ترتیب

غزل جدید

غزل قدیم

متغزلین جدید

مینائے غزل

اختتامیہ

متغزلین جدید (۲)

غزل جدید

مینائے غزل

اختتامیہ

حصۂ نثر

اُردو غزل اور متغزلین
(صنفِ غزل کے بارے میں نقادانِ فن کا اظہارِ خیال)

(۲)
(تذکرہ نویسوں کی آراء ممتاز شعراء کے بارے میں)

محمد طفیل پرنٹر پبلشر ایڈیٹر نے نقوش پریس اردو بازار لاہور سے چھپوا کر ادارہ فروغ اردو لاہور سے شائع کیا

طلوع

شعروں کے انتخاب کا معاملہ ہو یا غزلوں کے انتخاب کا معاملہ، اس کا سبب ہمیشہ ذاتی پسند ہوگی
یہی وجہ ہے کہ کسی کے انتخاب سے ہر شخص مطمئن نہیں ہو سکتا۔ شعری انتخابات کے سلسلے میں بعض لوگوں
نے ہماری رہنمائی بھی کی اور بعضوں نے ہمیں گمراہ بھی کیا۔ یہ گمراہی اور یہ رہنمائی صرف ذاتی پسند کی بدولت
ہوئی۔ جب مولانا نیاز فتح پوری مومن کو غالب سے بڑا شاعر مانتے ہیں تو ہمیں صرف تعجب ہی نہیں ہوتا بلکہ
وہ [illegible] یہ ذکر تو الگ رہا کہ مومن غالب سے بڑا شاعر تھا یا غالب [illegible]
تو اس [illegible] قرار دے دیا —— ہم ایسے تمام جھگڑوں سے بچنا چاہتے ہیں
تو شاعروں سے صرف اتنی شکایت ہے کہ ان میں سے بیشتر [illegible]
[illegible] رہ گئے۔ حالانکہ [illegible]
ہر انسان کی پوری پوری صلاحیتیں ہوتی ہیں۔ وہ اگر چاہے تو برے سے برے اچھے شاعروں کو زندہ کر سکتا ہے
ہم میں سے بعضوں کو شاید علم نہیں ہے کہ یہ غزل ۔

گو ایک بیک جو ہوا پلٹ نہیں دل کو میرے قرار ہے
کروں غم ستم کا میں کیا بیاں میرا غم سے سینہ فگار ہے

ظفر کی نہیں ہے بلکہ ایک اور شاعر صبا کی ہے۔ ہم میر و غالب کو جانتے ہیں لیکن یہ نہیں جانتے کہ
بعض شاعر ایسے بھی ہیں جنھوں نے ایسے ایسے شعر بھی کہے ہیں۔

جس گھڑی تیرے آستاں سے گئے
ہم نے جانا کہ دو جہاں سے گئے (آصف)

جب سے آنکھوں سے بیان کی
پھول جو دست باغباں سے گرا (میر مستحسن خلیق)

آیا جو میکشوں کی محفل میں وہ بادہ نوش
ہر ایک گل کے ساقی ہر ایک جام سے گیا (میر امانی اسد)

اس نمبر میں جتنے بڑے بڑے شعرا ہیں ان کی غزلوں پر بیشک جھوم جھوم جائیے۔ لیکن ان شعراء کو ضرور پڑھئے جن کی ایک ایک یا دو دو غزلیں پیش کی جا رہی ہیں۔ افسوس کہ اتنے مختصر وقت میں ہمیں ایسے شعرا کا زیادہ کلام دستیاب نہیں ہو سکا۔ ورنہ ہم اپنی تمام تر توجہ اس حصہ پر صرف کر دیتے۔ ضرورت ہے کہ کوئی ان زندہ رہنے والے گمنام شاعروں پر کام کرے۔ جب مجھ ایسا شعر دشمن بھی اس کلام کی افادیت سے منکر نہیں ہو سکا تو اُردو شاعری پر کام کرنے والے کیوں خاموش ہیں؟

ہم نے اس نمبر کی ترتیب میں کن کن امور کا خیال رکھا، اور کیسے کیسے صبر آزما مراحل سے گزرے اور کون کون سے تذکروں سے استفادہ کیا، اس کی کہانی کافی لمبی ہے۔ ہم یہاں صرف ایک امر کی طرف اشارہ کرنا چاہتے ہیں کہ ہم نے زیادہ سے زیادہ موجودہ دور کے شعراء کی فنی صلاحیتوں کو آپ کے سامنے پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم اس دھن میں اتنا آگے بڑھ گئے کہ منزل ہی پیچھے رہ گئی۔ بعض شاعروں کو ہم اس نمبر میں شامل بھی کرنا چاہتے تھے، لیکن وقت کی کوتاہی کے باعث ہماری دسترس ان کے کلام تک نہ ہو سکی اس لیے بادلِ نخواستہ انھیں چھوڑنا پڑا۔ —— نہ جانے ہم اتنی احتیاطوں کے باوجود کہاں تک کامیاب ہوئے؟

اس نمبر میں بعض شعرا کی دس غزلیں بھی ہیں، چھ بھی، دو بھی اور ایک بھی —— اس سے مقصود یہ نہیں ہے کہ ایک غزل والا شاعر ہر حال میں چھ غزلوں والے شعرا سے کمتر کہنے والا ہے۔ بلکہ بعض مجبوریاں ایسی تھیں جن کی بنا پر ایسا کرنا پڑا —— ویسے ہماری کوشش یہ ہے کہ متقدمین اور متوسطین میں سے ولی، میر، سودا، درد ایسے درجہ اوّل کے شعرا کے ساتھ دورِ متاخرین کے درجہ اوّل کے شعرا اقبال، حسرت، حفیظ اور فراق تک کو ایک ساتھ جگہ ملے تاکہ ان کا شعری مرتبہ پہچاننے کے ساتھ ساتھ اُردو غزل کی ارتقائی منزلوں کا بھی سراغ مل سکے۔ اس طرح ہم نے درجہ دوم اور سوم کے مرتبہ کے شعرا کو ایک ساتھ لانا چاہا۔ یہاں یہ اعتراف کر لیا جائے تو بہتر ہو گا کہ پرانے شعرا سے اس حد بندی میں ہم سے ضرور زیادتی ہوئی ہے (یہ ایک مجبوری تھی اس لیے کہ باوجود انتہائی کوشش کے بعض اہم شعرا کے ہمیں دواوین ہی نہیں ملے) لیکن حتی الامکان موجودہ شعرا کے ساتھ پورے دیانتدارانہ خلوص سے کام لیا گیا ہے۔

اس شمارہ کا سرورق عبدالرحمٰن چغتائی کی فنکارانہ صلاحیتوں کی ایک تابندہ مثال ہے جس کے لیے ہم ان کے شکر گزار ہیں۔

اگر اس نمبر کے سلسلہ میں حبیب اشعر، ملک اسلم، نگین احسن کلیم، محمد عبداللہ قریشی اور ڈاکٹر وحید قریشی نے میری بھرپور اعانت نہ کی ہوتی تو یہ کام مجھ اکیلے کے بس کا نہ تھا۔

محمد طفیل

۱۰ر مئی ۱۹۵۴ء

(۲)

کتنی عجیب بات ہے کہ جب مجھے معاملاتِ حسن و عشق کا کچھ بھی پتہ نہ تھا (پتہ تو خیر اب بھی نہیں) میں نے ایک بیاض (جو اب بھی میرے پاس ہے) خریدی تھی اور اس کے پہلے صفحے پر لکھا تھا ؎

کھلتا کسی پہ کیوں مرے دل کا معاملہ
شعروں کے انتخاب نے رسوا کیا مجھے

بعد کے صفحات میں وہ تمام اشعار لکھے تھے۔ جو مجھے کسی نہ کسی وجہ سے پسند آگئے تھے۔ نہ چھپنا حقیقت نے "بچپنے" میں ہی چھپا نہ چھوڑا اور ۱۹۵۲ء میں میں نے غزل نمبر کے نام سے نقوش کا ایک نمبر شائع کر دیا۔ جو خلافِ امید اتنا مقبول ہوا کہ میں "حیران" رہ گیا تھا —— معلوم ہوا۔ ابھی میری طرح کے صاحبانِ دل موجود ہیں —— جی بہت خوش ہوا۔

۱۹۵۵ء میں جب میں نے اس کا دوسرا ایڈیشن شائع کیا تو اسے اور "معتبر" بنانے کے لیے غزل سے متعلق، جو کار آمد قسم کا، نثر کا حصہ تھا بھی شامل کر دیا اور ساتھ ہی جو جو کلام کے شعرا پہلے ایڈیشن میں رہ گئے تھے۔ انہیں بھی ڈھونڈ نکالا۔ پہلے شمارہ کی ضخامت ۴۰۰ صفحات تھی۔ دوسرے ایڈیشن کی نوبت ۶۵۰ صفحات تک پہنچی۔ موجودہ ایڈیشن کی ضخامت ۷۵۲ صفحات ہے (پہلے ایڈیشن میں ۲۱۸ شعرا کا کلام درج تھا۔ دوسرے ایڈیشن میں ۲۶۶ شعرا کا اور موجودہ ایڈیشن میں ۲۷۰ شعرا کا کلام پیش کیا جا رہا ہے) غرض میں نے جس کام کو پہلے پہل محض مذاق میں کیا تھا۔ اُسے اب پوری توجہ اور سنجیدگی سے نبھانا پڑا۔ میرے ذہنی ترازو کے مطابق۔ اب تو یہ نمبر ایک کار آمد قسم کا تذکرہ —— اور بے شمار دوستوں کے دل کی دھڑکن بن جائے گا۔

میں نے اس نمبر کی ترتیب پھر بدل دی ہے۔ جو میرے نزدیک پہلے ایڈیشنوں سے بہر حال بہتر ہے ممکن ہے اب بھی بعض پرانی روش کے دوستوں کو یہ ترتیب بھی پسند نہ آئے۔ مگر میں کیا کروں۔ ذہنی فاصلے ہوتے ہوتے ہی کم ہوں گے —— اور پھر میری دشواریاں اسے کون جانے!

بچپن میں جو شعر اپنی کاپی کے پہلے صفحے پر لکھا تھا —— اس کی صداقت آج معلوم ہوئی!

محمد طفیل

۱۵ جنوری ۱۹۶۳ء

اساتذۂ غزل



پیدا کہاں ہیں ایسے پراگندہ طبع لوگ
افسوس تم کو میر سے صحبت نہیں رہی

[illegible]



جسے آپ گنتے تھے آشنا، جسے آپ کہتے تھے باوفا
میں وہی ہوں مومنِ مبتلا، تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو



بہت جی خوش ہوا حالی سے مل کر
ابھی کچھ لوگ باقی ہیں جہاں میں



اقبال لکھنؤ سے نہ دلی سے ہے غرض
ہم تو اسیر ہیں خمِ زلفِ کمال کے



اُردو ہے جس کا نام ہمیں جانتے ہیں داغؔ
ہندوستاں میں دھوم ہماری زباں کی ہے

جامعہ ملیہ اسلامیہ



بہت جی خوش ہوا حالی سے مل کر
ابھی کچھ لوگ باقی ہیں جہاں میں



ترے کلام کا جن کو مزا نہیں اے شادؔ
یقین مان کہ دل ہی نہیں گداز اُن کے



اقبال لکھنؤ سے نہ دلی سے ہے غرض
ہم تو اسیر ہیں خمِ زلفِ کمال کے



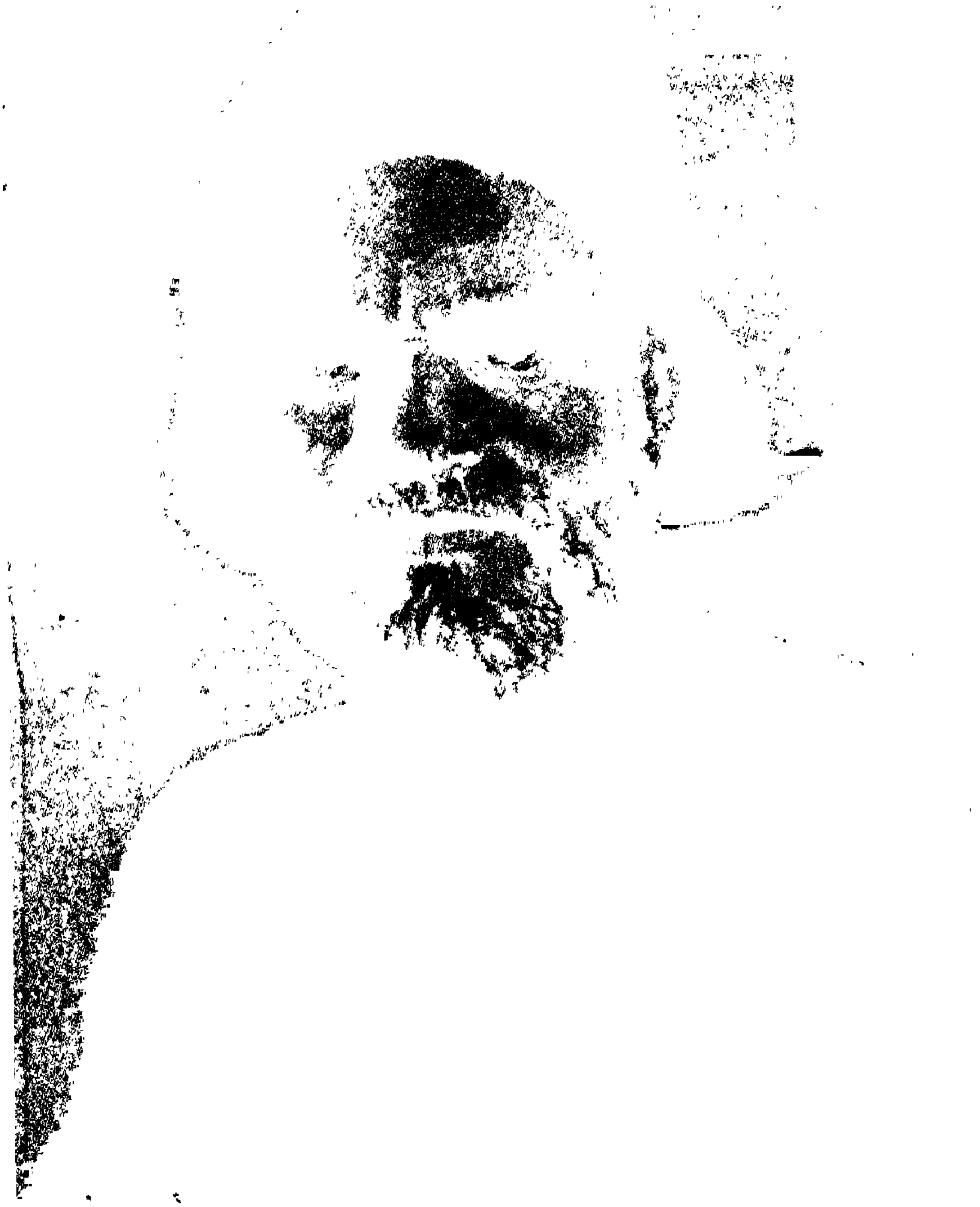
ہے زبانِ لکھنؤ میں رنگِ دہلی کی نمود
تجھ سے حسرتؔ نام روشن شاعری کا ہو گیا



اصغر سے ملے لیکن اصغر کو نہیں دیکھا
اشعار میں سنتے ہیں کچھ کچھ وہ نمایاں ہے



فانیؔ ہم تو جیتے جی وہ میت ہیں بے گور و کفن
غربت جس کو راس نہ آئی اور وطن بھی چھوٹ گیا



جگرؔ! میں نے چھپایا لاکھ اپنا دردِ غم لیکن
بیاں کر دی مری صورت نے سب کیفیت دل کی



بہت جی خوش ہوا اے ہم نشیں کل جوش سے مل کر
ابھی اگلی شرافت کے نمونے پائے جاتے ہیں



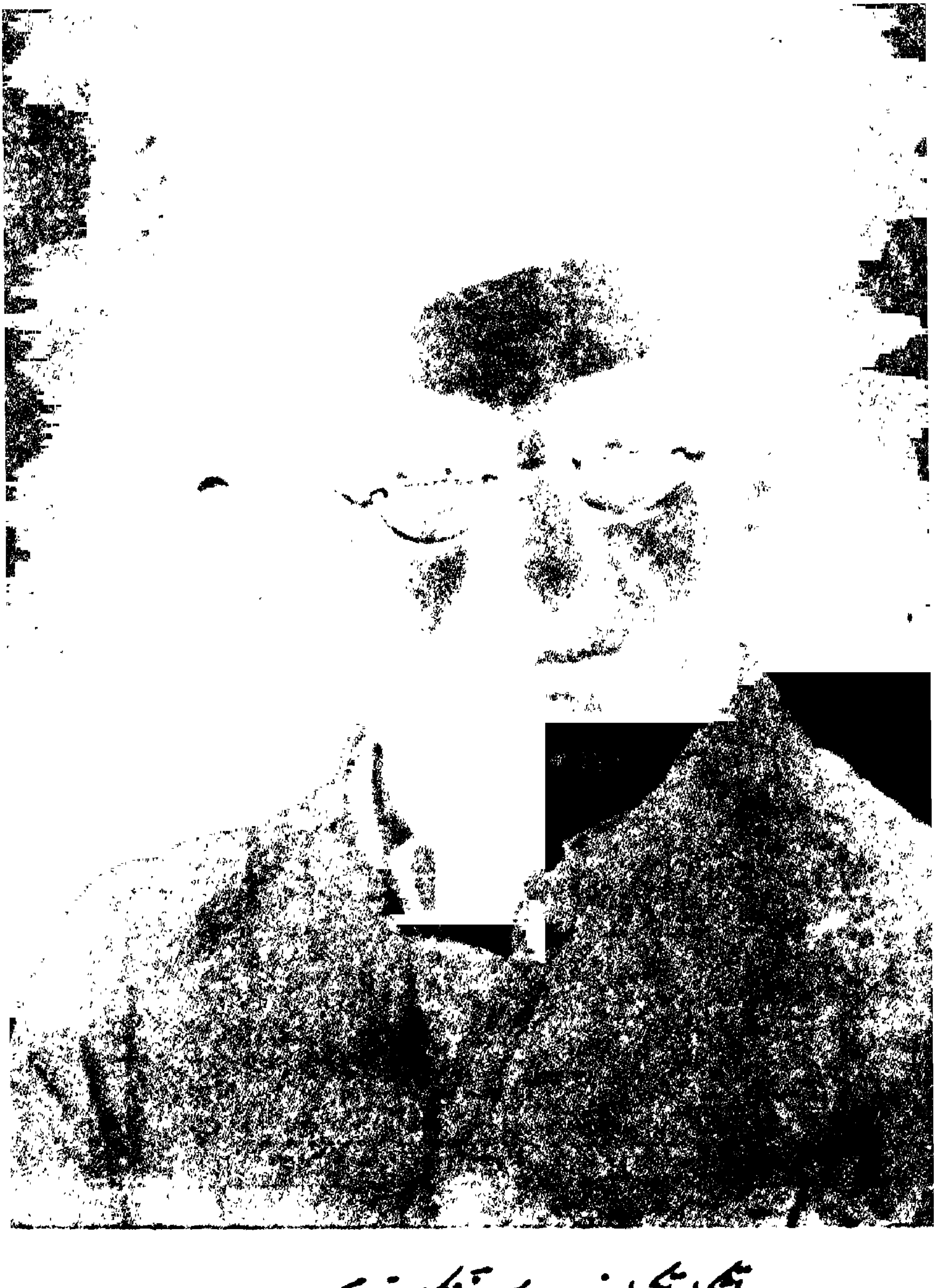
ہم نے بھی آج فراق کو دیکھا
سوزِ مکمل، دردِ مجسم



بہت ہی خوش ہوا اے ہم نشیں کل جوش سے مل کر
ابھی اگلی شرافت کے نمونے پائے جاتے ہیں



ہم نے بھی آج فراق کو دیکھا
سوزِ مکمل، دردِ مجسم



تشکیل و تکمیلِ فن میں جو بھی حفیظؔ کا حصہ ہے

نصف صدی کا قصہ ہے دو چار برس کی بات نہیں

مرزا یاس یگانہ چنگیزی



خودی کا نشہ چڑھا آپ میں رہا نہ گیا
خدا بنے تھے یگانہ مگر بنا نہ گیا

ولی دکنی

○

یاد کرنا ہر گھڑی اُس یار کا
ہے وظیفہ مجھ دلِ بیمار کا

آرزوئے چشمۂ کوثر نہیں
تشنہ لب ہوں شربتِ دیدار کا

عاقبت کیا ہووے گا معلوم نہیں
دل ہوا ہے مبتلا دیدار کا

کیا کہے تعریف دل ہے بے نظیر
حرف حرف اُس مخزنِ اسرار کا

گر ہوا ہے طالبِ آزادگی
بند مت ہو سبحہ و زنار کا

مسندِ گل منزلِ شبنم ہوئی
دیکھ رتبہ دیدۂ بیدار کا

اے ولی ہونا سری جن پر نثار
مدعا ہے چشمِ گوہر بار کا

○

میں تجھے آیا ہوں ایماں بوجھ کر
باعثِ جمعیتِ جاں بوجھ کر

بلبلِ شیراز کوں کرتا ہوں یاد
حسن گل تیرے گلستاں بوجھ کر

دل چلا ہے عشق کا ہو جوہری
لب ترے لعلِ بدخشاں بوجھ کر

ہر نگہ کرتی ہے نظارے کی مشق
خط کو تیرے خطِ ریحاں بوجھ کر

اے سجن آیا ہوں ہو بے اختیار
تجھ کوں اپنا راحتِ جاں بوجھ کر

زلف تیری کیوں نہ کھاوے پیچ و تاب
حال مجھ دل کا پریشاں بوجھ کر

رحم کر اُس پر کہ آیا ہے ولی
درد دل کا تجھ کوں درماں بوجھ کر

○

فدائے دلبرِ رنگیں ادا ہوں
شہیدِ شاہدِ گل گوں قبا ہوں

ہر اک مہ رو کے ملنے کا نہیں ذوق
سخن کے آشنا کا آشنا ہوں

کیا ہوں ترکِ نرگس کا تماشا
طلب گارِ نگاہِ باحیا ہوں

نہ کر شمشاد کی تعریف مجھ پاس
کہ میں اس سرو قد کا مبتلا ہوں

کیا میں عرض اس خورشید رو سوں
تو شاہِ حسن میں تیرا گدا ہوں

سدا رکھتا ہوں شوق اس کے سخن کا
ہمیشہ تشنۂ آبِ بقا ہوں

قدم پر اس کے رکھتا ہوں سدا سر
ولی ہم مشربِ رنگِ حنا ہوں

○

میں عاشقی میں تب سوں افسانہ ہو رہا ہوں
تیری نگہ کا جب سوں دیوانہ ہو رہا ہوں

اے آشنا کرم سوں یک بار آ درس دے
تجھ باج سب جہاں سوں بیگانہ ہو رہا ہوں

باتاں لگن کی مت پوچھ اے شمعِ بزمِ خوبی
مدت سوں تجھ جھلک کا پروانہ ہو رہا ہوں

شاید وہ گنجِ خوبی آوے کسی طرف سوں
اس واسطے سراپا ویرانہ ہو رہا ہوں

سودائے زلفِ خوباں رکھتا ہوں دل میں دائم
زنجیرِ عاشقی کا دیوانہ ہو رہا ہوں

بر جا ہے گر سنوں نئیں ناصح تری نصیحت
میں جامِ عشق پی کر مستانہ ہو رہا ہوں

کس سوں ولی اپس کا احوال جا کہوں میں
سر تا قدم میں غم سوں غم خانہ ہو رہا ہوں

○

خوب رو خوب کام کرتے ہیں
یک نگہ میں غلام کرتے ہیں

دیکھ خوباں کو وقت ملنے کے
کس ادا سوں سلام کرتے ہیں

کیا وفادار ہیں کہ ملنے میں
دل سوں سب رام رام کرتے ہیں

کم نگاہی سوں دیکھتے ہیں ولے
کام اپنا تمام کرتے ہیں

کھولتے ہیں جب اپنی زلفاں کو
صبح عاشق کوں شام کرتے ہیں

صاحب لفظ اس کو کہہ سکیے
جس سوں خوباں کلام کرتے ہیں

دل لجاتے ہیں اے ولی میرا
سرو قد جب خرام کرتے ہیں

○

کیا مجھ عشق کوں ظالم نے آب آہستہ آہستہ
کہ آتش گل کوں کرتی ہے گلاب آہستہ آہستہ

وفاداری نے دلبر کی بجھایا آتش غم کوں
کہ گرمی دفع کرتا ہے گلاب آہستہ آہستہ

عجب کچھ لطف رکھتا ہے شب خلوت میں گل رو سوں
خطاب آہستہ آہستہ، جواب آہستہ آہستہ

مرے دل کوں کیا بے خود تری انکھیاں نے آخر کوں
کہ جیوں بے ہوش کرتی ہے شراب آہستہ آہستہ

ہوا تجھ عشق سوں اے آتشیں رو دل مرا پانی
کہ جیوں گلتا ہے آتش سوں گلاب آہستہ آہستہ

ادا و ناز سوں آتا ہے وو روشن جبیں گھر سوں
کہ جیوں مشرق سوں نکلے آفتاب آہستہ آہستہ

ولی مجھ دل میں آتا ہے خیال یار بے پروا
کہ جیوں انکھیاں میں آتا ہے خواب آہستہ آہستہ

○

بے عشق کا تیر کاری لگے
سے زندگی کیوں نہ بھاری لگے

چھوڑے محبت دم مرگ تک
بسے یار جانی سوں یاری لگے

ہووے اُسے جگ میں ہرگز قرار
بسے عشق کی بے قراری لگے

ر اک وقت مجھ عاشق پاک کوں
یارے تری بات پیاری لگے

لی کوں کہے تو اگر یک بچن
یباں کے دل میں کٹاری لگے

○

ترا لب دیکھ حیواں یاد آوے
ترا مکھ دیکھ کنعاں یاد آوے

تیرے دو نین جب دیکھوں نظر بھر
مجھے تب نرگستاں یاد آوے

تری زلفاں کی طولانی کوں دیکھے
مجھے لیل زمستاں یاد آوے

ترے خط کا زمرد رنگ دیکھے
بہار سنبلستاں یاد آوے

ترے مکھ کے چمن کے دیکھنے کوں
مجھے فردوس رضواں یاد آوے

تری زلفاں میں یو مکھ جو کوئی دیکھے
اُسے شمع شبستاں یاد آوے

جو کوئی دیکھے میری انکھیاں کو روتے
اُسے ابر بہاراں یاد آوے

جو میرے حال کی گردش کوں دیکھے
اُسے گرداب گریاں یاد آوے

ولی میرا جنوں جو کوئی دیکھے
اُسے کوہ و بیاباں یاد آوے

○

سرودِ عیش گاویں ہم، اگر وہ عشوہ ساز آوے
بجاویں طبل شادی کے، اگر وہ دل نواز آوے

خمارِ ہجر نے جس کے دیا ہے دردِ سر مجکوں
رکھوں نشّہ نمن انکھیاں میں گر وہ مستِ ناز آوے

جنونِ عشق میں مجکوں نہیں زنجیر کی حاجت
اگر میری خبر لینے کوں وہ زلفِ دراز آوے

ادب کے اہتمام آگے نہ پاوے بار واں ہرگز
ترے سایے کی پابوسی کوں گر رنگِ ایاز آوے

عجب نئیں گر گلاں دوڑیں پکڑ کر صورتِ قمری
ادا سوں جب چمن بھیتر وہ سروِ سرفراز آوے

پرستش اُس کی میرے سر پہ ہووے سرتی لازم
صنم میرا رقیباں سے اگر ملنے سوں باز آوے

ولی اس گوہرِ کانِ حیا کی کیا کہوں خوبی
مرے گھر اس طرح آتا ہے جوں سینے میں راز آوے

○

صنم میرا سخن سوں آشنا ہے
مجھے فکرِ سخن کرنا بجا ہے

چمن میں وصل کے ہر جلوۂ یار
گلِ رنگیں بہارِ مدعا ہے

نہ بخشے کیوں ترا خط زندگانی
کہ موجِ چشمۂ آبِ بقا ہے

تغافل نے ترے زخمی کیا مجھ
تری یہ کم نگاہی نیمچا ہے

نہیں واں آب غیر از آبِ خنجر
شہادت گاہِ عاشق کربلا ہے

غنیمت بوجھ ملنے کوں ولی کے
نگاہِ پاک بازاں کیمیا ہے

میر تقی میر

○

جس سر کو غرور آج ہے یاں تاج وری کا
کل اس پہ یہیں شور ہے پھر نوحہ گری کا

آفاق کی منزل سے گیا کون سلامت
اسباب لٹا راہ میں یاں ہر سفری کا

زنداں میں بھی شورش نہ گئی اپنے جنوں کی
اب سنگ مداوا ہے اس آشفتہ سری کا

ہر زخم جگر داورِ محشر سے ہمارا
انصاف طلب ہے تری بیدادگری کا

اپنی تو جہاں آنکھ لڑی، پھر وہیں دیکھو
آئینے کو لپکا ہے پریشاں نظری کا

صد موسم گل ہم کو تہِ بال ہی گزرے
مقدور نہ دیکھا کبھی بے بال و پری کا

اس رنگ سے جھمکے ہے پلک پر کہ کہے تو
ٹکڑا ہے ترا اشک عقیقِ جگری کا

لے سانس بھی آہستہ کہ نازک ہے بہت کام
آفاق کی اس کارگہِ شیشہ گری کا

ٹک میر جگر سوختہ کی جلد خبر لے
کیا یار بھروسہ ہے چراغِ سحری کا

○

جو اس شور سے میر روتا رہے گا
تو ہمسایہ کاہے کو سوتا رہے گا

مجھے کام رونے سے اکثر ہے ناصح
تو کب تک مرے منہ کو دھوتا رہے گا

مرے دل نے وہ نالہ پیدا کیا ہے
جرس کے بھی جو ہوش کھوتا رہے گا

میں وہ رونے والا چلا ہوں جہاں سے
جسے ابر ہر سال روتا رہے گا

بس اے میر مژگاں سے پونچھ آنسوؤں کو
تو کب تک یہ موتی پروتا رہے گا

○

رہا جب تک کہ دم میں دم رہا
کے جانے کا نہایت غم رہا

ن تھا تیرا بہت عالم فریب
کے آنے پر بھی اک عالم رہا

نہ پہنچا گوشۂ داماں تلک
رۂ خوں تھا مژہ پر جم رہا

تے میں لیلیٰ کے خیمہ کو سیاہ
میں مجنوں کا دلے ماتم رہا

مہ احرام زاہد پر نہ جا
حرم میں ایک نامحرم رہا

نیں کھوئے تو تونک آیا نظر
ریہاں کا ہم دل برہم رہا

کے لب سے تلخ ہم سنتے رہے
پنے حق میں آبِ حیواں سم رہا

سے ملنے کی حقیقت جس پہ تھی
مدت تک وہ کاغذ نم رہا

صبح پیری شام ہونے آئی میر
نہ جیتا، یاں بہت دن کم رہا

○

اُلٹی ہو گئیں سب تدبیریں، کچھ نہ دوا نے کام کیا
دیکھا! اس بیماریٔ دل نے آخر کام تمام کیا

عہدِ جوانی رو رو کاٹا، پیری میں لیں آنکھیں موند
یعنی رات بہت جاگے تھے، صبح ہوئی آرام کیا

ناحق ہم مجبوروں پر یہ تہمت ہے مختاری کی
چاہتے ہیں سو آپ کریں ہیں، ہم کو عبث بدنام کیا

سرزد ہم سے بے ادبی تو وحشت میں بھی کم ہی ہوئی
کوسوں اس کی اُور گئے، پر سجدہ ہر ہر گام کیا

کس کا کعبہ، کیسا قبلہ، کون حرم ہے، کیا احرام
کوچے کے اس کے باشندوں نے سب کو یہیں سے سلام کیا

یاں کے سپید و سیاہ میں ہم کو دخل جو ہے سو اتنا ہے
رات کو رو رو صبح کیا، یا دن کو جوں توں شام کیا

صبح چمن میں اس کو کہیں تکلیفِ ہوا لے آئی تھی
رُخ سے گل کو مول لیا، قامت سے سرو غلام کیا

ساعدِ سیمیں دونوں اس کے ہاتھ میں لا کر چھوڑ دیے
بھولے اس کے قول و قسم پر ہائے خیالِ خام کیا

ایسے آہوئے رم خوردہ کی وحشت کھونی مشکل تھی
سحر کیا، اعجاز کیا، جن لوگوں نے تجھ کو رام کیا

میر کے دین و مذہب کو اب پوچھتے کیا ہو ان نے تو
قشقہ کھینچا، دیر میں بیٹھا، کب کا ترک اسلام کیا

میر تقی میر

○

جس سر کو غرور آج ہے یاں تاج وری کا
کل اس پہ یہیں شور ہے پھر نوحہ گری کا

آفاق کی منزل سے گیا کون سلامت؟
اسباب لٹا راہ میں یاں ہر سفری کا

زنداں میں بھی شورش نہ گئی اپنے جنوں کی
اب سنگ مداوا ہے اس آشفتہ سری کا

ہر زخمِ جگر داورِ محشر سے ہمارا
انصاف طلب ہے تری بیدادگری کا

اپنی تو جہاں آنکھ لڑی، پھر وہیں دیکھو
آئینے کو لپکا ہے پریشاں نظری کا

صد موسمِ گل ہم کو تہِ بال ہی گزرے
مقدور نہ دیکھا کبھی بے بال و پری کا

اس رنگ سے جھمکے ہے پلک پر کہ کہے تو
ٹکڑا ہے ترا اشک عقیقِ جگری کا

لے سانس بھی آہستہ کہ نازک ہے بہت کام
آفاق کی اس کارگہِ شیشہ گری کا

ٹک میر جگر سوختہ کی جلد خبر لے
کیا یار بھروسہ ہے چراغِ سحری کا

○

جو اس شور سے میر روتا رہے گا
تو ہمسایہ کاہے کو سوتا رہے گا

مجھے کام رونے سے اکثر ہے ناصح
تو کب تک مرے منہ کو دھوتا رہے گا

مرے دل نے وہ نالہ پیدا کیا ہے
جرس کے بھی جو ہوش کھوتا رہے گا

میں وہ رونے والا چلا ہوں جہاں سے
جسے ابر ہر سال روتا رہے گا

بس اے میر مژگاں سے پونچھ آنسوؤں کو
تو کب تک یہ موتی پروتا رہے گا

○

غم رہا جب تک کہ دم میں دم رہا
دل کے جانے کا نہایت غم رہا

حسن تھا تیرا بہت عالم فریب
خط کے آنے پر بھی اک عالم رہا

دل نہ پہنچا گوشۂ داماں تلک
قطرۂ خوں تھا مژہ پہ جم رہا

سنتے ہیں لیلیٰ کے خیمہ کو سیاہ
اس میں مجنوں کا وے ماتم رہا

جامۂ احرام زاہد پر نہ جا
تھا حرم میں لیک نامحرم رہا

زلفیں کھولے تو تو ٹک آیا نظر
عمر بھر یاں کام دل برہم رہا

اس کے لب سے تلخ ہم سنتے رہے
اپنے حق میں آبِ حیواں سم رہا

میرے رونے کی حقیقت جس میں تھی
ایک مدت تک وہ کاغذ نم رہا

صبح پیری شام ہونے آئی میرؔ
تو نہ جیتا، یاں بہت دن کم رہا

○

اُلٹی ہو گئیں سب تدبیریں، کچھ نہ دوا نے کام کیا
دیکھا! اس بیماریٔ دل نے آخر کام تمام کیا

عہدِ جوانی رو رو کاٹا، پیری میں لیں آنکھیں موند
یعنی رات بہت جاگے تھے، صبح ہوئی آرام کیا

ناحق ہم مجبوروں پر یہ تہمت ہے مختاری کی
چاہتے ہیں سو آپ کریں ہیں ہم کو عبث بدنام کیا

سرزد ہم سے بے ادبی تو وحشت میں بھی کم ہی ہوئی
کوسوں اس کی اور گئے، پر سجدہ ہر ہر گام کیا

کس کا کعبہ، کیسا قبلہ، کون حرم ہے، کیا احرام
کوچے کے اس کے باشندوں نے سب کو یہیں سے سلا

یاں کے سپید و سیاہ میں ہم کو دخل جو ہے سو اتنا ہے
رات کو رو رو صبح کیا، یا دن کو جوں توں شام ک

صبح چمن میں اس کو کہیں تکلیفِ ہوا لے آئی تھی
رُخ سے گل کو مول لیا، قامت سے سرو غلام ک

ساعدِ سیمیں دونوں اس کے ہاتھ میں لا کر چھوڑ دیئے
بھولے اس کے قول و قسم پر ہائے خیالِ خام ک

ایسے آہوئے رم خوردہ کی وحشت کھونی مشکل تھی
سحر کیا، اعجاز کیا، جن لوگوں نے تجھ کو رام کیا

میرؔ کے دین و مذہب کو اب پوچھتے کیا ہو ان نے تو
قشقہ کھینچا، دیر میں بیٹھا، کب کا ترک اسلام کیا

○

کیا خیالِ زلفِ سیہ جفا شعاراں
نہ ہوا کہ صبح ہووے شبِ تیرہ روزگاراں

ی عید سب نے پہنے طرب و خوشی کے جامے
نہ ہوا کہ ہم بھی بدلیں یہ لباسِ سوگواراں

ہیں خاکِ کُو کو اس کی تو صبا نہ دیجو جنبش
کہ بھرے ہیں اس زمیں میں جگرِ جگر فگاراں

سکے تاجِ زر کو سر پر چمن زمانہ میں گل
نہ شگفتہ ہو تو آشنا کہ خزاں ہے یہ بہاراں

نہیں تجھ کو چشمِ عبرت یہ نمود میں ہے ورنہ
کہ گئے ہیں خاک میں مل کئی تجھ سے تاجداراں

تو جہاں سے دل اٹھا یاں نہیں رسمِ دردمندی
کسی نے بھی یوں نہ پوچھا ہوئے خاک یاں ہزاراں

یہ سنا تھا میر ہم نے کہ فسانہ خواب لائے
تری سرگزشت سن کر گئے اور خوابِ یاراں

○

یارو! مجھے معاف رکھو، میں نشے میں ہوں
اب دو تو جام خالی ہی دو، میں نشے میں ہوں

ایک ایک قرطِ دور میں یوں ہی مجھے بھی دو
جامِ شراب پُر نہ کرو، میں نشے میں ہوں

مستی سے درہمی ہے مری گفتگو کے بیچ
جو چاہو تم بھی مجھ کو کہو، میں نشے میں ہوں

یا ہاتھوں ہاتھ لو مجھے مانندِ جامِ مے
یا تھوڑی دور ساتھ چلو، میں نشے میں ہوں

معذور ہوں جو پاؤں مرا بے طرح پڑے
تم سرگراں تو مجھ سے نہ ہو، میں نشے میں ہوں

نازک مزاج آپ قیامت ہیں میر جی
جوں شیشہ میرے منہ نہ لگو، میں نشے میں ہوں

○

بھر ہم رہے شرابی سے
پر مژوں کی اک گلابی سے

ڈھا جائے ہے سحر سے آہ
ت گزرے گی کس خرابی سے

ملنا کم کم کلی نے سیکھا ہے
ں کی آنکھوں کی نیم خوابی سے

رقع اٹھتے ہی اچاند سا نکلا
اغ ہوں اس کی بے حجابی سے

ام تھے عشق میں بہت پر میر
ہم ہی فارغ ہوئے شتابی سے

○

فقیرانہ آئے، صدا کر چلے
میاں خوش رہو ہم دعا کر چلے

جو تجھ بن نہ جینے کو کہتے تھے ہم
سو اس عہد کو اب وفا کر چلے

شفا اپنی تقدیر ہی میں نہ تھی
کہ مقدور تک تو دوا کر چلے

وہ کیا چیز ہے آہ! جس کے لئے
ہر اک چیز سے دل اٹھا کر چلے

کوئی نا امیدانہ کرتے نگاہ
سو تم ہم سے منہ بھی چھپا کر چلے

بہت آرزو تھی گلی کی تری
سو یاں سے لہو میں نہا کر چلے

دکھائی دیئے یوں کہ بے خود کیا
ہمیں آپ سے بھی جدا کر چلے

ق

جبیں سجدہ کرتے ہی کرتے گئی
حق بندگی ہم ادا کر چلے

پرستش کی یاں تک کہ اے بت تجھے
نظر میں سبھوں کی خدا کر چلے

کہیں کیا جو پوچھے کوئی ہم سے میر
جہاں میں تم آئے تھے کیا کر چلے

○

گیا خیالِ زلفِ سیہ جفا شعاراں
نہ ہوا کہ صبح ہووے شبِ تیرہ روزگاراں

ہ عید سب نے پہنے طرب و خوشی کے جامے
نہ ہوا کہ ہم بھی بدلیں یہ لباسِ سوگواراں

میں خاکِ کو کر اس کی تو صبا نہ دیجو جنبش
کہ بھرے ہیں اس زمیں میں جگر جگر فگاراں

رکھے تاجِ زر کو سر پہ چمن زمانہ میں گل
نہ شگفتہ ہو تو اتنا کہ خزاں ہے یہ بہاراں

نہیں تجھ کو چشمِ عبرت یہ نمود میں ہے ورنہ
کہ گئے ہیں خاک میں مل کئی تجھ سے تاجداراں

ترے جہاں سے دل باختگاں نہیں رسمِ دردمندی
کسی نے بھی یوں نہ پوچھا ہوئے خاک یاں ہزاراں

یہ سنا تھا میرؔ ہم نے کہ فسانہ خواب لاوے
تری سرگزشت سن کر گئے اور خواب یاراں

○

یارو! مجھے معاف رکھو، میں نشے میں ہوں
اب دو تو جام خالی ہی دو، میں نشے میں ہوں

ایک ایک فرطِ دور میں یوں ہی مجھے بھی دو
جامِ شراب پُر نہ کرو، میں نشے میں ہوں

مستی سے درہمی ہے مری گفتگو کے بیچ
جو چاہو تم بھی مجھ کو کہو، میں نشے میں ہوں

یا ہاتھوں ہاتھ لو مجھے مانندِ جام مے
یا تھوڑی دور ساتھ چلو، میں نشے میں ہوں

معذور ہوں جو پاؤں مرا بے طرح پڑے
تم سرگراں تو مجھ سے نہ ہو، میں نشے میں ہوں

نازک مزاج آپ قیامت ہیں میرؔ جی
جوں شیشہ میرے منہ نہ لگو، میں نشے میں ہوں

میر

○

عمر بھر ہم رہے شرابی سے
دلِ پُر خوں کی اک گلابی سے

جی ڈھا جائے ہے سحر سے آہ
رات گزرے گی کس خرابی سے

کھلنا کم کم کلی نے سیکھا ہے
اس کی آنکھوں کی نیم خوابی سے

برقع اٹھتے ہی چاند سا نکلا
داغ ہوں اس کی بے حجابی سے

کام تھے عشق میں بہت پر میر
ہم ہی فارغ ہوئے شتابی سے

○

فقیرانہ آئے، صدا کر چلے
میاں خوش رہو ہم دعا کر چلے

جو تجھ بن نہ جینے کو کہتے تھے ہم
سو اس عہد کو اب وفا کر چلے

شفا اپنی تقدیر ہی میں نہ تھی
کہ مقدور تک تو دوا کر چلے

وہ کیا چیز ہے آہ جس کے لئے
ہر اک چیز سے دل اُٹھا کر چلے

کوئی نا امیدانہ کرتے نگاہ
سو تم ہم سے منہ بھی چھپا کر چلے

بہت آرزو تھی گلی کی تری
سو یاں سے لہو میں نہا کر چلے

دکھائی دیئے یوں کہ بے خود کیا
ہمیں آپ سے بھی جدا کر چلے

ق

جبیں سجدہ کرتے ہی کرتے گئی
حقِ بندگی ہم ادا کر چلے

پرستش کی یاں تک کہ اے بت تجھے
نظر میں سبھوں کی خدا کر چلے

کہیں کیا جو پوچھے کوئی ہم سے میر
جہاں میں تم آئے تھے کیا کر چلے

○

پتا پتا بوٹا بوٹا حال ہمارا جانے ہے
جانے نہ جانے گل ہی نہ جانے، باغ تو سارا جانے ہے

لگنے نہ دے بس ہو تو اس کے گوہرِ گوش کو بالے تک
اس کو فلک چشمِ مہ و خور کی پتلی کا تارا جانے ہے

آگے اس متکبر کے ہم خدا خدا کیا کرتے ہیں
کب موجود خدا کو وہ مغرورِ خود آرا جانے ہے

عاشق سا تو سادہ کوئی اور نہ ہوگا دنیا میں
جی کے زیاں کو عشق میں اس کے اپنا وارا جانے ہے

چارہ گری بیماریٔ دل کی رسمِ شہرِ حسن نہیں
ورنہ دلبرِ ناداں بھی اس درد کا چارا جانے ہے

کیا ہی شکار فریبی پر مغرور ہے وہ صیاد بچہ
طائر اڑتے ہوا میں سارے اپنا آمارا جانے ہے

مہر و وفا و لطف و عنایت اک سے نہ واقف ان میں ہے
اور تو سب کچھ طنز و کنایہ رمز و اشارا جانے ہے

عاشق تو مردہ ہے ہمیشہ اٹھتا ہے دیکھے سے اس کے
یار کے آجانے کو یکایک عمر دوبارا جانے ہے

کیا کیا آفتیں سر پر اس کے لاتا ہے معشوق اپنا
جس بے دل بے تاب و تواں کو عشق کا مارا جانے ہے

رخنوں سے دیوارِ چمن کے منہ کو لے ہے چھپا یعنی
ان سوراخوں کے ٹک رہنے کو سو کا نظارا جانے ہے

تشنۂ خوں ہے اپنا کتنا میر بھی ناداں تلخی کش
دم دار آبِ تیغ کو اس کے آبِ گوارا جانے ہے

○

ہستی اپنی حباب کی سی ہے
یہ نمائش سراب کی سی ہے

نازکی اس کے لب کی کیا کہیے
پنکھڑی اک گلاب کی سی ہے

بار بار اس کے در پہ جاتا ہوں
حالت اب اضطراب کی سی ہے

میں جو بولا کہا کہ یہ آواز
اسی خانہ خراب کی سی ہے

میر اُن نیم باز آنکھوں میں
ساری مستی شراب کی سی ہے

سودا

○

مقدور نہیں اس کی تجلی کے بیاں کا
جوں شمع سراپا ہو اگر صرف زباں کا

پردے کو تعین کے درِ دل سے اٹھا دے
کھلتا ہے ابھی پل میں طلسماتِ جہاں کا

ٹک دیکھ صنم خانۂ عشق آن کے اے شیخ!
جوں شمعِ حرم رنگ جھمکتا ہے بتاں کا

اس گلشنِ ہستی میں عجب دید ہے لیکن
جب چشم کھلی گل کی تو موسم ہے خزاں کا

دکھلائیے لے جا کے تجھے مصر کا بازار
لیکن نہیں خواہاں کوئی واں جنسِ گراں کا

ق

سودا جو کبھو گوش سے ہمت کے سنے تو
مضمون یہی ہے جرسِ دل کی فغاں کا

ہستی سے عدم تک نفسِ چند کی ہے راہ
دنیا سے گزرنا سفر ایسا ہے کہاں کا

○

دل! مت ٹپک نظر سے کہ پایا نہ جائے گا
جوں اشک پھر زمیں سے اٹھایا نہ جائے گا

رخصت ہے باغباں کہ ٹک اک دیکھ لیں چمن
جاتے ہیں واں جہاں سے پھر آیا نہ جائے گا

تیغِ جفائے یار سے دل! سر نہ پھیریو
پھر منہ وفا کو ہم سے دکھایا نہ جائے گا

آوے گا وہ چمن میں نہ اے ابر جب تلک
پانی گلوں کے منہ سے چوایا نہ جائے گا

ق

ظالم! میں کہہ رہا کہ تو اس خو سے درگزر
سودا کا قتل ہے یہ چھپایا نہ جائے گا

داماں داغِ تیغ جو دھویا، تو کیا ہوا
عالم کے دل سے داغ ہٹایا نہ جائے گا

○

نہ غنچے گل کے کھلتے ہیں، نہ نرگس کی کھلیں کلیاں
چمن میں لے کے خمیازہ کسی نے انکھڑیاں ملیاں

کسی مہتاب سے نے دیکھا ہے تجھ خورشید تاباں کو
پھرے ہے ڈھونڈتا ہر شب جہان آباد کی گلیاں

تبسم یوں نمایاں ہے مسی آلودہ دنداں سے
نہ ہو ابرِ سیہ میں اس طرح بجلی کی اچپلیاں

لب و لہجہ ترا سا ہے کہیں خوبانِ عالم میں
غلط ہے یہ زبانوں پر کہ سب مصری کی ہیں ڈلیاں

دوانہ ہو گیا سودا تو آخر ریختہ پڑھ پڑھ
نہیں کہتا تھا اسے ظالم کہ یہ باتیں نہیں بھلیاں

○

گدا، دستِ اہلِ کرم دیکھتے ہیں
ہم اپنا ہی دم اور قدم دیکھتے ہیں

نہ دیکھا جو کچھ جام میں جم نے اپنے
سو یک قطرۂ مے میں ہم دیکھتے ہیں

یہ رنجش میں ہم کو ہے بے اختیاری
تجھے تیری کھا کر قسم دیکھتے ہیں

غرض کفر سے کچھ، نہ دیں سے ہے مطلب
تماشائے دیر و حرم دیکھتے ہیں

حباب لب جو ہیں اے باغباں ہم
چمن کو ترے کوئی دم دیکھتے ہیں

مٹا جائے ہے حرف حرف آنسوؤں سے
جو نامہ اسے کر رقم دیکھتے ہیں

اگرچہ نہیں کام سنبل کے ہم کو
کسی زلف کا پیچ و خم دیکھتے ہیں

مگر تجھ سے رنجیدہ خاطر ہے سودا
اسے تیرے کوچے میں کم دیکھتے ہیں

○

باتیں کدھر گئیں وہ تری بھولی بھولیاں
دل لے کے بولتا ہے جواب تو یہ بولیاں

ہر بات ہے لطیفہ و ہر اک سخن ہے رمز
ہر آن ہے کنایہ و ہر دم ٹھٹھولیاں

حیرت نے اس کو بند نہ کرنے دیں پھر کبھو
آنکھیں جب آرسی نے ترے مکھ پہ کھولیاں

اندام گل پہ ہو نہ قبا اس مزے سے چاک
جوں خوش چھبوں کے تن پہ مسکتی ہیں چولیاں

کس طرح سودے آنکھوں کی کاوش سے دل کو چین
مژگاں نہ گڑ سکیں تو نگاہیں چبھولیاں

کیا چاہیئے تجھے یہ سر انگشت پر حنا
جس بے گنہ کے خون میں چاہیں ڈبولیاں

سودا کے دل سے صاف نہ رہتی تھی زلف یار
شانے نے بیچ پڑ کے گرہ اس کی کھولیاں

○

غیر کے پاس یہ اپنا ہی گماں ہے کہ نہیں
جلوہ گر یار مرا ورنہ کہاں ہے کہ نہیں

مہر ہر ذرہ میں مجھ کو ہی نظر آتا ہے؟
تم بھی ٹک دیکھو تو صاحب نظراں! ہے کہ نہیں

پاس ناموس مجھے عشق کا ہے اے بلبل!
ورنہ یاں کون سا انداز فغاں ہے کہ نہیں

دل کے ٹکڑوں کو بغل بیچ لیے پھرتا ہوں
کچھ علاج ان کا بھی اے شیشہ گراں ہے کہ نہیں

جرم ہے اس کی جفا کا کہ وفا کی تقصیر
کوئی تو بولو میاں منہ میں زباں ہے کہ نہیں

ق

پوچھا اک روز میں سودا سے کہ اے آوارہ
تیرے رہنے کا معین بھی مکاں ہے کہ نہیں

یک بیک ہو کے برآشفتہ لگا یوں کہنے
کچھ تجھے عقل سے بہرہ بھی یہاں ہے کہ نہیں

دیکھا میں قصر فریدوں کے در اوپر اک شخص
حلقہ زن ہو کے پکارا کوئی یاں ہے کہ نہیں

○

گل پھینکے ہے اوروں کی طرف بلکہ ثمر بھی
اے خانہ بر اندازِ چمن! کچھ تو ادھر بھی

کیا ضد ہے مرے ساتھ، خدا جانیے! ورنہ
کافی ہے تسلی کو مرے ایک نظر بھی

اے ابر! قسم ہے تجھے رونے کی ہمارے
تجھ چشم سے ٹپکا ہے کبھو لختِ جگر بھی

کس ہستیِ موہوم پہ نازاں ہے تو اے یار!
کچھ اپنے شب و روز کی ہے تجھ کو خبر بھی

تنہا ترے ماتم میں نہیں شام سیہ پوش
رہتا ہے سدا چاک گریبانِ سحر بھی

سودا تری فریاد سے آنکھوں میں کٹی رات
آئی ہے سحر ہونے کو ٹک تو کہیں مر بھی

○

جوں غنچہ تو چمن میں بند قبا کو کھولے
پھر گل سے اے پیارے! بلبل کبھو نہ بولے

آوے گا وہ چمن میں تڑکے ہی مے کشی کو
شبنم سے کہہ دے بلبل! پیالے گلوں کے دھولے

باغِ جہاں میں آکر کچھ ہم نے پھل نہ پایا
اک دل ملا کہ جس میں ہیں سینکڑوں پھپھولے

ایسا ہی جاؤں جاؤں کرتے ہو تو سدھارو
اس دل پہ کل جو ہونی سو آج ہی وہ ہو لے

کم بولنا ادا ہے ہر چند پر نہ اتنا
مُند جائے چشمِ عاشق تو بھی وہ لب نہ کھولے

چشم پُر آب ہوں میں جوں آئینہ حبابی
رُک رُک کے پڑ گئے ہیں چھاتی میں سب پھپھولے

کہتی ایسا اب کسے ہے سودا گلی میں اس کی
[illegible]

○

ساون کے بادلوں کی طرح سے بھرے ہوئے
یہ وہ نین ہیں جن سے کہ جنگل ہرے ہوئے

اے دل! یہ کس سے بگڑی کہ آتی ہے فوجِ اشک
لختِ جگر کی نعش کو آگے دھرے ہوئے

انصاف اپنا سونپیے کس کو بجز خدا
منصف جو بولتے ہیں تو تجھ سے ڈرے ہوئے

نزدیک اپنے رہنے سے مت کر ہمیں تو منع
ہیں لاکھ کوس جب ترے دل سے پرے ہوئے

سودا نکل نہ گھر سے کہ اب تجھ کو ڈھونڈتے
لڑکے پھریں ہیں پتھروں سے دامن بھرے ہوئے

○

نسیم ہے ترے کوچے میں اور صبا بھی ہے
ہماری خاک سے دیکھو تو! کچھ رہا بھی ہے

ترا غرور، مرا عجز، تا کجا ظالم!
ہر ایک بات کی آخر کچھ انتہا بھی ہے

جلے ہے شمع سے پروانہ اور میں تجھ سے
کہیں ہے مہر بھی جگ میں، کہیں وفا بھی ہے

ستم روا ہے اسیروں پہ اس قدر صیاد
چمن چمن کہیں بلبل کی اب نوا بھی ہے

سمجھ کے رکھیو قدم دشتِ خار میں مجنوں
کہ اس نواح میں سودا برہنہ پا بھی ہے

خواجہ میر درد

قتلِ عاشق کسی معشوق سے کچھ دور نہ تھا
پر ترے عہد کے آگے تو یہ دستور نہ تھا

رات مجلس میں ترے حسن کے شعلے کے حضور
شمع کے منہ پہ جو دیکھا تو کہیں نور نہ تھا

ذکر میرا ہی وہ کرتا تھا صریحاً لیکن
میں جو پہنچا تو کہا: خیر! یہ مذکور نہ تھا

باوجودیکہ پر و بال نہ تھے آدم کے
وہاں پہنچا کہ فرشتے کا بھی مقدور نہ تھا

پرورشِ غم کی ترے یاں تئیں تو کی دیکھا
کوئی بھی داغ تھا سینے میں کہ ناسور نہ تھا

محتسب! آج تو میخانے میں تیرے ہاتھوں
دل نہ تھا کوئی جو شیشے کی طرح چور نہ تھا

درد کے ملنے سے اے یار! برا کیوں مانا
اس کو کچھ اور سوا دید کے منظور نہ تھا

سینہ و دل حسرتوں سے چھا گیا
بس ہجومِ یاس! جی گھبرا گیا

تجھ سے کچھ دیکھا نہ ہم نے، جز جفا
پر وہ کیا کچھ ہے کہ جی کو بھا گیا

کھل نہیں سکتی ہیں اب آنکھیں مری
جی میں یہ کس کا تصور آ گیا

میں نے تو ظاہر نہ کی تھی دل کی بات
پر مری نظروں کے ڈھب سے پا گیا

پی گئی کتنوں کا لہو تیری یاد
غم ترا کتنے کلیجے کھا گیا

مٹ گئی تھی اس کے جی سے تو جھجک
درد کچھ بک بک کے تو چونکا گیا

○

تجھی کو جو یاں جلوہ فرما نہ دیکھا
برابر ہے دنیا کو دیکھا نہ دیکھا

مرا غنچۂ دل ہے وہ دل گرفتہ
کہ جس کو کسو نے کبھو وا نہ دیکھا

یگانہ ہے تو آہ! بیگانگی میں
کوئی دوسرا اور ایسا نہ دیکھا

اذیت، مصیبت، ملامت، بلائیں
ترے عشق میں ہم نے کیا کیا نہ دیکھا

کیا مجھ کو داغوں نے سروِ چراغاں
کبھو تو نے آکر تماشا نہ دیکھا

تغافل نے تیرے یہ کچھ دن دکھائے
ادھر تو نے لیکن نہ دیکھا نہ دیکھا

حجابِ رخِ یار تھے آپ ہی ہم
کھلی آنکھ جب کوئی پردا نہ دیکھا

شب و روز اے درد درپے ہوں اس کے
کسو نے جسے یاں نہ سمجھا، نہ دیکھا

○

مژگانِ تر ہوں یا رگِ تاکِ بریدہ ہوں
جو کچھ کہ ہوں سو ہوں، غرض آفت رسیدہ ہوں

کھینچے ہے دور آپ کو میری فروتنی
افتادہ ہوں پہ سایۂ قدِ کشیدہ ہوں

ہر شام مثلِ شام ہوں میں تیرہ روزگار
ہر صبح مثلِ صبح گریباں دریدہ ہوں

کرتی ہے بوئے گل تو مرے ساتھ اختلاط
پر آہ! میں تو موجِ نسیمِ وزیدہ ہوں

چاہے ہے یہ مری تپشِ دل کہ بعدِ مرگ
کنجِ مزار میں بھی نہ میں آرمیدہ ہوں

اے درد جا چکا ہے مرا کام ضبط سے
میں غم زدہ تو قطرۂ اشکِ چکیدہ ہوں

○

ہم تجھ سے کس ہوس کی فلک جستجو کریں
دل ہی نہیں رہا ہے جو کچھ آرزو کریں

مٹ جائیں ایک آن میں کثرت نمائیاں
ہم آئینہ کے سامنے جب آ کے ہُو کریں

تر دامنی پہ شیخ ہماری نہ جائیو!
دامن نچوڑ دیں تو فرشتے وضو کریں

سر تا قدم زبان ہیں جوں شمع گو کہ ہم
پر یہ کہاں مجال جو کچھ گفتگو کریں

ہر چند آئینہ ہوں پر اتنا ہوں نا قبول
منہ پھیر لے وہ جس کے مجھے روبرو کریں

نے گل کو ہے ثبات نہ ہم کو ہے اعتبار
کس بات پر چمن ہوس رنگ و بو کریں

ہے اپنی یہ صلاح کہ سب زاہدانِ شہر
اے دردؔ آ کے بیعتِ دستِ سبو کریں

○

سمجھنا فہم گر کچھ ہے طبیعی سے الٰہی کو
شہادت غیب کی خاطر تو حاضر ہے گواہی کو

نہیں ممکن کہ ہم سے ظلمت امکان زائل ہو
چھڑاوے آہ کوئی کیونکر زنگی سے سیاہی کو

عجب عالم ہے ادھر سے ہمیں ہستی ستاتی ہے
ادھر سے نیستی آتی ہے دوڑی عذر خواہی کو

نہ رہ جائے کہیں تو زاہدا محروم رحمت سے
گنہ گاروں میں سمجھا کریو اپنی بے گنہی کو

نہ لازم نیستی اس کو نہ ہستی ہی ضروری ہے
بیاں کیا کیجیے اے دردؔ ممکن کی تباہی کو

○

ہر طرح زمانہ کے ہاتھوں سے ستم دیدہ
گر دل ہوں تو آزردہ، خاطر ہوں تو رنجیدہ

ہم گلشنِ دوراں میں اے خفتگیٔ طالع!
سرسبز تو ہیں، لیکن جوں سبزۂ خوابیدہ

اے شورِ قیامت! رہ اودھر ہی، میں کہتا ہوں
چونکے نہ ابھی یاں سے کوئی دلِ شوریدہ

اوروں سے تو ہنستے ہو نظروں سے ملا نظریں
ایدھر کو نظر کوئی پھینکی بھی تو دزدیدہ

مجھ پر بھی تو یہ عقدہ تو کھول صبا! بارے
زلفوں نے کسے بھیجا یہ نامۂ پیچیدہ

بدخواہ بھی عالم گر ہووے تو ہو، لیکن
یارب! نہ کسی کے ہوں دشمن یہ دل و دیدہ

کرتا ہے جگہ دل میں جوں ابروئے پیوستہ
اے دردؔ یہ تیرا تو ہر مصرعِ چسپیدہ

○

ارض و سما کہاں تری وسعت کو پا سکے
میرا ہی دل ہے وہ کہ جہاں تو سما سکے

وحدت میں تیری، حرف دوئی کا نہ آ سکے
آئینہ کیا مجال تجھے منہ دکھا سکے

میں وہ فتادہ ہوں کہ بغیر از فنا مجھے
نقشِ قدم کی طرح نہ کوئی اٹھا سکے

قاصد! نہیں یہ کام ترا، اپنی راہ لے
اُس کا پیام دل کے سوا کون لا سکے

غافل! خدا کی یاد پہ مت بھول زینہار
اپنے تئیں بھلا دے اگر تو بھلا سکے

یارب! یہ کیا طلسم ہے ادراک و فہم یاں
دوڑے ہزار آپ سے باہر نہ جا سکے

گو بحث کر کے بات بٹھائی پہ کیا حصول
دل سے اُٹھا غلاف، اگر تو اُٹھا سکے

اخفائے رازِ عشق نہ ہو آبِ اشک سے
یہ آگ وہ نہیں جسے پانی بجھا سکے

مستِ شرابِ عشق وہ بے خود ہے جس کو حشر
اے دردؔ چاہے لائے بخود پھر، نہ لا سکے

○

تہمتِ چند اپنے ذمے دھر چلے
جس لیے آئے تھے ہم سو کر چلے

زندگی ہے یا کوئی طوفان ہے
ہم تو اس جینے کے ہاتھوں مر چلے

کیا ہمیں کام ان گلوں سے اے صبا!
ایک دم آئے اِدھر، اُودھر چلے

دوستو! دیکھا تماشا یاں کا بس!
تم رہو، اب ہم تو اپنے گھر چلے

آہ! بس جی مت جلا تب جانیے
جب کوئی افسوں ترا اس پر چلے

ایک میں دل ریش ہوں ویسا ہی دوست
زخم کتنوں کے سنا ہے بھر چلے

ڈھونڈھتے ہیں آپ سے اس کو پرے
شیخ صاحب چھوڑ گھر باہر چلے

ہم نہ جانے پائے باہر آپ سے
وہ ہی آڑے آگیا جیدھر چلے

ہم جہاں میں آئے تھے تنہا ولے
ساتھ اپنے اب اُسے لے کر چلے

جوں شرر اے ہستیِ بے بود یاں
بارے! ہم بھی اپنی باری بھر چلے

ساقیا! یاں لگ رہا ہے چل چلاؤ
جب تلک بس چل سکے ساغر چلے

دردؔ کچھ معلوم ہے یہ لوگ سب
کس طرف سے آئے تھے کیدھر چلے

○

سر اہلِ فنا کو نام سے ہستی کے ننگ ہے
لوحِ مزار بھی مری چھاتی پہ سنگ ہے

فارغ ہو بیٹھ فکر سے دونوں جہان کی
خطرہ جو ہے سو آئینۂ دل پہ زنگ ہے

حیرت زدہ نہیں ہے فقط تو ہی آئینہ
یاں تک ابھی جس کی آنکھ کھلی ہے سو دنگ ہے

اس ہستیِ خراب سے کیا کام تھا ہمیں
اے نشۂ ظہور! یہ تیری ترنگ ہے

گل گرچہ منہ پسار نہ تو شمع کی طرف
اس کی زبان ہی اسے کامِ نہنگ ہے

کب ہے دماغ عشقِ بتانِ فرنگ کا
مجھ کو تو اپنی ہستی ہی قیدِ فرنگ ہے

عالم سے اختیار کی ہر چند صلحِ کل
پر اپنے ساتھ مجھ کو شب و روز جنگ ہے

میں کیا کہوں تجھے نظر آتا نہیں ہے کیا
اس گلشنِ جہان کا جو کچھ کہ ڈھنگ ہے

غنچہ شگفتہ ہوتے ہی ہوتے کہ اس میں دردؔ
دیکھا چمن میں جا کے تو کچھ اور رنگ ہے

مصحفی

○

سرِ شام اس نے منہ سے جو رُخِ نقاب اٹھا
نہ غروب ہونے پایا وہیں آفتاب اٹھا

میں حسابِ بوسہ جی میں کہیں اپنے کر رہا تھا
وہ لگا مجھی سے کرنے طلب اور حساب اٹھا

مہِ چار دہ کا عالم میں دکھاؤں گا فلک کو
اگر اس نے پردہ منہ سے شبِ ماہتاب اُٹھا

جو خفا ہوا میں جی میں کسی بات پر شبِ وصل
سحر اُٹھ کے میرے آگے وہی اس نے خواب کی

بہ سوالِ بوسہ اُس نے مجھے ٹُرک کے دی جو گالی
میں ادب کے مارے اس کو نہ دیا جواب اُٹھا

میں ہوا ہوں جس پہ عاشق یہ شگرف ماجرا ہے
کہ مرے عوض لگا ہے اُسے اضطراب اٹھا

میں عجب یہ رسم دیکھی کہ بہ روزِ عیدِ قرباں
وہی ذبح بھی کرے ہے وہی لے ثواب اٹھا

نہیں جائے شکوہ اس میں ہمیں مصحفی ہمیشہ
یہ زمانے کا رہا ہے یونہی انقلاب اٹھا

○

آج کچھ سینے میں دل ہے خود بخود بے تاب سا
کر رہا ہے بے قراری پارۂ سیماب سا

جوں گلِ تر کیا ہی اُس سے جھلکے ہے اس کا بدن
وہ جو پیراہن گلے میں اُس کے ہے اک آب سا

میں ہوں اور خلوت ہے اور پیشِ نظر معشوق ہے
ہے تو بیداری پہ لیکن دیکھتا ہوں خواب سا

کل شبِ تاریک میں جونہی ہوا وہ بے نقاب
جلوہ گر رُوئے زمیں پر ہو گیا مہتاب سا

کیا کہوں حسن و لطافت جامۂ شبنم سے ہے
نکلا ہی پڑتا ہے وہ گورا بدن مہتاب سا

مصحفی کیوں لختِ دل رونے کا کھاتا ہے قسم
ہے نمایاں کچھ تو آنکھوں میں تری خوناب سا

○

سو سو طرح کا حادثہ مجھ پر گزر چکا
پر اے دل ایک روز کہیں تو نہ مر چکا

اتنا بھی خال و خط کا بنانا ہے کیا یہاں
بس رکھو آئینہ کہاں مکھڑا سنور چکا

اس ہاتھ سے یہ دل نہ تسلی ہوا دریغ
سو مرتبہ میں دل کے اُپر ہاتھ دھر چکا

اے یار وقت چہرہ خراشی و مُو کنی
کیا کیا نہ تیرے ہاتھ سے مجھ پر گزر چکا

اک سر پہ خاک ڈالنی باقی رہی ہے سو
دیکھو گے شام و صبح کہ میں وہ بھی کر چکا

کتنا ہی میں بسارہوں اُسے لیک مصحفی
نقشہ اگر یہی ہے تو جی سے بسر چکا

○

جی جائے گا رائگاں کسی کا
یوں کرتے ہیں امتحاں کسی کا

مکھڑے سے نقاب مت اُٹھاؤ
کیا فائدہ ہو زیاں کسی کا

جز آہ وہاں کوئی کرے کیا
کچھ بس نہ چلے جہاں کسی کا

آزردہ کریں ہیں اس طرح واہ
دل مفت میں یاں و میہماں کسی کا

تا فصل دگر رہا نہ ہرگز
اس باغ میں آشیاں کسی کا

دیتے نہیں مصحفی پھر اس کو
دل لیویں جو یہ بتاں کسی کا

○

ناگہ چمن میں جب وہ گُلِ اندام آ گیا
گُل کو شکستِ رنگ کا پیغام آ گیا

اُٹھا جو صبح خواب سے وہ مستِ پُر خمار
خورشید کف کے بیچ لیے جام آ گیا

افسوس ہے کہ ہم تو رہے مستِ خوابِ صبح
اور آفتابِ عمر لبِ بام آ گیا

سوچے تھا اہلِ جرم سے کس کو کروں میں قتل
اتنے میں اس کو یاد مرا نام آ گیا

بے جائے رحم حال پہ یاں اُس اسیر کے
جو گِرتے ہی ہوا سے تہِ دام آ گیا

گو میں تڑپ تڑپ کے دی حسرت میں اپنی جان
بارے ٹک ایک دل کو تو آرام آ گیا

سمجھو خدا کے واسطے پیارے بُرا نہیں
وہ دن اگر کسی کے کوئی کام آ گیا

کر قطع کب گیا ترے کوچے سے مصحفیؔ
گر صبح کو گیا، وہیں پھر شام آ گیا

○

گر اُس منہ سے برقع کبھی کھُل گیا
تو دیکھو گے مہ خاک میں رُل گیا

گیا جان سے ایک عالم میاں
ولیکن نہ تیرا تغافل گیا

رہا ہے کہاں ہم میں آرام صبر
وہ طاقت گئی وہ تحمل گیا

ہمیں دے گیا داغ جاتے ہوئے
غرض اس گلستاں سے جو گُل گیا

وہی رنگ گُل ہے وہی چہچہے
چمن سے کہاں شورِ بلبل گیا

لگی چوٹ دل کو مرے داغ سے
سحر نالہ کرتا جو بلبل گیا

میں کہتا تھا عاشق نہ ہو مصحفیؔ
تو ایسی ہی باتوں میں تو کھُل گیا

مصحفی

○

خواب تھا یا خیال تھا کیا تھا
ہجر تھا یا وصال تھا کیا تھا

میرے پہلو میں رات جا کر وہ
ماہ تھا یا ہلال تھا کیا تھا

چمکی بجلی سی پر نہ سمجھے ہم
حسن تھا یا جمال تھا کیا تھا

جس کو ہم روزِ ہجر سمجھے تھے
ماہ تھا یا وہ سال تھا کیا تھا

مصحفی شب جو چپ تو بیٹھا تھا
کیا تجھے کچھ ملال تھا کیا تھا

○

خورشید کو سائے میں زلفوں کے چھپا رکھا
چتون کو دکھا خوبی سرمے کو لگا رکھا

سویا تھا لپٹ کر میں اُس ساتھ ولے اس نے
پہلو سے مرے پہلو تا صبح جدا رکھا

کس منہ سے اجل کو اب منہ اپنا دکھا دیں گے
ہم میں تری اُلفت نے کہہ تو ہی کہ کیا رکھا

قاصد جو گیا میرا لے نامہ تو پھر اس نے
نامے کے کیے پرزے قاصد کو بٹھا رکھا

کس لب کے تبسم نے چھڑکا تھا نمک اُن پر
زخموں کے الم نے شب تا صبح مزا رکھا

کیا جانیے کب کا تھا یہ میرا فلک دشمن
جو اس بر تاباں کو نت مجھ سے جدا رکھا

اے مصحفی میں کس کی رفتار کا کشتہ تھا
ہر شعر میں میں نے جو انداز نیا رکھا

مصحفی　　　نقوش ——— ۱۴۱ ——— غزل نمبر

○

ہے یہ عشق آفت و بلا تو نہیں
اس کا مارا کوئی جیا تو نہیں

دل کی تڑپوں میں آن نکلے ہے
دیکھیو کشتۂ ادا تو نہیں

پوچھتا کیا ہے حال دل کا مرے
او میاں تجھ سے کچھ چھپا تو نہیں

یعنی عاشق ہوا اور مر جائے
اب تلک ہم نے یہ سنا تو نہیں

بات پر اس کی میں جو کل بولا
کہا کچھ ذکر آپ کا تو نہیں

○

ہے ماہ کہ آفتاب کیا ہے
دیکھو تو تہ نقاب کیا
میں نے تجھے تو نے مجھ کو دیکھا
اب مجھ سے تجھے حجاب کیا
آئے ہو تو کوئی دم تو بیٹھو
اے قبلہ یہ اضطراب کیا
اُس بن ہمیں جاگتے ہی گزری
جانا نہ یہی کہ خواب کیا
مجکو بھی گنے وہ عاشقوں میں
اس بات کا سو حساب کیا
اس میکدۂ جہاں میں یارو
مجھ سا بھی کوئی خراب کیا
قسمت میں ہمارے مصحفی ہائے
کیا جانے ثواب عذاب کیا ہے

۲۱۵۷۹

میر حسنؔ

○

عشق کا راز گر نہ کھل جاتا
اس قدر تو نہ ہم سے شرماتا

آ کے تب بیٹھتا ہے وہ ہم پاس
آپ میں جب ہمیں نہیں پاتا

زندگی نے وفا نہ کی ورنہ
میں تماشا وفا کا دکھلاتا

مر گئے ہم تو کہتے کہتے حال
کچھ تو تو بھی زباں سے فرماتا

سب یہ باتیں ہیں چاہ کی ورنہ
اس قدر تو نہ ہم پہ جھنجھلاتا

میں نہ سنتا کسی کی بات حسنؔ
دل جو باتیں نہ مجھ کو سنواتا

○

جاتا تھا اس کے کھوج میں، میں بے خبر
بارے اسی نے ٹک کے پوچھا، کدھر

جس اشتیاق سے کہ میں آتا ہوں تیرے پا
کیا ہو، جو آوے تو بھی یوں ہی بے خبر چ

غیروں میں اس نے منہ تو چھپایا تھا مجھ
پر میں بھی اس کی چھیڑ سے منہ ڈھانپ کر چ

کس میں رکھوں گا اب مئے حسرت کو میں
شیشہ تو دل کا خونِ جگر ہی سے بھر چ

لکھنے کی یاں نہ تاب، نہ پڑھنے کا واں
کہہ دیں گے کچھ زبانی، اگر نامہ بر چ

قتیل
کچھ رات غیر کی جو کہیں نکلی اس سے با
سن سن کے میں خفا ہو، وہیں رو کے ڈر
غصے میں دیکھ مجھ کو لگا کہنے : اور
اک بات بس کہی نہ کہی، یہ تو مر چ
اب کوئی آوے یا کہ نہ آوے حسنؔ کو
بے چارہ اپنی جان سے آپ ہی گ

○

غم خانۂ دل عیش کا گھر ہووے گا یارب
آباد کبھی یہ بھی نگر ہووے گا یارب!

جب دیکھوں ہوں اس کو تو یہ آتا ہے مجھے رشک
کس کس کا یہ منظورِ نظر ہووے گا یارب!

بگڑی تو ہے غیروں سے اور اب ہم سے ولیکن
کیا جانیے! وہ شوخ کدھر ہووے گا یارب

جان و دل و دیں کھوئے اک اس کی نظر پر
ایسا بھی کوئی اور بشر ہووے گا یارب!

رونے سے مرے سنگ تلک ہو گئے پانی
دل میں کبھی اس کے بھی اثر ہووے گا یارب

داغوں کو ترے عشق کے جو رکھے تر و تازہ
یہ میرے سوا کس کا جگر ہووے گا یارب!

روتے ہی گزرتی ہے شب و روز حسن کو
اور اس سے تو کیا حال بتر ہووے گا یارب

○

دل غم سے ترے لگا گئے ہم
کس آگ سے گھر جلا گئے ہم

ماتم کدۂ جہاں میں جوں شمع
رو رو کے جگر بہا گئے ہم

مانندِ حباب اس جہاں میں
کیا آئے تھے اور کیا گئے ہم

کھویا گیا اس میں گو دل اپنا
پر یار! تجھے تو پا گئے ہم

تھا ہم میں اور اس میں وہ جو پردہ
سو اس کو حسن اٹھا گئے ہم

○

اس کی جب بزم سے ہم ہو کے تنگ آتے ہیں
اپنے ساتھ آپ ہی کرتے ہوئے جنگ آتے ہیں

حسن میں جب تپش گرمی نہ ہو، ہی دیوے کون
شمع تصویر کے کب گرد پتنگ آتے ہیں!

دل کو بس بوقلموں جلوہ نے ہے خوں کیا
اشک آنکھوں سے جو یہ رنگ برنگ آتے ہیں

آہ تعلیم کر اٹھتی ہے مرے سینے سے
دل پہ جب اس کی نگاہوں کے خدنگ آتے ہیں

شرط گر پوچھو، تو ہے اس میں بھی قسمت ورنہ
عاشقی کرنے کے ہر ایک کو ڈھنگ آتے ہیں

حیرت افزا ہے عجب کوچۂ دلدار حسنؔ!
جو وہاں جاتے ہیں اس طرح سے دنگ آتے ہیں

○

ہم نہ نکہت ہیں، نہ گل ہیں، جو مہکتے جاویں
آگ کی طرح جدھر جاویں، دہکتے جاویں

اے خوشا مستی! کہ تابوت کے آگے جس کے
آب پاشی کے بدل مے کو چھڑکتے جاویں

جو کوئی آوے ہے نزدیک ہی بیٹھے ہے ترے
ہم کہاں تک ترے پہلو سے سرکتے جاویں

غیر کو راہ ہو گھر میں ترے سبحان اللہ!
اور ہم دور سے در کو ترے تکتے جاویں

وقت اب وہ ہے کہ ایک ایک حسنؔ ہو کے تنگ
صبر و تاب و خرد و ہوش کھسکتے جاویں

○

مجھ کو عاشق کہہ کے اُس کے روبرو مت کیجیو!
دوستاں! گر دوست ہو، تو یہ کبھو مت کیجیو!

جس ادا کا کشتہ ہوں میں وہ رہے میرے ہی ساتھ
اس ادا کو مبتذل اے خوب رُو مت کیجیو!

وقتِ رخصت دل نے اتنا ہی کہا رو کر کہ بس
اب پھر آنے کی مرے تو آرزو مت کیجیو!

میں تو یوں ہی تم سے دیوانہ سا بکتا ہوں کہیں
اس کے آگے دوستاں! یہ گفتگو مت کیجیو!

زلف کے کوچے سے ہو گلشن میں گزرے ہے صبا
آج واں جا کر گلوں کو کوئی بو مت کیجیو!

کل کے جھگڑے میں بھلا ہے کس کے یارو! حق بطرف؟
واجبی جو ہو، سو کہیو! میری رُو مت کیجیو!

واں حسنؔ ہرگز نہیں ہے ڈھیل پھر جانے میں کچھ
آشنائی پر بھروسا اس کی تو مت کیجیو!

○

ہمدم! نہ پوچھ مجھ سے؟ غرض اک بلا ہے وہ
جو روبرو ہو اس کے سو جانے کہ کیا ہے وہ

بیگانہ وار بھی نہ ملا ہم سے وہ کبھی
ہم سادہ دل یہ جانتے تھے، آشنا ہے وہ

ہجراں تو ہے، پہ یہ نہیں معلوم کچھ ہمیں
ہم آپ سے جُدا ہیں کہ ہم سے جُدا ہے وہ

پھر پھر کے پوچھتے ہو عبث آرزوئے دل
تم جانتے تو ہو کہ مرا مدعا ہے وہ

میں نے تو بات بھی نہیں کی اس سے ہم نشیں!
اک یہ بھی چوچلا ہے کہ ناحق خفا ہے وہ

معذور رکھ حسنؔ کو جو بے طاقتی کرے
عاشق ہے، دردمند ہے اور مبتلا ہے وہ

○

سیر ہے تجھ سے مری جان! جدھر کو چلیے
تو ہی گر ساتھ نہ ہووے، تو کدھر کو چلیے

خواہ کعبہ ہو کہ بت خانہ غرض ہم سے سُن
جس طرف دل کی طبیعت ہو، اُدھر کو چلیے

زلف تک رخ سے نگہ جاوے نہ اک دن کے سوا
شام کو پہنچیے منزل، جو سحر کو چلیے

جب میں چلتا ہوں ترے کوچے سے کترا کے کبھی
دل مجھے پھیر کے کہتا ہے: ادھر کو چلیے

ان دنوں رات اسی فکر میں کٹتی ہے حسن
صبح کب ہووے کہ پھر یار کے گھر کو چلیے

○

دل بر سے ہم اپنے جب ملیں گے
اس گم شدہ دل سے تب ملیں گے

یہ کس کو خبر ہے اب کے بچھڑے
کیا جانیے! اس سے کب ملیں گے

دنیا ہے، سنبھل کے دل لگانا
یاں لوگ عجب عجب ملیں گے

ظاہر میں تو ڈھب نہیں ہے کوئی
ہم یار سے کس سبب ملیں گے

آرام حسن تبھی تو ہوگا،
اس لب سے جب اپنے لب ملیں گے

جرأت

○

ہمیں دیکھے سے وہ جیتا تھا اور ہم اس پہ مرتے تھے
یہی راتیں تھیں اور باتیں تھیں وہ دن کیا گزرتے تھے

وہ سوزِ دل سے بھر لاتا تھا اشکِ سرخ آنکھوں میں
اگر ہم جی کی بے چینی سے آہِ سرد بھرتے تھے

بیاں ہم وصل میں کرتے جو دردِ ہجر سے مرنا
تو وہ کہتا خدا شاہد ہے اس کا ہم بھی مرتے تھے

کسی دھڑکے سے روتے تھے جو باہم وصل کی شب کو
وہ ہم کو منع کرتا تھا ہم اس کو منع کرتے تھے

ملی رہتی تھیں نظریں غلبۂ اُلفت سے آپس میں
نہ خوف اوس کو کسی کا تھا نہ ہم لوگوں سے ڈرتے تھے

سو اب صد حیف اوس خورشید رُو کے ہجر میں جرأت
یہیں راتیں ہیں اور باتیں ہیں وہ دن کیا گزرتے تھے

○

سنا ہے وہ خدا نا کردہ ہے بیمار کیا کیجے
عیادت کو بھی جانا ہے ہمیں دشوار کیا کیجے

خیال اوس کی جو بیخوابی کا گذرے ہے تو ہم شب کو
لگا کے چھت سے آنکھیں رہتے ہیں بیدار کیا کیجے

کسی کو بھیج بھی سکتے نہیں احوال پرسی کو
مگر یہ چھپکے چھپکے کہتے ہیں ہر بار کیا کیجے

کفِ افسوس ملتے ہیں کہ جرأت ہم نہیں اس جا
نہیں تلوے تو سہلاتے گھڑی دو چار کیا کیجے

○

یک تو یہ ہے بے جگہ ربط ان دنوں پیدا کیا
پھر یہ ہے یہ وہم ہی ہم کو کہ ہم نے کیا کیا

وہ گیا اُٹھ کر جدھر کو میں اِدھر حیران سا
اوس کے جانے پر بھی کتنی دیر تک دیکھا کیا

میری اور اوس شوخ کی صاحب سلامت جوں ہوئی
صبر و طاقت نے کہا لو ہم نے تو مجرا کیا

دمبدم حسرت سے دیکھوں کیوں نہ سوئے چرخ میں
اس نے اوروں کا کیا اوس کو ہمیں جس کا کیا

مل گئے تھے ایک بار اوس کے جو میرے لب سے لب
عمر بھر ہونٹوں پہ اپنے میں زباں پھیرا کیا

جب تلک کرتے رہے مذکور اوس کا مجھ سے لوگ
جی ہی میں کچھ سوچا کیا میں اور دل دھڑکا کیا

دل ملے پر بھی ملاپ ایسی جگہ ہوتی رہی
ہم ادھر تڑپا کئے اور وہ ادھر تڑپا کیا

سوزشِ دل کیا کہوں میں جب تلک جیتا رہا
ایک انگارا سا پہلو میں میرے دہکا کیا

○

خیالِ وصل میں اوس کے عجب باتیں بناتا ہوں — مگر بیٹھا ہے وہ گویا اور اوس کو میں مناتا ہوں
گلی میں اوس کی جب جاتا ہوں جوں ہی اک نہ اک چرچا — پھر ایسا ہی میں سُن آتا ہوں کہ بس اُن سے میں سُن آتا ہوں
گلے لگتا نہیں گر عیدِ قرباں کو بھی تو میرے — تو لے خنجر ہی کو اپنے گلے سے میں لگاتا ہوں
تماشا ہے کہ ہے مدہوش وہ تو نشۂ مے سے — پھر اس محفل سے میں اٹھتے ہوئے کیوں لڑکھڑاتا ہوں
کہے سے کس کے رنجیدہ ہوئے ایسے یہ بندے سے — ذرا سمجھو تو صاحب میں تو آپ ہی کا کہاتا ہوں
کہے گر کوئی وہ ناگن نہیں پر دل کو ڈستی ہے — تو اوس کی زلف کی میں یہ پہیلی بوجھ جاتا ہوں
کہوں کیا دردِ ہجراں سے مری کیا شکل ہے جرأت — کسی صورت نہیں آرام کیا ایذا اُٹھاتا ہوں
کبھی جو یاد آتا ہے وہ ہنسنا بولنا اُس کا — تو پھر رو رو کے دریا اپنی آنکھوں سے بہاتا ہوں
کبھی اوس کا جو بلوانا وہ مجھ کو یاد آتا ہے — تو بیٹھے بیٹھے کیا جانوں کہ کیدھر کو چلا جاتا ہوں
کبھی گھبرا کے سر اپنا پٹکتا ہوں میں پائیں سے — کبھی بستر پہ بیتابی کے مارے تلملاتا ہوں
کبھی آواز اوس کی سی جو آ جاتی ہے کانوں میں — تو دل پر ہاتھ رکھ کر دھیان اودھر کو لگاتا ہوں
پھر اوس میں گر تسلی کو کوئی پاس آن بیٹھے ہے — تو مطلع پڑھ کے یہ روتا ہوں اور اوس کو رُلاتا ہوں

قرار اوس شعلہ رُو کے ہجر میں کیا خاک پاتا ہوں
نظر آتی ہے اک آتش جدھر کو آنکھ اُٹھاتا ہوں

○

ذرا ہم اس سے لگ چلنے کے سو سو ڈھب لگاتے ہیں
رسائی جو نہیں پاتے تو کیا کیا تلملاتے ہیں

غضب یہ ہے کہ واں جاتے ہیں تو خالی پھر آتے ہیں
اگر جاتے نہیں تو جی ہی سے ہم اپنے جاتے ہیں

مل رہتی تھیں جو نظروں سے نظریں سو کہاں اب تو
کبھی ہم اتفاقاً اک جھلک سی دیکھ پاتے ہیں

نظر آتا ہے باہم اب جو وصل و ہجر کا عالم
کبھی روتے ہیں آپ اپنے پہ اور گہ مسکراتے ہیں

خدا شاہد ہے دو ہی جان میں بس جان آتی ہے
کبھی صاحب جو آواز اپنے بندے کو سناتے ہیں

غرض یہ آتش دل اور بھی بھڑکے ہے نالے سے
لگی کو گرچہ اشکِ چشم تستا ہی بجھاتے ہیں

برنگِ موج جب بیتاب ہوتا ہے یہ دل بر میں
تو ہم رو رو کے دریا اپنی آنکھوں سے بہاتے ہیں

قلق گزرے ہے یہ دل پر کہ بس میں مرنے لگتا ہوں
دکھانے میں جو صورت آپ کچھ عرصہ لگاتے ہیں

مناسب گرچہ جانا بار بار اُس جا نہیں جرأت
مگر کیا کیجے بیتابی سے ہم لاچار جاتے ہیں

○

ہے غضب اپنی طبیعت اوس پہ ہے آئی ہوئی
جس پہ پڑتی ہے نگہ ہر اک کی للچائی ہوئی

یاد آجاتی ہے تو روتا ہوں کیا منہ ڈھانپ ڈھانپ
بھولی بھولی صورت اور وہ آنکھ شرمائی ہوئی

چھاؤنی برسات میں چھائی کہاں جلد آؤ جی
جی گھٹاتی ہے ہمارا یہ گھٹا چھائی ہوئی

کون رخصت ہو کے یہ ہم سے گیا یا رب جو آہ
صبر نے مجرا کیا رخصت شکیبائی ہوئی

شب تصور میں کسی مہرو کی آنکھوں کے حضور
چار سو اک نور کی چادر سی پھیلائی ہوئی

ناتواں دیکھا جو مجھ کو تو یہ ہنس کر بول اُٹھے
بارے اب تو کچھ بہت ان میں توانائی ہوئی

سامنے میرے جو منہ کر کے نہیں تم بیٹھتے
کیا کسی کے سامنے ہے یہ قسم کھائی ہوئی

پر یہ حیرت ہے مجھے اُس پر نہ تم ٹھہرے رہے
بات جو مدت سے ہے آپس میں ٹھہرائی ہوئی

خیر تو ہے اے دلِ وحشت زدہ یہ کیا ہوا
یوں جو قسمت میں مری یہ دشت پیمائی ہوئی

پا برہنہ، مو پریشاں، آہ بر لب، رنگ زرد
دست بر سینہ ہے اور صورت سے گھبرائی ہوئی

دوڑ دوڑ آنے سے جرأت کے رکاوٹ کیا گئے
اس بچارے کی طبیعت تم پہ ہے آئی ہوئی

○

بیٹھا دے محفل میں تنک لطف اٹھانے دے مجھے
اے ترے پاؤں پڑوں ہاتھ لگانے دے مجھے

سرگذشت آتے ہی کیا پوچھے ہے اے [illegible]
سب سناؤں گا تجھے آپ میں آنے دے مجھے

اب تو دم رکنے لگا ضبطِ محبت سے ہے
ایک دو اشک تو آنکھوں سے بہانے دے مجھے

مجھ سے پوچھے ہے بگڑ کر وہ حقیقت میری
کچھ تو اے بے خبری بات بنانے دے مجھے

کھلکھلا ہنسنے سے بات نہ کھل جائے کہیں
حیرتِ حسن پلک تک تو ہلانے دے مجھے

آہ مل جس کا ملا ہوئے نہ دل سے میرے
لب سے پھر اپنے وہ لب کیونکہ ملانے دے مجھے

اور بھی مار لگتے اسے کیا لگتا ہے
جو کہ زخموں پہ نہ مرہم بھی لگانے دے مجھے

انگلیاں پاؤں کی اپنے وہ دبانے دے ہے
کچھ تو اے پاسِ ادب ہاتھ بڑھانے دے مجھے

غیر پاس اس کے نہ دم بیٹھنے جی میں دلا
ضبط کر ضبط و رو ضبط بٹھانے دے مجھے

نہ رہا وہ بھی مزہ ہائے فلک وہ عدو
کہ نہ رنجش کا بھی کچھ لطف اٹھانے دے مجھے

اپنا منت سے بٹھانا وہ اور اس کا یہ کہنا
پھر نہیں تنے کا یاں میں نہیں جانے دے مجھے

تو بھی پھر پوچھیو جرأت سبب حیرانی
پہلے آئینہ ذرا اس کو دکھانے دے مجھے

○

جب یہ سنتے ہیں کہ ہمسائے ہیں آپ آئے ہوئے
کیا در و بام پہ ہم پھرتے ہیں گھبرائے ہوئے

آپ سے میں تو نہ جاتا پہ کروں کیا کہ کہیں
دل لیتا ہے لئے جائے ہے دوڑائے ہوئے

گھر میں بے یار ہے مشکل اپنی یہ دل کے ہمراہ
دو گنہگار رہیں جوں قید میں بٹھلائے ہوئے

آئے تم دست بہ قبضہ ہو تو پھر دیر ہے کیا
سرِ تسلیم کو ہم بیٹھے ہیں نہوڑائے ہوئے

آج بھی اس کے جو آنے کی نہ ٹھہری تو بس آہ
ہم وہ کر بیٹھیں گے جو دل میں ہیں ٹھہرائے ہوئے

پیرہن چاک ترے در پہ جو کل کرتا تھا
آج لوگ اس کو لئے جاتے ہیں کفنائے ہوئے

مردنی پھر گئی منہ پر مرے جن کی خاطر
رنگ دیکھا وہ وہی پھرتے ہیں چمکائے ہوئے

ابرِ تصویر کے مانند ہم اس محفل میں
رو نہیں سکتے ہیں اشک آنکھوں میں ہیں لائے ہوئے

لوگ گر ہم سے یہ کہتے ہیں کہ چلتے ہو جی واں
اپنے بیگانے سب اس بزم میں ہیں آئے ہوئے

دل میں ہم سوچ کے اس بات کو رو دیتے ہیں
کیا کہیں ان سے کہ ہیں ہم تو نکلوائے ہوئے

کر کے موزوں اونہیں جرأت غزل اک اور بھی پڑھ
دل میں جو تازہ مضامیں ہیں ٹھہرائے ہوئے

○

نہ تنہا دل خرامِ ناز پر ہر آن لوٹے ہے
ترا دامن بھی قدموں پر ترے اے جان لوٹے ہے

گیا ہے چھوڑ کر تو جس کو اے آبادیٔ عالم
وہ مضطر کیا درونِ خانۂ ویران لوٹے ہے

کرے ہے چاندنی کی سیر جب وہ مہ جبیں تو پھر
تو کیا کیا موج پر عکسِ مہِ تابان لوٹے ہے

دیا یہ خانۂ قاتل میں کس بے چین کو جانے
جو در پر نیم بسمل سا پڑا دربان لوٹے ہے

گرے ہے جب کہ تیرے مضطرب کی چشم سے آنسو
تو کیا کیا خاک پر جوں گوہرِ غلطان لوٹے ہے

چھپاتا ہے گلِ نرگس سے تو جو اپنے مکھڑے کو
تری اس بات پر کیا کیا ترا حیران لوٹے ہے

سرود اب طرفہ اوس مطرب بچے کا رقص لاتا ہے
کہ ہر اک پیکلی سے اوس کی سن کر تان لوٹے ہے

خفا مجھ سے نہ ہو گر لوٹ جاؤں تیرے قدموں پر
کروں میں کیا کہ تجھ پر دل مرا اے جان لوٹے ہے

کرے گا کام آخر اب وہ پاجامہ تمامی کا
کہ اک بجلی سی چلنے میں تہِ دامان لوٹے ہے

تصور میں جو بل کھائے ہے زلف اوس کی ہے بلا
تو اک چھاتی پہ اس کی سانپ سا ہر آن لوٹے ہے

اودا آملہ جو سوتا یاد با ہم بستر گل پر
کہ ساری رات انگاروں پہ دے دے جان لوٹے ہے

کیے اشعار جتابی کے تو نے ایسے اے جرأت
کہ پڑھ کر ہر سخنداں اب ترا دیوان لوٹے ہے

○

دل میں کیا کیا آئے ہے بات اور کیا کیا جائے ہے
کان میں آواز اوس کی سی جوں ہی آ جائے ہے

بسترِ اندوہ پر جب یاد آتے ہیں وہ عیش
پھر نہ لیٹا جائے ہے مجھ سے نہ بیٹھا جائے ہے

بزم میں آنکھوں تلے پھر جائے ہے جب اوس کی شکل
آنکھ بھر کر پھر کسو سے کس کو دیکھا جائے ہے

چھیڑنے کو مجھ سے یہ آزردہ وہ ہوتا نہیں
وقتِ رنجش تو بھلا کیوں مسکرا تا جائے ہے

کیا ہجومِ بدگمانی گھیر لیتا ہے مجھے
جب یہ سنتا ہوں کہیں گھر سے وہ تنہا جائے ہے

بس دلِ عشاق پر بجلی سی پڑ جاتی ہے آہ
جب سمندِ ناز کو اپنے وہ چمکا جائے ہے

دیکھ کر تصویر اوس کی ہو گئے تصویر ہیں
اب نہ دست و پا ہی ہلتے ہیں نہ بولا جائے ہے

بیٹھے یاں مت سچ بناؤ تو بجز عاشق کی تم
زندگی کا اوس کی واں نقشہ تو بگڑا جائے ہے

لے گیا اک راہ چلتا دین و دل صبر و قرار
اب وہ یاد آتا ہے تو بس جی ہی نکلا جائے ہے

کیا کہوں اے ہم نشیں اپنی تو وہ حالت ہوئی
جوں کسی کا قافلہ رستہ میں لوٹا جائے ہے

اشک خونی دیکھ چہرے پر مرے بولا وہ شوخ
دن بدن رنگ اب تو جرأت کا چمکتا جائے ہے

انشاء

○

اے عشق! مجھے شاہدِ اصلی کو دکھا لا
قم! خذ بیدی وفقک اللہ تعالیٰ

ہے تجھ کو جنوں کی قسم اے جذبِ محبت
اس نورِ تجلّی کی جھلک مجھ کو دکھا لا

سوجھے ہے مجھے عالمِ اطلاق کی منزل
الفت نے جو تقیید کے جھگڑے سے نکالا

ہر چند کہ عاصی ہوں پہ اُمّت میں ہوں اس کی
جس کا ہے قدم عرشِ معلّیٰ سے بھی بالا

مولائے جہاں، رہبرِ عشّاق، محمدؐ
صد عقدۂ مشکل کا ہے کھولنے والا

○

جگر کی آگ بجھے جس سے، جلد وہ شے لا
لگا کے برف میں ساقی صراحیٔ مے لا

قدم کو ہاتھ لگاتا ہوں، اُٹھ کہیں گھر چل
خدا کے واسطے! اتنے تو پاؤں مت پھیلا

نکل کے وادیٔ وحشت سے دیکھ اے مجنوں!
کہ زور دھوم سے آتا ہے ناقۂ لیلیٰ!

گرا جو ہاتھ سے فرہاد کے کہیں تیشہ
درونِ کوہ سے نکلی صدائے واویلا

نزاکت اس کے یہ مکھڑے کی دیکھ اے انشاؔ
نسیمِ صبح جو چھو جائے، رنگ ہو میلا

○

اچھا جو خفا ہم سے ہو تم اے صنم اچھا
لو ہم بھی نہ بولیں گے خدا کی قسم اچھا

مشغول کیا چاہیئے اس دل کو کسی طور
لے لیویں گے ڈھونڈھ اور کوئی یار ہم اچھا

گرمی نے کچھ آگ اور ہی سینے میں لگا دی
ہر طور غرض آپ سے ملنا ہے کم اچھا

اغیار سے کرتے ہو مرے سامنے باتیں
مجھ پر یہ لگے کرنے نیا تم ستم اچھا

کہہ کر گئے: آتا ہوں کوئی دم میں میں تم پاس
پھر دے چلے کل کی سی طرح مجھ کو دم اچھا

اس ہستیٔ موہوم سے میں تنگ ہوں انشا
واللہ کہ اس سے بمراتب عدم اچھا

○

اے آتشِ فراق! مرا جلبے سوزِ داغ
جھلکے ہے دل میں دور سے جوں دیر کا چراغ

آنکھوں میں تا کہ نشۂ وحدت کا ہو طلوع
ساقی! مئے مغانہ سے بھر دے مرا ایاغ

بیٹھا ہے آج مجلسِ زنداں میں شیخ یوں
طوطی کے پاس جیسے کوئی ہم قفس ہو زاغ

پیدا لگاوٹ آہ کسی ساتھ کیجیے
لیکن دل و دماغ کہاں کس کو یہ فراغ

پہنچوں میں کس کی کنہ حقیقت کو آج تک
انشا مجھے ملا نہیں اپنا ہی کچھ سراغ

○

ل مجھ سے لے پری! تجھے انسان کی قسم
دیتا ہوں تجھ کو تختِ سلیمانؑ کی قسم!

کرّوبیاں کی تجھ کو قسم اور عرش کی
جبریلؑ کی قسم! تجھے رضوان کی قسم!

طوبیٰ کی، سلسبیل کی، کوثر کے جام کی
حور و قصور و جنّت و غلمان کی قسم!

روح القدس کی تجھ کو قسم اور مسیحؑ کی
مریمؑ کی تجھ کو عفّتِ داماں کی قسم!

تجھ کو محمدِ عربیؐ کی قسم ہے اور
مولا علیؑ ولی، شہِ خراسان کی قسم!

توریت کی قسم! قسم انجیل کی تجھے
تجھ کو قسم زبور کی، فرقان کی قسم!

ملّت میں جس کی تو ہے، اسی کی قسم تجھے
اور اپنے دین و مذہب و ایمان کی قسم!

دامن کو میرے ہاتھ سے زنہار مت جھٹک
تجھ کو سحر کے چاکِ گریبان کی قسم!

مدّت سے تیرے چاہِ ذقن میں غریق ہوں
باللہ! تجھ کو یوسفِ کنعان کی قسم!

قیدی ہوں میں ترا، بہ خداوندیٔ خدا
اور اس عزیزِ مصر کے زندان کی قسم!

موسیٰ کی ہے تجھے قسم اور کوہِ طور کی
نور و فروغ و جلوۂ لمعان کی قسم!

سوگند اب ہنسی کی تجھے کچھ دلانیے
سن تجھ کو اپنے ناز کی اور آن کی قسم!

تجھ کو قسم ہے غنچۂ زنبق کی، تاک کی
اور شورِ عندلیبِ غزلخوان کی قسم!

سونے کی کانٹے کی قسم اور زرد نیل کی
فرعون کی قسم تجھے، ہامان کی قسم!

بستر مرا ہے خارِ مغیلانِ بیابانِ قیس
لیلیٰ کی ہے تجھے، صفِ مژگان کی قسم!

ایسی بڑی قسم بھی نہ مانے، تو ہے تجھے
مجنوں کے قبلہ گاہ، ابوالجان کی قسم!

کرنے میں باغ کے جو وہ رہتا ہے سا کہ دیشت
تجھ کو اسی کی شوکتِ ذی شان کی قسم!

دیوِ سفید کی قسم اور کوہِ قاف کی
باغِ ارم کی اور پرستان کی قسم!

لونا چماری کی قسم اور ہواپیر کی
کالی بلا کی، غولِ بیابان کی قسم!

قسمیں تو ساری ہو چکیں، باقی رہی ہے ایک
پیپل تلے کے بھتنے کی، شیطان کی قسم!

ہاں پھر تو کہیو، ہائے وہ کس طرح ہو غضب
انشاؔ نہ چھیڑ! تجھ کو مری جان کی قسم!

○

دھوم اتنی ترے دیوانے مچا سکتے ہیں
کہ ابھی عرش کو چاہیں تو ہلا سکتے ہیں

مجھ سے اغیار کوئی آنکھ ملا سکتے ہیں
منہ تو دیکھو وہ مرے سامنے آ سکتے ہیں

حضرتِ دل تو بگاڑ آئے ہیں اس سے لیکن
اب بھی ہم چاہیں تو پھر بات بنا سکتے ہیں

شیخی اتنی نہ کر اے شیخ! کہ رندانِ جہاں
انگلیوں پر تجھے چاہیں، تو نچا سکتے ہیں

تو گروہِ فقرا کو نہ سمجھ بے جبروت
ذاتِ مولا میں یہی لوگ سما سکتے ہیں

چارہ گر اپنے تو مصروف بہ دل ہیں لیکن
کوئی تقدیر کے لکھے کو مٹا سکتے ہیں

O

چمن صبا اُڑ جائیں اور تیری بہاریں لوٹ جائیں
تجھ کو جو گھوریں الٰہی ان کے دیدے پھوٹ جائیں

اس سے کیا کوئی برآمد ہو ذرا سی بات پر
آگ ہی ہو کر اٹھیں اور اپنے ماتھے کوٹ جائیں

دور بلا جو دل پہ اترے ہم بلا "مشہور ہے
کاش یہ جو ہوتی ہو جلدی ہو بلا سے چھوٹ جائیں

بزمِ خوباں میں نہ انشا ایک سے آنکھیں لڑا
خاطریں نازک بہت ان کی ہیں شاید ٹوٹ جائیں

O

کمر باندھے ہوئے چلنے کو یاں سب یار بیٹھے ہیں
بہت آگے گئے باقی جو ہیں تیار بیٹھے ہیں

نہ چھیڑ اے نکہتِ بادِ بہاری راہ لگ اپنی
تجھے اٹکھیلیاں سوجھی ہیں ہم بیزار بیٹھے ہیں

تصور عرش پر ہے اور سر ہے پائے ساقی پر
غرض کچھ اور دھن میں اس گھڑی مے خوار بیٹھے ہیں

بسانِ نقشِ پائے رہرواں کوئے تمنا میں
نہیں اُٹھنے کی طاقت کیا کریں لاچار بیٹھے ہیں

یہ اپنی چال ہے افتادگی سے اب کہ پہروں تک
نظر آیا جہاں پر سایۂ دیوار، بیٹھے ہیں

کہاں صبر و تحمل، آہ ننگ و نام کیا شے ہے
یہاں رو پیٹ کر ان سب کو ہم یکبار بیٹھے ہیں

نجیبوں کا عجب کچھ حال ہے اس دور میں یارو
جہاں پوچھو یہی کہتے ہیں ہم بیکار بیٹھے ہیں

بھلا گردش فلک کی چین دیتی ہے کسے انشا
غنیمت ہے کہ ہم صورت یہاں دو چار بیٹھے ہیں

○

دست آتا ہے دل کو تھام تو لو
بولیو مت ابھی سلام تو لو

کون کہتا ہے بولو مت بولو
ہاتھ سے میرے ایک جام تو لو

انھیں باتوں پہ دلّت ہے ہماری لیکن
گالی پھر مجھ سے کیجے سید انشا کا نام تو لو

یک نگہ پہ بکے ہے انشا آج
مفت میں مول اک غلام تو لو

○

چھیڑنے کا تو مزہ جب ہے کہو اور سنو
بات میں تم تو خفا ہو گئے لو اور سنو

تم کہو گے جسے کچھ کیوں نہ کہے گا تم کو
چھوڑ دیوے گا بھلا دیکھو تو لو اور سنو

یہی انصاف ہے کچھ سوچو تو دل میں اپنے
تم تو سو کہہ لو مری ایک نہ سنو اور سنو

آپ ہی آپ سے کچھ چھیڑ لیا کر پھر آپ ہی
آپ ہی بات میں پھر روٹھ کے اٹھو اور سنو

آخریا تم پہ یہ کیا چاہیے انشا کی قسمیں
دیکھ دو تا کہ یہیں بیٹھے لگو اور سنو

بات میری نہیں سنتے ہو اکیلے چل گئے
ایسے ہی ہو صاحب سنا لوگ سنو اور سنو

نظیر اکبر آبادی

○

ملا آج وہ مجھ کو چنچل چھبیلا
ہوا رنگ سن کر کہ قیسبوں کا رنگیلا

لیا جس نے مجھ سے عداوت کا پنجہ
سلقنی علیم عذاباً ثقیلا!

نکل اس کی زلفوں کے کوچے سے اے دل
تو پڑھنا: قُتم اقتیلا قتیلا

گلستاں میں پہنچیں مگر آہ کا دم
فکانت جبالاً کثیباً مہیلا

نظیر اس کے فضل و کرم پر نظر کر!
فقل حسبی اللہ نعم الوکیلا

○

نظر پڑا اک بُت پری وش، نرالی سج دھج، نئی ادا کا
جو عمر دیکھو، تو دس برس کی، پہ قہر آفت، غضب خدا کا

جو شکل دیکھو، تو بھولی بھولی جو باتیں سنیے، تو میٹھی میٹھی
پہ دل وہ پتھر کہ سر اڑا دے، جو نام لیجے کبھی وفا کا

جو گھر سے نکلے تو یہ قیامت کہ چلتے چلتے قدم قدم پر
کسی کو ٹھوکر، کسی کو جھڑکی، کسی کو گالی، نپٹ لڑاکا

یہ راہ چلنے میں چلبلاہٹ کہ دل کہیں ہے، نظر کہیں ہے
کہاں کا اونچا، کہاں کا نیچا، خیال کس کو، قدم کی جا کا

دکھا دے آنکھیں وہ بے حجابی کہ پھر پلک سے پلک نہ مارے
نظر جو نیچی کرے، تو گویا کھلا سراپا چمن حیا کا

یہ چنچلاہٹ، یہ چلبلاہٹ، خبر نہ سر کی، نہ تن کی سُدھ بُدھ
جو چیرا بکھرا، بلا سے بکھرا، نہ بند باندھا کبھو قبا کا

گلے لپٹنے میں یہ شتابی کہ شکل بجلی کے اضطرابی
کہیں جو چمکا، چمک چمک کر، کہیں جو لپکا، تو پھر چھپا کا

نہ وہ سنبھالا کسی کے سنبھلے، نہ وہ منایا منے کسی کے
جو قتل عاشق پہ آ کے مچلے، تو خیر کا پھر نہ آشنا کا

نظیر ہٹ جا، پرے سرک جا، بدل لے صورت، چھپا لے منہ کو
جو دیکھ لیوے گا وہ ستم گر، تو یار ہوگا ابھی دھماکا

○

کلال گردوں اگر جہاں میں جو خاک میری کو جام کرتا
تو میں صنم کے لبوں سے مل کر عجب یہ عیش مدام کرتا

جو پاتا لذت بہار بستاں مئے محبت کے تیری زاہد
تو صومعے سے نکل کے اپنے وہ میکدے میں قیام کرتا

وہ بزم اپنی مئے کشی کی، وہ سیر ہو جاتے مست بےخود
جو شیخ بھی واں سے نکلے آتے تو میں بھی جھک کے سلام کرتا

جو زلف مکھڑے پہ کھول دیتا صنم ہمارا، تو پھر یہ گردوں
نہ دن دکھاتا، نہ شب بتاتا، نہ صبح لاتا، نہ شام کرتا

نظیر آخر کو ہار کر میں گلی میں اس کی گیا تھا بکنے
تماشا ہوتا جو مجھ کو لے کر وہ شوخ اپنا غلام کرتا

○

کبھو دیکھوں نہ سنبل باغ کو میں، مجھے اس خم زلف دوتا کی قسم
نہ نگہ کروں عارض گل کی طرف، مجھے اس رخ مہر و وفا کی قسم

یوں پھرے ہے چمن کی فضا میں صبا، وہ ہزار طرح سے ہو نافہ کشا
مرے دل کو نہ ہو کبھی اس کی ہوا، مجھے کوئے صنم کی ہوا کی قسم

جو ہی آیا ادھر کو وہ چشم سیہ، وہیں لے گیا دل کو بہ سیر نگہ
رہی عقل و خرد کو نہ جی میں جگہ، مجھے اس بت ہوش ربا کی قسم

بدن اس کا ہے رشک برگ سمن، کہ ہے بر میں جو آوے وہ رشک چمن
کھلے غنچۂ دل مرا گل کی نمن، مجھے اس گل بند قبا کی قسم

لگی مہندی جو ہاتھوں میں اس کے میاں، تو وہ سرخی کچھ ایسی ہے لالہ فشاں
وہ شفق جو کہ صبح کو ہووے عیاں، سو وہ کھاتی ہے اس کی حنا کی قسم

میں نے دیکھا نظیر جو اس کے تئیں، تو وہ شرم سے ہو گیا سرو زمیں
لیا نیچی نگاہوں سے جان دل و دیں، میں کہوں کیا اب اس کی حیا کی قسم

○

دُور سے آئے تھے ساقی، سُن کے میخانے کو ہم
بس ترستے ہی چلے افسوس! پیمانے کو ہم

مے بھی ہے، مینا بھی ہے، ساغر بھی ہے، ساقی نہیں
دل میں آتا ہے لگا دیں آگ مے خانے کو ہم

ہم کو پھنسنا تھا قفس میں، کیا گلہ صیاد کا
بس ترستے ہی رہے ہیں آب اور دانے کو ہم

طاقِ ابرو میں صنم کے، کیا خدائی رہ گئی!
اب تو پوجیں گے اسی کافر کے بُت خانے کو ہم

باغ میں لگتا نہیں، صحرا سے گھبراتا ہے دل
اب کہاں لے جا کے بیٹھیں ایسے دیوانے کو ہم

کیا ہوئی تقصیر ہم سے، تو بتا دے اے نظیرؔ!
تاکہ شادی مرگ سمجھیں ایسے مر جانے کو ہم

○

کل نظر آیا چمن میں اک عجب رشکِ چمن
گل رخ و گل گوں قبا و گل عذار و گل بدن

مہر طلعت، حور پیکر، مشتری رُو، مہ جبیں
سیم بر، سیماب طبع و سیم ساق و سیم تن

نازنیں، ناز آفریں، نازک بدن، نازک کمر
غنچہ لب، رنگیں ادا، شکر دہاں، شیریں سخن

زلف و کاکل، خال و ابرو دیکھ میں یہ چاروں غلام
مشکِ تبت، مشکِ چیں، مشکِ خطا، مشکِ ختن

مبتلا ایسوں کے جو ہوتے ہیں، سو ہیں اے نظیرؔ
بے قرار و دل فگار و خستہ جان و بے وطن

○

لیتا ہے جان میری تو میں سر بہ دست ہوں
اے یار! میں تو کشتۂ روزِ الست ہوں

یک دم کی زندگی کے لئے مت اُٹھا مجھے
اے بے خبر! میں نقشِ زمیں کا نشست ہوں

تو مست کر، شراب سے اے گل بدن مجھے
میں آپ اپنے شیشۂ دل کا شکست ہوں

دُور از طریق مجھ کو سمجھنا نہ زاہدا!
گر تو خدا پرست ہے، میں بُت پرست ہوں

○

کیوں نہ ہو بام پہ وہ جلوہ نما تیسرے دن
ماہ بھی چھپ کے نکلتا ہے دلا تیسرے دن

ہاتھ سے اب تو قلم رشکِ مسیحا، رکھ دے
نسخے بدلے ہیں جہاں کے حکما تیسرے دن

غرقِ دریائے محبت کی نہیں ملتی لاش
ورنہ ڈوبا ہوا نکلے ہے سدا تیسرے دن

دلِ بیمار رہے عشق میں کیوں کر سرسبز
خاک سے دانے کو ہے نشو و نما تیسرے دن

چھوڑ مت زلف کے مارے کو تو دنیا میں ہنوز
سانپ کے کاٹے کو دیتے ہیں بہا تیسرے دن

تین دن چشم کے بیمار کا کر اپنے علاج
ہوتی معلوم ہے تاثیرِ دوا تیسرے دن

لوگ کہتے ہیں کہ ہیں پھول ترے کشتے کے
مہندی ہاتھوں میں تو قاتل نہ لگا تیسرے دن

عمر یک ہفتہ نہیں باغ میں اے گل مت بھول
رنگ بدلے ہے زمانے کی ہوا تیسرے دن

چار حرف اس بت پہ پڑھ کے اگر پھونکے نظیر
آپ سے آپ ہو جائے شفا تیسرے دن

○

جدا کسی سے کسی کا غرض حبیب نہ ہو
یہ داغ وہ ہے کہ دشمن کو بھی نصیب نہ ہو

جدا جو ہم کو کرے اس صنم کے کوچے سے
الٰہی! راہ میں ایسا کوئی رقیب نہ ہو

علاج کیا کریں حکما، تپ جدائی کا
سوائے وصل کے اس کا کوئی طبیب نہ ہو

نظیرؔ اپنا تو معشوق خوب صورت ہے
جو حسن اس میں ہے ایسا کوئی عجیب نہ ہو

○

تاب اس کے دیکھنے کی نہ لائے، چلے گئے
کیا کیا پری جوان تھے آئے، چلے گئے

دارا رہا، نہ جم، نہ سکندر سا بادشاہ
تخت زمیں پہ سینکڑوں آئے، چلے گئے

آدم رہا، نہ کوئی پیمبر رہا یہاں
وہ بھی اسی زمیں میں سمائے، چلے گئے

عالم تھا یہ زلیخا کا یوسف کی چاہ میں
رقعے ہزاروں بیاہ کے آئے، چلے گئے

میرزا غالب

○

درد منت کشِ دوا نہ ہوا / میں نہ اچھا ہوا، برا نہ ہوا
جمع کرتے ہو کیوں رقیبوں کو / اک تماشا ہوا، گلا نہ ہوا
ہم کہاں قسمت آزمانے جائیں / تو ہی جب خنجر آزما نہ ہوا
کتنے شیریں ہیں تیرے لب کہ رقیب / گالیاں کھا کے بے مزا نہ ہوا
ہے خبر گرم اُن کے آنے کی / آج ہی گھر میں بوریا نہ ہوا
کیا وہ نمرود کی خدائی تھی / بندگی میں مرا بھلا نہ ہوا
جان دی، دی ہوئی اسی کی تھی / حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا
زخم گر دب گیا، لہو نہ تھما / کام گر رک گیا، روا نہ ہوا
رہزنی ہے کہ دل ستانی ہے / لے کے دل، دلستاں روانہ ہوا
کچھ تو پڑھیے کہ لوگ کہتے ہیں
آج غالب غزل سرا نہ ہوا

○

پھر مجھے دیدۂ تر یاد آیا
دل، جگر تشنۂ فریاد آیا
دم لیا تھا نہ قیامت نے ہنوز
پھر ترا وقتِ سفر یاد آیا
سادگی ہائے تمنا، یعنی
پھر وہ نیرنگِ نظر یاد آیا
زندگی یوں بھی گزر ہی جاتی
کیوں ترا راہ گزر یاد آیا
کیا ہی رضواں سے لڑائی ہوگی
گھر ترا خلد میں گر یاد آیا
آہ! وہ جرأتِ فریاد کہاں
دل سے تنگ آ کے جگر یاد آیا
پھر ترے کوچے کو جاتا ہے خیال
دلِ گم گشتہ مگر یاد آیا
کوئی ویرانی سی ویرانی ہے
دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا
میں نے مجنوں پہ لڑکپن میں اسدؔ
سنگ اُٹھایا تھا کہ سر یاد آیا

آہ کو چاہیے اک عمر اثر ہونے تک
کون جیتا ہے تری زلف کے سر ہونے تک

دامِ ہر موج میں ہے حلقۂ صد کامِ نہنگ
دیکھیں کیا گزرے ہے قطرہ پہ گہر ہونے تک

عاشقی صبر طلب اور تمنا بے تاب
دل کا کیا رنگ کروں خونِ جگر ہونے تک

ہم نے مانا کہ تغافل نہ کرو گے لیکن
خاک ہو جائیں گے ہم تم کو خبر ہونے تک

پرتوِ خور سے ہے شبنم کو فنا کی تعلیم
میں بھی ہوں ایک عنایت کی نظر ہونے تک

یک نظر بیش نہیں فرصتِ ہستی غافل
گرمیِ بزم ہے اک رقصِ شرر ہونے تک

غمِ ہستی کا اسد کس سے ہو جز مرگ علاج
شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک

وہ فراق، اور وہ وصال کہاں
وہ شب و روز و ماہ و سال کہاں
فرصتِ کاروبارِ شوق کسے
ذوقِ نظارۂ جمال کہاں
دل تو دل، وہ دماغ بھی نہ رہا
شورِ سودائے خط و خال کہاں
تھی وہ اک شخص کے تصور سے
اب وہ رعنائیِ خیال کہاں
ایسا آساں نہیں لہو رونا
دل میں طاقت، جگر میں حال کہاں
ہم سے چھوٹا قمار خانۂ عشق
واں جو جائیں، گرہ میں مال کہاں!
فکرِ دنیا میں سر کھپاتا ہوں
میں کہاں اور یہ وبال کہاں
مضمحل ہو گئے قویٰ غالب
وہ عناصر میں اعتدال کہاں؟

○

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں
خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں

یاد تھیں ہم کو بھی رنگا رنگ بزم آرائیاں
لیکن اب نقش و نگارِ طاقِ نسیاں ہو گئیں

تھیں بنات النعش گردوں دن کو پردے میں نہاں
شب کو ان کے جی میں کیا آئی کہ عریاں ہو گئیں

قید میں یعقوب نے لی گو نہ یوسف کی خبر
لیکن آنکھیں روزنِ دیوارِ زنداں ہو گئیں

سب رقیبوں سے ہوں ناخوش، پر زنانِ مصر سے
ہے زلیخا خوش کہ محوِ ماہِ کنعاں ہو گئیں

جوئے خوں آنکھوں سے بہنے دو کہ ہے شامِ فراق
میں یہ سمجھوں گا کہ شمعیں دو فروزاں ہو گئیں

ان پری زادوں سے لیں گے خلد میں ہم انتقام
قدرتِ حق سے یہی حوریں اگر واں ہو گئیں

نیند اس کی ہے، دماغ اس کا ہے، راتیں اس کی ہیں
تیری زلفیں جس کے بازو پر پریشاں ہو گئیں

میں چمن میں کیا گیا، گویا دبستاں کھل گیا
بلبلیں سن کر مرے نالے غزل خواں ہو گئیں

وہ نگاہیں کیوں ہوئی جاتی ہیں یارب دل کے پار
جو مری کوتاہیِ قسمت سے مژگاں ہو گئیں

بسکہ روکا میں نے اور سینے میں ابھریں پے بہ پے
میری آہیں بخیۂ چاکِ گریباں ہو گئیں

واں گیا بھی میں تو ان کی گالیوں کا کیا جواب
یاد تھیں جتنی دعائیں صرفِ درباں ہو گئیں

جاں فزا ہے بادہ جس کے ہاتھ میں جام آ گیا
سب لکیریں ہاتھ کی گویا رگِ جاں ہو گئیں

ہم موحد ہیں، ہمارا کیش ہے ترکِ رسوم
ملتیں جب مٹ گئیں اجزائے ایماں ہو گئیں

رنج سے خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج
مشکلیں مجھ پر پڑیں اتنی کہ آساں ہو گئیں

یوں ہی گر روتا رہا غالب تو اے اہلِ جہاں
دیکھنا ان بستیوں کو تم کہ ویراں ہو گئیں

○

دل ہی تو ہے نہ سنگ و خشت، درد سے بھر نہ آئے کیوں
روئیں گے ہم ہزار بار، کوئی ہمیں ستائے کیوں

دیر نہیں، حرم نہیں، در نہیں، آستاں نہیں
بیٹھے ہیں رہ گزر پہ ہم، غیر ہمیں اٹھائے کیوں

جب وہ جمالِ دل فروز، صورتِ مہرِ نیم روز
آپ ہی ہو نظارہ سوز، پردے میں منہ چھپائے کیوں

دشنۂ غمزہ جاں ستاں، ناوکِ ناز بے پناہ
تیرا ہی عکسِ رخ سہی، سامنے تیرے آئے کیوں

قیدِ حیات و بندِ غم، اصل میں دونوں ایک ہیں
موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

حسن اور اس پہ حسنِ ظن، رہ گئی بوالہوس کی شرم
اپنے پہ اعتماد ہے، غیر کو آزمائے کیوں

واں وہ غرورِ عز و ناز، یاں یہ حجابِ پاس وضع
راہ میں ہم ملیں کہاں، بزم میں وہ بلائے کیوں

ہاں وہ نہیں خدا پرست، جاؤ وہ بے وفا سہی!
جس کو ہو دین و دل عزیز، اس کی گلی میں جائے کیوں

غالبِ خستہ کے بغیر کون سے کام بند ہیں
روئیے زار زار کیا، کیجیے ہائے ہائے کیوں

○

کوئی امید بر نہیں آتی
کوئی صورت نظر نہیں آتی

موت کا ایک دن معین ہے
نیند کیوں رات بھر نہیں آتی

آگے آتی تھی حالِ دل پہ ہنسی
اب کسی بات پر نہیں آتی

جانتا ہوں ثوابِ طاعت و زہد
پر طبیعت ادھر نہیں آتی

ہے کچھ ایسی ہی بات جو چپ ہوں
ورنہ کیا بات کر نہیں آتی

کیوں نہ چیخوں کہ یاد کرتے ہیں
میری آواز گر نہیں آتی

داغِ دل گر نظر نہیں آتا
بو بھی اے چارہ گر نہیں آتی

ہم وہاں ہیں جہاں سے ہم کو بھی
کچھ ہماری خبر نہیں آتی

مرتے ہیں آرزو میں مرنے کی
نیند آتی ہے پر نہیں آتی

کعبے کس منہ سے جاؤ گے غالب
شرم تم کو مگر نہیں آتی

○

دلِ ناداں تجھے ہوا کیا ہے
آخر اس درد کی دوا کیا ہے

ہم ہیں مشتاق اور وہ بیزار
یا الٰہی! یہ ماجرا کیا ہے؟

میں بھی منہ میں زبان رکھتا ہوں
کاش! پوچھو کہ مدعا کیا ہے

ق

جب کہ تجھ بن نہیں کوئی موجود
پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے؟

یہ پری چہرہ لوگ کیسے ہیں؟
غمزہ و عشوہ و ادا کیا ہے

شکنِ زلفِ عنبریں کیوں ہے
نگہِ چشمِ سرمہ سا کیا ہے

سبزہ و گل کہاں سے آئے ہیں
ابر کیا چیز ہے، ہوا کیا ہے

ہم کو ان سے وفا کی ہے امید
جو نہیں جانتے، وفا کیا ہے

جان تم پر نثار کرتا ہوں
میں نہیں جانتا، دعا کیا ہے

ہاں! بھلا کر ترا بھلا ہوگا
اور درویش کی صدا کیا ہے

میں نے مانا کہ کچھ نہیں غالب
مفت ہاتھ آئے تو برا کیا ہے

○

ابنِ مریم ہوا کرے کوئی
میرے دکھ کی دوا کرے کوئی

شرع و آئین پر مدار سہی
ایسے قاتل کا کیا کرے کوئی

چال جیسے کڑی کمان کا تیر
دل میں ایسے کے جا کرے کوئی

بات پر واں زبان کٹتی ہے
وہ کہیں اور سنا کرے کوئی

بک رہا ہوں جنوں میں کیا کیا کچھ
کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی

نہ سنو اگر برا کہے کوئی
نہ کہو گر برا کرے کوئی

روک لو گر غلط چلے کوئی
بخش دو گر خطا کرے کوئی

کون ہے جو نہیں ہے حاجت مند
کس کی حاجت روا کرے کوئی

کیا کیا خضر نے سکندر سے
اب کسے رہنما کرے کوئی

جب توقع ہی اٹھ گئی غالب
کیوں کسی کا گلہ کرے کوئی

○

مدت ہوئی ہے یار کو مہماں کیے ہوئے
جوشِ قدح سے بزم چراغاں کیے ہوئے

کرتا ہوں جمع پھر جگرِ لخت لخت کو
عرصہ ہوا ہے دعوتِ مژگاں کیے ہوئے

پھر وضعِ احتیاط سے رکنے لگا ہے دم
برسوں ہوئے ہیں چاک گریباں کیے ہوئے

پھر گرمِ نالہ ہائے شرربار ہے نفس
مدت ہوئی ہے سیرِ چراغاں کیے ہوئے

پھر پرسشِ جراحتِ دل کو چلا ہے عشق
سامانِ صد ہزار نمکداں کیے ہوئے

پھر بھر رہا ہوں خامۂ مژگاں، بخونِ دل
سازِ چمن طرازیِ داماں کیے ہوئے

باہم دگر ہوئے ہیں دل و دیدہ پھر رقیب
نظارہ و خیال کا ساماں کیے ہوئے

دل پھر طوافِ کوئے ملامت کو جائے ہے
پندار کا صنم کدہ ویراں کیے ہوئے

پھر شوق کر رہا ہے خریدار کی طلب
عرضِ متاعِ عقل و دل و جاں کیے ہوئے

دوڑے ہے پھر ہر ایک گل و لالہ پر خیال
صد گلستاں نگاہ کا ساماں کیے ہوئے

پھر چاہتا ہوں نامۂ دلدار کھولنا
جاں نذرِ دلفریبیِ عنواں کیے ہوئے

مانگے ہے پھر کسی کو لبِ بام پر ہوس
زلفِ سیاہ رخ پہ پریشاں کیے ہوئے

چاہے ہے پھر کسی کو مقابل میں آرزو
سرمے سے تیز دشنۂ مژگاں کیے ہوئے

اک نوبہارِ ناز کو تاکے ہے پھر نگاہ
چہرہ فروغِ مے سے گلستاں کیے ہوئے

پھر جی میں ہے کہ در پہ کسی کے پڑے رہیں
سر زیرِ بارِ منتِ درباں کیے ہوئے

جی ڈھونڈتا ہے پھر وہی فرصت کہ رات دن
بیٹھے رہیں تصورِ جاناں کیے ہوئے

غالب ہمیں نہ چھیڑ کہ پھر جوشِ اشک سے
بیٹھے ہیں ہم تہیۂ طوفاں کیے ہوئے

مومن

○

مرے نہ عشق میں جب تک وہ مہرباں نہ ہوا
بلائے جاں ہے وہ دل جو بلائے جاں نہ ہوا

خدا کی یاد دلاتے تھے، نزع میں احباب
ہزار شکر کہ اس دم وہ بدگماں نہ ہوا

ہنسے نہ غیر مجھے بزم سے اٹھانے پر
سبک ہے وہ کہ تری طبع پر گراں نہ ہوا

دیت میں روزِ جزا لے رہیں گے قاتل کو
ہمارا جان کے جانے میں بھی زیاں نہ ہوا

وہ آئے بہرِ عیادت تو تھا میں شادیِ مرگ
کسی سے چارۂ بیدادِ آسماں نہ ہوا

گلہ نہیں ہے یہ چپ لذتِ ستم سے کہ میں
حریفِ کشمکشِ نالہ و فغاں نہ ہوا

دمِ حساب رہا روزِ حشر بھی یہی ذکر
ہمارے عشق کا چرچا کہاں کہاں نہ ہوا

ہے شرط ہم پہ حکایت میں گو نہ گو ز ستم
کبھی محبتِ دشمن کا امتحاں نہ ہوا

وہ حالِ زار ہے میرا کہ گاہ غیر سے بھی
تمہارے سامنے یہ ماجرا بیاں نہ ہوا

امید وعدۂ دیدارِ حشر پہ مومن
تو سب مزہ تھا کہ حسرت کشِ بتاں نہ ہوا

○

اثر اس کو ذرا نہیں ہوتا
رنج، راحت فزا نہیں ہوتا

تم ہمارے کسی طرح نہ ہوئے
ورنہ دنیا میں کیا نہیں ہوتا

اس نے کیا جانے کیا کیا لے کر
دل کسی کام کا نہیں ہوتا

نارسائی سے دم رکے تو رکے
میں کسی سے خفا نہیں ہوتا

تم مرے پاس ہوتے ہو گویا
جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

حالِ دل یار کو لکھوں کیوں کر
ہاتھ دل سے جدا نہیں ہوتا

رحم کر! خصمِ جانِ غیر نہ ہو
سب کا دل ایک سا نہیں ہوتا

چارۂ دل سوائے صبر نہیں
سو تمہارے سوا نہیں ہوتا

دامن اس کا جو ہے دراز تو ہو
دستِ عاشق رسا نہیں ہوتا

کیوں سنے عرضِ مضطر اے مومن
صنم آخر خدا نہیں ہوتا

○

رو یا کریں گے آپ بھی پہروں اسی طرح
اٹکا کہیں جو آپ کا دل بھی مری طرح

مر چک کہیں کہ تو غمِ ہجراں سے چھوٹ جائے
کہتے تو ہیں بھلے کی، ولیکن بری طرح

نے تاب ہجر میں ہے نہ آرام وصل میں
کم بخت دل کو چین نہیں ہے کسی طرح

لگتی ہیں گالیاں بھی ترے منہ سے کیا بھلی
قربان تیرے، پھر مجھے کہہ لے اسی طرح

پامال ہم نہ ہوتے فقط جورِ چرخ سے
آئی ہماری جان پہ آفت کئی طرح

نے جائے واں بنے ہے نہ بن جائے چین ہے
کیا کیجیے! ہمیں تو ہے مشکل سبھی طرح

ہوں جاں بلب بتانِ ستمگر کے ہاتھ سے
کیا سب جہاں میں جیتے ہیں مومن اسی طرح

○

قہر ہے، موت ہے، قضا ہے عشق
سچ تو یہ ہے بری بلا ہے عشق!

اثرِ غم ذرا بتا دینا
وہ بہت پوچھتے ہیں: کیا ہے عشق!

آفتِ جاں ہے کوئی پردہ نشیں
کہ مرے دل میں آ چھپا ہے عشق

بوالہوس اور لافِ جاں بازی
کھیل ہی کیا سمجھ لیا ہے عشق

سوجھے کیوں کر فریبِ دلداری
دشمنِ آشنا نما ہے عشق!

کس ملاحت سرشت کو چاہا
تلخ کامی پہ بامزا ہے عشق

ہم کو ترجیح تم پہ ہے یعنی
دل رُبا حسن و جاں رُبا ہے عشق

دیکھیے! کس جگہ ڈبو دے گا
میری کشتی کا ناخدا ہے عشق

وصل میں احتمالِ شادیِ مرگ
چارہ گر! درد بے دوا ہے عشق

اب تو دل! عشق کا مزہ چکھا
ہم نہ کہتے تھے کیوں! بُرا ہے عشق

آپ مجھ سے نباہیں گے، سچ ہے
باوفا حسن، بے وفا ہے عشق

قیس و فرہاد و وامق و مومن
مر گئے سب ہی کیا وبا ہے عشق

○

اب اور سے لو لگائیں گے ہم
جوں شمع تجھے جلائیں گے ہم

برباد نہ جائے گی کدورت
کیا کیا تری خاک اڑائیں گے ہم

دل ہٹ کے اک اور لالہ رُو کو
ہر داغ پہ داغ کھائیں گے ہم

لب کا ترے دعویٰ مسیحی،
مُردوں پہ آزمائیں گے ہم

گر تیری طرف کو بے قراری
کھینچے گی تو لوٹ جائیں گے ہم

گر دیکھ کے ہنس دیا ہمیں تو
منہ پھیر کے مسکرائیں گے ہم

گر خواب میں آن کر جگایا
سوتے ہُوئے جگائیں گے ہم

آ لپٹے گلے سے دھیان تیرے
خاطر میں ستم نہ لائیں گے ہم

بُت خانہ چین ہو گر ترا گھر
مومن ہیں تو پھر نہ آئیں گے ہم

○

کہتے ہو، تم کو ہوش نہیں اضطراب میں
سارے گلے تمام ہوئے اک جواب میں

رہتے ہیں جمع کوچۂ جاناں میں خاص و عام
آباد ایک گھر ہے جہانِ خراب میں

آنکھ اس کی پھر گئی تھی، دل اپنا بھی پھر گیا
یہ اور انقلاب ہُوا، انقلاب میں!

بدنام میرے گریۂ رسوا سے ہو چکے
اب عذر کیا رہا نگہِ بے حجاب میں

مطلب کی جستجو نے یہ کیا حال کر دیا
حسرت بھی اب نہیں دلِ ناکامیاب میں

ناکامیوں سے کام رہا عمر بھر ہمیں
پیری میں یاس ہے، جو ہوس تھی شباب میں

دونوں کا ایک حال ہے یہ مدعا ہو کاش!
وہی خط اس نے بھیج دیا کیوں جواب میں

تقدیر بھی بُری مری، تدبیر بھی بُری
بگڑے وہ پرسشِ سببِ اجتناب میں

کیا جلوے یاد آئے کہ اپنی خبر نہیں
بے بادہ مست ہوں میں شبِ ماہتاب میں

بیمِ سجود، پائے صنم پر، دمِ وداع
مومن خدا کو بھول گئے اضطراب میں

○

وہ جو ہم میں تم میں قرار تھا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو
وہی یعنی وعدہ نباہ کا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

وہ جو لطف مجھ پہ تھے بیشتر وہ کرم کہ تھا مرے حال پر
مجھے سب ہے یاد ذرا ذرا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

وہ نئے گلے وہ شکایتیں وہ مزے مزے کی حکایتیں
وہ ہر ایک بات پہ روٹھنا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

کبھی بیٹھے سب میں جو روبرو تو اشارتوں ہی سے گفتگو
وہ بیان شوق کا برملا، تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

ہوئے اتفاق سے گر بہم تو وفا جتانے کو دم بدم
گلۂ ملامت اقربا، تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

کوئی بات ایسی اگر ہوئی کہ تمہارے جی کو بری لگی
تو بیاں سے پہلے ہی بھولنا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

کبھی ہم میں تم میں بھی چاہ تھی کبھی ہم سے تم سے بھی راہ تھی
کبھی ہم بھی تم بھی تھے آشنا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

سنو ذکر ہے کئی سال کا کہ کیا اک آپ نے وعدہ تھا
سو نباہنے کا تو ذکر کیا، تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

کہا میں نے بات وہ کوٹھے کی مرے دل سے صاف اتر گئی
تو کہا کہ جانے مری بلا، تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

وہ بگڑنا وصل کی رات کا، وہ نہ ماننا کسی بات کا
وہ نہیں نہیں کی ہر آن ادا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

جسے آپ گنتے تھے آشنا جسے آپ کہتے تھے باوفا
میں وہی ہوں مومنِ مبتلا، تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

○

اُلٹے وہ شکوے کرتے ہیں اور کس ادا کے ساتھ
بے طاقتی کے طعنے ہیں، عذرِ جفا کے ساتھ

بہرِ عیادت آئے وہ، لیکن قضا کے ساتھ
دم ہی نکل گیا مرا، آوازِ پا کے ساتھ

بے پردہ غیر پاس اسے بیٹھا نہ دیکھتے
اٹھ جاتے کاش ہم بھی جہاں سے حیا کے ساتھ

وہ لالہ رو گیا نہ ہو گلگشتِ باغ کو
کچھ رنگ بوئے گل کے عوض ہے صبا کے ساتھ

اس کی گلی کہاں! یہ تو کچھ باغِ خلد ہے
کس جائے مجھ کو چھوڑ گئی موت لا کے ساتھ

آتی ہے بوئے داغ، شبِ تارِ غم میں
سینہ بھی چاک ہو نہ گیا ہو، قبا کے ساتھ

تھے وعدے سے پھر آنے کے خوش، یہ خبر نہ تھی
ہے اپنی زندگانی اسی بے وفا کے ساتھ

اللہ ری گمرہی بت و بتخانہ چھوڑ کر
مومن چلا ہے کعبہ کو اک پارسا کے ساتھ

○

ناوک انداز جدھر دیدۂ جاناں ہوں گے
نیم بسمل کئی ہوں گے، کئی بے جاں ہوں گے

تابِ نظارہ نہیں، آئنہ کیا دیکھنے دوں
اور بن جائیں گے تصویر، جو حیراں ہوں گے

تو کہاں جائے گی، کچھ اپنا ٹھکانا کر لے
ہم تو کل خوابِ عدم میں شبِ ہجراں ہوں گے

ایک ہم ہیں کہ ہوئے ایسے پشیماں کہ بس
ایک وہ ہیں کہ جنھیں چاہ کے ارماں ہوں گے

ہم نکالیں گے سُن اے موجِ ہوا! بل تیرا
اس کی زلفوں کے اگر بال پریشاں ہوں گے

منّتِ حضرتِ عیسیٰؑ نہ اُٹھائیں گے کبھی
زندگی کے لیے شرمندۂ احساں ہوں گے

چاک پردے سے یہ غمزے ہیں تو اے پردہ نشیں!
ایک میں کیا کہ سبھی چاک گریباں ہوں گے

پھر بہار آئی وہی دشت نوردی ہوگی
پھر وہی پاؤں، وہی خارِ مغیلاں ہوں گے

سنگ اور ہاتھ وہی، وہ ہی سر و داغِ جنوں
وہی ہم ہوں گے، وہی دشت و بیاباں ہوں گے

عمر ساری تو کٹی عشقِ بتاں میں مومنؔ
آخری وقت میں کیا خاک مسلماں ہوں گے

○

وہ کہاں ساتھ سُلاتے ہیں مجھے
خواب کیا کیا نظر آتے ہیں مجھے

اُس پری وش سے لگاتے ہیں مجھے
لوگ دیوانہ بناتے ہیں مجھے

یا رب! اُن کا بھی جنازہ اُٹھے
یار اُس کُو سے اُٹھاتے ہیں مجھے

بے وفائی کا عدو کی ہے گلا،
لطف میں بھی وہ ستاتے ہیں مجھے

حیرتِ حسن سے یہ شکل بنی!
کہ وہ آئینہ دکھاتے ہیں مجھے

پھونک دے آتشِ دل، داغ مرے
اُس کی خُو یاد دلاتے ہیں مجھے

گر کیے غمزہ کے قتل کروں
تو اشارت سے بتاتے ہیں مجھے

میں تو اس زلف کی بُو پر خوش ہوں
چارہ گر مشک سنگھاتے ہیں مجھے

شعلہ رُو کہتے ہیں اغیار کو وہ
اپنے نزدیک جلاتے ہیں مجھے

جان گئی، پر نہ گئی جور کشی
بعدِ مردن بھی دباتے ہیں مجھے

وہ جو کہتے ہیں تجھے آگ لگے
مژدۂ وصل سناتے ہیں مجھے

اب یہ صورت ہے کہ اے پردہ نشیں
تجھ سے احباب چھپاتے ہیں مجھے

مومنؔ اور دیر، خدا خیر کرے
طور بے ڈھب نظر آتے ہیں مجھے

ذوقؔ

○

اسے ہم نے بہت ڈھونڈا نہ پایا
اگر پایا، تو کھوج اپنا نہ پایا

مقدّر ہی یہ گر سُود و زیاں ہے
تو ہم نے یاں نہ کچھ کھویا نہ پایا

رہِ پیچیدہ مثالِ نیشِ کژدم
کبھی کج فہم کو سیدھا نہ پایا

احاطے سے فلک کے ہم تو باہر
نکل جاتے، مگر رستا نہ پایا

جہاں دیکھا، کسی کے ساتھ دیکھا
کبھی ہم نے تجھے تنہا نہ پایا

کہے کیا ہائے زخمِ دل ہمارا
دہن پایا، لبِ گویا نہ پایا

کبھی تو، اور کبھی بیزار ہا عشم
غرض خالی دلِ شیدا نہ پایا

نظیر اس کا کہاں عالم میں اے ذوقؔ
کہیں ایسا نہ پائے گا، نہ پایا

○

کسی بے کس کو اے بیداد گر مارا تو کیا مارا
جو آپ ہی مر رہا ہو، اس کو گر مارا تو کیا مارا

نہ مارا آپ کو، جو خاک ہو اکسیر بن جاتا
اگر پارے کو اے اکسیر گر مارا تو کیا مارا

نہیں وہ قول کا سچا، ہمیشہ قول دے دے کر
جو اس نے ہاتھ میرے ہاتھ پر مارا تو کیا مارا

ہنسی کے ساتھ یاں رونا ہے مثلِ قلقلِ مینا
کسی نے قہقہہ اے بے خبر مارا تو کیا مارا

دلِ سنگینِ خسرو پر بھی ضرب اے کوہکن پہنچا
اگر تیشہ سرِ کہسار پر مارا تو کیا مارا

گیا شیطان مارا ایک سجدے کے نہ کرنے پر
اگر لاکھوں برس سجدے میں سر مارا تو کیا مارا

دلِ بد خواہ میں تھا مارنا، یا چشمِ بد بیں میں
فلک پر ذوقؔ تیرِ آہ گر مارا تو کیا مارا

○

کیا آئے، تم جو آئے گھڑی دو گھڑی کے بعد
سینے میں ہوگی سانس اڑی دو گھڑی کے بعد

کیا روکا اپنے گریہ کو ہم نے کہ لگ گئی!
پھر وہ ہی آنسوؤں کی جھڑی دو گھڑی کے بعد

کوئی گھڑی اگر وہ ملائم ہوئے تو کیا
کہہ بیٹھیں گے پھر ایک کڑی دو گھڑی کے بعد

کہتا رہا کچھ اُن سے عدو دو گھڑی تلک!
غمّاز نے پھر اور جڑی دو گھڑی کے بعد

تھے دو گھڑی سے شیخ جی شیخی بگھارتے
ساری وہ شیخی اُن کی جھڑی دو گھڑی کے بعد

○

ہاں! تأمّل دمِ ناوک فگنی خوب نہیں
ابھی چھاتی مری تیروں سے چھنی خوب نہیں

گل پریشاں ہوا ہنس کے چمن میں آخر!
دیکھ اے غنچہ یہاں خندہ زنی خوب نہیں

یہ نہیں شیشۂ مے، ہے کسی مے خوار کا دل
محتسب دیکھ نہ کر دل شکنی خوب نہیں

بات تو ہم نے بنائی تھی وہاں خوب، مگر
تھی جو بگڑی ہوئی قسمت تو بنی خوب نہیں

خلشِ خار کا کھٹکا ہے بغل میں موجود
دیکھ! گل، دعوئ نازک بدنی خوب نہیں

○

رندِ خراب حال کو زاہد نہ چھیڑ تو
تجھ کو پرائی کیا پڑی اپنی نبیڑ تو

ناخن نہ دے خدا تجھے اے پنجۂ جنوں
دے گا تمام عقل کے بخیے ادھیڑ تو

اے زاہدِ دو رنگ نہ پیر آپ کو بنا
مانندِ صبحِ کاذب ابھی ہے ادھیڑ تو

اس صیدِ مضطرب کو تأمل سے ذبح کر
دامن و آستیں نہ لہو میں لتھیڑ تو

آوارگی سے کوئے محبت کی ہاتھ اٹھا
اے ذوق یہ اٹھا نہ سکے گا کھکھیڑ تو

○

تیز اس نے جو کی تیغِ ستم اور زیادہ
مشتاقِ شہادت ہوئے ہم اور زیادہ

کچھ کی رستمِ شوق نے تاثیر جو پیدا
اٹھنے لگا قاصد کا قدم اور زیادہ

دشمن کی نہ جا سیدھی نگاہوں پہ کہ جوں تیغ
سیدھی ہے تو اک اس میں ہے دم اور زیادہ

ہے نکہتِ ریحاں کا دماغ اب کسے پھر بھی
آتا ہے مرا ناک میں دم اور زیادہ

جو کچھ قناعت میں ہیں تقدیر پہ شاکر
ہے ذوق برابر انھیں کم اور زیادہ

○

تیرے کوچے کو وہ بیمارِ غم دارالشفا سمجھے
اجل کو جو طبیب اور مرگ کو اپنی دوا سمجھے

بھلا کیا تلخ کام اس زندگانی کا مزا سمجھے
کہ جو زہرابِ تیغِ یار کو آبِ بقا سمجھے

ستم کو ہم کرم سمجھے، جفا کو ہم وفا سمجھے
اور اس پر بھی نہ سمجھے وہ تو اس بت سے خدا سمجھے

تجھے اے سنگ دل! آرامِ جاں مبتلا سمجھے
پڑیں پتھر سمجھ پر ایسی ہم سمجھے تو کیا سمجھے

حساب اصلا نہ پوچھے مجھ سے میرے دل کے نقد کا
حسابِ دوستاں در دل اگر وہ دلربا سمجھے

محبت سے ہوا گر موم ہو اس دل شکن کا دل
دلِ اشکستہ اپنے حق میں ہم مومیا سمجھے

وہ آیا ہے بن کر نامہ بر، لکھا نصیبوں کا
کریں گے ہم کے خط کیا؟ تمہی سے مدعا سمجھے

کشادِ کار ہم نے پنجۂ تقدیر کو سونپا!
خود کے تیز ناخن، ناخنِ انگشتِ پا سمجھے

سمجھ ہی میں نہیں آتی ہے کوئی بات ذوق اس کی
کوئی جانے تو کیا جانے، کوئی سمجھے تو کیا سمجھے

○

خوب روکا شکایتوں سے مجھے
تو نے مارا عنایتوں سے مجھے

کہتے کیا کیا ہیں دیکھ تو اغیار
یار! تیری حمایتوں سے مجھے

واجب القتل اس نے ٹھہرایا
آیتوں سے روایتوں سے مجھے

سمجھے ہے واجب الرعایت دوست
دشمنوں کی رعایتوں سے مجھے

گر نہ کہیے میں تو کبھی اے چشم!
شوق کم ہے کنایتوں سے مجھے

○

الٰہی! کس بے گنہ کو مارا، بھرے کے قاتل نے کشتنی ہے
کہ تیغ کہتی ہے شور اس کے بِاَیِّ ذَنبٍ قُتِلَتْ ہے

زمیں پہ نورِ قمر کے گرنے سے صاف اظہارِ روشنی ہے
کہ ہیں جو روشن ضمیر اُن کا فروغ، اُن کی فروتنی ہے

بشر جو اس تیرہ خاکداں میں پڑا، یہ اس کی فروتنی ہے
وگرنہ قندیلِ عرش میں بھی اسی کے جلوے کی روشنی ہے

ہیں تر گریۂ ندامت سے اس قدر آستین و دامن
کہ میری تردامنی کے آگے عرق عرق پاک دامنی ہے

بچے ہیں اس اپنی سادگی سے ہم آشنا جنگ و آشتی سے
اگر نہ ہو یہ تو پھر کسی سے نہ دوستی ہے نہ دشمنی ہے

نہیں ہے قانع کو خواہشِ زر، وہ مفلسی میں بھی ہے غنی گر
جہاں میں مانندِ کیمیا گر، ہمیشہ محتاج دل غنی ہے

کوئی ہے کافر کوئی مسلماں، جدا ہے ہر اک کی راہ یہاں
جو اس کے نزدیک رہبری ہے وہ اس کے نزدیک رہزنی ہے

○

ابرِ تر، آنسو بہانا کوئی ہم سے سیکھ جائے
برقِ مضطر، تلملانا کوئی ہم سے سیکھ جائے

خط میں لکھوا کر انھیں بھیجا تو مطلع درد کا!
دردِ دل اپنا جتانا کوئی ہم سے سیکھ جائے

تیغ تو اوچھی پڑی تھی، گر پڑے ہم آپ سے
دل کو قاتل کے بڑھانا کوئی ہم سے سیکھ جائے

واں ہلے ابرو، یہاں گردن پہ پھیری ہم نے تیغ
بات کا ایما بھی پانا کوئی ہم سے سیکھ جائے

سن کے آواز اس کی از خود رفتہ ہو جاتے ہیں ہم
پیشوا لینے کو جانا کوئی ہم سے سیکھ جائے

ہم نے پہلے ہی کہا تھا، تو کرے گا ہم کو قتل
تیوروں کا تاڑ جانا کوئی ہم سے سیکھ جائے

کیا ہوا اے ذوق! ہیں جوں مردمک ہم رو سیاہ
لیک آنکھوں میں سمانا کوئی ہم سے سیکھ جائے

بہادر شاہ ظفر

○

یا مجھے افسرِ شاہا نہ بنایا ہوتا
یا مرا تاج گدایانہ بنایا ہوتا

اپنا دیوانہ بنایا مجھے ہوتا تو نے
کیوں خرد مند بنایا، نہ بنایا ہوتا

خاکساری کے لیے گرچہ بنایا تھا مجھے
کاش! خاکِ درِ جاناں نہ بنایا ہوتا

نشۂ عشق کا گر ظرف دیا تھا مجھ کو
عمر کا تنگ نہ پیمانہ بنایا ہوتا

صوفیوں کے جو نہ تھا لائقِ صحبت تو مجھے
قابلِ جلسۂ رندانہ بنایا ہوتا

تھا جلانا ہی اگر دوریِ ساقی سے مجھے
تو چراغِ درِ میخانہ بنایا ہوتا

شعلۂ حسن چمن میں نہ دکھایا اس نے
ورنہ بلبل کو بھی پروانہ بنایا ہوتا

روز معمورۂ دنیا میں خرابی ہے ظفرؔ
ایسی بستی کو تو ویرانہ بنایا ہوتا

○

دیا اپنی خودی کو جو ہم نے اٹھا، وہ جو پردہ سا بیچ میں تھا نہ رہا
رہے پردہ میں اب نہ وہ پردہ نشیں، کوئی دوسرا اس کے سوا نہ رہا

نہ تھی حال کی جب ہمیں اپنے خبر رہے دیکھتے اوروں کے عیب و ہنر
پڑی اپنی برائیوں پر جو نظر تو نگاہ میں کوئی برا نہ رہا

ترے رخ کے خیال میں کون سے دن اٹھے مجھ پہ نہ فتنۂ روزِ جزا
تری زلف کے دھیان میں کون سی شب مرے سر پہ ہجومِ بلا نہ رہا

ہمیں ساغرِ بادہ کے دینے میں تو کرے دیر جو ساقی تو ہائے غضب
کہ یہ عہدِ نشاط، یہ دورِ طرب نہ رہے گا جہاں میں سدا نہ رہا

کئی روز میں آج وہ ماہ لقا ہوا میرے جو سامنے جلوہ نما
مجھے صبر و قرار ذرا نہ رہا، اسے پاسِ حجاب و حیا نہ رہا

ترے خنجر و تیغ کی آب رواں ہوئی جبکہ سبیلِ ستم زدگاں
گئے کتنے ہی قافلے خشک زباں کوئی تشنۂ آبِ بقا نہ رہا

مجھے صاف بتائے نگار اگر تو یہ پوچھوں میں رو رو خونِ جگر
ملے پاؤں سے کس کے ہیں دیدۂ تر، کفِ پا پہ جو رنگِ حنا نہ رہا

اسے چاہا تھا میں نے کہ روک رکھوں مری جان بھی جائے تو جانے نہ دوں
کیے لاکھ فریب کروڑ فسوں نہ رہا، نہ رہا، نہ رہا، نہ رہا

لگے یوں تو ہزاروں ہی تیرِ ستم کہ تڑپتے رہے پڑے خاک پہ ہم
ولے ناز و کرشمہ کی تیغِ دو دم لگی ایسی کہ تسمہ لگا نہ رہا

ظفرؔ آدمی اس کو نہ جانیے گا ہو وہ کیسا ہی صاحبِ فہم و ذکا
جسے عیش میں یادِ خدا نہ رہی جسے طیش میں خوفِ خدا نہ رہا

○

کسی نے اس کو سمجھایا تو ہوتا
کوئی یاں تک اُسے لایا تو ہوتا

مزا رکھتا ہے زخمِ خنجرِ عشق
کبھی اے بوالہوس کھایا تو ہوتا

نہ نکلی آہ ہوتا بید ہی کاش
نہ ہوتا گو ثمر سایا تو ہوتا

جو کچھ ہوتا سو ہوتا تو نے تقدیر
وہاں تک مجھ کو پہنچایا تو ہوتا

کیا کس جرم پر تو نے مجھے قتل
ذرا تو دل میں شرمایا تو ہوتا

دل اس کی زلف میں الجھا ہے کب سے
ظفر اک روز سلجھایا تو ہوتا

○

نہ ہرگز دردِ دل سے میں کراہا
غرض پوشیدہ الفت کو نباہا

محبت کے یہ معنی ہیں کہ میں نے
وہی چاہا کہ جو کچھ تو نے چاہا

فقیروں سے نہ پوچھو لذتِ عشق
اہاہا ! اہاہا ! اہاہا !! اہاہا !!!

صَرفتُ العُمرَ فی لہوٍ و لعبٍ
فآہا ! ثمّ آہا !! ثمّ آہا

ظفر کو باز رکھ اعمالِ بد سے
خطا بخشا ! کرم گسترا ! الٰہا !

○

یار تھا، گلزار تھا، مے تھی، فضا تھی، میں نہ تھا
لائقِ پابوسِ جاناں، کیا حنا تھی، میں نہ تھا

ہاتھ کیوں باندھے مرے، چھلا اگر چوری گیا
یہ سراپا شوخیٔ دزدِ حنا تھی، میں نہ تھا

بے خودی میں مَیں نے لیا بوسہ، خطا کیجے معاف
یہ دلِ بے تاب کی ساری خطا تھی، میں نہ تھا

ہائے ساقی! یہ ہو ساماں اور عاشق یوں نہ ہو
یار تھا، سبزہ تھا، بدلی تھی، ہوا تھی، میں نہ تھا

میں سسکتا رہ گیا اور مر گئے فرہاد و قیس
کیا انھیں دونوں کے حصے میں قضا تھی میں نہ تھا؟

میں نے پوچھا کیا ہوا وہ آپ کا حسن و شباب
ہنس کے بولا وہ صنم، شانِ خدا تھی، میں نہ تھا

اے ظفر یہ دل پہ میرے داغ کیسا رہ گیا
خانۂ باغِ یار میں خلقِ خدا تھی، میں نہ تھا

○

پسِ مرگ میرے مزار پر جو دیا کسی نے جلا دیا
اسے آہ دامنِ باد نے سرِ شام ہی سے بجھا دیا

مجھے دفن کرنا تو جس گھڑی تو یہ اس سے کہنا کہ اے پری
وہ جو تیرا عاشقِ زار تھا، تہِ خاک اس کو دبا دیا

دمِ غسل سے مرے پیشتر اسے ہمدموں نے یہ سوچ کر
کہیں جائے اُس کا نہ دل دہل، مری لاش پر سے ہٹا دیا

مری آنکھ جھپکی تھی ایک پل، مرے دل نے چاہا کہ اُٹھ کے چل
دلِ بیقرار نے او میاں! وہیں چٹکی لے کے جگا دیا

میں نے دل دیا، میں نے جان دی، مگر آہ تو نے نہ قدر کی
کسی بات کو جو کبھی کہا، اسے چٹکیوں میں اُڑا دیا

○

جلایا آپ ہم نے ضبط کر کے آہِ سوزاں کو
جگر کو، سینے کو، پہلو کو، دل کو، جسم کو، جاں کو

ہمیشہ کنجِ تنہائی میں ہم مونس سمجھتے ہیں
الم کو، یاس کو، حسرت کو، بیتابی کو، حرماں کو

ترے اندام و روی و قد و زلف معطر سے خجلت
سمن کو، یاسمن کو، سرو کو، سنبل کو، ریحاں کو

جگر کی کو ڈھونڈ لائیں ترے ملنے سے ہے قتل
کماں کو، چھری کو، بانک کو، خنجر کو، پیکاں کو

ترے دنداں و لب نے کر دیا بے قدر عالم میں
گہر کو، لعل کو، یاقوت کو، ہیرے کو، مرجاں کو

دکھا کر آنکھ اُس سے ہم نے دشمن کر لیا اپنا
نگہ کو، ناز کو، انداز کو، ابرو کو، مژگاں کو

نہیں قلقل، دعا دیتا ہے شیشہ دم بدم ساقی
سبو کو، خم کو، کوزے کو، کدو کو، بزمِ مستاں کو

نہ ہو جب تو ہی اے ساقی! بھلا پھر کیا کرے کوئی
ہوا کو، ابر کو، گل کو، چمن کو، صحنِ بستاں کو

بنایا اے ظفر خالق نے کب انساں سے بہتر
ملک کو، دیو کو، جن کو، پری کو، حور و غلماں کو

○

بہار آئی ہے بھر دے بادۂ گلگوں سے پیمانہ
رہے لاکھوں برس ساقی ترا آباد مے خانہ

اسی رشکِ پری پر جان دیتا ہوں میں دیوانہ
ادا جس کی ہے بانکی، ترچھی چتون، چال مستانہ

نبھے کیوں کر مرے اور اس پری پیکر کے یارانہ
وہ بے پروا ہیں سودائی، وہ سنگیں دل، میں دیوانہ

مجھے آنا ملے کیوں کر تری محفل میں جانانہ
مری صورت فقیرانہ، ترا دربار شاہانہ

غزالِ دشت بولے دیکھ کر مجنوں کی میت کو
یہ وحشی مر گیا بس ہو چکا آباد ویرانہ

ہمارے اور تمہارے عشق کا چرچا ہے شہروں میں
کوئی سنتا نہیں اب لیلیٰ و مجنوں کا افسانہ

گزر یارب! گلستاں میں ہوا ہے کس شرابی کا
کہ شاخیں جھومتی ہیں، نالۂ بلبل ہے مستانہ

ظفر وہ زاہدِ بے درد کی ہو حق سے بہتر ہے
کرے گر رند دردِ دل سے ہائے وہوئے مستانہ

○

بات کرنی مجھے مشکل کبھی ایسی تو نہ تھی
جیسی اب ہے تری محفل کبھی ایسی تو نہ تھی

لے گیا چھین کے کون آج ترا صبر و قرار
بے قراری تجھے اے دل! کبھی ایسی تو نہ تھی

تیری آنکھوں نے خدا جانے کیا کیا جادو
کہ طبیعت مری مائل کبھی ایسی تو نہ تھی

عکسِ رخسار نے کس کے ہے تجھے چمکایا
تاب تجھ میں مہ کامل کبھی ایسی تو نہ تھی

کیا سبب تو جو بگڑتا ہے ظفر سے ہر بار
خو تری حور شمائل کبھی ایسی تو نہ تھی

○

تری جو پازیب سر کا جھومر، زمیں پہ گوہر فلک پہ اختر
ہوئے ہیں جلوہ نما چمک کر زمیں پہ گوہر فلک پہ اختر

وفورِ اشکوں کا ہے ہمارے نکلتے باتوں میں ہیں شرارے
نہ کیوں کہ ہوں عرش پہ نچھاور زمیں پہ گوہر فلک پہ اختر

پھپھولے پاؤں میں ہیں نمایاں تو سر پہ داغِ جنوں فراواں
نہ دیکھیں دیوانے تیرے کیوں کر زمیں پہ گوہر فلک پہ اختر

ذرا جبینِ عرق فشاں پر تو اپنی، افشاں دکھائیے چن کر
کہ تا نظر آویں ماہ پیکر زمیں پہ گوہر فلک پہ اختر

ادھر تو فوارے چھوٹتے ہیں ادھر ہیں اشجار پر چراغاں
نئی ہے سیر اک چمن کے اندر زمیں پہ گوہر فلک پہ اختر

نہ سبزہ و گل نہ جوششِ شبنم نہ چمکے جگنو ہوا یہ ہر دم
نظر شب آتے تھے مجھ کو یکسر زمیں پہ گوہر فلک پہ اختر

زمیں نہایت ہی تھی یہ مشکل ظفر ہے استاد پر وہ کامل
غرض دکھا دی وہی بنا کر زمیں پہ گوہر فلک پہ اختر

شیفتہ

○

جفا و جور کا اس سے گلا کیا جو پوچھے: مہربانی کیا، وفا کیا
وہ بے پروا، جوابِ نامہ لکھے خدا جانے کہ دشمن نے لکھا کیا
نہ لکھنا تھا غمِ ناکامیٔ عشق جوابِ نامۂ بے مدعا کیا
ہمیں تھا آپ قصدِ عرضِ احوال (ق) جو وہ خود پوچھتے ہیں، پوچھنا کیا
کہا کل میں نے سرمایۂ ناز! تغافل سے ہے تم کو مدعا کیا
کبھی مجھ پر عتابِ بے سبب کیوں کبھی بے وجہ غیروں سے وفا کیا
کبھی محفل میں وہ بے باکیاں کیوں کبھی خلوت میں یہ شرم و حیا کیا
کبھی تمکینِ صولت آفریں کیوں کبھی الطافِ جرأت آزما کیا
کبھی وہ طعنہ ہائے جاں گزا کیوں کبھی یہ غمزہ ہائے جاں فزا کیا
کبھی شعروں سے میرے نغمہ سازی کبھی کہنا کہ یہ تم نے کہا کیا
کبھی بے جرم یہ آزردہ ہونا کہ کیا طاقت جو پوچھوں ہیں خفا کیا
کبھی اس دشمنی پر بہرِ تسکیں پئے ہم جلوہ ہائے دل ربا کیا
یہ سب طول اس نے سن کر بے تکلف جواب اک مختصر مجھ کو دیا کیا

ابھی اس سے شیفتہ واقف نہیں تم
کہ باتیں عشق میں ہوتی ہیں کیا کیا

○

اُٹھے نہ چھوڑ کے ہم آستانِ بادہ فروش
طلسمِ ہوش رُبا ہے دکانِ بادہ فروش

کھلا جو پردۂ روئے حقائقِ اشیا
کھلی حقیقتِ رازِ نہانِ بادہ فروش

فسردہ طینتی و کاہلی سے ہم نے کبھی
شباب میں بھی نہ دیکھی دکانِ بادہ فروش

قدح سے دل ہے مرا دلو رسے عشق فروش
میں وہ نہیں کہ نہ سمجھوں زبانِ بادہ فروش

عجب نہیں کہ کسی روز وہ بھی آ نکلیں
کہ ہے گزرگہِ خلق آستانِ بادہ فروش

مئے سرور کے اسرار آپ آ کر دیکھ
نہ پوچھ مجھ سے کہ ہوں رازدانِ بادہ فروش

شراب دیکھ کر کس رنگ کی پلاتا ہے
بجز اس کے اور نہیں امتحانِ بادہ فروش

تری شمیم نے گلزار کو کیا برباد
تری نگاہ نے لوٹی دکانِ بادہ فروش

جبیں سے شیفتہ ہر اک سے پوچھتے پھرتا
ملے گا بادہ کشوں سے نشانِ بادہ فروش

○

کچھ درد ہے مطربوں کی نے میں
کچھ آگ بھری ہوئی ہے نے میں

کچھ زہر اُگل رہی ہے بُلبل
کچھ زہر ملا ہوا ہے مے میں

بدمست جہان ہو رہا ہے
ہے یار کی بُو ہر ایک شے میں

ہے مستیٔ نیم خام کا ڈر
اسرار ہے جام پے بہ پے میں

میخانہ نشیں قدم نہ رکھیں
بزمِ جم و بارگاہِ کے میں

کچھ شیفتہ یہ غزل ہے آفت
کچھ درد ہے مطربوں کی نے میں

○

گرم جوشی ہے، مگر فرق شرارت میں نہیں
چھیڑ کس بات میں، طعنہ کس اشارت میں نہیں

رات ساقی نے کہا: جس کے یہ سب جلوے ہیں
وہ عبارت میں نہیں اور اشارت میں نہیں

ہم کو مقصد سے زیادہ ہے ادب میں کوشش
ورنہ کچھ غیر سوا ہم سے جسارت میں نہیں

رند فارغ بھی ہوئے جامِ سحر گاہی سے
اور زاہد ابھی آہنگِ طہارت میں نہیں

ذِحمتِ نفس جو وہ ہے تو یہ ہے راحتِ روح
کیا بزرگی میں مزہ ہے جو حقارت میں نہیں

اہلِ دانش کے فوائد کی تو کیا بات اگر
غور سے دیکھو، تو عاشق بھی خسارت میں نہیں

جامِ مے شے کہ وہاں کام پڑا ہے مجھ کو
کہ صبا کو بھی جہاں دخل سفارت میں نہیں

قتل و غارت کو سمجھتے ہو جسے امرِ عظیم
یہ تو دراصل بھی وہاں نازو شرارت میں نہیں

دل کے بدلے میں طلب گار نہیں کچھ تم سے
شیفتہ زمرۂ اصحابِ تجارت میں نہیں

○

مت چھیڑ کہ یار سے جدا ہوں
اے مرگ ابھی آپ مر رہا ہوں

مجھکو نہیں یوں ملے ہنسا ہوں
بیگانۂ آشنا نما ہوں

لیلیٰ کے کہنے سے بگڑ گئے تھے
دیوانہ میں جان کر بنا ہوں

کہتا ہوں جو غیر سے نہ ملیے
کہتا ہے کہ کیا میں بے وفا ہوں

روشن ہے مری سیاہ بختی
منت کش سایۂ ہما ہوں

بیگانہ وشی ستم ہے ان کی
غیروں کو بھی یار جانتا ہوں

اس غیرت گل سے ربط معلوم
ہر چند میں ہمدم صبا ہوں

ہمدم! نہ سہی محبت اس کو
اس بات پہ کیا اسے نہ چاہوں؟

مکشوف ہوا فروغ جا سے
ذرہ میں کس آفتاب کا ہوں

میں شیفتہ ہوں عزیز دل ہا
شیریں گفتار، خوش ادا ہوں

○

ہے گونہ گونہ شک ابھی عفوِ گناہ میں
جو ہے زباں پہ وہ نہیں ہے نگاہ میں

تمکینِ اضطراب ہے، بیدادِ التفات
کیا فرخیٔ اثر ہے سراسیمہ آہ میں

ہر خار و خس ہے وجد میں ہر سنگ و خشت مست
کیا مے کشوں نے آ کے کہا خانقاہ میں!

دشمن سے بھی زیادہ ہے اگر دوست کینہ جو
مل جائے جو کوئی ترے کوچہ کی راہ میں

صیاد دل فریب کا اللہ رے لطفِ عام
بے زخم ایک صید نہیں صید گاہ میں

دن رات جلوے دیکھتے ہیں مہر و ماہ کے
یہ روشنی نہ مہر میں دیکھی، نہ ماہ میں

تجھ کو نظر نہ آئے، تو اپنا علاج کر
ہے مرغزار جلوہ نما برگِ کاہ میں

دھوکا مجھی کو صرف نہیں میلِ یار کا
دیکھا بڑے بڑوں کو اسی اشتباہ میں

ہر شیوہ اس کا اپنی جگہ میں تمام ہے
اعجاز بات میں ہے تو جادو نگاہ میں

افسردہ خاطری وہ بلا ہے کہ شیفتہ
طاعت میں کچھ مزہ ہے نہ لذت گناہ میں

○

شوخی نے تیری لطف نہ رکھا حجاب میں
جلوے نے تیرے آگ لگائی نقاب میں

آفتہ گر ہو چرخ میں لا آسماں کو
آ رقص کر زمیں کو ڈال اضطراب میں

سو مہر کا فروغ ہے واں جلوہ گاہ میں
سو باغ کی شمیم ہے واں رختِ خواب میں

وہ قطرہ ہوں کہ موجِ دریا میں گم ہوا
وہ سایہ ہوں کہ محو ہوا آفتاب میں

سالک کی یہ مراد کہ کچھ سا ہو نفس بھی
رہزن کو یہ خیال کہ رہرو ہو خواب میں

اس صوتِ جاں نواز کا ثانی بنا نہیں
کیا ڈھونڈتے ہو بربط و عود و رباب میں

اے واعظ! روزِ حشر اگر ہم سے ہو سوال
جو کچھ کیا ہے ہم نے شبِ ماہتاب میں

شرمِ گنہ، نہ بیمِ عقوبت، یہ سچ ہے
ہے بے اتفاقی اس نے اذیت عتاب میں

دلّی نہ جائے آنکھ جو ساقی سے شیفتہ
ہم کو تو خاک لطف نہ آئے شراب میں

○

کیوں کر کہ مجھے خط رقم کریں گے
کیا غیر کا سر قلم کریں گے

ہم پیشہ ہے اضطراب و شوخی
کس واسطے مجھ سے رم کریں گے

اتنی بھی بُری ہے بے قراری
اب آپ سے اُنس کم کریں گے

مرنے کا مرے نہ ذکر کرنا
قاصد! وہ بہت الم کریں گے

آرام کی فکر اب ہوئی ہے
تم سے نہ ہوا، وہ ہم کریں گے

دلّی میں تو شیفتہ ہے استاد
ہم قصدِ سوئے عجم کریں گے

○

سحر گئے ہو وہ گلگشتِ گلستاں کے لیے
صبا تپش میں ہے، گل لائے بے خزاں کے لیے

انھیں ہے ہم سے محبت محل کی کیا حاجت
اگر کرو تو کرو ان کے پاسباں کے لیے

وہ اپنے باغ میں ہم کو ضرور رکھے گا،
جو بلبلوں کو نہ دے حکم آشیاں کے لیے

کرم کرم نہ سمجھو، اگر کسی غرض سے ہو
ستم ستم نہ سمجھو گر ہو امتحاں کے لیے

کب آپ آئے کہ طاقت نہیں اٹھنے کی
کب آپ آئے کہ جنبش نہیں زباں کے لیے

نہ میکدہ میں ترانہ، نہ خانقہ میں سماع
دعائے خیر ہے اس آفتِ جہاں کے لیے

زیاں ہے عشق میں ہم خود بھی جانتے ہیں مگر
معاملہ ہی کیا ہو اگر زیاں کے لیے!

ہمارے ساتھ ہیں وہ موشگافیاں کہ نہ پوچھ
یہ نکتہ بس ہے کہ آفت ہے نکتہ داں کے لیے

اٹھا اگرچہ بنا بہرِ نازِ دلکشِ دوست
مگر کچھ اپنی بھی آہِ جگر فشاں کے لیے

یہ ضبطِ راز کی تعلیم شیفتہ بے جا
زباں ہم کو ملی ہے اگر بیاں کے لیے

○

بچتے ہیں اس قدر جو اُدھر کی ہوا سے ہم
واقف ہیں شیوۂ دلِ شوخ کش ادا سے ہم

چلتے ہیں میکدہ کو، کہاں یہ عزیزِ رواں
رخصت تو ہو لیں کبر و نفاق و ریا سے ہم

اے جوشِ رشکِ قربِ عدو، اب تو مت اٹھا
بیٹھے ہیں دیکھ بزم میں کس التجا سے ہم

ہے جامہ پارہ پارہ، دل و سینہ چاک چاک
دیوانہ ہو گئے گلِ جیبِ قبا سے ہم

کیا جانتے تھے صبح وہ محشر قد آئے گا
شامِ شبِ فراق نہ مرتے بلا سے ہم

بیگانہ جب سے یار ہوا ہے رقیب سے
امید قطع کر چکے، ہر آشنا سے ہم

بلبل یہ کہہ رہی ہے سرِ شاخسار پر
بدمست ہو رہے ہیں چمن کی ہوا سے ہم

کم التفات ہم سے سمجھتے ہیں اہلِ بزم
شرمندہ ہو گئے تری شرم و حیا سے ہم

ہاں شیفتہ پھر اس میں نصیحت ہی کیوں نہ ہو
سنتے ہیں حرفِ تلخ کو بھی رضا سے ہم

ناسخ لکھنوی

○

مرا سینہ ہے مشرق آفتابِ داغِ ہجراں کا
طلوعِ صبحِ محشر چاک ہے میرے گریباں کا

چمکنا برق کا لازم پڑا ہے آبِ باراں میں
تصور چاہیے رونے میں اس کے روئے خنداں کا

کفن کی جب سفیدی دیکھتا ہوں کنجِ مرقد میں
تو عالم یاد آتا ہے شبِ مہتابِ ہجراں کا

دیا میرے جنازے کو جو کاندھا اس پری رو نے
گماں ہے تختۂ تابوت پر تختِ سلیماں کا

وہ شوخِ فتنہ انگیز اپنی خاطر میں سمایا ہے
کہ یک گوشہ ہے صحرائے قیامت اس کے داماں کا

تہِ شمشیرِ قاتل کس قدر بشاش تھا ناسخ
کہ عالم ہر دہانِ زخم پہ ہے روئے خنداں کا

○

ساتھ اپنے جو مجھے یار نے سونے نہ دیا
رات بھر مجھ کو دلِ زار نے سونے نہ دیا

خواب ہی میں نظر آتا وہ شبِ ہجر کہیں
سو مجھے حسرتِ دیدار نے سونے نہ دیا

خفتگی بخت کی کیا کہیے کہ جز خوابِ عدم
عمر بھر دیدۂ بیدار نے سونے نہ دیا

یہی صیاد گلا کرتا ہے میرا، ہر صبح
نالۂ مرغِ گرفتار نے سونے نہ دیا

سمجھے تھے بعدِ فنا پائیں گے راحت ناسخ
حشر تک وعدۂ دیدار نے سونے نہ دیا

○

کیوں دکھائی اے فلک اب بار صبح
ہے شفق سے مجھ پہ آتش بار صبح

یاں کسی خورشید رُو کی یاد میں
ہوتی ہے ہر رات سو سو بار صبح

زلف سے رخسار کو ہوتا ہے ربط
کیوں شبِ فرقت سے ہے بیزار صبح

وصل کا ساماں ہے آج اے فلک!
شام سے کر پیشتر تیار صبح

حسن کا عالم بھی کیا عالم ہے واہ
زلفِ جاناں شام ہے، رخسار صبح

وصل میں تھا صبح سے بیزار میں
ہجر کی شب مجھ سے ہے بیزار صبح

شام کیا ہو تیرے گھر میں باریاب
ذرّے ہیں سایۂ دیوارِ صبح

ہے یہاں کس کو شبِ فرقت میں ہوش
ہو چکی ہو گی ہزاروں بار صبح

○

تو مجھ سے ہو ہم کنار قاصد
کر لوں میں تجھ کو پیار قاصد

بر آئی ترے قدم کی دولت
امید امیدوار قاصد

آنکھوں سے نکالوں پاؤں پھیلا
گر کوئی چبھا ہو خار قاصد

گر جان بھی دوں تجھے تو کم ہے
ہوں سخت میں شرمسار قاصد

ناسخ بھی تجھ سے پوچھتا ہے
کیسا ہے مزاجِ یار قاصد

ناسخ

○

سب ہمارے لیے زنجیر لیے پھرتے ہیں
ہم سرِ زلفِ گرہ گیر لیے پھرتے ہیں

کون تھا صید وفادار کہ اب تک صیاد
بال و پر اس کے تہِ تیر لیے پھرتے ہیں

تیری صورت سے کسی کی نہیں ملتی صورت
ہم جہاں میں تری تصویر لیے پھرتے ہیں

جب سے مرتا ہے بھلا کس کو عداوت ہوگی
آپ کیوں ہاتھ میں شمشیر لیے پھرتے ہیں

○

دل میں پوشیدہ تپِ عشقِ بتاں رکھتے ہیں
آگ ہم سنگ کی مانند نہاں رکھتے ہیں

مثلِ پروانہ نہیں کچھ زر و مال اپنے پاس
ہم فقط تم پہ فدا کرنے کو جاں رکھتے ہیں

محفلِ یار میں کچھ بات نہ نکلی منہ سے
کہنے کو شمع کی مانند زباں رکھتے ہیں

ہوگیا زرد، پڑی جس کی حسینوں پہ نظر
یہ عجب گل ہیں کہ تاثیرِ خزاں رکھتے ہیں

ہم عوضِ ملکِ جہاں ملکِ سخن اے ناسخ
گو نہیں حکم رواں طبع رواں رکھتے ہیں

○

روز ہے گرمیٔ بازار ترے کوچے میں
جمع ہیں تیرے خریدار ترے کوچے میں

دیکھ کر تجھ کو، قدم اُٹھ نہیں سکتا اپنا
بن گئے صورتِ دیوار ترے کوچے میں

دیر ویراں ہے ترے عہد میں کعبہ ہے خراب
جمع ہیں کافر و دیں دار ترے کوچے میں

روز ہی عشق نے یہ تفرقہ پردازی کی
ہم ہیں زنداں میں، دلِ زار ترے کوچے میں

آرزو ہے جو مروں میں تو یہاں مدفن ہو
ہے جگہ تھوڑی سی درکار ترے کوچے میں

حالِ دل لکھنے کا ناسخ جو نہیں پاتا بار
پھینک جاتا ہے وہ اشعار ترے کوچے میں

○

مجھ کو اب ساقیٔ گلفام سے کچھ کام نہیں
مے سے کچھ کام نہیں، جام سے کچھ کام نہیں

دل میں خوش آتی ہیں صحرا کی ہوائیں پُرخار
اب کسی سروِ گل اندام سے کچھ کام نہیں

اپنے آرام سے ہوں دشتِ جنوں میں تنہا
کسی محبوبِ دل آرام سے کچھ کام نہیں

خانہ برباد ہوں صحرا میں بگولوں کی طرح
سقف و دیوار و در و بام سے کچھ کام نہیں

طائرِ روحِ رسیدہ کی طرح چھوٹا ہوں
اب تو صیاد ترے دام سے کچھ کام نہیں

آئی مدت سے ہوں غربت میں وطن بھول گیا
مجھ کو اب نامہ و پیغام سے کچھ کام نہیں

○

اس ابر میں یار سے جدا ہوں
بجلی کی طرح تڑپ رہا ہوں

امید وصال اب کہاں ہے
اس گل سے برنگِ بُو جدا ہُوں

گلبن ہوں اگر تو ہوں میں بے برگ
بلبل ہوں اگر تو بے نوا ہوں

سر رکھ کے کبھی وہ سو گیا تھا
اب تک زانو کو سونگھتا ہوں

آئینۂ دل میں ہے ترا عکس
دن رات میں تجھ کو دیکھتا ہوں

ہے مہر و وفا سراسر اس میں
ناسخ کیوں کر اسے نہ چاہوں

○

رفعت کبھی کسی کی گوارا یہاں نہیں
جس سرزمیں کے ہم ہیں وہاں آسماں نہیں

دو روز ایک وضع پہ رنگِ جہاں نہیں
وہ کون سا چمن ہے کہ جس کو خزاں نہیں

دشمن اگر وہ دوست ہوا ہے تو کیا عجب
یاں اعتبار دوستیِ جسم و جاں نہیں

منعم کے شکر میں بھی بلائیں کبھی کبھی،
تنہا گدائے لذتِ دنیا زباں نہیں

پژمردہ ایک ہے تو شگفتہ ہے دوسرا
باغِ جہاں میں فصلِ بہار و خزاں نہیں

آتش لکھنوی

○

سن تو سہی جہاں میں ہے تیرا فسانہ کیا!
کہتی ہے تجھ کو خلقِ خدا، غائبانہ کیا!

زیرِ زمیں سے آتا ہے جو گُل سو زر بکف
قاروں نے راستے میں لٹایا، خزانہ کیا

چاروں طرف سے صورتِ جاناں ہو جلوہ گر
دل صاف ہو ترا تو ہے آئینہ خانہ کیا

صیاد! اسیرِ دامِ رگِ گل ہے عندلیب
دکھلا رہا ہے چھپ کے اسے دام و دانہ کیا

طبل و علم نہ پاس ہے اپنے نہ ملک و مال
ہم سے خلاف ہو کے کرے گا زمانہ کیا

آتی ہے کس طرح سے مری قبضِ روح کو
دیکھوں تو موت ڈھونڈتی ہے بہانہ کیا

ترچھی نگہ سے طائرِ دل ہو چکا شکار
جب تیر کج پڑے گا، اُڑے گا نشانہ کیا

یوں مدعی حسد سے نہ دے داد تو نہ دے
آتش غزل یہ تونے کہی عاشقانہ کیا

○

شبِ وصل تھی، چاندنی کا سماں تھا
بغل میں صنم تھا، خدا مہرباں تھا

مبارک شبِ قدر سے بھی وہ شب تھی
سحر تک مہ و مشتری کا قراں تھا

وہ شب تھی کہ تھی روشنی جس میں دن کی
زمیں پر سے اک نور تا آسماں تھا

نکالے تھے دو چاند اُس نے مقابل
وہ شب، صبحِ جنت کا جس پر گماں تھا

عروسی کی شب کی حلاوت تھی حاصل
فرحناک تھی روح، دل شادماں تھا

مشاہد جمالِ پری کی تھیں آنکھیں
مکانِ وصال اک طلسمی مکاں تھا

حضوری نگاہوں کو دیدار سے تھی،
کھلا تھا وہ پردہ کہ جو درمیاں تھا

حقیقت دکھاتا تھا عشقِ مجازی
نہاں جس کو سمجھے ہوئے تھے عیاں تھا

بیاں خواب کی طرح جو کر رہا ہے
یہ قصہ ہے جب کا کہ آتش جواں تھا

○

تیری جو یاد اے دل خواہ بھولا
باللہ بھولا، واللہ بھولا!!

فرقت کی شب میں جاں سوز دل نے
اُف اُف کیا جو، آہ آہ بھولا

پگ رکھ نہ پا کو، جا دل سے غافل
پھیر اس نے کھایا، جو راہ بھولا

زنّار ڈالا، تسبیح پھینکی!
عشقِ صنم میں اللہ بھولا!

خود نے گرایا اس کو نظر سے
جو ذرہ تیری درگاہ بھولا

محروم رکھا ساقی نے ہم کو
اپنے گدا کو جم جاہ بھولا

بُت خانہ چھوڑا، باز آئے بت سے
وہ شیخ بھولا، وہ شاہ بھولا

شرطِ وفا کی کس بے وفا سے
آتش سا عارف، آگاہ بھولا

○

تیرے کوچہ کا ہے اے خانہ خراب افسانہ آج
شیخ کعبہ چھوڑتا ہے، برہمن بت خانہ آج

خوب رُو تجھ سا کوئی بازارِ عالم میں نہیں
قیمتِ یوسفؑ نہ تھی، جو ہے ترا بیعانہ آج

آمد آمد اس سراپا نور کی ہے بزم میں
شمع اُڑ جائے، جو ہاتھ آئیں پرِ پروانہ آج

ہم نشیں! کہتے ہیں: ذکرِ عیش، نصیبِ عیش ہے
میں کہوں، تو سن! جمالِ یار کا افسانہ آج

مجھ سے دریا نوش کو ساقی پلاتا ہے شراب
دیکھتا ہوں میں بھی ظرفِ شیشہ و پیمانہ آج

نقشِ آسیب پری ہے صورتِ زیبا تری
ہوش میں آتا ہے تجھ کو دیکھ کر دیوانہ آج

میرے مرنے کی دعا مانگے وہ بت پڑھ کر نماز
کس طرف جا کر کروں میں سجدۂ شکرانہ آج

نزع کی مشکل بھی آساں ہوتی ہے آتش نہ ڈر
شاہِ مرداں سے طلب کر ہمتِ مردانہ آج

○

غیرتِ مہر، رشکِ ماہ ہو تم
خوبصورت ہو، بادشاہ ہو تم

کیوں کر آنکھیں نہ ہم کو دکھلاؤ
کیسے خوش چشم، خوش نگاہ ہو تم

حسن میں آپ کے ہے شانِ خدا
عشق بازوں کے سجدہ گاہ ہو تم

ہر لباس آپ کو ہے زیبندہ
جامہ زیبوں کے بادشاہ ہو تم

فوق ہے سارے خوش جمالوں پر
وہ ستارے جو ہیں، تو ماہ ہو تم

کیوں محبت بڑھائی تھی تم سے
ہم گنہگار، بے گناہ ہو تم

جو کہ حقِ وفا بجا وے
شاہد اللہ ہے، گواہ ہو تم

ہے تمہارا خیال پیشِ نظر
جس طرف جائیں سدِّ راہ ہو تم

دونوں بندے اسی کے ہیں آتش
خواہ ہم اس میں ہوویں خواہ ہو تم

○

خوشا وہ دل کہ ہو جس دل میں آرزو تیری
خوشا دماغ، جسے تازہ رکھے بو تیری

مری طرف سے صبا! کہیو میرے یوسف سے
نکل چلی ہے بہت، پیرہن سے بو تیری

شبِ فراق میں اے روزِ وصل! تا دمِ صبح
چراغ ہاتھ میں ہے اور جستجو تیری

جو ابرِ گریہ کناں ہے، تو برقِ خندہ زناں
کسی میں خو ہے ہماری، کسی میں خو تیری

کسی طرف سے تو نکلے گا آخر اے شہِ حسن!
فقیر دیکھتے ہیں راہ، کو بہ کو تیری

زمانہ میں کوئی تجھ سا نہیں ہے سیف زباں
رہے گی معرکہ میں آتش آبرو تیری

○

یہ آرزو تھی تجھے گُل کے روبرو کرتے
ہم اور بلبلِ بیتاب، گفتگو کرتے

پیام بر نہ میسّر ہوا، تو خوب ہوا
زبانِ غیر سے کیا شرحِ آرزو کرتے

مری طرح سے مہ و مہر بھی ہیں آوارہ
کسی حبیب کی یہ بھی ہیں جستجو کرتے

جو دیکھتے تری زنجیرِ زلف کا عالم
اسیر ہونے کی آزاد آرزو کرتے

نہ پوچھ عالمِ برگشتہ طالعی آتش
برستی آگ، جو باراں کی آرزو کرتے

○

اے صنم! جس نے تجھے چاند سی صورت دی ہے
اسی اللہ نے مجھ کو بھی محبت دی ہے

تیغِ بے آب ہے نے بازوئے قاتل کمزور
کچھ گراں جانی ہے، کچھ موت نے فرصت دی ہے

کوئی اکسیر، غنی دل نہیں رکھتی ایسا
خاکساری نہیں دی ہے، مجھے دولت دی ہے

فرقتِ یار میں رو رو کے بسر کرتا ہوں
زندگانی مجھے کیا دی ہے، مصیبت دی ہے

یادِ محبوب فراموش نہ ہووے اے دل!
حسنِ نیت نے مجھے عشق سی نعمت دی ہے

گوش پیدا کیے سننے کو ترا ذکرِ جمال
دیکھنے کو ترے آنکھوں میں بصارت دی ہے

لطفِ دل بستگیٔ عاشقِ شیدا کو نہ پوچھ!
دو جہاں سے اس اسیری نے فراغت دی ہے

کمرِ یار کے مضمون کو باندھو آتش!
زلفِ خوباں سی مرے تم کو طبیعت دی ہے

○

وہیں پہ ہیں ان کے گماں کیسے کیسے
کلام آتے ہیں درمیاں کیسے کیسے

زمین چمن گل کھلاتی ہے کیا کیا
بدلتا ہے رنگ آسماں کیسے کیسے

تمہارے شہیدوں میں داخل ہوئے ہیں
گل و لالہ و ارغواں کیسے کیسے

بہار آئی ہے، نشّے میں جھومتے ہیں
مریدانِ پیرِ مغاں کیسے کیسے

نہ مڑ کر بھی بے درد قاتل نے دیکھا
تڑپتے رہے نیم جاں کیسے کیسے!

نہ گورِ سکندر، نہ ہے قبرِ دارا
مٹے نامیوں کے نشاں کیسے کیسے!

غم و غصہ و رنج و اندوہ و حرماں
ہمارے بھی ہیں مہرباں کیسے کیسے

تری کلکِ قدرت کے قرباں آنکھیں
دکھائے ہیں خوش رو جواں کیسے کیسے

کرے جس قدر شکرِ نعمت وہ کم ہے
مزے لوٹتی ہے زباں کیسے کیسے

○

ہوائے دورِ مئے خوشگوار، راہ میں ہے
خزاں چمن سے ہے جاتی، بہار راہ میں ہے

گدا نواز کوئی شہ سوار راہ میں ہے
بلند آج نہایت غبار، راہ میں ہے

عدم کے کوچ کی لازم ہے فکر ہستی میں
نہ کوئی شہر، نہ کوئی دیار راہ میں ہے

طریقِ عشق میں اے دل! عصائے آہ ہے شرط
کہیں چڑھاؤ، کسی جا اتار، راہ میں ہے

نہ بدرقہ ہے، نہ کوئی رفیق ساتھ اپنے
فقط عنایتِ پروردگار، راہ میں ہے

نہ جائیں آپ ابھی وہ پہر ہے گرمی کی
بہت سی گرد، بہت سا غبار، راہ میں ہے

تلاشِ یار میں کیا ڈھونڈیے کسی کا ساتھ
ہمارا سایہ، ہمیں ناگوار، راہ میں ہے

سفر ہے شرط، مسافر نواز بہتیرے
ہزار ہا شجرِ سایہ دار، راہ میں ہے

مقام تک بھی ہم اپنے پہنچ ہی جائیں گے
خدا تو دوست ہے، دشمن ہزار، راہ میں ہے

پتہ یہ کوچۂ قاتل کا سن رکھ اے قاصد!
بجائے سنگِ نشاں، اک مزار، راہ میں ہے

تھکیں جو پاؤں، تو چل سر کے بل، نہ ٹھہر آتش
گلِ مراد ہے منزل میں، خار، راہ میں ہے

امیر مینائی

○

ناوکِ ناز سے مشکل ہے بچانا دل کا
درد اُٹھ اُٹھ کے بتاتا ہے ٹھکانا دل کا

آج اس شوق سے پیکاں مِرے دل میں آیا
آگیا یاد کسی شوخ پہ آنا دل کا

ہائے وہ پہلی ملاقات میں میرا رُکنا
اور اُس کا وہ لگاوٹ سے بڑھانا دل کا

متصل آہ کی پہلو سے صدا آتی ہے
اب وہ ہے درد کا گھر تھا جو ٹھکانا دل کا

جی لگے آپ کا ایسا کہ کبھی جی نہ بھرے
دل لگا کر جو سُنیں آپ فسانہ دل کا

تیر پر تیر لگا کر وہ کہا کرتے ہیں
کیوں جی تم کھیل سمجھتے تھے لگانا دل کا

پھیر کر منہ مجھے تڑپاتے ہیں اور کہتے ہیں
رُخ بدل کر ہم اڑاتے ہیں نشانہ دل کا

ہر نگہ وصل میں اس شوخ کی کہتی ہے امیرؔ
ہو جسے حکم اٹھائے وہ نشانہ دل کا

○

گذشتہ خاک نشینوں کی یادگار ہوں میں
مٹا ہوا سا نشانِ سرِ مزار ہوں میں

نگاہِ کرم سے مجھ کو نہ دیکھ اے دوزخ
خبر نہیں تجھے کس کا گنہگار ہوں میں

پھر اس کی شانِ کریمی کے حوصلے دیکھے
گناہگار یہ کہہ دے گناہگار ہوں میں

جو مست ہوش میں آنے کا قصد کرتا ہے
پکارتا ہے یہ ساقی کہ ہوشیار ہوں میں

حضور! وصل کی حسرت ازل سے ہے مجھ کو
خیال کیجیے کب سے امیدوار ہوں میں

وہ بیقرار ہوں دیکھے اگر تڑپ میری
قرار بھی یہ پکارے کہ بے قرار ہوں میں

بڑے مزے سے گزرتی ہے بیخودی میں امیرؔ
وہ دن خدا نہ دکھائے کہ ہوشیار ہوں میں

○

ہے تصویر حیرانی ہم ان کے روبرو برسوں
لب خاموش سے کی دردِ دل کی گفتگو برسوں

نہیں مشتق ہے دل سے مر کے ان کی آرزو برسوں
[illegible]

فنا کے بعد بھی بے کسوں کو کون پوچھے گا ؟
مگر اُسے بے کسی رویا کرے گی مجھ کو تو برسوں

نہ کر اے یاس! یوں برباد میرے خانۂ دل کو
اسی گھر میں جلایا ہے چراغِ آرزو برسوں

سراپا جرم ہوں، لیکن وہ بندہ پاک طینت ہوں
کیا زاہد نے میرے آبِ خجلت سے وضو برسوں

تمہاری اک نگاہِ ناز نے توڑا اشارے میں
بنایا چشم و دل نے جو طلسمِ آرزو برسوں

کہاں ہوں گی امیر ایسی ادائیں حور و غلماں میں
رہے گا خلد میں بھی یاد ہم کو لکھنؤ برسوں

○

اس کی حسرت ہے، جسے دل سے مٹا بھی نہ سکوں
ڈھونڈنے اس کو چلا ہوں، جسے پا بھی نہ سکوں

ان کے غصے کے مٹانے کی ہیں سو تدبیریں!
لاگ کی آگ نہیں ہے کہ بجھا بھی نہ سکوں

چٹکیاں لینے سے دل میں وہ کریں کیا انکار
داغ کچھ درد نہیں ہے کہ دکھا بھی نہ سکوں

میں اگر گھر سے نکلتا ہوں، تو گھر کیوں ہے اداس
کیا دمِ باز پسیں ہے کہ پھر آ بھی نہ سکوں

کوئی پوچھے تو محبت سے، یہ کیا ہے انصاف
وہ مجھے دل سے بھلا دے، میں بھلا بھی نہ سکوں

نقشِ ہستی کو میں ابھی مٹائے دیتا ہوں
خطِ تقدیر نہیں ہے کہ مٹا بھی نہ سکوں

○

یہ تو میں کیونکر کہوں تیرے خریداروں میں ہوں
تو سراپا ناز ہے میں ناز برداروں میں ہوں

جان پر صدمہ، جگر میں درد، دل کا حالِ زار
گھر کا گھر بیمار، کس کس کے پرستاروں میں ہوں

وہ کرشمے شانِ رحمت نے دکھائے روزِ حشر
چیخ اٹھا ہر بے گنہ میں بھی گنہگاروں میں ہوں

مجھ سے مطلب، نرگس سے کام کیا جانوں انھیں
میں تمھارے سینہ چاکوں میں ہوں، دل افگاروں میں ہوں

پھیر منہ دیکھو! میری میت پر جو آئے، یہ کہا
تم وفاداروں میں ہو، یا میں وفاداروں میں ہوں

کس طرح فریاد کرتے ہیں بتا دو قاعدہ،
اے اسیرانِ قفس! میں نو گرفتاروں میں ہوں

بے گناہوں میں چلا زاہد جو اس کو ڈھونڈنے
مغفرت بولی ادھر آ، میں گنہگاروں میں ہوں

بے گناہوں کا تو دعویٰ ان کے آگے کیا مجال
ڈرتے ڈرتے منہ سے نکلا میں گنہگاروں میں ہوں

آچکا تھا رحم اس کو سن کے میری بے کسی
درد ظالم بول اٹھا میں اس کے غمخواروں میں ہوں

○

صورتِ غنچہ کہاں تابِ تکلم مجھ کو
منہ کے سو ٹکڑے ہوں آئے جو تبسم مجھ کو

وقتِ فرصت تھا میں حیرت کدۂ ہستی میں
کفِ افسوس ملے، جس نے کیا گم مجھ کو

ایک کو ایک سے بڑھ کر ترے جلوے کا ہے شوق
آنکھ کہتی ہے نگہ پہ ہو تقدم مجھ کو

واہ اے بیخودیٔ شوق کیا خوب سلوک
اس کو جب ڈھونڈھ نکالا تو کیا گم مجھ کو

خلوتِ وصل میں کچھ کام نہیں ساقی سے
جامِ مے بھر کے پلاؤں میں تمھیں تم مجھ کو

میں تو کیا، عکس سے وہ آئینہ رو کہتا ہے
پیار کی آنکھ سے دیکھا نہ کرو تم مجھ کو

دیکھتا ہوں کبھی آئینہ تو روتا ہوں امیر
اپنی صورت پہ خود آتا ہے ترحم مجھ کو

○

کہہ رہی ہے حشر میں وہ آنکھ شرمائی ہوئی
ہائے کیسی اس بھری محفل میں رسوائی ہوئی

آئینے میں ہر ادا کو دیکھ کر کہتے ہیں وہ
آج دیکھا چاہیے کس کس کی ہے آئی ہوئی

کہہ تو اے گل چیں! اسیرانِ قفس کے واسطے
توڑ لوں دو چار کلیاں میں بھی مرجھائی ہوئی

میں تو رازِ دل چھپاؤں پر چھپا رہنے بھی دے
جان کی دشمن یہ ظالم آنکھ للچائی ہوئی

کیوں ترے لب پر تبسم مجلسِ ماتم میں ہے
یہ ہنسی بھی کیا مرے پہلو میں ہے آئی ہوئی

گرد اڑی عاشق کی تربت سے تو جھنجھلا کر کہا
واہ سر چڑھنے لگی، پاؤں کی ٹھکرائی ہوئی

شعر گوئی سے ہو افسردہ دل کے کیا امیر
وا ہوئی ہیں پھر کہیں کلیاں بھی مرجھائی ہوئی

○

جب سے بلبل تو نے دو تنکے لیے
ٹوٹتی ہیں بجلیاں ان کے لیے

ہے جوانی خود جوانی کا سنگار
سادگی گہنا ہے اس سن کے لیے

کون ویرانے میں دیکھے گا بہار
پھول جنگل میں کھلے کن کے لیے

ساری دنیا کے ہیں وہ میرے سوا
میں نے دنیا چھوڑ دی جن کے لیے

باغباں! کلیاں ہوں ہلکے رنگ کی
بھیجنی ہیں ایک کم سن کے لیے

سب حسیں ہیں زاہدوں کو ناپسند
اب کوئی حور آئے گی ان کے لیے

وصل کا دن اور اتنا مختصر
دن گنے جاتے تھے اس دن کے لیے

صبح کا سونا جو ہاتھ آتا امیر
بھیجتے تحفہ مؤذن کے لیے

○

اچھے عیسیٰ ہو مریضوں کا خیال اچھا ہے
ہم مرے جاتے ہیں تم کہتے ہو حال اچھا ہے

تجھ سے مانگوں میں تجھی کو کہ سبھی کچھ مل جائے
سو سوالوں سے یہی ایک سوال اچھا ہے

دیکھ لے بلبل و پروانہ کی بے تابی کو
ہجر اچھا، نہ حسینوں کا وصال اچھا ہے

آ گیا اس کا تصور، تو پکارا یہ شوق
دل میں جم جائے الٰہی! یہ خیال اچھا ہے

برق اگر گرمیِ رفتار میں دیکھی ہے امیر
گرمیِ حسن میں وہ برقِ جمال اچھا ہے

○

آنکھ اس کے حضور رو رہی ہے
ساتھ اپنے مجھے ڈبو رہی ہے

دیدار کہاں کہ دور ہے حشر
قسمت ابھی اپنی سو رہی ہے

کیا باغ میں دیکھتی ہے شبنم
جو گل کی ہنسی پہ رو رہی ہے

اللہ رے حسنِ دخترِ رز
زاہد کے حواس کھو رہی ہے

کیا کشتی و ناخدا کا شکوہ
تقدیر ہمیں ڈبو رہی ہے

نرگس کو صبا، نہ چھیڑ اتنا
سونے دے غریب سو رہی ہے

گلشن میں جو ابر ہے دھواں دھار
مے خواروں میں دھوم ہو رہی ہے

اس تیغ کے منہ چڑھے نہ عیسیٰ
کیوں جان سے ہاتھ دھو رہی ہے

کیا شوخ ہے اس کی یادِ مژگاں
دل میں نشتر چبھو رہی ہے

ہم جاگ رہے ہیں ہجر کی شب
تقدیر ہماری سو رہی ہے

احساں ہے امیر چشمِ تر کا
نامے کی سیاہی دھو رہی ہے

داغ دہلوی

○

نقشہ سحر ہے جو نصیب ناز کا
گویا جواب ہے ترے کیہ و ناز کا

عالم تمام چشم حقیقت نگر بنا!
منہ دیکھتا ہے آئنہ آئینہ ساز کا

ہر چند دل کو کعبہ و بت خانہ ایک ہے
اے راہرو ہے کام یہاں امتیاز کا

دنیا بھی اک بہشت ہے اللہ کے کرم
کن نعمتوں کو حکم دیا ہے جواز کا

تجھ سے ہے برسرِ قصور بحر کو دیتا ہے
میں ہوں امام، شاہ عراق و حجاز کا

مجھ کو نہ کیوں کہ اس کی غلامی سے فخر ہو
محمود ایک بردہ ہے جس کے ایاز کا

کوئی جس کے نام سے بگڑا ہے ہیں داغ
میں ہوں نیاز مند اسی بے نیاز کا

○

اب دل ہے مقام بے کسی کا
یوں گھر نہ تباہ ہو کسی کا

کس کس کو مزہ ہے عاشقی کا
تم نام تو لو، بھلا کسی کا

گلشن میں ترے لبوں نے گویا
رس چوس لیا، کلی کلی کا

اتنی ہی تو بس کسر ہے تم میں
کہنا نہیں مانتے، کسی کا!

آغاز کو کون پوچھتا ہے
انجام اچھا ہو، آدمی کا

کہتے ہیں اسے زبانِ اُردو
جس میں نہ ہو رنگ فارسی کا

○

خاطر سے، یا لحاظ سے، میں مان تو گیا
جھوٹی قسم سے، آپ کا ایمان تو گیا

دل لے کے مفت کہتے ہیں: کچھ کام کا نہیں
اُلٹی شکایتیں ہوئیں، احسان تو گیا

دیکھا ہے بت کدے میں، جو اے شیخ! کچھ نہ پوچھ
ایمان کی تو یہ ہے کہ ایمان تو گیا

افشائے رازِ عشق میں گو ذلتیں ہوئیں
لیکن اسے جتا تو دیا، جان تو گیا

ہوش و حواس و تاب و تواں داغ جا چکے
اب ہم بھی جانے والے ہیں سامان تو گیا

○

پکارتی ہے خموشی مری، فغاں کی طرح
نگاہیں کہتی ہیں سب رازِ دل، زباں کی طرح

بگڑ گئی ہے یہاں بے طرح، جہاں کی طرح
کہاں کی وضع، کہاں کی ادا، کہاں کی طرح

چھڑا دے قید سے، اے قید! ہم اسیروں کو
لگا دے آگ قفس میں بھی آشیاں کی طرح

جلا کے داغِ محبت نے دل کو خاک کیا
بہار آئی مرے باغ میں، خزاں کی طرح

جوابِ خضر ہیں وہ مُردہ دل کہ جن کو یہاں
ملی ہے مرگِ ابد، عمرِ جاوداں کی طرح

یہ بدراہ ہوا، کس کا پاسِ رسوائی
رکے ہوئے ہیں مرے اشک کارواں کی طرح

ادائے مطلبِ دل، ہم سے سیکھ جائے کوئی
انھیں سنا ہی دیا حال، داستاں کی طرح

ہم اپنے ضعف کے صدقے، بٹھا دیا ایسا
ہلے نہ در سے ترے سنگِ آستاں کی طرح

خدا قبول کرے، داغ! تم جو سوئے عدم
چلے ہو عشقِ بتاں لے کے ارمغاں کی طرح

○

سوز و گداز عشق کا لذت چشیدہ ہوں
مانندِ آبلہ، ہمہ تن آب دیدہ ہوں

گر تو نہ ہو، تو پھر کسی کافر کا دل لگے
دوزخ میں آرمیدہ و ارم سے رمیدہ ہوں

نازک مزاجیوں نے مجھے ابھر سا کر دیا
اے بے خبر! میں اپنے سے آپ ہی کشیدہ ہوں

افتادگی پہ بھی نہ گئی اس کی جستجو!
گویا زمیں پہ سایۂ مرغِ پریدہ ہوں

اے داغ! جس کے واسطے روزِ جزا بنا
وہ کون ہے؟ وہ میں ہی تو آفت رسیدہ ہوں

○

سازِ یہ کینہ ساز کیا جانیں
ناز والے نیاز کیا جانیں

کب کسی در کی جبہہ سائی کی
شیخ صاحب نماز کیا جانیں

جو رہِ عشق میں قدم رکھیں
وہ نشیب و فراز کیا جانیں

پوچھیے میکشوں سے لطفِ شراب
یہ مزہ پاکباز کیا جانیں

حضرتِ خضر جب شہید نہ ہوں
لطفِ عمرِ دراز کیا جانیں

جو گزرتے ہیں داغ پر صدمے
آپ بندہ نواز کیا جانیں

○

نے تیری کام کیا اک نگاہ میں
صوفی ہے بت کدہ میں، صنم خانقاہ میں

ں چھپائیں ہم تو عدو کی بھی راہ میں
پر کیا کریں، اک تو ہے ہماری نگاہ میں

ہوں آگئے، پوچھ کے بس سے مقامِ عشق
جو فتنہ مجھ غریب کو ملتا ہے راہ میں

ساختگی میں قیامت کی شوخیاں
دو چار دن رہا تھا تمھاری نگاہ میں

مصیبتوں کی جو گزری تھیں آج تک
ماتم کو آئی ہیں مرے روزِ سیاہ میں

ذ یہ ہے ناز تجھے زاہد اس قدر
جو ٹوٹ کر شریک ہو میرے گناہ میں

ہے بات بات مجھے یاد بار بار
کہتا ہوں دوڑ دوڑ کے قاصد سے راہ میں

نظارہ، کس کا اشارہ، کہاں کی بات
سب کچھ ہے اور کچھ نہیں، نیچی نگاہ میں

مشتاق اس صدا کے بہت دردمند تھے
اے داغ! تم تو بیٹھ گئے ایک آہ میں

○

چاک ہو پردۂ وحشت، مجھے منظور نہیں
ورنہ یہ ہاتھ، گریباں سے کچھ دور نہیں

وصل سے یاس ہو، ایسا دلِ رنجور نہیں
بُت اگر دُور ہے مجھ سے، تو خدا دور نہیں

چھین لیں دل کو اگر وہ، تو یہ مجبوری ہے
میں کیے جاؤں گا، محتاج ہوں مقدور نہیں

لب تک آئی تھی شکایت کہ محبت نے کہا
دیکھ! پچھتائے گا، خاموش! یہ دستور نہیں

رات دن نامہ و پیغام کہاں تک ہوں گے
صاف کہہ دیجیے، ملنا ہمیں منظور نہیں

کیا کرے داغ کوئی اس کی محبت کا علاج
وہ کلیجا ہی نہیں جس میں یہ ناسور نہیں

○

اشک خوں رنگ بہے جاتا ہے
داغ اپنی جمائے جاتا ہے

کتنا باوضع ہے خیال اُس کا
بے کسی میں بھی آئے جاتا ہے

دیکھتا رشک اس کی محفل کا
ایک کو ایک کھائے جاتا ہے

وہ جدھر کو گئے، اُٹھا یہ شور
وہ قیامت اُٹھائے جاتا ہے

آتشِ شوق کیا بجھے ناصح!
تو پنکھے لگائے جاتا ہے

○

سبق ایسا پڑھا دیا تو نے
دل سے سب کچھ بھلا دیا تو نے

ہم نکمے ہوئے زمانے کے
کام ایسا سکھا دیا تو نے

دکھ دینے کا ایک دینا ہے
دلِ بے مدعا دیا تو نے

بے طلب جو ملا، ملا مجھ کو
بے غرض جو دیا، دیا تو نے

عمرِ جاوید، خضر کو بخشی
آبِ حیواں پلا دیا تو نے

نارِ نمرود کو کیا گلزار
دوست کو یوں بچا دیا تو نے

کہیں مشتاق سے حجاب ہوا
کہیں پردہ اُٹھا دیا تو نے

جس قدر میں نے تجھ سے خواہش کی
مجھ کو اس سے سوا دیا تو نے

مٹ گئے دل سے نقشِ باطل سب
نقش اپنا جما دیا تو نے

مجھ گنہگار کو، جو بخش دیا
تو جہنم کو کیا دیا تو نے؟

داغ کو کون دینے والا تھا
جو دیا، اے خدا! دیا تو نے

مولانا حالی

○

ں از ظہورِ عشق، کسی کا نشاں نہ تھا
ا حسن میزباں، کوئی مہماں نہ تھا

لتھی ان کے بھول گئیں کلفتیں تمام
ریا ہمارے سر پہ کبھی آسماں نہ تھا

یا ہانتے تھے، جائے گا جی اک نگاہ میں
ق دل کی احتیاط، مگر ہم جاں نہ تھا

کا ہے کہ پاسِ خاطرِ نازک عذاب ہے
تھا دل کو جب فراغ کہ وہ مہرباں نہ تھا

رات ان کو بات بات پہ سو سو دیے جواب
ہ کو خود اپنی ذات سے ایسا گماں نہ تھا

روتا ہے یہ کہ آپ بھی ہنستے ہیں بندہ یاں
طبعِ رقیب لا یہ کچھ ایسا گماں نہ تھا

بزمِ سخن میں جی نہ لگا اپنا زینہار
شب انجمن میں حالیِ جادو بیاں نہ تھا

○

رنج اور رنج بھی تنہائی کا
وقت پہنچا مری رسوائی کا

عمر شاید نہ کرے آج وفا
کاٹنا ہے شبِ تنہائی کا

تم نے کیوں وصل میں پہلو بدلا
کس کو دعویٰ ہے شکیبائی کا

اس سے نادان ہی بن کر ملیے!
کچھ اجارہ نہیں دانائی کا

کچھ تو ہے قدر تماشائی کی
ہے جو یہ شوق خود آرائی کا

اس کو چھوڑا تو ہے لیکن اے دل!
مجھ کو ڈر ہے تری خود رائی کا

بزمِ دشمن میں نہ جی سے اترا
پوچھنا کیا تری زیبائی کا

محتسب! عذر بہت ہیں، لیکن
اذن ہم کو نہیں گویائی کا

ہوں گے حالی سے بہت آوارہ
گھر ابھی دور ہے رسوائی کا

○

قلق اور دل میں سوا ہو گیا
دلاسا تمہارا بلا ہو گیا

دکھانا پڑے گا مجھے زخمِ دل
اگر تیر اس کا خطا ہو گیا

سبب ہو نہ ہو لب پہ آنا ضرور
مرا شکر اس کا گلا ہو گیا

وہ امید کیا جس کی ہو انتہا
وہ وعدہ نہیں جو وفا ہو گیا

ہوا سسکتے سسکتے دمِ آخر فنا
مرض بڑھتے بڑھتے دوا ہو گیا

نہیں بھولتا اس کی رخصت کا وقت
وہ رو رو کے ملنا بلا ہو گیا

سماں کل کا رہ رہ کے آتا ہے یاد
ابھی کیا تھا، اور کیا سے کیا ہو گیا

ٹپکتا ہے اشعارِ حالی سے حال
کہیں سادہ دل مبتلا ہو گیا

○

اس کے جاتے ہی یہ کیا ہو گئی گھر کی صورت
نہ وہ دیوار کی صورت ہے نہ در کی صورت

کس سے پیمانِ وفا باندھ رہی ہے بلبل
کل نہ پہچان سکے گی گلِ تر کی صورت

اپنی جیبوں سے رہیں سارے نمازی ہشیار
اک بزرگ آتے ہیں مسجد میں خضر کی صورت

دیکھئے شیخ! مصور سے کھچے یا نہ کھچے
صورت اور آپ سے بے عیب بشر کی صورت

واعظو! آتشِ دوزخ سے جہاں کو تم نے
یہ ڈرایا ہے کہ خود بن گئے ڈر کی صورت

شوق میں اس کے مزا، درد میں اس کے لذت
ناصحو! اس سے نہیں کوئی مفر کی صورت

کیا خبر زاہدِ قانع کو کہ کیا چیز ہے حرص
اس نے دیکھی ہی نہیں کیسۂ زر کی صورت

حملہ اپنے پہ بھی اک بعدِ ہزیمت ہے ضرور
رہ گئی ہے یہی اک فتح و ظفر کی صورت

رہنماؤں کے ہوئے جاتے ہیں اوسان خطا
راہ میں کچھ نظر آتی ہے خطر کی صورت

ان کو حالی بھی بلاتے ہیں گھر اپنے مہماں
دیکھنا آپ کی اور آپ کے گھر کی صورت

○

...بڑھے دقصۂ عشقِ بتاں سے ہم
سب کچھ کہا، مگر نہ کھلے رازداں سے ہم

...بھاگتے ہیں سایۂ عشقِ بتاں سے ہم
کچھ دل سے ہیں ڈرے ہوئے کچھ آسماں سے ہم

...بستگیِ شب کا مزہ بھولتے نہیں
آئے ہیں آج آپ میں یا رب! کہاں سے ہم

...فراق و شکوۂ عدو تنگ گماں نہیں
تنگ آ گئے ہیں اپنے دلِ شادماں سے ہم

...تے ہیں تو جئیں اگر اے زخمِ تیغِ عشق!
بدلیں گے تجھ کو زندگیِ جاوداں سے ہم

...نے دو چین کوئی دم اے منکر و نکیر!
آئے ہیں آج چھوٹ کے قیدِ گراں سے ہم

...تے ہیں اس کے گریۂ بے اختیار پر
بھولے ہیں بات کہہ کے کوئی رازداں سے ہم

...شوق سے بگاڑ کی باتیں کیا کرو
کچھ پا گئے ہیں آپ کی طرزِ بیاں سے ہم!

...ش ہر ایک قطعۂ صحرا ہے راہ میں
ملتے ہیں جا کے دیکھیے کب کارواں سے ہم

قوت ترے کلام میں آئی کہاں سے ہے
پوچھیں گے جا کے حالیِ جادو بیاں سے ہم

○

ہے جستجو کہ خوب سے ہے خوب تر کہاں
اب ٹھہرتی ہے دیکھیے جا کر نظر کہاں

ہیں دورِ جامِ اوّلِ شب میں خودی سے دور
ہوتی ہے آج دیکھیے ہم کو سحر کہاں

یا رب! اس اختلاط کا انجام ہو بخیر
تھا اس کو ہم سے ربط، مگر اس قدر کہاں

اک عمر چاہیے کہ گوارا ہو نیشِ عشق،
رکھی ہے آج لذتِ زخمِ جگر کہاں

بس ہو چکا بیاں کسل و رنجِ راہ کا
خط کا مرے جواب ہے اے نامہ بر کہاں

کون و مکاں سے ہے دلِ وحشی کنارہ گیر
اس خانماں خراب نے ڈھونڈا ہے گھر کہاں

ہم جس پہ مر رہے ہیں وہ ہے بات ہی کچھ اور
عالم میں تجھ سے لاکھ سہی، تو مگر کہاں

ہوتی نہیں قبول دعا ترکِ عشق کی
دل چاہتا نہ ہو، تو زباں میں اثر کہاں

حالی نشاطِ نغمہ و مے ڈھونڈتے ہو اب
آئے ہو وقتِ صبح، رہے رات بھر کہاں

○

کوئی محرم نہیں ملتا جہاں میں
مجھے کہنا ہے کچھ اپنی زباں میں

قفس میں جی نہیں لگتا کسی طرح
لگا دو آگ کوئی آشیاں میں

کوئی دن بو الہوس بھی شاد ہو لیں
دھرا کیا ہے اشاراتِ نہاں میں

نیا ہے لیجیے جب نام اُس کا
بہت وسعت ہے میری داستاں میں

دلِ پُر درد سے کچھ کام لوں گا
اگر فرصت ملی مجھ کو جہاں میں

بہت جی خوش ہُوا حالی سے مل کر
ابھی کچھ لوگ باقی ہیں جہاں میں

○

حق وفا کے جو ہم جتانے لگے
آپ کچھ کہہ کے مسکرانے لگے

تھا یہاں دل میں طعنِ وصلِ عدو
عذر ان کی زباں پہ آنے لگے

ہم کو جینا پڑے گا فرقت میں
وہ اگر ہمت آزمانے لگے

ڈر ہے، میری زباں نہ کھل جائے
اب وہ باتیں بہت بنانے لگے

جان بچتی نظر نہیں آتی!
غیر الفت بہت جتانے لگے

سخت مشکل ہے شیوۂ تسلیم!
ہم بھی آخر کو جی چرانے لگے

جی میں ہے، لوں رضائے پیرِ مغاں
قافلے پھر حرم کو جانے لگے

سِرّ باطن کو فاش کر، یا رب
اہلِ ظاہر بہت ستانے لگے

وقتِ رخصت تھا سخت حالی پر
ہم بھی بیٹھے تھے، جب وہ جانے لگے

○

جس کو غصے میں لگاوٹ کی ادا یاد رہے
آج دل دے گا، اگر کل نہ لیا، یاد رہے

شوق بڑھتا گیا، جوں جوں رکے اس شوخ سے ہم
یہ سبق وہ ہے کہ بھولے سے سوا یاد رہے

ہم بھی آدابِ شریعت سے تھے آگاہ مگر
نہ ہو برتاؤ میں جو رسم، وہ کیا یاد رہے

یاد آؤ گے بہت، لطف سمجھ کر کیجے!
اس بھلاوے کا ہے انجام برا، یاد رہے

شیخ! یاں شرمِ گنہ، شوق بھلا دیتا ہے
توبہ ان کی ہے، جنھیں اپنی خطا یاد رہے

خضر نے پاؤں اگر دشتِ فنا میں رکھا
بھول جائیں گے رہِ آبِ بقا، یاد رہے

چارہ گر! کار بہ اندازۂ تدبیر نہیں
کیجیو ہمت، اگر وقتِ دعا یاد رہے

ابھی جانا نہیں حالی نے کہ کیا چیز ہیں وہ
حضرت اس لطف کا پائیں گے مزا، یاد رہے

○

دھوم تھی اپنی پارسائی کی
کی بھی اور کس سے آشنائی کی

کیوں بڑھاتے ہو اختلاط بہت
ہم میں طاقت نہیں جدائی کی

منہ کہاں تک چھپاؤ گے ہم سے
تم کو عادت ہے خود نمائی کی

لاگ میں ہیں لگاؤ کی باتیں
صلح میں چھیڑ ہے لڑائی کی

دل بھی پہلو میں ہو، تو یاں کس سے
رکھیے امید دل ربائی کی

نہ ملا کوئی غارتِ ایماں
رہ گئی شرم پارسائی کی

موت کی طرح جس سے ڈرتے تھے
ساعت آ پہنچی اس جدائی کی

زندہ پھرنے کی ہے ہوس حالی
انتہا ہے یہ بے حیائی کی

اکبر الہ آبادی

○

ہنگامہ ہے کیوں برپا تھوڑی سی جو پی لی ہے
ڈاکہ تو نہیں مارا چوری تو نہیں کی ہے

نا تجربہ کاری سے واعظ کی یہ باتیں ہیں
اس رنگ کو کیا جانے پوچھو تو کبھی پی ہے!

اس مے سے نہیں مطلب دل جس سے ہے بیگانہ
مقصود ہے اس مے سے دل ہی میں جو کھنچتی ہے

اے شوق وہی مے پی اے ہوش ذرا سو جا
مہمان نظر اس دم ایک برق تجلی ہے

واں دل میں کہ صدمے دو یاں جی میں کہ سب سہہ لو
ان کا بھی عجب دل ہے میرا بھی عجب جی ہے

ہر ذرہ چمکتا ہے انوار الٰہی سے
ہر سانس یہ کہتی ہے ہم ہیں تو خدا بھی ہے

سورج میں لگے دھبا فطرت کے کرشمے ہیں
بت ہم کو کہیں کافر اللہ کی مرضی ہے

○

غمزہ نہیں ہوتا کہ اشارہ نہیں ہوتا
آنکھ ان سے جو ملتی ہے تو کیا کیا نہیں ہوتا

جلوہ نہ ہو معنی کا تو صورت کا اثر کیا
بلبل گل تصویر کا شیدا نہیں ہوتا

اللہ بچائے مرض عشق سے دل کو
سنتے ہیں کہ یہ عارضہ اچھا نہیں ہوتا

تشبیہ ترے چہرے کو کیا دوں گل تر سے
ہوتا ہے شگفتہ مگر اتنا نہیں ہوتا

میں نزع میں ہوں آئیں تو احسان ہے ان کا
لیکن یہ سمجھ لیں کہ تماشا نہیں ہوتا

ہم آہ بھی کرتے ہیں تو ہو جاتے ہیں بدنام
وہ قتل بھی کرتے ہیں تو چرچا نہیں ہوتا

اکبر

○

چمن کی یہ کیسی ہوا ہو گئی
کہ صر صر سے بد تر صبا ہو گئی

عیادت کو آئے شفا ہو گئی
علالت ہماری دوا ہو گئی

وہ اُٹھے تو آنکھوں ہی فتنے اُٹھے
چلے تو قیامت بپا ہو گئی

محبت کی گرمی میں کیا چیز ہے
طبیعت مری کیا سے کیا ہو گئی

لگاوٹ بہت ہے تری آنکھ میں
اسی سے تو یہ فتنہ زا ہو گئی

بتوں نے بلایا جو دل سے مجھے
مرے ساتھ یادِ خدا ہو گئی

انھیں نے عطا کی تھی جانِ حزیں
ہوا خوب انھیں پہ فدا ہو گئی

○

فلسفی کو بحث کے اندر خدا ملتا نہیں
ڈور کو سلجھا رہا ہے اور سرا ملتا نہیں

معرفت خالق کی عالم میں بہت دشوار ہے
شہرِ تن میں جب کہ خود اپنا پتہ ملتا نہیں

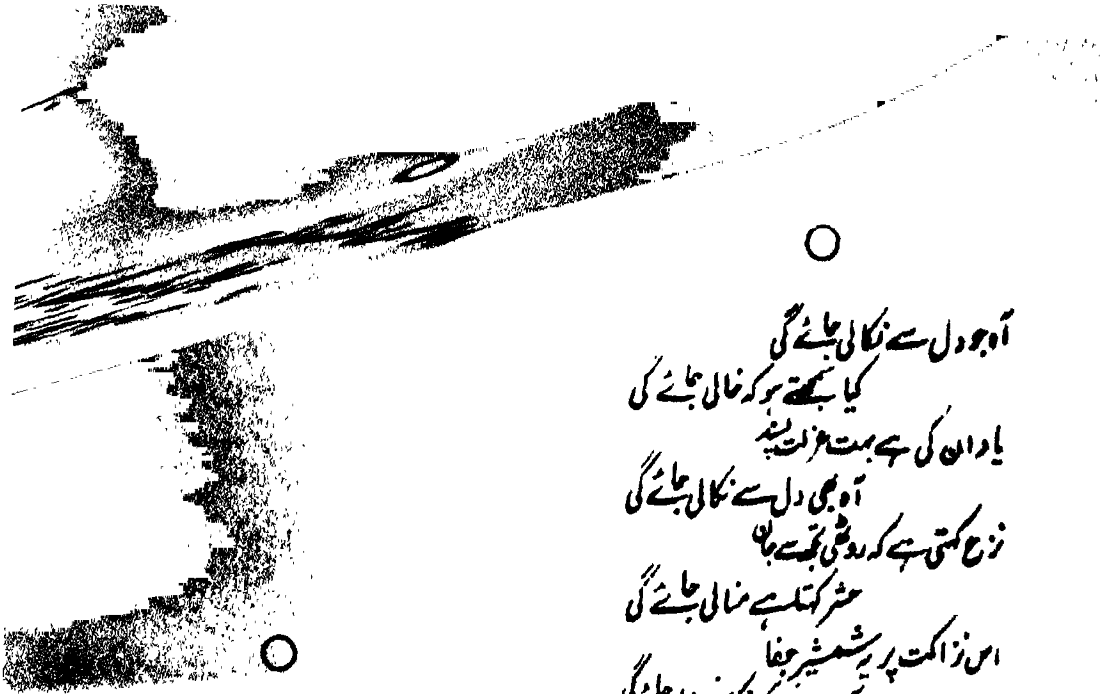
زندگانی کا مزہ ملتا تھا جن کی بزم میں
ان کی قبروں کا بھی اب مجھ کو پتہ ملتا نہیں

کشتیِ دل کی الٰہی بحرِ ہستی میں ہو خیر
ناخدا ملتے ہیں لیکن باخدا ملتا نہیں

صرف ظاہر ہو گیا سرمایۂ زیب و صفا
کیا تعجب ہے جو باطن باصفا ملتا نہیں

پختہ طبعوں پر حوادث کا نہیں ہوتا اثر
کوہساروں میں نشانِ نقشِ پا ملتا نہیں

شیخ صاحب برہمن سے لاکھ برتیں دوستی
بے بھجن گائے تو مندر سے ٹکا ملتا نہیں



آہ جو دل سے نکالی جائے گی
کیا سمجھتے ہو کہ خالی جائے گی

یاد ان کی ہے بہت عزلت پسند
آہ بھی دل سے نکالی جائے گی

نزع کہتی ہے کہ روٹھی تجھ سے جاں
حشر کہتا ہے منالی جائے گی

اس نزاکت پر یہ شمشیر جفا
آپ سے کیونکر سنبھالی جائے گی

بے تکلف چاہیئے سوز و گداز
شمع کیوں سانچے میں ڈھالی جائیگی

کیا غم دنیا کا ڈر مجھ رند کو
اور اک بوتل چڑھالی جائے گی

زندگی کی کل ہے پیچیدہ تو خیر
سانس لے لے کر چلا لی جائے گی

شیخ کی دعوت میں مے کا کام کیا
احتیاطاً کچھ منگالی جائے گی

یاد ابرو میں ہے اکبر محو یوں
کب تری یہ کج خیالی جائے گی

ترے سحر نظر سے ہوا یہ جنوں مرے دل کی تو اس میں خطا ہی نہ تھی
ترے کوچے میں آکے میں بیٹھ رہا بجز اس کے کچھ اور دوا ہی نہ تھی

ہوئی طبع جو مائل دام بلا، میں تمہاری ہی زلف سیہ میں پھنسا
مرے دامن دل کو جو کھینچ سکے، کوئی اور تو ایسی بلا ہی نہ تھی

کیا صحبت غیر نے قہر و غضب مجھے کوئی امید وہی نہیں اب
دم چند کو مجھ سے ملے بھی جو کل، وہ نظر ہی نہ تھی وہ ادا ہی نہ تھی

نہ نبھی تو پھر اس میں تھی کس کی خطا، یہ گلا ہے مری ہی طرف سے بجا
مرے عشق کا رنگ تو خوب رہا، مگر آپ میں بوئے وفا ہی نہ تھی

میں وطن سے حزین و ملول پھرا، نہ وہ بزم ملی نہ وہ یار ملے،
گل و لالہ و سرو کا ذکر بجا، وہ چمن ہی نہ تھا وہ ہوا ہی نہ تھی

غم ہجر میں جی سے گیا جو گذر، تو یہ اکبر زار نے خوب کیا
کہ علاج فراق تو تھا یہی، بجز اس کے کچھ اور دوا ہی نہ تھی

شاد عظیم آبادی

[…] ذوقِ سجود پیدا ستارہ ہو اوج پر جبیں کا
[…] سجدہ زمیں پہ ہو تو فخر ہے وہ رُخِ زمیں کا

[…] اس گل کے پاس آئی تو میرے دل کو ہوا کھٹکا
[…] شگوفہ نہ یہ کھلائے پیام لائی نہ ہو کہیں کا

[…] مری نظر ہے نہ لالہ و گل کی کچھ خبر ہے
[…] ے لیے ہے کافی تصور اس روئے آتشیں کا

نظر کو ہو ذوقِ معرفت کا کرے تو شرحِ [illegible]
سوال پیدا جو ہوں گے دل میں انھیں سے ہوں گے جواب پیدا

کرو نہ کچھ فکرِ جام و ساقی بہار آنے تو دو چمن میں
گلوں سے ٹپکے گا رنگِ مستی ہوا کرے گی شراب پیدا

نہ اس کو لوٹنے کا موقع نہ شوقِ گستاخیوں کا حامی
اداؤں میں کچھ لگاوٹیں ہیں نگاہ سے ہے عتاب پیدا

ہر اک کے وقت ہے اس کی زینت نہ ہے تری شانِ تیری قدرت
کہ آنکھ کو اشک سے ہے بھرتی گہر سے کرتی ہے آب پیدا

یہ منزلِ حرص مال و دولت نہ دے گی دنیا میں تم کو راحت
ہوس بڑھائے گی تشنگی کو نظر کرے گی سراب پیدا

○

…دل سے نکالی جائے گی
کیا سمجھتے ہو کہ خالی جائے گی

…ن کی ہے بہت عزلت پسند
آہ بھی دل سے نکالی جائے گی

…کتی ہے کہ روشنی تجھ سے جان
حشر کہتا ہے مثال جائے گی

…نزاکت پر یہ شمشیر جفا
آپ سے کیونکر سنبھالی جائے گی

…تکلف چاہیے سوز و گداز
شعر کیوں سانچے میں ڈھالی جائیگی

…غم دنیا کا ڈر کچھ نہ کرو
اور اک بوتل چڑھا لی جائے گی

…ندگی کی کل ہے پیچیدہ تر
سانس سے کر چالی جائے گی

…ج کی دعوت میں مے کا کام کیا
احتیاطاً کچھ منگالی جائے گی

یادِ ابرو میں ہے اکبر محو کیوں
کب تری یہ کج خیالی جائے گی

○

ترے سحر نظر سے ہوا یہ جنوں مرے دل کی تو اس میں خطا ہی نہ تھی
ترے کوچے میں آکے میں بیٹھ رہا، بجز اس کے کچھ اور دوا ہی نہ تھی

ہوئی طبع جو مائل دام بلا، میں تمہاری ہی زلف سیہ میں پھنسا
مرے دامن دل کو جو کھینچ سکے، کوئی اور تو ایسی بلا ہی نہ تھی

کیا صحبت غیر نے قہر و غضب مجھے کوئی امید رہی نہیں اب
دم چند کو مجھ سے ملے بھی جو کل، وہ نظر ہی نہ تھی وہ ادا ہی نہ تھی

نہ نبھی تو پھر اس میں تھی کس کی خطا، یہ گلا ہے مری ہی طرف سے بجا
مرے عشق کا رنگ تو خوب رہا، مگر آپ میں بوئے وفا ہی نہ تھی

میں دلی سے حزیں وطن پھرا، نہ وہ بزم ملی نہ وہ یار ملے،
گل و لالہ و سرو کا ذکر کجا، وہ چمن ہی نہ تھا وہ ہوا ہی نہ تھی

غم ہجر میں جی سے گیا جو گزر، تو یہ اکبر زار نے خوب کیا
کہ علاج فراق تو تھا یہی، بجز اس کے کچھ اور دوا ہی نہ تھی

○

ـے شب بھی ہے عنبر افشاں عروج بھی ہے مہ جبیں کا
ـونے کی وہ اجازت محل نہیں ہے نہیں نہیں کا

ـر ذوقِ سجدہ پیدا ستارہ ہو اوج پر جبیں کا
ـ سجدہ زمیں پر ہو تو فخر ہے وہ رخِ زمیں کا

ـی اس گل کے پاس آئی تو میرے دل کو ہوا کھٹکا
ـشگوفہ نہ یہ کھلائے پیام لائی نہ ہو کہیں کا

ـر مری نظر ہے نہ لالہ و گل کی کچھ خبر ہے
ـ دل کے لیے ہے کافی تصور اس روئے آتشیں کا

○

نظر کو ہو ذوقِ معرفت کا کرے تو شوقِ اضطراب پیدا
سوال پیدا جو ہوں گے دل میں انھیں سے ہوں گے جواب پیدا

کرو نہ کچھ فکرِ جام و ساقی بہار آنے تو دو چمن میں
گلوں سے ٹپکے گا رنگِ مستی ہوا کرے گی شراب پیدا

نہ آس کو ٹوٹنے کا موقع نہ شوقِ گستاخیوں کا حامی
اداؤں میں کچھ لگاوٹیں ہیں نگاہ سے ہے عتاب پیدا

ہر اک کے وقت ہے اس کی زینت یہ ہے تری شان تیری قدرت
کہ آنکھ کو اشک سے ہے بھرتی گہر سے کرتی ہے آب پیدا

یہ منزلِ حرص مال و دولت نہ دے گی دنیا میں تم کو راحت
ہوس بڑھائے گی تشنگی کو نظر کرے گی سراب پیدا

○

کبھی جو دعوی منصور میں شک آتا ہے
خیال یار مجھے آئنہ دکھاتا ہے

وہ بات ہوں کہ جو آتی ہے ہر کسی لب تک
وہ حال ہوں کہ جسے سن کے رحم آتا ہے

ہمیں تو آٹھ پہر رہتی ہے تمھاری یاد
کبھی تمھیں بھی ہمارا خیال آتا ہے؟

نہ جانے کا تو نہیں جانتے بہانہ کچھ
ہزار حیلہ نہ آنے کا تم کو آتا ہے

وہ میکدہ ہے ہمارا کہ جس میں مستقل ہے
ہزار ساغر جم روز ٹوٹ جاتا ہے

نہ پوچھیے ستم جوش حسرت دیدار
یہ جان زار کو آنکھوں میں کھینچ لاتا ہے

دوئی کا دخل نہیں بزم وصل میں سنو یار
وگرنہ آپ میں آتا تو پھر کو آتا ہے

فنا کا خوف کچھ اہل حیات ہی کو نہیں
ہوا سے شمع کا شعلہ بھی کانپ جاتا ہے

خدا کے واسطے یاد خدا کر اے اکبر
بتوں کے عشق میں جان اپنی کیوں گنواتا ہے

○

اس میں کمسن آپ کا آتا ہیں
دل کو اپنے یونہی سنبھالیں

آپ ناحق ہیں اور ہم حق
آپ سے ہم کبھی نہ ہاریں۔

عشق کہتا ہے لطف ہوں گے
ہجر کہتا ہے جان ماریں۔

لیجیے جان، ہے یہی جو
کیجیے ظلم، دم نہ ماریں

دل کی افسردگی نہ جائے
ہاں وہ چاہیں گے تو ابھاریں

پند اکبر کو دیں گے کیا
قتل کر کیا با جہاں سنواریں۔

○

ے جاتا تھا غرق اپنے ہی افسانے میں تھا
مرتے ہوش باقی تیرے دیوانے میں تھا

اکر جھلکتی تھی کس ادا سے اک پری
ساقی کا شاید عکس پیمانے میں تھا

ے وہ خود رفتگی الجھے ہوئے سب سر کے بال
ی بات اب کہاں جو تیرے دیوانے میں تھا

نا تھا جس طرف اپنا ہی جلوہ تھا عیاں
ہ تھا وحشی کوئی اس آئینہ خانے میں تھا

یا تھا، کچھ شیشے میں تھی یا ٹوٹے سبو
کیا اس کے مستوں کے ویرانے میں تھا

ے ہنستے رو دیا کرتے تھے سب بے اختیار
ی ترکیب کا درد اپنے افسانے میں تھا

دیکھا پوچھو نہ مجھ سے میرے دل کے داغ کو
ا سا چراغ اک اپنے ویرانے میں تھا

شاد عظیم آبادی

○

دل تو بدنام ہے اک عمر سے کیا اس کا گلہ، کہتے آتی ہے حیا
یہ تمنا، یہ امیدیں، جنھیں برسوں پالا، کس طرح ہوں گی بھلا
وہ تری کج روشی، کج کُلہی، کینہ وری، دلبری، عشوہ گری
کون غش کھا کے گرا، کون بچا، کون مرا، پھر کے دیکھا نہ ذرا
بان مارا تری آنکھوں نے، جو کی پھر کے نگاہ، نہ ملی دل کو پناہ
یار! کیا قہر ہے چلتا ہوا جادو تیرا، لاکھ روکا، نہ رکا
رُت پھری، ساری ہری ڈالوں میں پھوٹی کونپل، ہو گئے پھول بھی پھل
اک یہ اجڑا ہوا دل ہے کہ نہ پھولا نہ پھلا، اور سوکھا ہی کیا
کالی کالی وہ گھٹائیں، وہ پپیہوں کی پکار، دھیمی دھیمی وہ پھوار
ابکے ساون بھی ہمارا یوں ہی رونے میں کٹا، کیا کہیں چپکے سوا
بوسہ لینے کا مری خاک کو بھی ہے ارماں، تاب اُٹھنے کی کہاں؟
جامہ زیبی کا بھلا، اے صنم تنگ قبا، کچھ تو دامن کو جھکا!
فتنہ خو، آفتِ جاں، سنگ دل، آشوبِ جہاں، دشمنِ دین و ایماں
سرد مہری کہاں، خسروِ اقلیم جفا، بانیٔ مکر و دغا!
رس بھری ہائے وہ آنکھیں تری کالی کالی، بے پیے متوالی!
سانولا رنگ، نمک ریز جراحاتِ جفا، اُف کہاں دھیان گیا
دیکھنا تیرا کنکھیوں سے ہے آدی رہی، یار اس کی نہ سہی
کب کو گنتی میں ہے وہ، دیکھا جو ادھر سا لگا، چھپ کے پھر دیکھ ذرا
آنکھیں رُکی ہوئی، آواز ہے بھرائی ہوئی، باتیں گھبرائی ہوئی
اس سے تو اور کسی بھید کا ملتا ہے پتا، شاد قسمیں تو نہ کھا

○

ڈھونڈو گے اگر ملکوں ملکوں، ملنے کے نہیں نایاب ہیں ہم
تعبیر ہے جس کی حسرت و غم، اے ہم نفسو! وہ خواب ہیں ہم

اے درد! بتا کچھ تو ہی بتا، اب تک یہ معمہ حل نہ ہوا
ہم میں ہے دلِ بیتاب نہاں، یا آپ دلِ بیتاب ہیں ہم

میں حیرت و حسرت کا مارا، خاموش کھڑا ہوں ساحل پر
دریائے محبت کہتا ہے، آ کچھ بھی نہیں پایاب ہیں ہم

ہو جائے بکھیڑا پاک کہیں، پاس اپنے بلا لیں بہتر ہے!
اب دردِ جدائی سے ان کے اے آہ! بہت بیتاب ہیں ہم

لاکھوں ہی مسافر چلتے ہیں، منزل پہ پہنچتے ہیں دو ایک
اے اہلِ زمانہ! قدر کرو! نایاب نہ ہوں کم یاب ہیں ہم

مرغانِ قفس کو پھولوں نے اے شادؔ یہ کہلا بھیجا ہے:
آ جاؤ، جو تم کو آنا ہو، ایسے میں ابھی شاداب ہیں ہم

○

اسیرِ جسم ہوں، میعادِ قید لا معلوم،
یہ کس گناہ کی پاداش ہے، خدا معلوم!

تری گلی میں بھی یوں تو کھینچتی ہے بہت
دراصل ہے مری مٹی کہاں کی، کیا معلوم

تعلقات کا الجھاؤ، ہر طرح ظاہر
گرہ کشائیِ تقدیرِ نارسا معلوم!

سفر ضرور ہے اور عذر کی مجال نہیں
مزہ تو یہ ہے نہ منزل، نہ راستا معلوم

دعا کروں نہ کروں سوچ ہے یہی کہ مجھے
دعا کے قبل مرے دل کا مدعا معلوم

سنی حکایتِ ہستی، تو درمیاں سے سنی
نہ ابتدا کی خبر ہے، نہ انتہا معلوم

طلب کریں بھی تو کیا شے طلب کریں اے شادؔ
ہمیں کو آپ نہیں اپنا مدعا معلوم

○

تمناؤں میں الجھایا گیا ہوں
کھلونے دے کے بہلایا گیا ہوں

ہوں اس کوچے کے ہر ذرہ سے واقف
ادھر سے مدتوں آیا گیا ہوں

دلِ مضطر سے پوچھ اے رونقِ بزم
میں خود آیا نہیں، لایا گیا ہوں

سویرا ہے بہت اے شورِ محشر
ابھی بے کار اٹھوایا گیا ہوں

لحد میں کیوں نہ جاؤں منہ چھپائے
بھری محفل سے اٹھوایا گیا ہوں

کجا میں اور کجا اے شادؔ دُنیا
کہاں سے کس جگہ لایا گیا ہوں

○

کہاں یہ تاب کہ چھلکا چھلکے، یا گرا کے پیوں
ملے بھرا ہوا ساغر تو ڈگڈگا کے پیوں

ہزار تلخ ہے، پیرِ مغاں نے جب دی ہے
خدا نکردہ جو میں منہ بنا بنا کے پیوں

مزہ ہے بادہ کشی کا وہیں تو اے ساقی!
پیوں جو اب تو ترے آستاں پہ آ کے پیوں

میں وہ نہیں کہ خود اپنے قدح کی خیر مناؤں؟
پیوں تو بزم میں دس پانچ کو پلا کے پیوں

زمیں پہ جام کو رکھ دے، ذرا ٹھہر ساقی!
میں اس پہ ہو لوں تصدق، تو پھر اٹھا کے پیوں

وہ میکدہ ہے، نہ ساقی ہے، کچھ نہ پوچھو شادؔ
میں کس کے گھر میں پیوں، کس کے گھر سے لا کے پیوں

○

ڈھونڈو گے اگر ملکوں ملکوں، ملنے کے نہیں، نایاب ہیں ہم
تعبیر ہے جس کی حسرت و غم، اے ہم نفسو! وہ خواب ہیں ہم

اے درد! پتا کچھ تو ہی بتا، اب تک یہ معمہ حل نہ ہوا
ہم میں ہے دلِ بیتاب نہاں، یا آپ دلِ بیتاب ہیں ہم

میں حیرت و حسرت کا مارا، خاموش کھڑا ہوں ساحل پہ
دریائے محبت کہتا ہے، آ کچھ بھی نہیں، پایاب ہیں ہم

ہو جائے بکھیڑا پاک کہیں، پاس اپنے بلا لیں بہتر ہے!
اب دردِ جدائی سے ان کے اے آہ! بہت بیتاب ہیں ہم

لاکھوں ہی مسافر چلتے ہیں، منزل پہ پہنچتے ہیں دو ایک
اے اہلِ زمانہ! قدر کرو! نایاب نہ ہوں، کم یاب ہیں ہم

مرغانِ قفس کو پھولوں نے اے شاد یہ کہلا بھیجا ہے:
آ جاؤ، جو تم کو آنا ہو، ایسے میں ابھی شاداب ہیں ہم

○

اسیرِ جسم ہوں، میعادِ قید لا معلوم،
یہ کس گناہ کی پاداش ہے، خدا معلوم!

تری گلی بھی مجھے یوں تو کھینچتی ہے بہت
دراصل ہے مری مٹی کہاں کی، کیا معلوم

تعلقات کا الجھاؤ، ہر طرح ظاہر
گرہ کشائیِ تقدیرِ نارسا معلوم!

سفر ضرور ہے اور عذر کی مجال نہیں
مزہ تو یہ ہے نہ منزل، نہ راستا معلوم

دعا کروں نہ کروں، سوچ ہے یہی کہ تجھے
دعا کے قبل، مرے دل کا مدعا معلوم

سنی حکایتِ ہستی، تو درمیاں سے سنی
نہ ابتدا کی خبر ہے، نہ انتہا معلوم

طلب کریں بھی تو کیا شے طلب کریں اے شاد
ہمیں کو آپ نہیں اپنا مدعا معلوم

○

تمناؤں میں الجھایا گیا ہوں
کھلونے دے کے بہلایا گیا ہوں

ہوں اس کوچے کے ہر ذرہ سے واقف
ادھر سے عمر بھر آیا گیا ہوں

دلِ مضطر سے پوچھ اے رونقِ بزم
میں خود آیا نہیں، لایا گیا ہوں

سویرا ہے بہت اے شورِ محشر
ابھی بے کار اٹھوایا گیا ہوں

لحد میں کیوں نہ جاؤں منہ چھپائے
بھری محفل سے اٹھوایا گیا ہوں

کجا میں اور کجا اے شاد دُنیا
کہاں سے کس جگہ لایا گیا ہوں

○

کہاں یہ تاب کہ چکھ چکھ کے، یا گرا کے پیوں
ملے بھرا ہوا ساغر تو ڈگڈگا کے پیوں

ہزار تلخ ہے، پیرِ مغاں نے جب دی ہے
خدا نکردہ جو میں مُنہ بنا بنا کے پیوں

مزہ ہے بادہ کشی کا وہیں تو اے ساقی!
پیوں جواب تو ترے آستاں پہ آ کے پیوں

میں وہ نہیں کہ خود اپنے قدح کی خیر مناؤں؟
پیوں تو بزم میں دس پانچ کو پلا کے پیوں

زمیں پہ جام کو رکھ دے، ذرا ٹھہر ساقی!
میں اس پہ ہو لوں تصدق، تو پھر اٹھا کے پیوں

وہ میکدہ ہے، نہ ساقی ہے، کچھ نہ پوچھو شاد
میں کس کے گھر میں پیوں کس کے گھر سے لا کے پیوں

○

جہاں تک ہو بسر کر زندگی عالی خیالوں میں
بنا دیتا ہے کامل بیٹھنا صاحب کمالوں میں

زباں میں حلق میں سینے میں اک مدت کے چھالے ہیں
خدا جانے بھری تھی کس غضب کی آگ نالوں میں

مری آنکھوں سے دیکھو حسن صورت کے علاوہ بھی
بہت سی خوبیاں ہیں اور بھی صاحب جمالوں میں

مرے پہلو سے آخر اُڑ گیا غم خوار گھبرا کر
بہت مشکل ہے آکر بیٹھنا آشفتہ حالوں میں

جو آنکھیں ہوں تو چشم غور سے اوراقِ گل دیکھو
کسی کے حسن کی شرحیں لکھی ہیں ان رسالوں میں

غم اس الجھاؤ سے چھٹنے کا اے دل تجھ کو ناحق ہے
وہ کیا تیرے لیے کنگھی نہ کرتے اپنے بالوں میں

خوشا وہ سرزمیں جن کو جگہ وہ شاہِ خوباں دے
ہمارا ذکر کیا اے شاد! ہم ہیں خستہ حالوں میں

○

نگاہباں ہیں کچھ ایسے ادا و ناز ان کے
کہ بچتے جاتے ہیں لغزش سے پاکباز ان کے

تجھی کو نزع میں پوچھا ترے خموشوں نے
اخیر وقت جب آیا چھپے نہ راز ان کے

نظر اٹھانے میں ہوتا ہے باز پرس کا ڈر
جھکائے رکھتے ہیں گردن کو سرفراز ان کے

دلوں میں گھر نہیں کرتے جو خود پسندی سے
پھرے ہیں کعبے سے پیچھے نہ پڑھ نماز ان کے

مراد یہ ہے کہ آئے نہ راستی پہ کبھی
فلک کو چھانٹتے ہیں گیسوئے دراز ان کے

جنھوں نے ناز اُٹھائے نہ ناز والوں کے
پسند آئیں گے کیوں کر وہاں نیاز ان کے

تعلقات ہیں دنیا کے پھنس چکے تھے ہم
بچائے جاتے ہیں گیسوئے فتنہ ساز ان کے

اجل کے عزم سے بے جا ستائیں کیا دل ہیں
تمام عمر اٹھائے ہوئے ہیں ناز ان کے

نہیں پسند جنھیں شاد عاشقانہ کلام
معاف کرو انھیں دل نہیں گداز ان کے

○

ایک ستم اور لاکھ ادائیں اُف ری جوانی ہائے زمانے
ترچھی نگاہیں تنگ قبائیں اُف ری جوانی ہائے زمانے

ہجر میں اپنا اور ہی عالم، ابرِ بہاراں دیدۂ پُر نم
ضد کہ ہمیں وہ آپ بلائیں، اُف ری جوانی ہائے زمانے

اپنی ادا سے آپ کھٹکنا، اپنی ہوا سے آپ جھجکنا
چال میں لغزش منہ پہ حیائیں اُف ری جوانی ہائے زمانے

ہاتھ میں آڑی تیغ پکڑنا، تاکہ لگے بھی زخم تو اوچھا
قصد کہ پھر جی بھر کے ستائیں اُف ری جوانی ہائے زمانے

کالی گھٹائیں، باغ میں جھولے، دھانی دوپٹے لٹ چھٹکائے
مجھ پہ یہ قدغن آپ نہ آئیں اُف ری جوانی ہائے زمانے

پچھلے پہر اُٹھ اُٹھ کے نمازیں ناک رگڑنی سجدے پہ سجدے
جو نہیں جائز اس کی دعائیں اُف ری جوانی ہائے زمانے

شاد نہ وہ دیدار پرستی اور نہ وہ بے نشہ کی مستی
تجھ کو کہاں سے ڈھونڈ کے لائیں اُف ری جوانی ہائے زمانے

○

نگہ کی برچھیاں جو سہ سکے سینا اسی کا ہے
ہمارا آپ کا جینا نہیں جینا اسی کا ہے

یہ بزمِ مے ہے یاں کوتاہ دستی میں ہے محرومی
جو بڑھ کر خود اُٹھا لے ہاتھ میں مینا اسی کا ہے

کدر یا صفا جس کو یہ دونوں ہی یکساں ہوں
حقیقت میں وہی مے خوار ہے مینا اسی کا ہے

امیدیں جب بڑھیں حد سے طلسمی سانپ ہیں زاہد
جو توڑے یہ طلسم اے دوست گنجینہ اسی کا ہے

کدورت سے دل اپنا پاک رکھ لے شاد پیری میں
کہ جس کو منہ دکھاتا ہے یہ آئینہ اسی کا ہے

ریاض خیر آبادی

○

ہنگامِ نزع اگر یہ بیاں بے کسی کا تھا
تم ہنس پڑے، یہ کون سا موقع ہنسی کا تھا

دل نے مجھے خراب کیا مٹ گئے یار میں
دشمن پہ اعتبار مجھے دوستی کا تھا

یہ اپنی وضع اور یہ دشنامِ مے فروش
سن کر جو پی گئے، یہ مزہ مفلسی کا تھا

وہ کیوں ٹھہرتے نزع میں بالینِ غیر پر
کوئی معاملہ یہ گھڑی دو گھڑی کا تھا

حسرت سے کوئی سامنے ٹک دیکھتا تھا آج
لب پر گلہ کسی کا، نہ شکوہ کسی کا تھا

اہلِ حرم بھی آ کے ہوئے تھے شریکِ دور
کچھ اور رنگ آج مری مے کشی کا تھا

لوٹے مزے حیا کے، اٹھائے ادا کے لطف
پہروں سے آج مجھ کو، تصور کسی کا تھا

زاہد تمام عمر فرشتہ بنا رہا
اس نے کیا جو کام، یہ کام آدمی کا تھا

جس انجمن میں بیٹھ گیا، رونق آ گئی
کچھ آدمی ریاض عجب دل لگی کا تھا

○

وہ ستاتا ہے، ستاتے جو نہیں تم مجھ کو
دھوکے دیتا ہے بری طرح توہم مجھ کو

پارسائی کا یقیں غیر کو دلواتے ہیں
اور جو بے ساختہ آ جائے تبسم مجھ کو

خانقاہیں تو مزاروں میں بھی گڑ بھی گئے
کہیں تھوڑی سی جگہ دے دو پسِ خم مجھ کو

جس کے ہر قطرے میں تھا وادیٔ ایمن پنہاں
بے خودی نے اسی صحرا میں کیا گم مجھ کو

داد خواہوں میں دمِ حشر جو دیکھا ہے ریاض
پیار سے پوچھتے ہیں، بھول گئے تم مجھ کو

○

وارفتہ آج کیسی طبیعت چمن میں تھی
صحرا سے کچھ سوا مجھے وحشت چمن میں تھی

بے دورِ جام باغ میں گزرا تمام وقت
کل ساتھ ساتھ گردشِ قسمت چمن میں تھی

اجڑا جب آشیاں، تو خزاں کیا، بہار کیا
تنکوں سے آشیاں کے محبت چمن میں تھی

صیاد گھر ترا مجھے جنت سہی، مگر
جنت سے بھی سوا مجھے راحت چمن میں تھی

صحرا کی دیکھ بھال بھی کچھ تھی مرے سپرد
تنکے چنوں چمن کے یہ خدمت چمن میں تھی

اللہ! اس طرح کی جنوں آفریں بہار
جوشِ بہار تھا کہ قیامت چمن میں تھی

سامان سب تھے آج خدا نے بچا لیا
توبہ کے بعد کچھ مری نیت چمن میں تھی

کل ہم گئے تھے، آنکھ سے آنسو ٹپک پڑے
بے شمع و گل ریاض کی تربت چمن میں تھی

○

پی لی ہم نے شراب پی لی
تھی آگ مثالِ آب پی لی

اچھی پی لی، خراب پی لی
جیسی پائی شراب پی لی

عادت سی ہے نشہ ہے نہ اب کیف
پانی نہ پیا شراب پی لی

چھوڑے کئی دن گزر گئے تھے
آئی شبِ ماہتاب پی لی

منہ چوم لے کوئی اس ادا سے
سرکا کے ذرا نقاب پی لی

منظور تھی تشنگی زباں کی
تھوڑی سی شرابِ ناب پی لی

○

او کوسنے والے اب دعا دے
اتنا کہہ دے خدا شفا دے

قطرہ جو نسیم بادہ کا مزا دے
شبنم مری پیاس تو بجھا دے

درماں کی طرح تڑپ مزا دے
یارب مجھے درد لا دوا دے

صیاد نہ باغ کی ہوا دے
وہ دور سے آشیاں دکھا دے

سب سے کورے ہیں یاس سے خالی
دل کو مرے بے خودی خدا دے

یہ دولتِ حسن و دولتِ عشق
بس کی نہیں جسے خدا دے!

میری شبِ غم کی صبح ہو جائے
تو رخ سے ذرا نقاب اٹھائے

وہ تارِ نفس کہاں سے لاؤں
ٹوٹے ہوئے دل کی جو صدا دے

گائیں وہ اے ریاض! شرمائیں
ڈر ہے کہ یہی غزل سنا دے

○

گل مرقعے ہیں ترے چاک گریبانوں کے
شکل معشوق کی انداز ہیں دیوانوں کے

کعبہ و دیر میں ہوتی ہے پرستش کس کی
مے پرستو! یہ کوئی نام ہیں میخانوں کے

جامِ توبہ شکن، توبہ مری جام شکن
سامنے ڈھیر ہیں ٹوٹے ہوئے پیمانوں کے

پر پروانہ ہے خورشیدِ رخِ شمع کبھی
فرقِ شمع بنے پر کبھی پروانوں کے

ذکر کیا اہلِ جنوں کا کہ جب آئی ہے بہار
وہ تو وہ، رنگ بدل جاتے ہیں زندانوں کے

آج بت بیٹھے ہیں تقدیر کے مالک بن کر
اب جو لکھا ہے مقدر میں مسلمانوں کے

وسعتِ دشت ہیں گم، وحشت کے کرشمے ہیں ریاض
جو بیاباں ہیں وہ ذرّے ہیں بیابانوں کے

○

ہمی اُٹھے حشر میں پھر جی سے گزرنے والے
یاں بھی پیدا ہوئے پھر آپ پہ مرنے والے

ہے اُداسی شبِ ماتم کی سہانی کیسی
چھاؤں میں تاروں کی نکلے ہیں سنورنے والے

ہم تو سمجھے تھے کہ دشمن پہ اُٹھایا خنجر
تم نے جانا کہ ہمیں تم پہ ہیں مرنے والے

مر گیا ہے ابھی کم سن ہیں، نہ تنہا لیٹیں
سو رہیں پاس مرے خواب میں ڈرنے والے

نزع میں حشر کے وعدے سے یہ تسکین بخشی
چین سے سو رہے منہ ڈھانپ کے مرنے والے

صبر کی میرے، مجھے داد ذرا دے دینا
او مرے حشر کے دن فیصلہ کرنے والے

کیا مزہ دیتی ہے بجلی کی چمک مجھ کو ریاضؔ
مجھ سے لپٹے ہیں مرے نام سے ڈرنے والے

○

کوئی جانے، یہی ہیں ایک جلوا دیکھنے والے
یہ موسیٰؑ اچھے آئے جا کے تنہا دیکھنے والے

نئی ناقوس میں پھونکی ہے جس نے روح، وہ میں ہوں
ابھی موجود ہیں اہلِ کلیسا دیکھنے والے

کھلیں گی بے ثباتی دیکھ کر آنکھیں حبابوں کی
یہی ہیں سر اٹھا کر جوشِ دریا دیکھنے والے

ہم اپنی وضعِ رندانہ کریں کیوں ترک محشر میں
یہی ہوں گے وہاں بھی اہلِ دنیا دیکھنے والے

گرے غش کھا کے موسیٰؑ، تو صدا یہ طور سے آئی
کھلیں آنکھیں تری، کچھ تو نے دیکھا، دیکھنے والے!

سنو افسانۂ جم! جام رکھ کر سامنے اُن کے
ابھی دو چار ہیں جم کا زمانا دیکھنے والے

نشیمن میں نہیں ہیں، تو شرار و برق کیوں جائیں
یہ جا کر، کون میرا آشیانا دیکھنے والے

یہ جتنے پینے والے ہیں، ریاضؔ ان سب کے مرشد ہیں
ہمیشہ جامِ مے میں نورِ حق کا دیکھنے والے

○

وحدت پکارتی ہے وہ کثرت سے دُور ہے
ہر اک نشانِ راز حقیقت سے دُور ہے

دونوں میں ایک میرے لیے عیش ہو کہ غم
میرا مقام دوزخ و جنت سے دُور ہے

ہل چل میں حشر کی، نہیں موقع وصال کا
وقتِ وفائے عہد قیامت سے دُور ہے

آئینۂ مثال میں ہوں، حسنِ بے مثال
لیکن وہ عکس ہوں کہ جو صورت سے دُور ہے

میں نے کریم جان کے تجھ کو، کیے گناہ
بخشے نہ تو مجھے، تری رحمت سے دُور ہے

توبہ کے بعد بھی مجھے پہنچے نہ تجھ سے فیض
ساقی یہ تیری چشمِ مروّت سے دُور ہے

اے شیخ! اس کی چھاؤں بھی نہیں خلد کو نصیب
یاروں کا مے کدہ تری جنت سے دُور ہے

اس کی بلا سے چاہے قیامت کبھی نہ آئے
ہو جائے صبح، یہ شبِ فرقت سے دُور ہے

پینے کے تو نہیں، پس توبہ کبھی ریاض
ساغر سے ہاتھ اٹھائیں یہ حضرت سے دُور ہے

○

جس دن سے حرام ہو گئی ہے
مے، خلد مقام ہو گئی ہے

قابو میں ہے ان کے وصل کا دن
جب آئے ہیں شام ہو گئی ہے

آتے ہی قیامت اس گلی میں
پامالِ خرام ہو گئی ہے

توبہ سے ہماری بوتل اچھی
جب ٹوٹی ہے، جام ہو گئی ہے

کچھ زہر نہ تھی شرابِ انگور
کیا چیز حرام ہو گئی ہے

مے نوش ضرور ہیں وہ نااہل
جن پر یہ حرام ہو گئی ہے

بجھ بجھ کے جلی تھی قبر پہ شمع
جل جل کے تمام ہو گئی ہے

ہر بات میں ہونٹ پہ ہے دشنام
اب حسنِ کلام ہو گئی ہے

ہے دُور ابھی ریاض منزل
دن ختم ہے، شام ہو گئی ہے

آزاد انصاری

○

لطف کی آنکھوں سے کیا دیکھا!
آہ! کسی مصرف کا نہ رکھا

آج تک آنکھیں ڈھونڈ رہی ہیں
آہ! وہ پیارا پیارا جلوا

رحم نہ کھانا، ٹھیک نہیں ہے
دیکھو! ستا کر کچھ نہ ملے گا

دامنِ غفلت چھوٹ نہ جائے
آنکھ اٹھا کر، دیکھ نہ لینا

زیست کے دن کاٹے نہیں کٹتے
کاش! ترا ارمان نہ ہوتا

آہ ہماری ناؤ کی حالت
موجیں حائل، طوفاں برپا

آزاد آپ اور قیدِ علائق
"مرضیِ مولیٰ از ہمہ اولیٰ"

○

مے پی، دل کو غم سے نہ پاٹ
خوش جی، اور خوش جی کر کاٹ

آہ! خیالِ فرقتِ دوست
جی بھی بے کل، دل بھی اُچاٹ

جورِ جفا کی خُو تو نہ ڈال
مہر و وفا کی جڑ تو نہ کاٹ

رہبرِ حیرت! دیکھ کے چل
غافل! آگے راہ نہ گھاٹ

ارض و فلک، سب سرگرداں
جس کو دیکھو، بارہ باٹ

آزاد آپ اور اتنی دُون
بل بے تری تیرا پاٹ

○

کس کی لگاوٹ، کس کی لاگ!
بھاگ! بلائے عشق سے بھاگ

زلفوں والو! یہ اندھیر
ڈہرے ڈہرے کالے ناگ

ماشاء اللہ! طرزِ کلام
جیسے کوئی دلکش راگ

قتلِ جہاں اور پھر یہ ستم
ہولی ہے ہولی، پھاگ ہے پھاگ!

میرا سر اور تیرا در
دھن مری قسمت، دھن میرے بھاگ

خوابِ غفلت، ٹھیک نہیں
جاگ! اے غافل، وقت ہے جاگ

حیف آزادِ دانا حیف
تم اور الفت کا کھڑاگ

○

امید، سو وہ مفقود، ارماں، سو وہ معدوم
اے وائے دلِ مرحوم! صد وائے دلِ مرحوم

طالب ہوں مگر ناکام۔ سائل ہوں، مگر محروم
تقدیر، مری تقدیر، مقسوم، مرا مقسوم

اب دل کی نہ کچھ پوچھو، اب دل کا خدا حافظ
مایوس نہ کچھ مایوس، مسرور نہ کچھ مغموم

بس حد ہے خطا کب تک، بس شکر جفا کب تک
ظاہر ہے کہ تو ظالم ثابت ہے کہ ہم مظلوم

قسمت سے وہ ملزم ہوں شامت سے وہ مجرم ہوں
جو داد سے بھی محروم، بے داد سے بھی محروم

غمخوار یہ کہتے ہیں: "درمانِ غم آساں ہے"
آثار یہ کہتے ہیں: "خیریتِ جاں معلوم"

آزاد کی مے خواری، آزاد کا حصہ تھی
جب پی تو یہ کہہ کر پی: "القادرؒ کا مسدوم"

○

ہو! کون ہیں، کیوں راہ میں ناچار بیٹھے ہیں
رہیں، سفر کرنے کی ہمت ہار بیٹھے ہیں

ر پہلے سے تم اُٹھے، اِدھر دنیا سے ہم اُٹھے
ہم بھی تمھارے ساتھ ہی تیار بیٹھے ہیں

ہ فرصت؟ کہ فرضِ خدمتِ الفت بجا لائے
ہے کار بیٹھے ہو، نہ ہم بے کار بیٹھے ہیں

سٹھے ہیں، تو گرمِ جستجوئے دوست اُٹھے ہیں
بیٹھے ہیں، تو محوِ آرزوئے یار بیٹھے ہیں

ام دستگیری ہے کہ تیرے رہروِ الفت
اروں جستجو میں کر کے ہمت ہار بیٹھے ہیں

پوچھو، کون ہیں، کیا مدعا ہے، کچھ نہیں بابا
ہیں اور زیرِ سایۂ دیوار بیٹھے ہیں

ہو سکتا نہیں، آزاد سے مے خانہ خالی ہو
دیکھو! کون بیٹھا ہے، وہی سرکار بیٹھے ہیں

○

سخت مشکل ہے کہ اس کا جاننا ممکن نہیں
اور بے جانے، ہمارا ماننا ممکن نہیں

زندگی بھر جاننے کی کوششیں کرنے کے بعد
صرف یہ جانا: یہاں کچھ جاننا ممکن نہیں

وہ یہ کہتے ہیں: ہمیں پہچاننے کی سعی کر
اور یہاں اپنے کو بھی پہچاننا ممکن نہیں

وحدتِ بے لوث ہاتھ آئے تو کیوں کر ہاتھ آئے
کثرتیں اتنی ہیں، جن کا چھاننا ممکن نہیں

مادے کی ساری تعریفات برحق، لیکن اب
روح کو آلودگی میں سانا ممکن نہیں

رازِ عالم تا زباں لانا تو ممکن ہے مگر
سارے عالم سے لڑائی ٹھاننا ممکن نہیں

کچھ ہو، اب ناقص کو کامل جاننا امرِ محال
کچھ ہو، اب ممکن کو واجب ماننا ممکن نہیں

منکرِ عرفانِ حق! جا، شبہ و شک بالکل فضول
ظرف قابل لے کے آ، عرفان ناممکن نہیں

عقل والو! عقل پر غرّہ تو اک حد تک درست
لیکن اس کو عقل سے پہچاننا ممکن نہیں

حضرتِ آزاد اب ہم ہیں اور اک ایسا جہاں
جس جہاں کو منقلب گردانا ممکن نہیں

○

(بہ صنعتِ ترصیع جلد ملا)

وہ تیرا دل میں رہ کر، آنکھ سے مستور ہو جانا
وہ میرا باوجودِ قرب تجھ سے دور ہو جانا

وہ تیرا میری امیدوں کو بے دردی سے ٹھکرانا
وہ میرا شیشۂ دل، سنگِ غم سے چور ہو جانا

وہ تیرا جور پر تاکیدِ شکرِ جور فرمانا
وہ میرا امتثالِ امر سے معذور ہو جانا

وہ تیرا مجھ کو آخر مژدۂ پاسِ وفا دینا
وہ میری غم نصیب امید کا مسرور ہو جانا

وہ تیرا مجھ کو آخر اپنی منزل کا پتا دینا
وہ میری جد و جہدِ شوق کا مشکور ہو جانا

وہ تیرا مجھ کو اپنے درد کی دولت عطا کرنا
وہ میرے دامنِ امید کا بھرپور ہو جانا

وہ تیرا مجھ کو اپنی لم یزل الفت عطا کرنا
وہ میرا سرمدی تسکین سے معمور ہو جانا

خوشا آزاد کا فیضانِ صحبت جس نے سمجھایا
خدا کا قرب کیسے ہے خودی سے دور ہو جانا

○

جو حال دیکھتے ہو، وہ خود عرضِ حال ہے
درویش ہوں، فقیر ہوں، صورت سوال ہے

اب دل ہے اور دل میں تمھارا خیال ہے
اور وہ خیال، جس کا بھلانا محال ہے

ایسا نہ ہو کہ ضبطِ شکایت نہ ہو سکے!
للہ یہ نہ پوچھ کہ جی کیوں نڈھال ہے؟

اچھا! اک آرزو نہ سہی، دل کا کیا علاج
دل بھی تو آرزو کی طرح پائمال ہے

اے طاقتِ جواب! یہ بے اعتنائیاں؟
کم بخت! دیکھ تو، کوئی پرسانِ حال ہے

یہ کون چاہتا ہے کہ افشائے راز ہو؟
یہ عرض تھی کہ ضبطِ تمنا محال ہے؟

آزاد دل کا درد چھپانے سے فائدہ؟
صورت ہی کہہ رہی ہے: طبیعت نڈھال ہے

○

تو اور پاسِ خاطرِ اہلِ وفا کرے
امید تو نہیں ہے۔ مگر ہاں خدا کرے

تکرارِ لن ترانی پیہم روا نہ رکھ
ایسا نہ ہو کہ شوقِ تماشا گِلہ کرے

کیا فائدہ؟ کہ شکوۂ جور و جفا کروں
کیا جانتا نہیں ہوں کہ تو اور وفا کرے؟

شاید تمھیں ہنوز یہ الفاظ یاد ہوں
"تجھ سے وفا کرے، تو خدا سے وفا کرے"

اب میں ہوں اور کوششِ ترکِ تعلقات
شاید یہی علاج کوئی فائدہ کرے!

درویش کی پکار ہے، تو درویش کی صدا
درویش کی صدا ہے کہ "داتا بھلا کرے!"

آزاد! امیدِ خوفِ جزا، امرِ حق سہی
لیکن تری بلا، غمِ روزِ جزا کرے

○

بے خبر! وجہِ بقائے دو سرا بھی عشق ہے
کارِ انساں ہی نہیں، کارِ خدا بھی عشق ہے

سمِ قاتل بھی ہے، تریاقِ شفا بھی عشق ہے
موت بھی ہے، موت کے دکھ کی دوا بھی عشق ہے

رہرو! راہِ محبت میں نڈر آگے بڑھو
صرف رہزن ہی نہیں ہے، رہنما بھی عشق ہے

مشکلاتِ عشق سے گھبرا نہ جانا چاہیے
مشکلاتِ عشق کا مشکل کشا بھی عشق ہے

شیخ صاحب! عشق کارِ اہلِ عصیاں ہی نہیں
پیر و مرشد! مسلکِ اہلِ صفا بھی عشق ہے

زندگی میں ترکِ شغلِ عشق کیوں کر کیجیے!
زندگی بھی، زندگی کا مدعا بھی عشق ہے

آؤ! اب آزاد! آسن مار بیٹھیں دھیان میں
آتما بھی عشق ہے، پرماتما بھی عشق ہے

آرزو لکھنوی

○

کس مست سے ساقی آنکھ لڑی تھرّاتا لہرا کے گرا
آگے تو وہی ہیں اور کشتیِ دل پہلے ہی ٹھوکر کھا کے گرا

دل شوق کے جوش میں دوڑ پڑا اور شوق تو ہوتا ہے اندھا
در بند پڑا تھا قسمت کا ٹکر جو لگی تیورا کے گرا

کیا عشق کی منزل میں بھی کشش بندھ بندھ کے ہمت ٹوٹ گئی
جو ایک قدم چل کر سنبھلا وہ دو قدم آگے جا کے گرا

تنگی ہوئی ہے غم کی بستی دل کیوں نہ پگھل کر ہو پانی
جو قطرہ آنسو بن کے بہا لہرا کے چلا تیورا کے گرا

جو نالہ فلک سے ٹکرایا وہ آرزو اک تارا ٹوٹا
دشمن کی طرح جو لپکا تھا وہ شعلہ بجلی پہ آ کے گرا

○

بجھے جی کا اگلا سا جلنا کہاں اب
دھواں سا تو ہے لو نکلنا کہاں اب

وہ ہر آنے والے پہ دھوکا اُنہی کا
وہ گھبرا کے گھر سے نکلنا کہاں اب

رہا کرتا ہے جی بھی ڈوبا ہوا سا
وہ ہاتھوں کلیجہ اچھلنا کہاں اب

پڑے رہتے ہیں یونہی منہ کو لپیٹے
وہ اُٹھ اُٹھ کے پہروں ٹہلنا کہاں اب

فلک ہو کسی کی تو ہوکیں ہی اُٹھیں
تڑپ کر وہ کروٹ بدلنا کہاں اب

لگی تک تھا سب کا لگانا بجھانا
جلانا کہاں اب ہے جلنا کہاں اب

اٹھا اور گرا آرزو اس گلی میں
نہیں پاؤں جمتے سنبھلنا کہاں اب

○

ب کی تھیں پلٹ گئیں سنکیں بندھی ہوئی ہوائیں
جی ہی نہیں اُداس اُداس کرتا ہے بن بھی سائیں سائیں
ملنے جو گزر چکی آپ بھی اس کو بھول جائیں
سنتا ہے کون دھر کے کان لمبی کتھا کے سنائیں
دن کٹے تھے چاہ کے دھوپ میں تیور آ گئے
ہم یہی سوچتے رہے چھاؤں ملے تو بیٹھ جائیں
دیکھ نہ مار کر پلک لمبی سی سانس لی تھی کیوں
پھر ہوئی ویسی ہی کھٹک کہے کی ہے یہ کیا بتائیں
رتی لگی ہوئی چھوڑ دو ہٹ الگ رہو
بجلی سے ایک نس ہاتھ کہیں نہ جھنجھنائیں
جس نے کہ چین کھو دیا ہے وہی جی کا چین بھی
یہ بھی نہیں کہ رکھیں دھیان یہ بھی نہیں کہ بھول جائیں
ہونٹ سے کہی ہے وہ پھوٹ جیسے دہکتی بجلیاں
دیکھنے کی ٹھہر چکی آنکھیں رہیں کہ پھوٹ جائیں!
بس ہیں تو یہ کہ چپ ہو کہیں بولیں تو ہاں یہ سلسلہ
بھید ہی بھید تو ہیں سب کس سے بتائیں کیا بتائیں
اس کی گلی میں آ گئے آرزو اب بیٹھ کے گئے
اس سے ہو چاہے ترک کار اس سے ہو چاہے جائیں جائیں

○

پھولے بن کر حال نہ پوچھو بہتے ہیں اشک تو بہنے دو
جس سے جتھے بے چینی دل کی ایسی تسلی رہنے دو

رسمیں اس اندھیر نگر کی نئی نہیں یہ پرانی ہیں
مہر پہ ڈالو رات کا پردہ ماہ کو روشن رہنے دو

روح نکل کر باغ جہاں سے باغ جناں میں جا پہنچے
چہرے پہ اپنے میری نگاہیں اتنی دیر تو رہنے دو

خندۂ گل بلبل میں ہوگا گل میں نغمہ بلبل کا
قصہ ایک زبانیں دو ہیں آپ کہو یا کہنے دو

اپنا جنونِ شوق دیا کیوں خوف جو تھا رسوائی کا
بات کرو خود قابلِ شکوہ اُلٹے مجھ کو کہنے دو

○

اوّلِ شب وہ بزم کی رونق شمع بھی تھی پروانہ بھی
رات کے آخر ہوتے ہوتے ختم تھا یہ افسانہ بھی

قید کو توڑ کے نکلا جب میں اُٹھ کے بگولے ساتھ ہوئے
دشتِ عدم تک جنگل جنگل بھاگ چلا دیوانہ بھی

ہاتھ سے کس نے ساغر پٹکا موسم کی بے کیفی پر
اتنا برسا ٹوٹ کے بادل ڈوب چلا میخانہ بھی

خون ہی کی شرکت وہ نہ کیوں ہو شرکت چیز ہے جھگڑے کی
اپنوں سے وہ دیکھ رہا ہوں جو نہ کرے بیگانہ بھی

ایک لگی کے دو ہیں اثر اور دونوں حسبِ مراتب ہیں
لَو جو لگائے شمع کھڑی ہے رقص میں ہے پروانہ بھی

دونوں جولاں گاہِ جنوں ہیں بستی کیا ویرانہ کیا
اُٹھ کے چلا جب کوئی بگولا دوڑ پڑا دیوانہ بھی

وحدت میں کی کثرت پیدا جلووں کی پاشانی نے
ایک ہی جا تھا کچھ دن پہلے کعبہ بھی بتخانہ بھی

غنچے چپ ہیں گل ہیں ہوا پر کس سے کہئے جی کا حال؟
خاک نشیں اک سبزہ ہے سو اپنا بھی بیگانہ بھی

حسن و عشق کی آگ میں اکثر چھیڑ اُدھر سے ہوتی ہے
شمع کا شعلہ جب لہرایا اُڑ کے چلا پروانہ بھی

دورِ مسرت آرزو اپنا کیسا زلزلہ آگیں تھا
ہاتھ سے منہ تک آتے آتے چھوٹ پڑا پیمانہ بھی

○

ہو گئیں کیاریاں ہری جیسے کہ رُت پلٹ گئی
کرن یہ مسکرا دیا، ہنسنے لگی کلی کلی!

کھلنے کی آس میں یہاں ڈال گئے تھے اک کلی
رس کے اُبھار ہے ہیں آج پنکھڑیاں ملی ملی

تاروں کو دیکھتے ہیں سب اور یہ دیکھتا ہوں میں
آئی کہاں سے یہ چمک کس کی ہے یہ بھلا بھلی

سب سے جدا ہُوا تھا دن آئے تھے دیکھنے بھی
آنکھیں جو چوندھیا گئیں لگ گئی جیسے کھلبلی

دن کی بھی آس ہے یہاں رات کی کر چاندنی
کتنی رُتیں پلٹ گئیں ڈال کبھی نہ یہ پھلی

چاہ کے ساتھ جی کی تھاہ پائی ہے اور نہ پائیے
ایک ہے دوسرے کی آرزو دونوں ہیں یوں گھلی ملی

ہیں کے لیے کہ آرزو بنتا ہُوا تھا ساتھ ساتھ
ڈھونڈھتا ہوں بن کے بن چھان پھرا گلی گلی

○

گُتھم بات پہیلی ایسی بس وہی بوجھے جس کو بجھائے
بھید نہ پائے تو گھبرائے بھید جو پائے تو گھبرائے

مجھ سا باتیں بنانے والا ہنس کے ہنسائے رو کے رُلائے
جب بات ہی اُسے کیا کہے جائے تو منہ تکتا رہ جائے

جس کو اکیلے میں آ آ کر دھیان ترا رہ رہ کے ستائے
چپکے چپکے بیٹھا روئے آنسو پونچھے اور رہ جائے

اچھا اچھا ہنس لو جتنا اب نہ کہو گے کوئی بات
ایسا بھولا کوئی نہیں ہے جان کے پھر دھوکا کھائے

ساری کہانی بے چینی کی ملتے پہ کہہ دیتی ہے
ایسی بات کہ گھٹے گھٹے منہ تک آئے اور رہ جائے

چاہ کی بات کھٹکتا کانٹا جس کی بے چینی میں چین
منہ سے نکالے تو پچھتائے جی میں رکھے تو پچھتائے

چُپ سے چھپے گی چاہت کیوں کر جب اس میں یہ کھٹکا ہے
اپنی بیتی ایک کہے اور جگ بیتی کا بھرم کھل جائے

چھیڑ کے پوچھو پوچھ کے بھولو کہ نہ ایسی بات سنائے
آس لگا کر کہنے والا اپنا سا منہ لے کر رہ جائے

ایک نہ سننے والے سے کہنا پتھر سے ٹکرانا ہے
بات بھی وہ جو ٹوٹتے ڈرتے ہو کے ادھوری منہ تک آئے

چاہت کی ہر بات ہے اُلٹی ریت اُلٹی رونا اُلٹا
جتنا مسوسو اور گھٹے بوند کے ندی بہہ جائے

سکھ بھی وہی دیتا ہے دکھ بھی پھر کاہے کا رونا ہے
یہ تو ہے اپنی اپنی بھاون جیسا مانگے ویسا پائے

اُلٹے کی چوٹ نہ سہنے والا گھونٹ بھی کرتے گھٹتا ہے
جیسے بے بس سانپ ہٹیلا چپٹے کھا کھا کر رہ جائے

آرزو ایسے یوں بیتے ہنس کہ بہتر کوئی نہیں
چین کہو لے بے چینی کر جائے کہے اور ہنستا جائے

○

دکھ روگ کو چاہت کے سکھ روگ بنانا ہے
دہکا ہوا انگارا چھاتی سے لگانا ہے

کھسیانی ہنسی ہنسنا اک بات بنانا ہے
ٹپکے ہوئے آنسو کو پلکوں سے اٹھانا ہے

کیوں مرتے ہیں ہم تم پر اس "کیوں" کو نہ کچھ پوچھو
پانی نہیں پینا ہے اور پیاس بجھانا ہے

جو آپ سے گزرا ہے پہنچا ہے وہی تجھ تک
جو آپ کو بھولا ہے اس نے تجھے جانا ہے

ہم یونہی نہیں چپ ہیں کیوں چپ ہیں نہ یہ پوچھو
بات اپنی بنانا ہے بھید ان کا چھپانا ہے

اٹھنا تری چوکھٹ سے اور سوچ کے یہ رکنا
جائیں تو کدھر جائیں؟ پچھتا کے پھر آنا ہے

چپ ایک پہیلی ہے سوچو گے تو بوجھو گے
تم سے وہی کہنا ہے جو سب سے چھپانا ہے

دکھ میں بھی ہنسی آئے یہ آن ہے چاہت کی
چڑھتی ہوئی ندی ہے اور تیر کے جانا ہے

ہاں آرزو اچھا ہے جو اور بھی دکھ جھیلو
سمجھایا ہے جب تم کو کہنا نہیں مانا ہے

○

آگئی پیری، جوانی ختم ہے
صبح ہوتی ہے، کہانی ختم ہے

حسرتوں کا دل سے قبضہ اٹھ گیا
غاصبوں کی حکمرانی ختم ہے

ہو گیا ذوقِ نظارہ خود فنا
یا بہارِ بوستانی ختم ہے

ماجرائے غم چراغِ صبح کا
ختم اور اپنی زبانی ختم ہے

صورتِ یخ بستہ ہے برقِ گداز
بہتے دریا کی روانی ختم ہے

ذکرِ غم میں لذتِ غم پھر کہاں
اپنے ساتھ اپنی کہانی ختم ہے

آرزو تھا اک اندھیرے کا چراغ
اس کی بھی اب ضوفشانی ختم ہے

○

ہیرا بھی ہے دل تو پتھر ہے، یوں قدر نہیں کچھ ہوتی ہے
ہاں پانی ہو کر بہہ نکلے، پھر جو قطرہ ہے موتی ہے

سہ پٹے کھلائے زمانے نے، اور دل کا رنج خوشی نہ بنا
کیا موت کی نیند میں ہے قسمت جو ایک ہی کروٹ سوتی ہے

وہ نازِ غضب یہ نازِ ستم، دم بند ہے اور جینا مشکل
چپ ہیں تو ستائے جاتے ہیں، بولیں تو شکایت ہوتی ہے

غم خواری جب کاوش رکھتیں، راحت کی امید کروں کس سے
اب نیند بھی راتوں کو آکر کانٹے آنکھوں میں چبھوتی ہے

اس فیصلے پر تیرے ظالم، رونے کے ہے قابل حالتِ دل
ٹوٹا نہ اگر تو پتھر ہے اور چور ہوا تو موتی ہے

الفت میں خوشی پر میری، حیرت میں ہیں جو یہ کیا جانیں
پڑتا ہے داغ کلیجے میں اور ہنسی لبوں پہ ہوتی ہے

اے آرزو اب ہم چشموں میں ہے لاف کا اس کے خدا حافظ
جس دل میں جلن کی تیزی تھی اب سرد و گرم سموتی ہے

علامہ اقبال

○

کبھی اے حقیقتِ منتظر! نظر آ لباسِ مجاز میں
کہ ہزاروں سجدے تڑپ رہے ہیں مری جبینِ نیاز میں

طرب آشنائے خروش ہو، تو نوا ہے محرمِ گوش ہو
وہ سرود کیا، کہ چھپا ہوا ہو، سکوتِ پردۂ ساز میں

تو بچا بچا کے نہ رکھ اسے، ترا آئنہ ہے وہ آئنہ
کہ شکستہ ہو تو عزیز تر ہے نگاہِ آئنہ ساز میں

دمِ طوف کرمکِ شمع نے یہ کہا کہ وہ اثرِ کہن
نہ تری حکایتِ سوز میں، نہ مری حدیثِ گداز میں
نہ کہیں جہاں میں اماں ملی، جو اماں ملی، تو کہاں ملی
مرے جرمِ خانہ خراب کو، ترے عفوِ بندہ نواز میں

نہ وہ عشق میں رہیں گرمیاں، نہ وہ حسن میں رہیں شوخیاں
نہ وہ غزنوی میں تڑپ رہی، نہ وہ خم ہے زلفِ ایاز میں

جو میں سر بسجدہ ہوا کبھی، تو زمیں سے آنے لگی صدا
ترا دل تو ہے صنم آشنا، تجھے کیا ملے گا نماز میں

○

ترے عشق کی انتہا چاہتا ہوں
مری سادگی دیکھ! کیا چاہتا ہوں

ستم ہو کہ ہو وعدۂ بے حجابی،
کوئی بات صبر آزما چاہتا ہوں

یہ جنت مبارک رہے زاہدوں کو
کہ میں آپ کا سامنا چاہتا ہوں

ذرا سا تو دل ہوں، مگر شوخ اتنا
وہی لن ترانی سنا چاہتا ہوں

کوئی دم کا مہماں ہوں اے اہلِ محفل!
چراغِ سحر ہوں، بجھا چاہتا ہوں

بھری بزم میں راز کی بات کہہ دی
بڑا بے ادب ہوں، سزا چاہتا ہوں

○

جنہیں میں ڈھونڈتا تھا آسمانوں میں زمینوں میں
وہ نکلے میرے ظلمت خانۂ دل کے مکینوں میں

اگر کچھ آشنا ہوتا، مذاقِ جبہہ سائی سے
تو سنگِ آستانِ کعبہ، جا ملتا جبینوں میں

کبھی اپنا بھی نظارہ کیا ہے تو نے اے مجنوں
کہ لیلیٰ کی طرح، تو خود بھی ہے محمل نشینوں میں

مہینے وصل کے گھڑیوں کی صورت اُڑتے جاتے ہیں
مگر گھڑیاں جدائی کی گزرتی ہیں مہینوں میں

مجھے روکے گا تو اے ناخدا! کیا غرق ہونے سے
کہ جن کو ڈوبنا ہو، ڈوب جاتے ہیں سفینوں میں

جلا سکتی ہے شمعِ کشتہ کو، موجِ نفس ان کی
الٰہی! کیا چھپا ہوتا ہے اہلِ دل کے سینوں میں

تمنا دردِ دل کی ہو، تو کر خدمت فقیروں کی
نہیں ملتا یہ گوہر بادشاہوں کے خزینوں میں

نہ پوچھ ان خرقہ پوشوں کی، ارادت ہو تو دیکھ ان کو
یدِ بیضا لیے بیٹھے ہیں اپنی آستینوں میں

کسی ایسے شرر سے پھونک، اپنے خرمنِ دل کو
کہ خورشیدِ قیامت بھی ہو تیرے خوشہ چینوں میں

محبت کے لیے، دل ڈھونڈ! کوئی ٹوٹنے والا
یہ وہ مے ہے، جسے رکھتے ہیں نازک آبگینوں میں

خموش اے دل! بھری محفل میں چلانا نہیں اچھا
ادب پہلا قرینہ ہے، محبت کے قرینوں میں

بُرا سمجھوں انہیں، مجھ سے تو ایسا ہو نہیں سکتا
کہ میں خود بھی تو ہوں اقبال اپنے نکتہ چینوں میں

○

چمک تیری عیاں بجلی میں، آتش میں، شرارے میں
جھلک تیری ہویدا چاند میں، سورج میں، تارے میں

شریعت کیوں گریباں گیر ہو، ذوقِ تکلم کی!
چھپا جاتا ہوں اپنے دل کا مطلب استعارے میں

جو ہے بیدار انساں میں، وہ گہری نیند سوتا ہے
شجر میں، پھول میں، حیواں میں، پتھر میں، ستارے میں

مجھے پھونکا ہے سوزِ قطرۂ اشکِ محبت نے
غضب کی آگ تھی پانی کے چھوٹے سے شرارے میں

نہیں جنسِ ثوابِ آخرت کی آرزو مجھ کو
وہ سوداگر ہوں، میں نے نفع دیکھا ہے خسارے میں

صدائے لن ترانی سن کے اے اقبال، میں چپ ہوں
تقاضوں کی کہاں طاقت ہے مجھ فرقت کے مارے میں

○

انوکھی وضع ہے سارے زمانے سے نرالے ہیں
یہ عاشق کون سی بستی کے یارب! رہنے والے ہیں

علاجِ درد میں بھی درد کی لذت پہ مرتا ہوں
جو تھے چھالوں میں کانٹے نوکِ سوزن سے نکالے ہیں

پھلا پھولا رہے یارب! چمن میری امیدوں کا
جگر کا خون دے دے کر یہ بوٹے میں نے پالے ہیں

نہ پوچھو! مجھ سے لذت خانماں برباد رہنے کی
نشیمن سینکڑوں میں نے بنا کر پھونک ڈالے ہیں

نہیں بیگانگی اچھی، رفیقِ راہِ منزل سے
ٹھہر جا اے شرر! ہم بھی تو آخر مٹنے والے ہیں

امیدِ حور نے سب کچھ سکھا رکھا ہے واعظ کو
یہ حضرت دیکھنے میں سیدھے سادے بھولے بھالے ہیں

مرے اشعار اے اقبال کیوں پیارے نہ ہوں مجھ کو
مرے ٹوٹے ہوئے دل کے یہ دردانگیز نالے ہیں

○

نالہ ہے بلبلِ شوریدہ ترا خام ابھی
اپنے سینے میں اسے اور ذرا تھام ابھی

پختہ ہوتی ہے اگر مصلحت اندیش ہو عقل
عشق ہو مصلحت اندیش تو ہے خام ابھی

بے خطر کود پڑا آتشِ نمرود میں عشق
عقل ہے محوِ تماشائے لبِ بام ابھی

عشق فرمودۂ قاصد سے سبک گامِ عمل
عقل سمجھی ہی نہیں معنیِ پیغام ابھی

شیوۂ عشق ہے آزادی و دہر آشوبی
تو ہے زناریِ بت خانۂ ایام ابھی

عذرِ پرہیز پہ کہتا ہے بگڑ کر ساقی
ہے ترے دل میں وہی کاوشِ انجام ابھی

سعیِ پیہم ہے ترازوئے کم و کیفِ حیات
تیری میزاں ہے شمارِ سحر و شام ابھی

ابرِ نیساں! یہ تنک بخشیِ شبنم کب تک؟
میرے کہسار کے لالے ہیں تہی جام ابھی

بادہ گردانِ عجم وہ، عربی میری شراب
میرے ساغر سے جھجکتے ہیں مے آشام ابھی

خبر اقبال کی لائی ہے گلستاں سے نسیم
نو گرفتار پھڑکتا ہے تہِ دام ابھی

○

نہ آتے، ہمیں اس میں تکرار کیا تھی
مگر وعدہ کرتے ہوئے عار کیا تھی

تمہارے پیامی نے سب راز کھولا
خطا اس میں بندے کی سرکار کیا تھی

بھری بزم میں اپنے عاشق کو تاڑا
تری آنکھ، مستی میں ہشیار کیا تھی

تامل تو تھا ان کو آنے میں قاصد!
مگر یہ بتا طرزِ انکار کیا تھی؟

کہیں ذکر رہتا ہے اقبال تیرا
فسوں تھا کوئی، تیری گفتار کیا تھی

○

ظاہر کی آنکھ سے نہ تماشا کرے کوئی
ہو دیکھنا، تو دیدۂ دل وا کرے کوئی

منصور کو ہوا لبِ گویا، پیامِ موت
اب کیا کسی کے عشق کا دعویٰ کرے کوئی

ہو دید کا جو شوق، تو آنکھوں کو بند کر!
ہے دیکھنا یہی، کہ نہ دیکھا کرے کوئی

عذر آفرینِ جرمِ محبت ہے حسنِ دوست
محشر میں عذرِ تازہ نہ پیدا کرے کوئی

نظارہ کو یہ جنبشِ مژگاں بھی بار ہے
نرگس کی آنکھ سے تجھے دیکھا کرے کوئی

کھل جائیں کیا مزے ہیں تمنائے شوق کے
دو چار دن جو میری تمنا کرے کوئی

پریشاں ہو کے میری خاک آخر دل نہ بن جائے
جو مشکل اب ہے یا رب پھر وہی مشکل نہ بن جائے

نہ کر دیں مجھ کو مجبورِ نوا فردوس میں حوریں
مرا سوزِ دروں پھر گرمیِ محفل نہ بن جائے

کبھی چھوڑی ہوئی منزل بھی یاد آتی ہے راہی کو
کھٹک سی ہے جو سینے میں غمِ منزل نہ بن جائے

بنایا عشق نے دریائے ناپیدا کراں مجھ کو
یہ میری خود نگہداری مرا ساحل نہ بن جائے

کہیں اس عالمِ بے رنگ و بو میں بھی طلب میری
وہی افسانۂ دنبالۂ محمل نہ بن جائے

عروجِ آدمِ خاکی سے انجم سہمے جاتے ہیں
کہ یہ ٹوٹا ہوا تارا مہِ کامل نہ بن جائے

پھر چراغِ لالہ سے روشن ہوئے کوہ و دمن
مجھ کو پھر نغموں پہ اکسانے لگا مرغِ چمن

پھول ہیں صحرا میں یا پریاں قطار اندر قطار
اودے اودے نیلے نیلے پیلے پیلے پیرہن

برگِ گل پر رکھ گئی شبنم کا موتی بادِ صبح
اور چمکاتی ہے اس موتی کو سورج کی کرن

حسنِ بے پروا کو اپنی بے نقابی کے لیے
ہوں اگر شہروں سے بن پیارے تو شہر اچھے کہ بن!

اپنے من میں ڈوب کر پا جا سراغِ زندگی
تو اگر میرا نہیں بنتا نہ بن، اپنا تو بن!

من کی دنیا؟ من کی دنیا سوز و مستی جذب و شوق
تن کی دنیا! تن کی دنیا سود و سودا مکر و فن

من کی دولت ہاتھ آتی ہے تو پھر جاتی نہیں
تن کی دولت چھاؤں ہے! آتا ہے دھن جاتا ہے دھن

من کی دنیا میں نہ پایا میں نے افرنگی کا راج
من کی دنیا میں نہ دیکھے میں نے شیخ و برہمن

پانی پانی کر گئی مجھ کو قلندر کی یہ بات
تو جھکا جب غیر کے آگے نہ من تیرا نہ تن!

حسرت موہانی

○

سرگرم ناز آپ کی شانِ جفا ہے کیا
باقی ستم کا اور ابھی حوصلا ہے کیا

آنکھیں تری جو ہوش ربائی میں فرد ہیں
ان میں یہ سحر کاریٔ رنگِ حیا ہے کیا

گر جوشِ آرزو کی ہیں کیفیتیں یہی
میں بھول جاؤں گا کہ مرا مدعا تھا کیا

آتے ہیں وہ خیال میں کیوں میرے بار بار
عشقِ خدا نما کی یہی ابتدا ہے کیا

اک برق مضطرب ہے کہ اک سحر بے قرار
کچھ پوچھئے نہ وہ نگہِ فتنہ زا ہے کیا

اس درجہ دل پذیر ہے آہنگِ نغمہ کیوں
پنہاں بہ لباسِ درد میں تیری صدا ہے کیا

چل ہی دیئے وہ چھین کے صبر و قرارِ دل
ہم سوچتے ہی رہ گئے یہ ماجرا ہے کیا

نزدیک بامِ یار سے ہے نردبانِ عشق
اے دل! یہ جلسۂ حوصلہ ہے دیکھتا ہے کیا

حسرت جفائے یار کو سمجھا جو تو وفا
آئینِ اشتیاق میں یہ بھی روا ہے کیا

○

لایا ہے دل پہ کتنی خرابی
اے یار! تیرا حسنِ شرابی

پیراہن اس کا ہے سادہ رنگیں
یا عکسِ مے سے شیشہ گلابی

ق

عشرت کی شب کا وہ دورِ آخر
نورِ سحر کی وہ لاجوابی
پھرتی ہے اب تک دل کی نظر میں
کیفیت ان کی وہ نیم خوابی

بزمِ طرب ہے وہ بزم کیوں ہو
ہم غم زدوں کو واں باریابی

ق

اس نازنیں نے باوصفِ عصمت
کی وصل کی شب وہ بے حجابی
شوقِ اپنی بھولا گستاخ دستی
دل ساری شوخی حاضر جوابی
وہ روئے زیبا ہے جانِ خوبی
ہیں وصف جس کے سارے کتابی
اس قیدِ غم پر قربان حسرت
عالی جنابی، گردوں رکابی

(۱)

بُھلاتا لاکھ ہوں لیکن برابر یاد آتے ہیں
الٰہی! ترکِ الفت پر وہ کیوں کر یاد آتے ہیں

نہ چھیڑ اے ہم نشیں! کیفیتِ صہبا کے افسانے
شرابِ بیخودی کے مجھ کو ساغر یاد آتے ہیں

رہا کرتے ہیں قیدِ ہوش میں اے وائے ناکامی
وہ دشتِ خود فراموشی کے چکر یاد آتے ہیں

نہیں آتی، تو یاد اُن کی مہینوں تک نہیں آتی
مگر جب یاد آتے ہیں، تو اکثر یاد آتے ہیں

حقیقت کھل گئی حسرت ترے ترکِ محبت کی
تجھے تو اب وہ پہلے سے بھی بڑھ کر یاد آتے ہیں

○

وصل کی بنتی ہیں ان باتوں سے تدبیریں کہیں
آرزوؤں سے پھرا کرتی ہیں تقدیریں کہیں

بے زبانی ترجمانِ شوقِ بے حد ہو تو ہو
ورنہ پیشِ یار کام آتی ہیں تقریریں کہیں

مٹ رہی ہیں دل سے یادیں روزگارِ عیش کی
اب نظر کاہے کو آئیں گی یہ تصویریں کہیں

التفاتِ یار تھا اک خوابِ آغازِ وفا
سچ ہوا کرتی ہیں ان خوابوں کی تعبیریں کہیں

تیری بے صبری ہے حسرت خام کاری کی دلیل
گریۂ عشاق میں ہوتی ہیں تاثیریں کہیں

○

توڑ کر عہدِ کرم نا آشنا ہو جائیے — بندہ پرور! جائیے، اچھا خفا ہو جائیے
میرے عذرِ جرم پر مطلق نہ کیجے التفات — بلکہ پہلے سے بھی بڑھ کر کج ادا ہو جائیے
خاطرِ محروم کو کر دیجیے محوِ الم — درپئے ایذائے جانِ مبتلا ہو جائیے
راہ میں ملیے کبھی مجھ سے تو ازراہِ ستم — ہونٹ اپنا کاٹ کر فوراً جدا ہو جائیے
گر نگاہِ شوق کو محوِ تماشا دیکھیے — قہر کی نظروں سے مصروفِ سزا ہو جائیے
میری تحریرِ ندامت کا نہ دیجے کچھ جواب — دیکھ لیجے اور تغافل آشنا ہو جائیے
مجھ سے تنہائی میں گر ملیے تو دیجے گالیاں — اور بزمِ غیر میں جانِ حیا ہو جائیے
ہاں! یہی میری وفائے بے اثر کی ہے سزا — آپ کچھ اس سے بھی بڑھ کر پُر جفا ہو جائیے
جی میں آتا ہے کہ اس شوخِ تغافل کیش سے — اب نہ ملیے پھر کبھی اور بے وفا ہو جائیے
دل سے یادِ روزگارِ عاشقی دیجے نکال — آرزوئے شوق سے نا آشنا ہو جائیے
کاوشِ دردِ جگر کی لذتوں کو بھول کر — مائلِ آرام و مشتاقِ شفا ہو جائیے
ایک بھی ارماں نہ رہ جائے دلِ مایوس میں — یعنی آخر بے نیازِ مدعا ہو جائیے
بھول کر بھی اس ستم پرور کی پھر آئے نہ یاد — اس قدر بیگانۂ عہدِ وفا ہو جائیے
ہائے ری بے اختیاری یہ تو سب کچھ ہو مگر — اس سراپا ناز سے کیوں کر خفا ہو جائیے
چاہتا ہے مجھ کو تو بھولے نہ بھولوں میں تجھے — تیرے اس طرزِ تغافل کے فدا ہو جائیے

کشمکش ہائے الم سے اب یہ حسرتؔ جی میں ہے
چھٹ کے ان جھگڑوں سے مہمانِ قضا ہو جائیے

○

چپکے چپکے رات دن آنسو بہانا یاد ہے
ہم کو اب تک عاشقی کا وہ زمانا یاد ہے

با ہزاراں اضطراب و صد ہزاراں اشتیاق
تجھ سے وہ پہلے پہل دل کا لگانا یاد ہے

بار بار اٹھنا اسی جانب نگاہِ شوق کا
اور ترا غرفے سے وہ آنکھیں لڑانا یاد ہے

تجھ سے کچھ ملتے ہی وہ بے باک ہو جانا مرا
اور ترا دانتوں میں وہ انگلی دبانا یاد ہے

کھینچ لینا وہ مرا پردہ کا کونا ، دفعتہ
اور دوپٹے سے ترا وہ منہ چھپانا یاد ہے

جان کر سوتا تجھے وہ قصدِ پابوسی مرا
اور ترا ٹھکرا کے سر، وہ مسکرانا یاد ہے

تجھ کو تنہا جب کبھی پانا. تو از راہِ لحاظ
حالِ دل باتوں ہی باتوں میں جتانا یاد ہے

جب سوا میرے تمہارا کوئی دیوانہ نہ تھا
سچ کہو! کچھ تم کو بھی وہ کارخانا یاد ہے

غیر کی نظروں سے بچ کر سب کی مرضی کے خلاف
وہ ترا چوری چھپے، راتوں کو آنا یاد ہے

آ گیا گر وصل کی شب بھی کہیں ذکرِ فراق
وہ ترا رو رو کے مجھ کو بھی رلانا یاد ہے

دوپہر کی دھوپ میں میرے بلانے کے لیے
وہ ترا کوٹھے پہ ننگے پاؤں آنا یاد ہے

آج تک نظروں میں ہے وہ صحبتِ راز و نیاز
اپنا جانا یاد ہے، تیرا بلانا یاد ہے

میٹھی میٹھی چھیڑ کی باتیں نرالی پیار کی
ذکر دشمن کا وہ باتوں میں اڑانا یاد ہے

دیکھنا مجھ کو جو برگشتہ تو سو سو ناز سے
جب منا لینا، تو پھر خود روٹھ جانا یاد ہے

چوری چوری ہم سے تم آ کر ملے تھے جس جگہ
مدتیں گزریں پر اب تک وہ ٹھکانا یاد ہے

شوق میں مہندی کے وہ بے دست و پا ہونا ترا
اور مرا وہ چھیڑنا، وہ گدگدانا یاد ہے

باوجودِ ادعائے اتقا حسرتؔ مجھے
آج تک عہدِ ہوس کا وہ فسانا یاد ہے

○

یاد ہیں سارے وہ عیشِ بافراغت کے مزے
دل ابھی بھولا نہیں آغازِ الفت کے مزے

وہ سراپا ناز تھا، بیگانۂ رسمِ جفا
اور مجھے حاصل تھے لطفِ بے نہایت کے مزے

حسن سے اپنے وہ غافل تھا، میں اپنے عشق سے
اب کہاں سے لاؤں وہ ناواقفیت کے مزے

میری جانب سے نگاہِ شوق کی گستاخیاں
یار کی جانب سے آغازِ شرارت کے مزے

یاد ہیں وہ حسن و الفت کی نرالی شوخیاں
التماسِ عذر و تمہیدِ شکایت کے مزے

صحتیں لاکھوں مری بیماریٔ غم پر نثار
جس میں اٹھے بارہا ان کی عیادت کے مزے

○

تجھ کو پاسِ وفا ذرا نہ ہوا — ہم سے پھر بھی ترا گلا نہ ہوا
ایسے بگڑے کہ پھر جفا بھی نہ کی — دشمنی کا بھی حق ادا نہ ہوا
جانِ عاشق نثارِ دوست ہوئی — شادیٔ مرگ کا بہانہ ہوا
کٹ گئی احتیاطِ عشق میں عمر — ہم سے اظہارِ مدعا نہ ہوا
کچھ عجب چیز ہے وہ چشمِ سیاہ — تیر جس کا کبھی خطا نہ ہوا
حیف ہے اس کی بادشاہی پر — تیرے کوچہ کا جو گدا نہ ہوا
مر مٹے ہم تو مٹ گئے سب رنج — یہ بھی اچھا ہوا، برا نہ ہوا
جب تلک میرے دل میں جان رہی — دردِ مایوسِ مرحبا نہ ہوا
مل گئی مجھ کو صبرِ عشق کی داد — وہ جو شرمندۂ جفا نہ ہوا

تا بہ رنجِ عشق تھا حسرت
عیشِ دنیا سے آشنا نہ ہوا

○

یہ کار ہے، با صفا ہو گئے ہم
ترے عشق میں کیا سے کیا ہو گئے ہم

نہ جانا کہ شوق اور بھڑکے گا میرا
وہ سمجھے کہ اس سے جدا ہو گئے ہم

دمِ واپسیں آئے پرسش کو ناحق
بس اب جاؤ! تم سے خفا ہو گئے ہم

جب اس بے ادب نے نہ کچھ منہ سے مانگا
تو اک پیکرِ التجا ہو گئے ہم

فنا ہو کے راہِ محبت میں حسرت
سزاوارِ خلدِ بقا ہو گئے ہم

○

ہر حال انہیں یوں دل کا سنانے میں لگے ہیں
کچھ کہتے نہیں پاؤں دبانے میں لگے ہیں

اور ایسے کہاں حیرت و حسرت کے مرقعے
اے دل! جو ترے آئنہ خانے میں لگے ہیں

کہتا ہے انہیں یہ کہ نہ ہم ہوں گے مخاطب
پر کہتے نہیں زلف بنانے میں لگے ہیں

کچھ ہوش سر و پا کا نہیں، رِندِ خرابات
ابھی ہے گھٹا، دھوم مچانے میں لگے ہیں

قاتل! ترے دامن پہ مرے خون کے دھبے
کچھ اور بھی خنجر سے چھٹانے میں لگے ہیں

ہر دم ہے یہ ڈر پھر نہ بگڑ جائیں وہ حسرت
پہروں انہیں رو رو کے ہنسانے میں لگے ہیں

اصغر گونڈوی

○

زاہد نے مرا حاصلِ ایماں نہیں دیکھا
رُخ پر تری زلفوں کو پریشاں نہیں دیکھا

آئے تھے سبھی طرح کے جلوے مرے آگے
میں نے مگر اے دیدۂ حیراں نہیں دیکھا

اس طرح زمانہ کبھی ہوتا نہ پُر آشوب
فتنوں نے ترا گوشۂ داماں نہیں دیکھا

ہر حال میں بس پیشِ نظر ہے وہی صورت
میں نے کبھی روئے شبِ ہجراں نہیں دیکھا

کچھ دعویٔ تمکیں میں ہے معذور بھی زاہد
مستی میں تجھے چاک گریباں نہیں دیکھا

روداد چمن سنتا ہوں اس طرح قفس میں
جیسے کبھی آنکھوں سے گلستاں نہیں دیکھا

کیا کیا ہوا ہنگامِ جنوں یہ نہیں معلوم
کچھ ہوش جو آیا تو گریباں نہیں دیکھا

شائستۂ صحبت کوئی ان میں نہیں اصغر
کافر نہیں دیکھے، کہ مسلماں نہیں دیکھا

○

ترے جلوؤں کے آگے ہمتِ شرح و بیاں رکھ دی
زبانِ بے نگہ رکھ دی، نگاہِ بے زباں رکھ دی

مٹی جاتی تھی بلبل جلوۂ گل ہائے رنگیں پر
چھپا کر کس نے ان پردوں میں برقِ آشیاں رکھ دی

نیازِ عشق کو سمجھا ہے کیا؟ اے واعظِ ناداں!
ہزاروں بن گئے کعبے جبیں میں نے جہاں رکھ دی

قفس کی یاد میں یہ اضطرابِ دل معاذ اللہ!
کہ میں نے توڑ کر ایک ایک شاخِ آشیاں رکھ دی

کرشمے حسن کے پنہاں تھے شاید رقصِ بسمل میں
بہت کچھ سوچ کر ظالم نے تیغِ خوں فشاں رکھ دی

الٰہی کیا کیا تو نے کہ عالم میں تلاطم ہے
غضب کی ایک مشتِ خاک زیرِ آسماں رکھ دی

○

...بل کا خواں میں نہیں پرساں کوئی
...چمن میں نہ رہا رشتۂ عریاں کوئی

...بے محابا ہوا گر حسن، تو وہ بات کہاں
...کے جس شوخی سے ہو کے نمایاں کوئی

...ہی گل سے لپٹ کر وہیں مر جاتا تھا
...ب کرے کیوں گلۂ تنگیٔ داماں کوئی

...یار بے حال پہ کل کیا انھیں غم تھا قاصد؟
...نے دیکھا تھا ستادہ سرِ مژگاں کوئی؟

...لے زاہدِ بے چارہ اسے کیا معلوم؟
...کم کر سکے ہے یہ اندازۂ عصیاں کوئی

...ل میں اک بوند لہو کی نہیں، رونا کیسا
...ب ٹپکتا نہیں آنکھوں سے گلستاں کوئی

...ب اے ہوش کہیں پا کہ جنوں اے اختر
...ہو تو ہر تار میں ملتا ہے گریباں کوئی

○

کیا کہیے! جاں نوازیٔ پیکانِ یار کو
سیراب کر دیا دلِ منت گزار کو

جوشِ شباب، نشۂ صہبا، ہجومِ شوق
تعبیر یوں بھی کرتے ہیں فصلِ بہار کو

ہر قطرہ آئینہ ہے کسی کے جمال کا
یوں ہی نہ جانے دو مری مشتِ غبار کو

میرے مذاقِ شوق کا اس میں بھرا ہے رنگ
میں خود کو دیکھتا ہوں کہ تصویرِ یار کو

ہاں اے نگارِ خوبی و اے جانِ دلبری
تو نے حیات بخشی ہے صبحِ بہار کو

اس جوئبارِ حسن سے سیراب ہے فضا
روکو نہ اپنی لغزشِ مستانہ وار کو

تھی جستجوئے دوست مجھے نسیمِ سحر کے ساتھ
یاد سے لے اڑی مری مشتِ غبار کو

یہ راز دوں ہے، ہستیٔ کل کائنات ہے
دیکھیں ضرور دیدۂ امیدوار کو

کچھ اور ہی فضا دلِ بے مدعا کی ہے
دیکھا ہے روزِ وصل و شبِ انتظار کو

اختر نشاطِ روح کا اک کھل گیا چمن
جنبش ہوئی جو خامۂ رنگیں نگار کو

اصغر

○

گم ہوں حرم نہیں ہے، یہ کوئے بتاں نہیں
اب کچھ نہ پوچھئے کہ کہاں ہوں کہاں نہیں

مدت ہوئی کہ چشمِ تحیر کو ہے سکوت
اب جنبشِ نظر میں کوئی داستاں نہیں

اب ہو تو سنگِ خشت سے سر کو سکوں ہو
وہ آستاں نہیں، تو کوئی آستاں نہیں

سارا حصول عشق کی ناکامیوں میں ہے
جو عمر رائیگاں ہے، وہی رائیگاں نہیں

کسبِ حیات نو ازی ہر ہر ادا سے ہے
مرنا پسندِ خاطرِ اربابِ جاں نہیں

تسلیم مجھ کو عظمتِ کعبہ کی منزلت
سب کچھ سہی، مگر وہ ترا آستاں نہیں

ہوتا ہے رازِ عشق و محبت انھیں سے فاش
آنکھیں زباں نہیں ہیں مگر بے زباں نہیں

فطرت سنا رہی ہے ازل سے اسی طرح
لیکن ہنوز ختم مری داستاں نہیں

دیکھوں! ہجومِ غم میں وہ لے کس طرح خبر
یہ اس کا امتحاں ہے، مرا امتحاں نہیں

اب اس نگاہِ ناز سے ربطِ لطیف ہے
مجھ کو دماغِ صحبتِ روحانیاں نہیں

○

آلامِ روزگار کو آساں بنا دیا
جو غم ہوا، اسے غمِ جاناں بنا دیا

یوں مسکرائے، جان سی کلیوں میں پڑ گئی
یوں لب کشا ہوئے کہ گلستاں بنا دیا

اے شیخ! وہ بسیط حقیقت ہے کفر کی
کچھ قید و رسم نے جسے ایماں بنا دیا

کچھ آگ دی ہوس میں تو تعمیرِ عشق کی
جب خاک کر دیا اسے عرفاں بنا دیا

اک برق تھی ضمیر میں فطرت کے موجزن
آج اس کو حسن و عشق کا ساماں بنا دیا

مجبوریِ حیات میں رازِ حیات ہے
زنداں کو میں نے روزنِ زنداں بنا دیا

وہ شورشیں، نظامِ جہاں جن کے دم سے ہے
جب مختصر کیا انھیں انساں بنا دیا

ہم اس نگاہِ ناز کو سمجھے تھے نیشتر
تم نے تو مسکرا کے رگِ جاں بنا دیا

بلبل بہ آہ و نالہ و گل مستِ رنگ و بو
مجھ کو شہیدِ رسمِ گلستاں بنا دیا

کہتے ہیں: اک فریبِ مسلسل ہے زندگی
اس کو بھی وقفِ حسرت و حرماں بنا دیا

عالم سے بے خبر بھی ہوں، عالم میں بھی ہوں میں
ساقی نے اس مقام کو آساں بنا دیا

اس حسنِ کاروبار کو مستوں سے پوچھئے
جس کو فریبِ ہوش نے عصیاں بنا دیا

○

جلوہ ترا اب تک ہے نہاں چشمِ بشر سے
ہر ایک نے دیکھا ہے تجھے اپنی نظر سے

یہ عارضِ پرنور، یہ زلفیں ہیں پریشاں
کم بخت! نکل کر ہی شام و سحر سے

مے داغِ آدم ہے، تریاق ہے لیکن
کچھ اور ہی ہو جاتی ہے ساقی کی نظر سے

وہ شوخ بھی معذور ہے مجبور ہوں میں بھی
کچھ فتنے اٹھے حسن سے، کچھ حسنِ نظر سے

اس عالمِ ہستی میں نہ مرنا ہے نہ جینا
تو نے کبھی دیکھا نہیں ہستی کی نظر سے

جاں بازوں کے سینے میں ابھی اور بھی دل ہیں
پھر دیکھئے اک بار محبت کی نظر سے

○

نہ ہوگا کاوشِ بے مدعا کا راز داں برسوں
وہ زاہد جو رہا سرگشتۂ سود و زیاں برسوں

کچھ اس انداز سے چھیڑا تھا میں نے نغمۂ رنگیں
کہ فرطِ ذوق سے جھومی ہے شاخِ آشیاں برسوں

جبینِ شوق لائی ہے وہاں سے داغِ ناکامی
یہ کیا کرتی رہی کم بخت ننگِ آستاں برسوں

وہی تھا حال میرا جو بیاں میں آ نہ سکتا تھا
جسے کرتا رہا افشا سکوتِ راز داں برسوں

نہ پوچھو! مجھ پہ کیا گزری ہے میری مشتِ حسرت سے
قفس کے سامنے رکھا رہا ہے آشیاں برسوں

خروشِ آرزو ہو، نغمۂ خاموشِ الفت بن
یہ کیا اک شیوۂ فرسودۂ آہ و فغاں برسوں

نہ کی کچھ لذتِ افتادگی میں اعتنا میں نے
مجھے دیکھا کیا اٹھ کر غبارِ کارواں برسوں

وہاں کیا ہے؟ نگاہِ ناز کی ہلکی سی جنبش ہے
مزے لے لے کے اب تڑپا کریں اربابِ جاں برسوں

محبت ابتدا سے تھی مجھے گلہائے رنگیں سے
رہا ہوں آشیاں میں لے کے برقِ آشیاں برسوں

میں وہ ہرگز نہیں جس کو قفس سے موت آتی ہو!
میں وہ ہوں جس نے خود دیکھا نہ گئے آشیاں برسوں

○

کوئی محمل نشیں کیوں شاد یا ناشاد ہوتا ہے
غبارِ قیس خود اٹھتا ہے خود برباد ہوتا ہے

قفس کیا؟ حلقہ ہائے دام کیا؟ رنجِ اسیری کیا؟
چمن پر مٹ گیا جو، ہر طرح آزاد ہوتا ہے

بہار انجام سمجھوں اس چمن کا، یا خزاں سمجھوں
زبانِ برگِ گل سے مجھ کو کیا ارشاد ہوتا ہے

سمٹے جا رہے ہیں اب وہ جلوے دیدہ و دل میں
یہ نظارہ ہے یا ذوقِ نظر برباد ہوتا ہے

یہاں کوتاہیٔ ذوقِ عمل ہے خود گرفتاری
جہاں بازو سمٹتے ہیں وہیں صیاد ہوتا ہے

یہاں مستوں کے سر الزام ہستی ہی نہیں اصغر
پھر اس کے بعد ہر الزام بے بنیاد ہوتا ہے

○

وہ نغمہ بلبلِ رنگیں نوا اک بار ہو جائے
کلی کی آنکھ کھل جائے، چمن بیدار ہو جائے

نظر وہ ہے جو اس کون و مکاں سے پار ہو جائے
مگر جب روئے تاباں پر پڑے، بیکار ہو جائے

تم اس کافر کا ذوقِ بندگی اب پوچھتے کیا ہو
جسے طاقِ حرم بھی ابروئے خمدار ہو جائے

سحر لائے گی کیا پیغامِ بیداری شبستاں میں
نقابِ رخ الٹ دو، خود سحر بیدار ہو جائے

یہ اقرارِ خودی ہے، دعویٔ ایمان و دیں کیسا؟
ترا اقرار جب ہے خود سے بھی انکار ہو جائے

نظر اس حسن پر ٹھہرے تو آخر کس طرح ٹھہرے
کبھی خود پھول بن جائے، کبھی رخسار ہو جائے

چلا جاتا ہوں ہنستا کھیلتا موجِ حوادث سے
اگر آسانیاں ہوں، زندگی دشوار ہو جائے

فانی بدایونی

○

شوق سے ناکامی کی بدولت کوچۂ دل ہی چھوٹ گیا
ساری امیدیں ٹوٹ گئیں، دل بیٹھ گیا، جی چھوٹ گیا

فصلِ گل آئی یا اجل آئی، کیوں درِ زنداں کھلتا ہے
کیا کوئی وحشی اور آ پہنچا، یا کوئی قیدی چھوٹ گیا

لیجئے کیا دامن کی خبر اور دستِ جنوں کو کیا کہئے
اپنے ہی ہاتھ سے دل کا دامن مدت گزری چھوٹ گیا

منزلِ عشق پہ تنہا پہنچے، کوئی تمنا ساتھ نہ تھی
تھک تھک کر اس راہ میں آخر اک اک ساتھی چھوٹ گیا

فانی ہم تو جیتے جی وہ میت ہیں بے گور و کفن
غربت جس کو راس نہ آئی اور وطن بھی چھوٹ گیا

○

پھر وہ اندازِ نظر یاد آیا
چاکِ دل تا بہ جگر یاد آیا

ذوقِ اربابِ نظر یاد آیا
سجدہ، بے منتِ سر یاد آیا

ہر تبسم پہ یہ کھاتا ہوں فریب
کہ انھیں دیدۂ تر یاد آیا

پھر ترا نقشِ قدم ہے درکار
سجدۂ راہ گزر یاد آیا!

جمع کرتا ہوں غبارِ رہِ دوست
سرِ شوریدہ مگر یاد آیا

ہائے وہ معرکۂ ناوکِ ناز
دل بچایا، تو جگر یاد آیا

آشنا اب نہیں دیکھا جاتا
میں بہ عنوانِ دگر یاد آیا

درد کو پھر ہے مرے دل کی تلاش
خانہ برباد کو گھر یاد آیا

اس کو بھولے تو ہوئے ہو فانی
کیا کرو گے وہ اگر یاد آیا

○

ضبط اپنا شعار تھا، نہ رہا
دل پہ کچھ اختیار تھا، نہ رہا

دلِ مرحوم کو خدا بخشے
ایک ہی غم گسار تھا، نہ رہا

آ، کہ وقتِ سکونِ مرگ آیا
نالہ ناخوشگوار تھا، نہ رہا

اُن کی بے مہریوں کو کیا معلوم
کوئی امیدوار تھا، نہ رہا

آہ کا اعتبار بھی کب تک
آہ کا اعتبار تھا، نہ رہا

کچھ زمانے کو سازگار سہی
جو ہمیں سازگار تھا، نہ رہا

اب گریباں کہیں سے چاک نہیں
شغلِ فصلِ بہار تھا، نہ رہا

موت کا انتظار باقی ہے
آپ کا انتظار تھا، نہ رہا

مہرباں! یہ مزارِ فانی ہے
آپ کا جاں نثار تھا، نہ رہا

○

✓ جی ڈھونڈتا ہے گھر کوئی دونوں جہاں سے دور
اس آپ کی زمیں سے الگ، آسماں سے دور

شاید میں درخورِ نگہِ گرم بھی نہیں!
بجلی تڑپ رہی ہے مرے آشیاں سے دور

وہ پوچھتے ہیں اور کوئی دیتا نہیں جواب
کس کی وفا ہے دسترسِ امتحاں سے دور

آنکھیں چرا کے آپ نے افسانہ کر دیا
جو حال تھا زباں سے قریب اور بیاں سے دور

ہے منع راہِ عشق میں دیر و حرم کا ہوش
یعنی کہاں سے پاس ہے منزل کہاں سے دور

تا عرضِ شوق میں نہ رہے بندگی کی لاگ
اک سجدہ چاہتا ہوں ترے آستاں سے دور

فانی دکن میں آ کے یہ عقدہ کھلا کہ ہم
ہندوستاں میں رہتے ہیں ہندوستاں سے دور

○

آپ سے شرحِ آرزو تو کریں
آپ تکلیفِ گفتگو تو کریں!

وہ یہیں ہیں، جو وہ کہیں بھی نہیں
آئیے! دل میں جستجو تو کریں!

اہلِ دنیا مجھے سمجھ لیں گے
دل کسی دن ذرا لہو تو کریں!

رنگ و بُو کیا ہے یہ تو سمجھا دو
سیرِ دنیائے رنگ و بو تو کریں!

تم سے ملنے کی آرزو ہی سہی!
تم سے ملنے کی آرزو تو کریں

وہ اُدھر، رُخ اِدھر ہے میت کا
لوگ فانیؔ کو قبلہ رُو تو کریں

○

مشتاق خبردار رہیں دل سے، جگر سے
ملتی ہے زمانے کی نظر اُن کی نظر سے

دل جن سے ملے اب وہ نگاہیں نہیں ملتیں
ملنے کو تو ملتی ہے نظر اُن کی نظر سے!

پیکاں کے بھی ٹکڑے ہیں، رفو کے بھی ہیں ٹانکے
سینے میں دھواں خیر ہے اٹھتا ہے کدھر سے

کیا پھر ترے ناوک نے کیا عزمِ نوازش
لبیک کی آتی ہے صدا چاکِ جگر سے

کس صبح کے مشتاق کا ماتم ہے کہ فانی
روتی ہے گلے مل کے سحر، شمعِ سحر سے!

○

یہ عجز بھی جو وصل نہیں ہونے پاتے
مر کے شرمندۂ قاتل نہیں ہونے پاتے

حرم و دیر کی گلیوں میں پڑے پھرتے ہیں
بزمِ رنداں میں جو شامل نہیں ہونے پاتے

سعی نے ڈوبنے والوں کو بہت کچھ پلٹا
رخ مگر جانبِ ساحل نہیں ہونے پاتے

تو کہاں ہے کہ تری راہ میں یہ کعبہ و دیر
نقش بن جاتے ہیں منزل نہیں ہونے پاتے

کوئی چٹکی سی کلیجے میں لیے جاتا ہے!
ہم تری یاد سے غافل نہیں ہونے پاتے

تیرا انعام سمجھتا ہوں ان ارمانوں کو
میری کوشش کا جو حاصل نہیں ہونے پاتے

خود تجلی کو نہیں اذنِ حضوری فانی
آئینے اُن کے مقابل نہیں ہونے پاتے

○

اس کشمکشِ ہستی میں کوئی راحت نہ ملی جو غم نہ ہوئی
تدبیر کا حاصل کیا کہیے! تقدیر کی گردش کم نہ ہوئی

اللہ رے سکونِ قلب اس کا دل ہی نے الجھن سلجھا دی
جس زلف نے دنیا برہم کی وہ آپ کبھی برہم نہ ہوئی

محرم راز ہے اُن کی تجلی کا، جو عالم بن کر عالم نہ ہوا
دل رازِ نہاں ہے اُن کی تجلی کا جو ظاہر بھی عالم نہ ہوئی

دل کی یہ دیوانی ہی محبت ہے ہمیں آخر کیا کرتے
جب عالم سامنے بیٹھے تھے یہ دیوانی کم نہ ہوئی

انساں کی ساری ہستی کا مقصد ہے فانی ایک قطرہ
یعنی وہ قطرہ جو دل میں اُتر کر زخم بنی، مرہم نہ ہوئی

○

نظر آج ان سے رہ گئی مل کے
آخری کچھ پیام تھے دل کے

تو نے دیکھے ہیں اے نسیمِ سحر!
کچھ فدائی تھے شمعِ محفل کے

خلشیں تھیں ہمارے دم کے ساتھ
آہ کانٹے نکل گئے دل کے

پھول کو پھول جاننے والے
گل پہ چھینٹے تھے خونِ بسمل کے

تیز تر جادۂ وفا سے گزر!
مٹ رہے ہیں نشان منزل کے

مل بھی جاتے ہیں چھوٹنے والے
چھوڑ جاتا ہے یوں کوئی مل کے

خاک ہے تو اسی گلی کی خاک
اللہ اللہ یہ حوصلے دل کے!

اُن کی نظریں ہی کچھ کہیں تو کہیں
ان کی نظروں نے کیا کیا مل کے

مرگِ فانی میں اب تو دیر نہ کر
سہل فرمانے والے مشکل کے

○

دُنیا میری بلا جانے، مہنگی ہے یا سستی ہے
موت ملے تو مفت نہ لوں ہستی کی کیا ہستی ہے

آبادی بھی دیکھی ہے، ویرانے بھی دیکھے ہیں
جو اُجڑے اور پھر نہ بسے، دل وہ نرالی بستی ہے

عجزِ گناہ کے دم تک ہیں، عصمتِ کامل کے جلوے
پستی ہے تو بلندی ہے، رازِ بلندی پستی ہے

جان سی شے بک جاتی ہے ایک نظر کے بدلے میں
آگے مرضی گاہک کی، ان داموں تو سستی ہے

وحشتِ دل سے پھرنا ہے، اپنے خدا سے پھر جانا
دیوانے یہ ہوش نہیں، یہ تو ہوش پرستی ہے

جگ سونا ہے تیرے بغیر، آنکھوں کا کیا حال ہوا
جب بھی دنیا بستی تھی، اب بھی دنیا بستی ہے

آنسو تھے سو خشک ہوئے، جی ہے کہ اُمڈا آتا ہے
دل پہ گھٹا سی چھائی ہے، کھلتی ہے نہ برستی ہے

دل کا اُجڑنا سہل سہی، بسنا سہل نہیں ظالم!
بستی بسنا کھیل نہیں، بستے بستے بستی ہے

فانی جس میں آنسو کیا، دل کے لہو کا کال نہ تھا
ہائے! وہ آنکھ اب پانی کی دو بوندوں کو ترستی ہے

جگر مرادآبادی

○

تیرا تصور شب ہمہ شب　　خلوتِ غم بھی بزمِ طرب
دعوئ شوق اور شکوہ بلب　　شرم! او دل آرام طلب
باتیں ہیں دو مقصد ہے ایک　　تیری طلب یا اپنی طلب
آ ہی گیا اک مستِ شباب　　شیشہ بدست و نغمہ بلب
ختم ہوا انعامِ فراق　　آ ہی گیا پیغامِ طلب
بیت گئی جو دل پہ نہ پوچھ　　ہجر کی شب اور آخرِ شب
حسن مکمل جذب و گریز　　عشق مسلسل ترکِ طلب

ترکِ طلب اور اطمینان
دیکھ تو میرا حسنِ طلب

○

دنیا کے ستم یاد، نہ اپنی ہی وفا یاد
اب مجھ کو نہیں کچھ بھی محبت کے سوا یاد

کیا لطف کہ میں اپنا پتہ آپ بتاؤں
کیجے کوئی بھولی ہوئی خاص اپنی ادا یاد

میں ترکِ رہ و رسمِ جنوں کر ہی چکا تھا
کیوں آگئی ایسے میں تری لغزشِ پا یاد

کیا جانئے کیا ہو گیا اربابِ جنوں کو
جینے کی ادا یاد، نہ مرنے کی ادا یاد

مدت ہوئی اک حادثۂ عشق کو لیکن
اب تک ہے ترے دل کے دھڑکنے کی صدا یاد

○

یہ دن بہار کے اب کے بھی راس آ نہ سکے   کہ غنچے کھل تو سکے کھل کے مسکرا نہ سکے
مری تباہیٔ دل پر تو رحم کھا نہ سکے   مگر کبھی وہ نظر سے نظر ملا نہ سکے
یہ آدمی ہے وہ پروانۂ شمعِ دانش کا   جو روشنی میں رہے، روشنی کو پا نہ سکے
انھیں سعادتِ منزل رسی نصیب ہوئی   وہ پاؤں راہِ طلب میں جو ڈگمگا نہ سکے
نہ جانے آہ! کہ ان آنسوؤں پہ کیا گزری   جو دل سے آنکھ تک آئے، مژہ تک آ نہ سکے
رہیں گے مر کے بقائے دوام کیا حاصل   جو زندہ رہ کے مقامِ حیات پا نہ سکے
زہے خلوصِ محبت کہ حادثاتِ جہاں   مجھے تو کیا، مرے نقشِ قدم مٹا نہ سکے
مری نظر سے گریزاں بہت رہے لیکن   مرے خلوصِ محبت سے بچ کے جا نہ سکے
جو مہر و ماہ مرے ہم سفر رہے برسوں   پھر اس کے بعد مری گردِ رہ بھی پا نہ سکے
مری نظر نے شبِ غم انھیں بھی دیکھ لیا   وہ بے شمار ستارے کہ جگمگا نہ سکے

نیا زمانہ بنانے چلے تھے دیوانے
نئی زمین، نیا آسماں بنا نہ سکے

○

جہلِ خرد نے دن یہ دکھائے
گھٹ گئے انساں بڑھ گئے سائے

ہائے وہ کیونکر جی بہلائے
غم بھی جس کو راس نہ آئے

دل پہ کچھ ایسا وقت پڑا ہے
بھاگے لیکن راہ نہ پائے

جھوٹی ہے ہر ایک مسرت
روح اگر تسکین نہ پائے

حسن وہی ہے حسن جو ظالم
ہاتھ لگائے ہاتھ نہ آئے

ضبطِ محبت، شرطِ محبت
جی ہے کہ ظالم اُمڈا آئے

نغمہ وہی ہے نغمہ کہ جس کو
روح سنے اور روح سنائے

راہِ طلب آسان ہوئی ہے
زلف و مژہ کے سائے سائے

○

کوئی یہ کہہ دے گلشن گلشن　　　لاکھ بلائیں ایک نشیمن
قاتل رہبر، قاتل رہزن　　　دل سا دوست نہ دل سا دشمن
پھول کھلے ہیں گلشن گلشن　　　لیکن اپنا اپنا دامن
عمریں بیتیں، صدیاں گزریں　　　ہے وہی اب تک عقل کا بچپن
عشق ہے پیارے کھیل نہیں ہے　　　عشق ہے کارِ شیشہ و آہن
برقِ حوادث اللہ اللہ　　　جھوم رہی ہے شاخِ نشیمن
بیٹھے ہم ہر بزم میں لیکن　　　جھاڑ کے اُٹھے اپنا دامن
دل کہ مجسم آئینہ ساماں　　　اور وہ ظالم آئینہ دشمن
غیر مزاجِ حسن کی یا رب!　　　تیز بہت ہے دل کی دھڑکن
تجھ سا حسیں اور خونِ محبت　　　وہم ہے شاید سرخیٔ دامن
آج نہ جانے راز یہ کیا ہے　　　ہجر کی رات اور اتنی روشن
آ، کہ نہ جانے تجھ بن کب سے　　　روح ہے لاشہ، جسم ہے مدفن

ق

کام ادھورا اور آزادی　　　نام بڑے اور تھوڑے درشن
شمع ہے لیکن دھندلی دھندلی　　　سایہ ہے لیکن روشن روشن
علم ہی ٹھیرا علم کا مانع　　　عقل ہی نکلی عقل کی دشمن

ق

مستیٔ شاعر اللہ اللہ　　　حسن کی منزل عشق کا مسکن
رنگیں فطرت، سادہ طبیعت　　　فرش نشیں اور عرش نشیمن

کانٹوں کا بھی حق ہے کچھ آخر
کون چھڑائے اپنا دامن

○

سراپا حقیقت، مجسم فسانا
محبت کا عالم، جنوں کا زمانا

وہ پہلے پہل دونوں جانب یہ عالم
ادا بے تعلق، نظر محرمانہ

نظر ملتے اُٹھتے، نظر جھکتے ملتے
دھڑکتے دلوں کا وہ نازک فسانہ

طبیعت شگفتہ، مگر کھوئی کھوئی
ہر انداز دلکش، مگر والہانہ

وہ شعر و ترنم کا پُرکیف موسم
وہ اشک و تبسم کا رنگیں زمانہ

غرورِ تجمل، مگر زخم خوردہ
شکستِ محبت، مگر فاتحانہ

○

یہ ترا جمالِ کامل، یہ شباب کا زمانہ
دلِ دشمناں سلامت، دلِ دوستاں نشانہ

مجھے عشق کی صداقت پہ بھی شک سا ہو چلا ہے
مرے دل سے کہہ گئی کیا، وہ نگاہِ ناقدانہ

مری زندگی تو گزری ترے ہجر کے سہارے
مری موت کو بھی پیارے! کوئی چاہیے بہانہ

میں وہ صاف ہی نہ کہہ دوں جو ہے فرق مجھ میں تجھ میں
ترا درد، دردِ تنہا، مرا غم، غمِ زمانہ

مرے دل کے ٹوٹنے پہ ہے کسی کو ناز کیا کیا!
مجھے اے جگر مبارک! یہ شکستِ فاتحانہ

○

کسی صورت نمودِ سوزِ پنہانی نہیں جاتی
بجھا جاتا ہے دل، چہرے کی تابانی نہیں جاتی

صداقت ہو تو دل سینوں سے کھنچنے لگتے ہیں واعظ
حقیقت خود کو منوا لیتی ہے مانی نہیں جاتی

چلے جاتے ہیں بڑھ بڑھ کر مٹے جاتے ہیں گر گر کر
حضورِ شمع پروانوں کی نادانی نہیں جاتی

وہ یوں دل سے گزرتے ہیں کہ آہٹ تک نہیں ہوتی
وہ یوں آواز دیتے ہیں کہ پہچانی نہیں جاتی

محبت میں اک ایسا وقت بھی دل پر گزرتا ہے
کہ آنسو خشک ہو جاتے ہیں طغیانی نہیں جاتی

جگر وہ بھی ز سر تا پا محبت ہی محبت ہیں
مگر ان کی محبت صاف پہچانی نہیں جاتی

○

عجب عالم سا دل پر چھا رہا ہے
نہیں جیسے کوئی شرما رہا ہے

وہ زلفیں دوش پر بکھری ہوئی ہیں
جمالِ آرزو بنتا رہا ہے

گلے مل کر وہ رخصت ہو رہے ہیں
محبت کا زمانہ آ رہا ہے

وہ خود تسکینِ خاطر کر رہے ہیں
مگر دل ہے کہ ڈوبا جا رہا ہے

طبیعت ہے کہ ٹھہری جا رہی ہے
زمانہ ہے کہ گزرا جا رہا ہے

مری رودادِ غم وہ سن رہے ہیں
تبسم سا لبوں پر آ رہا ہے

جگر ہی کا نہ ہو افسانہ کوئی
در و دیوار کو حال آ رہا ہے

○

محبت صلح بھی پیکار بھی ہے
یہ شاخِ گل بھی ہے تلوار بھی ہے

طبیعت عشق کی خوددار بھی ہے
ادھر نازک، مزاجِ یار بھی ہے

یہ نغمے جن سے اک دنیا ہے نالاں
انھیں سے گرمیٔ بازار بھی ہے

غنیمت ہے کہ اس دورِ ہوس میں
تمنا بہت دشوار بھی ہے

خبردار اے سبک سارانِ ساحل
یہ ساحل ہی کبھی منجدھار بھی ہے

جو کوئی سن سکے تو نکہتِ گل
شکستِ رنگ کی جھنکار بھی ہے

جوش ملیح آبادی

○

سوزِ غم دے کے مجھے اس نے یہ ارشاد کیا
جا تجھے کشمکشِ دہر سے آزاد کیا

وہ کریں بھی تو کن الفاظ میں تیرا شکوہ
جن کو تیری نگہِ لطف نے برباد کیا

دل کی چوٹوں نے کبھی چین سے رہنے نہ دیا
جب چلی سرد ہوا میں نے تجھے یاد کیا

اے میں سو جان سے اس طرزِ تکلم کے نثار
پھر تو فرمائیے! کیا آپ نے ارشاد کیا

اس کا رونا نہیں کیوں تم نے کیا دل برباد
اس کا غم ہے کہ بہت دیر میں برباد کیا

اتنا مانوس ہوں فطرت سے، کلی جب چٹکی
جھک کے میں نے یہ کہا، مجھ سے کچھ ارشاد کیا

مجھ کو تو ہوش نہیں تم کو خبر ہو شاید
لوگ کہتے ہیں کہ تم نے مجھے برباد کیا!

○

ملا جو موقع تو روک دوں گا جلالِ روزِ حساب تیرا
پڑھوں گا رحمت کا وہ قصیدہ کہ ہنس پڑے گا عتاب تیرا

یہی تو ہیں دو ستونِ محکم، انہیں پہ قائم ہے نظمِ عالم
یہی تو ہے رازِ خلدِ آدم، نگاہ میری شباب تیرا

صبا تصدق ترے نفس پر، چمن ترے پیرہن پہ قرباں
شمیمِ دوشیزگی میں کیسا بسا ہوا ہے شباب تیرا

تمام محفل کے روبرو گو، اٹھائیں نظریں، ملائیں آنکھیں
سمجھ سکا ایک بھی نہ لیکن سوال میرا جواب تیرا

ہزار شانیں ادا سے ٹپکیں، ہوا نہ تیرا سا کوئی پیدا
شفق نے کتنے ہی رنگ بدلے، ملا نہ رنگِ شباب تیرا

ادھر مرا دل تڑپ رہا ہے تری جوانی کی جستجو میں
ادھر مرے دل کی آرزو میں مچل رہا ہے شباب تیرا

کرے گی دونوں کا چاک پردہ، رہے گا دونوں کو کر کے رسوا
یہ شورشِ ذوقِ دید میری، یہ اہتمامِ حجاب تیرا

جڑیں پہاڑوں کی ٹوٹ جاتیں، فلک تو کیا عرش کانپ اٹھتا
اگر میں دل پر نہ روک لیتا، تمام زورِ شباب تیرا

بھلا ہوا جوشؔ نے اٹھایا نگاہ کا چشمِ تر سے پردہ
بلا سے جاتی رہیں گر آنکھیں، کھلا تو بندِ نقاب تیرا

○

چھلک گیا سیلاب، اس کے سینے میں ارمانوں کا
دیکھا جو سفینے کو میرے، جی چھوٹ گیا طوفانوں کا

یہ شوخ فضا، یہ تازہ چمن، یہ مست گھٹا، یہ سرد ہوا
کافر ہے اگر اس وقت بھی کوئی رُخ نہ کرے میخانوں کا

یہ کس کی حیات افروز نظر نے چھیڑ دیا ہے عالم کو
ہر خاک کے ادنیٰ ذرّے میں ہنگامہ ہے لاکھوں جانوں کا

مطرب! بربط ہاتھ سے رکھ دے، ماضی نے دکھلا دیا
فرہاد کو چھیڑ کر ٹوٹ گیا، پھر کا ناسا ارمانوں کا!

ہاں! ظلم و ستم سے بھی قطرے پڑتی ہیں خواہشیں سینے میں
سب سے ہے مہلک غم گر اے حسن ترے ارمانوں کا

اے دینِ وفا، اے جانِ کرم! یوں غم میں نہ سر ہاتھ پہ رکھ
مرجھاؤں گو میں نے شمع ابھارا! روپ بھر پروانوں کا

دنیا نے فسانوں کو بخشی افسردہ حقائق کی تلخی!
اور ہم نے حقائق کے نقشے میں رنگ بھرا افسانوں کا

کم بخت جوانی سینے میں ناگن کی طرح لہراتی ہے
ہر موجِ نفس اک طوفاں ہے کڑکتی بجلی ارمانوں کا

اے جوش! جنوں کی شام و سحر میں وقت کی بینائی نہیں
داناؤں کی طولانی صدیاں اک لمحہ نفس دیوانوں کا

○

ہٹ گئے دل سے تیرگی کے حجاب
آفریں! اے نگاہِ عالم تاب

آنسو آیا نہ کوئی مشکل میں
مشورے کے ہٹ گئے حجاب

کیا قیامت تھی صبر کی تلقین
اور بھی روح ہو گئی بے تاب

ہارے اُٹھے تو تا صبحِ شفق
ہاں کدھر ہے صراحیِ مے ناب

ہاں! اثر اب ہوا محبت کا
ہم سے آنے لگا ہے اُن کو حجاب

شب جو وہ بیٹھے میرے پہلو پر
مسکرانے لگی شبِ مہتاب

جوش کھلتی تھی جن سے دل کی کلی
کیسے وہ لوگ ہو گئے نایاب

○

حشووں کو چین ہی نہیں آفت کیے بغیر
تم اور مان جاؤ شرارت کیے بغیر!

اہلِ نظر کو یار دکھاتا رہو وفا
اے کاش! ذکرِ دوزخ و جنت کیے بغیر

اب دیکھ اس کا حال کہ آتا نہ تھا قرار
خود تیرے دل کو جس پہ عنایت کیے بغیر

اے ہم نشیں محال ہے ناصح کا ٹالنا!
یہ اور یہاں سے جائیں نصیحت کیے بغیر

تم کتنے تند خو ہو کہ پہلو سے آج تک
اک بار بھی اٹھے نہ قیامت کیے بغیر

چلتا نہیں ہے محفلِ حسنِ جواں میں کام
ہر جنبشِ نظر سے عبادت کیے بغیر

مانا کہ ہر قدم پہ قیامت ہے پھر بھی جوش
جیتا نہیں کسی سے محبت کیے بغیر!

○

جنوں پرور ہے جنت کے در کھلوائے جاتے ہیں
سرِ محشر تمہاری حسن کے بلوائے جاتے ہیں

غضب ہے یہ ادا اُن کی دمِ آرائشِ گیسو
جھکی جاتی ہیں آنکھیں خود بخود شرمائے جاتے ہیں

سحر کی ضو، شفق کی سرخیاں، برسات کے بادل
مجھے ہمراز پا کر یہ مناظر کھلائے جاتے ہیں

نہ جانے کتنی رنگیں صحبتیں ہیں میری نظروں میں
بس اے مطرب! مری آنکھوں میں آنسو آئے جاتے ہیں

شبِ وعدہ یہ کیسی تیرگی ہے؟ وقت کیا ہوگا
تمناؤں کے غنچے ہم نفس کمہلائے جاتے ہیں

کوئی حد ہی نہیں اس احترامِ آدمیت کی!
بدی کرتا ہے دشمن اور ہم شرمائے جاتے ہیں

بہت جی خوش ہوا اے ہم نشیں کل جوش سے مل کر
ابھی اگلی شرافت کے نمونے پائے جاتے ہیں

○

قدم انساں کا راہِ دہر میں تھرا ہی جاتا ہے
چلے کتنا ہی کوئی بچ کے ٹھوکر کھا ہی جاتا ہے

نظر ہو خواہ کتنی ہی حقائق آشنا، پھر بھی!
ہجومِ کشمکش میں آدمی گھبرا ہی جاتا ہے

خلافِ مصلحت میں بھی سمجھتا ہوں، مگر واعظ
وہ آتے ہیں تو چہرہ پر تغیر آ ہی جاتا ہے

ہوائیں زور کتنا ہی لگائیں آندھیاں بن کر
مگر جو گھر کے آتا ہے وہ بادل چھا ہی جاتا ہے

شکایت کیوں اسے کہتے ہو؟ یہ فطرت ہے انساں کی
مصیبت میں خیالِ عیشِ رفتہ آ ہی جاتا ہے

سمجھتی ہیں مآلِ گل، مگر کیا زورِ فطرت ہے!
سحر ہوتے ہی کلیوں کو تبسم آ ہی جاتا ہے

○

اٹھی وہ گھٹا، رنگ سامانیاں کر
گہرپاشیاں کر، زرافشانیاں کر!
وہ چھلکے خمِ مل، وہ بہکیں ہوائیں
گلوں کی طرح چاک دامانیاں کر
صراحی جھکا اور دھومیں مچا دے!
گلابی اٹھا اور گل افشانیاں کر!
شہ دارِ ہوش اور مدہوش بن جا
اٹھا جامِ زر اور سلطانیاں کر!
نگاہوں سے برسا دے ابرِ جوانی!
مے و ارغواں سے گلستانیاں کر
سمندر پہ چل اور الیاس بن جا!
ہواؤں پہ اڑ اور سلیمانیاں کر
صبا کی طرح کنج میں رقص فرما
بگولوں کی مانند جولانیاں کر
سکوں پاؤں چومے وہ ہلچل مچا دے
خرد سر جھکا دے وہ نادانیاں کر!
غمِ کم دلی کر جو شکستہ ہمتوں کے
جہاں داریاں کر، جہاں بانیاں کر!

ہے شوق تو وہاں کیفِ کم کی بات نہیں — دیارِ حسن میں دیر و حرم کی بات نہیں
ری رک سے منظر مری نظر جاؤں — وصال کی بات نہیں ہے ہجر کی بات نہیں
ے وحشت نسیم کا شوق ہے خیال کو — غزالِ دشت کے انداز رم کی بات نہیں
یہ بہ چہرہ وجۂ افتخار بجے — کسی کے قول کسی کی قسم کی بات نہیں
غلام ہے سب ہیں حلقہ بگوش — جہاں پناہ کے طبل و علم کی بات نہیں
بنا فقط اسیری ہے پاؤں کی زنجیر — حضور آپ کی زلفوں کے خم کی بات نہیں
بادۂ صبح محبت ہے روح — خطا معاف یہ لطف و کرم کی بات نہیں
ن بنانے جو کچھ نہیں نگاہ و مژہ — یہ فیض جام کا ہے جامِ جم کی بات نہیں
ے جلوۂ نسیم ہے جلوت پہ — بہار کوثر و باغِ ارم کی بات نہیں
وکے عشوۂ ادا دل پہ مرتا ہوں — کسی کی بخششِ دام و درم کی بات نہیں
ازل کی لغت دیں ہے فقط — کسی کی شوخیٔ نقشِ قدم کی بات نہیں

یہ طرزِ شستگی دل کا اک تقاضا ہے
کرم فسردہ تو آں محترم کی بات نہیں

○

نمایاں جستا نے سحر پیہم ہوتی جاتی ہے — طبیعت بے نیازِ ہر دو عالم ہوتی جاتی ہے
اٹھی جاتی ہے دل سے ہیبتِ آلام روحانی — جراحت ہر قلبِ زار مرہم ہوتی جاتی ہے
کنارہ کر رہی ہے صبح سے سیمابی سر تابی! — کہ گردوں جستجو کے ذوق میں خم ہوتی جاتی ہے
جنوں کا چھا رہا ہے زندگی پر اک دھندلکا سا — خودی کی روشنی سینے میں مدھم ہوتی جاتی ہے
نسیم بے نیازی آ رہی ہے بام گردوں سے — غرورِ سربلندی کی زلف برہم ہوتی جاتی ہے
نمایاں ہو رہا ہے اک جہانِ چشمِ تصور پر — نظر شاید حریفِ ساغرِ جم ہوتی جاتی ہے
گرہ یوں کھل رہی ہے ہر نفس ذوقِ تماشا کی — کہ ہر ادنیٰ سی شے اب ایک عالم ہوتی جاتی ہے
فضائیں کائنات کی ہیں مسلسل نغمگی — ہر اک تخئیل پاکیزہ مجسم ہوتی جاتی ہے
نہ جانے سینۂ احساس پر یہ ہات ہے کس کا — طبیعت بے نیازِ شادی و غم ہوتی جاتی ہے
سمجھ میں آئیں کیا باریکیاں قانونِ قدرت کی — جبلت کثرتِ معنیٰ سے مبہم ہوتی جاتی
عمل تھا جس کی شہرت سے کا عالم ہستی کا — ہے دل میں وہ ہلچل جوش اب کم ہوتی جاتی

فراق گورکھپوری

○

آج بھی قافلۂ عشق رواں ہے کہ جو تھا
وہی میل اور وہی سنگِ نشاں ہے کہ جو تھا

پھر ترا غم وہی رسوائے جہاں ہے کہ جو تھا
پھر فسانہ بحدیثِ دگراں ہے کہ جو تھا

منزلیں گرد کی مانند اڑی جاتی ہیں
وہی اندازِ جہانِ گزراں ہے کہ جو تھا

منزلیں عشق کی تا حدِ نظر سونی ہیں
کوئی رہرو نہ یہاں ہے نہ وہاں ہے کہ جو تھا

یوں تو اس دور میں بے کیف سی ہے بزمِ حیات
ایک ہنگامہ سرِ رطلِ گراں ہے کہ جو تھا

جو بھی کر جور و ستم جو بھی کر احسان و کرم
تجھ پہ اے دوست وہی وہم و گماں ہے کہ جو تھا

آنکھ جھپکی کہ ادھر ختم ہوا روزِ وصال
پھر بھی اس دن پہ قیامت کا گماں ہے کہ جو تھا

قرب ہی کم ہے نہ دوری ہی زیادہ لیکن
آج وہ ربط کا احساس کہاں ہے کہ جو تھا

پھر سرِ میکدۂ عشق ہے اک بارشِ نور
چھلکے جاموں سے چراغاں کا سماں ہے کہ جو تھا

آج بھی آگ دبی ہے دلِ انساں میں فراق
آج بھی سینوں سے اٹھتا وہ دھواں ہے کہ جو تھا

○

یہ نکہتوں کی نرم روی یہ ہوا یہ رات
یاد آ رہے ہیں عشق کو ٹوٹے تعلقات

مایوسیوں کی گود میں دم توڑتا ہے عشق
اب بھی کوئی بنا لے تو بگڑی نہیں ہے بات

کچھ اور بھی تو ہو ان اشارات کے سوا
یہ سب تو اے نگاہِ کرم بات بات ہے

اک عمر کٹ گئی ہے ترے انتظار میں
ایسے بھی ہیں کہ کٹ نہ سکی جن سے ایک رات

ہم اہلِ انتظار کے آہٹ پہ کان تھے
ٹھنڈی ہوا تھی، غم تھا ترا، ڈھل چلی تھی رات

یوں تو بچی بچی سی اٹھی وہ نگاہِ ناز!
دنیائے دل میں ہو ہی گئی کوئی واردات

جن کا سراغ پا نہ سکی غم کی روح بھی
ناداں اٹھے ہیں عشق میں ایسے بھی سانحات

ہر سعی و ہر عمل میں محبت کا ہاتھ ہے
تعمیرِ زندگی کے سمجھ کچھ محرکات

مجھ کو تو غم نے فرصتِ غم بھی نہ دی فراق
دے فرصتِ حیات نہ جیسے غمِ حیات

○

یہ نرم نرم ہوا جھلملا رہے ہیں چراغ
ترے خیال کی خوشبو سے بس رہے ہیں دماغ

دلوں کو تیرے تبسم کی یاد یوں آئی
کہ جگمگا اٹھیں جس طرح مندروں میں چراغ

تمام شعلۂ گل ہے تمام موجِ بہار
کہ تا حدِ نگہِ شوق لہلہاتے ہیں باغ

نئی زمین، نیا آسماں، نئی دنیا
سنا تو ہے کہ محبت کو ان دنوں ہے فراغ

جو چھپ کے تاروں کی آنکھوں سے پاؤں دھرتا ہے
اسی کے نقشِ کفِ پا سے جل اٹھے ہیں چراغ

نگاہیں مطلعِ نو پہ ہیں ایک عالم کی
کہ مل رہا ہے کسی پھوٹتی کرن کا سراغ

دلوں میں داغِ محبت کا اب یہ عالم ہے
کہ جیسے نیند میں ڈوبے ہوں پچھلی رات چراغ

فراق بزمِ چراغاں ہے محفلِ رنداں
سجے ہیں پگھلی ہوئی آگ سے چھلکتے ایاغ

○

جولانگہِ حیات کہیں ختم ہی نہیں
منزل نہ کر حدود سے دنیا بنی نہیں

مانا کہ تیرے لطف و کرم میں کمی نہیں
آسان اس قدر تو تری دوستی نہیں

کچھ غور کریں تو کہاں تک نشیمن کی منزلیں
پائے طلب کو فکرِ سلامت روی نہیں

کب دیکھیے دلوں کو ملے اذنِ پاس ابھی
بیگانہ وار کتنی ہے وہ آنکھ ابھی نہیں

بے خود سے تھے تو وقت کا یہی فریب تھا
ہم اور تجھ کو دل سے بھلا دیں کبھی نہیں

نیند آ چلی ہے انجمِ شامِ ابد کو بھی
آنکھ اہلِ انتظار کی اب تک لگی نہیں

یادِ بہار دیکھ کے کس طرح یہ کہیں
رنگینیوں کی جان تری سادگی نہیں

اے دوست یوں تو بہتری حسرت کہیں کہیں
لیکن یہ زندگی تو کوئی زندگی نہیں

اے عشق کارواں ہی وہ عالم بچھڑ گئے
اے خضرِ راہ یہ تو کوئی رہبری نہیں

یہ کیفیت سکوں کی ہے موجِ مکاں کی ہے
وہ شام ہے جو صبح ہی ہو کر گئی نہیں

نگاہیں کسی کو مانگتی ہیں آج بھی فراق
گو زندگی میں یوں مجھے کوئی کمی نہیں

○

سر میں سودا بھی نہیں دل میں تمنا بھی نہیں
لیکن اس ترکِ محبت کا بھروسا بھی نہیں

تم نے پوچھا بھی نہیں ہم نے بتایا بھی نہیں
کون سا راز وہ ایسا تھا کہ جانا بھی نہیں

یہ بھی سچ ہے کہ محبت پہ نہیں میں مجبور
یہ بھی سچ ہے کہ ترا حسن کچھ ایسا بھی نہیں

بدگماں ہو کے مل اے دوست جو ملنا ہے تجھے
یہ جھجکتے ہوئے ملنا کوئی ملنا بھی نہیں

دل کی گنتی نہ یگانوں میں نہ بیگانوں میں
لیکن اس جلوہ گہِ ناز سے اٹھتا بھی نہیں

مہربانی کو محبت نہیں کہتے اے دوست
آہ اب مجھ سے تری رنجشِ بے جا بھی نہیں

مدتیں گزریں تری یاد بھی آئی نہ ہمیں
اور ہم بھول گئے ہوں تجھے ایسا بھی نہیں

مجھ سے سنبھلیں تو سنبھال اپنے حجابِ بے باک
میں اٹھا، تا حدِ آداب تماشا بھی نہیں

ہائے وہ رازِ محبت جو چھپائے نہ بنے
ہائے وہ داغِ محبت جو ابھرتا بھی نہیں

آہ یہ مجمعِ احباب یہ بزمِ خاموش
آج محفل میں فراقِ سخن آرا بھی نہیں

○

شامِ غم کچھ اس نگاہِ ناز کی باتیں کرو
بے خودی بڑھتی چلی ہے راز کی باتیں کرو

یہ سکوتِ ناز یہ دل کی رگوں کا ٹوٹنا
خامشی میں کچھ شکستِ ساز کی باتیں کرو

نکہتِ زلفِ پریشاں داستانِ شامِ غم
صبح ہونے تک اسی انداز کی باتیں کرو

ہر رگِ دل وجد میں آتی رہے دکھتی رہے
یوں ہی اس کے جا و بے جا ناز کی باتیں کرو

جو عدم کی جان ہے جو ہے پیامِ زندگی
اس سکوتِ راز، اس آواز کی باتیں کرو

عشق رسوا ہو چلا بے کیف سا بیزار سا
آج اس کی نرگسِ غماز کی باتیں کرو

کچھ قفس کی تیلیوں سے چھن رہا ہے نور سا
کچھ فضا کچھ حسرتِ پرواز کی باتیں کرو

جس کی فرقت نے پلٹ دی عشق کی کایا فراق
آج اس عیسیٰ نفس دمساز کی باتیں کرو

○

…طرب سے کوئی آج اس انداز سے گائے
پھر دل کو لگے چوٹ سی، بھر آنکھ بھر آئے
…وہ چوٹ، جو کیا جانیے کہاں سے اُبھر آئے
وہ درد، فرشتوں کو جو انسان بنائے
…آنکھوں کو پھر اک شاہد رعنا نظر آئے
زلفیں کھلے، رخ کھلے، تنگ قبائے
…ل برق ادا، شعلہ قبا، پیکر رنگیں
دل دست حنا دھڑکے تو پہلو میں دبائے
…کرنا ہو گداز، اُف یہ تبسم کی گھلاوٹ
لہجے کی کھنک، وہ جو ستاروں سے چرائے
وہ مستی قامت کہ گھٹا جھوم کے اٹھے
وہ چستی ہر عضو کہ بجلی کو غش آئے
…نس نس میں کرن جیسے دبی چنگیاں بھرے
رگ رگ میں کلی جیسے چٹکتی چلی جائے
دوشیزہ جوانی کی ادھر نرم سی انگڑائی
تصویر ادھر قوس و قزح کھینچتی جائے
وہ شوخئ مستانہ کے بچتے ہوئے انداز
دنیا بھی نہ جینے دے، قیامت بھی نہ ڈھائے
یہ کم نگہی چشم فسوں ساز کی کیسی
دیوانہ بناتا ہے تو دیوانہ بنائے
کچھ ایسی بھی گزری ہیں ترے ہجر میں راتیں
دل درد سے خالی ہو، مگر نیند نہ آئے

○

نہ ہے آب و گل کی یہ کیمیا، ہے چمن کہ معجزۂ نمو
نہ خزاں ہے کچھ، نہ بہار کچھ، وہی خار و خس، وہی رنگ و…
ہوئی ختم صحبت مے کشی، یہی داغ سینوں میں رہ گیا
کہ طلوع ہونے سے رہ گئے، کئی آفتاب خم و سب…
کئی لاکھ پھولوں نے پیرہن سر باغ ہنس کے اڑا دیے
نہ ہے فصل گل، وہ ہوا چلی کہ چمن کی لے اڑی آبر…
جسے اپنے آپ سے کہتے بھی مجھے آج لاکھ حجاب ہے
وہ زمانہ عشق کو یاد ہے، مری عرض غم تھی رو بہ…
ہوئی واردات سحر میاں، تو گلوں کا سینہ دھڑک گیا
یہ چلی کہ تیغ نسیم نے کئی ہاتھ اچھال دیا لہ…
وہی آنکھ جام مے حیا، وہی آنکھ جام جہاں نما
جو نگاہ اٹھتی نہیں کبھی، وہ نگاہ جاتی ہے چار…
یہ کہاں سے بزم خیال میں امنڈ آئیں چہروں کی ندیاں
کوئی مہر چکاں، کوئی نور فشاں، کوئی زہرہ وش، کوئی مش…
کھلے باغ حسن صدف صدف، لگے داغ عشق ختن ختن
تب و تاب رخ سمن بدن، خم و پیچ زلف سیاہ…
مری شاعری نے کھلائے گل سر نوک خار چمن چمن
جو کیے یہ دعوے حریف نے رگ فکر دینے لگی ا…
تجھے اہل دل کی خبر نہیں کہ جہاں میں کیا کیا لٹا گئے
یہ گدا اگر ہیں دیار غم، یہ قلندران تہی ک…
اب اسی کا کلمہ زمانے میں، یہ سنا ہے مرجع خلق ہے
جو فراق تیرے لیے پھرا، کبھی در بدر، کبھی کو بہ کو

○

ل سی شب ہجر کی ختم پہ آئی
وہ پہلی سی وہ نئی زندگی نظر آئی

ہے کہ یہ جہانیاں ابھی گلہ
مسافروں کے کمرشوں کی دھند آئی

ستم بہار رہی بیکسی
پہنچ کے منزل جاناں پہ آنکھ بھر آئی

ال مکاں ہی ہے نام کرب یکسر
گر یہ بات محبت کی بات پہ آئی

نہ ہم طرب میں حیات جیتی تھی
امید مدتوں کی مستیاں نظر آئی

یہ ایک افسانہ کا بار اٹھا
کہ یہ بلا بھی ترے عاشقوں کے سر آئی

یں آہ تری یاد دنوں کے بعد
یہ چہرہ جتنی یہ چشم تر آئی

ر جیسے کوئی رات بھر جاگے
تری نگاہ وہ دوریں پہ جتنی اتر آئی

سال کے بعد آئینہ تو دیکھنے کو بہت
ترے جمال کی وہ شیرگی نکھر آئی

نہیں کہ کبھی درد بیٹھ رہیں
گلی گلی کی صبا جا کے گرد بھر آئی

شب فراق اٹھے دل میں اور بھی کچھ درد
کہوں یہ کیسے تری یاد رات بھر آئی

○

دنیا دنیا عالم عالم تک رازہی ویرانے
وادی وادی جنگل جنگل جہاں گئے تیرے دیوانے

بات وہ کہنے عشق کرنے کا سب قائل ہیں کوئی مانے
وہ بھلا پید اکلے سے ہیں لیاقت کے دیوانے

ایک شب غم کی سرائیں ایک محبت کے افسانے
اسی درد کا گھر گھر چرچا، ہی سے دنیا قائل ہے

وہی جتنے عشق کے ہیں وہی سمجھے غم پہچانے
اور حسن سے ہی جن کے یہ عشق نہ تھا پیارے کیا

حسینہ کے بستی ہیں نادان رہنی خطا جتنے ہیں افسانے
ترے قسمت ہوا کی رازبری کو اپنی گود پہ لگا دیا

بلند وہ کار جہاں خود جیسے نگیں پہ حق سکتا نے
خلقت ہو کر کوئی بھلا ہے سجا کے بڑوں کو کہیں جا

دلوں پہ آتی یا ہے دنیا کی جلتے ہیں زمانے
حسن کے پاس ہی کا نہیں جتنا عشق کا اس کی کیا بھلا

دیکھے جو سب جلا ہیں سب کی سمجھا یاپی ٹھانے
اسی کی قطرہ حیرانی حیران مجبوری ہی آزادی بھی

جس ہر خوشی سے آنکھیں ہیں سہے وہ محبت کے زمانے
دنیا اپنے رنگ کی جتنی خوب خوشی کے دیکھی ہے

تھوڑا یا کہ سبھی یہی ہم کہیں پہ سانے تری پیمانے
حسن محبت آپ اپنی تو بھی ہیں کہ محرم نہ ہوں

کہنا تو عشق گیا ہے رسک کس میں جان پہچانے
اس جہاں کی دنیا میں بھی بیوں کی کب بیتیں فسانے

دل میں جلتے بجھتے ہیں کہ اپنے کے بلنے
شعلۂ گل پر چادر شبنم سر تا سر تصویر حیات

ہوش اڑے وہی حیران کرنے کی بے کس کرنے جانے
ذرہ ذرہ رکا رتا رقطرہ قطرہ دریا دریا

سامنے کی چیزیں بھی فراق انساں کو دھوکا دیتی ہیں
نیند میں جاگا خواب نے کیا دیکھا جو جاگا ہی نہ مانے

حفیظ جالندھری

○

او دل توڑ کے جانے والے، دل کی بات بتاتا جا
اب میں دل کو کیا سمجھاؤں، مجھ کو بھی سمجھاتا جا

ہاں میرے مجروح تبسم خشک لبوں تک آتا جا
پھول کی ہست و بود یہی ہے کھلتا جا مرجھاتا جا

میری چپ رہنے کی عادت جس کارن بدنام ہوئی
اب وہ حکایت عام ہوئی ہے سنتا جا شرماتا جا

یہ دکھ درد کی برکھا بندے دین ہے تیرے داتا کی
شکرِ نعمت بھی کرتا جا، دامن بھی پھیلاتا جا!

جینے کا ارمان کروں یا مرنے کا سامان کروں
عشق میں کیا ہوتا ہے ناصح عقل کی بات سجھاتا جا

مجھ کو بار آور دونوں سے کام نہ چاند نہ تاروں سے
بہلانا ہے باتوں سے بہلاتا جا بہلاتا جا!

دونوں سنگِ راہِ طلب ہیں راہنما بھی منزل بھی
ذوقِ طلب! ہر ایک قدم پہ دونوں کو ٹھکراتا جا

نغمے سے جب پھول کھلیں گے چننے والے چن لیں گے
سننے والے سن لیں گے تو اپنی دھن میں گاتا جا

آخر تجھ کو بھی موت آئی۔ خیر، حفیظ خدا حافظ
لیکن جاتے جاتے پیارے وجہِ مرگ بتاتا جا

○

کوئی دوا نہ دے سکے، مشورۂ دعا دیا
چارہ گروں نے اور بھی درد کا دل بڑھا دیا

ذوقِ نگاہ کے سوا، شوقِ گناہ کے سوا
مجھ کو خدا سے کیا ملا، مجھ کو بتوں نے کیا دیا

تھی نہ خزاں کی روک تھام دامنِ اختیار میں
ہم نے بھری بہار میں اپنا چمن لٹا دیا

حسنِ نظر کی آبرو صنعتِ برہمن سے ہے
جس کو صنم بنا لیا، اس کو خدا بنا دیا

داغ ہے مجھ پہ عشق کا میرا گناہ بھی تو دیکھ
اس کی نگاہ بھی تو دیکھ جس نے یہ گل کھلا دیا

عشق کی مملکت میں ہے شورشِ عقلِ نامراد
ابھرا کہیں جو یہ فساد دل نے وہیں دبا دیا

نقشِ وفا تو میں ہی تھا، اب مجھے ڈھونڈتے ہو کیا
حرفِ غلط نظر پڑا، تم نے مجھے مٹا دیا

خبثِ دروں دکھا دیا، ہر دہنِ غلیظ نے
کچھ نہ کہا حفیظ نے، ہنس دیا مسکرا دیا

○

جھگڑا دانے پانی کا ہے دام و قفس کی بات نہیں
اپنے بس کی بات نہیں صیاد کے بس کی بات نہیں

جان سے پیارے یار ہمارے قید وفا سے چھوٹ گئے
سارے رشتے ٹوٹ گئے اک تارِ نفس کی بات نہیں

جیا پھولوں کا بستر ہی راہ گزارِ سیل میں ہے
آگا— اب یہ بنسے ہی کے خار و خس کی بات نہیں

دونوں بھوکے، دیتے ہیں، دونوں وصل کے طالب ہیں
حسن بھلا کیسے پہچانے عشق ہوس کی بات نہیں

زشت ہے عنواں— نیش تبسم، ان شیریں افسانوں کا
تذکرہ ہے افسانوں کا یہ صور و عکس کی بات نہیں

کار مغاں یہ قند کا شربت ہے چکھنے والے کیا جانیں!
تلخی و مستی بھی ہے غزل میں، خالی رس کی بات نہیں

تشکیل و تکمیل فن میں جو بھی حفیظ کا حصہ ہے
نصف صدی کا قصہ ہے، دو چار برس کی بات نہیں

○

اے دوست مٹ گیا ہوں فنا ہو گیا ہوں میں
اس دردِ دوستی کی دوا ہو گیا ہوں میں

قائم کیا ہے میں نے عدم کے وجود کو
دنیا سمجھ رہی ہے، فنا ہو گیا ہوں میں

ہمت بلند تھی، مگر افتاد دیکھنا!
چُپ چاپ آج محوِ دعا ہو گیا ہوں میں

نا آشنا ہیں رتبۂ دیوانگی سے دوست
کم بخت، جانتے نہیں، کیا ہو گیا ہوں میں

ہنسنے کا اعتبار، نہ رونے کا اعتبار
کیا زندگی ہے جس پہ فدا ہو گیا ہوں میں

اس کیفِ بے خودی کی وہ ساعت بھی یاد ہے
محسوس ہو رہا تھا خدا ہو گیا ہوں میں!

○

مستوں پہ اُنگلیاں نہ اُٹھاؤ بہار میں
دیکھو تو — ہوش ہے بھی کسی ہوشیار میں

کچھ محتسب کا خوف ہے کچھ شیخ کا لحاظ
پیتا ہوں چھپ کے دامنِ ابرِ بہار میں

وہ سامنے دھری ہے صراحی بھری ہوئی
دونوں جہاں ہیں آج مرے اختیار میں

جھوٹی تسلیوں سے نہ بہلاؤ، جاؤ جاؤ
جاؤ — کہ تم نہیں ہو مرے اختیار میں!

اللہ بات کیا ہے کہ دیوانگی مری!
دیوانگی نہیں نظرِ ہوشیار میں

وہ عندلیبِ گلشنِ معنی ہوں میں حفیظ
سوزِ سخن سے آگ لگا دوں بہار میں

○

جوانی کے ترانے گا رہا ہوں — دبی چنگاریاں سلگا رہا ہوں
مری بزمِ وفا سے جانے والو — ٹھہر جاؤ، کہ میں بھی آ رہا ہوں
بتوں کو قول دیتا ہوں وفا کا — قسم اپنے خدا کی کھا رہا ہوں
وفا کا لازمی تھا یہ نتیجہ! — سزا اپنے کیے کی پا رہا ہوں
خدا لگتی کہو سمجھانے والو! — تمھارے ساتھ میں کیسا رہا ہوں

نہ ہے وہ گوشۂ راحت کہ جس میں — ہجومِ رنج سے کترا رہا ہوں
نئے کعبے کی بنیادوں سے پوچھو — پرانے بتکدے کیوں ڈھا رہا ہوں
نہیں کانٹے بھی کیا اُجڑے چمن میں — کوئی رُت کے بھلے میں جا رہا ہوں
ہوئی جاتی ہے کیوں بیتاب منزل — مسلسل چل رہا ہوں آ رہا ہوں

حفیظ اپنے پرائے بن رہے ہیں
کہ میں دل کو زباں پر لا رہا ہوں

○

ناکامیِ عشق، یا کامیابی
دونوں کا حاصل خانہ خرابی

آنکھیں ہیں مست، پھر اکتسابی
بادہ شبانہ، جامِ آفتابی

پُر سوز ہیں وہ، پھول کھلیں ہی تک
لب لعل تابی، عارض گلابی

دنیا دلوں سے بیگانہ ہو جب
دیوانہ ہو جا، بن جا شرابی

اُن کا بہانہ برجستہ گوئی
میرا تبسم حاضر جوابی

دیندار کر دے، کافر بنا دے
یہ پردہ داری، یہ بے حجابی

ہیں تختِ دل پر سرکار، ورنہ
تختہ اُلٹ دیں ہم انقلابی

دربان سے ہوں دست و گریباں
الحمد للہ یہ باریابی!

○

کہہ گئے الفراق یارانے
رہ گئے ناتمام افسانے

دوستی اب گلے کا ہار نہیں
تار ٹوٹا بکھر گئے دانے

صبحدم اپنی اپنی راہ لگے
شمع کے جاں نثار پروانے

ساقیا! یہ رواروی کا ہے دور
بھر دے بھر دے پھر اور پیمانے

ماتمِ اہلِ ظرف کے دن ہیں
احتراماً ہیں بند مے خانے

زندگی سے نپٹ رہا ہوں ابھی
موت کیا ہے مری بلا جانے

کر رہا ہوں تلاش اپنوں کی
جب سے گم ہو گئے ہیں بیگانے

ہم نے روکا حفیظؔ کو ورنہ
اور بھی کچھ لگے تھے فرمانے!

تک رہا ہے ترے جلو میں حفیظؔ
اور کیا چاہتا ہے دیوانے

○

ہم ہی میں تھی نہ کوئی بات یاد نہ تم کو آسکے
تم نے ہمیں بھلا دیا، ہم نہ تمہیں بھلا سکے

تم ہی نہ سن سکے اگر، قصۂ غم سنے گا کون
کس کی زباں کھلے گی پھر، ہم نہ اگر سنا سکے

ہوش میں آچکے تھے ہم، جوش میں آچکے تھے ہم
بزم کا رنگ دیکھ کر سر نہ مگر اٹھا سکے

رونقِ بزم بن گئے۔ لب پہ حکایتیں رہیں!
دل میں شکایتیں رہیں، لب نہ مگر ہلا سکے

عجز سے اور بڑھ گئی، برہمیٔ مزاجِ دوست
اب وہ کرے علاجِ دوست، جس کی سمجھ میں آسکے

ایسا ہو کوئی نامہ بر، بات پہ کان دھر سکے
سن کے یقین کر سکے، جا کے انھیں سنا سکے

شوقِ وصال ہے یہاں، لب پہ سوال ہے یہاں
کس کی مجال ہے یہاں، ہم سے نظر ملا سکے؟

اہلِ زباں تو ہیں بہت، کوئی نہیں ہے اہلِ دل
کون تری طرح حفیظ، درد کے گیت گا سکے

○

وہ سرخوشی دے کہ زندگی کو شباب سے بہرہ یاب کر دے
مرے خیالوں میں رنگ بھر دے مرے لہو کو شراب کر دے

یہ خوب کیا ہے، یہ زشت کیا ہے، جہاں کی اصلی سرشت کیا ہے
بڑا مزا ہو تمام چہرے اگر کوئی بے نقاب کر دے!

کہو تو رازِ حیات کہہ دوں، حقیقتِ کائنات کہہ دوں
وہ بات کہہ دوں کہ پتھروں کے جگر کو بھی آب آب کر دے

خلافِ تقدیر کر رہا ہوں، پھر ایک تقصیر کر رہا ہوں
پھر ایک تدبیر کر رہا ہوں، خدا اگر کامیاب کر دے

ترے کرم کے معاملے کو ترے کرم ہی پہ چھوڑتا ہوں
مری وفائیں شمار کر لے، مری وفا کا حساب کر دے

حفیظ سب سے بڑی خرابی ہے عشق میں لطفِ کامیابی
کسی کی دنیا تباہ کر دے، کسی کی عقبیٰ خراب کر دے

میرزا یاس یگانہ

○

مجھے دل کی خطا پر یاس شرمانا نہیں آتا
پرایا جرم اپنے نام لکھوانا نہیں آتا

برا ہو پائے سرکش کا کہ تھک جانا نہیں آتا
کبھی گمراہ ہو کر راہ پر آنا نہیں آتا

مجھے اے ناخدا آخر کسی کو منہ دکھانا ہے
بہانہ کر کے تنہا پار اتر جانا نہیں آتا

مصیبت کا پہاڑ آخر کسی دن کٹ ہی جائے گا
مجھے سر مار کر تیشے سے مر جانا نہیں آتا

اسیرو! شوق آزادی مجھے بھی گدگداتا ہے
مگر چادر سے باہر پاؤں پھیلانا نہیں آتا

دل بے حوصلہ ہے اک ذرا سی ٹھیس کا مہماں
وہ آنسو کیا پئے گا جس کو غم کھانا نہیں آتا

سراپا راز ہوں میں کیا بتاؤں کون ہوں کیا ہوں
سمجھتا ہوں مگر دنیا کو سمجھانا نہیں آتا

○

ہنوز زندگیٔ تلخ کا مزا نہ ملا
کمال صبر ملا صبر آزما نہ ملا

مری بہار و خزاں جس کے اختیار میں ہے
مزاج اس دل بے اختیار کا نہ ملا

جواب کیا وہی آوازۂ بازگشت آئی
قفس میں نالۂ جانکاہ کا مزا نہ ملا

امیدوار رہائی قفس بدوش چلے
جہاں اشارۂ توفیق غائبانہ ملا

ہوا کے دوش پہ جاتا ہے کاروان نفس
عدم کی راہ میں کوئی پیادہ پا نہ ملا

ہزار ہا اسی جانب ہے منزل مقصود
دلیل راہ کا عالم کیا بلا نہ ملا

امید و بیم نے مارا مجھے دوراہے پر
کہاں کے دیر و حرم گھر کا راستہ نہ ملا

خوشا نصیب جسے فیض عشق شعلہ گیر
بقدر ظرف ملا ظرف سے سوا نہ ملا

سمجھ میں آگیا جب عذر فطرت مجبور
گلہ کا پھر ازل کو نصیب جا نہ ملا

○

ـ لاتی ہے آخر ایک جنبشِ لب کیا
دیکھئے دکھاتا ہے وعدۂ تذبذب کیا

بھری ستوالی، وہی گھونگھٹ میں خالی
یہ بھری جوانی کیا، جذبۂ لبالب کیا

دعائیں لیتا جا گالیاں بھی دیتا جا
تازگی تو کچھ پہنچے، چابتا رہوں لب کیا

ست آنکھیں آخر کہہ گئیں خدا حافظ
راستی کا پھل پاتا، بندۂ مقرب کیا

ی مسجد میں سنتا رہا کہ تو آنی کہہ
سادہ ہے تو کیا جانے بجا نچنے کا ہے ڈھب کیا

سب جہاد میں دل کے سب فساد ہیں دل کے
بے دلوں کا مطلب کیا اور ترکِ مطلب کیا

در ہے گا سجدہ بھی جب کسی کی یاد آئی
یاد جانے کب آئے زندہ داریِ شب کیا

ابرِ مرگ کے دن کا تھوڑی دیر کا جھگڑا
دیکھنا ہے یہ نادان جینے کا ہے کرتب کیا

پہنچے بہت پالے ڈس چکے بہت کالے
موذیوں کے موذی کو فکرِ نیشِ عقرب کیا

میرزا یگانہ واہ! زندہ باد! زندہ باد!
اک بلا سے بھلا دار جب تم گئے تو اب کیا

○

خودی کا نشہ چڑھا آپ میں رہا نہ گیا
خدا بنے تھے یگانہ مگر بنا نہ گیا

پیام زیرِ لب ایسا کہ کچھ سنا نہ گیا
اشارہ پاتے ہی انگڑائی لی رہا نہ گیا

ہنسی میں وعدۂ فردا کو ٹالنے والو!
لو دیکھ لو وہی کل آج بن کے آ نہ گیا

گناہِ زندہ دلی کہئے یا دل آزاری
کسی پہ ہنس لیے اتنا کہ پھر ہنسا نہ گیا

سمجھتے کیا تھے مگر سنتے تھے ترانۂ درد
سمجھ میں آنے لگا جب تو پھر سنا نہ گیا

کروں تو کس سے کروں دردِ نارسا کا گلہ
کہ مجھ کو لے کے دلِ دوست میں سما نہ گیا

بتوں کو دیکھ کے سب نے خدا کو پہچانا
خدا کے گھر تو کوئی بندۂ خدا نہ گیا

کرشن کا ہوں پجاری علی کا بندہ ہوں
یگانہ شانِ خدا دیکھ کر رہا نہ گیا

○

لذتِ زندگی مبارک باد
کل کی کیا فکر؟ ہر چہ بادا باد

اے خوشا زندگی کہ پیوستہ شوق
دوست کے نام قصہ ہے آباد

دل سلامت ہے، درد دل نہ سہی
درد جاتا رہا کہ درد کی یاد؟

زیست کے ہیں یہی مزے واللہ
چار دن شاد چار دن ناشاد

کون دیتا ہے دادِ ناکامی
خونِ فرہاد برسرِ فرہاد

صبر اتنا نہ کر کہ دشمن پر
تلخ ہو جائے لذتِ بیداد

صلح کر لو یگانہ غالب سے
وہ بھی استاد تم بھی اک استاد

○

جب تک خلشِ دردِ خداداد رہے گی
دنیا دلِ ناشاد کی آباد رہے گی

دنیا کی بہار آس نہ آئے گی کسی کو
ہر سر میں ہوائے ارم آباد رہے گی

چونکائے گی رہ رہ کے تو غفلت کا مزہ کیا
ساتھ اپنے اجل صورتِ ہمزاد رہے گی

دل اور دھڑکتا ہے اب تو قفس میں
شاید یہ زباں تشنۂ فریاد رہے گی

جو خاک کا پتلا وہی صحرا کا بگولہ
مٹنے پہ بھی اک ہستیٔ برباد رہے گی

ہر شام ہوئی صبح کو اک خوابِ فراموش
دنیا یہی دنیا ہے تو کیا یاد رہے گی

شہرہ ہے یگانہ تری بیگانہ روی کا
واللہ یہ بیگانہ روی یاد رہے گی

○

شیدہ سہی
غریب کھاؤ گے پھر بھی فریب دیدہ سہی
لیل و نہار
بہل ہی جائے گا دل آپ سے رمیدہ سہی
ں دھڑکتا ہے
اسے یہ ایک ہی فتنہ ہے، نودمیدہ سہی
رت ہے
مزے پہ آہی گیا حسن، نارسیدہ سہی
ہ دزدیدہ
خطائے حسن کہے کون، چشم دیدہ سہی
یکتی ہے
ستم رسیدہ سہی، پیرہن دریدہ سہی!
را ہے
بلا سے نخلِ تمنا خزاں رسیدہ سہی
ب اُڑتا ہے
زبانِ حال سے اک حرف ناشنیدہ سہی
کوسوں دور
مجھے نہ دیکھ سکو گے، زمانہ دیدہ سہی
گلوں کی خطا
تمھارے داغ میں کانٹا ہی برگزیدہ سہی
یدِ صب تو سوچئے کیا ہو
یں تو [illegible]یدہ سہی

○

حسن پر فرعون کی پھبتی کہی
ہاتھ لانا یار کیوں کیسی کہی!

دامنِ یوسفؑ ہی بھڑکاتا رہا
عشق اور ترکِ ادب؟ اچھی کہی

کوئی ضد تھی یا سمجھ کا پھیر تھا
مٹ گئے وہ میں نے جب اُلٹی کہی

درد سے پہلے کروں فکرِ دوا
واہ یہ اچھی الٹوانسی کہی

دوست سے پردہ کیا یہ کیسا کیا
آپ بیتی چھوڑ جگ بیتی کہی

شک ہے کافر کو مرے ایمان میں
جیسے میں نے کوئی منہ دیکھی کہی

کیا خبر تھی یہ خدائی اور ہے
ہائے میں نے کیوں خدا لگتی کہی

مفت میں سُن لی یگانہ کی غزل
اَن سُنی کردی جو مطلب کی کہی

○

کس کی آواز کان میں آئی؟ دور کی بات دھیان میں آئی
ایسی آزاد روح اس تن میں کیوں پرائے مکان میں آئی
آپ آتے رہے بلاتے رہے آنے والی اک آن میں آئی
ہائے کیا کیا نگاہ بھٹکی ہے جب کبھی امتحان میں آئی
علم کیا علم کی حقیقت کیا جیسی جس کے گمان میں آئی
حسن کیا خواب سے ہوا بیدار جانِ تازہ جہان میں آئی
جان لیوا ہے یہ کڑی تیوری یہ کشش کس کمان میں آئی
بات ادھوری مگر اثر دونا اچھی لکنت زبان میں آئی
آنکھ نیچی ہوئی ارے یہ کیا؟
کیوں غرض درمیان میں آئی

○

کارگاہِ دنیا کی نیستی بھی ہستی ہے
اک طرف اجڑتی ہے ایک سمت بستی ہے
بے دلوں کی ہستی کیا جیتے ہیں نہ مرتے ہیں
خواب ہے نہ بیداری ہوش ہے نہ مستی ہے
کیمیائے دل کیا ہے خاک ہے مگر کیسی؟
لیجیے تو مہنگی ہے بیچیے تو سستی ہے
خضرِ منزل اپنا ہوں اپنی راہ چلتا ہوں
میرے حال پر دنیا کیا سمجھ کے ہنستی ہے
کیا کہوں سفر اپنا ختم کیوں نہیں ہوتا
فکر کی بلندی یا حوصلہ کی پستی ہے
حسنِ بے تماشا کی دھوم کیا معمہ ہے
کان بھی ہیں نامحرم آنکھ بھی ترستی ہے
چتونوں سے ملتا ہے کچھ سراغ باطن کا
چال سے تو کافر پہ سادگی برستی ہے
ترکِ لذتِ دنیا کیجیے تو کس دل سے
ذوقِ پارسائی کیا فیضِ تنگدستی ہے
دیدنی ہے یاس اپنے رنج و غم کی طغیانی
جھوم جھوم کر کیا کیا یہ گھٹا برستی ہے

سیماب اکبرآبادی

○

رات کا جانا، وداعِ شیشہ و پیمانہ تھا
صبح کا آنا نہ تھا، قفلِ درِ مے خانہ تھا

حسن تنگ آکر بھڑک اُٹھا فضائے طور سے
طالبِ دیدار کا ارمان گستاخانہ تھا

ڈھونڈتا پھرتا تھا چشمِ آرزو کی روشنی
میں شبِ فرقت اندھیری رات کا پروانہ تھا

میری خاکستر سے پیدا تھا جہانِ آرزو
جو پتنگا دل کے شعلوں سے اُڑا، پروانہ تھا

کیف اے ساقی! اٹھا مجھ کو نہ جھونکے کی طرح
کچھ مرے انداز سے چھوٹا ترا پیمانہ تھا

○

اب تو یہ حال ہے نظرِ سوگوار کا
کیفِ جمال ہے، نہ مزہ انتظار کا

کہتے ہیں جس کو نزع کا عالم جہان میں
پچھلا پہر ہے میری شبِ انتظار کا

دل سرگرانِ حسرتِ دیدار رہ گیا
آنکھوں نے لطف لوٹ لیا انتظار کا

منہ زرد، خون یاس میں پلکیں بھری ہوئی
عالم تو دیکھئے سحرِ انتظار کا

یہ نازِ منفعل، یہ ادائیں حجاب کی
منہ ہو تو چوم لوں نگہِ شرمسار کا

سیماب کیا سناؤں میں اپنا کسی کو حال
زندہ ہوں اور شکر ہے پروردگار کا

○

نامہ گیا کوئی، نہ کوئی نامہ بر گیا
تیری خبر نہ آئی، زمانہ گزر گیا

ہنستا ہوں یوں کہ ہجر کی راتیں گزر گئیں
روتا ہوں یوں کہ لطفِ دعائے سحر گیا

اب مجھ کو ہے قرار تو سب کو قرار ہے
دل کیا ٹھہر گیا کہ زمانہ ٹھہر گیا

یارب! نہیں میں واقفِ روداد زندگی
اتنا ہی یاد ہے کہ جیا اور مر گیا

○

جتنے ستم کیے تھے کسی نے عتاب میں
وہ بھی ملا لیے کرمِ بے حساب میں

حسرت کو گھر کہیں نہ ملا اضطراب میں
رہنے کو آ گئی دلِ خانہ خراب میں

اٹھا ہے ابر ایسے کہ وہ دستِ دعا کے ساتھ
اتنی برس پڑے کہ نہا لوں شراب میں

آ، اے کلی فسردہ! لگا لوں تجھے گلے
تو بھی تو میری طرح کلی ہے شباب میں

ہر چیز پہ بہار، ہر اک شے پہ حسن تھا
دنیا جوان تھی مرے عہدِ شباب میں

○

دل کی بساط کیا تھی نگاہِ جمال میں
اک آئینہ تھا ٹوٹ گیا دیکھ بھال میں

صبر آ ہی جائے گر ہو بسر ایک حال میں
امکاں اک اور ظلم ہے قیدِ محال میں

آزردہ اس قدر ہوں سرابِ خیال سے
جی چاہتا ہے تم بھی نہ آؤ خیال میں

تنگ آ کے توڑتا ہوں طلسمِ خیال کو
یا مطمئن کرو کہ تمھیں ہو خیال میں

دنیا ہے خواب، حاصلِ دنیا خیال ہے
انسان خواب دیکھ رہا ہے خیال میں

بجلی گری اور آنچ نہ آئی کلیم پر
شاید ہنسی بھی آگئی ان کو جلال میں

عمرِ دو روزہ واقعی خواب و خیال تھی
کچھ خواب میں گزر گئی، باقی خیال میں

○

جنوں پہنچا بیاباں میں، بہار آئی گلستاں میں
یہ دونوں کیوں نہ آ بیٹھے مرے چاکِ گریباں میں

یہ کس کافر نے لیں انگڑائیاں صحنِ گلستاں میں
قیامت چھپتی پھرتی ہے گلوں کے چاکِ داماں میں

دلِ غمگیں! مداراتِ ستم کی بات رہ جائے
لہو کی بوند بن کر جذب ہو جا، نوکِ پیکاں میں

ذرا کھل کر پکار اے صورِ جذباتِ الفت کو
یہ دیوانے کہیں بیٹھے نہ رہ جائیں بیاباں میں

○

طولِ رہِ حیات سے گھبرا رہا ہوں میں
گھبرا رہا ہوں اور چلا جا رہا ہوں میں

چھوتی نہیں مجھے پرِ جبریل کی ہوا
یہ کن بلندیوں پہ اُڑا جا رہا ہوں میں

پھر لے رہا ہوں فطرتِ انساں کو درِ ناز
سر آستانِ حسن سے اٹھا رہا ہوں میں

کیوں میرے ترکِ بادہ پہ تجھ کو یقیں نہیں
ساقی ترے لبوں کی قسم کھا رہا ہوں میں

تحلیل ہو رہی ہے مری روح ہر نفس
تعمیرِ کائنات میں کام آ رہا ہوں میں

○

برباد حسن حسن سے مآلِ وفا نہ ہو
ایسا نہ ہو کہ حقِ محبت ادا نہ ہو

الجھا رہا ہوں زلفِ تصور میں دستِ شوق
اور اس طرح کہ پیچ ہوا آشنا نہ ہو

وہ سرخوشی کا وقت ہے جب کائنات میں
دل بولتا ہو اور کوئی بولتا نہ ہو!

آ، اور آخری نگہِ یاس دیکھ جا!
شاید پھر اس کے بعد عیادت روا نہ ہو

○

کیوں ہنسی تو اسے اجل! فانی اگر سمجھا مجھے
ایک دن سب کو فنا ہے کیا تجھے اور کیا مجھے

ہے حصولِ آرزو کا راز، ترکِ آرزو
میں نے دنیا چھوڑ دی تو مل گئی دنیا مجھے

کہہ کے سویا ہوں یہ اپنے اضطرابِ شوق سے
جب وہ آئیں قبر پر فوراً جگا دینا مجھے

صبح تک کیا کیا تری امید نے طعنے دیئے
آ گیا تھا شامِ غم اک نیند کا جھونکا مجھے

دیکھتے ہی دیکھتے دنیا سے میں اٹھ جاؤں گا
دیکھتی کی دیکھتی رہ جائے گی دنیا مجھے

○

چمک جگنو کی برقِ بے اماں معلوم ہوتی ہے
قفس میں رہ کے قدرِ آشیاں معلوم ہوتی ہے

کہانی میری رودادِ جہاں معلوم ہوتی ہے
جو سنتا ہے اسی کی داستاں معلوم ہوتی ہے

چمن کے سامنے کو مدتیں گزریں مگر اب بھی
چمکتی ہے جو بجلی آشیاں معلوم ہوتی ہے

ترقی پر ہے روز افزوں خلشِ دردِ محبت کی
جہاں محسوس ہوتی تھی وہاں معلوم ہوتی ہے

قفس کی تیلیوں میں جانے کیا ترکیب رکھی ہے
کہ ہر بجلی قریبِ آشیاں معلوم ہوتی ہے

جعفر علی خاں اثرؔ لکھنوی

○

حیا میں اک ادا نکلی، اداؤں سے حجاب آیا
شباب آیا اور اس انداز سے ان کا شباب آیا

جوانی اور آئینہ، تبسم اور انگڑائی
حیا بے اختیار آئی، اداؤں پر عتاب آیا

ہی آنکھیں کہ جن سے بادۂ گلگوں چھلکتا تھا
وہی نرگس کی کلیاں تھیں جہاں ہنگامِ خواب آیا

بگڑنا، روٹھنا، باتیں بنانا مجھ سے آتی ہیں
مگر اے دل نہ کر پائی ان کے طعنوں کا جواب آیا!

نظر اٹھی نظر کے ساتھ اک موجِ شراب اٹھی
مجسم کیفِ رنگیں بن کے وہ مستِ شباب آیا

گلوں کی گود میں جیسے نسیم آکر مچل جائے
اسی انداز سے ان پر خمار آنکھوں میں خواب آیا

صبا پھولوں کی نکہت میں لیے مستی شرابوں کی
مہکتا، مسکراتا ایک کافر کا شباب آیا

نہ مینا اور شوخی کی خطا تھی اب یہ تہمت ہے
نگاہیں اٹھ گئیں کیوں جب اُدھر وہ بے نقاب آیا

آثرؔ کو ہوش میں پاؤ تو کہہ دو کیا کہتا تھا
کہاں سے کیا ہوا، جا کر نہ وہ خانہ خراب آیا

○

مثالِ برگِ خزاں رسیدہ شباب ہے زرد آفتاب کیسا
مگر قیامت قریب آئی، کھلا ہے بندِ نقاب کیسا

دلِ ستم کش کو بجلیوں کا خزانہ جس نے بنا دیا ہے
تری نظر میں نہاں تھا ظالم یہ محشرِ اضطراب کیسا

کبھی ہے تکیہ ترے کرم پر، کبھی ہے خوفِ عتاب دل میں
یہی ہے جنت یہی ہے دوزخ، عذاب کیسا ثواب کیسا

میں ان کے جلووں کا آشنا ہوں وہ میری حیرت کا آشنا ہیں
جہاں یہ عالم ہو محویت کا، سوال کیسا جواب کیسا

بجائے صہبا دمِ کسی کی پیا ہے خونابِ دل وگرنہ
تمھاری آنکھوں سے آج ٹپکا اثرؔ یہ رنگِ شراب کیسا

○

کاہے کو ایسے ڈھیٹ تھے پہلے، جھوٹی قسم جو کھاتے تم
غیرت سے آجاتا پسینا، آنکھ نہ ہم سے ملاتے تم

حیف تمھیں فرصت ہی نہیں ہے، ورنہ کیا کیا حسرت تھی
حال ہمارا کچھ سُن لیتے، کچھ حال اپنا سناتے تم

ننگ ہے ملنا، عار تکلّم، ایک زمانہ ایسا تھا
بزم میں اپنی ہم کو بلا کر عزّت سے بٹھلاتے تم

ہم وہ نہیں یا تم وہ نہیں، تم ہنستے ہو اور ہم روتے ہیں
یا پلکی الٹی جاتی تھی، جتنا ہمیں سمجھاتے تم

وضع بھی کوئی شے ہے آخر، دل کو اثرؔ سمجھاتا تھا
در سے کسی کے اک بار اٹھ کر کاش دوبارہ نہ جاتے تم

○

صحرا سے چلے ہیں سُوئے گلشن
خونیں جگراں چاک دامن

پیغام بہار دے رہی ہے
داغوں کی جھلک دلوں کی اُلجھن

رقصاں ہے نسیم برگِ گُل پر
شبنم میں ہے گھنگروؤں کی چھن چھن

غنچوں کے بدن میں سنسنی ہے
مستی میں چھوڑا صبا نے دامن

دل کش نہ ہو کیوں کلام اثرؔ کا
سیکھا ہے یہ اس نے میرؔ سے فن

○

دل کا ہے رونا کھیل نہیں ہے، منہ کو کلیجا آنے دو
تھمتے ہی تھمتے اشک تھمیں گے، ناصح کو بک جانے دو

اڑ گئیں شرمیں مٹ گئیں قسمیں، طاقت دل جب طاق ہوئی
ضبط کی آخر حد بھی ہے کوئی، اب تو یہ پردہ اٹھانے دو

کہتے ہی کہتے حال کہیں گے، ایسی تمہیں جلدی کیا ہے
دل تو ٹھکانے ہونے دو، او، آپ میں ہم کو آنے دو

بچ کر تو چلا چھوڑ نہ جائے ایسی کوئی تدبیر کرو
زخمی تیغ ناز و ادا ہے ہاتھ نہ اس کو اٹھانے دو

بزم طرب میں دیکھ کے مجھ کو پھیر لیں آنکھیں ساقی نے
میرے لیے تھے زہر ہلاہل رس کے بھرے پیمانے دو

خود سے گریباں پھٹتے تھے اکثر، چاک ہوا میں اڑتے تھے
اب وہ جنوں کا جوش نہیں، آئی بہار تو آنے دو

یاد دل گم گشتہ میں ایں ٹھنڈی آہیں بھرتا تھا
جنس کے گاہک کہتا کیا ہے، بات ہی کیا ہے جانے دو

صورت منزل کیا نظر آئے، شعبدہ یاں رخش خودی
عقل ہے دشمن نفس ہے رہزن، ٹھوکریں کچھ دن کھانے دو

دل کو آثر کے لوٹ لیا ہے، شوخ نگہ اک کافر نے
کوئی نہ اس کو رونے سے روکو، آگ لگی ہے بجھانے دو

○

کھوئے ہوئے سے رہنا دن کو، روتے پھرنا راتوں کو
جو ہیں عاقل وہ کیا سمجھیں، عشق و جنوں کی باتوں کو

صبح کو جلوہ بر سر منبر، شب کو پیر میخانہ
اب کہیے تو بھلا کیا کہیے ایسی مقدس ذاتوں کو

وہ جو نہ آئے، یاد دل چاہے، اگرچہ بہتے کھل بھی گئے
اس کے سوا ہم ہجر کے مارے کیا جانیں برساتوں کو

بات یہ لو ہے شوق کے ہاتھوں خون دل عاشق ہو جائے
کام نہیں کچھ خونریزی سے تیرے حنائی ہاتھوں کو

شرم و حیا ہے ناز و ادا ہے، عشوہ و کرشمہ، شوخی بھی
کیا تمکیں ہے جانا کہیں ہے دل لینے کی گھاتوں کو

کیا کیا ہم پر لطف و کرم ہے، کیسی کیسی مروت
تیغ اگر سن سکتے نہیں تو کیوں چھیڑو ان باتوں کو

دید کی عشرت، محویت، بیہوشی سے خمار کی سی
شوق نے ختم ہمیں پہ کیا ہے لطف ملاقاتوں کو

عمر میں وہ لذت پائی ہم نے، ذوق طلب پہ نثار کیا
حسن قبول عطا جو ہوا بھی شب کی مناجاتوں کو

ہو نہ ہو رستے ہی میں بیتی ہوگی کرو انکار اثر
خندۂ آنکھوں کی بتلاتے ہو کہ کہہ کے فسانہ راتوں کو

○

جھپکی ذرا جو آنکھ جوانی گزر گئی — بدلی کی چھاؤں تھی اِدھر آئی اُدھر گئی
مشاطۂ بہار عجب گُل کتر گئی — منہ بند جو کلی تھی کِھلی اور سنور گئی
پیشِ جمالِ یار کرن آفتاب کی — شرما کے چاہتی تھی کہ پلٹے بکھر گئی
مل کر بھبھوت چہرے پہ تاروں کی چھاؤں کا — دھونی رمائے در پہ یہ کس کے سحر گئی
کیا جانے آنکھ مار کے کیا کہہ گئی شفق — پھولوں کی گود موجِ نسیم آ کے بھر گئی
سینے میں اور تاب وہ شیشے کہ ٹوٹتے — سجدہ عبث اگر نہ تجلی نکھر گئی
تیری ہی جلوہ زار ہے دنیائے رنگ و بو — اے وائے وہ نظر جو حجابات پر گئی
اب ہاتھ ملتے ہیں کہ دمِ عرضِ ماجرا — کہنے کی بات دھیان سے کیسی اتر گئی

کچھ دن کی اور کشمکشِ زیست ہے اثرؔ
اچھی بُری گزرنی تھی جیسی گزر گئی

○

کمر ہر قدم پر لچکتی رہی
یہ بجلی سوئے دل لپکتی رہی

ادب لاکھ تھا پھر بھی اس کی طرف
نظر میری اکثر بھٹکتی رہی

اگر ہونٹ سی بھی لیے کیا ہوا
نگاہوں سے الفت ٹپکتی رہی

غبارِ دلِ مضطرب چھٹ گیا
صبا اپنا دامن جھٹکتی رہی

نہ کھلنے پہ بھی میرے دل کی کلی
گُلِ تر کی صورت مہکتی رہی

دلِ زار کی آہ بھی زار تھی
اگر آئی لب پر سسکتی رہی

اثرؔ کی سی شیوا بیانی کہاں
بہت یوں تو بلبل چہکتی رہی

○

نشیمن تو گلوں سے چھا گئے
ور کچھ بجلی کی زد میں آ گئے

ر جھکا کر کچھ کہا، شرما گئے
ر ہی کو آتے تھے تڑپا گئے

رم ٹھہرا ہے وفا کا ذکر بھی
ہم سزا اپنے کیے کی پا گئے

منزلِ عشق اب نگاہوں سے پرے
پاؤں تو اس راہ میں تھرا گئے

آنے والے آ، کہاں تک انتظار
چاند ڈوبا، تارے بھی کجلا گئے

بجلیوں میں بجلیاں حل ہو گئیں
ناگہاں وہ دل جہاں ٹکرا گئے

سعیِ ضبطِ اشک کے باوصف اثر
چند افسانے مژہ تک آ گئے

○

دلہن بنی ہوئی اب کی چمن میں آئی ہے — بہار ہو کے تری انجمن میں آئی ہے
شمیمِ دوست لیے پیرہن میں آئی ہے — نسیم ہوش اڑاتی چمن میں آئی ہے
ظہورِ عشق حقیقت طراز تھا ورنہ — یہ دل کشی کہیں دار و رسن میں آئی ہے
بسائی جاتی ہے اس میں قمیص یوسف کی — ہوا جو مصر سے بیت الحزن میں آئی ہے
وہ بوئے خوں ہے کہ گھٹتا ہے دم معاذ اللہ — بہار وادیٔ زخمِ کہن میں آئی ہے
یہ کس کی خاک ہے جو حسرتِ نشیمن میں — صبا کے دوش پہ کھچ کر چمن میں آئی ہے
نسیمِ صبح کے جھونکے و نکہت پھولوں کی — نفس نفس میں نئی روح تن میں آئی ہے
بقدرِ ذوق نہیں جوئے شیر بھی افزا — بجائے تیشہ سر کوہکن میں آئی ہے

گماں ہوتا ہے اُف ری کلام کی گرمی
زبانِ شعلہ اثر کے دہن میں آئی ہے

اساتذۂ غزل

(۲)

سراج دکنی

○

لیا ہے نقدِ جانِ بلبلاں، یعنی خراج اپنا
چلایا خسروِ گل نے اسی رنگوں رواج اپنا

اسے غم! اے صبح تنے کی خبر ہے سرو قامت کی
قیامت کل تو آتی ہے، عمل کر لے تو آج اپنا

لگا کر راکھ جوگن ہوئی قمری باغ کو تج کر
مگر کوئی سرو قد کے واسطے چھوڑے ہے راج اپنا

تھا غم زہر تھا، پہ نوشدارو جان کر کھایا
کیا ہے اپنے ہاتھوں دل ہمارے نے علاج اپنا

وہ ظالم ہم کو جلتا دیکھ کر اتنا بھی نہیں کہتا
کہ کیا ثابت قدم ہے، کشتہ ہوا آخر سراج اپنا

○

خبرِ تحیرِ عشق سن نہ جنوں رہا، نہ پری رہی،
نہ تو تو رہا، نہ تو میں رہا، جو رہی سو بے خبری رہی

شہِ بے خودی نے عطا کیا، مجھے اب لباسِ برہنگی
نہ خرد کی بخیہ گری رہی، نہ جنوں کی جامہ دری رہی

چلی سمتِ غیب سے اک ہوا کہ چمن سرور کا جل گیا
مگر ایک شاخِ نہالِ غم جسے دل کہیں سو ہری رہی

نظرِ تغافلِ یار کا گلہ کس زباں سے کروں بیاں
کہ شرابِ حسرت و آرزو، خمِ دل میں تھی، سو بھری رہی

وہ عجب گھڑی تھی کہ جس گھڑی لیا درس نسخۂ عشق کا
کہ کتاب عقل کی طاق پر جو دھری تھی سو وہ دھری رہی

ترے جوشِ حیرتِ حسن کا اثر اس قدر سے یہاں ہوا
کہ نہ آئینے میں جلا رہی، نہ پری میں جلوہ گری رہی

کیا خاک آتشِ عشق نے دلِ بے نوائے سراج کو
نہ خطر رہا، نہ حذر رہا، جو رہی سو بے خطری رہی

شاہ مبارک آبرو

○

جان! اگر دشمن ہوئے ہو تم ہمارے اس قدر
تو ہمارے دل کو کیوں لگتے ہو پیارے اس قدر

گاہ گاہے پیار کی انکھوں سے کرتا ہے نگاہ
مہرباں ہوتا چلا ہے اب تو بارے اس قدر

دیکھنے کو دوڑتے ہیں لوگ جو پہنچا سحر
آہ سے دل کے نکلتے ہیں شرارے اس قدر

عاجزوں کو بے گنہ آزار دینا خوب نہیں
ڈر خدا سے! آبرو کو مت ستا رے اس قدر

○

دیکھو تو جان! تم کو مناتا ہوں کب ستی
بولو خدا کے واسطے! ٹک لال لب ستی

یہ جانیو ہر ایک سے لالچ نہیں ہے خوب
ہے بھیک مانگ کھانا بھلا اس کسب ستی

پانی میں ڈوب آگ میں جل کر مرو، پن ایک
عاشق نہ ہو، پکار کے کہتا ہوں سب ستی

باندھا ہے برگ تاک کا کیوں سر پہ سہرا
کیا آبرو کا بیاہ ہے بنت العنب ستی

شاہ حاتمؔ

○

عاشق کا جہاں میں گھر نہ دیکھا
ایسا کوئی در بدر نہ دیکھا

جیسا کہ اُڑے ہے طائرِ دل
ایسا کوئی تیز پر نہ دیکھا

خوباں جہاں ہوں جس سے تسخیر
ایسا کوئی ہم ہنر نہ دیکھا

اس تیغ نگہ سے ہو مقابل
ایسا کوئی بے جگر نہ دیکھا

جو آب ہے آبرو میں حاتمؔ!
ایسا کوئی ہم گہر نہ دیکھا

○

تمہارے عشق میں ہم ننگ و نام بھول گئے
جہاں کے کام تھے جتنے، تمام بھول گئے

گئے تھے زعم میں اپنے، پہ اس کو دیکھتے ہی
جو دل نے ہم سے کہے تھے پیام، بھول گئے

تری طرف ہوئی صورت گرانِ چیں کی نگاہ
قلم کو ہاتھ سے رکھ، اپنا کام بھول گئے

تری یہ زلف گرہ گیر دیکھ کر صیاد
شکار آپ ہوئے، صید و دام بھول گئے

بڑا غضب ہے کہ حاتمؔ کو تم نہ پہچانا
وہی قدیم تمہارا غلام بھول گئے

اشرف علی خان فغاںؔ

○

کہتے ہیں، فصلِ گل تو چمن سے گزر گئی
اے عندلیب! تو نہ قفس بیچ مر گئی

فلک تو کیوں کرے ہے مرے اشکِ سرخ کا
تیری کب آستیں مرے لوہو سے بھر گئی

تنہا اگر میں یار کو پاؤں، تو یوں کہوں
انصاف تو نہ چھوڑ، مروّت اگر گئی

مجھ سے جو پوچھتے ہو، تو ہر حال شکر ہے
یوں بھی گزر گئی مری، ووں بھی گزر گئی

آخر فغاںؔ وہی ہے اسے کیوں بھلا دیا
وہ کیا ہوئے تپاک، وہ الفت کدھر گئی!

○

ظالم! تجھے قسم ہے، جو اس کو جلا نہ دے
یہ دل بھی دل نہ ہووے، جو تجھ کو دعا نہ دے

قاتل کے کیوں قدم سے تڑپ کر پڑا ہے دور
بسمل! تو اپنے ہاتھ سے شرطِ وفا نہ دے

بے طرح جوشِ گل نے چمن میں لگائی آگ
ڈرتا ہوں آشیانے کو کافر جلا نہ دے

تیرے ہی دل سے پوچھئے اس غم کو ہاں فغاںؔ
الفت بری بلا ہے، کسی کو خدا نہ دے

میرزا مظہر جان جاناں

○

ہم نے کی ہے توبہ اور دھومیں مچاتی ہے بہار
ہائے! بس چلتا نہیں، کیا مفت جاتی ہے بہار

لالہ و گل نے ہماری خاک پر ڈالا ہے شور
کیا قیامت ہے موؤں کو بھی ستاتی ہے بہار

نرگس و گل کی کھلی جاتی ہیں کلیاں دیکھو سب
پھر انہیں خوابیدہ فتنوں کو جگاتی ہے بہار

ہم گرفتاروں کو اب کیا کام ہے گلشن میں لیک
جی نکل جاتا ہے جب سنتے ہیں، آتی ہے بہار

شاخِ گل ہلتی نہیں یہ بلبلوں کو باغ میں
ہاتھ اپنے کے اشارے سے بلاتی ہے بہار

○

یہ دل کب عشق کے قابل رہا ہے
کہاں اس کو دماغ و دل رہا ہے

نہ تو ملنے کے اب قابل رہا ہے
نہ مجھ کو وہ دماغ و دل رہا ہے

نہیں آتا کسی تکیہ اُپر خواب
یہ سر پاؤں سے تیرے ہِل رہا ہے

خدا کے واسطے! اس کو نہ ٹوکو
یہی اک شہر میں قاتل رہا ہے

میر سوز

○

یہ تیرا عشق کب کا آشنا تھا
کہاں کا جان کو میری دھرا تھا

وہ ساعت کون سی تھی یا الٰہی!
کہ جس ساعت دوچار اس سے ہوا تھا

میں کاش اُس وقت آنکھیں موند لیتا
کہ میرا دیکھنا، مجھ پر بلا تھا

میں اپنے ہاتھ اپنے دل کو کھویا
خداوندا! میں کیوں عاشق ہوا تھا

ولے کیا آن تھی، اللہ اللہ!
کہ جس مرنے سے چھاتی پر چڑھا تھا

وہ بہر کو ذبح کرتا تھا چھری سے
میں اس کی تیز دستی کہہ رہا تھا

نہ تھا اس وقت جز اللہ کوئی
ولے یہ سوز پہلو میں کھڑا تھا

○

مری جان جاتی ہے، یارو! سنبھالو!
کلیجے میں کانٹا چبھا ہے، نکالو

نہ جاؤں مجھے زندگانی نہ بھائی
مجھے مار ڈالو، مجھے مار ڈالو

خدا کے لئے بارے میرے ہم نشینو!
یہ آتا جو جاتا ہے اُس کو بلا لو

اگر وہ نہ آوے تمہارے کہے سے
تو منت کرو، گھیرے گھیرے بلا لو!

اگرچہ خفا ہو کے وُہ گالیاں دے
تو دم کھا رہو، کچھ نہ بولو نہ چالو

کہو: ایک بندہ تمہارا مرے ہے
اسے جاں کنی سے تو جا کر بچا لو!

جلوں کی بُری آہ ہوتی ہے پیارے
تم اس سوز کی اپنے حق میں دُعا لو

قائم چاندپوری

ہو گر ایسے ہی مری شکل سے بیزار بہت
تم سلامت رہو! بندہ کے خریدار بہت

ہم کو جب خفگی آئی، تو جھگڑا کیا ہے
تم کو خواہندہ بہت ہم کو طرحدار بہت

نہ کہو قتل پہ کس کے یہ کمر باندھی ہے
ان دنوں ہاتھ میں تم کھینچتے ہو تلوار بہت

قائم آتا ہے مجھے رحم جوانی پہ تری
مر چکے ہیں اسی آزار کے بیمار بہت

رکھتا ہے جو تو صفائے عارض
موتی نے کہاں یہ پائے عارض

اک صافیٔ تن ہے گل میں بھی لیک
ایسا وہ کہاں سے لائے عارض

اس سینے سے منہ رگڑ نہ اے داغ
اس کی تھی کبھو یہ جائے عارض

بیانے میں مہر و ماہ دو تجے
تیرا ہو جہاں بہائے عارض

کس سے کہوں اس کے منہ کا نقشہ
اے وائے جبین و ہائے عارض

کیا دور، جو حشر ہووے قائم
کمہلائے جو وہ دکھائے عارض

انعام اللہ خاں یقینؔ

○

سر پہ ظلمت سے آستانِ یار بہتر تھا
ہمیں ظلِّ ہُما سے سایۂ دیوار بہتر تھا

بے زنجیر کرنا کیا مناسب تھا بہاراں میں
کہ گُل ہاتھوں میں یا پاؤں میں سیہ خار بہتر تھا

ہوس نے ہر سے کچھ دل میں یہ دعوے کے بہت دیکھے
ہلاکِ عشق ہیں اس کے کوئی آزار بہتر تھا

مرا دل مر گیا جس دن سے نظّارہ سے باز آیا
یقیںؔ پرہیز اگر کرتا، تو وہ بیمار بہتر تھا

○

اگرچہ عشق میں آفت ہے اور بلا بھی ہے
نرا بُرا نہیں یہ شغل، کچھ بھلا بھی ہے

اس اشک و آہ سے سودا بگڑ نہ جائے کہیں
یہ دل کچھ آب رسیدہ ہے کچھ جلا بھی ہے

یہ آرزو ہے کہ اس بے وفا سے یہ پُوچھوں
کہ میرے بے مزہ رکھنے میں کچھ مزا بھی ہے

یہ کون ڈھب ہے جن خاک میں ملانے کا
کسو کا دل کبھو پاؤں تلے ملا بھی ہے

یقیںؔ کا شورِ جنوں سُن کے یار نے پوچھا
کوئی قبیلۂ مجنوں میں کیا رہا بھی ہے

خواجہ احسن اللہ بیاںؔ

○

مَیں ترے ڈر سے رو نہیں سکتا
گردِ غم دل سے دھو نہیں سکتا

شب ہوا شورِ گریہ سُن کے کہا
اس کے ہاتھوں میں سو نہیں سکتا

مصلحت ترکِ عشق ہے ناصح
لیک یہ ہم سے ہو نہیں سکتا

جوں مسلسل بیاںؔ کہے ہے سخن
کوئی موتی پرو نہیں سکتا!

○

جو ہوتا ہے ریحان و سُنبل کے صدقے
نہ ہوں کیونکہ اس زلف و کاکل کے صدقے

خزاں میں بھی چھوڑا نہ طوفِ چمن کو
غرض ہو جیے عشقِ بلبل کے صدقے

جلو میں پھرے ہیں پری زاد لڑکے
دِوانے ترے اس تجمّل کے صدقے

ابھی وعدہ کر کر، لگا سوچنے تُو
نہیں یاد گویا، تامّل کے صدقے

بیاںؔ کون ہے؟ اب تلک پُوچھتے ہو
تغافل کے قرباں، تجاہل کے صدقے

ہدایت خان ہدایتؔ

○

پہنچے ہے فصلِ گُل کوئی حسنِ نگار کو
مکھڑے پہ اس کے صدقے کیا نوبہار کو

کس دل جلے کی آگ لے گزری چمن میں آج
دیکھا عرق فشاں میں نسیمِ بہار کو

لازم ہے دستگیریِ افتادگاں نسیم!
لے پہنچ اس گلی کے تئیں مجھ غبار کو

نالے سے میرے اور ثواب چاہتا ہے کیا
پانی تو کر دیا ہے دلِ کوہسار کو

اللہ رے کارخانۂ تقدیرِ ذوالجلال
یہ اعتبار، ہستیِ بے اعتبار کو

○

رہا مرتے مرتے مجھے غم اسی کا
نہیں بعد میرے کوئی بے کسی کا

کیا تیغِ قاتل نے جب کام اپنا
میں مُنہ دیکھتا رہ گیا بے بسی کا

عبث ہے غرض ان بتاں سے بھی ملنا
نہیں آج دنیا میں کوئی کسی کا

کیا حُسن سے اُس نے آگاہ اُس کو
الٰہی! ہو خانہ خراب آرسی کا

ہدایتؔ کہا ریختہ جب سے ہم نے
رواج اٹھ گیا ہندستانی کا

میر محمدی بیدار

○

ہم پہ سو ظلم و ستم کیجیے گا
ایک ملنے کو نہ کم کیجیے گا

گر یہی زلف و یہی مکھڑا ہے
غارتِ دیر و حرم کیجیے گا

جی میں ہے آج بجائے مکتوب
یہی بیت اس کو رقم کیجیے گا

مہربانی سے پھر اے بندہ نواز
کیجے! بس روز کرم کیجیے گا

○

تیری ہم خاطرِ نازک سے حذر کرتے ہیں
ورنہ یہ نالے تو پتھر میں اثر کرتے ہیں

دل و دیں تھا سو لیا، اَور بھی کچھ مطلب ہے
بار بار آپ جو ادھر کو نظر کرتے ہیں

کیا ہو گر ایک گھڑی یاں بھی کرم فرماؤ
آپ اس راہ سے آخر تو گزر کرتے ہیں

تیرے ایامِ فراق، اے صنمِ مہر گسل
آہ! مت پوچھ کہ کس طرح بسر کرتے ہیں

دن کو پھرتے ہیں تجھے ڈھونڈتے اور رات تمام
شمع کی طرح سے رو رو کے سحر کرتے ہیں

یہ وہی فتنہ و آشوبِ جہاں ہے بیدار
دیکھ کر پیر و جواں جس کو حذر کرتے ہیں

بس نہیں خوب کہ ایسے کو دل اپنا دیجے
آ گئے تو جان میاں! ہم تو خبر کرتے ہیں

میر عبدالحی تاباںؔ

○

رہتا ہے خاک و خوں میں سدا لوٹتا ہوا
میرے غریب دل کو الٰہی! یہ کیا ہوا

مَیں اپنے دل کو غنچۂ تصویر کی طرح
یارب! کبھی خوشی سے نہ دیکھا کھلا ہوا

تو دیکھ مجھ کو نزع میں مت کہہ کہ تیرے سوا
مجھ سے بہت ہیں، ایک نہ ہوگا، تو کیا ہوا

ہر دم کروں نہ کیونکہ گریباں کو اپنے چاک
آتا ہے یاد یار کا جامہ چپا ہوا

تاباںؔ کے دیکھنے سے بُرا مانتے تھے تم
کھو دی بہار خط نے تمہاری، بھلا ہوا

○

آئی بہار شورشِ طفلاں کو کیا ہوا
اہلِ جنوں کدھر گئے، یاراں کو کیا ہوا

غنچے لہو میں تر نظر آتے ہیں تہ بہ تہ
اس شکلِ گل کو دیکھ، گلستاں کو کیا ہوا

اس جامہ زیب غنچہ دہن کو چمن میں دیکھ
حیراں ہوں مَیں کہ گل کے گریباں کو کیا ہوا

آنے سے تیرے خط کے یہ کیوں ہے گرفتہ دل
بتلا کہ تیری زلفِ پریشاں کو کیا ہوا

گھٹتے ہی تیرے غم میں گزرتی ہے اس کی عمر
پوچھا کبھی نہ تو نے کہ تاباںؔ کو کیا ہوا

میر اثرؔ

○

ہم ہیں بے دل، دل اپنے پاس نہیں
آہ! اس کا بھی تجھ کو پاس نہیں

بے وفا کچھ نہیں تری تقصیر
مجھ کو میری وفا ہی راس نہیں

قتل میرا ہے، تیری بدنامی
جان کا ورنہ کچھ ہراس نہیں

تُو ہی بہتر ہے ہم سے آئینے
ہم تو اتنے بھی رُوشناس نہیں

یوں خدا کی خدائی برحق ہے
پر اثرؔ کی ہمیں تو آس نہیں

○

دل میں ہے پھر تجھے از سرِ نو یاد کریں
تُو سُنے یا نہ سُنے، نالہ و فریاد کریں

ان بُتوں کی ہے بڑی دوڑ یہی دل شکنی
یہ کہاں، جو یہ کسی دل کے تئیں شاد کریں

ہم اسیروں کی اسے چاہیے خاطرداری
اور الٹی نہ کہ ہم خاطرِ صیاد کریں

آپ کے دل سے بھلا ٹک تو نکل جائے غبار
اور بھی جی میں جو کچھ ہو سو ارشاد کریں

جعفر علی حسرت

○

خدا حافظ ہے کیوں محفل میں اس کا نام آیا تھا
تڑپنے سے ابھی دل کو مرے آرام آیا تھا

فلک اک دم بھی تُو نے وصل کی شب کو نہ ٹھہرایا
یہ ساری عُمر میں تجھ تک ہمارا کام آیا تھا

بہاریں بھول گئیں، پہ یاد ہے اتنا کہ گلشن میں
گریباں چاک کرنے کا بھی اک ہنگام آیا تھا

نہیں معلوم کیا تھا، جو سحر تک شمع رو یا کی
کہ اپنا حال پروانہ سنانے شام آیا تھا

ہوا لبریز جام زندگی جس وقت اے حسرت
دریغ! اس وقت میں ساقی پلانے جام آیا تھا

○

کس کا ہے جگر، جس پہ یہ بیداد کرو گے
لو دل تمہیں ہم دیتے ہیں، کیا یاد کرو گے

دل لینے کو آزردوں سے بھی کہہ دیکھو بھلا تم
لا دیں گے بجا ہم تو، جو ارشاد کرو گے

بے خوابی و حیرانی و طغیانیٔ گریہ
سب آنکھوں پہ ہم لیں گے جو امداد کرو گے

تاراج کیا صبر و دل و جان، پھر آگئے
کیا خاک ہے گھر میں جسے برباد کرو گے

کہہ دیجو صبا تک تو جوانانِ چمن سے
فرصت ہے کسی دل کو اگر شاد کرو گے

ہاں کریں پتھر کو بھی حسرت کی یہ آہیں
دل اپنا بتاں تک تئیں فولاد کرو گے

سعادت یار خاں رنگین

○

دل تھا جو بساط اپنی، سو گذران چکے ہیں
جی نذر کریں، جی میں یہ اب ٹھان چکے ہیں

مت چُوک! ادھر دیکھ! یہ ہے مفت کا سودا
اک بوسہ پہ دین و دل و ایمان چکے ہیں

سو بار کہا آؤں گا، اور آئے نہ ہرگز
بدعہد ہو تم، ہم تمہیں پہچان چکے ہیں

پھر چل! نہیں کچھ فائدہ، بس سمنے دے رنگیں
دو منہ پہ دوپٹے کے تئیں تان چکے ہیں

○

تجھ سے جس وقت کہ خالی یہ مکاں رہتا ہے
مجھ کو تنہائی میں پہروں خفقاں رہتا ہے

شکوہ ہم کرتے ہیں کیوں رسم ہے دُنیا کی یہی
دل جو لگتا ہے، تو پھر پاس کہاں رہتا ہے

جو ترے پاس سے آتا ہے، میں پوچھوں ہوں یہی
کیوں جی! کچھ ذکر ہمارا بھی وہاں رہتا ہے

پنکھڑی گل کی جو کروٹ تلے اس کے آئے
نازک اتنا ہے بدن اس کا، نشاں رہتا ہے

ق

اس ستمگر سے ہمارے جو کسی نے پوچھا
کوئی رنگیں بھی ترے کوچہ میں یاں رہتا ہے

تو کچھ اک ناز سا کر، چین جبیں ہو کے وہیں
گالی دے کر یہ کہا اس نے کہاں رہتا ہے

شاہ نصیرؔ

○

کب دل نہیں پھولوں سے ہمارا ہمہ تن چشم
نظارۂ ساقی کو ہے مینا ہمہ تن چشم

تو وُہ چمن آرا ہے کہ ہر دستۂ نرگس
دیکھے ہے ترا بن کے تماشا ہمہ تن چشم

بُرقع کو اُلٹ مُنہ سے جو کرتا ہے تو باتیں
اب میں ہمہ تن گوش بنوں یا ہمہ تن چشم

کیا خاک ہو صیاد مجھے چشمِ رہائی
حلقوں سے بنا دام ہے تیرا ہمہ تن چشم

آنکھوں کے تصور میں نصیرؔ اس کی شب و روز
دل صورتِ آئینہ ہے اپنا ہمہ تن چشم

○

قدم نہ رکھ مرے چشم پُر آب کے گھر میں
بھرا ہے موج کا طوفاں حباب کے گھر میں

کہے ہے دیکھ کے وُہ عکس رُخ بہ ساغرِ مے
نزولِ ماہ ہُوا آفتاب کے گھر میں

مدام رند کریں کیوں نہ آستاں بوسی
حرم ہے شیخ مشیخت مآب کے گھر میں

ہمارے دل میں کہاں آبلے ہیں اے ساقی
چُنے ہوئے ہیں یہ شیشے شراب کے گھر میں

دلا نہ کیونکہ کروں اختلاط کی باتیں!
حجاب کیا ہے اب اس بے حجاب کے گھر میں

نصیرؔ دیکھ! تو کیا جلوۂ خدائی ہے
ہمارے اس بُتِ خانہ خراب کے گھر میں

میر نظام الدین ممنون

○

بندہ ہوں حسن صورت و عشقِ مجاز کا
ہر آئینہ میں جلوہ ہے اُس جلوہ ساز کا

اے آہ بے ادب! نہ اسے پھونکیو کہ ہے
دل جلوہ گاہ، پردہ نشینانِ راز کا

ہے آستانِ دیر پہ اپنی نشست و خاست
کب ہو حرم میں ہم کو ارادہ نماز کا

یاں جان تک بھی دے چکے پروا ہی اں نہیں
جھگڑا چکے گا کیوں کہ یہ ناز و نیاز کا

ممنوں دلِ ستم زدہ ہے عشق کا حریف
یاں ہے وہ چار صوبے بال، باز کا

○

ہم سے کتنے بے دلوں کی کب ہے منزل تک پہنچ
یار گو دل میں ہے، پر ہم کو کہاں دل تک پہنچ

کشتیِ طاقت شکستہ اور بحرِ غم کا جوش
مژدہ نومیدی نہیں اب اپنی ساحل تک پہنچ

دشتِ تنہائی میں صحرا گرد ہے، جُوں گرد باد
مشتِ خاک قیس کی مشکل ہے محمل تک پہنچ

صید گاہِ شوق میں کیا بے ادب وُہ صید ہے
جو کہ جاتا ہے تڑپ کر پائے قاتل تک پہنچ

کرامت علی شہیدی

ہزار مرتبہ دیکھا ستم جُدائی کا
ہنوز حوصلہ باقی ہے آشنائی کا

پری اُٹھی مرے پہلو سے بارہا ناکام
فریفتہ ہوں تری طرزِ دل رُبائی کا

مجھے عذاب جہنم کہ بُت پرستوں میں
وہ بت بہشت میں دعویٰ جسے خدائی کا

فضائے باغ سے ہے گوشۂ قفس خوشتر
گر اپنے دل میں نہ ہو دغدغہ رہائی کا

ادب نہ وادیٔ وحشت کے مجھ سے ترک ہوئے
جنوں میں ہوش رہا ہے برہنہ پائی کا

نگاہ، خندہ، تغافل، عتاب، کہنہ ہوئے
نکال طرز نیا کوئی دل رُبائی کا

بُتوں کا سجدہ مری سرنوشت میں کب تھا
کہ عزم کعبے کے در پہ ہو جبہ سائی کا

اچک رہا ہے کھڑا بامِ عرش پہ کم بخت
قلق ہے مجھ کو شہیدیؔ کی نارسائی کا

جی چاہے گا جس کو، اُسے چاہا نہ کریں گے
ہم عشق و ہوس کو کبھی یکجا نہ کریں گے

اے کاش! حسیں عہد شکن بن کے جہاں میں
باز آئے! وفاداری کا دعویٰ نہ کریں گے

گر حُسن پرستی نہ ہو خاطر سے فراموش
خوش قامتوں کا یاد سراپا نہ کریں گے

نرگس کی شبِ تیرہ میں کاٹیں گے بہاریں
پر سُرمگیں آنکھوں کی تمنا نہ کریں گے

بہلائیں گے سیرِ گُل و شبنم سے دل اپنا
اس عارضِ گُل رنگ کی پروا نہ کریں گے

انگاروں پہ لوٹیں گے، پر ان شعلہ رُخوں کے
نظارے سے ہم آنکھ بھی سینکا نہ کریں گے

عصمت کا نہیں خوف سے، تقویٰ کا یہیں پاس
نے کی ہے کبھی خواہشِ بے جا، نہ کریں گے

بکنے کے شہیدیؔ کے بُرا مانیو مت جان!
ہیں عاشقِ صادق کبھی ایسا نہ کریں گے

وزیر لکھنوی

○

چلا ہے او دلِ راحت طلب! کیا شادماں ہو کر
زمینِ کوئے جاناں رنج دے گی آسماں ہو کر

اسی باعث تو قتلِ عاشقاں کو منع کرتے تھے
اکیلے پھر رہے ہو، یوسفِ بے کارواں ہو کر

کیا قتل اس نے غیروں کو موئے ہم رشک کے مارے
اجل بھی دوستو! آئی نصیبِ دشمناں ہو کر!

بناوٹ نے بگاڑا، باتیں سنوائیں خموشی نے
نہ پوچھو، ہم نے کیا ہی منہ کی کھائی بے زباں ہو کر

وہ پیاسا ہوں، لگا کر تیغ پر آب اس نے جب کھینچی
نکل آئی دہانِ زخم سے سوکھی زباں ہو کر

ادا سے جھک کے ملتے ہو، جگر سے قتل کرتے ہو
ستم ایجاد ہو، ناوک لگاتے ہو، کماں ہو کر

○

سر مرا کاٹ کے پچھتائیے گا
جھوٹی پھر کس کی قسم کھائیے گا

کیا گریباں نے گلا گھونٹا ہے
ادھر اے دستِ جنوں آئیے گا

آپ کہتے ہیں کہ جا، جاتا ہوں
پر اکیلے بھی تو گھبرائیے گا

تھام لوں دل کو ذرا ہاتھوں سے
ابھی پہلو سے نہ اٹھ جائیے گا

کہیے! یارانِ عدم، کیا گذری
کچھ لبِ گور سے فرمائیے گا

مردمِ چشم سے گر آئے حجاب
آنکھ کے پردے میں چھپ جائیے گا

ہم بھی آ نکلیں گے مسجد میں وزیر
نشۂ غم لے کے جو بہلائیے گا

صبا لکھنوی

○

واعظ کے ہیں ضرور، ڈرانے سے ڈر گیا
جام شراب لانے بھی ساقی کدھر گیا

بلبل کہاں، بہار کہاں، باغباں کہاں
وہ دن گزر گئے، وہ زمانہ گذر گیا

ایسی ہوا چلی مری آہوں کی رات کو
سب آسماں پہ خرمن انجم بکھر گیا

اچھا ہوا جو ہو گئے وحدت پرست ہم
فتنہ گیا، فساد گیا، شور و شر گیا

کعبے کی سمت سجدہ کیا دل کو چھوڑ کر
تو کس طرف تھا دھیان ہمارا کدھر گیا

پھر سیرِ لالہ زار کو ہم اے صبا چلے
آئی بہار، داغ جنوں پھر ابھر گیا

○

تری طرف سے دلِ لے جانِ جاں اُٹھا نہ سکے
بہت ضعیف تھے بارِ گراں اُٹھا نہ سکے

ہزار بار بہار آئی، لیکن اے صیاد
نگاہ ہم طرفِ بوستاں اُٹھا نہ سکے

اسیرِ زلف جو مرتے ہیں تو وہ کہتے ہیں
ذرا بھی صدمۂ قیدِ گراں اُٹھا نہ سکے

سنیں جو یار کی باتیں غش آگیا ہم کو
یہ ناتواں تھے کہ لطفِ بیاں اُٹھا نہ سکے

دیا شنکر نسیم

○

جب ہو چکی شراب، تو میں مست مر گیا
شیشے کے خالی ہوتے ہی پیمانہ بھر گیا

نے قاصدِ خیال نہ پیکِ نظر گیا
ان تک میں اپنی آپ ہی لے کر خبر گیا

سمجھا ہے حق کو اپنے ہی جانب ہر ایک شخص
یہ چاند اس کے ساتھ چلا، جو جدھر گیا!!

طوفانِ نوح اس میں ہو یا شورِ حشر ہو
ہونا جو کچھ ہے ہوگا، جو گزرا، گزر گیا

میں نے بھی آنکھیں دیکھی ہیں پریوں کی جادو بھی
تم نے دکھائی آنکھ مجھے، اور میں ڈر گیا!

گزرا جہاں سے میں تو کہا سن کے یار نے
فتنہ گیا، فساد گیا، دردِ سر گیا!

کاغذ سیاہ کرتے ہو کس کے لیے نسیم
آیا جوابِ خط تمہیں اور نامہ بر گیا

○

خم نہ بن کر خود غرض ہو جائیے
مثلِ ساغر اور کے کام آئیے

ابرِ رحمت سنتے ہیں نام آپ کا
خاکساروں پہ کرم فرمائیے!

آپ آہو چشم ہیں، آہو نہیں!
ہم سے وحشت کی نہ لیجے، آئیے!

صبر رخصت ہو تو جانے دیجیے
بے قراری آئے، تو ٹھہرائیے

جوہرِ تیغِ نگہ کھل جائے گا!
منہ نہ میرے زخم کا کھلوائیے

دل میں ہے دکھلائیے تاثیرِ عشق
ٹھنڈی سانسوں سے انہیں گرمائیے

سرد آہیں بھرتے ہیں جب ہم نسیم
کہتے ہیں وہ! ٹھنڈے ٹھنڈے جائیے

رندؔ لکھنوی

○

رکھو خدمت میں مجھ سے کام تو لو
بات کرتے نہیں سلام تو لو

بات تم نے نہیں کی غیر سے کل
سہ پہ اللہ کا کلام تو لو!

ناز و انداز و حسن و خوبی میں
کون ہے تم سا، اس کا نام تو لو

رندؔ حاضر ہیں شیشہ و ساغر
مے نہ سمجھو اگر حرام، تو لو!

○

بچھڑے کے دل، جان کھونا پڑا ہے
غرض ہاتھ دونوں سے دھونا پڑا ہے

جو رونا یہی ہے، تو پھوٹیں گی آنکھیں
مجھے اب تو آنکھوں کا رونا پڑا ہے

کیے سینکڑوں گھر محبت نے غارت
نئو جس محلے میں، رونا پڑا ہے

میں پاتا نہیں دل کو سینے میں اپنے
کئی دن سے خالی یہ کونا پڑا ہے

کرو چل کے آباد اب گور اے رندؔ!
بہت دن سے سونا وہ کونا پڑا ہے

فصلِ گل آئی ہے کل اور ہی ساماں ہوں گے
بیرے ۱ مکو میں تیرے دست و گریباں ہوں گے

سب یہ کافر ہیں، حسینوں کی نہ سُن تو اے دل!
چار دن بعد یہی دشمنِ ایماں ہوں گے

کس طرح جائیں گے مانع ہے ہمیں خوفِ مزاج
زلف پر خم ہے، تو کچھ وہ بھی پریشاں ہوں گے

گریۂ انجامِ تبسم ہے، نہ ہنس اے غافل!
خون روئیں گے وُہی زخم جو خنداں ہوں گے

یاد آئے گا پسِ مرگ ہمارا یہ کمال
حال کُھل جائے گا، جب خاک میں پنہاں ہوں گے

خانہ زادوں کو کہاں قیدِ محبت سے فراغ
ہم وہ بُلبل ہیں یہیں خاکِ گلستاں ہوں گے

دورِ ہر نخل کریں گے صفتِ گرد نسیم
ہم پسِ مرگ بھی [illegible] گلستاں ہوں گے

نسیم دہلوی

(نواب اصغر علی خان)

دیکھ او قاتل! بسر کرتے ہیں کس مُشکل سے ہم
چارہ گر سے دردِ نالاں، درد سے دل، دل سے ہم

ہائے کیا بے خود کیا ہے غفلتِ امید نے
اہلِ دل کہتے ہیں اپنا پھر اسی قاتل سے ہم

رشکِ اعدا نے کئے روشن بدن میں استخواں
شمعِ محفل ہو کے اُٹھے آپ کی محفل سے ہم

اس کو کہتے ہیں وفاداری کہ بعد از قتل بھی
داغِ خوں ہو کر نہ چھوٹے دامنِ قاتل سے ہم

چشمِ روشن سے نظر آتے ہیں جلوے رُوح کے
حسنِ لیلےٰ دیکھتے ہیں پردۂ محمل سے ہم

خالی از احساں نہیں یہ بھی کہ وقتِ اضطراب
خوش تو ہو جاتے ہیں تیرے وعدۂ باطل سے ہم

آؤ آپس میں سمجھ لیں غیر کا ہے کو سُنے
تم کہو دل سے ہمارے کچھ تُمہارے دل سے ہم

سُن کے رو دیتے ہیں اکثر صُورتِ زخمِ جگر
آپ شرماتے ہیں اپنے خندۂ باطل سے ہم

رشک ہے حسرت پہ اس کی دل میں آتا ہے یہی
اپنے قالب کو بدل لیں قالبِ بسمل سے ہم

سینہ و دل میں ہجومِ داغِ حسرت ہے نسیم
پھول چن لیتے ہیں اپنے گلشنِ حاصل سے ہم

ظہیر دہلوی

○

ساقیا! مر کے اٹھیں گے ترے مے خانے سے
عہد و پیماں ہیں یہی زیست میں پیمانے سے!

تو کہاں آئی مرا درد بٹانے کے لئے
اے شبِ ہجر! نکل جا مرے غم خانے سے

کون ہوتا ہے مصیبت میں کسی کا دلسوز
اٹھ گئی شمع بھی جل کر مرے کاشانے سے

پھر یہی کوہ کن و قیس پہ گذری ہوگی!
ملتی جلتی ہے کہانی مرے افسانے سے

جبہ فرسائے درِ کعبہ تھے کل تک تو ظہیر
گرتے پڑتے ہوئے آج آتے ہیں میخانے سے

○

وہ نیرنگِ الفت کو کیا جانتا ہے
کہ اپنے سے مجھ کو جدا جانتا ہے

بھلا ایسی تو دشمن میں خوبی نہیں ہے
مگر تو خدا جانے کیا جانتا ہے

یہ منہ سے تو کہتا ہوں چھوڑی محبت
مگر حال دل کا خدا جانتا ہے

تمہاری شرارت کو کیا جانے کوئی
یہ میں جانوں یا دل مرا جانتا ہے

ظہیر اپنے عیبوں کو میں جانتا ہوں
زمانہ مجھے پارسا جانتا ہے

سالکؔ دہلوی

○

مجھ ناتواں پہ حشر میں وہمِ فغاں غلط
میں گفتگو کی تاب رکھوں، یہ گماں غلط

تم بھی وہی کہو، تو کہیں سب بجا۔ درست
میں بھی وہی کہوں تو کہے اک جہاں غلط

گرمی سے اُس کے غم کی، جس کا جگر جلا
تشبیہِ مہر دُروئے نکوئے بُتاں غلط

کہئے ! اسیرِ خواہشِ سنبل کوئی ہُوا
دینی مثالِ کاکلِ عنبر فشاں غلط

سچ ہے کہ آدمی کو غرض آدمی سے ہے
واعظ ! بیانِ دلکشِ حورِ جناں غلط

کہہ کر تمام سالکِ غمگیں کا ماجرا
میں نے کہا غلط ہے، تو بولے کہ ہاں غلط

○

کچھ تغیّر مرے احوالِ پریشاں میں نہیں
ایسے عالم میں ہوں جو عالمِ امکاں میں نہیں

صبحِ محشر بھی دکھائی نہیں دیتی یا ربّ
روزِ بہ بھی تو نصیبِ شبِ ہجراں میں نہیں

وحشتِ عشق کو ثابت قدمی بھی ہے ضرور
قیس کا نقشِ قدم تک تو بیاباں میں نہیں!

ہو گیا ذوق فزائے خلشِ یاد، مژہ!
کون کہتا ہے کہ لذّت تہِ پیکاں میں نہیں

دشتِ وحشت میں اُڑے پھرتے ہیں آرام سے ہم
جو صفت ضعف میں ہے تختِ سلیماں میں نہیں

میر مہدی مجروح

○

غیروں کو بھلا سمجھے اور مجھ کو برا جانا
سمجھے بھی تو کیا سمجھے، جانا بھی تو کیا جانا

اک عمر کے دکھ پائے، سوتے ہیں فراغت سے
اے غلغلۂ محشر! ہم کو نہ جگا جانا

کیا یار کی بدخوئی، کیا غیر کی بدخواہی
سرمایۂ صد آفت ہے دل ہی کا آ جانا

کچھ عرضِ تمنا میں شکوہ نہ ستم کا تھا
میں نے تو کہا کیا تھا اور آپ نے کیا جانا

چلمن کا الٹ جانا، ظاہر کا بہانہ ہے
ان کو تو بہر صورت اک جلوہ دکھا جانا

ہے حق بطرف اس کے، چاہے سو ستم کر لے
اس نے دلِ عاشق کو مجبورِ وفا جانا

انجام ہوا اپنا آغازِ محبت میں
اس شغل کو جاں فرسا ایسا تو نہ تھا جانا

مجروح ہوئے مائل کس آفتِ دوراں پر
اے حضرتِ من تم نے دل بھی نہ لگا جانا

○

گریباں چاک ہیں گل بوستاں میں
اثر کتنا ہے بلبل کی فغاں میں

قفس صیاد کا خالی پڑا ہے
نہ ہوں بے چین کیونکر آشیاں میں

دعائے وصل جا اب تو اثر تک
کئے نالوں نے روزن آسماں میں

سنے گر طالعِ خفتہ کا قصہ
تو نیند آجائے چشمِ پاسباں میں

زلیخا کی بھی جاتی ہیں آنکھیں
کہیں یوسف نہ ہو اس کارواں میں

تمام اسبابِ دنیاوی کے بدلے
ہے اک بے رونقی اپنی دکاں میں

سنا حالِ دلِ مجروح شب کو
کوئی حسرت سی حسرت تھی بیاں میں

جلال لکھنوی

وہ دل نصیب ہوا جس کو داغ بھی نہ ملا
ملا وہ غم کدہ، جس میں چراغ بھی نہ ملا

گئی تھی کہہ کے میں لاتی ہوں زلفِ یار کی بُو
پھری تو بادِ صبا کا دماغ بھی نہ ملا

اسیر کر کے ہمیں، کیوں رہا کیا صیاد
وہ ہم صفیر بھی چھوٹے، وُہ باغ بھی نہ ملا

بتوں کے عشق میں کیا ہوتی ہم سے یادِ خدا
کہ دل بھی تھا نہ ٹھکانے، فراغ بھی نہ ملا

دکھائیں یار کو کیا جسمِ داغدار کی سیر
نظر فریب ہمیں ایک داغ بھی نہ ملا

بھر آئے محفلِ ساقی میں کیوں نہ آنکھ اپنی
وہ بے نصیب ہیں خالی ایاغ بھی نہ ملا

چراغ لے کے ارادہ تھا بخت کو ڈھونڈیں
شبِ فراق تھی، کوئی چراغ بھی نہ ملا

خبر کو یار کی بھیجا تھا، گم ہوئے ایسے
حواسِ رفتہ کا اب تک سراغ بھی نہ ملا

جلال باغِ جہاں میں وہ عندلیب ہیں ہم
چمن کو پھول ملے، ہم کو داغ بھی نہ ملا

نہ ٹھہری جب کوئی تسکینِ دل کی شکل یاروں میں
تو آ نکلے تڑپ کر ہم تمہارے بے قراروں میں

کسی کے عشق میں دردِ جگر سے دل یہ کہتا ہے
ادھر بھی آ نکلنا ہم بھی ہیں امیدواروں میں

وہ ماتم بزمِ شادی ہے، تمہاری جس میں شرکت ہو
وہ مرنا، زندگی ہے، تم جہاں ہو سوگواروں میں

تعلّی سے یہ نفرت ہے کہ بعدِ مرگ خاک اپنی
اگر اُٹھتی بھی ہے جا بیٹھتی ہے خاکساروں میں

ہمارے دل نے ہم سے بے وفائی کر کے کیا پایا؟
وہاں بھی جا کے ٹھہرایا گیا بے اعتباروں میں

وہ کھینچوں گا جلال آہیں کہ اس کی خاک اُڑا دیں گی
فلک نے پیس ڈالا ہے سمجھ کر خاکساروں میں

تسلیم لکھنوی

○

وصل کی شب بھی ادائے رسمِ حرماں میں رہا
صبح تک بین التماسِ شوقِ پنہاں میں رہا

مر گئے لاکھوں شہیدِ ناز، کچھ پروا نہیں
وہ تماشائے ہلالِ عیدِ قرباں میں رہا

کام اپنا کر چکی بیماریِ عشقِ بتاں
میں فریبِ نسخہ و تاثیرِ درماں میں رہا

واہ رے پاسِ وفا! اللہ ری شرمِ آرزو
ہر نفس ہمراہیِ عمرِ گریزاں میں رہا

کیا پڑھے اشعار تسلیمِ جگر افگار نے
شورِ تحسیں ہر طرف بزمِ سخنداں میں رہا

○

کل مرا تھا، آج وہ بُت غیر کا ہونے لگا
وائے قسمت دو ہی دن میں کیا سے کیا ہونے لگا

یاد میری آ گئی، منہ پھیر کر رونے لگے
انجمن میں اُن کی جب ذکرِ وفا ہونے لگا

ہائے کب اُس نے نکالے اپنے پیکاں کھینچ کر
درد کی لذت سے جب دل آشنا ہونے لگا

آہ نے آخر تو کی تاثیر پیدا، شکر ہے
بام پر آنے لگے وہ، سامنا ہونے لگا

بام پر جب تک وہ مہرِ حُسن ہے سرگرمِ سیر
بھیڑ کیوں چھٹنے لگی، کیوں راستا ہونے لگا

خوب رویا بیٹھ کر واماندگی کی جان کو
جب مری نظروں سے پنہاں قافلہ ہونے لگا

یہ بھی اے تسلیم ہے برگشتہ بختی کا اثر
جب دوا کی ہم نے دردِ دل سوا ہونے لگا

مرزا قادر بخش صابرؔ

○

جو دل کو محبت کے مزے آئے ہوئے ہیں
وہ اپنی طبیعت پہ ابھی چھائے ہوئے ہیں!

ہر بات پہ اظہارِ نزاکت ہے، حیا سے!
ثابت ہے کہ تکلیف بھی کچھ پائے ہوئے ہیں

کچھ تم نے ہمیں دل میں سمجھ رکھا ہے سمجھو!
کچھ ہم بھی تمہیں ذہن میں ٹھہرائے ہوئے ہیں

پھر ملنے کو جی چاہتا ہے یار کا ہم سے
ناچار ہیں غصے میں قسم کھائے ہوئے ہیں!

اللہ ری ضد کوٹھے کے چڑھنے کو کیا ترک!
جس روز سے ہم یار کے ہمسائے ہوئے ہیں

اب دل کو لگاتے ہیں ذرا سوچ سمجھ کر
دو چار جگہ پہلے جو زک پائے ہوئے ہیں

کچھ در پہ جھکائے ہوئے سر بیٹھے ہیں صابرؔ
اس بزم سے شاید کہ نکلوائے ہوئے ہیں!

○

پہلے نہ اڑایا کسی نے کس کے جگر کو
پر ہم نے لگائے ہیں ترے تیرِ نظر کو

ہے تیرِ نگہ بزمِ عدو میں مری جانب
غصے میں چھپایا ہے محبت کی نظر کو

کیوں آتشِ گل باغ میں ہے تیز کہ ہم آپ
اٹھ جائیں گے اے شبنمِ شاداب! سحر کو

دن رات کا فرق ان کی محبت میں ہے جب تو
بعدہ تو کیا شام کا اور تڑکے سحر کو

دل چیز ہے کیا جان بھی دوں عشق میں صابرؔ
میں نفع سمجھتا ہوں مدام اسے ضرر کو

نظامؔ رامپوری

○

انگڑائی بھی وہ لینے نہ پائے اُٹھا کے ہاتھ
دیکھا جو مجھ کو، چھوڑ دیے مُسکرا کے ہا

بے ساختہ نگاہیں جو آپس میں مل گئیں
کیا منہ پہ اُس نے رکھ لئے آنکھیں چُرا کے

یہ بھی نیا ستم ہے حنا تو لگائیں غیر
اور اس کی داد چاہیں وہ مجھ کو دکھا کے

بے اختیار ہو کے جو میں پاؤں پر گرا
ٹھوڑی کے نیچے اُس نے دھرا مسکرا کے

قاصد! ترے بیاں سے دل ایسا ٹھہر گیا
گویا کسی نے رکھ دیا سینے پہ آ کے

دیکھا جو کچھ رُکا مجھے، تو کس تپاک سے
گردن میں میری ڈال دئے آپ آ کے

کوچے سے تیرے اٹھیں تو پھر جائیں ہم کہاں
بیٹھے ہیں یاں تو دونوں جہاں سے اُٹھا کے

دینا وہ اس کا ساغرِ مے یاد ہے نظامؔ!
مُنہ پھیر کر اُدھر کو، اِدھر کو بڑھا کے ا

○

کہتے ہو اعتبار میرا — معلوم ہے تم کو پیار میرا
ر ہے آج، کچھ تو کہئے! — کیوں ذکر ہے بار بار میرا
بات میں فیصلہ ہے تم سے — رنجیدہ ہے دل ہزار میرا
نہیں اعتبار مجھ کو! — تو بھی نہ کر اعتبار میرا
کہ نہ ہو تم اپنے بس میں — دل پر تو ہے اختیار میرا
و نہ ہو رشک غیر ممکن — تو اور ہو دوستدار میرا
بھے ہوئے ہیں اپنے دل میں — سنتے نہیں حال زار میرا
ئے بگڑ کے اس کا جانا — رونا وہیں زار زار میرا

کل تک تو نظامؔ یہ نہ تھا حال
دل آج ہے بے قرار میرا

بیانؔ یزدانی

○

جھونکے آتے ہیں بوئے اُلفت کے
پھول یارب ہیں کس کی تربت کے

شور ہے دل میں غم کے نالوں کا
علم اُٹھتے ہیں آج حسرت کے

تیری باتوں میں کیا حلاوت تھی
کہ نہ لب کھل سکے شکایت کے!

ہم پہ اور تیغِ ناز اُٹھ نہ سکے
جو چلے ہیں تری نزاکت کے

اے بیاںؔ! قیس و وامق و فرہاد
ہیں یہ سارے مُرید حضرت کے

○

ترا کُشتہ اُٹھایا اس بہانے
چلے محشر کو مٹّی میں دبانے

نفس گم اور سخن باقی رہے گا
نہ ہوگا تار اور ہونگے ترانے

خدا ٹھنڈا رکھے اے شمع تجھ کو
کھڑی روتی ہے بیکس کے سرہانے

تھے چھپنے سے سینے میں ہیں کے
اُٹھا اک درد محشر کے بہانے

ہمیں نے پنجۂ دستِ جنوں سے
کئے ہیں کوہ کی چوٹی میں شانے

حفیظ جونپوری

○

دل اس لئے ہے دوست کہ دل میں ہے جائے دوست
جب یہ نہ ہو بغل میں ہے دشمن بجائے دوست

مٹنے کی آرزو ہے اسی راہگذار میں
اتنے مٹے کہ لوگ کہیں خاک پائے دوست

تقریر کا ہے خاص ادائے بیاں میں لطف
سنئے مری زبان سے کچھ ماجرائے دوست

سب کچھ ہے اور کچھ نہیں عالم کی کائنات
دنیا برائے دوست ہے عقبیٰ برائے دوست

○

بیٹھ جاتا ہوں جہاں چھاؤں گھنی ہوتی ہے
ہائے کیا چیز غریب الوطنی ہوتی ہے

نہیں مرتے ہیں تو ایذا نہیں جھیلی جاتی
اور مرتے ہیں تو پیماں شکنی ہوتی ہے

دن کو اک نور برستا ہے مری تربت پر
رات کو چادر مہتاب تنی ہوتی ہے

لٹ گیا وہ ترے کوچے میں رکھا جس نے قدم
اس طرح کی بھی کہیں راہزنی ہوتی ہے

ہجر میں زہر ہے ساغر کا لگانا منہ سے
مے کی جو بوند ہے ہیرے کی کنی ہوتی ہے

میکشوں کو نہ کبھی فکر کم و بیش ہوئی
ایسے لوگوں کی طبیعت بھی غنی ہوتی ہے

ہوک اٹھتی ہے اگر ضبط فغاں کرتا ہوں
سانس رکتی ہے تو برچھی کی انی ہوتی ہے

پی لو دو گھونٹ کہ ساقی کی رہے بات حفیظ
صاف انکار میں خاطر شکنی ہوتی ہے

بیخود بدایونی

○

دردِ دل میں کمی نہ ہو جائے
دوستی ، دشمنی نہ ہو جائے

تم مری دوستی کا دم نہ بھرو
آسماں مدعی نہ ہو جائے

بیٹھتا ہے ہمیشہ رندوں میں
کہیں زاہد ولی نہ ہو جائے

طالع بد وہاں بھی ساتھ نہ دے
موت بھی زندگی نہ ہو جائے

اپنی خوئے وفا سے ڈرتا ہوں
عاشقی بندگی نہ ہو جائے

کہیں بیخود تمہاری خودداری
دشمنِ بے خودی نہ ہو جائے

○

ساتھ ساتھ اہلِ تمنا کا وہ مضطر جانا
اللہ اللہ ترا بزم سے اٹھ کر جانا

رہبری کرکے مری خضر بھی چکر میں پڑے
اب انہیں جلوہ گہ یار میں اکثر جانا

داغِ کم حوصلگی دل کو گوارا نہ ہوا
ورنہ کچھ ہجر میں دشوار نہ تھا مر جانا

سادگی سے یہ گماں ہے کہ بس اب رحم کیا
مطمئن ہوں کہ مجھے آپ نے مضطر جانا

نشہ میں بھی تھے بیخود کی تعلی نہ گئی
بادۂ ہوش رُبا کو مئے کوثر جانا

برج نرائن چکبست

○

فنا کا ہوش آنا، زندگی کا دردِ سر جانا
اجل کیا ہے خمارِ بادۂ ہستی اتر جانا

مقامِ کوچ کیا ہے منزلِ مقصود تک پہنچے
قیامت تھا سرائے دہر میں دو دن ٹھہر جانا

بسے سودا رہا واعظ تجھے نارِ جہنم کا
مزا سوزِ محبت کا بھی کچھ اے بے خبر جانا

مصیبت میں بشر کے جوہرِ مردانہ کھلتے ہیں
مبارک بزدلوں کو گردشِ قسمت سے ڈر جانا

سدھاری منزلِ ہستی سے کس بے اعتنائی سے
تنِ خاکی کو شاید روح نے گردِ سفر جانا

○

دردِ دل، پاسِ وفا، جذبۂ ایماں ہونا — آدمیت ہے یہی اور یہی ا
زندگی کیا ہے عناصر میں ظہورِ ترتیب — موت کیا ہے انہی اجزا ک
ہم کو منظور ہے اے سعدیٔ وسعت لیکن — ایک غنچہ میں تماشائے
جس طرح غم سے کسی جام کا ٹکڑا ہونا — یونہی گردوں سے مرو
سر میں سودا نہ رہا پاؤں میں بیڑی نہ رہی — میری تقدیر میں تھا بے سر
صنعِ دہر میں جوہرِ قدرت سمجھو — پھول کا خاک کے تودے
ہو بیاضِ سحر نور پہ دل کیا مائل — یاد ہے دفترِ انجم کا پر
کل بھی وہ کل جب ہے زمانے قیامت کا — اور پھر اس کے لئے آ
ہوں نہ بیکسی کے عشاق میں سے جوشِ جنوں — ہے مگر شرط ترا سلسلہ
گل کو پامال نہ کر لعل و گہر کے مالک — ہے اسے طرۂ دستارِ کر

ہے مرا ضبطِ جنوں جوشِ جنوں سے بڑھکر
ننگ ہے میرے لئے چاک گریباں ہونا

علی حیدر نظمؔ طباطبائی

○

کسی سے بسکہ امیدِ کشودِ کار نہیں
مجھے اجل کے بھی آنے کا اعتبار نہیں

جواب نامہ کا، قاصد مزار پر لایا
کہ جانتا تھا اسے تابِ انتظار نہیں

یہ کہہ کے اُٹھ گئی بالیں سے میری شمعِ سحر
تمام ہو گئی شب اور تجھے قرار نہیں

جو تُو ہو پاس تو حُور و قصور سب کچھ ہو
جو تُو نہیں، تو نہیں، بلکہ زینہار نہیں

خزاں کے آنے سے پہلے ہی تھا مجھے معلوم
کہ رنگ و بوئے چمن کا کچھ اعتبار نہیں

غزل کہی ہے کہ موتی پروئے ہیں اے نظمؔ
وہ کون شعر ہے جو دُرِ شاہوار نہیں

○

یہ آہِ بے اثر کیا ہو، یہ نخلِ بے ثمر کیا ہو
نہ ہو جب درد ہی یارب! تو دل کیا ہو، جگر کیا ہو

بغل گیر آرزو سے ہیں مرادیں، آرزو مجھ سے
یہاں اس وقت تو اک عید ہے، تم جلوہ گر کیا ہو

مقدر میں یہ لکھا ہے، کٹے گی عمر مر مر کر
ابھی سے مر گئے ہم، دیکھئے اب عُمر بھر کیا ہو

مروت سے ہو بیگانہ، وفا سے دُور ہو کوسوں
یہ سچ ہے، نازنیں ہو، خوبصورت ہو، مگر کیا ہو

لگا کر زخم میں ٹانکے قضا تیری نہ آجائے
جو وہ سفاک سن پائے بتا اے چارہ گر! کیا ہو؟

قیامت کے بکھیڑے پڑ گئے آتے ہی دُنیا میں
یہ مانا ہم نے مر جانا تو ممکن ہے مگر کیا ہو

کہا میں نے کہ نظمؔ مبتلا مرتا ہے حسرت میں
کہا اس نے اگر مر جائے تو میرا ضرر کیا ہو

برج نرائن چکبست

○

…لس آنا، زندگی کا دردِ سر جانا
…بے خمارِ بادۂ ہستی اُتر جانا

…ا کیا ہے منزلِ مقصود تک پہنچے
…تھا سرالے دہر میں دو دن ٹھہرنا

…ڈرا رہا واعظ تجھے نارِ جہنم کا
…محبت کا بھی کچھ اسے بے خبر جانا

…میں بشر کے جوہرِ مردانہ کھلتے ہیں
…بندوں کو گردشِ قسمت سے ڈر جانا

…ی منزلِ ہستی سے کس بے اعتنائی سے
…کہ شاید رُوح نے گردِ سفر جانا

○

دردِ دل، پاسِ وفا، جذبۂ ایماں ہونا
…آدمیت ہے یہی اور یہی انساں ہونا

زندگی کیا ہے عناصر میں ظہورِ ترتیب
…موت کیا ہے انہی اجزا کا پریشاں ہونا

ہم کو منظور ہے اے دیدۂ وحدت گلچیں
…ایک غنچہ میں تماشائے گلستاں ہونا

جس طرح غم سے کسی جام کا ٹکڑا ہونا
…یونہی گردوں سے مرے دل کا…

سر میں سودا نہ رہا پاؤں میں بیڑی نہ رہی
…میری تقدیر میں تھا بے سر و ساماں…

صنعتِ دہر میں ہر رنگ قدرت سمجھو
…پھول کا خاک کے تودے سے نمایاں…

ہو بیانِ سحرِ نور پہ دل کیا مائل
…یاد ہے دفترِ انجم کا پریشاں…

کل بھی وہ کل جو ہے فردائے قیامت مشہور
…اور پھر اس کے لئے آج پریشاں…

ہوں نہ بیچے مشتاق میں نے جوشِ جنوں
…ہے گرفتہ ترا سلسلۂ جنباں…

ٹوٹ کر پامال نہ کر سن وگھر کے مالک
…ہے اسے طرۂ دستارِ غریباں…

ہے مرا ضبطِ جنوں جوشِ جنوں سے بڑھ کر
ننگ ہے میرے لئے چاک گریباں ہونا

علی حیدر نظمؔ طباطبائی

○

کسی سے بیکسِ امیدِ کشودِ کار نہیں
مجھے اجل کے بھی آنے کا اعتبار نہیں

جواب نامہ کا، قاصد مزار پر لایا
کہ جانتا تھا اسے تابِ انتظار نہیں

یہ کہہ کے اُٹھ گئی بالیں سے میری شمعِ سحر
تمام ہو گئی شب اور تجھے قرار نہیں

جو تُو ہو پاس تو حُور و قصور سب کچھ ہو
جو تُو نہیں، تو نہیں، بلکہ زینہار نہیں

خزاں کے آنے سے پہلے ہی تھا مجھے معلوم
کہ رنگ و بُوئے چمن کا کچھ اعتبار نہیں

غزل کہی ہے کہ موتی پروئے ہیں اے نظمؔ
وہ کون شعر ہے، جو دُرِّ شاہوار نہیں

○

یہ آہِ بے اثر کیا ہو، یہ نخلِ بے ثمر کیا ہو
نہ ہو جب درد ہی یارب! تو دل کیا ہو، جگر کیا ہو

بغل گیر آرزو سے ہیں مرادیں، آرزو مجھ سے
یہاں اس وقت تو اک عید ہے، تم جلوہ گر کیا ہو

مقدر میں یہ لکھا ہے، کٹے گی عمر مر مر کر
ابھی سے مر گئے ہم، دیکھئے اب عمر بھر کیا ہو

مروت سے ہو بیگانہ، وفا سے دُور ہو کوسوں
یہ سچ ہے، نازنیں ہو، خوبصورت ہو، مگر کیا ہو

لگا کر زخم میں ٹانکے قضا تیری نہ آ جائے
جو وہ سفاک سن پائے بتا اے چارہ گر! کیا ہو؟

قیامت کے بکھیڑے پڑ گئے آتے ہی دُنیا میں
یہ مانا ہم نے مرجانا تو ممکن ہے مگر کیا ہو

کہا میں نے کہ نظمؔ مُبتلا مرتا ہے حسرت میں
کہا اس نے اگر مر جائے تو میرا ضرر کیا ہو

وحید الدین سلیم

○

گریباں سے ترے کس نے نکالا صبحِ خنداں کو
کیا کس نے نمایاں دامن کی کلیوں سے گلستاں کو

اُڑایا چھینٹوں میں میرے قطرے نے بیاباں کو
مرے قطرے نے پانی کر دیا ہر بحرِ طوفاں کو

مری کشتی بھنور سے کھیلنے کا شوق رکھتی ہے
یہ کس نے کر دیا خاموش یا رب بحرِ طوفاں کو

یہ کیا نغمہ تھا چھیڑا جو کہ اک مطربِ شب نے
ربابی لے نے رقصاں کر دیا سلکِ گہر کو

میں وہ ہوں قطرۂ شبنم کہ چمکا تیرے پرتو سے
ملی ہیں کھینچ کر کرنیں مری مہرِ درخشاں کو

مرے ذوقِ فنا پر زندگی ہے خضر کی قرباں
مرے خمخانۂ غم میں ڈبو دو آبِ حیواں کو

سلیم طورِ معنی ہوں یہ بجتا ہے میرا دل
منور کر دیا جس نے مرے چاکِ گریباں کو

○

مست ہوئی ہے صبح حسیناں کیے ہوئے
نورِ سحر سے دل کو چراغاں کئے

موسم ہوا ہے وصفِ بہارِ جمال سے
روئے ورق کو رشکِ گلستاں

برسوں ہوئے ہیں تذکرۂ سوزِ عشق سے
بزمِ سخنوری کو درخشاں کئے

آتا ہے کس شکوہ سے وہ رشکِ آفتاب
فلک کدے سے جلوں کے چراغاں کئے

جاتا ہوں کوئے یار کو دیکھے لے گا مجھے
برپا ہجومِ اشک سے طوفاں کئے

بیٹھے ہیں ہم تصورِ گیسوئے یار میں
اس زندگی کو خوابِ پریشاں

خوں کر کے لے چلا ہوں دل و جاں کو اپنے ساتھ
دیدارِ روئے یار کا ساماں کئے

مرتے ہیں اس ادا پہ کہ کچھ لوگ جل بجھے
سینے میں سوزِ عشق کو پنہاں کئے

وہ نوبہارِ حسن ابھی اس راہ سے گیا
ہر نقشِ پا کو روضۂ رضواں کئے ہوئے

شوکت

سید کاظم علی شوکت بلگرامی

○

شب میں رویا ہوں وہ روٹھے ہیں یا الفت میرے ساتھ
مدتوں برسا کیا ہے، ابرِ رحمت میرے ساتھ

جان جلائے یار ہے دل کو رہے گا پاسِ عشق
قبر میں جائیں گے تیرے رازِ الفت میرے ساتھ

اس کی ہے ترغیب نالے کی کہ ہو آزردہ دوست
دشمنی کرتی ہے اب میری محبت میرے ساتھ

تو ہوں دلدادۂ الفت کہو میں کیا کروں
دلربا ہو کر کرو تم جب یہ الفت میرے ساتھ

شکل تیری سامنے آنکھوں کے ہے آٹھوں پہر
یاد تیری ہے شریکِ رنج و راحت میرے ساتھ

ن گیا ہے تابِ دل اک محشرستانِ خیال
خواب میں جب وہ ہوئے سرگرمِ الفت میرے ساتھ

یاد ب بھولے سے بھی صبحِ وطن آتی نہیں
ہو گئی مانوس ایسی شامِ غربت میرے ساتھ

دھڑکن، لب پہ نالے، چشمِ تر میں اشکِ خوں
کیا کہوں، کیا کر گئی تیری محبت میرے ساتھ

یاد آتا ہے یہ رفتارِ ستمگر کو دیکھ کر
سیر کرتا تھا وہ یوں ہی ماہ طلعت میرے ساتھ

شب ہے اور تیری نظر میں اک قیامت کا غرور
میں ہوں اور اک محشرِ ارمان و حسرت میرے ساتھ

رخصت کر کے بعد کو گھر میں جا بیٹھے مگر
یاد ان کی دور تک آئی تھی شوکت میرے ساتھ

○

لکھا ہے گو تری قسمت میں شوکت چشمِ تر رکھنا
مگر ظالم! کسی کی آبرو پر بھی نظر رکھنا

نہ بھولے گا نہ بھولے گا، قیامت تک نہ بھولے گا
کسی کا وہ محبت سے مرے سینہ پہ سر رکھنا

نہ اٹھے گا دلِ نازک سے صدمہ رنج و ذلت کا
الٰہی میرے دردِ دل سے ان کو بے خبر رکھنا

وہ کیا جانے بھلا ہوتی ہیں کیسی عیش کی راتیں
میسر ہو نہ جس کو تا سحر تکیہ پہ سر رکھنا

دلِ بے آرزو کافی ہے ہم حسرت نصیبوں کو
مبارک ہو صدف کو اپنی مٹھی میں گہر رکھنا

نہ ہو کس طرح شہرہ دلبری دنیا میں دلداری
جہاں میں گھر بنانا سہل ہے مشکل ہے گھر رکھنا

محشر

مرزا کاظم حسین لکھنوی

ذہنیں ہو گئی ہیں چپ رہتے
کوئی سُنتا تو ہم بھی کچھ کہتے

جل گیا خشک ہو کے دامنِ دل
اشک آنکھوں سے اور کیا بہتے

بات کی اور مُنہ کو آیا جگر
اس سے بہتر یہی تھا چپ رہتے

ہم کو جلدی سنے موت کی مارا
اور جیتے، تو اور غم سہتے

سب ہی سنتے تمہاری اے محشر
کوئی کہنے کی بات اگر کہتے

دیر تک اُٹھ نہ سکا واں سے وہ دیوانۂ دوست
چھڑ گیا جب کہ کہیں بیٹھ کے افسانۂ دوست

آج اُٹھے جاتے ہیں درباں کی بجائے بیکسو
زندگی بھر کہیں چھُٹتا ہے درِ خانۂ دوست

ہجر میں حالتِ دل کی ہیں وہ آنکھیں نگراں
دیکھی تھی جن سے کبھی رونقِ کاشانۂ دوست

راہ بر شوقِ دلی، سر پہ اجل، دل بے تاب
بے خبر یوں میں چلا ہوں طرفِ خانۂ دوست

آج کیوں حد سے سوا دل کو خوشی ہے محشر
کیا بُلائے ہوئے جاتے ہو سوئے خانۂ دوست

مضطر خیرآبادی

دمِ خواب راحت بلایا انھوں نے تو دردِ نہاں کی کہانی کہوں گا
یہ حال لکھنے کے قابل نہیں ہے اگر مل گئے تو زبانی کہوں گا

لبِ جوئے الفت یہ آئی ہے دعوت، یہاں قصۂ سخت جانی کہوں گا
ادھر آ ادھر زوجِ شیریں ادھر آ، تجھے کوہ کن کی کہانی کہوں گا

خضر! تیرے چشمہ کا پانی ہے اچھا، مگر میں اسے مرگِ فانی کہوں گا
محبت کا مارا ہوا دل جلا دے، میں تب تیرے پانی کو پانی کہوں گا

تری ذاتِ واحد ہے بیدارِ مطلق، تجھے تو کبھی نیند آتی نہیں ہے
تری آنکھ لگنے کی حسرت میں یارب! کہاں تک میں قصے کہانی کہوں گا

وہ اک آئنہ جس میں منہ دیکھتے ہیں کسی ایک کا وقفِ صورت نہیں ہے
یہیں سے تو جھگڑا اٹھا کر دوئی کا، میں وحدت کو کثرت کا بانی کہوں گا

یہ ہستی کا شیشہ جو تو نے دیا ہے ذرا اس پہ چاہت کی صیقل تو کر دے
یہ ہو جائے پھر اپنی ہستی کو میں بھی، تری ذات کا نقشِ ثانی کہوں گا

ازل ہی میں تجھ پہ نظر پڑ چکی ہے، نہ کر مجھ سے انکارِ جلوہ نمائی
تجلی تری گو نئی روشنی ہے مگر میں تو اس کو پرانی کہوں گا

محبت میں انکارِ جلوہ نمائی، ذرا اس طریقے کو تو یاد رکھنا
اگر میں کبھی تیرے سجدے پہ پہنچا، تو میں بھی یونہی لن ترانی کہوں گا

سنا کیا ہے وفا جوں جو حشر میں مضطرؔ خدا سے کروں شکوۂ قتلِ پنہاں

غرورِ الفت کی طرزِ نازش عجب کرشمے دکھا رہی ہے
ہماری روٹھی ہوئی نظر کو تری تجلی منا رہی ہے

وہ طور والی تری تجلی، غضب کی گرمی دکھا رہی ہے
وہاں تو پتھر جلا دئے تھے یہاں کلیجہ جلا رہی ہے

مرے نشیمن میں شانِ قدرت کے سارے اسباب ہیں مہیا
ہوا صفائی پہ ہے مقرر، چراغ بجلی جلا رہی ہے

نہ اس کے دامن سے میں ہی الجھا، نہ میرے دامن سے یہ ہی الجھی
ہوا سے میرا بگاڑ کیا ہے جو شمعِ تربت بجھا رہی ہے

فرشتے آئے اگر لحد میں، تو صاف کہہ دوں گا راستہ لو!
جب اسکی چاہت میں جان دے دی تو بات کہنے کو کیا رہی ہے

جمالِ قدرت مجھی کو دے دے کہ میں کلیجے کی چوٹ سیکوں
کلیم کے گھر میں رکھے رکھے وہ آگ اب کیا بنا رہی ہے

شبلی نعمانی

○

تیس دن کیلئے ترکِ مے و ساقی کرلوں
واعظِ سادہ کو روزوں میں تو راضی کرلوں

پھینک دینے کی کوئی چیز نہیں فضل و کمال
ورنہ حاسد! تری خاطر سے میں یہ بھی کرلوں

اے نکیرین! قیامت ہی پہ رکھو پرسش
میں ذرا عمرِ گذشتہ کی تلافی کرلوں

کچھ تو ہو چارۂ غم، بات تو یک سو ہو جائے
تم خفا ہو تو اجل ہی کو میں راضی کرلوں

اور پھر کس کو پسند آئے گا ویرانۂ دل
غم سے مانا بھی کہ اس گھر کو میں خالی کرلوں

دل ہی ملتا نہیں سفلی سے، وگرنہ شبلی
خوب گذرے فلکِ دوں سے جو یاری کرلوں

○

یار کو رغبتِ اغیار نہ ہونے پائے
گلِ تر کو ہوسِ خار نہ ہونے پائے

اس میں در پردہ سمجھتے ہیں وہ اپنا ہی گلہ
شکوۂ چرخ بھی زنہار نہ ہونے پائے

فتنۂ حشر جو آنا، تو دبے پاؤں ذرا
بختِ خفتہ مرا بیدار نہ ہونے پائے

ہائے دل کھول کے کچھ کہہ نہ سکے سوزِ دروں
آبلے ہم سخنِ خار نہ ہونے پائے

باغ کی سیر کو جاتے تو ہو، پر یاد رہے
سبزہ بیگانہ ہے، دوچار نہ ہونے پائے

جمع کر لیجئے غمزوں کو مگر خوبیِ بزم
بس وہیں تک ہے کہ بازار نہ ہونے پائے

آپ جاتے تو ہیں اس بزم میں لیکن شبلی
حالِ دل دیکھیے اظہار نہ ہونے پائے!

حسن بریلوی

○

حُسن جب مقتل کی جانب تیغِ بُرّاں لے چلا
عشق اپنے مجرموں کو پا بجولاں لے چلا

خونِ ناحق کی حیا بولی، ذرا منہ ڈھانک لے
ناز جب ان کو سرِ خاکِ شہیداں لے چلا

خاکِ عاشق روکنے کو دُور تک لپٹی گئی
جب سمندِ ناز کو وہ گرم جولاں لے چلا

جب چلی مقتل سے قاتل کی سواری رات کو
آگے آگے مشعلیں خونِ شہیداں لے چلا

آرزوئے دیدِ جاناں بزم میں لائی مجھے
بزم سے میں آرزوئے دیدِ جاناں لے چلا

ڈھونڈتی تھی ہر طرف کس کو نگاہِ واپسیں
آہ کس کی دید کی بیمارِ ہجراں لے چلا

نازِ آزادی حسنؔ وجہِ اسیری ہو گیا!
سرکشاں دل کو خیالِ زلفِ پیچاں لے چلا

○

جلوے ترے جو رونقِ بازار ہو گئے
خوبانِ خود فروش خریدار ہو گئے

تلووں سے راستہ چمن دلکشا بنا!
جلووں سے آئینہ در و دیوار ہو گئے

دل جاں بلب، جگر میں تپک جان بیقرار
ہم تیرا نام لے کے گنہگار ہو گئے!

گلزار ہے بہار یونہی حُسنِ یار سے
جیسے چمن، بہار سے گلزار ہو گئے

یہ حُسنِ خود فروش عجب جنس ہے حسنؔ
وہ بک گئے جو اس کے خریدار ہو گئے

نسیم

شبّر حسین بھرتپوری

○

غیر کے گھر ہیں وہ مہمان بڑی مشکل ہے
جان جانے کے ہیں سامان بڑی مشکل ہے

کہتے ہیں آپ ہیں بس ایک کے طالب ہم سے
ہے وہی غیر کو ارمان بڑی مشکل ہے

اُس نے لی جان ہزاروں کو یہ دم دے دے کر
مجھ پہ مرنا نہیں آسان، بڑی مشکل ہے

روز کہتے ہو کہ ترکش کے لیے ہے بیتاب
جان کر بنتے ہو انجان، بڑی مشکل ہے

دوستی سہل نہیں اس بتِ بدخُو سے نسیم
ضد نہ کر، دیکھ مری جان، بڑی مشکل ہے

○

اُن کے پیکان پہ پیکان چلے آتے ہیں
دل میں گھر کرنے کو مہمان چلے آتے ہیں

دیکھ کر آئے ہیں کیا عارض و گیسو اُن کے
لوگ حیران پریشان چلے آتے ہیں

چارۂ گل کا وہ پرچہ نہیں لکھتے مجھ کو
پاس اغیار کے فرمان چلے آتے ہیں

بزمِ اغیار میں کس شخص نے گُستاخی کی
کہ وہ خاموش پشیمان چلے آتے ہیں!

بیخود دہلوی

○

شمعِ مزار تھی نہ کوئی سوگوار تھا
تم جس پہ رو رہے تھے یہ کس کا مزار تھا

تڑپوں گا عمر بھر دلِ مرحوم کے لیے
کم بخت، نامراد لڑکپن کا یار تھا

سودائے عشق اور ہے وحشت کچھ اور شے
مجنوں کا کوئی دوست فسانہ نگار تھا

جادو ہے یا طلسم تمہاری زبان میں
تم جھوٹ کہہ رہے تھے مجھے اعتبار تھا

کیا کیا ہمارے سجدہ کی رسوائیاں ہوئیں
نقشِ قدم کسی کا سرِ رہگزار تھا

اس وقت تک تو وضع میں آیا نہیں ہے فرق (ق)
تیرا کرم شریک جو پروردگار تھا

○

وہ سن کر حور کی تعریف پردے سے نکل آئے
کہا پھر مسکرا کر حسنِ زیبا اس کو کہتے ہیں

اجل کا نام دشمن دوسرے معنی میں لیتا ہے
تمہارے چاہنے والے تمنا اس کو کہتے ہیں

مرے مدفن پہ کیوں روتے ہو عاشق مر نہیں سکتا
یہ مر جانا نہیں ہے صبر آنا اس کو کہتے ہیں

نمک بھر کر مرے زخموں میں تم کیا مسکراتے ہو
مرے زخموں کو دیکھو مسکرانا اس کو کہتے ہیں

زمانے سے عداوت کا سبب تھی دوستی جن کی
اب ان کو دشمنی ہے ہم سے دنیا اسکو کہتے ہیں

دکھاتے ہم نہ آئینہ تو یہ کیونکر نظر آتا
بشر حوروں سے اچھا تم نے دیکھا اسکو کہتے ہیں

پنڈت امرناتھ ساحر

○

عجب ہے کس قدر دل ذوقِ کاوش ہائے مژگاں کا
کہ سو سو نشتروں کی نوک ہے، ایک اک رگِ جاں پر

پڑا ہوگا مگر عکسِ عذارِ لالہ گوں، ورنہ
یہ گستاخی! ہمارا خون اور قاتل کے داماں پر

طریقِ عشق میں ہے رنج پہلے اور خوشی پیچھے
بہارِ صبحِ روزِ وصل ہے اک شامِ ہجراں پر

مری دیوانگی روزِ قیامت میرے کام آئی
قلم رحمت کا کھینچا اُس نے آخر میرے عصیاں پر

اگر اُن کے تغافل کو ہے دعویٰ اپنی تمکیں کا
ہماری خود فراموشی کو ہے ناز اپنے نسیاں پر

○

رُسوائے عشق ہے ترا شیدا کہیں جسے
عشاق میں مثال ہے رُسوا کہیں جسے

سینہ چمن ہے، غنچۂ دل ہے شگفتہ دل
تیری نگاہ ہے چمن آرا کہیں جسے

غم ہا دریں ہے دلِ شوریدگانِ عشق!
فرقت کی ایک رات ہے دُنیا کہیں جسے

منسوب کفر دیر سے، ایماں حرم سے ہے
اک رہ گیا ہوں میں کہ تمہارا کہیں جسے

ہم غیر معتبر سہی اور غیر معتبر
کتنا بجا ہے آپ کا، جیسا کہیں جسے

ساحر نفس وُہ دام ہے، جس میں کہ ہے اسیر
صیدِ رمِ خیال کہ عنقا کہیں جسے

سائلؔ دہلوی

○

سنا بھی کبھی ماجرا درد و غم کا کسی دل جلے کی زبانی، کہو تو
نکل آئیں آنسو کلیجہ پکڑ لو، کروں عرض اپنی کہانی، کہو تو

تمہیں رنگِ مے شیخ مرغوب کیا ہے گلابی ہو یا زعفرانی، کہو تو
بلائے کوئی ساقی مُو رُو پیکر، مصفا، کشیدہ، پُرانی، کہو تو

تمنائے دیدار ہے حسرتِ دل کہ تم جلوہ فرما ہو میں آنکھیں سینکوں
نہ کہہ دینا موسیٰ سے جیسے کہا تھا، مری عرض پر لن ترانی، کہو تو

وفا پیشہ عاشق نہیں دیکھا تم نے، مجھے دیکھ لو، جانچ لو، آزما لو
تمہارے اشارے پہ قربان کر دوں ابھی مایۂ زندگانی، کہو تو

کہاں میں کہاں داستاں کا تقاضا مرے ضبطِ دردِ نہاں کا ہے کہنا
چھڑا اس پہ یہ تاکید بھی ہے برابر، نہ کہنا پرائی کہانی، کہو تو

مرے نامۂ شوق کی سطر میں ہے بجز اک ورق سادہ وہ مہمل نہیں ہے
میں سمجھا دوں خدمت میں حاضر ابھی خود بتا دے گا اس کے معانی کہو تو

○

ملے غیروں سے مجھ سے رنج، غم یوں بھی ہے اور یوں بھی
وفا دشمن جفا جو کا ستم یوں بھی ہے اور یوں بھی

شبِ وعدہ وہ آ جائیں، نہ آئیں، مجھ کو بلوا لیں
عنایت یوں بھی اور یوں بھی، کرم یوں بھی ہے اور یوں

مجھے لکھا تھا، ہم بہرِ عیادت آنے والے ہیں
مدد ہمدم ہے اب سمجھے کہ ہم یوں بھی ہے اور یوں

نہ خود آئیں، نہ بلوائیں، شکایت کیوں نہ لکھ بھیجوں
عنایت کی نظر مجھ پر تو کم یوں بھی ہے اور یوں

تم آؤ مرگ شادی ہے، نہ آؤ مرگ ناکامی
نظر میں اب رہِ ملکِ عدم یوں بھی ہے اور یوں

ہے سر پر بھی ٹوٹا ہے تمہارے پاؤں بھی چومے
غرض پیرِ فلک کی پشت خم یوں بھی ہے اور یوں

مجھے باور ہے تم جھوٹے نہیں وعدے کے سچے ہو
قسم کیوں کھاؤ، ناجائز قسم یوں بھی ہے اور یوں

یہ مسجد ہے، یہ مے خانہ، تعجب اس پہ آتا ہے
جنابِ شیخ کا نقشِ قدم یوں بھی ہے اور یوں بھی

یہ تیری سادگی آرائشِ زیور سے بڑھ کر ہے
خدا کے فضل سے تو تو رقم یوں بھی ہے اور یوں

تجھے نواب بھی کہتے ہیں، شاعر بھی سمجھتے ہیں
زمانے میں ترا سائلؔ بھرم یوں بھی اور یوں بھی

ستائیں تو اب جان دے کر ستائیں
قیامت ہے یہ روٹھ جانا تمہارا

ذرا سے یہ سادے بڑے بھولے بھالے

جگر میں درد ہے، دل مضطرب ہے

بچا ہے جو ساغر میں کیوں پھینکتے ہو
ہمیں دے دو ہم پی لیں جھوٹا تمہارا

یہ کیا ہے سبب آج چپ چپ ہو پیارے
بتاؤ تو کیوں جی ہے کیسا تمہارا؟

اٹھانے پڑے خاک سے دل کے ٹکڑے
بڑا پیار تھا، پیار دیکھا تمہارا

خدا کے لئے ہاں، نہیں کچھ تو کہدو
کہ منہ تک رہی ہے تمنا تمہارا!

علاج اس کے بیمار کا تم کروگے
کہیں دل چلا ہے مسیحا، تمہارا

چلا شاعرِ زار تسلیم لیجے!
بھلا ہو بھلا میرے داتا تمہارا

نہیں ملتے نہ ملیے؟ خیر! کوئی مر نہ جائے گا
خدا کا شکر ہے! پہلے محبت آپ نے کم کی

عدو جس طرح تم کو دیکھتا ہے ہم سمجھتے ہیں
چھپاؤ لاکھ تم چھپتی نہیں ہے آنکھ محرم کی

مزہ اس میں ہی ملتا ہے، نمک چھڑکو، نمک چھڑکو
تمہیں لو نہیں عادت مرے زخموں کو مرہم کی

کہاں جانا ہے؟ تھم تھم کر چلو، ایسی بھی کیا جلدی
تم ہی تم ہو، غبار کیسے، نظر پڑتی ہے عالم کی

کوئی ایسا ہو آئینہ کہ جس میں تو نظر آئے
زمانے بھر کا جھوٹا، کیا حقیقت ساغرِ جم کی

گھٹائیں دیکھ کر بے تاب ہے بے چین ہے شاعر
تمہارے قربان، او مطرب! سنا دے کوئی ترنم کی

...ایں ہے یا عشق، حسن میں مضمر
...سنہ میں یا آئینہ ہے جوہر میں

...شق محشر آرا کی طور پہ گری بجلی
حسن لن ترانی کی رہ سکا نہ چادر میں

...د سوزِ الفت میں دیکھ کر سکوں دل کا
بجلیاں چلتی ہیں بادلوں کے محشر میں

...ہ کو حیرت ہے ارتقائے وحشت پہ
...دلوں میں جو چکر تھا آ رہا ہے وہ سر میں

... وہ رند یا صوفی، مست اسکی دھن میں ہیں
... کتنے مے خانے بھر دیے ہیں کوثر میں

O

عشق ہی عشق ہو، عاشق ہو نہ معشوق جہاں
ایسی اک درگہ توحید مآب اور بھی ہے

ہوش سے کاٹ یہ دن، زندہ دلی سے رکھ کام
شیب کے بعد مری جان شباب اور بھی ہے

یار مے خانے اگر کر گئے خالی، غم کیا!
اب بھی ابر آتا ہے اور خم میں شراب اور بھی ہے

گھر گیا غالب و مومن نے جہاں آنکھوں میں
اسی بستی میں کوئی خانہ خراب اور بھی ہے

آغا شاعر

○

چلے گا نہیں مجھ پہ فقرا تمہارا
بتا دو! کہ خنجر ہے جھوٹا تمہارا

منائیں تو اب جان دے کر منائیں
قیامت ہے یہ روٹھ جانا تمہارا

بڑے سیدھے سادے بڑے بھولے بھالے
کوئی دیکھے اس وقت چہرہ تمہارا

بجا ہے جو ساغر میں کیوں پھینکتے ہو
ہمیں دے دو ہم پی لیں جھوٹا تمہارا

یہ کیا ہے سبب آج چپ چپکے پیارے
بتاؤ تو کیوں جی ہے کیسا تمہارا!

اٹھانے پڑے خاک سے دل کے ٹکڑے
بڑا پیار تھا، پیار دیکھا تمہارا

خدا کے لیے ہاں، نہیں کچھ تو کہہ دو
کہ منہ تک رہی ہے تمنا تمہارا!

علاج اس کے بیمار کا تم کرو گے
کہیں دل چلا ہے مسیحا، تمہارا

چلا شاعرِ زار تسلیم لیجے!
بھلا ہو بھلا میرے داتا تمہارا

○

یہ کیسے بال کھولے آئے، کیوں صورت بنی غم کی
تمہارے دشمنوں کو کیا پڑی تھی میرے ماتم کی

شکایت کس سے کیجے، ہائے! کیا اُلٹا زمانہ ہے
بڑھایا پیار جب ہم نے، محبت یار نے کم کی

جگر میں درد ہے، دل مضطرب ہے، جان بے کل ہے
مجھے اس بیخودی میں بھی خبر ہے اپنے عالم کی

نہیں ملتے نہ ملیے، خیر! کوئی مر نہ جائے گا
خدا کا شکر ہے! پہلے محبت آپ نے کم کی

عدو جس طرح تم کو دیکھتا ہے ہم سمجھتے ہیں
چھپاؤ لاکھ تم چھپتی نہیں ہے آنکھ محرم کی

مزا اس میں ہی ملتا ہے، نمک چھڑکو، نمک چھڑکو
تمہارے تو نہیں عادت مرے زخموں کو مرہم کی

کہاں جاتے ہو؟ تھم تھم کر چلو، ایسی بھی کیا جلدی
تم ہی تم ہو، خدا رکھے، نظر پڑتی ہے عالم کی

کوئی ایسا ہو آئینہ کہ جس میں تو نظر آئے
زمانے بھر کا جھوٹا، کیا حقیقت ساغرِ جم کی

گھٹائیں دیکھ کر بے تاب ہے بے چین ہے شاعر
ترے قربان، او مطرب! سنا دے کوئی سرگم کی

پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی

○

حُسن عشق میں ہے یا عشق، حسن میں مُضمر
جوہر آئنہ میں یا آئنہ ہے جوہر میں

عشق محشر آرا کی طُور پہ گری بجلی
حُسن لن ترانی کی رہ سکا نہ چادر میں

فرطِ سوزِ الفت میں دیکھ کر سکوں دِل کا
بجلیاں مچلتی ہیں بادلوں کے محشر میں

چارہ گر کو حیرت ہے ارتقائے وحشت کے
پاؤں میں جو چکر تھا آ رہا ہے وُہ سر میں

ہوں وہ رند یا صوفی، مست اسکی دھن میں ہیں
جلنے کتنے خانے بر دئے ہیں کوثر میں

○

عشق ہی عشق ہو، عاشق ہو نہ معشوق جہاں
ایسی اک درگہ توحید مآب اَور بھی ہے

ہوش سے کاٹ یہ دن، زندہ دلی سے رکھ کام
شیب کے بعد مری جان شباب اَور بھی ہے

یارے خانے اگر کر گئے خالی، غم کیا!
اب بھی ابر آتا ہے اور خُم میں شراب اَور بھی ہے

گھر کیا غالب و مومن نے جہاں آنکھوں میں
اسی بستی میں کوئی خانہ خراب اَور بھی ہے

محمد علی جوہر

○

تنہائی کے سب دن ہیں تنہائی کی سب راتیں
اب ہونے لگیں اُن سے خلوت میں ملاقاتیں

ہر آن تسلّی ہے ہر لحظہ تشفّی ہے
ہر وقت ہے دلجوئی ہر دم ہیں مداراتیں

معراج کی سی حاصل سجدوں میں ہے کیفیت
اک فاسق و فاجر میں اور ایسی کراماتیں

بیٹھا ہُوا توبہ کی ترغیب منایا کر
تھمتی نہیں یُوں جوہر اس دیس کی برساتیں

دورِ حیات آئے گا قاتل قضا کے بعد
ہے ابتدا ہماری تری انتہا کے بعد

جینا وہ کیا کہ دل میں نہ ہو تیری آرزُو
باقی ہے موت ہی دلِ بے مدعا کے بعد

تجھ سے مقابلے کی کسے تاب ہے ولے
میرا لہُو بھی خوب ہے تیری حنا کے بعد

لذّت ہنوز مائدۂ عشق میں نہیں
آتا ہے لطفِ جُرمِ تمنا سزا کے بعد

قتلِ حسین اصل میں مرگِ یزید ہے
اسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد

دِل شاہجہانپوری

○

پھر اعتبارِ عشق کے قابل نہیں رہا
جو دل تری نظر سے گرا دِل نہیں رہا

نشتر چبھوئے اب نہ پشیمانیٔ نگاہ
مجھ کو تو شکوۂ خلشِ دل نہیں رہا

موجیں اُبھار کر مجھے جس سمت لے چلیں
حدِ نگاہ تک کہیں ساحل نہیں رہا

کیا کہئے اب مآلِ محبت کی سرگذشت
یاد اس کی رہ گئی ہے مگر دل نہیں رہا

○

کوچہ گردی میں جوانی جائے گی
خاک ہو کر زندگانی جائے گی

مٹ نہیں سکتا ہمارے دِل کا داغ
قبر میں بھی یہ نشانی جائے گی

سچ ہے میری بات کا کیا اعتبار
سچ کہوں گا، جھوٹ جانی جائے گی

حضرت دِل جب بڑھاپا آئے گا
خیر مقدم کو جوانی جائے گی

شاہ بیدمؔ وارثی

○

اپنی ہستی کا اگر حُسن نمایاں ہو جائے
آدمی کثرتِ انوار سے حیراں ہو جائے

تم جو چاہو تو مرے درد کا درماں ہو جائے
ورنہ مشکل ہے کہ مشکل مری آساں ہو جائے

او نمک پاش تجھے اپنی ملاحت کی قسم!
بات تو جب ہے کہ ہر زخم نمکداں ہو جائے

دینے والے مجھے دینا ہے تو اتنا دے دے
کہ مجھے شکوۂ کوتاہیِ داماں ہو جائے

اس سیہ بخت کی راتیں بھی کوئی راتیں ہیں
خوابِ راحت بھی جسے خواب پریشاں ہو جائے

سینۂ شبلی و منصور تو پھونکا تُو نے
اس طرف بھی کرم اے جنبشِ داماں ہو جائے

آخری سانس بنے زمزمۂ ہُو اپنا
سازِ مضرابِ فنا تارِ رگِ جاں ہو جائے

تو جو اسرارِ حقیقت کہیں ظاہر کر دے
ابھی بیدمؔ رسن و دار کا ساماں ہو جائے

○

مجھے شکوہ نہیں برباد رکھ! برباد رہنے دے
مگر اللہ میرے دل میں اپنی یاد رہنے دے

مرے ناشاد رہنے سے اگر تجھ کو مسرت ہے
تو میں ناشاد ہی اچھا، مجھے ناشاد رہنے دے

تری شانِ تغافل پر مری بربادیاں صدقے
جو بربادِ تمنا ہو، اُسے برباد رہنے دے

نہ صحرا میں بہلتا ہے نہ کوئے یار میں ٹھہرے
کہیں تو چین سے مجھ کو دلِ ناشاد رہنے دے

بھلا اپنی گزری ہی بیدمؔ بھلی معلوم ہوتی ہے
مری ہستی مٹا دے قصۂ فرہاد رہنے دے!

آغا حشر

○

یاد میں تیری جہاں کو بھولتا جاتا ہوں میں
بھولنے والے! کبھی تجھ کو بھی یاد آتا ہوں میں

ایک دھندلا سا تصور ہے کہ دل بھی تھا یہاں
اب تو سینے میں فقط اک ٹیس سی پاتا ہوں میں

او وفا نا آشنا کب تک سنوں تیرا گلہ
بے وفا کہتے ہیں تجھ کو اور شرماتا ہوں میں

آرزوؤں کا شباب، اور مرگِ حسرت ہائے ہائے
جب بہار آئے گلستاں میں تو مرجھاتا ہوں میں

حشر میری شعر گوئی ہے فقط فریادِ شوق!
اپنا غم دل کی زباں میں دل کو سمجھاتا ہوں میں

○

چوری کہیں کھلے نہ نسیمِ بہار کی
خوشبو اڑا کے لائی ہے گیسوئے یار کی

اللہ رکھے اس کا سلامت غرورِ حسن
آنکھوں کو جس نے دی ہے سزا انتظار کی

گلشن میں دیکھ کر مرے مستِ شباب کو
شرمائی جا رہی ہے جوانی بہار کی

اے میرے دل کے چین مرے دل کی روشنی
آ، اور صبح کر دے شبِ انتظار کی

اے حشر دیکھنا تو یہ ہے چودھویں کا چاند
یا آسماں کے ہاتھ میں تصویر یار کی!

وحشت کلکتوی

○

ہوئے ہیں گم جس کی جستجو میں اسی کی ہم جستجو کرینگے
ملا ہے مرہم جس سے ہم کو اسی کی ہم آرزو کرینگے

گئے وہ دن جبکہ اس چمن میں ہوائے نشو و نما تھی ہم کو
خزاں کو دیکھا نہیں ہے ہم نے کہ خواہشِ رنگ و بو کرینگے

حکایتِ آرزو ہے نازک زباں کیا خاک کہہ سکیگی
بہ نغمۂ شورِ نالہ حسرتِ دل کی ہم گفتگو کریں گے

جگہ جو آنکھوں میں میں نے دی تھی تو ان کی تھی چشمِ راز داری
یہ کیا خبر تھی کہ اشک میرے مجھی کو بے آبرو کرینگے

ابھی تو گم کردہ راہ خود ہیں پئے محبت کی بیخودی میں
اگر کبھی آپ میں ہم آئے تو اسکی بھی جستجو کریں گے

اس انجمن میں کہ چشمِ ساقی کفیل ہو عیشِ زندگی کی
وہ بادہ خواری میں خام ہونگے جو فکرِ جام و سبو کرینگے

طہارتِ ظاہری سے حاصل نہ ہو سکے گی صفائے باطن
بہا کے ہم خونِ توبہ وحشت کسی اگر دن وضو کرینگے

○

درد کا میرے یقیں آپ کریں یا نہ کریں
عرض اتنی ہے کہ اس راز کا چرچا نہ کریں

لاکھ غافل سہی پر ایسے بھی ہم کور نہیں
کہ چمن دیکھ کے ذکرِ چمن آرا نہ کریں

عقل و دانش سے تو کچھ کام نہ نکلا اپنا
کب تلک آخر دلِ دیوانہ کا کہنا نہ کریں

وہ نگاہیں عجب انداز سے ہیں عشوہ فروش
غمِ پنہاں کو ہمارے کہیں رسوا نہ کریں

تیرے آشفتہ سر ایسے بھی نہیں سودائی
کہ دل و دیں کیلئے زلف کا سودا نہ کریں

میں نے بے ہودہ توقع کی سزا پائی ہے
کچھ خیال آپ مری حسرتِ دل کا نہ کریں

میرے ارمانوں کو کاش اتنی سمجھ ہو وحشت
کہ ان آنکھوں سے مروت کا تقاضا نہ کریں

آسی الدنی

○

قید سے پہلے بھی آزادی مری خطرہ میں تھی
آشیانہ ہی مرا صورت نمائے دام تھا

واہمہ خلاق اور آزادی کا حُسن افزا سوا
ہر فریبِ رنگ کا پہلے گلستاں نام تھا

نصف آہوں پر بھی غالب ہو چلا تھا اے اجل!
تو نہ آتی تو یہ میرا آخری پیغام تھا

دیدۂ خوں نابہ افشاں میرا اُن کے سامنے
بے خودی کے ہاتھ سے چھوٹا ہوا اک جام تھا

○

ہزاروں طرح اپنا درد ہم اُس کو سناتے ہیں
مگر تصویر کو ہر حال میں تصویر پاتے ہیں

بجھا دے اے ہوائے تُند! مدفن کے چراغوں کو
سیہ بختی میں یہ اک بدنما دھبہ لگاتے ہیں

مرتب کر گیا اک عشق کا قانون دنیا میں
وہ دیوانے ہیں جو مجنوں کو دیوانہ بتاتے ہیں

اسی محفل سے میں روتا ہوا آیا ہوں اے آسی
اشارے میں جہاں لاکھوں تمنّے بے جلتے ہیں

تاجور نجیب آبادی

○

من شوخ چشم میں نام کو وفا نہیں　　درد آفریں نظر ہے درد آشنا نہیں
قلبِ عاشق ہے وہ ننگِ زندگی ہے وہ　　جس کے دل کا آئینہ تیرا آئینہ نہیں
وا اس کی بیکسی تو نہ جس کے ساتھ ہو　　ہائے اس کی بندگی جس کا تو خدا نہیں
بت وہ الم نصیب جس کا درد تو نہ ہو　　اُف وہ دردِ زندگی جس کی تو دوا نہیں
ستیلعزیز میں خود زمیں کے نام　　آج آپ کے سوا کوئی آپ کا نہیں
تناہوں میں کی تو اہلِ دل کیا ہے　　دل پہ جو خدا کی مار دل بھی اتنا نہیں
حسن کو ذرا تو مری نظر سے دیکھ　　دوستِ شش جہات میں کچھ ترے سوا نہیں

بے وفا خدا سے ڈر طعنۂ وفا نہ دے
تاجور میں اور عیب کچھ ہوں بے وفا نہیں

○

محبت میں زیاں کاری مرادِ دل نہ بن جائے
یہ لا حاصل ہی عمرِ عشق کا حاصل نہ بن جائے

مجھی پہ پڑ رہی ہے ساری محفل میں نظر ان کی
یہ دلداری حسابِ دوستاں در دل نہ بن جائے

کروں گا عمر بھر طے راہِ بے منزل محبت کی
اگر وہ آستاں اس راہ کی منزل نہ بن جائے

یہ متوالی نظر یہ بادۂ بے جام اے توبہ
کسی پہ بے بسی اے ساقیِ محفل نہ بن جائے

ترے انوار سے ہے نبضِ ہستی میں تڑپ پیدا
کہیں سارا نظامِ کائنات اک دل نہ بن جائے

کہیں رسوا نہ ہو اب شانِ استغنا محبت کی
مری حالت تمہارے رحم کے قابل نہ بن جائے

صفیؔ لکھنوی

○

جانا جانا جلدی کیا ہے، ان باتوں کو جانے دو
ٹھہرو ٹھہرو، دل تو ٹھہرے مجھ کو ہوش میں آنے دو

پاؤں نکالو خلوت سے، آنے جو قیامت آنے دو
سارے سر آپس میں ٹکرائیں اگر، ٹکرانے دو

مہر منوّر جام طلائی، ماہ کٹورا چاندی کا
میخانے کے میخانے میں یہی ہیں، گردش میں پیمانے دو

دورِ بہارِ حُسن تو ہو، پھر جوشِ جنوں کا قحط نہیں
کُرتے کی باہوں میں کوئل بُوداموں میں آنے دو

بادل گرجا، بجلی چمکی، روئی شبنم، پھُول ہنسے
مُرغِ سحر کو ہجر کی شب کے افسانے دُہرانے دو

ہاتھ میں ہے آئینہ و شانہ پھر بھی شکن پیشانی پہ
موجِ صبا سے تم تو نہ بگڑو زلفوں کو بل کھانے دو

کثرتِ بےنام و نشاں ہے کیا ہونگے گمنام صفیؔ
نقش دلوں پر نام ہے اپنا، نقشِ لحد مٹ جانے دو

○

وہ عالم ہے کہ منہ پھیرے ہوئے عالم نکلتا ہے
شبِ فرقت کے غم جھیلے ہوؤں کا دم نکلتا ہے

الٰہی خیر ہو اُلجھن پہ اُلجھن بڑھتی جاتی ہے
نہ میرا دم نہ اُن کے گیسوؤں کا خم نکلتا ہے

قیامت ہی نہ ہو جائے، جو پردے سے نکل آؤ
تمہارے منہ چھپانے میں تو یہ عالم نکلتا ہے

شکستِ رنگِ رُخ آئینۂ بےتابیِ دل ہے
ذرا دیکھو تو کیونکر غم زدوں کا دم نکلتا ہے

نگاہِ التفاتِ مہر اور اندازِ دلجوئی
مگر اک پہلوئے بےتابیِ شبنم نکلتا ہے

صفیؔ کشتہ ہوں نامہربانیوں کا اہلِ عالم کی
یہ دیکھوں کون میرا صاحبِ ماتم نکلتا ہے

ثاقب لکھنوی

○

کہاں تک جفا حسن والوں کی سہتے
جوانی جو رہتی تو پھر ہم نہ رہتے

وفا بھی نہ ہوتا تو اچھا تھا دشمن
گھڑی دو گھڑی تو کبھی شاد رہتے

نشیمن نہ جلتا نشانی تو رہتی
ہمارا تھا کیا ٹھیک رہتے نہ رہتے

بتاتے ہیں آنسو کہ اب دل نہیں ہے
جو پانی نہ ہوتا تو دریا نہ بہتے

بڑے شوق سے سن رہا تھا زمانہ
ہمیں سو گئے داستاں کہتے کہتے

کوئی نقش اور کوئی دیوار سمجھا
زمانہ ہوا مجھ کو چپ رہتے رہتے

مری ناؤ اس غم کے دریا میں ثاقب
کنارے پہ آ ہی لگی بہتے بہتے

○

ہجر کی شب نالۂ دل وہ صدا دینے لگے
سننے والے رات کٹنے کی دعا دینے لگے

کس نظر سے آپ نے دیکھا دلِ مجروح کو
زخم جو کچھ بھر چلے تھے پھر ہوا دینے لگے

جز زمینِ کوئے جاناں کچھ نہیں پیشِ نگاہ
جس کا دروازہ نظر آیا صدا دینے لگے

باغباں نے آگ دی جب آشیانے کو مرے
جن پہ تکیہ تھا وہی پتے ہوا دینے لگے

مٹھیوں میں خاک لیکر دوست آئے وقتِ دفن
زندگی بھر کی محبت کا صلا دینے لگے

آئینہ ہو جائے میرا عشق اُن کے حسن کا
کیا مزا ہو درد اگر خود ہی دوا دینے لگے

سینۂ سوزاں میں ثاقب گھٹ رہا ہے وہ دھواں
اُف کروں تو آگ دنیا کی ہوا دینے لگے

حکیم سعید احمد ناطق لکھنوی

○

کبھی دامانِ دل پر داغِ مایوسی نہیں آیا
اِدھر وعدہ کیا اُس نے، اِدھر دل کو یقیں آیا

محبت آشنا دل مذہب و ملت کو کیا جانے
ہوئی روشن جہاں بھی شمع پروانہ وہیں آیا

دو عالم سے گزر کے بھی دلِ عاشق ہے آوارہ
ابھی تک یہ مسافر اپنی منزل پر نہیں آیا

مری جانب سے اُنکے دل میں کس شکوے پہ کینہ ہے
وہ شکوہ جو زباں پر کیا ابھی دِل میں نہیں آیا

حیاتِ بیخودی کچھ ایسی نامحسوس تھی ناطق
اجل آئی تو مجھ کو اپنی ہستی کا یقیں آیا

○

کیا بتاؤں دل کہاں ہے اور کس جا درد ہے
مَیں سراپا دل ہُوں، دل میرا سراپا درد ہے

یہ سمجھ لیں پہلے آپ اے حضرتِ عیسیٰ! ذرا
کس کے دل میں درد ہے یہ اور کس کا درد ہے

جو چلا دُنیا سے، وُہ رکھے ہوئے سینے پہ ہاتھ
میں سمجھتا ہوں کہ سب کے دل میں تیرا درد ہے

میرے چپ رہنے سے تو غافل ہے او ظاہر پرست
ظرف بھی اتنا ہی میں رکھتا ہُوں جتنا درد ہے

ہر تڑپ پر قالبِ مُردہ میں آجاتی ہے رُوح
مجھ مریضِ ناتواں کی جان گویا درد ہے

بچ گئے تو انتہائے عشق میں لُطف آئے گا
اور ابھی تو ابتدا میں انتہا کا درد ہے

اپنا اپنا حال کہہ لینے دو ناطق سب کو تم
جانتا ہے وُہ کہ کس کے دل میں کتنا درد ہے

ناطق گلاؤٹھوی

○

ڈھونڈتی ہے اضطرابِ شوق کی دنیا مجھے
آپ نے محفل سے اٹھا کر کہاں رکھا مجھے

اے نگاہِ مست! اس کا نام ہے کیفِ سرور
آج تو نے دیکھ کر میری طرف دیکھا مجھے!

یار سے ہو کر جدا، جورِ فلک کا غم نہیں
ہر گھڑی وہ بات تھی جس بات کی پروا مجھے

ساتھ ہی چھوڑا تو کیا، سب مرے دن کٹ گئے
زندگی تو نے کہاں آکر دیا دھوکا مجھے!

○

کیا ارادے ہیں وحشتِ دل کے
کس سے ملنا ہے خاک میں مل کے

اے دلِ شکوہ سنج! کیا گزری
کس لئے ہونٹ رہ گئے ہل کے؟

مٹتے جاتے ہیں راہِ عمر میں دوست
جل رہے ہیں نشانِ منزل کے

چھوڑ ناطق فضائے بزمِ شکست
اٹھ کے ٹکڑے سنبھال لے دل کے

عزیز لکھنوی

○

دیکھ کر ہر در و دیوار کو حیراں ہونا
وہ مرا پہلے پہل داخلِ زنداں ہونا

اف مرے اُجڑے ہوئے گھر کی تباہی دیکھو
جس کے ہر ذرّہ پہ چھایا ہے بیاباں ہونا

حادثے دونوں یہ عالم میں اہم گذرے ہیں
میرا مرنا، تیری زلفوں کا پریشاں ہونا

کچھ نہ پوچھو شبِ وعدہ مرے گھر کی رونق
اللہ اللہ وہ سامان سے ساماں ہونا

ہوش میں لے کے اک انگڑائی کسی کا کہنا
تم کو آتا ہی نہیں چاک گریباں ہونا

نزع ڈوبے تری آنکھوں کے الٰہی توبہ!
چاہیئے تھا انہیں پیوستِ رگِ جاں ہونا

ہو چلیں آپ کے بیمار کی آنکھیں بے نور
فخر تھا صبح کے تارے کا نمایاں ہونا

میں کروں ضبط اُدھر آنسو کو پسینہ آئے
چاہیئے یوں غمِ پنہاں کو نمایاں ہونا

اللہ اللہ یہ سلیقہ ترا اے شعلۂ طور
کس طرح تو نے چھپایا ہے نمایاں ہونا

ان سے کہتا ہے دمِ نزع دبیتے عزیز
خلق روئے گی مگر تم نہ پشیماں ہونا

○

یہ مشورہ ہم اُٹھے ہیں چارہ جُو کرتے
اب اس مریض کو اچھا تھا قبلہ رُو کرتے

زبان رُک گئی آخر سحر کے ہوتے ہی!
تمام رات کٹی دل سے گفتگو کرتے

کفن کو باندھے ہوئے سر سے آئے ہیں، ورنہ
ہم اور آپ سے اس طرح گفتگو کرتے

سوادِ شہرِ خموشاں کا دیکھئے منظر!
سُنا نہ ہو جو خموشی کو گفتگو کرتے!

اگر کہیں وُہ دمِ واپسیں چلے آتے
ہم ایک سانس میں تفصیلِ آرزو کرتے

تمام رُوح کی لذت اسی پہ تھی موقوف
کہ زندگی میں کبھی تم سے گفتگو کرتے

جواب حضرتِ ناصح کو ہم بھی کچھ دیتے
جو گفتگو کے طریقے سے گفتگو کرتے

پہنچ کے حشر کے میداں میں ہول کیوں ہے عزیز
ابھی تو پہلی ہی منزل ہے جستجو کرتے!

جلیلؔ مانک پوری

○

کھو کے دل میرا تمہیں ناحق پشیمانی ہوئی!
تم سے نادانی ہوئی یا مجھ سے نادانی ہوئی!

اللہ اللہ پھوٹ نکلا رنگ چاہت کا مری
زہر کھایا میں نے پوشاک آپ کی دھانی ہوئی

ہم کو ہو سکتا نہیں دھوکا ہجومِ حشر میں
تیری صورت ہے ازل سے جانی پہچانی ہوئی

اے صبا! میں نذر کیا دوں قبرِ مجنوں کیلئے
خاک تھوڑی سی چڑھا دینا مری چھانی ہوئی

یار کے ہاتھوں ہوا جو کچھ ہوا اے تیغِ ناز!
تیری عُریانی ہوئی یا میری قربانی ہوئی!

کر گئی دیوانگی ہم کو بری ہر جرم سے
چاک دامانی سے اپنی پاک دامانی ہوئی

بانٹ دی بانکی اداؤں نے جو خنجر کو جلیلؔ!
ذبح کرنے میں مرے قاتل کو آسانی ہوئی

○

اِس شان سے وہ آج پئے امتحاں چلے
فتنوں نے پاؤں چوم کے پوچھا کہاں چلے

جب میں چلوں تو سایہ بھی اپنا نہ ساتھ دے
جب تم چلو، زمین چلے، آسماں چلے

آنکھوں میں کون آکے الٰہی نکل گیا!
کس کی تلاش میں مرے اشکِ رواں چلے

اُٹھتا ہوں میں جو دشت سے جانے کو اے جنوں
کہتے ہیں خار تھام کے دامن کہاں چلے

احسن مارہروی

○

ادا میں بانکپن، انداز میں اک آن پیدا کر
تجھے معشوق بننا ہے، تو پوری شان پیدا کر

کہاں کا وصل کیسی آرزو، اے دل! وہ کہتے ہیں
نہ میں حسرت کروں پوری، نہ تو ارمان پیدا کر

ہمارا انتخاب اچھا نہیں اے دل تو پھر تو ہی
خیالِ یار سے بہتر کوئی مہمان پیدا کر

مجھے ہے رشک اُسکو بھی رقیب اپنا سمجھتا ہوں
نہ دیکھے جو تجھے ایسا کوئی دربان پیدا کر

خیالِ ضبطِ اُلفت ہے تو احسن خوف پھر کیا
نہ دھڑکے دل بھی سینے میں، وہ اطمینان پیدا کر

○

ساقی وہ اعظا میں ضد ہے بادہ کش چکر میں ہے
تو بہ لب پر اور لب ڈوبا ہوا ساغر میں ہے

روک لے اے ضبط! جو آنسو کہ چشمِ تر میں ہے
کچھ نہیں بگڑا ہے اب تک گھر کی دولت گھر میں ہے

دب گیا تھا میرے مرنے سے جو اے محشر خرام!
کیا وہی خوابیدہ فتنہ صورتِ محشر میں ہے

جس کو تو چاہے جلادے جس کو چاہے مار دے
وہ بھی تیری بات میں، یہ بھی تری ٹھوکر میں ہے

دل کے مٹ جانے سے، جوشِ عشق گھٹ سکتا ہے کیا
دل سے کیا مطلب کہ یہ سودا تو میرے سر میں ہے

مانتا ہے آستاں کو تیرے کعبہ اور کون!
یہ ہمارا ہی نشانِ سجدہ، سنگِ در میں ہے

احسن آوارہ قسمت کی نہ پوچھو گردشیں
اپنے گھر بیٹھا ہوا تقدیر کے چکر میں ہے

نوح ناروی

○

کسی بے درد کو ظلم و ستم کا شوق جب ہوگا
یہ میرا ایک دل لاکھوں دلوں میں منتخب ہوگا

ہمارا اور ان کا سامنا محشر میں جب ہوگا
وہ جلسہ وہ سماں وہ معرکہ بھی کچھ عجب ہوگا

کوئی زندہ رہے دنیا میں کیا اگلی امیدوں پر
ابھی تو ہجر کا رونا ہے ہوگا وصل جب ہوگا

لڑکپن جا چکا اُن کا جوانی آنے والی ہے
کبھی مجھ پہ جفا ہوتی تھی، لیکن قہر اب ہوگا

تمہارے وصل کی ساعت ہمیشہ ٹلتی رہتی ہے
خدا جانے کہاں ہوگا، کسے معلوم کب ہوگا؟

ابھی لذت نہیں اس کو ملی آزارِ پنہاں کی
جو ہوگا بھی تو ہوتے ہوتے دل ایذا طلب ہوگا

وہ اپنے وعدۂ دیدار سے پھرنے کو پھر جائیں
مگر یہ تو سمجھ لیں بے وفا کس کا لقب ہوگا

مجھے اظہارِ اُلفت پر یہ ان سے داد ملتی ہے
تمہارا عشق اک دن میری ذلت کا سبب ہوگا

بھری محفل میں اُن کو چھیڑنے کی کیا ضرورت تھی
جناب نوح تم سا بھی نہ کوئی بے ادب ہوگا

○

آپ جن کے قریب ہوتے ہیں
وہ بڑے خوش نصیب ہوتے ہیں

جب طبیعت کسی پہ آتی ہے
موت کے دن قریب ہوتے ہیں

مجھ سے ملنا، پھر آپ کا ملنا
آپ کس کو نصیب ہوتے ہیں

ظلم سہہ کر جو اُف نہیں کرتے
ان کے دل بھی عجیب ہوتے ہیں

عشق میں اور کچھ نہیں ملتا
سینکڑوں غم نصیب ہوتے ہیں

نوح کی قدر کوئی کیا جانے
کہیں ایسے ادیب ہوتے ہیں

عبداللطیف تپش

○

جان آنکھوں میں رہی جی سے گزرنے نہ دیا
ابھی دیدار کی حسرت تھی کہ مرنے نہ دیا

کیا قیامت ہے ستمگار! بھری محفل میں
دل چُرا کر تری دزدیدہ نظر نے، نہ دیا

مدتوں کشمکشِ یاس و تمنا میں رہے
غم نے جینے نہ دیا شوق نے مرنے نہ دیا

ناخدا نے مجھے دلدل میں پھنسائے رکھا
ڈوب مرنے نہ دیا، پار اُترنے نہ دیا

کوئی تو بات ہے جو غیر کے آگے اُس نے
شکوہ کیسا کہ مجھے شکر بھی کرنے نہ دیا

خاک آرام کی خواہش ہو وطن سے باہر
جب ہمیں چین تپش اپنے ہی گھر نے نہ دیا

○

موت آتی نہیں قرینے کی
یہ سزا مل رہی ہے جینے کی

مے سے پرہیز! شیخ توبہ کرو!
اک یہی چیز تو ہے پینے کی

تم کو کہتا ہے آئنہ خودبیں
باتیں سنتے ہو اس کمینے کی

ہو گیا جب سے بے نقاب کوئی
شمع روشن نہ پھر کسی نے کی

چشمِ تر آبرو تو پیدا کر
یوں نہیں بجھتی آگ سینے کی

اہلِ دُنیا سے کیا بدی کا گلہ
اے تپش تو نے کس سے نیکی کی

ظفر تاباں

○

عمر بھر کا حاصل، عشق کا دورِ ناتمام
ہائے وہ مستیٔ سحر، ہائے وہ بیخودیٔ شام

چلیے اک سعی لیں، ہمسفرانِ سست گام!
میری سرشت میں نہیں، خواہشِ منزل و مقام

طائرِ خستہ بال کو دام بھی کنجِ آشیاں!
مرغِ چمن نورد کو، گوشۂ آشیاں بھی دام

اب بھی خدا پرست ہے دیر و حرم کی قید میں
ہائے نگاہِ نارسا، ہائے مذاقِ ناتمام

کیفِ نظر کی مستیاں اہلِ نظر سے پوچھئے
جیسے کوئی پلا گیا بادۂ مشک بو کے جام

خوبی و شانِ دلبری، غمزہ و ناز ہی نہیں
حسن میں وہ ادا بھی ہے جس کا نہیں ہے کوئی نام

○

یاد میں تیری دو عالم کو بھلانا ہے ہمیں
عمر بھر اب کہیں آنا ہے، نہ جانا ہے ہمیں

کہتے ہیں، عشق کا انجام بُرا ہوتا ہے
اب تو کچھ بھی ہو محبت کو نبھانا ہے ہمیں

خلشِ عشق سے بےچین ہے دل ایک طرف
اس پہ یارب! غمِ ہستی بھی اُٹھانا ہے ہمیں

ہائے وہ آگ! جو شعلے سے جلی تھی دل میں
آج اس آگ کے شعلوں کو بجھانا ہے ہمیں

رخصتِ عرضِ تمنا نہیں ملتی، نہ ملے
قصۂ شوق نگاہوں سے سُنانا ہے ہمیں!

آپ کانٹوں سے جھجکتے ہوئے چلتے ہیں، چلیں
دامنِ شوق کو پھولوں سے بچانا ہے ہمیں

ہائے! اس شرمِ محبت کا بُرا ہو تاباں
عشق کا راز خود اُن سے بھی چھپانا ہے ہمیں

عندلیب شادانی

○

کوئی ادا شناسِ محبت ہمیں بتائے
جو ہم کو بھول جائے وہ کیوں ہم کو یاد آئے

کس کی مجال تھی کہ حجابِ نظر اُٹھائے
وہ مُسکرا کے آپ ہی دل کے قریب آئے

اک دلنشیں نگاہ میں اللہ یہ خلش
نشتر کی نوک جیسے کلیجے میں ٹوٹ جائے

کچھ ہم سے بیخودی میں ہوئیں بے حجابیاں
چشمک زنی ستاروں نے کی پھُول مسکرائے

ناداں سہی پہ اتنے بھی ناداں نہیں ہیں ہم
خود ہم نے جان جان کے کتنے فریب کھائے

وہ جانِ آرزو کہ ہے سرمایۂ نشاط
کیوں اس کی یاد غم کی گھٹا بن کے دل پہ چھائے

کہتے تھے تم سے چھوٹ کے کیونکر جئیں گے ہم!
جیتے ہیں تم سے چھوٹ کے تقدیر جو دکھائے

بھولے گا دل میں وہ عالم، دمِ وداع
بجھتے ہوئے چراغ کی لَو جیسے تھرتھرائے

تم تو ہمیں کو کہتے تھے، یہ تم کو کیا ہوا
دیکھو! کنول کے پھول سے شبنم چھلک نہ جائے

اک ناتمام خواب، مکمل نہ ہو سکا
آنے کو زندگی میں بہت انقلاب آئے

○

جہاں عہدِ تمنا ختم ہو جائے
عذابِ جاودانی زندگی ہے

رُلاتی ہے مجھے کیوں چاندنی رات
یہی اِک راز میری زندگی ہے

خلش ہو، درد ہو، کاہش ہو، کچھ ہو
فقط جینا بھی کوئی زندگی ہے

ہلاک انجامِ تمنا!
بقائے آرزو ہی زندگی ہے

جگر میں ٹیس، لب ہنسنے پہ مجبور
کچھ ایسی ہی ہماری زندگی ہے

وہ چاہے جس قدر بھی مختصر ہو
محبت کی جوانی زندگی ہے

امیدیں مر چکیں، مَیں جی رہا ہوں
عجب بے اختیاری زندگی ہے

جوانی اور ہنگاموں سے خالی
یہ جینا ہے، یہ کوئی زندگی ہے

گزاری تھیں خوشی کی چند گھڑیاں
انہیں کی یاد میری زندگی ہے

محبت دونوں جانب سے محبت
نہ پوچھو آہ! کیسی زندگی ہے

علی اختر

○

زندگی کیا ہے، جو دل ہو تشنۂ ذوقِ وفا
یعنی یہ پردہ تو اٹھ سکتا ہے آسانی کیساتھ

تنگیٔ صورت و معنی ہے عنوانِ حیات
کھیلتے ہیں وہ مری فطرت کی حیرانی کیساتھ

تم نے ہر ذرے میں برپا کر دیا طوفانِ شوق
اک تبسم اس قدر جلووں کی طغیانی کیساتھ

دل کی آبادی ہے اختر دل کی بربادی کا نام
اک تعلق ہے مری ہستی کو ویرانی کے ساتھ

○

حرم کعبہ بنا دی وہ سر زمیں میں نے
تیرے خیال میں رکھ دی جہاں جبیں میں نے

مجھی کو پردۂ ہستی میں دے رہا ہے فریب
وہ حسن جس کو کیا جلوہ آفریں میں نے

چٹک میں غنچے کی وہ صوتِ جاں فزا تو نہیں
سنی ہے پہلے بھی آواز یہ کہیں میں نے

رہینِ منزلِ وہم و گماں رہا اختر
اسی میں ڈھونڈ لیا جادۂ یقیں میں نے

تلوک چند محروم

○

اس کا گلا نہیں کہ دعا بے اثر گئی
اک آہ کی تھی، وہ بھی کہیں جا کے مر گئی

اے ہم نفس، نہ پوچھ جوانی کا ماجرا
موجِ نسیم تھی، اِدھر آئی، اُدھر گئی

دامِ غمِ حیات میں اُلجھا گئی اُمید
ہم یہ سمجھ رہے تھے کہ احسان کر گئی

اس زندگی سے ہم کو نہ دُنیا ملی، نہ دیں
تقدیر کا مشاہدہ کرتے گُزر گئی

انجامِ فصلِ گل پہ نظر تھی، وگرنہ کیوں
گلشن سے آہ بھر کے نسیمِ سحر گئی

بس اتنا ہوش تھا مجھے روزِ وداعِ دوست
ویرانہ تھا نظر میں جہاں تک نظر گئی

ہر موجِ آبِ سندھ ہوئی وقفِ پیچ و تاب
محروم جب وطن میں ہماری خبر گئی

○

کاوشوں سے اماں ملے نہ ملے
پھر ترا آستاں ملے نہ ملے

اب قفس ہی کو آشیاں کہیے
راحتِ آشیاں ملے نہ ملے

دل سے کہتے ہیں مشورے دن رات؎
ہم سخن، ہم زباں ملے نہ ملے

محوِ فریاد ہم ہیں آج کہ پھر
فرصتِ یک فغاں ملے نہ ملے

عَلَمِ آہ سر بلند ہے آج
کل ہمارا نشاں ملے نہ ملے

تُو تو بیتاب ہے مگر اے دل
ہو کے وہ مہرباں ملے نہ ملے

یہ غزل جوشؔ؎ کو سنا محروم
پھر کوئی نکتہ داں ملے نہ ملے

؎ جناب جوشؔ ملیح آبادی

غزل قدیم

آرزو

سراج الدین علی خان

○

آتا ہے صبح اُٹھ کر تیری برابری کو
کیا دن لگے ہیں دیکھو خورشید خاوری کو

دل مارنے کا نسخہ پہنچا ہے عاشقوں تک
کیا کوئی جانتا ہے اس کیمیا گری کو

اس تُند خو صنم سے ملنے لگا ہوں جب سے
ہر کوئی مانتا ہے میری دلاوری کو

اپنی فسوں گری سے اب ہم تو ہار بیٹھے
بادِ صبا یہ کہنا اس دلربا پری کو

اب خواب میں ہم اس کی صورت کو ہیں ترستے
اے آرزو ہوا کیا بختوں کی یاوری کو

آزردہ

مفتی صدرالدین

○

یہ کہہ کے رخنہ ڈالیے ان کے حجاب میں
اچھے بُرے کا حال کُھلے کیا نقاب میں

یارب وہ خواب حق میں مرے خوابِ مرگ ہو
آئے وہ مست خواب اگر میرے خواب میں

تحقیق ہو تو جانوں کہ میں کیا ہوں، قیس کیا
لکھا ہوا ہے یوں تو سبھی کچھ کتاب میں

میں اور ذوقِ بادہ کشی! لے گئیں مجھے
یہ کم نگاہیاں تری بزمِ شراب میں

ہیں دونوں مثلِ شیشہ، یہ سامانِ صد شکست
جیسا ہے میرے دل میں نہیں ہے حباب میں

یہ عمر اور عشق! ہے آزردہ جائے شرم!
حضرت یہ باتیں پھبتی تھیں عہدِ شباب میں

آشفتہ

بھوسن خان

○

جام گدائی ہاتھ میں لے نت سانجھ سویرے پھرتے ہیں
شمس و قمر یہ دونوں بچارے حُسن کے تیرے پھرتے ہیں

قسمت سے ہے اختر طالع ماہ جبیں بن گردش میں
کھل تو اب ہم جاتی اپنی کب دن میرے پھرتے ہیں

پنڈت پوچھو، ہاتھ دکھاؤ، فال کھلاؤ کوئی، پر
دن جو ہوں برگشتہ اپنے کس نے پھیرے پھرتے ہیں

عقل و فراست سب ہی گئے سب کھو بیٹھے ہاتھ جنوں
گلیوں گلیوں لڑکے ہم کو گھیرے گھیرے پھرتے ہیں

یوں کہ منصور رشید اس کی بن کھلتی ہیں وقت خرام
ماہ و سیہ کو ڈالے گلے میں جیسے پھیرے پھرتے ہیں

جھنگ بیا آشفتہ ہم نے دیکھا ہلکے ان زلفوں کی
گلیوں گلیوں حال پریشاں، بال بکھیرے پھرتے ہیں

آشفتہ

مرزا رضا قلی

○

یہ جوش غم ہے کہ سینہ میں خون ابلتا ہے
نہ رکھیو ہاتھ کلیجہ پہ میرے، جلتا ہے

نہ پوچھ دل کی حقیقت تمہارے عشق میں آہ
اسے وہ غم ہے جو لگ کے اسی میں گلتا ہے

یہ ہم کو اس کی جدائی نے اور ایذا دی
کہ رات دن کوئی سینے میں دل کو ملتا ہے

کسی کے کان کا موتی دیکھا تو نے آشفتہ
جو اشک آنکھوں سے موتی سا تیرے ڈھلتا ہے

آصف

آصف الدولہ بہادر

○

جس گھڑی تیرے آستاں سے گئے
ہم نے جانا کہ دو جہاں سے گئے

تیرے کوچہ میں نقشِ پا کی طرح
ایسے بیٹھے کہ پھر نہ واں سے گئے

شمع کی طرح رفتہ رفتہ ہم
ایسے گذرے کہ جسم و جاں سے گئے

ق

ایک دن میں نے یار سے یہ کہا
اب تو ہم طاقت و تواں سے گئے

ہنس کے بولا کہ سُن لے اے آصف
یہی کہہ کہہ کے لاکھوں جاں سے گئے

آفتاب

شاہ عالم بادشاہ دھلی

○

بعدِ مجنوں کیوں نہ ہوں میں کاملِ غم ہائے حزیں
عشق کی سرکار سے ملبوس رُسوائی ملا

خوب سا یہ جلنے گا دیکھ اے سروِ چمن
اس کی رعنائی سے مت تو اپنی زیبائی ملا

جل گیا پروانہ جس دم محفل آرائی کے ساتھ
خاک میں سب شمع نے دی محفل آرائی ملا

طالعِ بیدار کی منت اُٹھانے بھی نہ دی
اس سے شب ہم کو تمنا خواب میں لائی ملا

اپنی قسمت میں ازل سے تھی لکھی سرگشتگی!
گرد و باد آسا جو کارِ دشت پیمائی ملا

واہ وا! رحمت ہے اس کو اور مجھ کو آفریں
راہ میں بن کر عصا جو خارِ صحرائی ملا

دستگیری بھی نہ کی تو نے کہ جوں نقشِ قدم!
خاک میں میں تیری خاطر اے توانائی ملا

سرکشی اے چرخ مت کر دیکھ ہیبتِ آفتاب

احسان

منشی احسان علی شاہجہانپوری

○

اس کو نہ سوچئے کہ ستم یا کرم ہوا
خنجر اُٹھائیے! سرِ تسلیم خم ہوا

توڑا ہمارے دل کو بتوں نے ستم ہوا
وہ بھی انہیں کا قول، انہیں کی قسم ہوا

اپنی گلی میں دیکھ کے ہم ہو رہے ہیں خوش
نقشِ امید، یار کا نقشِ قدم ہوا

کیسا مری وفا نے پشیمان کر دیا
آنکھیں بھی اُن کی جھک گئیں، غصہ بھی کم ہوا

دونوں طرف سے کب وہی دل ایک جان ایک
ہم پہ ستم ہوا، تو تمہیں پر ستم ہوا

محرومِ عیش میری طرح دوسرا کہاں
دل میں سرورِ وصل بھی آیا، تو غم ہوا

احسان ضبط کرنے سے اٹھلے رازِ عشق
دل سے بہت ہوا، مگر آنکھوں سے کم ہوا

احسن

میرزا احسن

○

نہ نالہ ہے دل میں نہ آہِ حزیں ہے
کوئی دم ہے یاں، سو دمِ واپسیں ہے

گئے دن جو آنکھوں سے بہتے تھے دریا
ادھر دیکھ لو، خشک اب آستیں ہے

گیا دل جو کوچہ میں چیں بر جبیں کے
نہ پھر واں سے نکلا عجب سرزمیں ہے

قدم رکھ نہ اپنا مرے دل سے باہر
کہا مان میرا، یہ گھر دل نشیں ہے

نہ کھینچ آسماں پر تو سر اپنا احسن
کہ آخرش سب کا مدفن زمیں ہے

اختر

نواب واجد علی شاہ

○

چاک چاک اپنا گریباں نہ ہوا تھا، سو ہوا
وحشتِ دل کا جو ساماں نہ ہوا تھا، سو ہوا

یا خدا دَیر میں ساماں نہ ہوا تھا، سو ہوا
کافرِ عشق مسلماں نہ ہوا تھا، سو ہوا

رُخِ انور سے میں حیراں نہ ہوا تھا سو ہوا
کبھی اے زلف! پریشاں نہ ہوا تھا، سو ہوا

ظلم و جور اے شبِ ہجراں! نہ ہوا تھا، سو ہوا
خانۂ گور میں مہماں نہ ہوا تھا، سو ہوا

چشمِ نصاف سے طوفاں نہ ہوا تھا، سو ہوا
دلِ اختر پشیماں نہ ہوا تھا، سو ہوا

اثر

نواب سید امداد امام

○

سُنا حالِ دل، پر کہا کچھ نہیں
مگر کان دھر کر سنا کچھ نہیں

نہ گل پہ ہے جوبن، نہ بلبل کو جوش
چمن کی وہ اگلی ہوا کچھ نہیں

عبادت خدا کی بہ امیدِ حور
مگر تجھ کو زاہد حیا کچھ نہیں

خدا ان سے بندوں کو اپنے بچائے
کہ نزدیک جن کے خدا کچھ نہیں

حسینوں کے انداز مت پوچھیے
جفا ہی جفا ہے، وفا کچھ نہیں

بتوں کی پرستش کہاں تک اثر
مگر تجھ کو خوفِ خدا کچھ نہیں

ارشد

میرزا عبدالغنی گورگانی

○

الٰہی جان دی ہے میں نے کس کے رُخِ روشن پر
ہزاروں شمعیں پروانہ بنی ہیں میرے مدفن پر

تعجب کیا خمیدہ ہو اگر تلوار قاتل کی!
چڑھا ہے خون کس کس بے گنہ کا اس کی گردن پہ

وہ بے انصاف، اور اپنی وفا کی داد یا قسمت!
گمانِ دوستی ہے سادگی سے ہم کو دشمن پر

عجب اس جلوۂ یکتا میں نیرنگِ تماشا ہے
نئی صورت سے چمکا خاطرِ شیخ و برہمن پر

میں ہوں مرہونِ منت شمعِ گل کا جب سے اے ارشد
یقین دوستی ہونے لگا ہے مجھ کو دشمن پہ

اسد

میر امانی

○

پی کر شراب، دُردِ تہِ جام دے گیا
وہ شوخ ہم کو بوسہ بہ پیغام دے گیا

آیا جو مے کشی کو چمن میں وہ بادہ نوش
ہر ایک گُل کے ہاتھ میں اک جام دے گیا

کھانے کو غم ہے پینے کو خوں، دیکھنے کو داغ
سب عشق کا وہ ہم کو سرانجام دے گیا

کل لڑ گیا کہ اور یہ عاشق ہے تُو اسد
آیا ہے جب وہ یاں تو اک الزام دے گیا

اسمٰعیل

مولوی محمد اسمٰعیل میرٹھی

○

جو بھلے بُرے کی اٹکل نہ مرا شعار ہوتا
نہ جزائے خیر پاتا نہ گناہ گار ہوتا

مَے بے خودی کا ساقی مجھے ایک جُرعہ بس تھا
نہ کبھی نشہ اترتا نہ کبھی خمار ہوتا

میں کبھی کا مر بھی رہتا، نہ غمِ فراق سہتا
اگر اپنی زندگی پہ مجھے اختیار ہوتا

یہ جو عشق جانستاں ہے یہ جو بحرِ بیکراں ہے
نہ سُنا کوئی سفینہ کبھی اس سے پار ہوتا

کبھی بھول کر کسی سے نہ کرو سلوک ایسا
کہ جو کوئی تم سے کرتا، تمہیں ناگوار ہوتا

ہے اس انجمن میں یکساں عدم و وُجود میرا
کہ جو میں یہاں نہ ہوتا یہی کاروبار ہوتا

اسیر

مظفر علی

○

آہ کب لب پر نہیں ہے داغ کب دل میں نہیں
کون سی شب ہے کہ گرمی اپنی محفل میں نہیں

بزم کی کثرت سے اندیشہ مرے دل میں نہیں
دل میں اس کی ہے جگہ میرے جو محفل میں نہیں

پنجۂ مژگان تم نے یہ اڑائیں دھجیاں!
تار باقی ایک بھی دامانِ ساحل میں نہیں!

خونِ ناحق کا ہمارے داغ مٹنے کا نہیں
تیغ میں ہوگا، اگر دامانِ قاتل میں نہیں

پردہ دارِ چہرۂ یوسف نہیں ہے ہر نقاب
حُسنِ لیلےٰ جلوہ گر ہر ایک محمل میں نہیں!

نجد کا صحرا عجب صحرائے وحشت خیز ہے
قیس کیا لیلےٰ کو بھی آرام منزل میں نہیں!

جس طرف بھی چاہے کا میرا نکل جاؤں گا میں
سینکڑوں دروازے ہیں حلقے سلاسل میں نہیں

حد سے باہر پاؤں جو رکھتا ہے ہوتا ہے خراب
گھر میں جو راحت مسافر کو ہے منزل میں نہیں

ڈوبتے جاتے ہیں کیونکر لوگ حیرت ہے مجھے
قدِ آدم آب بجز تیغِ قاتل میں نہیں

ہم غریبوں کا خدا ہے، ناخدا درکار کیا
طالبِ ملاح کشتی دستِ ساحل میں نہیں

ہوگیا دہشت سے ایسا بسملوں کا خون خشک
[illegible]

افسوس

میر شیر علی

○

سمند گرم جولاں اس سوار کا پہنچا
غبار تا فلک اس خاک سار کا پہنچا

تو لک بتا کہ مجھے اتنی کیوں ہے بے چینی
مگر پیام کسی بے قرار کا پہنچا

ملے ہے پاؤں سے اپنے وہ لالہ رو ہر دم
یہ مرتبہ تو دل داغ دار کا پہنچا

ہے یاں تلک تو نزاکت کہ گلوں کے گجرے سے
چھلنے لگتا ہے اس گلعذار کا پہنچا

قفس سے چھٹنے کی اُمید ہی نہیں افسوس
حصول کیا ہے جو مژدہ بہار کا پہنچا

اشتیاق

علی اللہ سرہندی

○

خیال دل کو ہے اس گل سے آشنائی کا
نہیں صبا کو ہے دعویٰ جہاں رسائی کا

کہیں وہ کثرت عشاق سے گھمنڈ میں آ
ڈروں ہوں میں کہ نہ دعویٰ کرے خدائی کا

مجھے تو روکے تھا زاہد پر اک نگاہ سے آج
غرور کیا ہوا وہ تیری پارسائی کا

جہاں میں دل نہ لگانے کا یہ ہے پھر کوئی نام
بیاں کروں میں اگر تیری بے وفائی کا

نہ چھوڑا مار بھی کھا کر گزر گلی کا تری
رقیب کو مرے دعویٰ ہے بے حیائی کا

نہیں خیال میں لاتے وہ سلطنت جم کی
غرور ہے جنہیں در کی ترے گدائی کا

خیالِ یار سے مت اشتیاق پھیر کے منہ
خیال کیجو کہیں اور جبہ سائی کا

الم

صاحب میر

○

دھمکاتے ہیں بس مجھ کو فقط آپ اکڑ کر
بانکے ہو تو مونڈھا چلو مونڈھے سے رگڑ کر

ہنگام فغاں تھا خس و چنبہ قفس و دام
تار رگ گل نے ہے رکھا ہم کو جکڑ کر

جب نام خدا دور سے وہ جلوہ نما ہو
مر جائیں صنموں کی سبھیں حیرت سے پچھڑ کر!

منزل کا تو کیچ اٹھا بیٹھے گا اے شیخ
پہنچا سکے نہ کچھ پھلنگا نہ دوں سے بکڑ کر

کہتا ہے دکھ درد بھلانے کو الم یاں
کیا اس سے سوا تم ہو اٹھاتے جو لڑ کر

امانت لکھنوی

○

شب فرقت میں نالوں نے جہاں سر پہ اٹھایا ہے
زمیں کو زلزلہ ہے آسماں چکر میں آیا ہے

حساب آب و دانہ حشر میں ہوگا، تو کہہ دوں گا
پیا ہے عمر بھر خون جگر، غم میں نے کھایا ہے

شفق پھولی ہے دیکھو شام کو شہر بدخشاں میں
لب رنگیں پہ مسی مل کے اس نے پان کھایا ہے

مری تربت پہ تانا چاندنی میں کیوں ہے گیرو
یہ کس نے چادر مہتاب میں دھبہ لگایا ہے!

نہیں بے وجہ پیہم ہچکیاں آتی ہیں فرقت میں
کسی محبوب کو تو اے امانت یاد آیا ہے!

آمانی

میر امانی

○

اس کے کوچہ ستی غبار اُٹھا
کون ساواں سے خاکسار اُٹھا

عندلیبو! بسا لو اب بسترا
باغ سے موسمِ بہار اُٹھا

ہچکیاں لے کے گلابیاں روئیں
بزم سے جب یہ مے گسار اُٹھا

عزمِ رخصت ہوا جب ہی اس کا
میرے دل سے وہیں قرار اُٹھا

نہیں جو قدرِ اشک عالم سے
موتیوں کا مگر وقار اُٹھا

شمع سے سوز آمانی پوچھا ترا
اک دھواں اس کے دل سے یار اُٹھا

امید

قزلباش خان

○

یار بن گھر میں عجب صحبت ہے
در و دیوار سے اب صحبت ہے

دل ہمارا اسے کہتا ہے رات
غیر سے جو سرِ شب صحبت ہے

دردِ دل اس سے جو ہم نے نہ کہا
ایسی حالت ہوئی کب صحبت ہے

دہر میں پاسِ نفس لازم ہے
شیشہ و سنگ یہ سب صحبت ہے

دستِ اغیار ہے زیرِ سرِ یار!
آج امید کہ عجب صحبت ہے

امیرؔ

نواب محمد یار خان

○

سُرخ چشم اتنی کہیں ہوتی ہے بیداری سے
لو اُترا ہے تری آنکھوں میں خونخواری سے

وقتِ رخصت کے ترے اے مرے جی کے دشمن
تھام تھام آج دکھا دل کو میں کس خواری سے

بس میں آیا جو تمہارے اسے چاہو سو کرو
کیا ستم آدمی سہتا نہیں لاچاری سے

کس نے نظروں میں خدا جانے اسے ڈالا
نرگس آج آنکھ اُٹھاتی نہیں بیماری سے

کیا کہوں ولولۂ شوق کو تیرے میں امیرؔ
مر میں جاتے ہیں پہلے تو خبرداری سے

امینؔ

خواجہ امین الدین

○

جس کا دل آپ نے لیا ہوگا
خاک میں لے ملا دیا ہوگا!

ہم کو کیا گر بہار آتی ہے
دل وُہ غنچہ نہیں کہ وا ہوگا

گالیاں غیر سے سُناتے ہو!
ہاں میاں! تم سے اور کیا ہوگا

مل گیا ہوگا خاک میں مجنوں اشک
تیری آنکھوں سے جو گرا ہوگا

انجام

عمدۃ الملک امیر خان

○

ٹک تو دے فرصت کہ ہولیں رخصتِ صیاد ہم
مدتوں اس باغ کے سائے میں تھے آزاد ہم

منہ تکا کرتے ہیں سب اقلیمِ حسن و عشق کے
تو ہی بتلا دے کریں کس سے تری فریاد ہم

دل تو ہے داغِ غلامی سے ترے طاؤس وار
سامنے قمری کے ہیں گو سرو ساں آزاد ہم

اب کسی نے دل جلایا مہربانی سے تو کیا
عمر، مانندِ شرر، جب کر چلے برباد ہم

ساتھ اپنے سر کے تھا انجامؔ پاسِ تمکنت
شکر ہے! تڑپے نہ زیرِ خنجرِ فولاد ہم

انیسؔ لکھنوی

○

سدا ہے فکرِ ترقی بلند بینوں کو
ہم آسمان سے لائے ہیں ان زمینوں کو

یہ جھریاں نہیں ہاتھوں پہ ضعفِ پیری نے
چنا ہے جامۂ اصلی کی آستینوں کو

لگا رہا ہوں مضامینِ نو کے پھر انبار
خبر کرو مرے خرمن کے خوشہ چینوں کو

بھلا تردّدِ بیجا سے ان میں کیا حاصل
اٹھا چکے ہیں زمیندار جن زمینوں کو

خیالِ خاطرِ احباب چاہیے ہر دم
انیسؔ ٹھیس نہ لگ جائے آبگینوں کو

سحر

شیخ امداد علی

○

آنکھ کھلتے ہی میسر ہوا دیدارِ قفس
موئے خزاں مری قسمت سے ہوئے تارِ قفس

ہم اسیروں کے اگر تیرِ نظر کاری ہیں
ہو گی دیوارِ چمن صورتِ دیوارِ قفس

کہے دیتی ہے بنائے قفسِ تابوتی
مر گئے پر بھی نہ چھوٹیں گے گرفتارِ قفس

ہم صفیرو! کوئی کیا جانے اسیری کا مزا
میں چمن بیچ کے ہوتا ہوں خریدارِ قفس

مدتیں ہوئے زنداں سے جو مر کر نکلے
گور میں نقلِ مکاں کرتے ہیں بیمارِ قفس

برق لکھنوی

○

کیا کیا ہوا نہ دامنِ دولت سے چھوٹ کر
مر گیا فراق میں حسرت سے چھوٹ کر

آنکھیں ترس رہی ہیں زیارت کے واسطے
دم بند ہے حضور کی خدمت سے چھوٹ کر

آتا نہیں قرار دلِ بے قرار کو
غم میں پھنسا ہوں دامِ محبت سے چھوٹ کر

آخر تڑپ تڑپ کے گئی جانِ مضطرب
ہرگز نہ ہم بچے کسی صورت سے چھوٹ کر

کیا برق منہ دکھاؤں کہ آتی ہے مجھ کو شرم
[illegible]

بسمل

سید امین الحسن موہانی

○

پہلے سے دیکھنا کہیں بہتر بنائیں گے
اب اپنا ایک اور مقدر بنائیں گے

بگڑے ہوئے ہیں منہ پہ ہیں کون آج کیا کہے
اس وقت بات بات کے دفتر بنائیں گے

دیکھیں گے اپنے دل کے تحمل کی کیفیت
ہم ان کو اور چھیڑ کے خود سر بنائیں گے

آنے تو دو بہار کا موسم، جنوں کے دن
اپنے لئے ہم آپ ہی نشتر بنائیں گے

بسمل چمن میں آج دریار تک صنم و
پژمردہ دل کو تیرے گُل تر بنائیں گے

بقاء

شیخ بقاء اللہ

○

رہرواں کہتے ہیں جس کو، جرس محمل ہے
محنت راہ سے نالاں وہ ہمارا دل ہے

موج سے بیش نہیں ہستیٔ وہمی کی نمود
صفحۂ دہر پہ گویا یہ خط باطل ہے

کچھ تعین نہیں اس راہ میں جوں ریگ رواں
جس جگہ بیٹھ گئے اپنی وہی منزل ہے

آئیں حشر کے دن خون سے تر ہو جس کی
یہ یقیں جانیو اس کو کہ مرا قاتل ہے

کھول دو عقدۂ کونین بقاؔ کے یک بار
یا علی تم کو یہ آساں ہے اسے مشکل ہے

بہار

گلشن الدولہ

○

اٹھو گلے سے لپٹ جاؤ، پھر نکھر لینا
تمام رات پڑی ہے بناؤ کر لینا

یہ لوٹنا، یہ مرا درد، یاد کر لینا
کبھی کبھی تو کلیجہ پہ ہاتھ دھر لینا

ہمارے ساتھ ہے تیرا بھی امتحاں اے تیر
تڑپ کے دل جو نکل جائے، تو جگر لینا

ڈرے تو کٹ نہ سکے گا کبھی گلا میرا
یہی خوشی ہو تو آنکھوں پہ ہاتھ دھر لینا

گناہگار پہ یارب نزولِ رحمت کر
ترا خزانہ جو خالی ہو مجھ سے بھر لینا

بہار روز یہ کم بخت منہ کو آتا ہے
کدھر چلا ہے مرا دل، ذرا خبر لینا

بیباک

سید حسین احمد شاہجہانپوری

○

ہر ایک سانس ہے تیغِ نگاہِ یار مجھے
دیا ہے شوق نے وہ لطفِ انتظار مجھے

فدا ہوا ہوں یہ میں کس سے محبت میں
ہوا نہ مر کے بھی مرنے کا اعتبار مجھے

یہ مدعا ہے کہ ہو ہر بلا کا اس میں گزر
اسی لئے تو دیا ہے دلِ فگار مجھے

کمی وفا میں اگر ہو، تو وہ جفا نہ کرے
صلاح دیتے ہیں کیا کیا صلاح کار مجھے

سکونِ دل کی تمنا، یہ عشق کا دعویٰ
اسی لئے وہ ستاتے ہیں بار بار مجھے

نگاہِ غیر سے دیکھا اسے تو کیا دیکھا
کہ ہے ابھی مرے مرنے کا اعتبار مجھے

یہ امتحان ہے پیرایۂ تغافل میں
ملا دے خاک میں اے آہِ شعلہ بار مجھے

اسی ادا سے کہ او میرے ڈھونڈنے والے
کہاں ہے تو؟ یونہی اک بار پھر پکار مجھے

وفائے عہد، دمِ نزع، اے جزاک اللہ
اب آپ جائیے! آ جائے گا قرار مجھے!

سزا ملے نہ ملے جرمِ عشق پہ لیکن
وہ جانتے تو ہیں اپنا گناہگار مجھے

عجیب لطف ہے باتوں کا دل سے اے بیباک
ملا ہے خوب محبت میں رازدار مجھے

تجلّی

میاں خاجی

○

طرب کا رنگ، رُخِ گل پہ آشکار آیا
کلی سی کھل گئی جوں ہی وہ گلعذار آیا

تڑپ کے جان نکل جائے گی ابھی صیّاد
نہ کہیو باغ میں پھر موسمِ بہار آیا

ملائیں خاک میں مر مر کے، آہ! پر تو بھی
نہ بے قراریٔ دل کے تئیں قرار آیا

مری وفا پہ تجھے روز شک تھا اے ظالم
یہ سر یہ تیغ ہے، صاحب تو اعتبار آیا

یہ شوق دیکھو پسِ مرگ بھی تجلّی نے
کفن میں کھول دیں آنکھیں سنا جو یار آیا

بیتاب عظیم آبادی

○

حسن و ادا کی بحث کہو تو کہاں تک پہنچے
پھر حقیقت بھی ہے انساں کی کہاں تک پہنچے

عشق کے شعلے بھڑک کر لبِ جاں تک پہنچے
آگ سی آگ ہے یہ آگ جہاں تک پہنچے

لو گئی ان سے نظر کھو گئے ابروؤں کے
مرکزِ عشق کے یہ تیر و کماں تک پہنچے

دل سے باہر ہو تو اظہارِ لبِ گل کے
یعنی وہ بات نہیں ہے کہ زباں تک پہنچے

اے حسد نگہِ ناز تو رتبہ ہے بلند
سر جھکا دو تو مرا گر نوکِ سناں تک پہنچے

کوئی دیوانگیٔ عشق کا قصہ چھیڑے
سلسلہ اس کا خدا جانے کہاں تک پہنچے

سرِ ہر خار بیاباں یہ پتہ دیتی ہے
کہ ادھر سے ترے دیوانے یہاں تک پہنچے

شب پُر کیف بہ یک گردشِ چشمِ ساقی
غایتِ دانش کوئی مکاں تک پہنچے

رُخ سے پردہ کو ہٹا حسنِ یقیں تک پہنچا
ہم تو انساں ہیں یہاں حق بھی کہاں تک پہنچے

راہ میں اور بھی دیوانوں سے ملتے جاتے
پوچھتے پوچھتے ہم اُن کے مکاں تک پہنچے

شربتِ دید نہ ہو تیغ کا پانی ہی سہی
کوئی ٹھنڈک تو مرے قلبِ تپاں تک پہنچے

لے گئے عشق کی بازی بصفائی بیتاب
جان پر کھیل گئے جانِ جہاں تک پہنچے

تسکینؔ

میر حسین

○

کیجئے دفن نہ اس کوچہ میں احباب مجھے
خاک میں دل کی کدورت نے دیا داب مجھے

ہجر میں پاس نہ ہے زہر نہ خنجر افسوس
نہ دئے موت کے بھی چرخ نے اسباب مجھے

قاصد آیا ہے وہاں سے تو ذرا تھام اے ہوش
بات تو کہنے دے اس سے دل بیتاب مجھے

نام تسکیں ہو یہ مضمون تپش نازیبا،
تا تخلص ہو سزاوار تو بیتاب مجھے

تسلّیؔ

لالہ ٹیکا رام

○

عالم اس بت پہ مبتلا ہی رہا
ان میں فدوی بھی اک فدا ہی رہا

اُٹھ گئی دوستی زمانے سے
آشنائی، نہ آشنا ہی رہا

نہ سُنی تو نے ایک بات کبھو
ہم کو اس بات کا گلا ہی رہا

تم خفا ہی رہے تسلّیؔ سے
اور وہ تم پہ نت فدا ہی رہا

تشنہ

محمد علی

○

آنکھ پڑتی ہے کہیں پاؤں کہیں پڑتا ہے
سب کی ہے تم کو خبر، اپنی خبر کچھ بھی نہیں

شمع ہے، گل بھی ہے، بلبل بھی ہے، پروانہ بھی
رات کی رات یہ سب کچھ ہے سحر کچھ بھی نہیں

عشق کی دھوم ہے سب کہتے ہیں یوں ہے یوں ہے
فتنہ ہے اک تری ٹھوکر کا مگر کچھ بھی نہیں

نیستی کی ہے مجھے کوچۂ ہستی میں تلاش
سیر کرتا ہوں اُدھر کی کہ جدھر کچھ بھی نہیں

لامکاں میں بھی تو اک جلوہ نظر آتا ہے
بے کسی میں تو ادھر ہوں کہ جدھر کچھ بھی نہیں

ایک آنسو بھی اثر جب نہ کرے اے تشنہ
فائدہ رونے سے اے دیدۂ تر کچھ بھی نہیں

تنہا

محمد عیسیٰ

○

ہم سے کرتے ہو بیاں غیروں کی یاری آن کر
رہ گئی ہے آپ کی یہ دوست داری آن کر

ہم کو آنے سے تمہاری بزم کے کیا تھا حصول
دیکھ لیتے تھے مگر صورت تمہاری آن کر

رُوٹھنے پر میرے کیا لازم تھا ہو جانا خفا
بلکہ کرنی تھی تمہیں خاطر ہماری آن کر

طعنِ بدخواہاں سے تو اک دم نہ پاوے گا قرار
کی جو تیرے در پہ ہم نے بے قراری آن کر

تھا اگرچہ غش میں مجنوں لیکن آنکھیں کھل گئیں
سر پہ اس کے جس گھڑی لیلیٰ پکاری آن کر

جس جگہ کشتہ کا تیرے لاشہ تھا خوں میں پڑا
خوب سا رویا وہاں ابرِ بہاری آن کر

میں بھی کیا برگشتہ طالع ہوں کہ تنہا رات کو
پھر گئی در سے مرے اس کی سواری آن کر

ثاقب

نواب شہاب الدین خان

○

ہم توت جذبِ دل دکھائیں
اور پھر وُہ ہمارے گھر نہ آئیں

کیا چیر کے سینہ دل دکھائیں
کچھ حال سُنو تو ہم سُنائیں

اے بخت کہاں تلک بُرائی
اے چرخ! کہاں تلک ستائیں

ہم سینہ سپر کیے کھڑے ہیں
وُہ شوق سے خنجر آزمائیں

جو کام میں غیر کے ہوئیں صرف
افسوس وہ دل رُبا ادائیں

شاید کہ ہے گرمِ نالہ ثاقب
چلتی ہیں شوفشاں ہوائیں

جوآن

مرزا نعیم بیگ

○

یہ ان دنوں جو ہم سے اتنی رُکھائیاں ہیں
شاید کسی نے باتیں کچھ کچھ سُجھائیاں ہیں

اے عندلیب! سچ کہہ، کیا فصلِ گُل پھر آئی
فوجیں جنوں کی ہم پر کیسی چڑھ آئیاں ہیں

کس بے ادب نے تم سے گُل بازی آج کی ہے
منہ پر تُمہارے چوٹیں کیا سخت آئیاں ہیں

دیوار و در کی چھاتی سُوراخ ہو گئی ہے
کیا روزنوں سے اس نے آنکھیں لڑائیاں ہیں

پیوستہ ابرو اس کی ہیں دیکھ کر یہ سمجھا
دو شاخیں ہیں کہ جھک کر ملنے کو آئیاں ہیں

جوشش

شیخ محمد روشن

○

یاں غمی اپنا کسے اے یار نہ دیکھا
ہے کوئی جسے تیرا طلب گار نہ دیکھا

سوتوں کو جگایا مرے نالے نے ولیکے
پر طالع خوابیدہ کو بیدار نہ دیکھا

کل بزم میں سب پر نگہ لطف و کرم تھی
اک میری طرف تو نے ستمگار نہ دیکھا

جز چشم بتاں میکدۂ دہر میں جوشش
ہم نے تو کسی مست کو ہشیار نہ دیکھا

حزیں

میر محمد باقر

○

مری رنگیں کلامی کا ہے وہ گل پیرہن باعث
کہ ہووے بلبلوں کی خوش صفیری کا چمن باعث

کوئی ہوتا ہے سنگ سینہ خسرو سے رقیبوں کا
ہوا ناحق ہلاک اپنے کا آپ ہی کوہ کن باعث

بھڑکتا ہے کسی سے انس سے وحشت آتی ہے
مری صحرا نشینی کا ہے میرا من ہرن باعث

حزیں ان شعلہ رخساروں سے جی کو مت لگا ہرگز
ہوئی آخر کو پروانے کے جلنے کی لگن باعث

حسامیؔ

مرزا اسلم الدین حیدر

○

گئی یک بیک جو ہوا پلٹ نہیں دل کو اپنے قرار ہے
کروں عرض ستم کا میں کیا بیاں مرا غم سے سینہ فگار ہے

دلے شہر دہلی یہ تھا چمن کہ تھا سب طرح کا یہاں امن (؟)
وہ خطاب اس کا تو مٹ گیا، فقط اب تو اُجڑا دیار ہے

یہ رعایا ہند تبہ ہوئی کہوں کیا جو ان پہ جفا ہوئی
جسے دیکھا حاکمِ وقت نے، کہا یہ تو قابلِ دار ہے

شب و روز پھولوں میں جو تُلیں وہ یوں خارِ غم سے فگار ہوں
پڑے طوق قید میں جب انہیں کہیں بدلے گل کے یہ ہار ہے

جو سلوک اور دہی کرتے تھے وہی اب ہیں کتنے ذلیل و خوار
وہ ہیں تنگ چرخ کے جبر سے، نہ تن پہ ان کے نہ تار ہے

یہ زمانہ ہے وہ بُرا فلک، چلو بچ کے سب سے الگ الگ
نہ رفیق کوئی کسی کا یاں، نہ کسی کا کوئی بھی یار ہے

کیا حسامی ڈر تجھے حشر کا، جو خدا رکھے ہے تجھے برملا
تجھے ہے وسیلہ رسول کا وہی تیرا حامیٔ کار ہے

حسینؔ

سید صادق علی

○

ایسا بھی نہیں درد کے مارے نہیں دیکھے
ہم نے گل و بلبل کے نظارے نہیں دیکھے

جب میں نے کہا مرتا ہوں منہ پھیر کے بولے
سنتے تو ہیں پر عشق کے مارے نہیں دیکھے

ہر سمت پھرے خاک اُڑاتا کئے برسوں
پر نقشِ قدم ہم نے تمہارے نہیں دیکھے

پوشیدہ ہیں کس حد میں مری خاک کے ذرّے
پتھر میں بھی اس طرح اشارے نہیں دیکھے

تُربت میں مرے بندِ کفن کھول کے بولے
ہم نے دہنِ زخم تمہارے نہیں دیکھے

اب قبر پہ آئے ہو تو اس سمت بھی دیکھو
ہاں نیچی نگاہوں کے اشارے نہیں دیکھے

بے چین ہے دل فصلِ بہاری میں حسینؔ کا
اب تک کسی گل رو کے اشارے نہیں دیکھے

حیا

مرزا رحیم الدین

○

موت ہی چارہ سازِ فرقت ہے
رنج مرنے کا، پھر کراہت ہے

ہو چکا وصل، وقتِ رخصت ہے
اے اجل! جلد آ، کہ فرصت ہے

سوز کی داد کون دیوے گا
ظلم کرنا تمہاری عادت ہے

کارواں عمر کا ہے رخت بدوش
ہر نفس بانگِ کوسِ رحلت ہے

سانس اک پھانس سی کھٹکتی ہے
دم نکلتا نہیں مصیبت ہے

تم بھی اپنے حیا کو دیکھ آؤ
آج اس کی کچھ اور حالت ہے

حیراں

میر حیدر علی

○

گر یہی وضع ہے اور ہیں یہی ہیہات نصیب
تو ہمیں ہو چکی بس اس سے ملاقات نصیب

ہم لبِ گور ہوئے خوں ہے جگر اس غم سے
کبھی اس غنچہ دہن سے نہ ہوئی بات نصیب

صبح ہر روز اسی غم میں ہمیں ہوتی ہے شام
آہ! جاگیں گے مرے کون سی اب رات نصیب

کچھ ہمیں شکوہ نہیں جور سے تیرے ہرگز
ہم ہمیشہ سے ہیں اے جان! کچھ آفات نصیب

مسجدوں میں پھرے سبحہ پھراتے حیراں
شیخ جی پر نہ ہوئی تم کو کرامات نصیب

خاکسار

محمد یار

○

تھا زلیخا کو جو جاں سے مہِ کنعان عزیز
ہم نے بھی تجھ سے تو بے مہر نہ کی جان عزیز

ل بجے قتل کر اس دشمنِ دیں کافر نے
بولا لوگوں سے یہ تھا مردِ مسلمان عزیز

کیوں نہ وہ مصحفِ رُو جاں سے مجھے ہووے زیاد
کس مسلماں کو نہیں دین اور ایمان عزیز

خاکسار عرش سے بھی دیکھا پرے تیرا مزاج
آپ میں آ، ذرا اپنے تئیں پہچان عزیز

خلیق

میر مستحسن

○

اشک جو چشمِ خوں فشاں سے گرا
تھا ستارا کہ آسماں سے گرا

آتشِ گل پہ جل کباب ہوا
رات بلبل جو آشیاں سے گرا

شیشۂ دل تو چور ہو جاتا
کوئی پتھر نہ آسماں سے گرا

میں نے آنکھوں سے لے لیا ہی گر
پھول جو دستِ باغباں سے گرا

ہنس دیا یار نے جو رات خلیق
کھا کے ٹھوکر اس آستاں سے گرا

دلیر

سید امیر حسن مارہروی

○

عزت اسی کی اہلِ نظر کی نظر میں ہے
سب کچھ لبِ بشر میں ہے جو محبت بشر میں ہے

کیا پوچھتے ہو، جوہرِ تیغِ نگاہِ ناز
یہ اس سے تیز ہے جو تمہاری کمر میں ہے

قاصد! سوالِ وصل سُنیں اور وُہ چُپ رہیں
کیا کیا نہ شانِ بے خبری اس خبر میں ہے

کیا جانے کس سوال کا جیسا ہے یہ جواب
اک تیر، اک چھری، کف پنہا بسر میں ہے

اور ایک بار قلب کو تڑپائے وُہ نگاہ
اتنی سکت ابھی تو ہمارے جگر میں ہے

اے دل! کسی کی یاد بھی اور اضطراب بھی
اتنا نہیں خیال کہ مہمان گھر میں ہے

گھبرائے کیوں نہ کشمکشِ نزع سے دلیر
چلا یہ اتفاق اسے عمر بھر میں ہے

دیوانہ

رائے سرب سنگھ

○

جب نہ تب سنئے تو کرتا ہے وہ اقرار بغیر
گفتگو ہم سے اسے، پہ نہیں انکار بغیر

بزم میں رات بہت سادہ و پُر فن تھے، ولے
گرمیٔ بزم کہاں اس بتِ عیّار بغیر

دیکھ بیمار کو تیرے، یہ طبیبوں نے کہا
ہو چکی اس کو شفا شربتِ دیدار بغیر

جان پر آبنی ہمدم میری، خاموشی سے
بات کچھ بن نہیں آتی ہے اب اظہار بغیر

جس کی خاطر کے لئے یار سب اغیار ہوئے
کیونکر دیوانہ بھلا رہئے اب اس یار بغیر

راسخ

حافظ عبدالرحمٰن

○

کہاں تھے شب؟ ادھر دیکھو، حیا کیوں ہے نگاہوں میں
اثر ظاہر ہے یہ کہ تو مجھے جھوٹے گواہوں میں

سنا وہ یوں گر میں تیرہ بخت کان میں کہہ دوں
مؤذن بت کدہ میں ہوں، برہمن خانقاہوں میں

نظر مجھ سے چرا کر، منہ چھپا کر کہتے جاتے ہیں
کہ یہ چوری بھی لکھی جائے گی تیرے گناہوں میں

سیہ کاری مری بن جائے رشکِ گیسوئے خوباں
قیامت کو چھپا بیٹھا رہوں یارب گناہوں میں

وہی راسخ تو ہیں کل تک جو مے خانے کے درباں تھے
بنے بیٹھے ہیں حضرت چار دن سے دیں پناہوں میں

راقم

خواجہ قمرالدین

○

بات کیونکر بنے امید بر آئے کیوں کر
نالہ پُر شور نہیں، آہ شرر بار نہیں

آج آتے ہیں مرے شکووں کا لینے وہ حساب
خیر ہے، ہاتھ میں ان کے کوئی تلوار نہیں

مجھ سے نفرت سہی، فرقت کش آزار تو ہوں
غیر پھر غیر ہے، وہ خوگرِ آزار نہیں

جوشِ مستی میں چلے آئے کہاں تم راقم
یہ تو مسجد ہے چلو، خانۂ خمار نہیں

رخشاں

نواب ضیاء الدین خاں

○

پی کے گرنے کا ہے خیال ہمیں
ساقیا! لیجیو سنبھال ہمیں

شب نہ آئے جو اپنے وعدے پر
گزرے کیا کیا نہ احتمال ہمیں

تیرے غصے نے ایک دم میں کیا
مردۂ صد ہزار سال ہمیں

دل میں مضمر ہے مستی باقی
کسی صورت نہیں زوال ہمیں

طالع بد سے نیّر رخشاں
اپنے ہی گھر میں ہے وبال ہمیں

رسا رامپوری

○

ساقی جو دے نہ جائے یہ کہہ کر کہ پیے جا
تو میں بھی پیے جاؤں یہ کہہ کر کہ دیے جا

جانے کی جو ضد ہے تو مجھے زہر دیے جا
اتنا تو کہا مان لے اتنا تو کیے جا

کچھ اور نہ کر مجھ پہ جفائیں تو کیے جا
کچھ اور نہ لے میری دعائیں تو لیے جا

کیا لذت تعزیر نے مجبور کیا ہے
آ آ کے یہی جی میں کہ تقصیر کیے جا

کم بخت رسا تیری رسائی نہیں ان تک
تو خوب سا اسلام کو بدنام کیے جا

رشک

میر علی اوسط

○

جو رنج نوشتہ میں ہے کیونکر نہ ملے گا
لکھوائیں گے نامہ، تو کبوتر نہ ملے گا

جس رات نقاب اس مہ کامل نے اُلٹ دی
تاروں کو نشانِ مہِ انور نہ ملے گا

ابر شب فرقت ہے بندھے آنسوؤں کا تار
اس طرح کا وقت لئے ثمرۂ تر نہ ملے گا

کاہیدگی جسم اگر یوں ہی رہے گی
ہم کو بھی ہمارا تنِ لاغر نہ ملے گا

انصاف کو سمجھو خضرِ راہِ ہدایت
اے رشک، اب ایسا کوئی رہبر نہ ملے گا

رشکی

نواب محمد علی خان

○

غصہ آتا ہے پیار آتا ہے
غیر کے گھر سے یار آتا ہے

مے پلانی اگر نہیں منظور
ابر کیوں بار بار آتا ہے

تیرے رونے سے اب مجھے بھی ہے خوف
دیدۂ اشک بار آتا ہے

دردِ دل کیا بیاں کروں رشکی
اس کو کب اعتبار آتا ہے

زکی

نواب محمد زکریا خاں

○

اسیری میں تباہی رونق کاشانہ ہوجائے
نفس ہی نالوں سے جل کر چراغِ خانہ ہوجائے

تغافل، ساز گارِ شوقِ اہلِ درد کیا ہوگا
ولے وہ فریب ایسا کہ دل دیوانہ ہوجائے

نہ کہنا غیر سے قاصد کہ میں مطلب نہیں سمجھا
پیامِ یار ہے بے معنیٔ بیگانہ ہوجائے

میں کیوں حضرت موسیٰ کی بیتابی کے ہم پردہ
کہ رازِ دل زباں پر آئے اور افسانہ ہوجائے

ہاں تک ضبطِ بیتابی دلِ مسکیں مجھے ڈر ہے
زی خوئے تحمل سے وہ بے پروا نہ ہوجائے

ناں کرتے ہوئے جا پہنچا اس کی بزمِ عشرت میں
بھی تو اسے زکی یہ شوخیٔ رندانہ ہوجائے

سجاد

میر سجاد اکبر آبادی

○

دل ہو گیا پھپھولا پیارے تمام جل کے
کیا تجھ نہال سے ہوں امیدوار پھل کے

تنہا نہ دل مرے نے زلفوں سے تاب کھایا
گلشن کے بیچ سنبل کھاتا ہے تاب بل کے

ایسے ترے چمکتے دانتوں کو دیکھ پیارے
پانی ہو جائے موتی مارے نہ کیوں کہ جھلکے

کیا جانتا تھا مجھ کو رسوا کریں گے سب یہ
یہ طفلِ اشک میرے آنکھوں کے بیچ پل کے

سحر بھوپالی

○

سینہ میں دل ہے، دل میں داغ، داغ میں سوز و سازِ عشق
پردہ بہ پردہ ہے نہاں پردہ نشیں کا رازِ عشق

باندھ کے صف ہوں سب کھڑے تیغ کے ساتھ سر جھکے
آج تو قتل گاہ میں دھوم سے ہو نمازِ عشق

کوہ پہ جانِ کوہکن، دشت میں جانِ قیس لی
ہل بے تری چڑھائیاں اُف رے یہ ترکتازِ عشق

نام و نشاں مٹا چکے شوقِ جفا و ذوقِ جور
جان و جگر جلا چکے سوزِ دل و گدازِ عشق

پردہ میں رہ کے الحذر گوشہ میں چھپ کے الاماں
ہم کو خبر ہے ہو گیا حُسن سے سازبازِ عشق

سر کو کٹا کے لوٹ لی دولتِ وصل سرمدی
تیغ کے گھاٹ قطع کی ہم نے رہِ درازِ عشق

خاص خدا کا وہ مقام دل میں خدا کے اُس کا گھر
عرش سے کچھ بلند ہے دیکھ یہ بے نیازِ عشق

فرش زمیں پہ مصطفےٰ عرش بریں پہ کبریا
پہنچا ہے دیکھنا کہاں سلسلۂ درازِ عشق

سلیمان

نواب سلیمان شکوہ

○

ساقیا! ہے یہ جام کا عالم
جیسے ماہِ تمام کا عالم

کبک رفتار اپنی بھول گئے
دیکھو اس کے خرام کا عالم

اب خدا پھر ہمیں نہ دکھلائے
شبِ ہجراں کی شام کا عالم

تجھ پہ ہے ان دنوں میں نام خدا
کچھ عجب دھوم دھام کا عالم

شاد

مہاراجہ سرکشن پرشاد

○

بادۂ خم خانۂ توحید کا مے نوش ہوں
چور ہوں مستی میں ایسا بے خود و مدہوش ہوں

لو بھرنے دے مجھے ساقی، یہ میرا فرض ہے
مثلِ ساغر دور میں ہوں، بادۂ سرجوش ہوں

طرزِ خاموشی مری بتلاتی ہے اس راز کو
ہوں نوا سنجِ حقیقت گو کہ میں خاموش ہوں

دردمندِ عشق ہو کر ضبط کا خوگر ہوں میں
صورتِ سیماب ہو کر پیکرِ خاموش ہوں

کس کی فرقت، وصل کس کا اور ہے معشوق کون
شاد میں اس عالمِ تمکیں کا ہم آغوش ہوں

شاد

حکیم سید محمد غازی پوری

○

بلبل کو پھر چمن میں لگا لائی بوئے گل
اے کاش ہوتی گلبدنوں میں بھی خوئے گل

دل داغ داغ اس میں خیالِ خرامِ ناز
جس طرح اڑتی پھرتی ہو گلشن میں بوئے گل

عاشق ہی جب نہیں تو خزاں ہے بہارِ حسن
بلبل کے ساتھ ساتھ گئی آبروئے گل

رازِ محبت اور دلِ غنچہ، تا بہ کے
نکلے گی بو کے پردے میں ہر آرزوئے گل

او شاد سیرِ گل سے بھی نفرت ہوئی انھیں
بے گر کہ بوئے محبت ہے بوئے گل

شرر

مولوی عبدالحلیم لکھنوی

○

کیا سن سیجے ہو، کہیں دھبا چھٹا نہ ہو
ظالم یہ میرا خون ہے رنگِ حنا نہ ہو

یارب! مجھے ہے داغِ تمنا بہت عزیز
پہلو سے دل جُدا ہو، مگر یہ جدا نہ ہو

ہیں نکالتا ہے یہی سوز و ساز کی
پہلو میں دل نہ ہو تو کوئی حوصلا نہ ہو

تم اور وفا کرو، یہ نہ مانوں گا میں کبھی
اس کو فریب دو، جو تمہیں جانتا نہ ہو

کیا کیا شرر ذلیل ہوئے، آبرو گئی!
ایسا بھی عاشقی کا کسی کو مزا نہ ہو

شفق عماد پوری

○

دل تڑپ جائے نہ کیوں سُن کر فغانِ اہلِ درد
ان سے پوچھو، جو سمجھتے ہیں زبانِ اہلِ درد

ایک سے اک بڑھ کے ہے دلچسپ، دلکش، دلستاں
حالِ دل، افسانۂ غم، داستانِ اہلِ درد

یہ تو کہئے مُنہ سے اک اُف تک کسی نے کی کبھی؟
لے چکے ہیں آپ اکثر امتحانِ اہلِ درد

ہاتھ دھو لے جان سے کوئی، تو بھی صبر کرتے
جاں نثارِ اہلِ دل ہے، داستانِ اہلِ درد

کس کے آگے دردِ دل اپنا کہو گے تم شفق
کوئی دُنیا میں نہیں اب قدردانِ اہلِ درد

شوق

شیخ احمد علی ہمدانی

○

رُوٹھ کر کیج ناز ہے اپنا وقار دیکھ کر
اُس نے چڑھائیں تیوریاں میرا قرار دیکھ کر

قصہ طول نہ تھا مگر، حشر میں جوشِ شوق سے
ہاتھ مرا نہ رک سکا، دامنِ یار دیکھ کر

دیکھ کے ایک بار انہیں دل سے تو ہاتھ دھو چکے
دیکھئے کیا گزرتی ہے دوسری بار دیکھ کر

آتے ہیں وہ تو پہلے ہی رنج سے صاف ہو رہیں
آکے کہیں پلٹ نہ جائیں دل میں غبار دیکھ کر

مجھ کو بجا نہ شوق ابھی، نیتِ زندگی بخیر!
ہم بھی چلیں گے تیرے ساتھ اب کی بہار دیکھ کر

وصل سے گنتے اے خدا! ہاں یہ شگون چاہیئے
صبح کو ہم اٹھا کریں روئے نگار دیکھ کر

شیدا

مسیح الملک حکیم اجمل خان

○

کچھ بات ہی تھی ایسی کہ تھامے جگر گئے
ہم اور جاتے بزمِ عدو میں مگر گئے

یہ تو خبر نہیں کہ کہاں اور کدھر گئے
لیکن یہاں سے دُور کچھ اہلِ سفر گئے

ارماں جو ہم نے جمع کئے تھے شباب میں
پیری میں وہ خدا کو خبر ہے کدھر گئے

رتبہ بلند ہے مرے داغوں کا اس قدر
میں جن میں یہ داغ مرے تا قمر گئے

رخسار پر ہے رنگِ حیا کا فروغ آج
بوسے کا نام میں نے لیا وہ نکھر گئے

دنیا بس اس سے اور زیادہ نہیں ہے کچھ
کچھ روز ہیں گزارنے اور کچھ گزر گئے

جانے لگا ہے دل کی طرف ان کا ہاتھ اب
نالے شبِ فراق کے کچھ کام کر گئے

حسرت کا یہ مزا ہے کہ نکلے نہیں کبھی
ارماں نہیں ہیں وہ کہ شب آئے سحر گئے

بس ایک ذاتِ حضرتِ شیدا کی ہے یہاں
دہلی سے رفتہ رفتہ سب اہلِ ہنر گئے

صبا

لالہ کانجی مل

○

سحر جب بسترِ راحت سے وُہ رشکِ قمر اُٹھا
غلامی اُس کی میں خورشید لے تیغ و سپر اُٹھا

ابھی تسکیں ہوئی تھی اک ذرا فریاد و زاری سے
لگا دل مضطرب ہونے کہ پھر دردِ جگر اُٹھا

گلے پہ میرے خنجر پھیرتا وہ اَور بھی لیکن
ہوئی مجھ سے خطا اتنی کہ میں فریاد کر اُٹھا

نہیں معلوم اے یارو صبا کے دل میں کیا آیا
ابھی جو بیٹھے بیٹھے وُہ یکایک آہ کر اُٹھا:

صفیر

سیّد فرزند احمد بلگرامی

○

شگفتہ ہو کے بیٹھے تھے وہ اپنے بے قراروں میں
تڑپ بجلی کی پیدا ہو گئی پھولوں کے ہاروں میں

کیا اندھیر اپنے رنج نے، ان کی کدورت نے
بجھی شمعِ محبت ہائے وہ دل کے غباروں میں

شبِ فرقت کو زاہد سے سوا مر مر کے کاٹا ہے
کرے مشہور ہم کو بھی خدا شب زندہ داروں میں

یہ کس نے کشتۂ تیغِ تبسم کر دیا مجھ کو
مبارک باد کا غُل ہو رہا ہے سوگواروں میں

وہ عشرت جس کا ساماں ہے دل میں، ہو نہیں سکتی
مری مجبوریوں کو دیکھئے اِن اختیاروں میں

ہمیں وہ ڈھب جو آجاتا، تمہیں پہ آزماتے ہم
دلِ عشاق تم کیا کہہ کے لیتے ہو اشاروں میں

صفیر اب بس کرو! کب تک سرِ شوریدہ زانو پہ
غزل کی فکر کیونکر ہو سکے گی انتشاروں میں؟

ضیا

میر ضیاء الدین

○

دل رُبا ہے مرا بڑا گستاخ
میں لے آتا نہ سمجھا تھا گستاخ

اب تو وہ شوخیاں لگا کرنے
یک بیک ایسا ہو گیا گستاخ

ناز بے جا کبھی نہ کرتا تھا
یک بیک ایسا ہو گیا گستاخ

جاں فشانی ہم اس پہ کرتے ہیں
رام ہرگز نہ وہ ہوا گستاخ

اے ضیا کیجو سمجھ کے کلام
وہ صنم تو ہے بے وفا گستاخ

صنعت

شیخ کریم الدین مراد آبادی

○

وصل کی شب میں بھی ہم ! ہمدگر رویا کیے
میں جدائی سے وہ میرے حال پر رویا کیے

اُس نے زانو غیر کا اپنے رکھا جب زیر سر
اپنے زانو پہ ہم اپنا رکھ کے سر رویا کیے

اُس نے آنسو غیر کے پونچھے جب اپنے ہاتھ سے
ہمنشیں ! یہ ماجرا ہم دیکھ کر رویا کیے

ہو گیا مشکل مری مژگاں سے مژگاں کا ملاپ
حائل اک دریا ہوا ہم اس قدر رویا کیے

سرخرو بے آبروئی میں بھی ہیں صنعت سے
خشک جب آنسو ہوئے لخت جگر رویا کیے

طاہرؔ

فرخ آبادی

ب یا میں حسینوں سے ہم گوشہ گیر ہیں
ت زُروں نے لوٹ لیا ہے فقیر ہیں

ن بچائے زہرہ جبینوں کی چاہ سے
نے ہیں وہ فرشتے ابھی تک اسیر ہیں

ٹھیں ہنسنے کی ہیں تو غصہ نہ کیجیے
ئی نہیں، فقیر نہیں، راہ گیر ہیں

ہ تمہارے بیٹھے ہیں، سر پہ ہے آفتاب
خاکسار مالکِ تاج و سریر ہیں

بھی تو روئیں اسے اثرِ گریہ ایک دن
ن کی نگاہ میں مرے آنسو حقیر ہیں

دیں گے صاف صاف وہ، دیکھیں تو آئنہ
نمہ ہے لکیر ہم اس پہ فقیر ہیں

روں سے کیا گرائیں گے طاہرؔ عدو مجھے
لیں خدا سے دستِ خدا دستگیر ہیں

عاجزؔ

عارف الدین خاں

عرق جب اس پری کے چہرۂ پُر نور سے ٹپکے
خجل ہو گُل سے شبنم، جُوں لہو ناسُور سے ٹپکے

مری آنکھوں سے خونیں اشک یُوں گرتے ہیں پلکوں پہ
لہو نیزوں کے اوپر جُوں سرِ منصور سے ٹپکے

اگر کیفِ سخن میرا نہالِ تاک کو پہنچے
صراحی شاخ بن جائے، شراب انگور سے ٹپکے

اگر اس زلفِ مشک آمیز سے چینی میں بال آوے
عجب نئیں قطرۂ عنبر کاسۂ فغفور سے ٹپکے

کروں فریاد رو رو یار کو جب یاد کر عاجزؔ
دمِ اسرافیل کا لوہو ہو بانگِ صور سے ٹپکے

ضیاؔ

میر ضیاء الدین

○

دل رُبا ہے مرا بڑا گستاخ
مَیں نے اتنا نہ سمجھا تھا گستاخ

اب تو وہ شوخیاں لگا کرنے
یک بیک ایسا ہو گیا گستاخ

ناز بے جا کبھی نہ کرتا تھا
یک بیک ایسا ہو گیا گستاخ

جاں فشانی ہم اس پہ کرتے ہیں
رام ہرگز نہ وُہ ہُوا گستاخ

اے ضیاؔ کیجو سمجھ کے کلام
وہ صنم تو ہے بے وفا گستاخ

صنعت

شیخ کریم الدین مُراد آبادی

○

وصل کی شب میں بھی ہم باہمدگر رویا کیے
میں جدائی سے وہ میرے حال پر رویا کیے

اُس نے زانو غیر کا اپنے رکھا جب زیرِ سر
اپنے زانو پہ ہم اپنا رکھ کے سر رویا کیے

اُس نے آنسو غیر کے پونچھے جب اپنے ہاتھ سے
ہمنشیں! یہ ماجرا ہم دیکھ کر رویا کیے

ہو گیا شکل مری مژگاں سے مژگاں کا ملاپ
حائل اک دریا ہُوا، ہم اس قدر رویا کیے

سرخرو بے آبروئی میں بھی ہم صنعتؔ ہے
خشک جب آنسو ہوئے لختِ جگر رویا کیے

طاہر

فرخ آبادی

○

ب نیا میں حسینوں سے ہم گوشہ گیر ہیں
ت ٹروں نے لوٹ لیا ہے فقیر ہیں

ن بجائے زہرہ جبینوں کی چاہ سے
نے ہیں دو فرشتے ابھی تک اسیر ہیں

ھیں ہنسنے کی ہیں تو غصہ نہ کیجیے
ئل نہیں، فقیر نہیں، راہ گیر ہیں

تمہارے بیٹھے ہیں، سر پہ ہے آفتاب
خاکسار مالکِ تاج و سریر ہیں

بھی تو رو میں لے اثر گریہ ایک دن
ن کی نگاہ میں مرے آنسو حقیر ہیں

ریں گے صاف صاف دیکھیں تو آئینہ
ھے لکیر ہم اس پہ فقیر ہیں

غروں سے کیا گرائیں گے طاہر عدو مجھے
فضل خدا سے دست خدا دستگیر ہیں

عاجز

عارف الدین خان

○

عرق جب اس پری کے چہرۂ پر نور سے ٹپکے
خجل ہو گل سے شبنم، جوں لہو ناسور سے ٹپکے

مری آنکھوں سے خوں میں اشک یوں گرتے ہیں پلکوں پر
لہو سولی کے اوپر جوں سرِ منصور سے ٹپکے

اگر سیف سخن میرا نہالِ تاک کو پہنچے
ہری شاخ بن جاوے، شراب انگور سے ٹپکے

اگر اس زلفِ مشک آمیز سے چینی میں بال آوے
عجب نہیں عطر و عنبر کاسۂ فغفور سے ٹپکے

کرے فرہاد رو رو یار کو جب یاد کر عاجز
دمِ اسرافیل کا لوہو تو بانگ صور سے ٹپکے

عارف

حکیم نواب جان خان

○

لذتِ کیف نگاہ و ناز نہیں
دل ہی خود نیشتر نواز نہیں

جانتا ہوں تری نگاہ کو میں
اور پھر آشنائے راز نہیں

ہائے وہ دل کہ بے قرارِ خلش
وائے وہ سر کہ سرفراز نہیں

آ، بتاؤں تجھے میں راز کی بات
راز یہ ہے کہ کوئی راز نہیں

اب یہ عالم ہے تیرے غم کی خیر!
ہوش و مستی میں امتیاز نہیں

واقفِ رازِ ہر دو عالم ہوں
کیا کروں حکمِ شرحِ راز نہیں

آہ! مسجد میں پڑ رہیں عارف
درِ مے خانہ آج باز نہیں

عبرت

اکبر حسین موہانی

○

دل ہے، نہ نشان بے دلی کا
کیا وقت پڑا ہے بے کسی کا

دیکھا کیے راستہ کسی کا
تھا شغل یہ اپنی زندگی کا

پروائے کرم، نہ شکوۂ غم
اللہ رے دماغ! بے دلی کا

میں اور یہ بے نیازیٔ شوق
احسان ہے جوشِ بے خودی کا

مرنا، مرنے کی آرزو میں
حاصل ہے یہ اپنی زندگی کا

آنسو بھر آئے، دل بھر آیا
گر نام بھی سن لیا خوشی کا

آخر عبرت نے جان دے دی
کچھ پاس کیا نہ بے کسی کا

قدرت

شاہ قدرت اللہ

○

رگز یہ برقِ خاطرِ مایوس ہے — جو شرر دل سے اٹھا سو جلوۂ طاؤس ہے

ت تو کبھی کے کوچ یاں کر گئے — اب دو دن کا ننگ ہے اور خیمۂ ناموس ہے

پنے ہوا دل ہے کاوش مدام — ہم پیش ایں شمع کی برقِ دلِ فانوس ہے

ق

ہاں مجھے ترغیب دیتی تھی مجھے — کیا ہے ملکِ روم کیا ہی سرزمینِ روس ہے

ہو تر کیا جو سیر کیجے زندگی — اس طرف تو اہلِ اسلام اودھر صدائے کوس ہے

نہ شام ہوتا ہے مکھڑوں کا دور — شب جو کی تو ماہ رویوں کی کنار و بوس ہے

و عبرت یہ بولی اک تماشا میں تجھے — چل دکھاؤں تو نہ قیدِ آز کا محبوس ہے

لیا بگی گر غریباں کی طرف — جس جگہ جا تن تنہا سو محرومِ مایوس ہے

ز زمیں دکھلا کر لگی کہنے مجھے — یہ سکندر ہے یہ دارا ہے یہ کیکاؤس ہے

یں سے کر جاہ و حکم دنیا سے آج — کچھ بھی ان کے پاس غیر از حسرت افسوس ہے

تہ پردے کے ہیچ تو ہیں الاپ — گر صدائے بانگ ہے در نغمۂ ناقوس ہے

کل تو قدرت اپنے غم رکھے تھی تسبیح رہا

آج رہن جام ہے، یہ خرقۂ سالوس ہے

قلق

آفتاب الدولہ لکھنوی

○

ادا سے دیکھ لو، جاتا رہے گلہ دل کا
بس اک نگاہ پہ ٹھہرا ہے فیصلہ دل کا

وہ ظلم کرتے ہیں مجھ پر، تو لوگ کہتے ہیں
خدا بُرا کرے، نہ ڈالے معاملہ دل کا

پھرا جو کوچۂ قاتل سے کوئی پوچھیں گے
سنا ہے لٹ گیا رستے میں قافلہ دل کا

ہزار فصلِ گل آئے جنوں! وہ جوش کہاں
گیا شباب کے ہمراہ ولولہ دل کا

بہار آتے ہی کُنجِ قفس نصیب ہوا
ہزار حیف کہ نکلا نہ حوصلہ دل کا

الٰہی خیر ہو! کچھ آج رنگ بے ڈھب ہے
ٹپک رہا ہے کئی دن سے آبلہ دل کا

خدا کے ہاتھ ہے اب اپنے تعلق انصاف
بُتوں سے حشر میں ہوگا مقابلہ دل کا

فدوی لاہوری

○

رکتے ہیں کوئی ہاتھ چلے یا زباں چلے
ہم داد خواہ ساتھ ہیں اس کے، جہاں چلے

کیا ہمسری ہو تیر کی اس تیرِ آہ سے
وہ، یہ ہی تیر ہے کہ سدا بے کماں چلے

سر پہ تو دھر کے نعش ہماری کو تا مزار
ہر اک قدم پہ روتے ہوئے خونفشاں چلے

لائے تھے سر پہ دھر کے کس اخلاص سے ہمیں
بس آنکھ اوجھل ہوتے ہی اے دوستاں چلے

یاروں نے اپنی راہ لی فدوی ہمیں رہے
وہ چیز اب کہاں ہے کہ پوچھے کہاں چلے

فراق

ثناء اللہ

○

غیر کے دل میں نہ جا کیجے گا
میری آنکھوں میں رہا کیجے گا

کاسۂ چشم کو لے در پہ ترے
بے نوایانہ صدا کیجے گا

زائرانِ حرم و دیر کبھو
میرے حق میں بھی دعا کیجے گا

وائے اس اپنی سیہ بختی پر
خواہشِ زلفِ رسا کیجے گا

فقیر

میر شمس الدین

○

دردمندوں سے نہ پوچھو کہ کدھر بیٹھ گئے
تیری مجلس میں غنیمت ہے جدھر بیٹھ گئے

بے غرض دید سے یاں کام تکلف سے نہیں
خواہ اِدھر بیٹھ گئے ، خواہ اُدھر بیٹھ گئے

دیکھا ہووے گا مرے اشک کا طوفاں تم نے
وہ کہ دیوار گرے، سینکڑوں گھر بیٹھ گئے

کس نظر باز نے اس باز کو بخشی پرواز
سینکڑوں مرغ ہوا جھاڑ کے پر بیٹھ گئے

کب ہے آواز ترے کوچے کے باشندوں کی
نالہ کرنے سے گلے ان کے مگر بیٹھ گئے

منت اُٹھنے کے نہیں یار کے کوچے سے فقیر
جب کہ بستر کو جما، کھول کمر بیٹھ گئے

قدر

سید غلام حسین بلگرامی

○

ہوئے کارواں سے جدا جو ہم، رہِ عاشقی میں فنا ہوئے
جو گرے تو نقشِ قدم بنے جو اُٹھے تو بانگِ درا ہوئے

جو ہوا سے زلف بکھر گئی، نظر ان کی صاف بدل گئی
جو اسیرِ حلقۂ ناز تھے، وہ قتیلِ تیغِ ادا ہوئے

ہوا بعدِ وصل عجب مزا کہ خموش بیٹھے جدا جدا
ہمہ تن میں صبر و سکوں ہوا، ہمہ تن وہ شرم و حیا ہوئے

اُٹھے ہم جو خواب و خیال سے لگے کہنے دیدۂ حال سے
کہ وہ کب اُٹھے، وہ کدھر گئے، ابھی پاس تھے ابھی کیا ہوئے

جو نگہ ہے چشمِ سیاہ میں، وہی برقِ طور ہے راہ میں
تری آنکھ پر جو فدا ہوئے، وہ شہیدِ راہِ خدا ہوئے

بنے قدر ایسے غبار ہم، ہوئے گردشوں میں وہ خوار ہم
کہ مثالِ دائرۂ فلک، جو اُٹھے تو بے سر و پا ہوئے

عشق عظیم آبادی

ہم نے تو خاک بھی دیکھا نہ اثر رونے میں
عمر کیوں کھوتے ہو، اے دیدۂ تر رونے میں

رات کب آئے تم اور کب گئے، معلوم نہیں
جان! اتنی نہ رہی ہم کو خبر رونے میں

جب تلک اشک تھیں، بیٹھ! اگر آیا ہے
تیری صورت نہیں آتی ہے نظر رونے میں

تجھ کو اے دیدۂ تر شغل ہے رونا لیکن
ڈوبا جاتا ہے یہاں دل کا نگر رونے میں

عالم عشق میں مجنوں بھی بڑا کاڑھا تھا
یار مجنوں سے بھی ہم کاڑھے ہیں پر رونے میں

عظیم

مرزا عظیم بیگ

گل چشم خوں فشاں سے گلزار پیرہن تھا
دامن کا تھا جو تختہ، اک تختۂ چمن تھا

کیجو عظیم کو بھی یارب غریقِ رحمت
آوارۂ جنوں سا اک صاحبِ سخن تھا

اور معنی بند ایسا، ہندی زباں کا صاحب
ہندوستان سے لے کر مشہور تا دکن تھا

اک دن جو گھر سے نکلا خطِ شعاع آسا
بکھرا ہوا بدن پر ہر تارِ پیرہن تھا

دیکھا جو دفن کرتے جوں شمع پہ ہو فانوس
تربت میں دور تن سے بالشت بھر کفن تھا

گستاخ

کرامت اللہ خاں رامپوری

○

ساغر میں شکلِ دخترِ رز کچھ بدل گئی
خم سے نکل کے نور کے سانچے میں ڈھل گئی

صد سالہ دورِ چرخ تھا ساغر کا ایک دور
نکلے جو مے کدے سے تو دنیا بدل گئی

کہتی ہے نیم وا یہ چمن کی کلی کلی
فریادِ عندلیب کلیجہ مسل گئی

ساقی ادھر اٹھا تھا ادھر ہاتھ اٹھ گئے
بوتل سے کاگ اڑا تھا کہ رندوں میں چل گئی

انگڑائی لے کے اور بھی وہ سوئے چمن سے
پھولوں کی پنکھیا جو نسیم آکے جھل گئی

دامن میں دختِ رز نے لگایا ضرور داغ
جب پارسا کی گود میں جا کر مچل گئی

گھبرا کے بھولے نامۂ گستاخ تو نہیں
جب ان کے پاس کوئی ہماری غزل گئی

کمال

شاہ کمال الدین

○

جوں قدم یار نے گھر سے مرے در پر رکھا
سر رکھا زانو پہ میں، ہاتھ جگر پر رکھا

ہم کو صیاد نے رکھا جو قفس میں تو آہ
دستِ شفقت کبھی ظالم نے نہ سر پر رکھا

سنگ وہ اس کی گلی کا جو کوئی ہاتھ آیا!
شکلِ گل میں نے اٹھا کے سر پر رکھا

بیٹھے بیٹھے تجھے کون آگیا یاد آج کمال!
تو نے رومال جو لے دیدۂ تر پہ رکھا

گویا

نواب فقیر محمد خاں

○

اس کو غصہ پیشہ کہہ آتے ہیں ہم
بھول جانا یاد دلواتے ہیں ہم

ضعف سے رہتا ہے اب پاؤں پر سر
آپ اپنی ٹھوکریں کھاتے ہیں ہم

دل نہیں اس بت کی الفت چھوڑتا
ناسمجھ کو لاکھ سمجھاتے ہیں ہم

ہے جنازہ اس لیے بھاری مرا
حسرتیں دل کی لیے جاتے ہیں ہم

بارِ عصیاں سر پہ ہے گویا بہت
کیا اٹھائیں سر، جھکے جاتے ہیں ہم

مائل

مرزا محمد یار بیگ

○

اختر سے تھے جو موتی اس کان کے بالے کے
اک چاند بھی جھمکے تھا جھرمٹ میں دوشالے کے

فانوس میں کب دکھلائی یوں شمع کے شعلے کو
جھلکے ہے بدن اس کا یوں کرتے میں ململ کے

جوں کان میں ہے تیرے یہ موتیوں کا بالا
کب گرد ستارے ہیں یوں چاند کے ہالے کے

وہ زلف جو ڈس جاوے تو خاک بچے کوئی
بچتے ہیں کہیں مائل کاٹے ہوئے کالے کے

محبت

شیخ ولی اللہ

○

ت نے گلابی جو اُٹھا مُنہ سے لگائی
شیشے میں عجب آن سے جھلکے تھی خدائی

یں نشے کے شب مہتاب نے تیرے!
خورشید سے مکھڑے نے طلبات دکھائی

ے ملنے کی قسم کھاتے ہو پیارے
چھپتی نہیں وہ بات جو ہو دل سے بنائی

! ہیں عشق کی سب بھولی ہوئی چال
کافر تری رفتار نے پھر یاد دلائی!

تو بھرا شیشہ جھکاتا ہے نشے میں
ڈرتا ہوں کہ تیری نہ مڑک جائے کلائی

نہ مدہوش ہوا عشق میں تیرے
چار ابروؤں کی لے کے فقیرانہ صفائی

رٹ کیں تو نہ ہو دیدار خدا کا
ہے روزِ قیامت، تری اک شب کی جدائی

رُتب سلطنت ہر دو جہاں ہے
گر یار کے کوچہ کی میسر ہو گدائی!

محنت

مرزا حسین علی

○

ناصح! یہ نصیحت نہ سنا، میں نہیں سنتا
بک بک کے مرا مغز نہ کھا میں نہیں سنتا

احوال مرا دھیان سے سنتا تھا، ولیکن
کچھ بات جو سمجھا، تو کہا، میں نہیں سنتا

اُس بت نے جو غیروں پہ کیا لطف تو یارو!
مجھ سے نہ کہو بہرِ خدا، میں نہیں سنتا

کچھ ذکر میں ذکر اپنا میں لایا تو وہ بولا
بس بات کو اتنا نہ بڑھا میں نہیں سنتا

شکوہ سے ہی کرتا ہے جو کوئی اس سے مرا ذکر
تو کہتا ہے ہر اک کا گلا میں نہیں سنتا

محنت کو ہے یہ ضعف کہ کچھ اپنی حقیقت
کہتا ہے وہ مجھ سے، تو ذرا میں نہیں سنتا

محوی

مولوی محمد حسین لکھنوی

○

صلائے عام ساقی ہے کہ آؤ با صفا کر دُوں
فنا کی مے پلا کر مست و مدہوش بقا کر دُوں

تقاضائے وصالِ یار ہے تفتیح روحانی!
جو قابو ہو تو اپنی جان و دل تم پہ فدا کر دوں۔

مری رنگیں بیانی منحصر ہے ذکرِ جاناں پر
مضامینِ معرفت کے جس طرح چاہوں ادا کر دوں

بتم ہے، سر جھکا کر، مسکرا کر یار کا کہنا!
ملے خون دلِ عاشق تو میں ترکِ حنا کر دوں

خیالِ غیر سے نفرت دلِ عاشق کو لازم ہے
محبت ان کی کہتی ہے کہ ترکِ ماسوا کر دوں

صدائے نالۂ پیہم، صدائے صور ہے گویا
کہو تو میں ابھی ہنگامۂ محشر بپا کر دُوں

تمہیں آئینۂ وحدت میں دیکھو شانِ محبوبی
میں اے محوی یہ عقدہ راز کا کس طرح وا کر دُوں

مروت

صغیر علی

○

کیوں تُو نے وا کیا تھا بندِ قبا چمن میں
اُڑتی پھرے ہے بلبل گل سے خفا چمن میں

ہر سمت اب صبا جو پھرتی ہے خاک اُڑاتی
بلبل کے پر پڑے ہیں کیا جا بجا چمن میں

نرگس کی آنکھ تجھ پر پڑتی ہے بے طرح سی
مت وقت شام جانا بہرِ خدا چمن میں

جوں لالہ داغِ دل یاں بھر جل اُٹھا ہے شاید
جاتا ہے سیر کرنے وہ بے وفا چمن میں

جیب اپنا گل نے پھاڑا بلبل کو کی مروت
کیوں اپنے غم کا قصہ تو نے کہا چمن میں

مضطر

حکیم اسد علی خاں

○

تیری نگاہِ ناز جو ناوک اثر نہ ہو
تکلیفِ چارہ سازیِ زخمِ جگر نہ ہو

مجھ سے بھی کچھ سوا ہے انہیں میری آرزو
یہ شوق وہ نہیں جو اِدھر ہو، اُدھر نہ ہو

میں اور مجھ کو وعدۂ دیدار کی امید
وہ چاہتا ہوں آج کہ جو عمر بھر نہ ہو

اے برقِ حسنِ یار ذرا چشمِ التفات
یوں جل بجھوں کہ مجھ کو بھی میری خبر نہ ہو

کعبہ میں ہے نشاں نہ کہیں دیر میں پتہ
تیری گلی میں مضطرِ آشفتہ سر نہ ہو

معروف

مرزا الٰہی بخش

○

آہ! وہ کون تھا خدا مارا
جس نے اس سے مجھے لگا مارا

ایک ہے تو بھی بدبلا اے چشم!
دل کو پھر زلف میں پھنسا مارا

کیا غضب تھی وہ جنبشِ ابرو
صاف جس نے کہ نیچا مارا

بعدِ مدت ملے تھے کل ان سے
آج لوگوں نے پھر لڑا مارا!

وصل کی شب بھی میں نہ سویا آہ
شبِ ہجراں کے خوف کا مارا

مقتولؔ

مرزا ابراہیم بیگ

○

بتاں جب کہ زلفِ دوتا باندھتے ہیں
گرہ میں دلِ مبتلا باندھتے ہیں

نہیں بنتی بلبل سے اپنی چمن میں
ہم اب آشیانہ جُدا باندھتے ہیں

جفا کھینچیں گے پر نہ ہاریں گے جی کو
یہ ہم تم سے شرطِ وفا باندھتے ہیں

ق
گرہ دے کے سر پہ جو بالوں کا جُوڑا
یہ نازک بدن خوش ادا باندھتے ہیں

ہر اک تار میں اس کے دل ہائے عشاق
ہم جستجو کر کے لا باندھتے ہیں!

میاں حالِ مقتول دیکھا نہیں کیا
کمر آپ کس پر بھلا باندھتے ہیں!

منتؔ

میر قمر الدین

○

مدعی اس سے سخن ساز یہ سالوسی ہے
پھر تمنا کو بیاں مژدۂ مایوسی ہے

میری ہی طرح جگر خوں ہے ترا مدت سے
اے حنا کس کی تجھے خواہشِ پابوسی ہے

آہ اے کثرتِ داغِ غمِ خوباں! کہ مدام
صفحۂ سینہ پُر از جلوہ طاؤسی ہے

تہمتِ عشق عبث کرتے ہیں مجھ کو منت
ہاں یہ عادت ملنے کی خوباں سے تو اک مجوسی ہے

منتظر

میاں نور الاسلام

○

امید ہے کہ مجھ کو خدا آدمی کرے
پر آدمی کرے تو بھلا آدمی کرے

اس طرح وہ فریب سے دل لے گئے مرا
جس طرح آدمی سے دغا آدمی کرے

جاویں نہیں کہ اس کے نکلتی ہے اپنی جان
کیا ایسے بے وفا سے وفا آدمی کرے

مارا ہے کوہ کن نے سر اپنے پہ تیشہ آہ
دل کو لگی ہو چوٹ تو کیا آدمی کرے

کُر کچھ کہا بگڑ کے میں بس اس نے ہنس دیا
کیا ایسے آدمی کا گِلا آدمی کرے!

گزرا میں ایسی چاہ سے اچند ہم نشیں!
بیٹھا کسی کے سر کو لگا آدمی کرے

ہے عشق بد مرض کوئی جاتا ہے مُنتظر
کیا خاک اس مرض کی دوا آدمی کرے

منیر

سید اسمٰعیل حسین شکوہ آبادی

○

آمد تصورِ بُتِ بیداد گر کی ہے
دل کی بھی لُوٹ مار خرابی جگر کی ہے

تقدیر کی کجی ہو کہ ٹیڑھا ہو آسماں
یہ سب عنایت آپ کی ترچھی نظر کی ہے

اک بار تیر مار کے اب تک خبر نہ لی
یارب نگاہ مست یہ کس بے خبر کی ہے

یہ رنگت اور کہاں گلِ تر کو نصیب تھا
اتری ہوئی قبا کسی رشکِ قمر کی ہے

پھر بھی کبھی نگاہِ کرم ہوگی اس طرف
امید آج تک اسی پہلی نظر کی ہے

مہر

مرزا حاتم علی

○

گریباں ہاتھ میں ہے پاؤں میں صحرا کا داماں ہے
بس اب پاؤں ہیں اپنے اور سرِ خارِ مغیلاں ہے

ہمارے دشتِ وحشت ہم کو سے اُڑتی ہے بستی سے
ہمارا عنصرِ خاکی مگر ریگِ بیاباں ہے

سبق کو دیکھتا ہوں رات بھر اور پھر اُلجھتا ہوں
مطوّل، مختصر، وہ شرحِ شعرِ زلفِ پیچاں ہے

جلا آتے یہ پھاؤں کو وصفِ خطِ رویاں ہے
زبانِ خامہ بھی اب تو زبانِ شمعِ سوزاں ہے

نہ کیوں ہم طرز میں پڑھتا غزل اس ماہ کے آگے
مرا استاد کامل مہرِ تابانِ سخنداں ہے

ناظم

نواب محمد یوسف علی خان والئ رامپور

○

میں نے کہا کہ دعویٔ الفت مگر غلط
کہنے لگے کہ ہاں غلط اور کس قد

تاثیرِ آہ و زاریٔ شبہائے تار جھوٹ
آوازۂ قبولِ دعائے سح

سوزِ جگر سے ہونٹ پہ چھالا افترا
شورِ فغاں سے جنبشِ دیوار و در

ہاں سینے سے نالۂ موزونِ دل دروغ
ہاں آنکھ سے تراوشِ خونِ جگ

آجائے کوئی دم میں تو کیا کچھ نہ کیجیے
عشقِ مجاز رسمِ حقیقت نگ

بوس و کنار کیلئے یہ سب فریب ہیں
اظہارِ پاکبازی و ذوقِ نظ

کہنا ادا کو تیغ، خوشامد کی بات ہے
سینے کو اپنے اس کی سمجھنا سپ

شمع میں کیا دھری تھی کہ چپکے سے جل مرے
جانِ عزیز پیشکشِ نامہ ب

ہاں پھر تو کوئی مر کے بھی کرتا ہے کچھ کلام
کہتے ہو جان دی ہے سرِ رہگذ

ہم پوچھتے پھریں کہ جنازہ کدھر گیا
مرنے کی اپنے روز اُڑاتی خب

آیت نہیں، حدیث نہیں جس کو مانیے
ہے نظم و نثرِ اہلِ سخن سر بسر

یہ کچھ سنا جواب میں ناظم ستم کیا

نثار

محمد امان

○

کیا جانے پھلکاری اس گل کی پھبن کا تھا
جو تختۂ دامن تھا، تختہ وہ چمن کا تھا

ہم آگو ہی سمجھے تھے تم گھر کو سدھاروگے
جوں صبح گجر باجا، ماتھا وہیں ٹھنکا تھا

مینا میں نہ ہو جلوہ وہ بادۂ گلگوں کا
جام میں جو کچھ یارو! رنگ اسکے بدن کا تھا

نرگس کو کیا ایسا جھیلا ان آنکھوں نے
ڈھلکا ہی نظر آیا گردن کا جو منکا تھا

ندرت

شعیب احمد میرٹھی

○

نالۂ دل کی صدا، دیوار میں ہے در میں ہے
صورِ محشر میں ہوگا، یا ہمارے گھر میں ہے

یوں تو مرنے کو مروں گا میں، مگر مٹی مری
یا فلک کے ہاتھ میں، یا آپ کی ٹھوکر میں ہے

میں پریشاں ہو کے نکلوں گا، تو اُن کی بزم سے
میری بربادی کا ساماں ہے تو اُنکے گھر میں ہے

وہ اگر دیکھیں تو اب حالت سنبھلتی ہے مری
وہ اگر پوچھیں تو، اب مجھ کو شفا دم بھر میں ہے

یہ نہیں موقع ہنسی کا، تم نظر بدلے رہو
اب قضا میری، اسی بگڑے ہوئے تیور میں ہے

دے دے چلو میں اکٹھی کر کے اے ساقی مجھے
کچھ ابھی تو خم میں ہے شیشے میں ہے ساغر میں ہے

نقدِ جاں لینے کو مقتل میں قضا ندرت مری
بن کے دلہن رونما آئینۂ خنجر میں ہے

نظرؔ

نزہت رائے لکھنوی

○

کاروبارِ عشق کی کثرت کبھی ایسی نہ تھی
دل نہ تھا تو تنگیٔ فرصت کبھی ایسی نہ تھی

اس سے ویرانی حسرت کبھی ایسی نہ تھی
دل میں سناٹا نہ تھا، وحشت کبھی ایسی نہ تھی

ان کے وعدہ پر ہمیں جینا پڑا ہے حشر تک
ورنہ طولانی شبِ فرقت کبھی ایسی نہ تھی

دیکھ ڈالے زندگی میں وصل و فرقت کے طلسم
غم کبھی پایا نہ تھا راحت کبھی ایسی نہ تھی

آپ نے بیمار پرسی کی تو جینا ہے وبال
ورنہ مرنے کی مجھے حسرت کبھی ایسی نہ تھی

با مزہ ہے کس قدر انکار اُن کا وصل میں
تجھ میں اے خونِ جگر لذت کبھی ایسی نہ تھی

دل کو کیا سمجھا دیا نومیدیٔ جاوید نے
پردہ دارِ غم شبِ فرقت کبھی ایسی نہ تھی

زندگی کی کشمکش سے مر کے پائی کچھ نجات
اس سے پہلے اے نظرؔ فرصت کبھی ایسی نہ تھی

نواؔ

ظہور اللہ بدایونی

○

اب اشک تو کہاں ہے جو چاہوں ٹپک پڑے
آنکھوں سے وقتِ گریہ مگر خوں ٹپک پڑے

پہنچی جو اک جھلک ترے دانتوں کی گوہر تک
خجلت سے آب ہو دُرِ مکنوں ٹپک پڑے

طغیانِ سرشک کا تو بیاں کم ہے چشم سے
اک قطرہ آب کا ہو، تو جیحوں ٹپک پڑے

غلبہ ہے بحرِ شعر میں ایسا نواؔ کو اب
دے طبع کو فشار تو مضموں ٹپک پڑے

نیازؔ

شاہ نیاز احمد بریلوی

○

عشق میں تیرے کوہِ غم سر پہ لیا، جو ہو سو ہو
عیش و نشاطِ زندگی چھوڑ دیا، جو ہو سو ہو

عشق کے دریئے ہو، عشق کے مے کدہ میں آ
جامِ فنا و بے خودی اب تو پیا، جو ہو سو ہو

لاگ کی آگ لگ اٹھی، پنبہ طرح سا جل گیا
رختِ وجود جان و تن کچھ نہ بچا، جو ہو سو ہو

ہجر کی سب مصیبتیں عرض کیں اس کے رُوبرو
نازِ و ادا سے مسکرا کہنے لگا، جو ہو سو ہو

دنیا کے نیک و بد سے کام ہم کو نیازؔ کچھ نہیں
آپ سے جو گذر گیا، پھر اسے کیا، جو ہو سو ہو

واقفؔ

شاہ واقفؔ

○

روزِ خزاں چمن میں جو دیکھا ہزار کے
اک مشت پر پڑے تھے تلے شاخسار کے

یاران ہم نشین و رفیقانِ دوستدار
سب آشنا ہیں زندگیِ مستعار کے

جب مُند گئی یہ آنکھ تو اے دوست! بعدِ مرگ
پھٹکے ہے پاس کون کسی کے مزار کے

جو نقش پا ہے سو ہے پھر نہ اُٹھ سکے
واقفؔ کی طرح جائے گرے کوئے یار کے

وحید الٰہ آبادی

کس نے جلوۂ دیدار کے دکھلانے کو
پھونک ڈالے برقِ تجلی مرے کاشانے کو

دیکھیے! کون سی جا، یار کا ملتا ہے پتہ
کوئی کعبے کو چلا ہے، کوئی بت خانے کو

تیری فرقت میں تصور ہے یہ بے دردی کا
خواب ہم جانتے ہیں نیند کے آجانے کو

بعد میرے جو ہوا دشت میں مجنوں کا گزر
رو دیا دیکھ کے خالی مرے ویرانے کو

کام آجاتی ہے ہم رنگی بھی سوزشِ دل کی
شمع ہم رنگ بنا لیتی ہے پروانے کو

آج پھر شہر کے کوچے نظر آتے ہیں اُداس
کس طرف لے گئی وحشت ترے دیوانے کو

اے جنوں تنگ ہوئی وسعتِ صحرا تجھ سے
اب کہاں جائے طبیعت کوئی بہلانے کو

گل پہ بلبل تھا کہیں شمع پہ پروانہ تھا
ہم نے ہر رنگ میں دیکھا ترے پروانے کو

واشدِ دل نہ ہوئی، غنچۂ خاطر نہ کھلا
کون سے باغ میں آئے تھے ہوا کھانے کو

میں نے جب وادیٔ غربت میں قدم رکھا تھا
دور تک یادِ وطن آئی تھی سمجھانے کو

وفا

حکیم عبد الہادی خان رامپوری

ہر رگِ شعلۂ جاں سوز میں نشتر گزرا
نالہ کیوں آبلۂ دل سے اُبھر کر گزرا

میں ہوں دلدارئ افسونِ وفا پہ نازاں
جو رقیبوں پہ نہ گزرا تھا، وہ مجھ پر گزرا

کیا مرے بے رنگ میں طوفاں آیا
جوشِ رنگ انجمنِ ناز سے باہر گزرا

تشنۂ حسرتِ جاوید ہوں میں کیا جانوں
کیوں گلے سے میرے تقاضۂ کوثر گزرا

آؤ! میرے دلِ افسردہ کی تسکین دیکھو
جاؤ! اس کشمکشِ ناز سے میں درگزرا

لٹ گئی جان تو امید کے پہلو ڈھونڈے
مٹ گئی راہ تو اندیشۂ رہبر گزرا

اس تکلف سے کٹی عمرِ گراں، اے وفا
ایک دم سیکڑوں برسوں کے برابر گزرا

ولا
مظہر علی خان

○

ہرگز نہ کریں اس سے اشکِ اثر آلودہ
ہووے نہ کبھی خوں سے جو چشم حیا آلودہ

از بسکہ کلیجے کے ٹکڑے بہے کرتے ہیں
آنکھوں سے مرے آنسو لختِ جگر آلودہ

واں رشکِ چمن اس نے گھر اپنا کیا ہے یاں
رشکِ چمنی سے ہے دیوار و در آلودہ

اک پل میں گنہ جاوے نہ چھوٹیں یہیں سے بھی
ہوتی ہے بڑی ظالم، آہ و ادا آلودہ

بخش اپنے ولا کو بھی از راہِ کرم یارب
ہرچند گنہ سے ہے وہ سر بسر آلودہ

ہادی
میر محمد جواد

○

رہ رہ کے سخن کہنا ہر بار بہت تحفہ
ہیں لب تو میاں لب ہی گفتار بہت تحفہ

ہر پاؤں کی ٹھوکر میں ہو دل پڑے تڑپے ہیں
پھر ان دنوں سیکھے ہو رفتار بہت تحفہ

خورشید کا یوں چہرہ زرتار تو ہے لیکن
ہے سر پہ تری سادی دستار بہت تحفہ

اک بوسہ پہ دل ٹھہرا تس پہ وہ نہیں لیتا
اک سہل سی قیمت پہ تکرار بہت تحفہ

ہم مر چکے، پہ اُس نے دل کی نہ خبر تو دی
ہم کو بھی ملا ہے یاں دلدار بہت تحفہ

ہاشمی

میرزا ہاشمی

○

مرا سو بار اس تک نامۂ پُر آرزو پہنچا
پہ اودھر سے جوابِ صاف پہنچا جب کبھو پہنچا

کیا افشا تمہیں نے رازِ عشق اے دیدۂ گریاں
بہ گوشِ خلق ورنہ کس طرح بے گفتگو پہنچا!

دماغ آشفتہ ہوتا ہے صبا نکہت سے سنبل کی!
مشامِ آرزو میں تو کسی کاکل کی بو پہنچا

ابھی چھوٹا ہے موجِ اشک کی زنجیر سے قمری
نہ پھر گوشِ دلِ دیوانہ تک آوازِ ہو پہنچا

یہ دعوے سب کے باطل مکّے میں ہاشمی ہونگے
اگر حاکم تلک وہ شیخ بانکے نکو پہنچا

ہجر

نواب ناظم علی خاں شاہجہانپوری

○

دیکھا انہیں تو اپنی طبیعت سنبھل گئی
آنکھوں میں ہو کے دل کی تمنا نکل گئی

میں اور تم سے وصل کی خواہش خدا نہ ہو
اک بات بیخودی میں زباں سے نکل گئی

تم نے کرم کیا، یہ تمہارا کرم ہوا
تم نے نکال دی، مری حسرت نکل گئی

انصافِ جورِ یار نہیں ہو، تو خوب ہے
پھر لطف کیا، جو بات قیامت پہ ٹل گئی

یا کوئی جان بوجھ کے انجان بن گیا
یا پھر یہی ہوا، مری صورت بدل گئی

اتنا سا میں نہیں ہوں کہ تم، لو تمہیں کہو
کس کا مزاج، کس کی طبیعت بدل گئی

شرما کے پوچھنا وہ کسی کا شبِ وصال
اے ہجر! اب تو دل کی تمنا نکل گئی!

ہوس

نواب مرزا محمد تقی

یہی کہتی تھی لیلیٰ پردہ نشیں، نہیں کھاتی ادب سے خدا کی قسم
غم قیس سوا مجھے کچھ نہیں غم، اسی کشتۂ ناز و ادا کی قسم

رکا پایا جو لیلےٰ نے مجنوں کا جی، کہا کیوں ہو خفا مرے سروِ سہی
کہ نہ میں نے کسی سے ہے بات بھی کی، مجھے میری ہی شرم و حیا کی قسم

مرے گریہ سے جاتے رہے صبر و سکوں مرے اشکوں سے ٹپکے ہے قطرۂ خوں
ارے چین نہیں مجھے پیارے کبھوں مجھے اس تیری مہر و وفا کی قسم

شبِ ہجر میں اشکوں کا خون بہا، اسے دیکھ کے رنگ شفق کا اُڑا
نہیں اس میں مبالغہ ایک ذرا مجھے تیرے ہی رنگِ حنا کی قسم

ترے کشتۂ غم کا ہے حال بتر، یہی کہیو جو جانا ہو تیرا اُدھر
تجھے قاصدِ موجِ نسیمِ سحر، شبِ ہجر کی میری بکا کی قسم

کبھی کہتا تھا قیس غزالوں سے جا، کہو ناقہ ادھر سے کدھر کو گیا
کبھی کہتا تھا تو ہی بتا دے صبا! تجھے لیلےٰ کی زلفِ دوتا کی قسم

کبھی ساغرِ وصل نہ میں نے پیا، کبھی چاک جگر کو نہ میں نے سیا
غم و رنج و تعب کو عزیز کیا، مجھے عشق کے جور و جفا کی قسم

نہ ترا پائی ہوسؔ کبھی پھولوں کی بُو نہ تو بیٹھا ہوں میں کبھی بر لبِ جُو
نہ ترے بے کلی دل کی گئی ہے کبھو، مجھے پیارے کی اپنے وفا کی قسم

مُتغزّلینِ جدید

فیض احمد فیض

○

رنگ پیراہن کا، خوشبو زلف لہرانے کا نام
موسمِ گل ہے تمہارے بام پر آنے کا نام

دوستو اُس چشم و لب کی کچھ کہو جس کے بغیر
گلستاں کی بات رنگیں ہے نہ میخانے کا نام

پھر نظر میں پھول مہکے دل میں پھر شمعیں جلیں
پھر تصور نے لیا اُس بزم میں جانے کا نام

ق

دلبری ٹھہرا زبانِ خلق کھلوانے کا نام
اب نہیں لیتے پری رُو زلف بکھرانے کا نام

اب کسی لیلیٰ کو بھی اقرارِ محبوبی نہیں
ان دنوں بدنام ہے ہر ایک دیوانے کا نام

محتسب کی خیر اُونچا ہے اسی کے فیض سے
رند کا ساقی کا مے کا خم کا پیمانے کا نام

ہم سے کہتے ہیں چمن والے غریبانِ چمن
تم کوئی اچھا سا رکھ لو اپنے ویرانے کا نام

فیض اُن کو ہے تقاضائے وفا ہم سے جنہیں
آشنا کے نام سے پیارا ہے بیگانے کا نام

○

روش روش ہے وہی انتظار کا موسم
نہیں ہے کوئی بھی موسم بہار کا موسم

گراں ہے دل پہ غمِ روزگار کا موسم
ہے آزمائشِ حسنِ نگار کا موسم

خوشا نظارۂ رخسارِ یار کی ساعت
خوشا قرارِ دلِ بے قرار کا موسم

حدیثِ بادہ و ساقی نہیں تو کس مصرف
خرامِ ابرِ سرِ کوہسار کا موسم

نصیبِ صحبتِ یاراں نہیں تو کیا کیجے
یہ رقصِ سایۂ سرو و چنار کا موسم

یہ دل کے داغ تو دکھتے تھے یوں بھی پر کم کم
کچھ اب کے اور ہے ہجرانِ یار کا موسم

یہی جنوں کا یہی طوق و دار کا موسم
یہی ہے جبر یہی اختیار کا موسم

قفس ہے بس میں تمہارے، تمہارے بس میں نہیں
چمن میں آتشِ گل کے نکھار کا موسم

صبا کی مست خرامی تہِ کمند نہیں
اسیرِ دام نہیں ہے بہار کا موسم

بلا سے ہم نے نہ دیکھا تو اور دیکھیں گے
فروغِ گلشن و صوتِ ہزار کا موسم

○

تمہاری یاد کے جب زخم بھرنے لگتے ہیں
کسی بہانے تمہیں یاد کرنے لگتے ہیں

حدیثِ یار کے عنواں نکھرنے لگتے ہیں
تو ہر حریم میں گیسو سنورنے لگتے ہیں

ہر اجنبی ہمیں محرم دکھائی دیتا ہے
جو اب بھی تیری گلی سے گزرنے لگتے ہیں

صبا سے کرتے ہیں غربت نصیب ذکرِ وطن
تو چشمِ صبح میں آنسو ابھرنے لگتے ہیں

وہ جب بھی کرتے ہیں اس نطق و لب کی بخیہ گری
فضا میں اور بھی نغمے بکھرنے لگتے ہیں

درِ قفس پہ اندھیرے کی مہر لگتی ہے
تو فیض دل میں ستارے اترنے لگتے ہیں

○

کئی بار اس کا دامن بھر دیا حسنِ دو عالم سے
مگر دل ہے کہ اس کی خانہ ویرانی نہیں جاتی

کئی بار اس کی خاطر ذرے ذرے کا جگر چیرا
مگر یہ چشمِ حیراں جس کی حیرانی نہیں جاتی

نہیں جاتی متاعِ لعل و گوہر کی گراں یابی
متاعِ غیرت و ایماں کی ارزانی نہیں جاتی

مری چشمِ تن آساں کو بصیرت مل گئی جب سے
بہت جانی ہوئی صورت بھی پہچانی نہیں جاتی

سرِ خسرو سے نازِ کج کلاہی چھن بھی جاتا ہے
کلاہِ خسروی سے بوئے سلطانی نہیں جاتی

بجز دیوانگی واں اور چارہ ہی کہو کیا ہے؟
جہاں عقل و خرد کی ایک بھی مانی نہیں جاتی

○

دونوں جہان تیری محبت میں ہار کے
وہ جا رہا ہے کوئی شبِ غم گزار کے

ویراں ہے میکدہ خم و ساغر اداس ہیں
تم کیا گئے کہ روٹھ گئے دن بہار کے

اک فرصتِ گناہ ملی وہ بھی چار دن
دیکھے ہیں ہم نے حوصلے پروردگار کے

دنیا نے تیری یاد سے بیگانہ کر دیا
تجھ سے بھی دلفریب ہیں غم روزگار کے

بھولے سے مسکرا تو دیے تھے وہ آج فیض
مت پوچھ ولولے دلِ ناکردہ کار کے

○

تم آئے ہو نہ شبِ انتظار گزری ہے
تلاش میں ہے سحر بار بار گزری ہے

جنوں میں جتنی بھی گزری بکار گزری ہے
اگرچہ دل پہ خرابی ہزار گزری ہے

ہوئی ہے حضرتِ ناصح سے گفتگو جس شب
وہ شب ضرور سرِ کوئے یار گزری ہے

وہ بات سارے فسانے میں جس کا ذکر نہ تھا
وہ بات ان کو بہت ناگوار گزری ہے

نہ گُل کھلے ہیں نہ ان سے ملے نہ مے پی ہے
عجیب رنگ میں اب کے بہار گزری ہے

چمن پہ غارتِ گلچیں سے جانے کیا گزری
قفس سے آج صبا بے قرار گزری ہے

اختر شیرانی

○

آرزوئے وصل کی رکھتی ہے پریشاں کیا کیا
کیا بتاؤں کہ مرے دل میں ہیں ارماں کیا کیا

غم عزیزوں کا حسینوں کی جدائی دیکھی
دیکھیں دکھلائے ابھی گردشِ دوراں کیا کیا

ان کی خوشبو ہے فضاؤں میں پریشاں ہر سُو
ناز کرتی ہے ہوائے چمنستاں کیا کیا

دشتِ غربت میں رُلاتے ہیں ہمیں یاد آ کر
اے وطن تیرے گل و سنبل و ریحاں کیا کیا

اب وہ باتیں نہ وہ راتیں نہ ملاقاتیں ہیں
محفلیں خواب کی صورت ہوئیں ویراں کیا کیا

ہے بہارِ گل و لالہ مرے اشکوں کی نمود
میری آنکھوں نے کھلائے ہیں گلستاں کیا کیا

ہے کرم اُن کے ستم کا کہ کرم بھی ہے ستم
شکوے سن سن کے وہ ہوتے ہیں پشیماں کیا کیا

گیسو بکھرے ہیں مرے دوش پہ کیسے کیسے
میری آنکھوں میں ہیں آباد شبستاں کیا کیا

وقتِ امداد ہے اے ہمتِ گستاخیٔ شوق
شوق انگیز ہیں اُن کے لبِ خنداں کیا کیا

سیرِ گل بھی ہے ہمیں باعثِ وحشت اختر
ان کی الفت میں ہوئے چاک گریباں کیا کیا

○

تمناؤں کو زندہ آرزوؤں کو جواں کر لوں
یہ شرمیلی نظر کہہ دے تو کچھ گستاخیاں کر لوں

بہار آئی ہے بلبل دردِ دل کہتی ہے پھولوں سے
کہو تو میں بھی اپنا دردِ دل تم سے بیاں کر لوں

ہزاروں شوخ ارماں لے رہے ہیں چٹکیاں دل میں
حیا ان کی اجازت دے تو کچھ بیباکیاں کر لوں

کوئی صورت تو ہو دنیائے فانی میں بہلنے کی
ٹھہر جا اے جوانی ماتمِ عمرِ رواں کر لوں

چمن میں ہیں بہم پروانہ و شمع و گل و بلبل
اجازت ہو تو میں بھی حالِ دل اپنا بیاں کر لوں

کسے معلوم کب کس وقت کس پر گر پڑے بجلی
ابھی سے میں چمن میں چل کر آباد آشیاں کر لوں

بر آئیں حسرتیں کیا کیا اگر موت اتنی فرصت دے
کہ اک بار اور زندہ شیوۂ عشقِ جواں کر لوں

مجھے دونوں جہاں میں ایک وہ مل جائیں گر اختر
تو اپنی حسرتوں کو بے نیازِ دو جہاں کر لوں

○

وہ کہتے ہیں رنجش کی باتیں بھلا دیں
محبت کریں خوش رہیں مسکرا دیں

غرور اور ہمارا غرورِ محبت
مہ و مہر کو ان کے در پر جھکا دیں

جوانی ہو گر جاودانی تو یا رب
تری سادہ دنیا کو جنت بنا دیں

شبِ وصل کی بے خودی چھا رہی ہے
کہو تو ستاروں کی شمعیں بجھا دیں

بہاریں سمٹ آئیں کھل جائیں کلیاں
جو ہم تم چمن میں کبھی مسکرا دیں

عبادت ہے اک بے خودی سے عبارت
حرم کو مئے مشکبو سے بسا دیں

وہ آئیں گے آج اے بہارِ محبت
ستاروں کے بستر پہ کلیاں بچھا دیں

بناتا ہے منہ تلخیٔ مے سے زاہد
تجھے باغِ رضواں سے کوثر منگا دیں

تم افسانۂ قیس کیا پوچھتے ہو
ادھر آؤ ہم تم کو لیلیٰ بنا دیں

وہ سرمستیاں بخش اے رشکِ شیریں
کہ خسرو کو خوابِ عدم سے جگا دیں

انھیں اپنی صورت پہ یوں ناز کب تھا
مرے عشقِ رسوا کو اخترؔ دعا دیں

○

کون آیا ہے مرے پہلو میں یہ خواب آلودہ؟
زلف برہم زدہ و چشم حجاب آلودہ

آہ یہ زلف ہے یا ابرِ سیہ مے خانہ
آہ یہ آنکھ ہے یا جامِ شراب آلودہ

کس نے پہلو میں بٹھایا یہ مجھے شرما کر
کس کے ہاتھوں میں ہے لرزش یہ حجاب آلودہ

کس کے ملبوس سے آتی ہے حنا کی خوشبو
کس کے ہر سانس کی جنبش ہے گلاب آلودہ

کس کو شکوہ ہے مرے عشق سے رسوائی کا
کس کا لہجہ ہے بایں لطف عتاب آلودہ

پھر ہم آغوشی کے موسم نے بکھیرے گیسو
پھر فضائیں نظر آتی ہیں سحاب آلودہ

حسرتِ بوسہ پہ اخترؔ یہ خیال آتا ہے
کیوں مرے لب سے ہوں وہ برگِ گلاب آلودہ

○

نہ سازِ مطرب نہ جام و ساقی نہ وہ بہارِ چمن ہے باقی
نگاہِ شمعِ سحر کے پہلے پہ نقشِ انجمن ہے باقی

زمانہ گزرا وہ یاسمن بو جدا ہوئی ہم کنار ہو کر
مگر ابھی تک ہمارے پہلو میں نکہتِ یاسمن ہے باقی

بُھلا چکی دل سے شامِ غربت ہر ایک نقشہ ہر ایک صورت
ہماری آنکھوں میں لیکن اب تک فروغِ صبحِ وطن ہے باقی

زمانہ بدلا مٹی جوانی نہ وہ محبت نہ زندگانی
بس ایک بھولی سی یاد ہے جو بہ رنگِ داغِ کہن ہے باقی

مٹا دیئے ہے ستونِ چرخِ کہن نے شیریں لقا ہزاروں
مگر محبت کے لب پہ اب بھی ترانۂ کوہکن ہے باقی

حباب آسا محیطِ ہستی میں جو ہے مٹنے کو بن رہا ہے
ہے انقلاب اک نمود ایسی جو زیرِ چرخِ کہن ہے باقی

غمِ زمانہ کی سختیوں سے ہوئی ہے پامال طبعِ اختر
نہ وہ نشاطِ کہن ہے باقی نہ وہ مذاقِ سخن ہے باقی

○

جھوم کر بدلی اُٹھی اور چھا گئی
ساری دنیا پر جوانی آ گئی

آہ وہ اس کی نگاہِ مے فروش
جب بھی اُٹھی مستیاں برسا گئی

گیسوئے مشکیں میں وہ روئے حسیں
ابر میں بجلی سی اک لہرا گئی

عالمِ مستی کی توبہ الاماں!
پارسائی نشہ بن کر چھا گئی

آہ اس کی بے نیازی کی نظر
آرزو کیا پھول سی کُمھلا گئی

سازِ دل کو گدگدایا عشق نے
موت کو لے کر جوانی آ گئی

پارسائی کی جواں مرگی نہ پوچھ
توبہ کرنی تھی کہ بدلی چھا گئی

اختر اس جانِ تمنا کی ادا
جب کبھی یاد آ گئی تڑپا گئی

تاثیر

حضورِ یار بھی آنسو نکل ہی آتے ہیں
کچھ اختلاف کے پہلو نکل ہی آتے ہیں

مزاج ایک، نظر ایک، دل بھی ایک سہی
معاملاتِ من و تو نکل ہی آتے ہیں

ہزار ہم سخنی ہو، ہزار ہم نظری
مقامِ جنبشِ ابرو نکل ہی آتے ہیں

حنائے ناخنِ پا ہو کہ حلقۂ سرِ زلف
چھپاؤ بھی تو یہ جادو نکل ہی آتے ہیں

جنابِ شیخ وضو کے لیے سہی لیکن
کسی بہانے لبِ جو نکل ہی آتے ہیں

متاعِ عشق وہ آنسو جو دل میں ڈوب گئے
زمیں کا رزق جو آنسو نکل ہی آتے ہیں

لطفِ وفا نہیں کہ وہ بیدادگر نہیں
خاموش ہوں کہ میری فغاں بے اثر نہیں
تیرے بغیر تلخیٔ کام و دہن حرام
دردِ جگر ہے لذتِ دردِ جگر نہیں
سجدوں سے نامراد ہے جلووں سے ناامید
وہ رہگزر کہ اب جو تری رہگزر نہیں
تم کیا گئے کہ سارا زمانہ چلا گیا
وہ رات دن نہیں ہیں وہ شام و سحر نہیں
ہر ہر روش معاملۂ حسن و عاشقی
ہر ہر قدم فروغِ جمالِ نظر نہیں
بے باک چال، چال سے بیباک تر نظر
اب حسن تو بہت ہے مگر فتنہ گر نہیں
زخموں سے چور قافلے، پرخار راستے
اس میں ترا قصور تو اے راہبر نہیں
دنیائے چشم و گوش تو برباد ہو گئی
اب کچھ بغیر معرکۂ خیر و شر نہیں

○

وہ ملے تو بے تکلف، نہ ملے تو بے ارادہ
نہ طریقِ آشنائی، نہ رسومِ جام و بادہ

تری نیم کش نگاہیں، ترا زیرِ لب تبسم
یونہی اک ادائے مستی، یونہی اک فریبِ سادہ

وہ کچھ اس طرح سے آئے، مجھے اس طرح سے دیکھا
مری آرزو سے کم تر، مری تاب سے زیادہ

یہ دلیلِ خوش دلی ہے، مرے واسطے نہیں ہے
وہ دہن کہ ہے شگفتہ، وہ جبیں کہ ہے کشادہ

وہ قدم قدم پہ لغزش، وہ نگاہِ مستِ بادہ
یہ طرازِ زلفِ سرکش، یہ کلاہِ کج نہادہ

○

حسن کے رازِ نہاں شرحِ بیاں تک پہنچے
آنکھ سے دل میں گئے، دل سے زباں تک پہنچے

دل نے آنکھوں سے کہی، آنکھوں نے دل سے کہہ دی
بات چل نکلی ہے، اب دیکھیں کہاں تک پہنچے

عشق پہلے ہی قدم پر ہے یقیں سے واصل
انتہا عقل کی یہ ہے کہ گماں تک پہنچے

کعبہ و دیر میں تو لوگ ہیں آتے جاتے
وہ نہ لوٹے جو درِ پیرِ مغاں تک پہنچے

آنکھ سے آنکھ کے، دل سے ہوں دل کی باتیں
وائے وہ حرفِ تمنا جو زباں تک پہنچے

یہ

○

لبالب جام پھر ساقی نے واپس لے لیا مجھ سے
نہ جانے کیا کہا میں نے، نہ جانے کیا ہوا مجھ سے

مری توبہ، مجھے باور، وہ کافر ہے وہ کافر ہے
خفا تو بھی ہوا جاتا ہے اے میرے خدا مجھ سے

چھپایا پھرتا ہوں اب تک تیری آنکھوں سے مگر کب تک
یہ کہہ ڈالیں گی اک دن میرے دل کا مدعا مجھ سے

مجھے معلوم ہے تاثیر سب کچھ جانتا ہوں میں
ارے اب پی بھی جا، کیوں بن رہا ہے پارسا مجھ سے

○

میری وفائیں یاد کرو گے
روؤ گے فریاد کرو گے

مجھ کو تو برباد کیا ہے
اور کسے برباد کرو گے؟

ہم بھی ہنسیں گے تم پر اک دن
تم بھی کبھی فریاد کرو گے

محفل کی محفل ہے غمگیں
کس کس کا دل شاد کرو گے

دشمن تک کو بھول گئے ہو
مجھ کو تم کیا یاد کرو گے

ختم ہوئی دشنام طرازی
یا کچھ اور ارشاد کرو گے

جا کر بھی ناشاد کیا تھا
آ کر بھی ناشاد کرو گے

چھوڑو بھی تاثیر کی باتیں
کب تک اس کو یاد کرو گے

عبدالمجید سالک

○

ہمنفسو۔ اُجڑ گئیں مہر و وفا کی بستیاں
پوچھ رہے ہیں اہلِ دل مہر و وفا کو کیا ہوا

عشق ہے بے گداز کیوں حسن ہے بے نیاز کیوں
میری وفا کہاں گئی ان کی جفا کو کیا ہوا

یہ تو بجا کہ اب وہ کیف جامِ شراب میں نہیں
ساقیٔ مے کے غمزۂ ہوش رُبا کو کیا ہوا

اب نہیں جنتِ مشام کوچۂ یار کی شمیم
نکہتِ زلف کیا ہوئی بادِ صبا کو کیا ہوا

تھم گیا دورِ حیات رُک گئی نبضِ کائنات
عشق و جنوں کی گرمیٔ ہنگمہ زا کو کیا ہوا

نالۂ شب ہے نارسا آہِ سحر ہے بے اثر
میرا خدا کہاں گیا، میرے خدا کو کیا ہوا

○

نہ تھی امید نہ وعدے پہ اعتبار کیا
غضب ہے پھر بھی ترا ہم نے انتظار کیا

اٹھائے اب تو نقاب اے عروسِ آزادی
ہزار سال ترا ہم نے انتظار کیا

شفق نے پھول بکھیرے خزاں کی وادی میں
سحر نے دامنِ مشرق کو لالہ زار کیا

وداعِ عشق تھی اب رخصت اے غمِ جاناں
کہ پھر مجھے غمِ دوراں نے بے قرار کیا

خرد نے سائے میں جس کے پناہ لی صدیوں
جنوں نے آج اسی دامن کو تار تار کیا

چھپا رکھا تھا جسے محتسب نے ردا میں
وہ راز بزم میں رندوں نے آشکار کیا

دماغ تو کسی قیمت پہ بک نہ سکتے تھے
متاعِ دل ہی کو نذرِ جمالِ یار کیا

نظر میں پھر گئی سالک جہانِ نو کی نمود
غمِ زمانہ نے جب مجھ کو اشکبار کیا

○

ـب کی نہ جور و جفا کی بات کرو — مئے کہن کی نگارِ جواں کی بات کرو

ی تابشِ رخسار کا کہو قصہ — کسی کے گیسوئے عنبر فشاں کی بات کرو

ہے شاہد و شمع و شراب سے اس کی — فروغِ محفلِ روحانیاں کی بات کرو

ا ہو کسی قبلۂ مراد کا ذکر — تو آستانۂ پیرِ مغاں کی بات کرو

ہوا جو طلوعِ آفتاب تو فی الحال — قمر کی بات کرو کہکشاں کی بات کرو

گا مشغلۂ یادِ رفتگاں کب تک — گزر رہا ہے جو اس کارواں کی بات کرو

و صیاد کے اندیشہ ہائے بے جا کیا — چمن کی فکر کرو آشیاں کی بات کرو

جہان ہے ہنگامہ زارِ سود و زیاں — اسی کے سود اسی کے زیاں کی بات کرو

اس چمن میں نہ صیاد ہے نہ گلچیں ہے — کرو تو اب تم باغباں کی بات کرو

خدا کے ذکر کا موقع نہیں یہاں سالک
دیارِ ہند میں حسنِ بتاں کی بات کرو[1]

○

خرد میں مبتلا ہے سالکِ دیوانہ برسوں سے
نہیں آیا وہ مے خانے میں بیباکانہ برسوں سے

میسر جس سے آجاتی تھی ساقی کی قدم بوسی
مقدر میں نہیں وہ لغزشِ مستانہ برسوں سے

بیادِ چشمِ یار اک نعرۂ مستانہ اے ساقی
کہ ہا و ہو سے خالی ہے ترا میخانہ برسوں سے

تجھے کچھ عشق و الفت کے سوا بھی یاد ہے اے دل
سنائے جا رہا ہے ایک ہی افسانہ برسوں سے

کسی کو تو مشرف کر شرف سے ذوقِ جبیں سائی
تقاضا کر رہے ہیں کعبہ و بت خانہ برسوں سے

نئی شمعیں جلاؤ عاشقی کی انجمن والو
کہ سونا ہے شبستانِ دلِ پروانہ برسوں سے

کوئی جوہر شناس آئے تو جانے قدر سالک کی
پڑا ہے خاک پر یہ گوہرِ یکدانہ برسوں سے

[1] مشاعرۂ دہلی میں پڑھی گئی

○

چراغِ زندگی ہوگا فروزاں ہم نہیں ہوں گے
چمن میں آئے گی فصلِ بہاراں ہم نہیں ہوں گے

جوانو! اب تمھارے ہاتھ میں تقدیرِ عالم ہے
تمھیں ہوگے فروغِ بزمِ امکاں ہم نہیں ہوں گے

جئیں گے جو وہ دیکھیں گے بہاریں زلفِ جاناں کی
سنوارے جائیں گے گیسوئے دوراں ہم نہیں ہوں گے

ہمارے ڈوبنے کے بعد ابھریں گے نئے تارے
جبینِ دہر پہ چھٹکے گی افشاں ہم نہیں ہوں گے

نہ تھا اپنی ہی قسمت میں طلوعِ مہر کا جلوہ
سحر ہو جائے گی شامِ غریباں ہم نہیں ہوں گے

اگر ماضی منور تھا کبھی تو ہم نہ تھے حاضر
جو مستقبل کبھی ہوگا درخشاں ہم نہیں ہوں گے

ہمارے دور میں ڈالیں خرد نے الجھنیں لاکھوں
جنوں کی مشکلیں جب ہوں گی آساں ہم نہیں ہوں گے

کہیں ہم کو دکھا دو اک کرن ہی ٹمٹماتی سی
کہ جس دن جگمگائے گا شبستاں ہم نہیں ہوں گے

ہمارے بعد ہی خونِ شہیداں رنگ لائے گا
یہی سرخی بنے گی زیبِ عنواں ہم نہیں ہوں گے

○

غم کے ہاتھوں مرے دل پر جو سماں گزرا ہے
حادثہ ایسا زمانے میں کہاں گزرا ہے

زندگی کا ہے خلاصہ وہی اک لمحۂ شوق
جو تری یاد میں اے جانِ جہاں گزرا ہے

حالِ دل غم سے یہ ہے جیسے کسی صحرا میں
ابھی اک قافلۂ نوحہ گراں گزرا ہے

بزم وہ فیض کدہ یاد کہ اس کا ہر رند
رونقِ بارگہِ پیرِ مغاں گزرا ہے

پا بگل ہوتے ہیں وہ آزردہ نظر آتے ہیں
شاید اس راہ سے وہ سروِ رواں گزرا ہے

نگرانیٔ دل و دیدہ ہوئی ہے دشوار
کوئی جب سے مری جانب نگراں گزرا ہے

حالِ دل سن کے وہ آزردہ ہیں شاید ان کو
اس حکایت پہ شکایت کا گماں گزرا ہے

وہ گل افشانیٔ گفتار کا پیکر سالکؔ
آج کوچے سے ترے اشک فشاں گزرا ہے

عابد علی عابد

○

آئی سحر قریب تو میں نے پڑھی غزل
جلنے لگے ستاروں کے بجھتے ہوئے کنول

بے تاب ہے جنوں کہ غزل خوانیاں کروں
خاموش ہے خرد کہ نہیں بات کا محل

کیسے دیئے جلائے غمِ روزگار نے
کچھ اور جگمگائے غمِ یار کے محل

راہوں میں جوئے خوں ہے رواں مثلِ موجِ مے
ساقی یقیں نہ ہو تو ذرا میرے ساتھ چل

اے التفاتِ یار مجھے سوچنے تو دے
مرنے کا ہے مقام کہ جینے کا ہے محل؟

اب ترکِ دوستی ہی تقاضا ہے وقت کا
اے یارِ چارہ ساز مری آگ میں نہ جل

کچھ بجلیوں کا شور ہے کچھ آندھیوں کا زور
دل ہے مقام پر تو ذرا بام پر نکل

ہم رندِ تاک و خوں ہیں اٹھے ہاتھ ہی تھکے
نکلے نہ اے بہار ترے گیسوؤں کے بل

فرمانِ شحنۂ یار کی پروا نہیں مجھے
ایمائے عاشقاں ہو تو عابد کہے غزل

○

مے ہو ساغر میں کہ خوں رات گزر جائے گی
دل کو غم ہو کہ سکوں رات گزر جائے گی

دیکھنا یہ ہے کہ اندازِ سحر کیا ہوں گے
یوں تو اربابِ جنوں رات گزر جائے گی

نہ رُکا ہے نہ رُکے قافلۂ لیل و نہار
رات کم ہو کہ فزوں رات گزر جائے گی

میں تو محرمِ اسرار ہوں اے صبحِ بہار
جا کے پھولوں سے کہوں رات گزر جائیگی

مژدۂ صبحِ مبارک تمھیں اے دیدہ ورو!
میں جیوں یا نہ جیوں رات گزر جائے گی

رات بھر میں نے سجائے سرِ مژگاں تارے
مجھ کو تھا وہم کہ یوں رات گزر جائے گی

صبح اُٹھ کر تجھے رہرو سے لپٹنا ہوگا
رہبرِ تیرہ دروں رات گزر جائے گی

○

یہ کیا طلسم ہے دنیا پہ بار گزری ہے
وہ زندگی جو سرِ رہگزار گزری ہے

کہیں سحر کا اُجالا ہوا ہے ہم نفسو
کہ صبح برق سرِ شاخسار گزری ہے

رہا ہے یہ سرِ شوریدہ محفلِ شعلہ بلند
اگرچہ مجھ پہ قیامت ہزار گزری ہے

یہ حادثہ بھی ہوا ہے کہ عشقِ یار کی یاد
دیارِ قلب سے بیگانہ وار گزری ہے

گلوں کی خوں شدگی سے سراغ ملتا ہے
یہیں کہیں سے نسیمِ بہار گزری ہے

ستم کو چھوڑ دلدار کو بہت ہی نہیں
کہ جیسے زندگی مستعار گزری ہے

انہیں کو عرضِ وفا کا تھا اشتیاق بہت
انہیں کو عرضِ وفا ناگوار گزری ہے

کبھی بجرمِ غمِ روزگار دیکھا ہے
کبھی مصیبتِ ہجرانِ یار گزری ہے

حریمِ شوق مہکتا ہے آج تک عابدؔ
یہاں سے نکہتِ گیسوئے یار گزری ہے

○

دل ہے آئینۂ حیرت سے دوچار آج کی رات
غمِ دوراں میں ہے مہکی غمِ یار آج کی رات

کوئی غنچہ سے جا کر یہ کہو ہم نفسو!
ہمیں بے تعزیۂ غم بھی ہے سرشار آج کی رات

تیرے دور پہ ایسے بھی ہے ہنگامۂ بزم
میری محفل میں نہیں وقت کو بار آج کی رات

نہ مکاں ہی ہے ثابت نہ زماں ہے سیار
نہ خزاں شعبدہ آرا، نہ بہار آج کی رات

کبھی گرد کبھی گل وہ لگی ہو کشتِ خیال
اس سے بے ساختہ اُٹھتے ہیں غبار آج کی رات

جلوۂ حسن آئی ہے صحرائے تمنا سے مجھے
کھیلتا ہے دلِ وحشی کا شکار آج کی رات

مجھے معلوم ہے عابدؔ کہ بیاضِ دل پر
نام تم نے لکھے نقش و نگار آج کی رات

○

اروہِ گل و ریحاں گزرے — صورتِ برق درخشاں گزرے
یا بتاؤں کہ مری آنکھوں سے — کس قدر خواب پریشاں گزرے
ستِ بنار ہا ہیں شکلِ حباب — دائیں بائیں سے طوفاں گزرے
گردشِ جام نہیں رک سکتی — جو بھی لے گردشِ دوراں گزرے
صبح محشر ہے بلا سے ظاہر — کسی صورت شبِ ہجراں گزرے
کوئی برسانہ سرِ کشتِ وفا — کتنے بادل گہر افشاں گزرے
ابن آدم کو نہ آیا کوئی راس — کبھی آذر کبھی یزداں گزرے
زیستی کے بیابانوں سے — کچھ ہیں ایسے کہ غزلخواں گزرے
اے غمِ یار تری راہوں سے — عمر بھر سوختہ ساماں گزرے
ور پہ پہنچے جلبلات کی راہ آت — منزلِ عشق سے آساں گزرے

غم کے تاریک افق پر عابد
کچھ ستارے سرِ مژگاں گزرے

○

غمِ دوراں غمِ جاناں کا نشاں ہے کہ جو تھا
وصفِ خوباں بہ حدیثِ دگراں ہے کہ جو تھا
لذتِ عرضِ وفا راحتِ جاں ہے کہ جو تھی
دلِ تپاں اشک رواں شوق جواں ہے کہ جو تھا
شرح و آئین کی تعزیر کے باوصف شباب
لب و رخسار کی جانب نگراں ہے کہ جو تھا
میرے پاؤں سے ہیں الجھے ہوئے ریشم کے تار
ہمدم! یہ تو وہی بندِ گراں ہے کہ جو تھا
عشق کی طرزِ تکلم وہی چپ ہے کہ جو تھی
لبِ خوش گوئے ہوس محوِ بیاں ہے کہ جو تھا
راہبر دشت میں فریاد کناں ہیں کہ جو تھے
خندہ زن قافلۂ راہبراں ہے کہ جو تھا
مغبچے خوش ہیں کہ بزم ان کی ہے ساقی ہے نیا
بر سرِ کار وہی پیرِ مغاں ہے کہ جو تھا
جلوۂ یار سے کیا شکوۂ بے جا کیجے!
شوقِ دیدار کا عالم وہ کہاں ہے کہ جو تھا
حلقۂ دعظ سے اب بھک سے گریزاں دنیا!
حلقۂ زلف مدارِ دو جہاں ہے کہ جو تھا
میرے ہنسنے پہ خفا تھے مرے رونے پہ خفے
وہی رنگِ ستمِ عشوہ گراں ہے کہ جو تھا
سنگِ طفلاں سے ذرا بچ کے رہے قصرِ بلند
یہ وہی کارگہِ شیشہ گراں ہے کہ جو تھا
دوستو ہم نفسو! سنتے ہو عابد کی غزل!
یہ وہی شعلہ نوا سوختہ جاں ہے کہ جو تھا

حفیظ ہوشیارپوری

○

ایسی بھی کیا جلدی پیارے، جانے دیں پھر پا نہ سکیں ہم
کون کہے گا پھر یہ فسانہ، بیٹھ بھی جاؤ سن لو کوئی دم
وصل کی شیرینی میں پنہاں، ہجر کی تلخی بھی ہے کم کم
تم سے ملنے کی بھی خوشی ہے، تم سے جدا ہونے کا بھی غم
حسن و عشق جدا ہو سکیں جانے کیا طوفان اُٹھے گا
حسن کی آنکھیں بھی ہیں پُرنم، عشق کی آنکھیں بھی ہیں پُرنم
میری وفا تو نادانی تھی، تم نے مگر یہ کیا ٹھانی تھی
کاش نہ کرتے مجھ سے محبت، کاش نہ ہوتا دل کا یہ عالم
پروانے کی خاک پریشاں، شمع کی لَو بھی لرزاں لرزاں
محفل کی محفل ہے ویراں، کون کرے اب کس کا ماتم
کچھ بھی پھر ان آنکھوں نے اکثر یہ عالم بھی دیکھا
عشق کی دنیا نازِ سراپا، حسن کی دنیا عجزِ مجسم
شہد شکن ہونٹوں کی لرزش، عشرتِ باقی کا گہوارہ
دائرۂ امکانِ تمنا، نرم لچکتی بانہوں کے خم
اپنے اپنے دل کے ہاتھوں، دونوں ہی برباد ہوئے ہیں
میں ہوں اور وفا کا رونا، وہ ہیں اور جفا کا ماتم
ناکامی سی ناکامی ہے، محرومی سی محرومی ہے
دل کا منانا سعیِ مسلسل، ان کو بھلانا کوششِ پیہم
عہدِ وفا ہے اور بھی محکم، تیری جدائی کے میں قرباں
تیری جدائی کے میں قرباں، عہدِ وفا ہے اور بھی محکم

○

کچھ اس طرح سے نظر سے گزر گیا کوئی
کہ دل کو غم کا سزاوار کر گیا کوئی
دلِ ستم زدہ کو جیسے کچھ ہوا ہی نہیں
خود اپنے حسن سے یوں بے خبر گیا کوئی
وہ ایک جلوۂ صد رنگ، اک ہجومِ بہار
نجانے کون تھا جانے کدھر گیا کوئی
نظر کہ تشنۂ دیدار تھی رہی محروم
نظر اُٹھائی تو دل میں اُتر گیا کوئی
نگاہِ خلق کی محرومیوں سے ناواقف
نگاہِ شوق پہ الزام دھر گیا کوئی
اب اُن کے حسن میں حسنِ نظر بھی شامل ہے
کچھ اور میری نظر سے سنور گیا کوئی
کسی کے پاؤں کی آہٹ کہ دل کی دھڑکن تھی
ہزار بار اُٹھا سوتے ڈر گیا کوئی
نصیبِ اہلِ وفا یہ سکونِ دل تو نہ تھا
ضرور نالۂ دل بے اثر گیا کوئی
اُٹھا پھر آج مرے دل میں شک کا طوفاں
پھر اُن کی راہ سے بچشمِ تر گیا کوئی
یہ کہہ کے یاد کریں گے حفیظؔ دوست مجھے
وفا کی رسم کو پائندہ کر گیا کوئی

○

راز سربستہ محبت کے زباں تک پہنچے — بات بڑھ کر یہ خدا جانے کہاں تک پہنچے

کیا تصرف ہے ترے حسن کا اللہ اللہ — جلوے آنکھوں سے اتر کر دل و جاں تک پہنچے

تری منزل پہ پہنچنا کوئی آسان نہ تھا — سرحدِ عقل سے گزرے تو یہاں تک پہنچے

حیرتِ عشق مری حسن کا آئینہ ہے — دیکھنے والے کہاں سے ہیں کہاں تک پہنچے

کھل گئیں کیا آج نگاہیں ہیں نگاہیں اپنی — جلوے ہی جلوے نظر آئے جہاں تک پہنچے

وہی اس گوشۂ داماں کی حقیقت جانے — جو مرے دیدۂ خونابہ فشاں تک پہنچے

ابتدا میں جنھیں ہم ننگِ وفا سمجھے تھے — ہوتے ہوتے وہ گلے حسنِ بیاں تک پہنچے

آہ وہ حرفِ تمنا کہ نہ لب تک آئے — ہائے وہ بات کہ اک اک کی زباں تک پہنچے

کس کا دل ہے کہ سنے قصۂ وقتِ سحر! — کون ہے جو مرے اندوہ نہاں تک پہنچے

خلش عشق یہ تھا کیا کیا تری مژگاں کا خیال — ٹوٹ کر دل میں یہ نشتر رگِ جاں تک پہنچے

نہ پتہ سنگِ نشاں کا نہ خبر رہبر کی — جستجو میں ترے دیوانے یہاں تک پہنچے

نہ غبارِ رہِ منزل ہے نہ آوازِ جرس — کون مجھ رہروِ گم کردہ نشاں تک پہنچے

صاف توہین ہے یہ دردِ محبت کی حفیظ
حسن کا راز ہو اور میری زباں تک پہنچے

○

پھر سے آرائشِ ہستی کے جو ساماں ہوں گے
تیرے جلووں ہی سے آباد شبستاں ہوں گے

عشق کی منزلِ اول پہ ٹھہرنے والو!
اس سے آگے بھی کئی دشت و بیاباں ہوں گے

تو جہاں جائے گی غارت گرِ ہستی بن کر
ہم بھی اب ساتھ ترے گردشِ دوراں ہوں گے

کس قدر سخت ہے یہ ترک و طلب کی منزل
اب کبھی ان سے ملے بھی تو پشیماں ہوں گے

تیرے جلووں سے جو محروم رہے ہیں اب تک
وہی آخر ترے جلووں کے نگہباں ہوں گے

اب تو مجبور ہیں پر حشر کا دن آنے دے
تجھ سے انصاف طلب روئے گریزاں ہوں گے

جب کبھی ہم نے کیا عشق پشیمان ہوئے
زندگی ہے تو ابھی اور پشیماں ہوں گے

کوئی بھی غم ہو غمِ دل کہ غمِ دہر حفیظ
ہم بہرحال بہر رنگ غزل خواں ہوں گے

○

محبت کرنے والے کم نہ ہوں گے
تری محفل میں لیکن ہم نہ ہوں گے

میں اکثر سوچتا ہوں پھول کب تک
شریکِ گریۂ شبنم نہ ہوں گے

ذرا دیر آشنا چشمِ کرم ہے
ستم ہی عشق میں پیہم نہ ہوں گے

دلوں کی الجھنیں بڑھتی رہیں گی
اگر کچھ مشورے باہم نہ ہوں گے

زمانے بھر کے غم یا اک ترا غم
یہ غم ہوگا تو کتنے غم نہ ہوں گے

کہوں بیدردیٔ اہلِ جہاں کو
وہ میرے حال سے محرم نہ ہوں گے

ہمارے دل میں سیلِ گریہ ہوگا
اگر با دیدۂ پُرنم نہ ہوں گے

اگر تو اتفاقاً مل بھی جائے
تری فرقت کے صدمے کم نہ ہوں گے

حفیظ اُن سے میں جتنا بدگماں ہوں
وہ مجھ سے اس قدر برہم نہ ہوں گے

○

کہاں کہاں نہ تصور نے دام پھیلائے
حدودِ شام و سحر سے نکل کے دیکھ آئے

نہیں پیام، رہِ نامہ و پیام تو ہے
ابھی صبا سے کہو اُن کے دل کو بہلائے

غرورِ جادہ شناسی بجا سہی لیکن
سراغِ منزلِ مقصود بھی کوئی پائے

نہ راہ دی نہ دکھائے کہ راہبر نکلے
چلے تھے جانے کہاں کہاں نکل آئے

گزر گیا کوئی درماندۂ راہ یہ کہتا
اب اس فضا میں کوئی قافلے نہ ٹھہرائے

نجانے اُن کے مقدر میں کیوں ہے تیرہ شبی
وہ ہم نوا جو سحر کو قریب تر لائے

کوئی فریبِ نظر ہے کہ تابناک فضا
کسے خبر کہ یہاں کتنے چاند گہنائے

غمِ زمانہ تری ظلمتیں ہی کیا کم تھیں
کہ بڑھ چلے ہیں اب اُن گیسوؤں کے بھی سائے

بہت بلند ہے اس سے مرا مقامِ غزل
اگرچہ میں نے محبت کے گیت بھی گائے

حفیظ اپنا مقدر، حفیظ اپنا نصیب
گرے تھے پھول مگر ہم نے زخم ہی کھائے

صوفی غلام مصطفیٰ تبسم

○

...نظراں ہے کلی کلی بیدار
نہ جانے کس کی نگاہوں کو ڈھونڈتی ہے بہار

...فضاؤں میں نشاط و طرب کا افسانہ
کبھی ہنسی ابھی تڑپتے ہوئے دلوں کی پکار

...کے نشاطِ قدم سے ہیں محروم
کہ ایک عمر سے سُونے پڑے ہیں راہگزار

...کسی چشمِ آشنا کے طفیل
اُجڑ اُجڑ کے بسے ہیں محبتوں کے دیار

...ہے بیتابیٔ محبت کا
شبِ وصال کی راحت میں ڈھونڈتی ہے قرار

...اور اس پہ تری [illegible] حجاب
یہ سیلِ عشق اور اس پہ نظر نظر کا شمار

...میسر نہیں ہے گل بھی
بہار ڈھونڈ رہی ہے ابھی سراغِ بہار

ہے ان کی پرسشِ دردِ الم میں بھی پنہاں
وہ اک کسک کہ سمجھتے نہیں جسے غمخوار

○

ہزار گردشِ شام و سحر سے گزرے ہیں
وہ قافلے جو تری رہگزر سے گزرے ہیں

ابھی ہوس کو میسر نہیں دلوں کا گداز
ابھی یہ لوگ مقامِ نظر سے گزرے ہیں

ہر ایک نقش پہ تھا تیرے نقشِ پا کا گماں
قدم قدم پہ تری رہگزر سے اٹکے ہیں

نہ جانے کون سی منزل پہ جا کے رک جائیں
نظر کے قافلے دیوار و در سے گزرے ہیں

رحیلِ شوق سے لرزاں تھا زندگی کا شعور
نہ جانے کس لیے ہم بے خبر سے گزرے ہیں

کچھ اور پھیل گئیں درد کی کٹھن راہیں
غمِ فراق کے مارے جدھر سے گزرے ہیں

جہاں سرور میسر تھا جام لے کے بغیر
وہ میکدے بھی ہماری نظر سے گزرے ہیں

○

یہ کیا کہ اک جہاں کو کرو وقفِ اضطراب
یہ کیا کہ ایک دل کو شکیبا نہ کر سکو

ایسا نہ ہو یہ درد بنے دردِ لازوال
ایسا نہ ہو کہ تم بھی مداوا نہ کر سکو

شاید تمھیں بھی چین نہ آئے مرے بغیر
شاید یہ بات تم بھی گوارا نہ کر سکو

کیا جانے پھر ستم بھی میسر ہو یا نہ ہو
کیا جانے یہ کرم بھی کرو یا نہ کر سکو

اللہ کرے جہاں کو مری یاد بھول جائے
اللہ کرے کہ تم کبھی ایسا نہ کر سکو

میرے سوا کسی کی نہ ہو تم کو جستجو
میرے سوا کسی کی تمنا نہ کر سکو

○

وہ حسن کو جلوہ گر کریں گے
آرائشِ بام و در کریں گے

ہنس ہنس کے کریں گے چارہ سازی
سامانِ دل و نظر کریں گے

ہم بھی سرِ راہ منتظر ہیں
دیکھیں کب ادھر نظر کریں گے

افسانۂ غم طویل ہے دوست
اس بات کو مختصر کریں گے

ہے شامِ فراق سخت تاریک
اس شام کی اب سحر کریں گے

افسردہ ہیں زندگی کے تیور
کب تک یونہی ہم بسر کریں گے

آئے گا تبسم ان لبوں پر
آنسو بھی کبھی اثر کریں گے

○

نظر میں ڈھل کے اُبھرتے ہیں دل کے افسانے
یہ اور بات ہے دنیا نظر نہ پہچانے

وہ بزم دیکھی ہے میری نگاہ نے کہ جہاں
بغیر شمع بھی جلتے رہے ہیں پروانے

یہ کیا بہار کا جوبن یہ کیا نشاط کا رنگ
فسردہ میکدے والے اُداس میخانے

مرے ندیم! تری چشمِ التفات کی خیر
بگڑ بگڑ کے سنورتے گئے ہیں افسانے

یہ کس کی چشمِ فسوں ساز کا کرشمہ ہے
کہ ٹوٹ کر بھی سلامت ہیں دل کے پیمانے

نگاہِ ناز میں دل سوزیٔ نیاز کہاں
یہ آشنائے نظر ہیں دلوں کے بیگانے

○

یہ آج آئے ہیں کس اجنبی سے دیس میں ہم
تڑپ گئی ہے نظر چشمِ آشنا کے لیے

وہ ہاتھ جن سے تھا کل چاک دامنِ افلاک
وہ ہاتھ آج اٹھانے پڑے دعا کے لیے

یہ میں نے مانا جدائی مرا مقدر ہے
مگر یہ بات نہ منہ سے کہو خدا کے لیے

یہ راہرو تھے کبھی راہِ زندگی کا سراغ
یہ راہبر ہو کے بھٹکتے ہیں رہنما کے لیے

چراغ حسن حسرت

○

یارب غمِ ہجراں میں اتنا تو کیا ہوتا
جو ہاتھ جگر پر ہے وہ دستِ دعا ہوتا

اک عشق کا غم آفت اور اس پہ یہ دل آفت
یا غم نہ دیا ہوتا یا دل نہ دیا ہوتا

ناکامِ تمنا دل اس سوچ میں رہتا ہے
یوں ہوتا تو کیا ہوتا یوں ہوتا تو کیا ہوتا

امید تو بندھ جاتی تسکین تو ہو جاتی
وعدہ نہ وفا کرتے وعدہ تو کیا ہوتا

غیروں سے کہا تم نے غیروں سے سنا تم نے
کچھ ہم سے کہا ہوتا کچھ ہم سے سنا ہوتا

○

جب سے تیرا کرم ہے بندہ نواز
سوز ہے سوز اور نہ ساز ہے ساز

میں ہوں اور میری بے پر و بالی
دل ہے اور دل کی جراتِ پرواز

حسن کی برہمی معاذ اللہ
گیسوؤں کے بکھرنے کا انداز

زلف برہم جھکی ہوئی نظریں
گردنِ ناز میں کمندِ نیاز

قد بالا و دامنِ کوتاہ
منزلِ عشق کے نشیب و فراز

اللہ اللہ فسونِ نغمۂ عشق
سارا عالم ہے گوشش برآواز

قطع ہونے لگا ہے رشتۂ زیست
اے غمِ یار تیری عمر دراز

○

اس طرح کر گیا دل کو مرے ویراں کوئی
نہ تمنا کوئی باقی ہے نہ ارماں کوئی

ہر گلی میں ہے ترے حسنِ دل آرا کی نمود
اب کے دامن ہی بچے گا نہ گریباں کوئی

مے چکاں لب، نظر آوارہ، نگاہیں گستاخ
یوں مرے پہلو سے اٹھا ہے غزل خواں کوئی

زلف برہم ہے دلِ آشفتہ صبا آوارہ
خوابِ ہستی سا نہیں خوابِ پریشاں کوئی

نغمۂ درد سے ہو جاتا ہے عالم مسرور
اس طرح چھیڑتا ہے تارِ رگِ جاں کوئی

○

محبت کس قدر یاس آفریں معلوم ہوتی ہے
ترے ہونٹوں کی ہر جنبش نہیں معلوم ہوتی ہے

یہ اس کے آستاں پر مجھ کو ذوقِ سجدہ لے آیا
کہ آج اپنی جبیں اپنی جبیں معلوم ہوتی ہے

محبت تیرے جلوے کتنے رنگا رنگ جلوے ہیں
کہیں محسوس ہوتی ہے کہیں معلوم ہوتی ہے

جوانی مٹ گئی لیکن خلشِ دردِ محبت کی
جہاں معلوم ہوتی تھی وہیں معلوم ہوتی ہے

امید وصل نے دھوکے دیئے ہیں اس قدر حسرت
کہ اس کافر کی ہاں بھی اب نہیں معلوم ہوتی ہے

○

آؤ حسنِ یار کی باتیں کریں
زلف کی، رخسار کی باتیں کریں

زلفِ عنبر بار کے قصے سنائیں
طرۂ طرار کی باتیں کریں

پھول برسائیں بساطِ عیش پر
روزِ وصلِ یار کی باتیں کریں

نقدِ جاں لے کر چلیں اس بزم میں
مصر کے بازار کی باتیں کریں

اُن کے کوچے میں جو گزری ہے کبھی
سایۂ دیوار کی باتیں کریں

آخری ساعت شبِ فرقت کی ہے
آؤ اب تو پیار کی باتیں کریں

○

دل ملا ہے نثار ہو جائے
آپ کو اعتبار ہو جائے

قہر تو بار بار ہوتا ہے
لطف بھی ایک بار ہو جائے

زندگی چارہ سازِ غم نہ سہی
موت ہی غمگسار ہو جائے

یا خزاں جائے اور بہار آئے
یا خزاں ہی بہار ہو جائے

دل یہ مانا کہ اختیار نہیں
اور اگر اختیار ہو جائے

احسان دانش

○

عشق نے حسن کو تن ہی نہیں من بیچ دیا
معصیت کرتی رہی لاکھ جتن بیچ دیا

عشق نے حسن کی اک نیم نگاہی کے عوض
تاج و اورنگِ سلاطینِ زمن بیچ دیا

آج کل بارگہِ حسن ہے اور اہلِ ہوس
عشق نے سلسلۂ دار و رسن بیچ دیا

ان کو آتی نہیں خورشید کے رشتوں کی کمند
جن صدفوں نے ستاروں کا کفن بیچ دیا

جورِ صیاد کی کس منہ سے شکایت کیجے
اہلِ گلشن نے بھی تو ہر صحنِ چمن بیچ دیا

کوئی دیوانوں سے پوچھے یہ خموشی کیسی
کیا کہیں نعرۂ بت خانہ شکن بیچ دیا

صرف نغمے ہی نہیں لے بھی بدلنی ہوگی
باغبانوں نے سنا ہے کہ چمن بیچ دیا

دل اُمڈ آیا ہے احسانؔ بھر آئے آنسو
جب سنا ہے کسی فنکار نے فن بیچ دیا

○

اب کہو کارواں کدھر کو چلے
راستے کھو گئے چراغ جلے

آنسوؤں میں نہا گئیں خوشیاں
رو پڑے جب وہ آ لگے ہیں گلے

کاروانوں میں شورِ منزل تھا
آئی منزل تو سب نے ہاتھ ملے

وقتِ غم کو عبور کر نہ سکا
راستے کارواں کے ساتھ چلے

ہم پہ گزری ہیں ہجر کی راتیں
ہم جہنم میں تھے مگر نہ جلے

تھے محبت کی ابتدا کے قصور
وہ تبسم جو آنسوؤں میں ڈھلے

آشیانوں پہ ظلمتیں برسیں
برق کے جس وقت چراغ جلے

وقت کی بات، میکدے والو
رات ڈھلنے کو ہے شراب ڈھلے

نغمہ ہائے حیات گائے کون
ساز اترے ہوئے ہیں خشک گلے

خاک سے سینکڑوں اُگے خورشید
ہے اندھیرا اگر چراغ تلے

چاند ساکت ہے رک گئے تارے
اب وہ آئیں تو غم کی رات ڈھلے

میکدے کا تو ذکر بھی ہے گناہ
اب حیاتِ حرم پڑی ہے گلے

پرسشِ حال کا جواب تھا کیا
ہنس پڑے ہم کہ جلد بات ٹلے

صبحِ نو کے گجر کو کیا معلوم
گھٹ گئے کتنے زمزموں کے گلے

○

ے آستاں سے لوٹ آئے
جنتِ دو جہاں سے لوٹ آئے
ے مقام سے آگاہ
سرحدِ امکاں سے لوٹ آئے
نجم کے ساتھ تھے ہم بھی
ہم مگر درمیاں سے لوٹ آئے
ا بھی قفس میں جن تن کا
بارہا آشیاں سے لوٹ آئے
سینے میں روشنی کر دو
اب تو کوئے بتاں سے لوٹ آئے
ں کو جہاں سے نسبت تھی
حلقۂ گلستاں سے لوٹ آئے
ہے اک آشنا آواز
بے خودی ہم کہاں سے لوٹ آئے
جو گردِ راہ ہیں اب تک
وائے جو کارواں سے لوٹ آئے
مرے ان کے دیوانے
ناخوش و سرگراں سے لوٹ آئے
اش احساں وہ خلدِ رعنائی
رضِ ہندوستاں سے لوٹ آئے

○

جب جوانی کی دھوپ ڈھلتی ہے — خودسری سر جھکا کے چلتی ہے
یاس میں ان کے لطف کی امید — ظلمتوں میں کرن مچلتی ہے
اُف وہ معذوریٔ نگاہ کہ جب — زندگی بندگی میں ڈھلتی ہے
دل سلگتا نہ ہو بہاروں کا — اشکِ شبنم سے لَو نکلتی ہے
لامکاں کے لیے عروسِ حیات — موت کے بھیس میں نکلتی ہے
تجربہ ہے کہ دشمنی اکثر — دوستی کے لہو سے پلتی ہے
ہوشیار اے وفا کے دیوانے — یہ وفا آنسوؤں میں ڈھلتی ہے
تھک گیا چاند سو چلے تارے — اب تو آؤ کہ رات ڈھلتی ہے
شامِ غم میں خیال ہے اُن کا — اور جنگل میں آگ جلتی ہے
یاس سے بیٹھتی ہے کشتی کو — آس ساحل پہ ہاتھ ملتی ہے
بعض اوقات دل کی دنیا بھی — آنکھ کے فیصلوں پہ چلتی ہے
مسجدوں میں سکوت کیا معنی — میکدوں میں شراب ڈھلتی ہے
عشرتِ بے ثبات کی لَو میں — جسم بنتا ہے روح جلتی ہے

دورِ حاضر کی دوستی احساںؔ
کس قدر جلد رُخ بدلتی ہے

○

فریبِ قضا کھا گئی تو کیا ہوگا   حیات موت سے ٹکرا گئی تو کیا ہوگا
م ہوشِ تجلی کی جستجو بے سود   جنوں کی زد پہ خزاں آ گئی تو کیا ہوگا
سحر کے بہت لوگ منتظر ہیں مگر   نئی سحر بھی جو کجلا گئی تو کیا ہوگا
بناؤں کی مجلس میں لے چلو مجھ کو   میں بے ادب ہوں ہنسی آ گئی تو کیا ہوگا
یات بیشک ہے خودکشی آساں   مگر جو موت بھی شرما گئی تو کیا ہوگا
ب لالہ و گل کو پکارنے والو   خزاں سرشت بہار آ گئی تو کیا ہوگا
ی چینی ہے تو غم کا بھی اعتماد نہ کر   جو روح غم سے بھی اکتا گئی تو کیا ہوگا
لر کر ان آسودگی کے دھوکوں میں   تری خودی کو بھی موت آ گئی تو کیا ہوگا
داستاں جو مصائب میں فن سے ہے تک   زبانِ خلق پہ گر آ گئی تو کیا ہوگا
ہے میں جگر جس سے کوہساروں کے   اگر وہ لہر یہاں آ گئی تو کیا ہوگا

وہ موت جس کی ہم احسان سن رہے ہیں خبر
رموزِ زیست بھی سمجھا گئی تو کیا ہوگا

○

پرسشِ غم کا شکریہ! کیا تجھے آگہی نہیں
تیرے بغیر زندگی درد ہے زندگی نہیں

دور تھا اک گزر گیا، نشہ تھا اک اتر گیا
اب وہ مقام ہے جہاں شکوۂ بے رخی نہیں

تیرے سوا کروں پسند کیا تری کائنات میں
دونوں جہاں کی نعمتیں قیمتِ بندگی نہیں

عشرتِ خلد کے لیے زاہدِ کج نظر جھکے
مشربِ عشق میں تو یہ جرم ہے بندگی نہیں

لاکھ زمانہ ظلم ڈھائے، وقت وہ خدا دکھائے
جب مجھے ہو یقیں کہ تو حاصلِ زندگی نہیں

دل کی شگفتگی کے ساتھ راحتِ میکدہ گئی
فرصتِ میکشی تو ہے، حسرتِ میکشی نہیں

ایک وہ رات تھی کہ جب تھا مرے گھر وہ ماہتاب
ایک یہ رات ہے کہ اب چاند ہے چاندنی نہیں

زخم پہ زخم کھا کے جی اپنے لہو کے گھونٹ پی
آہ نہ کر لبوں کو سی عشق ہے دل لگی نہیں

دیکھ کے خشک و زرد پھول دل ہے کچھ اس طرح ملول
جیسے تری خزاں کے بعد دورِ بہار ہی نہیں

ساغر نظامی

○

دشت میں قیس نہیں، کوہ پہ فرہاد نہیں
ہے وہی عشق کی دنیا، مگر آباد نہیں

ڈھونڈنے کو تجھے او میرے نہ ملنے والے
وہ چلا ہے، جسے اپنا بھی پتہ یاد نہیں

روحِ بلبل نے خزاں بن کے اجاڑا گلشن
پھول کہتے رہے ہم پھول ہیں، صیاد نہیں

حُسن سے چوک ہوئی، اس کی ہے تاریخ گواہ
عشق سے بھول ہوئی ہو، یہ مجھے یاد نہیں

بربطِ ماہ پہ مضرابِ فغاں رکھ دی تھی
میں نے اک نغمہ سنایا تھا، تمھیں یاد نہیں

لاؤ، اک سجدہ کروں عالمِ بدمستی میں
لوگ کہتے ہیں کہ ساغر کو خدا یاد نہیں

○

نغمے ہوا نے چھیڑے فطرت کی بانسری میں
پیدا ہوئیں زبانیں جنگل کی خامشی میں

اس وقت کی اداسی ہے دیکھنے کے قابل
جب کوئی رو رہا ہو افسردہ چاندنی میں

کچھ تو لطیف ہوتیں گھڑیاں مصیبتوں کی
تم ایک دن تو ملتے، دو دن کی زندگی میں

ہنگامۂ تبسم ہے میری ہر خموشی
تم مسکرا رہے ہو دل کی شگفتگی میں

خالی پڑے ہوئے ہیں پھولوں کے سب صحیفے
رازِ چمن نہاں ہے کلیوں کی خامشی میں

○

ں رنج میں دل میں سمائے جاتے ہیں — ہر ایک عالمِ امکاں پہ چھائے جاتے ہیں
ڑ سکے تھے نہ خود حسن کے اُٹھانے سے — وہ پردہ ہائے دوئی اب اٹھائے جاتے ہیں
ئے تھے نہ خود عشق کے گرانے سے — وہ سب حجابِ محبت گرائے جاتے ہیں
چھپا کے جنھیں مصلحت نے رکھا تھا — وہ جلوے اب سرِ محفل دکھائے جاتے ہیں
ل کرلے نگہِ شوق! بزمِ دوست ہے یہ — یہاں خرابِ نظر آزمائے جاتے ہیں
چھ کارگہِ عشق کا طلسم نہ پوچھ — قدم قدم پہ تماشے دکھائے جاتے ہیں
میں نہیں ان کا اور ان کے دیوانے — تصورات کی محفل سجائے جاتے ہیں
ی کی لغزشِ پا اب یہ حال ہے ساقی — کہ سر سے تا بہ قدم ڈگمگائے جاتے ہیں
. وہ ہے تر دامنِ سر نہیں واعظا! — یہاں شراب سے انساں بنائے جاتے ہیں
یہ محو ہے آتش کدہ محبت کا — بجائے شمع یہاں دل جلائے جاتے ہیں
عالمِ محسوس کانپ اٹھتا ہے — جب آنکھ سے کہیں آنسو بہائے جاتے ہیں
. ماں تو دیکھا، ہنا اعزت بھی دیکھ — نگاہ اٹھتی نہیں غم اٹھائے جاتے ہیں

تلاش لازمۂ عاشقی نہیں ساغر
نہ ڈھونڈنے پہ بھی وہ ہم میں پائے جاتے ہیں

○

کافرِ گیسو والوں کی رات بسر یوں ہوتی ہے
حسن حفاظت کرتا ہے اور جوانی سوتی ہے

مجھ میں تجھ میں فرق نہیں، مجھ میں تجھ میں فرق ہے یہ
تو دنیا پر ہنستا ہے، دنیا مجھ پر روتی ہے

اس معمورۂ انسانی سے ضبط ذرا ہشیار رہے
دل کی ہر گہرائی میں ایک اچھوتا موتی ہے

صبر و سکوں دو دریا ہیں، بھرتے بھرتے بھرتے ہیں
تسکینِ دل کی بارش ہے، ہوتے ہوتے ہوتی ہے

جینے میں کیا راحت تھی، مرنے میں تکلیف ہے کیا
جب دنیا کیوں ہنستی تھی؟ اب دنیا کیوں روتی ہے؟

دل کی تو تشخیص ہوئی، چارہ گروں سے پوچھوں گا
دل جب دھک دھک کرتا ہے، وہ حالت کیا ہوتی ہے

ساون آئے پھول کھلے، اک افسردہ یہ بول اٹھا
جس میں دل کھل جاتے ہیں، وہ رُت کب ہوتی ہے

ذرّے اور تارے مل کر جادو روز جگاتے ہیں
فطرت کی بیداری میں ساری دنیا سوتی ہے

رات کے آنسو اے ساغر پھولوں میں بھر جاتے ہیں
صبحِ چمن اس پانی سے کلیوں کا منہ دھوتی ہے

○

ساون کی رُت آپہنچی، کالے بادل چھائیں گے
کلیاں رنگ میں بھیگیں گی، پھولوں میں رس آئیں گے

ہاں! وہ ملنے آئیں گے، ہم بھی کچھ فرمائیں گے
حسن مگر چنچل ہے گا، پھر رستے ہی سے جائیں گے

تلے گھرے دھندلکے میں شام ہوئی رات آپہنچی
پریم کے سونے مندر میں آخر وہ کب آئیں گے

ہستی کی یہ مستی کیا، ہستی خود اک مستی ہے
موت اسی دن آئے گی، ہوش میں جس دن آئیں گے

میری آنکھیں کچھ بھی نہیں، تیرے جلوے ہی جلوے ہیں
تو جب سامنے آئے گا، پردے سے پڑ جائیں گے

تارے کتنے ہی چمکیں، جگنو کتنے ہی چمکیں
شمع کی زردی کہتی ہے، رات گئے وہ آئیں گے

○

راتوں کو تصوّر رہے اُن کا، اور چپکے چپکے رونا ہے
اے صبح کے تارے تو ہی بتا! انجام مرا کیا ہونا ہے

ان نورسی آنکھوں والوں کا کیا ہنسنا ہے کیا رونا ہے
ہنسنے سچے موتی ہیں، بہتا ہوا خالص سونا ہے

دل کو کھویا، خود بھی کھوئے، دنیا کھوئی، دین بھی کھویا
یہ گم شدگی ہے تو اک دن اے دوست! تجھے بھی کھونا ہے

تمیزِ کمال و نقص اٹھا، یہ تو روشن ہے دنیا پر
میں چندن ہوں تو کندن ہے، میں مٹی ہوں تو سونا ہے

تو یہ نہ سمجھ للہ! کہ ہے تسکین ترے دیوانوں کو
وحشت میں ہمارا ہنس پڑنا، دراصل ہمارا رونا ہے

ماتم ہے مری آوازِ شکستِ سازِ دلِ صد پارہ کا
ساغرؔ میرا نغمہ بھی دیپک کے سروں میں رونا ہے

اختر انصاری

○

کسی سے لڑائیں نظر اور جھیلیں محبت کے غم اتنی فرصت کہاں
اٹھائیں کسی ماہ پیکر حسینہ کے جور و ستم اتنی فرصت کہاں

زمانے کی بے رحمیوں کے تصدق دماغِ نشاط و الم ہی نہیں
دل اپنا کرے آرزوئے جفا یا امیدِ کرم اتنی فرصت کہاں

ڈبو دیں مئے ناب کی مستیوں میں فلاکت کے نکبت کے احساس کو
بنائیں کسی عامیانہ سے کوزے ہی کو جامِ جم اتنی فرصت کہاں

ہوں آزادِ افکار لیکن تفکر میں ڈوبے ہوئے سے رہیں رات دن
طبیعت کی بے وجہ افسردگی کے مزے لوٹیں ہم اتنی فرصت کہاں

نہ ماضی ہمارا نہ مستقبل اپنا کچھ اس طور سے صرفِ امروز ہیں
غمِ دوش یا فکرِ فردا میں اختر کریں سر کو خم اتنی فرصت کہاں

○

کوئی مآلِ محبت مجھے بتاؤ نہیں
میں خواب دیکھ رہا ہوں مجھے جگاؤ نہیں

کسی کی یاد سے ان کی مہک سے وابستہ
مجھے یہ پھول خدا کے لیے سنگھاؤ نہیں

محبت اور جوانی کے تذکرے نہ کرو
کسی ستائے ہوئے کو بہت ستاؤ نہیں

یہ کہہ رہا ہے محبت کی کاوشوں سے دل
یہ میرے ہنسنے کے دن ہیں مجھے رلاؤ نہیں

اُجڑ کے پھر نہیں بستا جہانِ دلِ خستہ
بہارِ باغ کو اس پہ دلیل لاؤ نہیں

○

ساون کی رُت آپہنچی، کالے بادل چھائیں گے
کلیاں رنگ میں بھیگیں گی، پھولوں میں رس آئیں گے

ہاں! وہ ملنے آئیں گے، ہم بھی کچھ فرمائیں گے
حسن مگر چنچل ہے گا، پھر تاکی ہو جائیں گے

نیلے گھونگھٹ ڈھلکے ہیں، شام ہوئی رات آپہنچی
پریم کے سُونے مندر میں آخر وہ کب آئیں گے

ہستی کی بدمستی کیا، ہستی خود اک مستی ہے
موت اسی دن آئے گی، ہوش میں جس دن آئیں گے

میری آنکھیں کچھ بھی نہیں، تیرے جلوے، جلوے ہیں
تو جب سامنے آئے گا، پردے سے پڑ جائیں گے

تارے کتنے ہی چھلکیں، جگنو کتنے ہی چمکیں
شمع کی زردی کہتی ہے، رات گئے وہ آئیں گے

○

راتوں کو تصوّر ہے اُن کا اور چپکے چپکے رونا ہے
اے صبح کے تارے تو ہی بتا! انجام مرا کیا ہونا ہے

ان نورس آنکھوں والوں کا کیا ہنسنا ہے، کیا رونا ہے
بکھرے تو سچے موتی ہیں، بہتا ہوا خالص سونا ہے

دل کو کھویا، خود بھی کھوئے، دنیا کھوئی، دین بھی کھویا
یہ گم شدگی ہے تو اک دن اے دوست! تجھے بھی کھونا ہے

تیرِ کماں و نقص اشایہ تو روشن ہے دنیا پر
میں چندن ہوں تو کندن ہے، میں مٹی ہوں تو سونا ہے

تو یہ نہ سمجھ اللہ! کہ ہے تسکین ترے دیوانوں کو
وحشت میں ہمارا ہنس پڑنا، دراصل ہمارا رونا ہے

ماتم ہے مری آوازِ شکست سازِ دلِ صد پارہ کا
ساغرؔ میرا نغمہ بھی دیپک کے سُروں میں روتا ہے

اختر انصاری

○

کسی سے لڑائیں نظر اور جھیلیں محبت کے غم اتنی فرصت کہاں
اٹھائیں کسی ماہ پیکر حسینہ کے جور و ستم اتنی فرصت کہاں

زمانے کی بے رحمیوں کے تصدق دماغِ نشاط و الم ہی نہیں
دل اپنا کرے آرزوئے جفا یا امیدِ کرم اتنی فرصت کہاں

ڈبو دیں مئے ناب کی مستیوں میں فلاکت کی نکبت کے احساس کو
بنائیں کسی عامیانہ سے کوزے ہی کو جامِ جم اتنی فرصت کہاں

ہوں آزادِ افکار لیکن تفکر میں ڈوبے ہوئے سے رہیں رات دن
طبیعت کی بے وجہ افسردگی کے مزے لوٹیں ہم اتنی فرصت کہاں

نہ ماضی ہمارا نہ مستقبل اپنا کچھ اس طور سے صرف امروز ہیں
غمِ دوش یا فکرِ فردا میں اختر کریں سر کو خم اتنی فرصت کہاں

○

کوئی مآلِ محبت مجھے بتاؤ نہیں
میں خواب دیکھ رہا ہوں مجھے جگاؤ نہیں

کسی کی یاد سے اِن کی مہک ہے وابستہ
مجھے یہ پھول خدا کے لیے سنگھاؤ نہیں

محبت اور جوانی کے تذکرے نہ کرو
کسی ستائے ہوئے کو بہت ستاؤ نہیں

یہ کہہ رہا ہے محبت کی کاوشوں سے دل
یہ میرے ہنسنے کے دن ہیں مجھے رلاؤ نہیں

اُجڑ کے پھر نہیں بستا جہانِ دل اختر
بہارِ باغ کو اس پہ دلیل لاؤ نہیں

○

بہار آئی زمانہ ہوا خراباتی
ہمارے دل میں بھی اک لہر کاش آجاتی

ہوا بھی سرد ہے بھیگی ہے رات بھی لیکن
سلگ رہی ہے کسی آگ سے مری چھاتی

سمندروں میں یہ ذکر ہے کئی دن سے
صدا جو آتی تھی رونے کی اب نہیں آتی

لگا کے سینے سے شادابیوں کو سو جاتا
مجھے بہارِ جوانی میں موت آجاتی

بجا رہا ہے کوئی رات میں ستار اختر
دھڑک رہی ہے مری آرزوؤں کی چھاتی

○

حلاوتیں نہ ہمیں مل سکیں تکلم کی
سمیٹ لائے فقط بجلیاں تبسم کی

متاعِ صبر کو اشکوں کی نذر کر بیٹھے
ہمارے پاس جو دولت تھی ہم نے یوں گم کی

اڑا لی رونقِ گلزارِ دل کے زخموں نے
بہار چھین لی داغوں نے بزمِ انجم کی

مغنیہ! یہ تری وجد بار موسیقی
ہے بازگشت مری روح کے ترنم کی

خمارِ چشم سے پھوٹی لبوں تک آ پہنچی
لبوں سے چہرے پہ پھیلی ضیا تبسم کی

پلا رہی ہیں نظر کو شرابِ دل افروز
یہ رُخ پہ بکھری ہوئی مستیاں تکلم کی

ہم اس اداس خموشی پہ مرتے ہیں اختر
نثار جس پہ ہیں رعنائیاں تکلم کی

○

زاں میں آگ لگاؤ بہار کے دن ہیں   نئے شگوفے کھلاؤ بہار کے دن ہیں
ٹ و تختۂ خزاں کی تباہ کاری کا   بساطِ عیش بچھاؤ بہار کے دن ہیں
ار گل کی دہک سے جلا کے گلشن کو   گی دلوں کی بجھاؤ بہار کے دن ہیں
کے قطرۂ شبنم میں رنگ و نکہتِ گل   کوئی شراب بناؤ بہار کے دن ہیں
سے کترے چمن کے یہ درس دیتے ہیں   چھلکتے جام لنڈھاؤ بہار کے دن ہیں
ب احتیاط پسندی ہے بھی ناشکری   متاعِ ضبط لٹاؤ بہار کے دن ہیں
شرر گل سے زمانے میں شعلے بھڑکاؤ   حسین فتنے جگاؤ بہار کے دن ہیں
نون شوق کی بے اعتدالیوں کے خلاف   کوئی دلیل نہ لاؤ بہار کے دن ہیں
انی شمعیں بجھا دیں صبا کے جھونکوں نے   نئے چراغ جلاؤ بہار کے دن ہیں
لک رہی ہے بدوشِ ثمر سے شاخِ حیات   یہ بارِ جنس کے اٹھاؤ بہار کے دن ہیں

جنابِ اختر جاں دادۂ رنجِ گل کو
امامِ وقت بناؤ بہار کے دن ہیں

○

صاف ظاہر ہے نگاہوں سے کہ ہم مرتے ہیں
منہ سے کہتے ہوئے یہ بات مگر ڈرتے ہیں

ایک تصویرِ محبت ہے جوانی — گویا
جس میں رنگوں کے عوض خونِ جگر بھرتے ہیں

عشرتِ رفتہ نے جا کر نہ کیا یاد ہمیں
عشرتِ رفتہ کو ہم یاد کیا کرتے ہیں

آسماں سے کبھی دیکھی نہ گئی، اپنی خوشی
اب یہ حالت ہے کہ ہم ہنستے ہوئے ڈرتے ہیں

شعر کہتے ہو بہت خوب تم اختر لیکن
اچھے شاعر یہ سنا ہے کہ جواں مرتے ہیں

○

بہار آئی زمانہ ہُوا خراباتی
ہمارے دل میں بھی اک لہر کاش آجاتی

ہوا بھی سرد ہے بھیگی ہے رات بھی لیکن
سلگ رہی ہے کسی آگ سے مری چھاتی

مسہریوں میں یہ ذکر ہے کئی دن سے
صدا جو آتی تھی رونے کی اب نہیں آتی

لگا کے سینے سے شادابیوں کو سو جاتا
مجھے بہارِ جوانی میں موت آجاتی

بجا رہا ہے کوئی رات میں ستار اختر
دھڑک رہی ہے مری آرزوؤں کی چھاتی

○

ملا وہیں نہ ہمیں مل سکیں تکلّم کی
سمیٹ لائے فقط بجلیاں تبسّم کی

ستارِ صبر کو اشکوں کی نذر کر بیٹھے
ہمارے پاس جو دولت تھی ہم نے یوں گم کی

اُڑا لی رونقِ گلزارِ دل کے زخموں نے
بہار چھین لی داغوں نے بزمِ انجم کی

مغنیہ! یہ تری وجد بار موسیقی
ہے بازگشت مری روح کے ترنّم کی

خمارِ چشم سے پھوٹی لبوں تک آ پہنچی
لبوں سے چہرے پہ پھیلی ضیا تبسّم کی

پلا رہی ہیں نظر کو شرابِ دل افروز
یہ رُخ پہ بکھری ہوئی مستیاں تکلّم کی

ہم اس اداس خموشی پہ مرتے ہیں اختر
نثار جس پہ ہیں رعنائیاں تکلّم کی

○

زاں میں آگ لگاؤ بہار کے دن ہیں   نئے شگوفے کھلاؤ بہار کے دن ہیں
ٹ دو تختۂ خزاں کی تباہ کاری کا   بساطِ عیش بچھاؤ بہار کے دن ہیں
نہ گُل کی دہک سے جلا کے گلشنوں کو   لگی دلوں کی بجھاؤ بہار کے دن ہیں
ا کے قطرۂ شبنم میں رنگ و نکہتِ گُل   کوئی شراب بناؤ بہار کے دن ہیں
دے کر شرے چمن کے یہ رس دیتے ہیں   چھلکتے جام لنڈھاؤ بہار کے دن ہیں
ب احتیاط پسندی سے بھی نا مشکور   متاعِ ضبط لٹاؤ بہار کے دن ہیں
شرارِ گُل سے زمانے میں شعلے بھڑکاؤ   حسین فتنے جگاؤ بہار کے دن ہیں
نونِ شوق کی بے اعتدالیوں کے خلاف   کوئی دلیل نہ لاؤ بہار کے دن ہیں
رانی شمعیں بجھا دیں صبا کے جھونکوں نے   نئے چراغ جلاؤ بہار کے دن ہیں
لک رہی ہے بنوکِ ثمر سے شاخِ حیات   یہ بار ہنس کے اٹھاؤ بہار کے دن ہیں

جنابِ اختر جاں دادۂ رخِ گُل کو
امامِ وقت بناؤ بہار کے دن ہیں

○

صاف ظاہر ہے نگاہوں سے کہ ہم مرتے ہیں
منہ سے کہتے ہوئے یہ بات مگر ڈرتے ہیں

ایک تصویرِ محبت ہے جوانی — گویا
جس میں رنگوں کے عوض خونِ جگر بھرتے ہیں

عشرتِ رفتہ نے جا کر نہ کیا یاد ہمیں
عشرتِ رفتہ کو ہم یاد کیا کرتے ہیں

آسماں سے کبھی دیکھی نہ گئی، اپنی خوشی
اب یہ حالت ہے کہ ہم ہنستے ہوئے ڈرتے ہیں

شعر کہتے ہو بہت خوب تم اختر لیکن
اچھے شاعر یہ سنا ہے کہ جواں مرتے ہیں

شاد عارفی

○

بہ قولِ غالب ہوا کیا ہے جو شور دہقاں کے لہو کا
نشیمنوں سے وہی تعلق ہے آج کل نظمِ شعلہ خو کا

ہجومِ حرماں میں کوئی موقع نہیں عطفی خوش گلو کا
تمہیں مبارک۔ مگر مرے ہاں نہیں ہے مصرف خم و سبو کا

وہاں بہاروں سے باغبانوں کی سازشیں بار ور نہ ہوں گی
جہاں خزاں نے اٹھا دیا ہو سوال کانٹوں کی آبرو کا

یہ اگلے وقتوں کے رہنما۔ ان کی مصلحت پر نگاہ رکھیے
پٹے ہوئے راستوں پہ چل کر فریب دیتے ہیں جستجو کا

ہم اُن کے وعدوں پہ ٹوپیاں کیوں اچھالتے ہیں جو سیاست
ہوا کے جھونکے، قدم کی آہٹ پہ رخ بدلتے ہیں گفتگو کا

کسی کے ظاہر سے اس کے باطن پہ جائزہ سہل ہی نہیں ہے
شراب کی تلخیوں سے پہلے سوال آتا ہے رنگ و بو کا

چمن میں پودوں کے سوکھ جانے کی شکوہ سنجی کو طنز کہہ کر
کہاں ٹھکانے لگا دیا ہے عندلیبانِ خوش گلو کا

جو بن بلائے تمہاری محفل میں آ گئے ہیں اُن کو کیا کہوں میں
وہ اس میں عزت سمجھ رہے ہیں تو ایسی عزت پہ میں نے تھو کا

جوان شاعر تو شاد ان وحشتوں سے دامن بچا چلے ہیں
مگر ضعیفوں میں اب بھی چرچا ہے چاک دامانی و رفو کا

○

بنا پائی نہ ذرّے کو نگینا
تو پھر مصرف ترا اے چشمِ بینا

سرہانے کوئی رکھ جاتا ہے مینا
خدا کا نام لینا اور پینا

نظر ہے اور تماشائے بد و نیک
بُری اچھی بھی پڑتی ہے پینا

پسیجا ہے بتوں کا دل ہمیں پر
ہمیں پتھر کو آیا ہے پسینا

نگینہ ہے دلِ برباد الفت
مگر جو ٹوٹ جائے وہ نگینا

حجاب آلودہ رخسارِ جوانی
دیا پھولوں کو شبنم نے پسینا

جہاں اندیشے ادب کے پاسباں ہوں
وہاں کیا عرضِ جوہر کا قرینا

کہاں ہیں تجربہ کارانِ خلوت
دھڑکتا ہے مرا دل اس کا سینا

مرا مسلک ہے صلح و آشتی شاد
کمینہ ہے جو رکھے مجھ سے کینا

○

چمن کو آگ لگانے کی بات کرتا ہوں
سمجھ سکو تو ٹھکانے کی بات کرتا ہوں

سحر کو شمع جلانے کی بات کرتا ہوں
یہ غافلوں کو جگانے کی بات کرتا ہوں

روش روش پہ بچھا دو ہیں پھول کے کانٹے
چمن سے لطف اٹھانے کی بات کرتا ہوں

وہ باغبان جو پودوں سے بیر رکھتا ہے
یہ آپ ہی کے زمانے کی بات کرتا ہوں

شراب سرخ کی موجوں سے مدعا ہوگا
اگر میں خون بہانے کی بات کرتا ہوں

وہ صرف اپنے لیے جام کر رہے ہیں طلب
میں ہر کسی کو پلانے کی بات کرتا ہوں

یہاں چراغ تلے روشنی سے اندھیرا ہے
کہاں چراغ جلانے کی بات کرتا ہوں

میں انجمن سے اٹھا ہوں کھری کھری کہہ کر
پھر انجمن میں نہ آنے کی بات کرتا ہوں

دلی زباں سے گزارش ہے ناگوار اگر
تو کیا سوال اٹھانے کی بات کرتا ہوں

عتاب روئے زمانہ نہ اٹھ سکے گی کمر میں
گلوں سے اوس اٹھانے کی بات کرتا ہوں

گئے ہوؤں کو نئی فکر دے رہا ہوں شاد
نئے ہوؤں کو سکھانے کی بات کرتا ہوں

○

موج کو آپ کنارا سمجھیں　　ہم کو اس باب میں ہارا سمجھیں

آئیے خون کو پارا سمجھیں　　وہ سمجھتے ہیں اشارا سمجھیں

بے اصولی کو وہ پیارا سمجھیں　　بزم سے مجھ کو سدھارا سمجھیں

یہ سمجھنا کوئی توہین نہیں　　غلطی کر کے دوبارا سمجھیں

غالباً یہ تو نہ ممکن ہوگا　　ہم تباہی کو نظارا سمجھیں

ہو کے آزاد ہوا اندازہ　　جیتنے والے کو ہارا سمجھیں

فرصت عشق میسر ہی کہاں　　اب کسے عشق کا مارا سمجھیں

اس سے پہلے کہ اجڑ جائے چمن　　باغبانوں کو غدارا سمجھیں

حکم یہ ہے ستم آرا نہ کہیں　　اور دل میں ستم آرا سمجھیں

آ گیا وقت کہ وہ گھبرا کر　　پھول کو سرخ ستارا سمجھیں

واسطہ اُن سے پڑا ہے ارشاد

○

اپنی تقدیر کو پیٹے جو پریشاں ہے کوئی
آپ کے بس میں علاجِ غمِ دوراں ہے کوئی

لٹ گئے اس کو جو اس وقت غزل خواں ہے کوئی
جیل میں عشق لٹانے کا بھی امکاں ہے کوئی

اپنی مرضی سے تو اُگتے نہیں خود رُو پودے
ہم غریبوں کا بہ ہر حال نگہباں ہے کوئی

زرد چہروں نے تبسم کو کیا ہے رُسوا
ورنہ ظاہر بھی نہ ہوتا کہ پریشاں ہے کوئی

گل رخسار فسردہ ۔ نہ جبیں عرق آلود
آپ کس طرح یہ کہتے ہیں پشیماں ہے کوئی

چاپ سن کر جو ہٹا دی تھی، اُٹھا لا ساقی
شیخ صاحب ہیں میں سمجھا تھا مسلماں ہے کوئی

حرص دربان کو آقا کا مصاحب مانے
نسبتہً آقا کو سمجھتا ہے کہ درباں ہے کوئی

ضبطِ اظہارِ وفا کوئی بڑی بات نہیں
ضبطِ بہتانِ خطا سہل ہے آساں ہے کوئی

بھرے کافر کے یہاں شاد مکمل سرقہ
عسسِ شہر بڑا صاحبِ دیواں ہے کوئی

○

یہ سجدہ ہے کہ تجدیدِ وفا ہے
اسے اللہ بہتر جانتا ہے

تمھیں رہبر سمجھنا پڑ گیا ہے
ہماری بیکسی کی انتہا ہے

ہماری جرأتوں پر وہ ہنسا ہے
ہنسا۔ لیکن پسینہ آگیا ہے

میں اپنے لفظ واپس لے رہا ہوں
یہ رہزن تھا۔ میں سمجھا رہنما ہے

برابر ہیں فغانیں درد و نغمہ
یہ آزادی نہیں تو اور کیا ہے

بہ ہر حالت تجھی کو پوجتے ہیں
بہ ہر صورت۔ ہمارا بھی خدا ہے

یہی ہے شاد میں سب سے بڑا عیب
وہ کہتا ہے جو کچھ دیکھتا ہے

نہال سیوہاروی

○

…شخص جہاں خاک بسر یاد تو ہوگا — وہ اپنی نگاہوں کا اثر یاد تو ہوگا
وہ دھوم زمانے میں مرے جوشِ جنوں کی — وہ غلغلۂ شام و سحر یاد تو ہوگا
…ضے تو نہ ہونگے وہ تجلی کی حکایت — وہ تذکرۂ داغِ جگر یاد تو ہوگا
ہر گام پہ وہ حسن کی پُرہوش نگاہیں — وہ عشق کا بدمست سفر یاد تو ہوگا
… وہ دنیا سے محبت میں تنفر — ہر سانس میں وہ رنگِ اثر یاد تو ہوگا
وہ وال کے رستے میں خود آرائے تعشق — وہ خاک سرِ بامِ نظر یاد تو ہوگا
وہ اور دہر سے اک بے خبری سی — وہ طعنۂ ہر اہلِ خبر یاد تو ہوگا
وہ دیکھ کے نظارۂ آرائشِ گیتی — پھر دن طرف راہگزر یاد تو ہوگا
وہ حسن کے جذبات کا بھرپور تلاطم — طوفان کی موجوں میں گزر یاد تو ہوگا
گزرے وہ سکوں پا کے مچلنے پہ گئی پھر — کہنا وہ تجاہل سے کدھر یاد تو ہوگا

بھول تو نہ ہوگی مری الفت کی حقیقت
مدت کا فسانہ ہے مگر یاد تو ہوگا

○

ہے کدھر وہ سلسلۂ کرم ہے کہاں وہ ساقیِ نیک خو
کہ جہانِ میکدہ تشنگی سے پکارتا ہے سبو سبو

ہوں منزل سے راہروِ طلب یہ ندائے غیب ہے روز و شب
ابھی اور چل ابھی اور چل، یہی جستجو یہی جستجو

تری حکمتوں کی خبر کہاں جو ہو پردہ در وہ نظر کہاں
ہیں ہزار ناظرِ گلستاں نہیں ایک محرمِ رنگ و بو

ہوں حدیں تمام خیال کی نہ ہو شرح تیرے جمال کی
جو ازل سے تا بہ ابد رہے یہی تذکرہ یہی گفتگو

مری چار دن کی یہ زندگی اسی ذوق و شوق میں کٹ گئی
کبھی یہ حکایتِ آرزو کبھی وہ حکایتِ آرزو

ترا جلوہ رونقِ بحر و بر تو ہر ایک خوب سے خوب تر
کبھی اپنی سمت نگاہ کر کہ فروغِ بزمِ جہاں ہے تو

ترے ولولے ہیں اگر جواں ہو بہ رنگِ سیلِ رواں دواں
کہ ہے ننگِ ہمتِ آدمی روشِ قناعتِ آب جو

ستمِ زمانہ سے تجھ کو رم ہے خفائے دستِ ہر الم
مجھے آشیاں کی تلاش ہے مجھے بجلیوں کی ہے جستجو

○

دم گھٹتا ہے یہ عالم ہے طوفانوں کی
ایک بجلی سی تڑپ ہے مرے ارمانوں کی

یہی بے لوث محبت یہی غمخواری خلق
اور سوا اس کے کہتے ہیں انسانوں کی

ـے مری ہمت مردانہ تری جسم دراز
توڑ ڈالی ہے کلائی کئی طوفانوں کی

آج کچھ لوگ وطن جس سے بچھڑ کے اب
کل جو دنیا تھی چھلکتے ہوئے پیمانوں کی

ـس قدر عام ہے اس دہر میں احساس حیات
رگ ہر سنگ میں اک لہر ہے طوفانوں کی

ـام ہے کیا اسی ہنگامے کا آغاز شباب
ایک آندھی سی چلی آتی ہے ارمانوں کی

ـات کب سنتے ہیں دنیا کی ترے دیوانے
منتظر بات ہے یہ دنیا ترے دیوانوں کی

ـس قدر وحشت سے ہوتی ہے فزوں وسعت فکر
حد کھلتی ہے بنا جس سے زندانوں کی

ـی مرت اپنی تباہی کی طرف کیا دیکھیں
کر نگاہیں طرف شمع ہیں پروانوں کی

ـرگئی عمر بہاروں کے تصور میں تمام
سیر کرتے رہے نادیدہ گلستانوں کی

ماسوا اس کے نہیں اور کچھ افسانۂ ہند
ایک تاریخ ہے اجڑے ہوئے کاشانوں کی

○

جنوں ہے گرم تلاش اثر فغاں کے لیے
فغاں ہے سینۂ سوزاں کے امتحاں کے لیے

اڑا دیے ہیں کچھ ارباب گلستاں نے تو کیا
ہزار شعلۂ نو ہیں مری فغاں کے لیے

زمیں کرہ جاناں سے آرہی ہے صدا
بلندیاں نہیں مخصوص آسماں کے لیے

ہے ختم جو سلسلہ ہی وجود آدم پر
ستیزہ کار ہے ہر فتح عزم جاں کے لیے

چمن کی سرد ہواؤں نے دی ہے مجھے تسکین
میں دل گرفتہ ہوا جب سکون جاں کے لیے

الٰہی محفل انجم میں جلوہ گر ہے کون
یہ چاندنی نے کیا گیت کس جہاں کے لیے

ہے سخت بے ادبی کر کے فسانۂ عشق
ہر ایک بات مناسب نہیں زباں کے لیے

اندھیری رات، تھکی بستیں، کوئی منزل
سلامتی کی دعا مانگ کارواں کے لیے

بچائی نظر رخشاں نے میری جرم بجرم
تھی منتظر یہ زمیں ناز آسماں کے لیے

○

ر کا، روپ بھی نگاہوں میں اک فریبِ بہار سا ہے
ت میں کشش نہیں ہے حیات میں انتشار سا ہے

دیا دیکھئے دکھائے ابھی نہ جانے کیا انقلاب آئے
کے تیور میں خنکیں ہے زمیں کے دل میں غبار سا ہے

ل پہ اپنی توجہ ہے نہ احساسِ جیب و دامن
ہے احساسِ جیب و دامن تو پھر جنوں ہوشیار سا ہے

تی ابھی ابھی جگہ یہ گندی بنی ہوئی تھی جو چوٹ ابھری
ہ سنبھالے سنبھل تھا دل میں وہ نالۂ بے اختیار سا ہے

ں، یہ وفا نہ تو رہو، سیاست دلبری نہ چھوڑو
ں جو ذرہ دہی رنگ جو تھا وہ ایک ہجرِ ادبار سا ہے

ل ہیں ہے مستی ہے منت الزام سے یہی
دو اس شعر کی وضاحت یہ شخص کچھ بادہ خوار سا ہے

○

زندگی زہر کا اک جام ہوئی جاتی ہے
کیا سے کیا یہ مے گلفام ہوئی جاتی ہے

یوں گزاری ہے غمِ عشق و محبت میں حیات
کچھ سپردِ غمِ ایام ہوئی جاتی ہے

ہوتا جاتا ہے یہ عالم ہمہ تن عالمِ درد
خلشِ غم خلشِ عام ہوئی جاتی ہے

آ چلا پیرِ مغاں وقتِ چراغانِ حیات
زرد ہے مہرِ مبیں، شام ہوئی جاتی ہے

ہوسِ سیر تماشہ ہے کہ ہوتی نہیں ختم
زندگی ہے کہ سبک گام ہوئی جاتی ہے

کن حقائق پہ نظر اب ہے کہ یہ بزمِ وجود
اک صنم خانۂ اوہام ہوئی جاتی ہے

صحبتِ پیرِ مغاں میں یہ کھلی عظمتِ عشق
عقل بھی دُردِ تہِ جام ہوئی جاتی ہے

اللہ اللہ رے تیرا اقبالِ عروج
تیرہ بختوں کی سحر شام ہوئی جاتی ہے

العجب بالعجب اے ہمتِ پرواز کہ تو
شاکیٔ گردشِ ایام ہوئی جاتی ہے

تم جو آئے ہو تو مشکل درد و دوا ہے لب
کتنی رنگیں مری شام ہوئی جاتی ہے

کیوں نہ دھوم آئے تری نکتہ طرازی پہ نہال
غزل اک نغمۂ الہام ہوئی جاتی ہے

اسرار الحق مجاز

○

شوق کے ہاتھوں اے دلِ مضطر کیا ہونا ہے کیا ہوگا
عشق تو رسوا ہو ہی چکا ہے حسن بھی کیا رسوا ہوگا

حسن کی بزمِ خاص میں جا کر اس سے زیادہ کیا ہوگا
کوئی نیا پیماں باندھیں گے کوئی نیا وعدہ ہوگا

چارہ گری سر آنکھوں پر اس چارہ گری سے کیا حاصل
درد کی اپنی آپ دوا ہے تم سے اچھا کیا ہوگا

واعظِ سادہ لوح سے کہہ دو چھوڑے عقبیٰ کی باتیں
اِس دنیا میں کیا رکھا ہے اُس دنیا میں کیا ہوگا

○

مری وفا کا ترا لطف بھی جواب نہیں
مرے شباب کی قیمت ترا شباب نہیں
یہ ماہتاب نہیں ہے کہ آفتاب نہیں
سبھی ہے حسن، مگر عشق کا جواب نہیں
مری نگاہ میں جلوے ہیں جلوے ہی جلوے
یہاں حجاب نہیں ہے یہاں نقاب نہیں
جنوں بھی حد سے سوا شوق بھی ہے حد سے سوا
یہ بات کیا ہے کہ میں موردِ عتاب نہیں
یہاں تو حسن کا دل بھی ہے غم سے صد پارہ
میں کامیاب نہیں وہ بھی کامیاب نہیں
یہاں تو رات کی بیداریاں مسلّم ہیں
مگر وہاں بھی حسین انکھڑیوں میں خواب نہیں
نہ پوچھیے مری دنیا کو میری دنیا میں
خود آفتاب بھی ذرہ ہے آفتاب نہیں
سبھی ہیں میکدۂ دہر میں خرد والے
کوئی خراب نہیں ہے کوئی خراب نہیں
مجاز کس کو میں سمجھاؤں کوئی کیا سمجھے
کہ کامیاب محبت بھی کامیاب نہیں

مجاز

○

ربادِ تمنا یہ عتاب اور زیادہ
ہں میری محبت کا جواب اور زیادہ

رو دیں نہ ابھی اہلِ نظر حال پہ میرے
ہونا ہے ابھی مجھ کو خراب اور زیادہ

آوارہ و مجنوں ہی پہ موقوف نہیں کچھ
ملنے ہیں ابھی مجھ کو خطاب اور زیادہ

اٹھیں گے ابھی اور بھی طوفاں مرے ل سے
دیکھوں گا ابھی عشق کے خواب اور زیادہ

ٹپکے گا لہو اور مرے دیدۂ تر سے
دھڑکے گا دلِ خانہ خراب اور زیادہ

ہو گی مری باتوں سے انھیں اور بھی حیرت
ئے گا انھیں مجھ سے حجاب اور زیادہ

اے مطربِ بیباک کوئی اور بھی نغمہ
اے ساقیٔ فیاض شراب اور زیادہ

○

کچھ تجھ کو خبر ہے ہم کیا کیا اے شورشِ دوراں بھول گئے
وہ زلفِ پریشاں بھول گئے وہ دیدۂ گریاں بھول گئے

اے شوقِ نظارہ کیا کہیے نظروں میں کوئی صورت ہی نہیں
اے ذوقِ تصور کیا کیجے ہم صورتِ جاناں بھول گئے

اب گل سے نظر ملتی ہی نہیں اب دل کی کلی کھلتی ہی نہیں
اے فصلِ بہاراں رخصت ہو ہم لطفِ بہاراں بھول گئے

سب کا تو مداوا کر ڈالا اپنا ہی مداوا کر نہ سکے
سب کے تو گریباں سی ڈالے اپنا ہی گریباں بھول گئے

یہ اپنی وفا کا عالم ہے اب ان کی جفا کو کیا کہیے
اک نشترِ زہر آگیں رکھ کر نزدیکِ رگِ جاں بھول گئے

○

تسکینِ دلِ محزوں نہ ہوئی وہ سعیِ کرم فرما بھی گئے
اس سعیِ کرم کو کیا کہیے بہلا بھی گئے تڑپا بھی گئے

ہم عرضِ وفا بھی کر نہ سکے کچھ کہہ نہ سکے کچھ سن نہ سکے
یاں ہم نے زباں ہی کھولی تھی واں آنکھ جھکی شرما بھی گئے

آشفتگیِ وحشت کی قسم حیرت کی قسم حسرت کی قسم
اب آپ کہیں کچھ یا نہ کہیں ہم رازِ تبسم پا بھی گئے

روداد غمِ الفت ان سے ہم کیا کہتے کیوں کر کہتے
ایک حرف نہ نکلا ہونٹوں سے اور آنکھ میں آنسو آ بھی گئے

اربابِ جنوں پر فرقت میں اب کیا کہیے کیا کیا گزری
آئے تھے سوادِ الفت میں کچھ کھو بھی گئے کچھ پا بھی گئے

یہ رنگِ بہارِ عالم ہے کیوں فکر ہے تجھ کو اے ساقی
محفل تو تری سونی نہ ہوئی کچھ اٹھ بھی گئے کچھ آ بھی گئے

اس محفلِ کیف و مستی میں اس انجمنِ عرفانی میں
سب جام بکف بیٹھے ہی رہے ہم پی بھی گئے چھلکا بھی گئے

○

جنونِ شوق اب بھی کم نہیں ہے
مگر وہ آج بھی برہم نہیں ہے

بہت مشکل ہے دنیا کا سنورنا
تری زلفوں کا پیچ و خم نہیں ہے

بہت کچھ اور بھی ہے اس جہاں میں
یہ دنیا محض غم ہی غم نہیں ہے

تقاضے کیوں کروں پیہم نہ ساقی
کسے یاں فکرِ بیش و کم نہیں ہے

مری بربادیوں کا ہم نشینو!
تمہیں کیا خود مجھے بھی غم نہیں ہے

ابھی بزمِ طرب سے کیا اٹھوں میں
ابھی تو آنکھ بھی پُرنم نہیں ہے

بایں سیلِ غم و سیلِ حوادث
مرا سر ہے کہ اب بھی خم نہیں ہے

معین احسن جذبی

○

شریکِ محفلِ دار و رسن کچھ اور بھی ہیں
ستم گرو ابھی اہلِ کفن کچھ اور بھی ہیں

رواں دواں یوں ہی اے ننھی بوندیو کہ ابر
کہ اس دیار میں اجڑے چمن کچھ اور بھی ہیں

خدا کرے نہ تھکیں حشر تک جنوں کے پاؤں
ابھی مسافرِ دشت و دمن کچھ اور بھی ہیں

خدا کرے مری درماندگی کو غیرت آئے
ابھی منازلِ رنج و محن کچھ اور بھی ہیں

ابھی سموم نے مانی کہاں نسیم سے ہار
ابھی تو معرکہ ہائے چمن کچھ اور بھی ہیں

ابھی تو ہیں دلِ شاعر میں سینکڑوں ناسور
ابھی تو معجزہ ہائے سخن کچھ اور بھی ہیں

دلِ گداز نے آنکھوں کو دے دیے آنسو
یہ جانتے ہوئے غم کے چلن کچھ اور بھی ہیں

○

ہم دہر کے اس ویرانے میں جو کچھ بھی نظارا کرتے ہیں
اشکوں کی زباں میں کہتے ہیں آہوں میں اشارا کرتے ہیں

کیا تجھ کو پتہ کیا تجھ کو خبر دن رات خیالوں میں اپنے
اے کاکلِ گیتی ہم تجھ کو جس طرح سنوارا کرتے ہیں

اے موجِ بلا ان کو بھی ذرا دو چار تھپیڑے ہلکے سے
کچھ لوگ ابھی تک ساحل سے طوفاں کا نظارا کرتے ہیں

کیا جانیے کب یہ پاپ کٹے کیا جانیے وہ دن کب آئے
جس دن کے لیے ہم اے جذبی کیا کچھ نہ گوارا کرتے ہیں

○

بیتے ہوئے دنوں کی حلاوت کہاں سے لائیں
اک میٹھے میٹھے درد کی راحت کہاں سے لائیں

ڈھونڈیں کہاں وہ نالۂ شب تاب کا جمال
آہِ سحر گہی کی صباحت کہاں سے لائیں

سمجھائیں کیسے دل کی نزاکت کا ماجرا
خاموشیٔ نظر کی خطابت کہاں سے لائیں

ترکِ تعلقات کا ہو جس سے احتمال
بے باکیوں میں اتنی صداقت کہاں سے لائیں

افسردگیٔ ضبطِ الم آج بھی سہی
لیکن نشاطِ ضبطِ مسرت کہاں سے لائیں

آسودگیٔ لطف و عنایت کے ساتھ ساتھ
دل میں دبی دبی سی قیامت کہاں سے لائیں

وہ جوشِ اضطراب یہ کچھ سوچنے کے بعد
حیرت کہاں سے لائیں ندامت کہاں سے لائیں

ہر لحظہ تازہ تازہ بلاؤں کا سامنا
ناآزمودہ کار کی جرأت کہاں سے لائیں

ہے آج بھی نگاہِ محبت کی آرزو
پر ایسی اک نگاہ کی قیمت کہاں سے لائیں

سب کچھ نصیب ہو بھی تو اے شورشِ حیات
تجھ سے نظر چرانے کی عادت کہاں سے لائیں

○

ملے مجھ کو غم سے فرصت تو سناؤں وہ فسانہ
کہ ٹپک پڑے نظر سے مئے عشرتِ شبانہ

یہی زندگی مصیبت، یہی زندگی مسرت
یہی زندگی حقیقت، یہی زندگی فسانہ

کبھی درد کی تمنا کبھی کوششِ مداوا
کبھی بجلیوں کی خواہش، کبھی فکرِ آشیانہ

مرے قہقہوں کی زد پر کبھی گردشیں جہاں کی
مرے آنسوؤں کی رو میں کبھی تلخیٔ زمانہ

مری رفعتوں سے لرزاں کبھی مہر و ماہ و انجم
مری پستیوں سے خائف کبھی اوجِ خسروانہ

کبھی میں ہوں تجھ سے نالاں کبھی مجھ سے تو پریشاں
کبھی میں ترا ہدف ہوں کبھی تو مرا نشانہ

جسے پا سکا نہ زاہد جسے چھو سکا نہ صوفی
وہی تار چھیڑتا ہے مرا سوزِ شاعرانہ

○

مرنے کی دعائیں کیوں مانگوں جینے کی تمنا کون کرے
یہ دنیا ہو یا وہ دنیا اب خواہشِ دنیا کون کرے

جب کشتی ثابت و سالم تھی ساحل کی تمنا کس کو تھی
اب ایسی شکستہ کشتی پر ساحل کی تمنا کون کرے

جو آگ لگائی تھی تم نے اس کو تو بجھایا اشکوں نے
جو اشکوں نے بھڑکائی ہے اس آگ کو ٹھنڈا کون کرے

دنیا نے ہمیں چھوڑا جذبیؔ ہم چھوڑ نہ دیں کیوں دنیا کو
دنیا کو سمجھ کر بیٹھے ہیں اب دنیا دنیا کون کرے

○

جسے آج نغمہ سمجھتی ہے دُنیا
وہی نغمہ کل تک فغاں ہو نہ جائے

جسے سازِ دوراں پہ گانا نہ آیا
وہ مطرب کہیں نوحہ خواں ہو نہ جائے

بچا کر جسے رکھ لیا ہے جبیں میں
وہ سجدہ بھی نذرِ بتاں ہو نہ جائے

نہ کلیاں ہی چٹکیں نہ تارے ہی چمکیں
مرا غم غمِ دو جہاں ہو نہ جائے

احمد ندیمؔ قاسمی

○

افق نشاں ہے تو پھر تو نظر کا ذکر کریں
ستارے ڈوب رہے ہیں سحر کا ذکر کریں

فضا کا ذکر کریں بحر و بر کا ذکر کریں
بہت بلند ہے فردوسِ گہر کا ذکر کریں

صدف کو سامنے پا کر گہر کا ذکر کریں
نظر کے ساتھ ہی حسنِ نظر کا ذکر کریں

خزاں کو بوئے گل و نسترن سے چھلکا دیں
اگر بہار نہیں برگ و بر کا ذکر کریں

ہمیں تو عظمتِ انساں کو آزمانا ہے
حضورِ فلسفۂ خیر و شر کا ذکر کریں

فرار کا یہ نیا روپ ہے اگر ہم لوگ
چراغ توڑ کے نورِ سحر کا ذکر کریں

ستارے کون چنے گا بدستِ زخم آلود
چلو غبارِ سرِ رہگزر کا ذکر کریں

اگر نہایتِ بیچارگی ہے چارہ گری
تو کس امید پہ زخمِ جگر کا ذکر کریں

تمام عمر سکے، چاک دامنی کے گلے
بعزمِ بخیہ گری بخیہ گر کا ذکر کریں

مرے ندیمؔ مری ذات کو بھلا کر آپ
مرے کلام کے نقش و اثر کا ذکر کریں

○

مہک سبو میں مری زیست کا لہو تو نہیں
کہیں مزاجِ زمانہ بہانہ جو تو نہیں

ندی کی رَو میں رواں ہے جو ایک برگِ گلاب
کہیں شباب کا ایوانِ رنگ و بو تو نہیں

پگھل پگھل کے ابھرتی ہے جب چراغ کی لو
میں سوچتا ہوں کہ ان لرزشوں میں تو تو نہیں

یہ سب درست شبِ ہجر کی سحر تو ہوئی
مگر شفق میں مرا خونِ آرزو تو نہیں

افق کی سمت تو قرنوں سے چل رہا تھا ندیمؔ
کہیں یہ راہنما مجھ سا راہ جو تو نہیں

ندیم

○

میں کب سے گوش بر آواز ہوں پکارو بھی
زمیں پہ یہ ستارے کبھی اُتارو بھی

مرے غیور اُمنگو شباب فانی ہے
غرورِ عشق کا دیرینہ کھیل ہارو بھی

سفینہ محوِ سفر ہے تو نارسیدہ نہیں
قدم قدم پہ کنارے ہیں تم سدھارو بھی

مرے خلوص پہ جمنے لگی ہے گردِ حیات
اُداس نقش گرو! اب مجھے نکھارو بھی

بھٹک رہا ہے دھندلکوں میں کاروانِ خیال
بس اب خدا کے لیے کاکلیں سنوارو بھی

مری تلاش کی معراج ہو تمہیں لیکن
نقاب اُٹھاؤ نشانِ سفر ابھارو بھی

یہ کائنات ازل سے سپردِ انساں ہے
مگر ندیم تم اس بوجھ کو سہارو بھی

○

بگاڑ ہو کہ بناؤ، عجیب ترے سبھاؤ
نگاہوں میں ہیں بلائیں تو ابروؤں میں تناؤ

گجر بجا ہے سہانا مگر کرو نہ بہانہ
بجھا تو تم نہ دکھاؤ بجھا چراغ جلاؤ

اگر گھنا ہو اندھیرا اگر ہو دور سویرا
تو یہ اصول ہے میرا کہ دل کے دیپ جلاؤ

اُجڑ رہے ہیں گھرانے بدل رہے ہیں زمانے
ٹپک رہے ہیں دِوانے اُتار ہو کہ چڑھاؤ

خدا کے لب پہ ہنسی ہے خدائی جھوم رہی ہے
تمہاری بات بھلی ہے مری حسین خطاؤ

اِدھر شباب کا مس ہے اُدھر شراب کا رس ہے
قدم قدم پہ قفس ہے ندیم دیکھتے جاؤ

○

پھر چھپاتک تیرگی میں آ گئے　　ہم گجر بجنے سے دھوکا کھا گئے
ہائے خوابوں کی خیاباں سازیاں　　آنکھ کیا کھولی چمن مرجھا گئے
کون تھے آخر جو منزل کے قریب　　آئنے کی چادریں پھیلا گئے
کس تجلی کا دیا ہم کو فریب　　کس دھندلکے میں ہمیں پہنچا گئے
اُن کا آنا حشر سے کچھ کم نہ تھا　　اور جب پلٹے قیامت ڈھا گئے
اک پہیلی کا ہمیں دے کر جواب　　اک پہیلی ہو کے ہر سو چھا گئے
پھر وہی اختر شماری کا نظام　　ہم تو اس تکرار سے اُکتا گئے
رہنماؤ! رات ابھی باقی سہی　　آج سیارے اگر ٹکرا گئے
جن کو ہم سمجھا کئے ابرِ بہار　　وہ بگولے کتنے گلشن کھا گئے
کیا رسا نکلی دعائے اجتہاد　　لیجئے! اگلے زمانے آ گئے
آدمی کے ارتقا کا مدعا　　وہ چھپاتے ہی رہے ہم پا گئے

اب کوئی طوفاں ہی لائے گا سحر
آفتاب ابھرا تو بادل چھا گئے

○

بہار جب بھی چمن میں دیئے جلاتی ہے
ہر اک گل سے مجھے تیری آنچ آتی ہے

بفیضِ لذتِ تخلیق خوں ہو کے کلی
خود اپنے زخم کے پردے میں مسکراتی ہے

وفورِ رنگ میں کھلنے لگی ہے کیوں شبنم
عروسِ گل کو اگر آئنہ دکھاتی ہے

یہ شب ہے یا شفق افشانیوں سے گھبرا کر
نگارِ شامِ حیا سے لٹیں گراتی ہے

یہ کائنات کا آہنگ ہے کہ بزمِ حیات
چٹک کلی کی ستاروں کو گدگداتی ہے

یہ رودِ آب ہے تارے یہ شہرِ لالہ و گل
ابھی وہ آئنہ چمکے اور رات جاتی ہے

عبدالحمید عدم

○

میکدہ تھا چاندنی تھی میں نہ تھا
اک مجسم بے خودی تھی میں نہ تھا

عشق جب دم توڑتا تھا تم نہ تھے
موت جب سر دُھن رہی تھی میں نہ تھا

طور پر چھیڑا تھا جس نے آپ کو
وہ مری دیوانگی تھی میں نہ تھا

وہ حسیں بیٹھا تھا جب میرے قریب
لذتِ ہمسائگی تھی میں نہ تھا

میکدے کے موڑ پر رُکتی ہوئی
مدتوں کی تشنگی تھی میں نہ تھا

میں اور اس غنچہ دہن کی آرزو
آرزو کی سادگی تھی میں نہ تھا

گیسوؤں کے سائے میں آرام کش
سر برہنہ زندگی تھی میں نہ تھا

دیر و کعبہ میں عدم حیرت فروش
دو جہاں کی بدظنی تھی میں نہ تھا

○

عہدِ مستی ہے لوگ کہتے ہیں
مے پرستی ہے لوگ کہتے ہیں

غمِ ہستی خریدنے والو!
موت سستی ہے لوگ کہتے ہیں

ہم جہاں جی رہے ہیں مر مر کر
بزمِ ہستی ہے لوگ کہتے ہیں

ضبطِ توبہ پہ آ رہی ہے ہنسی
تنگ دستی ہے لوگ کہتے ہیں

شاید اک بار اُجڑ کے پھر نہ بسے
دل کی بستی ہے لوگ کہتے ہیں

کیا کریں مہ وشوں سے پیار عدم
بت پرستی ہے لوگ کہتے ہیں

○

اُن مست انکھڑیوں کو کنول کہہ گیا ہوں میں
محسوس ہو رہا ہے غزل کہہ گیا ہوں میں

ساقی! تری نگاہ کو کتنے غرور سے
ہر حادثے کا ردِ عمل کہہ گیا ہوں میں

کہتے ہیں زندگی جسے اِک جرعۂ تلخ کو
سمجھا نہیں تو زہرِ اجل کہہ گیا ہوں میں

کہتے ہیں زندگی جسے مرگِ ناگہاں
اُس اتفاق کو بھی اٹل کہہ گیا ہوں میں

قسمت کی الجھنوں کو عدمؔ کس گریز سے
اُس گیسوئے دراز کا بل کہہ گیا ہوں میں

○

غمِ محبت ستا رہا ہے غمِ زمانہ مسل رہا ہے
مگر مرے دن گزر رہے ہیں مگر مرا وقت چل رہا ہے

وہ ابر آیا وہ رنگ برسے وہ کیف جاگا وہ جام کھنکے
چمن میں یہ کون آگیا ہے تمام موسم بدل رہا ہے

مری جوانی کے گرم لمحوں پہ ڈال دے گیسوؤں کا سایہ
یہ دوپہر کچھ تو معتدل ہو تمام ماحول جل رہا ہے

یہ بھینی بھینی سی مست خوشبو یہ ہلکی ہلکی سی دلنشیں بو
یہیں کہیں تیری زلف کے پاس ایک پروانہ جل رہا ہے

نہ دیکھ او مہ جبیں مری سمت اتنی مستی بھری نظر سے
مجھے یہ محسوس ہو رہا ہے شراب کا دور چل رہا ہے

عدمؔ خرابات کی سحر ہے کہ بارگاہِ رموزِ مستی
اِدھر بھی سورج نکل رہا ہے اُدھر بھی سورج نکل رہا ہے

○

یہ کیسی سرگوشیِ ازل سازِ دل کے پردے ہلا رہی ہے
مری سماعت کھنک رہی ہے کہ تیری آواز آ رہی ہے

حوادثِ روزگار میری خوشی سے کیا انتقام لیں گے
کہ زندگی وہ حسین ضد ہے کہ بے سبب مسکرا رہی ہے

ترا تبسم فروغِ ہستی تری نظر اعتبارِ ہستی
بہار اقرار کر رہی ہے شراب ایمان لا رہی ہے

فسانہ خواں دیکھنا شبِ زندگی کا انجام تو نہیں ہے
کہ شمع کے ساتھ رفتہ رفتہ مجھے بھی کچھ نیند آ رہی ہے

اگر کوئی خاص چیز ہوتی تو خیر دامن جھٹک بھی لیتے
شراب سے تو بہت پرانے مذاق کی باس آ رہی ہے

خرد کے ٹوٹے ہوئے ستارے عدم کہاں تک چراغ بنتے
جنوں کی روشن روش ہی آخر دلوں کو رستے دکھا رہی ہے

○

پھولوں کی ٹہنیوں پہ نشیمن بنائیے
بجلی گرے تو جشنِ چراغاں منائیے

کلیوں کے انگ انگ میں میٹھا سا درد ہے
بیمار نکہتوں کو ذرا گدگدائیے

کب سے سلگ رہی ہے جوانی کی گرم رات
زلفیں بکھیر کر مرے پہلو میں آئیے

بہکی ہوئی سیاہ گھٹاؤں کے ساتھ ساتھ
جی چاہتا ہے شامِ ابد تک تو جائیے

ناسازیِ حیات بھی ہے اک نشاطِ تلخ
حالات کی روش پہ ذرا مسکرائیے

سن کر جسے حواس میں ٹھنڈک سی آ بسے
ایسی کوئی اداس کہانی سنائیے

رستے میں ہر قدم پہ خرابات ہے عدم
یہ حال ہو تو کس طرح دامن بچائیے

سیف الدین سیفؔ

○

دلوں کو توڑنے والو تمہیں کسی سے کیا
ملو تو آنکھ چرا لو تمہیں کسی سے کیا

ہماری لغزشِ پا کا خیال کیوں ہے تمہیں؟
تم اپنی چال سنبھالو تمہیں کسی سے کیا

چمک کے اور بڑھاؤ مری سیہ بختی
کسی کے گھر کے اجالو تمہیں کسی سے کیا

نظر بچا کے گزر جاؤ میری تربت سے
کسی پہ خاک نہ ڈالو تمہیں کسی سے کیا

مجھے خود اپنی نظر میں بنا کے بیگانہ
جہاں کو اپنا بنا لو تمہیں کسی سے کیا

قریبِ نزع بھی کیوں چین لے سکے کوئی
نقاب رخ سے اٹھا لو تمہیں کسی سے کیا

○

غمِ خزاں کی تلافی بہار میں بھی نہیں
کہ اب نگاہ ترے انتظار میں بھی نہیں

تری نگاہ سے بدلی ہے کس طرح دنیا
جو دل کشی تھی خزاں میں بہار میں بھی نہیں

بھڑک اٹھی ہے کچھ اس طرح آتشِ ہستی
قرار سایۂ دامانِ یار میں بھی نہیں

عجب سکوں کا عالم ہے یاس کا عالم
یہ دل کشی تو غمِ انتظار میں بھی نہیں

ہلاک جبرِ مسلسل یہی سمجھتے ہیں
نظامِ دہر ترے اختیار میں بھی نہیں

○

قریبِ موت کھڑی ہے ذرا ٹھہر جاؤ
قضا سے آنکھ لڑی ہے ذرا ٹھہر جاؤ

تھکی تھکی سی فضائیں بجھے بجھے تارے
بڑی اُداس گھڑی ہے ذرا ٹھہر جاؤ

نہیں امید کہ ہم آج کی سحر دیکھیں
یہ رات ہم پہ کڑی ہے ذرا ٹھہر جاؤ

ابھی نہ جاؤ کہ تاروں کا دل دھڑکتا ہے
تمام رات پڑی ہے ذرا ٹھہر جاؤ

عروسِ شام ابھی گیسوؤں کے سائے میں
کنیز بن کے کھڑی ہے ذرا ٹھہر جاؤ

پھر اس کے بعد کبھی ہم نہ تم کو روکیں گے
لبوں پہ سانس اڑی ہے ذرا ٹھہر جاؤ

دمِ فراق میں جی بھر کے تم کو دیکھ تو لوں
یہ فیصلے کی گھڑی ہے ذرا ٹھہر جاؤ

○

راہ آسان ہو گئی ہو گی
جان پہچان ہو گئی ہو گی

موت سے تیرے دردمندوں کی
مشکل آسان ہو گئی ہو گی

پھر پلٹ کر نگہ نہیں آئی
تجھ پہ قربان ہو گئی ہو گی

تیری زلفوں کو چھیڑتی تھی صبا
خود پریشان ہو گئی ہو گی

ان سے بھی چھین لو گے یاد اپنی
جن کا ایمان ہو گئی ہو گی

دل کی تسکین پوچھتے ہیں آپ
ہاں مری جان! ہو گئی ہو گی

مرنے والوں پہ سیفؔ حیرت کیوں
موت آسان ہو گئی ہو گی

○

بڑے غضب میں ہے حسنِ گلستاں ہم نہ کہتے تھے
چمن تک آ گئی دیوارِ زنداں ہم نہ کہتے تھے

بکے بازار میں جنسِ وفا بے آبرو ہو گی
اٹھے گا اعتبارِ کوئے جاناں ہم نہ کہتے تھے

اسی محفل اسی بزمِ وفا کے گوشے گوشے میں
لٹے گی مستیٔ چشمِ غزالاں ہم نہ کہتے تھے

اسی رستے میں آخر وہ کڑی منزل بھی آئے گی
جہاں دم توڑ دے گی یادِ یاراں ہم نہ کہتے تھے

خزاں کی آہٹوں پر کانپتی ہیں پتیاں گل کی
بکھرنے کو ہے اب عندلیبِ بہاراں ہم نہ کہتے تھے

دلِ فطرت شناس آخر کہیں یونہی دھڑکتا ہے
فریبِ حسن ہے جشنِ چراغاں ہم نہ کہتے تھے

○

ہر اک چمن میں اسی مہرباں سے ملتی ہے
زمیں ضرور کہیں آسماں سے ملتی ہے

سرودِ عشق میں نغماتِ حسن شامل ہیں
تری خبر بھی مری داستاں سے ملتی ہے

ہمیں تو شعلۂ خرمن فروز بھی نہ ملا
تری نظر کو تجلی کہاں سے ملتی ہے

خیالِ منزلِ مقصد سے منزلوں آگے
نگاہ گردِ پسِ کارواں سے ملتی ہے

تری نگاہ سے آخر عطا ہوئی دل کو
وہ کاوش کہ غمِ دو جہاں سے ملتی ہے

چلے ہیں سیف وہاں ہم جہاں حرم کے لیے

ظہیر کاشمیری

○

اب صاحبِ دوراں آتے ہیں اب فاتحِ میداں آتے ہیں
وہ شیر تو شیرِ قالیں تھے، اب شیرِ نیستاں آتے ہیں

آہنگِ تفنگ و تیر میں ہم، گاتے ہیں سرودِ آزادی
ہنگامۂ دار و گیر میں ہم، سرمست و غزلخواں آتے ہیں

جو تند بگولوں سے الجھے، وہ عزمِ سفر کی بات کرے
اس منزلِ نو کے رستے میں کتنے ہی بیاباں آتے ہیں

تسلیم کہ ساحل والوں نے، اک سیلِ خراماں روک دیا
ساحل کا نشاں تک مٹ جائے کچھ ایسے بھی طوفاں آتے ہیں

جو ایسے امن پسندوں کو الحاد کا طعنہ دیتے ہیں
اس بزم میں خنجر در داماں جتنے بھی مسلماں آتے ہیں

پھولوں پہ مسرت ناچے گی، کلیوں پہ اجالا برسے گا
ہم لوگ برنگِ نورِ سحر لے صبحِ گلستاں آتے ہیں

قاتل بھی ظہیر اب دامن کے دھبوں کو چھپاتا پھرتا ہے
اس دھج سے مل کے چہروں پر ہم خونِ شہیداں آتے ہیں

○

وہ حکایت جو بایں ہوش تجھے یاد نہیں
تیرے اپنے ہی تغافل کی تو روداد نہیں

آج بھی کاہشِ بے نام وہی ہے کہ جو تھی
دل کی دنیا تیرے آنے سے بھی آباد نہیں

حسنِ تنہائی سے گھبرائے تو اتنا کہہ دو
عشق پابستۂ زنجیر ہے آزاد نہیں

وہ ملاقات کہ جو وجہِ شکستِ دل تھی
اب نگاہِ غلط انداز کو بھی یاد نہیں

کون سا دل تیرے جلووں سے نہیں صاعقہ بار
کون سی بزم تیری یاد سے آباد نہیں

ہم نہ سوچیں گے کبھی کوہ کنی کی تدبیر
قسمتِ عشق اگر تیشۂ فرہاد نہیں

تیری ہر بات میں ہے عذرِ جفا کا پہلو
تیری محفل میں کوئی صورتِ فریاد نہیں

○

بڑے خطرے میں ہے حسنِ گلستاں ہم نہ کہتے تھے
چمن تک آ گئی دیوارِ زنداں ہم نہ کہتے تھے

بھرے بازار میں جنسِ وفا بے آبرو ہوگی
اٹھے گا اعتبارِ کوئے جاناں ہم نہ کہتے تھے

اسی محفل اسی بزمِ وفا کے گوشے گوشے میں
لٹے گی مستیٔ چشمِ غزالاں ہم نہ کہتے تھے

انہی رستوں میں آخر وہ کڑی منزل بھی آئے گی
جہاں دم توڑ دے گی یادِ یاراں ہم نہ کہتے تھے

خزاں کی آہٹوں پر کانپتی ہیں پتیاں گل کی
بکھرنے کو ہے سب نقشِ بہاراں ہم نہ کہتے تھے

دلِ فطرت شناس آخر کہیں یونہی دھڑکتا ہے
قریبِ صبح ہے جشنِ چراغاں ہم نہ کہتے تھے

○

ہر اک چمن میں اسی مہرباں سے ملتی ہے
زمیں ضرور کہیں آسماں سے ملتی ہے

سرودِ عشق میں نغماتِ حسن شامل ہیں
تری خبر بھی مری داستاں سے ملتی ہے

ہمیں تو شعلۂ حسنِ فروز بھی نہ ملا
تری نظر کو تجلی کہاں سے ملتی ہے

خیالِ منزلِ مقصود سے منزلوں آگے
نگاہ گردِ پسِ کارواں سے ملتی ہے

تری نگاہ سے آخر عطا ہوئی دل کو
وہ کشمکش کہ غمِ دو جہاں سے ملتی ہے

چلے ہیں سیفؔ وہاں ہم ہجومِ غم کے لیے
دلوں کو درد کی دولت جہاں سے ملتی ہے

ظہیر کاشمیری

○

ب ساحب وہاں آتے ہیں اب فاتحِ میداں آتے ہیں
شیر تو شیرِ قالیں تھے، اب شیرِ نیستاں آتے ہیں

نگ تفنگ و تیر میں ہم، گاتے ہیں سرودِ آزادی
نامۂ دار و گیر میں ہم، سرمست و غزل خواں آتے ہیں

آند گبولوں سے الجھے، وہ عزمِ سفر کی بات کرے
منزلِ نو کے رستے میں کتنے ہی بیاباں آتے ہیں

نیم کر ساحل والوں نے، اک سیلِ خراماں روک دیا
ساحل کا نشاں تک مٹ جائے گا، ایسے بھی طوفاں آتے ہیں

دیسے امن پسندوں کو الحاد کا طعنہ دیتے ہیں
ں بزم میں بجز دہ دامن جتنے بھی مسلماں آتے ہیں

پھولوں پہ مسرت ناچے گی، کلیوں پہ اُجالا برسے گا
ہم وقت برنگِ خندۂ سحر اے صبحِ گلستاں آتے ہیں

قاتل بھی ظہیر اب دامن کے دھبوں کو چھپاتا پھرتا ہے
ں دیکھے بل کے پھر مقتل پر ہم خونِ شہیداں آتے ہیں

○

وہ حکایت جو بایں ہوش تجھے یاد نہیں
تیرے اپنے ہی تغافل کی تو روداد نہیں

آج بھی کاہشِ بے نام وہی ہے کہ جو تھی
دل کی دنیا تیرے آنے سے بھی آباد نہیں

حسن تنہائی سے گھبرائے تو اتنا کہہ دو
عشق پابستۂ زنجیر ہے آزاد نہیں

وہ ملاقات کہ جو وجہِ شکستِ دل تھی
اب نگاہِ غلط انداز کو بھی یاد نہیں

کون سا دل تیرے جلووں سے نہیں صاعقہ بار
کون سی بزم تیری یاد سے آباد نہیں

ہم نہ سوچیں گے کبھی کوہ کنی کی تدبیر
قسمتِ عشق اگر تیشۂ فرہاد نہیں

تیری ہر بات میں ہے مذہبِ جفا کا پہلو
تیری محفل میں کوئی صورتِ فریاد نہیں

○

شبِ مہتاب بھی اپنی، بھری برسات بھی اپنی
تمہارے دم قدم سے زندگی تھی زندگی اپنی

یہاں پابندیٔ ناز و جنوں کی بات ہے ورنہ
جمالِ یار سے کچھ کم نہیں تابندگی اپنی

مجھے شادابیٔ گلچیں سے خوف آتا ہے
یہی انداز تھے جب لٹ گئی تھی زندگی اپنی

تمہارا غم! اسے آشوبِ صرصر سے بچاؤں گا
ہواؤں سے بھڑک اٹھی ہے شمعِ زندگی اپنی

گر تم بھی تو اک بھٹکے گریزاں کی طرح نکلے
گزرنے کو گزر جاتی بہارِ دوستی اپنی

ظہیر! اس چشمکِ اہل پہ یوں محسوس ہوتا ہے
بڑی مدت سے ہے جیسے کسی سے دوستی اپنی

○

جب کبھی تذکرۂ شعلہ رخاں ہوتا ہے
دامنِ دل پہ سلگنے کا گماں ہوتا ہے

ہم کبھی پرسشوں میں اس طرح رہے آشفتہ
جس طرح شام کو باغوں میں دھواں ہوتا ہے

دل بیاباں میں الاؤ کی طرح جلتے ہیں
خیمہ زنی تھا قافلۂ گشتہ ساماں ہوتا ہے

اس کی ہر تان سے ملتا ہے ستاروں کو گداز
عشق کہتے ہیں جسے نغمۂ جاں ہوتا ہے

دلِ مرحوم تمنا پہ دمکتے ہوئے داغ
جیسے تربت پہ چراغوں کا سماں ہوتا ہے

دعوتِ جلوۂ شب تاب پہ مسرور نہ ہو
یہ بھی اک دورۂ تزئیں گراں ہوتا ہے

حسن کا عکس بھی تسکینِ دل و جاں ہے ظہیر
حسن پر سایۂ صاحب نظراں ہوتا ہے

○

ابھی تو کاوشِ بوئے بہار باقی ہے
ابھی تجسسِ دامانِ یار باقی ہے

تڑپ تڑپ کے شبِ ہجر کاٹنے والے
ستارہ ہائے سحر کا شمار باقی ہے

تمہارے ساتھ غمِ دوستی گزر ہی گیا
تمہارے بعد غمِ روزگار باقی ہے

ابھی سے تذکرۂ دل پہ وہ بگڑ بیٹھے
ابھی تو قصۂ منصور و دار باقی ہے

ظہیر اب بھی امیرانِ شہر کے سر میں
شرابِ نیم شبی کا خمار باقی ہے

○

شورشِ نالہ و فریاد ابھی باقی ہے
طمطراقِ دلِ برباد ابھی باقی ہے

غنچے غنچے میں ابھی تک ہیں قفس پوشیدہ
برگِ گل میں کفِ صیاد ابھی باقی ہے

زخمِ سر آج بھی ہے درد پرستوں کا علاج
غلغلِ تیشۂ فرہاد ابھی باقی ہے

دلِ پُرخوں سے کہو حیلۂ مرہم نہ کرے
شہر میں اک ستم ایجاد ابھی باقی ہے

ابھی خونابۂ محشر سے گزرنا ہوگا
چشمِ تر! اک نئی افتاد ابھی باقی ہے

بزم میں شعلۂ لب سوز جلانے والو!
شہرتِ نغمۂ آزاد ابھی باقی ہے

دلِ مرحوم کی خاموش فضاؤں میں ظہیر
اک سسکتی ہوئی فریاد ابھی باقی ہے

قتیل شفائی

○

انگڑائی پر انگڑائی لیتی ہے رات جدائی کی
تم کیا سمجھو، تم کیا جانو بات مری تنہائی کی

کون سیاہی گھول رہا تھا وقت کے بہتے دریا میں
دیکھی ہے میں نے آنکھ جھکی پھر آج کسی ہرجائی کی

ٹوٹ گئے سیال نگینے پھوٹ بہے رخساروں پر
دیکھو میرا ساتھ نہ دینا بات ہے یہ رسوائی کی

وصل کی رات نہ جانے کیوں اصرار تھا ان کو جانے پر
وقت سے پہلے ڈوب گئے تاروں نے بڑی دانائی کی

آپ کے ہوتے دنیا والے میرے دل پر راج کریں؟
آپ سے مجھ کو شکوہ ہے شکوہ آپ کی بے پروائی کی

اڑتے اڑتے آس کا پنچھی دور افق میں ڈوب گیا
روتے روتے بیٹھ گئی آواز کسی سودائی کی

○

پہلے تو اپنے دل کی رضا جان جائیے — پھر جو نگاہِ یار کہے مان جائیے
پابوسیٔ جمال بھی ممکن طلب سہی — جوشِ جنوں ہیں آ کے گریبان جائیے
شاید حضور سے کوئی نسبت ہمیں بھی ہو — آنکھوں میں جھانک کر ہمیں پہچان جائیے
اک دھوپ سی جمی ہے نگاہوں کے آس پاس — یہ آپ ہیں تو آپ پہ قربان جائیے
جلنے دو رخ سے ہٹ کے نقابِ سیہ کو — یا سادگی سے ہو کے پشیمان جائیے
کچھ کہہ رہی ہیں آپ کے سینے کی دھڑکنیں — میرا نہیں تو دل کا کہا مان جائیے

اپنی غزل قتیل ہے کوئی کی کوک ہے
جس کی تڑپ کو درد سے پہچان جائیے

○

ل کو غم حیات گوارا ہے ان دنوں
پہلے جو درد تھا وہی چارا ہے ان دنوں

ہر سیل اشک ساحل تسکیں ہے آجکل
دریا کی موج موج کنارا ہے ان دنوں

یہ دل ذرا سا دل تری یادوں میں کھو گیا
ذرے کو آندھیوں کا سہارا ہے ان دنوں

شعوں میں اب نہیں ہے وہ پہلی سی روشنی
ی واقعی وہ انجمن آرا ہے ان دنوں

تم آ سکو تو شب کو بڑھا دوں کچھ اور بھی
اپنے کہے میں صبح کا تارا ہے ان دنوں

○

صدمے جھیلوں جان پہ کھیلوں اس سے مجھے انکار نہیں ہے
لیکن تیرے پاس وفا کا کوئی بھی معیار نہیں ہے

یہ بھی کوئی بات ہے آخر دور ہی دور رہیں متوالے؟
ہرجائی ہے چاند کا جوبن یا پنچھی کو پیار نہیں ہے

ایک ذرا سا دل ہے جس کو توڑ کے بھی تم جا سکتے ہو
یہ سونے کا طوق نہیں، یہ چاندی کی دیوار نہیں ہے

ملاحوں نے ساحل ساحل موجوں کی توہین تو کر دی
لیکن پھر بھی کوئی بھنور تک جانے کو تیار نہیں ہے

پھر سے وہی سیلاب حوادث! جانے دو اے ساحل والو
یا اس بار سفینہ ڈوبا یا اب کے منجدھار نہیں ہے

قید قفس کے بعد کرے گا قید گلستاں کون گوارا؟
اب بھی وہی زنجیریں ہیں گو پہلی سی جھنکار نہیں ہے

○

چمن کی آبرو ہیں کہ صبا کے ساتھ چلتے ہیں
سبک رفتار ہیں لیکن ادا کے ساتھ چلتے ہیں

عجب کیا ہے جو منزل کا تصور ہی بدل جائے
مسافر بے رخی سے رہنما کے ساتھ چلتے ہیں

خدا جانے کہاں ٹھہریں گے جا کر قافلے ان کے
یہ دیوانے تو رہوارِ وفا کے ساتھ چلتے ہیں

ستارے ڈوب جائیں یا افق سے آفتاب ابھرے
اندھیرے تو ہر صورت ضیا کے ساتھ چلتے ہیں

دمِ رخصت ہم اپنے آنسوؤں کو روک بھی لیتے
مگر یہ کارواں تیری رضا کے ساتھ چلتے ہیں

قتیل اس بے مروت کے بچھڑ جانے سے ہم
یہ وہ نشتر ہیں جو ذکرِ وفا کے ساتھ چلتے ہیں

○

اندیشۂ اربابِ ہوس ساتھ رہے گا
جنت بھی ملے گی تو یہ غم ساتھ رہے گا

پیاسے ہی گزر جائیں گے ہم راہِ طلب سے
عبرت کے لیے ساغرِ جم ساتھ رہے گا

تو اور نہ سنے درِ زندانِ وفا تک
مر کر بھی یہ غم تیری قسم ساتھ رہے گا

افلاک سے صحراؤں پہ اتر آئیں گے تارے
کھل کر بھی شبِ غم کا بھرم ساتھ رہے گا

منزل سے پلٹ آئے گی ایک ایک تجلی
ہاں شعلۂ رخسارِ صنم ساتھ رہے گا

میخانہ بہت دور نہیں دیدۂ نم سے
آ گردشِ دوراں کوئی دم ساتھ رہے گا

یاروں میں قتیل آئیں گے سو آتش خانے
لیکن مرا گلپوشِ قلم ساتھ رہے گا

ساحر لدھیانوی

○

ہوس نصیبِ نظر کو کہیں قرار نہیں
میں منتظر ہوں مگر تیرا انتظار نہیں

ہمیں سے رنگِ گلستاں ہمیں سے رنگِ بہار
ہمیں کو نظمِ گلستاں پہ اختیار نہیں

ابھی نہ چھیڑ محبت کے گیت اے مطرب!
ابھی حیات کا ماحول خوشگوار نہیں

تمہارے عہدِ وفا کو میں عہد کیا سمجھوں
مجھے خود اپنی محبت کا اعتبار نہیں

نہ جانے کتنے گلے اس میں مضطرب ہیں ندیم
وہ ایک دل جو کسی کا گلہ گزار نہیں

گریز کا نہیں قائل حیات سے لیکن
جو سچ کہوں تو مجھے موت ناگوار نہیں

یہ کس مقام پہ پہنچا دیا زمانے نے
کہ اب حیات پہ تیرا بھی اختیار نہیں

○

ہر چند مری قوتِ گفتار ہے محبوس
خاموش مگر طبع خود آرا نہیں ہوتی

معمورۂ احساس میں ہے حشر سا برپا
انسان کی تذلیل گوارا نہیں ہوتی

نالاں ہوں میں بیداریٔ احساس کے ہاتھوں
دنیا مرے انکار کی دنیا نہیں ہوتی

بیگانہ صفت جادۂ منزل سے گزر جا
ہر چیز سزاوارِ نظارہ نہیں ہوتی

فطرت کی مشیت بھی بڑی چیز ہے لیکن
فطرت کسی بے بس کا سہارا نہیں ہوتی

○

طرب زاروں پہ کیا بیتی صنم خانوں پہ کیا گزری
دلِ زندہ ترے مرحوم ارمانوں پہ کیا گزری

زمیں نے خون اگلا آسماں نے آگ برسائی
جب انسانوں کے دل بدلے تو انسانوں پہ کیا گزری

ہمیں یہ فکر اُن کی انجمن کس حال میں ہوگی
انھیں یہ غم کہ اُن سے چھٹ کے دیوانوں پہ کیا گزری

مرا الحاد تو خیر ایک لعنت تھا سو ہے اب تک
مگر اس عالمِ وحشت میں ایمانوں پہ کیا گزری

یہ منظر کون سا منظر ہے پہچانا نہیں جاتا
سیہ خانوں سے کچھ پوچھو شبستانوں پہ کیا گزری

چلو وہ کفر کے گھر سے سلامت آ گئے لیکن
خدا کی مملکت میں سوختہ جانوں پہ کیا گزری

○

عقائد وہم ہیں، مذہب خیالِ خام ہے ساقی
ازل سے ذہنِ انساں بستۂ اوہام ہے
حقیقت آشنائی اصل میں گم کردہ راہی ہے
عروسِ آگہی پروردۂ ابہام ہے
مبارک ہو ضعیفی کو خرد کی فلسفہ رانی
جوانی بے نیازِ عبرتِ انجام ہے
ہوس ہوگی اسیرِ حلقۂ نیک و بد عالم
محبت ماورائے فکرِ ننگ و نام ہے سا
ابھی تک راستے کے پیچ و خم سے دل دھڑکتا ہے
مرا ذوقِ طلب شاید ابھی تک خام ہے
وہاں بھیجا گیا ہوں چاک کرنے پردۂ شب کو
جہاں ہر صبح کے دامن پہ عکسِ شام ہے
مرے ساغر میں مے ہے اور ترے ہاتھوں میں بربط ہے
وطن کی سرزمیں میں بھوک سے کہرام ہے سا
زمانہ برسرِ پیکار ہے پُرہول شعلوں سے
ترے لب پر ابھی تک نغمۂ خیام ہے ساقی

○

بہت ترک کی میں نے گریباں سی لیا میں نے
نے اب تو خوش ہو زہر یہ بھی پی لیا میں نے

ابھی زندہ ہوں لیکن سوچتا رہتا ہوں خلوت میں
ہ اب تک کس تمنا کے سہارے جی لیا میں نے

انہیں اپنا نہیں سکتا مگر اتنا بھی کیا کم ہے
کچھ مدت حسیں خوابوں میں کھو کر جی لیا میں نے

بس اب تو دامن دل چھوڑ دو بے کار امیدو!
بہت دکھ سہ لیے میں نے بہت دن جی لیا میں نے

○

قفس کے کنج میں رم ہی نہیں کچھ اور بھی ہے
حیات ساغر سم ہی نہیں کچھ اور بھی ہے

تری نگاہ مرے غم کی پاسدار سہی
مری نگاہ میں غم ہی نہیں کچھ اور بھی ہے

مری ندیم! محبت کی رفعتوں سے نہ گر
بلند بام حرم ہی نہیں کچھ اور بھی ہے

یہ اجتناب ہے عکس شعور محبوبی
یہ احتیاط ستم ہی نہیں کچھ اور بھی ہے

ادھر بھی ایک اچٹتی نظر کہ دنیا میں
فروغ محفل جم ہی نہیں کچھ اور بھی ہے

نئے جہان بسائے ہیں نسل آدم نے
اب اس زمیں پہ ارم ہی نہیں کچھ اور بھی ہے

مرے شعور کو آوارہ کر دیا جس نے
وہ مرگ شادی و غم ہی نہیں کچھ اور بھی ہے

مجروح سلطان پوری

○

جب ہوا عرفاں تو غم آرامِ جاں بنتا گیا
سوزِ جاناں دل میں سوزِ دیگراں بنتا گیا

رفتہ رفتہ منقلب ہوتی گئی رسمِ چمن
دھیرے دھیرے نغمۂ دل بھی فغاں بنتا گیا

میں اکیلا ہی چلا تھا جانبِ منزل مگر
لوگ ساتھ آتے گئے اور کارواں بنتا گیا

میں تو جب جانوں کہ بھر دے ساغرِ ہر خاص و عام
یوں تو جو آیا وہی پیرِ مغاں بنتا گیا

جس طرف بھی چل پڑے ہم آبلہ پایانِ شوق
خار سے گل اور گل سے گلستاں بنتا گیا

شرحِ غم تو مختصر ہوتی گئی اس کے حضور
لفظ جو منہ سے نہ نکلا داستاں بنتا گیا

دہر میں مجروح کوئی جاوداں مضموں کہاں
میں جسے چھوتا گیا وہ جاوداں بنتا گیا

○

اب اہلِ درد یہ جینے کا اہتمام کریں
اسے بھلا کے غمِ زندگی کا نام کریں

فریب کھا کے ان آنکھوں کا کب تلک اے دل
شرابِ غم پییں رقصِ ناتمام کریں

غمِ حیات نے آوارہ کر دیا ورنہ
تھی آرزو کہ ترے در پہ صبح و شام کریں

نہ دیکھیں دیر و حرم سوئے رہروانِ حیات
یہ قافلہ تو نہ جانے کہاں قیام کریں

غمِ جہاں کو صنم دل بنا کے کچھ نہ
کہ جس سے زیست کو راحت ملے وہ کام کریں

سکھائیں دستِ طلب کو ادائے بیباکی
پیامِ زیرِ لبی کو صلائے عام کریں

غلام رہ چکے، توڑیں یہ بندِ رسوائی
خود اپنے بازوئے محنت کا احترام کریں

زمیں کو مل کے سنواریں مثالِ روئے نگار
رخِ نگار کی صورت سے فروغِ بام کریں

پھر اُٹھ کے گرم کریں کاروبارِ زلفِ جنوں
پھر اپنے ساتھ اسے بھی اسیرِ دام کریں

○

یہ ڈھلکے ڈھلکے سے آنسو یہ گھٹی گھٹی سی آہیں
یونہی کب تلک خدایا غمِ زندگی نباہیں

کہیں ظلمتوں میں گھر کر ہے تلاشِ دستِ رہبر
کہیں جگمگا اٹھی ہیں مرے نقشِ پا سے راہیں

تجھے خانماں خرابوں کا چمن کوئی نہ سمجھا
یہ جہاں بھی بیٹھ جائیں وہیں ان کی بارگاہیں

کبھی جادۂ طلب سے جو پھرا ہوں دل شکستہ
تری آرزو نے ہنس کر وہیں ڈال دی ہیں بانہیں

○

ختم شورِ طوفاں تھا دور تھی سیاہی بھی
دم کے دم میں افسانہ تھی مری تباہی بھی

التفات سمجھوں یا بے رُخی کہوں اس کو
رہ گئی خلش بن کر اس کی کم نگاہی بھی

اس نظر کے اُٹھنے میں اس نظر کے جھکنے میں
نغمۂ سحر بھی ہے آہِ صبحگاہی بھی

یاد کر وہ دن جس دن تیری سخت گیری پر
اشک بھر کے اٹھی تھی میری بے گناہی بھی

پستیٔ زمیں سے ہے رفعتِ فلک قائم
میری خستہ حالی سے تیری کج کلاہی بھی

شمع بھی اُجالا بھی میں ہی اپنی محفل کا
میں ہی اپنی منزل کا راہبر بھی راہی بھی

گنبدوں سے پلٹی ہے اپنی ہی صدا مجروحؔ
مسجدوں میں کی جا کے میں نے داد خواہی بھی

○

جنونِ دل نہ صرف اتنا کہ اک گل پیرہن تک ہے
قد و گیسو سے اپنا سلسلہ دار و رسن تک ہے

مگر اے ہم قفس کہتی ہے شوریدہ سری اپنی
یہ رسمِ قید و زنداں ایک دیوارِ کہن تک ہے

دعا دیتی ہیں راہیں آج تک مجھ آبلہ پا کو
مرے قدموں کی گلکاری بیاباں سے چمن تک ہے

میں کیا کیا جرعۂ خوں پی گیا پیمانۂ دل میں
بلانوشی مری کیا اک مئے ساغر شکن تک ہے

نہ آخر کہہ سکا اس سے مرا حالِ دلِ سوزاں
مہِ تاباں کہ جو اس کا شریکِ انجمن تک ہے

نوا ہے جاوداں مجروحؔ جس میں روحِ ساعت ہو
کہا کس نے مرا نغمہ زمانے کے چلن تک ہے

○

لیے بیٹھا ہے دل اک عزمِ بے باکانہ برسوں سے
کہ اس کی راہ میں ہیں کعبہ و بتخانہ برسوں سے

دلِ سادہ نہ سمجھا ماسوائے پاکدامانی
نگاہِ یار کہتی ہے کوئی افسانہ برسوں سے

مجھے یہ فکر سب کی پیاس اپنی پیاس ہے ساقی
تجھے یہ ضد کہ خالی ہے مرا پیمانہ برسوں سے

گریزاں تو نہیں تجھ سے مگر تیرے سوا دل کو
کئی غم اور بھی ہیں اے غمِ جانانہ برسوں سے

ہزاروں ماہتاب آئے ہزاروں آفتاب آئے
مگر مجروحؔ وہی ہے ظلمتِ غم خانہ برسوں سے

شکیل بدایونی

○

ی زندگی ہے ظالم ترے غم سے آشکارا
م ہے درحقیقت مجھے زندگی سے پیارا

اگر بجا نہ مانیں تو جہان رنگ و بو میں
سکون دل کی خاطر کوئی ڈھونڈ لوں سہارا

ے مجھ سے خاص نسبت میں رہین موج طوفاں
یں زندگی تھی پیاری انھیں مل گیا کنارا

ے اٹھا یقیں سا کر یہی ہے میری منزل
راہ جب کسی نے مجھے دفعتاً پکارا

ں بتاؤں فرق ناصح جو ہے مجھ میں اور تجھ میں
ری زندگی کا عالم تری زندگی کنارا

ے گفتگو سے بڑھ کر غم اذن گفتگو ہے
ی بات پوچھتے ہیں جو نہ کر سکوں دوبارا

لی اے شکیل یاد کیجے یہ جنوں نہیں تو کیا ہے
ای کے ہو گئے ہم جو نہ ہو سکا ہمارا

○

ہم ہیں اور ان کی خوشی ہے آج کل
زندگی ہی زندگی ہے آج کل

ان کا ذکر ان کی تمنا ان کی یاد
وقت کتنا قیمتی ہے آج کل

جل رہی ہے دل میں شمع آرزو
غمکدے میں روشنی ہے آج کل

تو ہے اور دریا دلی ہے ساقیا
میں ہوں اور تشنہ لبی ہے آج کل

عرض غم پر مسکراتے بھی نہیں
برہمی سی برہمی ہے آج کل

حاصل ترک محبت دیکھنا
انجمن سونی پڑی ہے آج کل

دل میں اور مایوسیوں میں اے شکیل
اتحاد باہمی ہے آج کل

○

پھر اٹھی دل میں اک موجِ شباب آہستہ آہستہ
پھر آیا زندگی میں انقلاب آہستہ آہستہ

سما کر مجھ میں وہ جانِ شباب آہستہ آہستہ
بنا دے گا مجھے اپنا جواب آہستہ آہستہ

یہ محفل ناصحانِ خشک کی محفل ہے اے رندو!
ذرا اس بزم میں ذکرِ شراب آہستہ آہستہ

مری نظریں بھی کر رفتہ رفتہ بھولے جاتی ہیں
ہوئے جاتے ہیں جلوے کامیاب آہستہ آہستہ

شکیل اس درجہ مایوسی شبِ ہجرِ عشق میں کیسی
ابھی تو اور ہونا ہے خراب آہستہ آہستہ

○

مری زندگی پہ نہ مسکرا مجھے زندگی کا الم نہیں
جسے تیرے غم سے ہو واسطہ وہ خزاں بہار سے کم نہیں

مرا کفر حاصلِ زہد ہے مرا زہد حاصلِ کفر ہے
مری بندگی ہے وہ بندگی جو رہینِ دیر و حرم نہیں

مجھے راس آئیں خدا کرے یہی اشتباہ کی ساعتیں
انہیں اعتبارِ وفا تو ہے مجھے اعتبارِ ستم نہیں

وہی کارواں وہی راستے وہی زندگی وہی مرحلے
مگر اپنے اپنے مقام پر کبھی تم نہیں کبھی ہم نہیں

نہ وہ شانِ جبرِ شباب ہے نہ وہ رنگِ قہرِ حجاب ہے
دلِ بے قرار پہ ان دنوں ہے ستم یہی کہ ستم نہیں

نہ فنا مری نہ بقا مری مجھے اے شکیل نہ ڈھونڈیے
میں کسی کا حسنِ خیال ہوں مرا کچھ وجود و عدم نہیں

○

…نہ پردوں سے متقابل تجلی کے جلوے نظر سے پہلے
…بت آئینہ ہو چکی تھی وجود بزم جہاں سے پہلے

…ہر ایک عنایت صد فرقت ہے ابتدا حرف مدعا کی
…ملی نہ تسکین یہ غلط ہے یقیں کو گماں سے پہلے

…سر میں راز نہاں غم تھیں مسرتیں بھی الم کا بہ نہاں
…بھی تو سمجھو چمن میں شاید بہار آئی خزاں سے پہلے

…کہ رہا تھا اگر نہ جیسی ہے جو یہ دار پہ ضمیر ہوگی
…نظر اٹھا کر جو میں نے دیکھا مجاہد تھا کا امتحاں سے پہلے

…اٹھا رہا دست ساقی مری جو نہ کچھ تب سے ضبط باقی
…تمام میکش پکار اٹھے لبوں سے پہلے بیاں سے پہلے

…قسم زہر میخانہ کو ہم جو اس جستجو نے کھویا
…دیر تھی وہ اس پتہ سے تقلیم آ گئے جہاں سے پہلے

…نا ہے شاید لکھے ہوئے تھے شکیل قسمت میں جور پیہم
…کہیں جو الجھیں یہاں بھی آ کر یہ فقرا آسماں سے پہلے

○

نہ اب وہ آنکھوں میں برہمی ہے نہ اب وہ ماتھے پہ بل رہا ہے
وہ ہم سے خوش ہیں ہم ان سے خوش ہیں زمانہ کروٹ بدل رہا ہے

خوشی نہ غم کی نہ غم خوشی کا عجیب عالم ہے زندگی کا
چراغ افسردۂ محبت نہ بجھ رہا ہے نہ جل رہا ہے

اہتمام چشم مست ہے یہ کہ ہوش چھا جائے بے خودی پر
نظر اٹھا کر تو دیکھو ساقی یہ کون گر کر سنبھل رہا ہے

ہزار ترک وفا کروں میں تری محبت کو کیا کروں میں
دل حزیں مجھ سے روٹھ کر بھی ترے اشاروں پہ چل رہا ہے

کہاں یہ مستی کی وارداتیں کہاں یہ عیش و طرب کی باتیں
اب اور ہی نغمہ چھیڑ مطرب کہ رنگ محفل بدل رہا ہے

شکیل تفسیر شعر اپنی جو پوچھتے ہو تو ہے بس اتنی
جو نالہ سینے میں گھٹ رہا تھا وہ نغمہ بن کر نکل رہا ہے

فضل احمد کریم فضلی

○

تمہیں اک نہیں جانستاں اور بھی ہیں
بہت حادثاتِ جہاں اور بھی ہیں

حسیں اور بھی ہیں جواں اور بھی ہیں
غزالانِ ابرو کماں اور بھی ہیں

ابھی کہ محبت میں سہنے ہیں صدمے
ابھی کیا ابھی امتحاں اور بھی ہیں

چلو دھوم سے جشنِ ماتم منائیں
ہمیں اک نہیں نوحہ خواں اور بھی ہیں

نہیں ختم کچھ آسماں پہ خدائی
مرے حال پہ مہرباں اور بھی ہیں

نقاب اس نے رخ سے اٹھائی تو لیکن
حجابات کچھ درمیاں اور بھی ہیں

فریبِ کرم اک تو ان کا ہے اس پہ
ستم میری خوش فہمیاں اور بھی ہیں

وفا ان سے اپنی جتانے گئے تھے
مگر اب تو وہ بدگماں اور بھی ہیں

نہیں صبر ہی کی کمی تجھ میں فضلی
میری جان کچھ خامیاں اور بھی ہیں

○

بہار آئی گل افشانی کے دن ہیں
ہماری تنگ دامانی کے دن ہیں

عنادل کی غزل خوانی کے دن ہیں
گلوں کی چاک دامانی کے دن ہیں

جدھر دیکھو کھلے ہیں لالہ و گل
یہ خونِ دل کی ارزانی کے دن ہیں

ہوا دامانِ گل وا اور وحشت
قفس کی چاک دامانی کے دن ہیں

سبک رو ہے نسیمِ صبح ہر چند
مگر پھر بھی گراں جانی کے دن ہیں

دلِ پُر درد اُمڈا آ رہا ہے
یہ بحرِ غم میں طغیانی کے دن ہیں

یہی دن حاصل ہیں زندگی کے
یہی بس دل کی نادانی کے دن ہیں

کمالِ زندگی کی خیر یا رب
کمالِ عقلِ انسانی کے دن ہیں

غزل پاکیزہ ہے فضلی ابھی تک
یہ دن ہر چند عریانی کے دن ہیں

○

پھر ایسے خیالات آنے لگے
کہ ہم خود بخود گنگنانے لگے

ہمارا تمہارا عجب حال ہے
نظر مل گئی مسکرانے لگے

جوانی کی اللہ رے سرشاریاں
قدم خود بخود ڈگمگانے لگے

اندھیرا اندھیرا سا چھانے لگا
مرے پاس سے جب وہ جانے لگے

یونہی عمر گزرے گی امید میں
وہ کہتا ہے کہ تشریف لانے لگے

اکیلے میں گاتے تھے میری غزل
مجھے دیکھ کر مسکرانے لگے

ترا روٹھنا ہے یہ بے فائدہ
تجھے کیوں وہ فضلی منانے لگے

○

آغازِ شباب شب ہے پیارے
جانے کا یہ وقت کب ہے پیارے

آنکھوں کا تو کام ہی ہے رونا
یہ گریۂ بے سبب ہے پیارے

اپنے ہاتھوں سے تو پلائے
پینے کا مزہ تو جب ہے پیارے

اک آگ جلائے دے رہی ہے
دل جیسے ابولہب ہے پیارے

پھر بعد میں آکے کیا کرے گا
آنے کا تو وقت اب ہے پیارے

کیا حال کہوں، کرم ہے تیرا
آگے حدِ ادب ہے پیارے

کوئی نہ کوئی تو بات ہوگی
کیوں خندۂ زیرِ لب ہے پیارے

بے بات کی بات پر بگڑنا
غصہ تیرا غضب ہے پیارے

یہ پھولوں سے کہہ رہی ہے شبنم
کیوں ہنستا ہے کیا سبب ہے پیارے

اپنے فضلی سے جو خفا ہو
اس کا کوئی سبب ہے پیارے

○

اب وہ ہلکی ہوئی سی بات نہیں
بات کیا ہے کہ اب وہ بات نہیں

پھر وہی جاگتا ہے دن کا طلسم
رات ہے اور جیسے رات نہیں

بات اپنی تمھیں نہ یاد رہی
میرے جانے بلا کوئی بات نہیں

کچھ نہیں ہے تو یاد ہے اس کی
ہم سے ترکِ تعلقات نہیں

پھر بھی دل کو بڑی امیدیں ہیں
گو بظاہر توقعات نہیں

عشق ہوتا ہے خود بخود پیدا
عشق کے کچھ لوازمات نہیں

ایسے فضلی کے شعر کم ہوں گے
جن میں کچھ دل کی واردات نہیں

○

آتے رہتے ہیں قدسیوں کے پیام
شعر بھی اک طرح کا ہے الہام

عشق ہے کس قدر بلند مقام
اس کے آگے ہے بس خدا کا نام

کام ان کا ہے جو ہیں زیرِ الہام
چاہیے ہم کو اپنے کام سے کام

زندگی ہے ازل سے تا بہ ابد
زندگی کی نہ کوئی صبح و شام

راہرو تھک کے رہ گئے آخر
زندگی تھی کچھ ایسی تیز خرام

زلفِ دوراں سنوارنے والے
ہیں بڑی چیز عاشقانِ کرام

گر تمنا نہیں تو حسرت ہے
کیا ہوا کاروبارِ شوق تمام

میں نے مانا کہ ہوں تہی ساغر
فکر صد شکر ہے تو ہاتھ میں جام

دو مبارک ہو تم کو اے فضلی
اب وہ سمجھے نہیں تمہارا نام

ناصر کاظمی

○

عشق جب زمزمہ پیرا ہوگا
حسن خود محوِ تماشا ہوگا

سن کے آوازۂ زنجیرِ صبا
قفسِ غنچہ کا در وا ہوگا

جرسِ شوق اگر ساتھ رہی
ہر نفس شہپرِ عنقا ہوگا

دائم آباد رہے گی دنیا
ہم نہ ہوں گے کوئی ہم سا ہوگا

کون دیکھے گا طلوعِ خورشید
ذرہ جب دیدۂ بینا ہوگا

ہم تجھے بھول کے خوش بیٹھے ہیں
ہم سا بیدرد کوئی کیا ہوگا

پھر سلگنے لگا صحرائے خیال
ابر گھر کر کہیں برسا ہوگا

پھر کسی دھیان کے صد راہے پر
دلِ حیرت زدہ تنہا ہوگا

پھر وہی رنگ برستے ہوں گے
ماہ ہالک شفق زا ہوگا

پھر کسی صبحِ طرب کا جادو
پردۂ شب سے ہویدا ہوگا

گل زمینوں کے خنک رمنوں میں
جشنِ رامشگری برپا ہوگا

پھر نئی رت کا اشارہ پاکر
وہ سمن بر بھی آرا ہوگا

گلِ شب تاب کی خوشبو لے کر
ابلقِ صبح روانہ ہوگا

پھر سرِ شاخِ شعاعِ خورشید
نکہتِ گل کا بسیرا ہوگا

اک صدا سنگ میں تڑپی ہوگی
اک شرر پھول میں لرزا ہوگا

تجھ کو [illegible] سے لگے
چاندنی رات نے دیکھا ہوگا

دیکھ کر آئینۂ آبِ رواں
پتہ پتہ لبِ گویا ہوگا

شام سے سوچ رہا ہوں ناصر
چاند کس شہر میں اترا ہوگا

○

وا ہوا پھر درِ میخانۂ گل
پھر صبا لائی ہے پیمانۂ گل

زمزمہ ریز ہوئے اہلِ چمن
پھر چراغاں ہوا کاشانۂ گل

رقص کرتی ہوئی شبنم کی پری
لے کے پھر آئی ہے نذرانۂ گل

پھول برسائے یہ کہہ کر اس نے
میرا دیوانہ ہے دیوانۂ گل

پھر کسی گل کا اشارہ پاکر
چاند نکلا سرِ میخانۂ گل

پھر سرِ شام کوئی شعلہ نوا
سو گیا چھیڑ کے افسانۂ گل

آج غربت میں بہت یاد آیا
اے وطن تیرا صنم خانۂ گل

آج ہم خاک بسر پھرتے ہیں
ہم سے تھی رونقِ کاشانۂ گل

ہم پہ گزرے ہیں خزاں کے صدمے
ہم سے پوچھے کوئی افسانۂ گل

کل ترا دور تھا اے بادِ صبا
ہم ہیں اب سرخیِ افسانۂ گل

ہم ہی گلشن کے امیں ہیں ناصر
ہم سا کوئی نہیں بیگانۂ گل

○

سفرِ منزلِ شب یاد نہیں
لوگ رخصت ہوئے کب یاد نہیں

اولیں قرب کی سرشاری میں
کتنے ارماں تھے اب یاد نہیں

دل میں ہر وقت چبھن رہتی تھی
تھی مجھے کس کی طلب یاد نہیں

وہ ستارہ تھی کہ شبنم تھی کہ پھول
ایک صورت تھی عجب یاد نہیں

کیسی ویراں ہے گزرگاہِ خیال
جب سے وہ عارض و لب یاد نہیں

بھولتے جاتے ہیں ماضی کے دیار
یاد آئیں بھی تو سب یاد نہیں

ایسا الجھا ہوں غمِ دنیا میں
ایک بھی خوابِ طرب یاد نہیں

یہ حقیقت ہے کہ احباب کو ہم
یاد ہی کب تھے جو اب یاد نہیں

رشتۂ جاں تھا کبھی جس کا خیال
اس کی صورت بھی تو اب یاد نہیں

یاد ہے سیرِ چراغاں ناصر
دل کے بجھنے کا سبب یاد نہیں

○

ساز ہستی کی صدا غور سے سن
کیوں ہے یہ شور بپا غور سے سن

دن کے ہنگاموں کو بیکار نہ جان
شب کے پردوں میں ہے کیا غور سے سن

چڑھتے سورج کی ادا کو پہچان
ڈوبتے دن کی ندا غور سے سن

کیوں ٹھہر جاتے ہیں دریا سرِ شام
روح کے تار ہلا غور سے سن

یاس کی چھاؤں میں سونے والے
جاگ اور شورِ درا غور سے سن

ہر نفس دامِ گرفتاری ہے
نو گرفتارِ بلا غور سے سن

دل تڑپ اٹھتا ہے کیوں آخرِ شب
دو گھڑی کان لگا غور سے سن

اسی منزل میں ہیں سب ہجر و وصال
رہروِ آبلہ پا غور سے سن

اسی گوشے میں ہیں سب دیر و حرم
دل صنم ہے کہ خدا غور سے سن

کعبہ سنسان ہے کیوں اے واعظ
ہاتھ کانوں سے اٹھا غور سے سن

موت اور زیست کے اسرار و رموز
آ مری بزم میں آ غور سے سن

کیا گزرتی ہے کسی کے دل پر
تو بھی اے جانِ وفا غور سے سن

کبھی فرصت ہو تو اے صبحِ جمال
شب گزیدوں کی دعا غور سے سن

ہے یہی ساعتِ ایجاب و قبول
صبح کی لے کو ذرا غور سے سن

کچھ تو کہتی ہیں چٹک کر کلیاں
کیا سناتی ہے صبا غور سے سن

برگِ آوارہ بھی اک مطرب ہے
طائرِ نغمہ سرا غور سے سن

رنگ منت کشِ آواز نہیں
گل بھی ہے ایک نوا غور سے سن

خامشی حاصلِ موسیقی ہے
نغمہ ہے نغمہ نما غور سے سن

آئینہ دیکھ کے حیران نہ ہو
نغمۂ آبِ صفا غور سے سن

عشق کو حسن سے خالی نہ سمجھ
نالۂ اہلِ وفا غور سے سن

دل سے ہر وقت کوئی کہتا ہے
میں نہیں تجھ سے جدا غور سے سن

ہر قدم راہِ طلب میں ناصر
جرسِ دل کی صدا غور سے سن

○

کسی کلی نے بھی دیکھا نہ آنکھ بھر کے مجھے
گزر گئی جرسِ گل اداس کر کے مجھے

میں سو رہا تھا کسی یاد کے شبستاں میں
جگا کے چھوڑ گئے قافلے سحر کے مجھے

میں رو رہا تھا مقدر کی سخت راہوں میں
اڑا کے لے گئے جادو تری نظر کے مجھے

میں تیرے درد کی طغیانیوں میں ڈوب گیا
پکارتے رہے تارے ابھر ابھر کے مجھے

ترے فراق کی راتیں کبھی نہ بھولیں گی
مزے ملے انھیں راتوں میں عمر بھر کے مجھے

ذرا سی دیر ٹھہرنے دے اے غمِ دنیا
بلا رہا ہے کوئی بام سے اتر کے مجھے

پھر آج آئی تھی اک موجۂ ہوائے طرب
سنا گئی ہے فسانے ادھر ادھر کے مجھے

○

کچھ تو احساسِ زیاں تھا پہلے — دل کا یہ حال کہاں تھا پہلے
اب تو جھونکے سے لرز اٹھتا ہوں — نشۂ خوابِ گراں تھا پہلے
اب تو منزل بھی ہے خود گرمِ سفر — ہر قدم سنگِ نشاں تھا پہلے
سفرِ شوق کے فرسنگ نہ پوچھ — وقت بے قیدِ مکاں تھا پہلے
یہ الگ بات کہ غم راس ہے اب — اس میں اندیشۂ جاں تھا پہلے
یوں نہ گھبرائے ہوئے پھرتے تھے — دل عجب کنجِ اماں تھا پہلے
ڈیرے ڈالے ہیں بگولوں نے جہاں — اس طرف چشمہ رواں تھا پہلے
اب وہ دریا، نہ وہ بستی، نہ وہ لوگ — کیا خبر کون کہاں تھا پہلے
اڑ گئے شاخ سے یہ کہہ کے طیور — سرو اک شوخ جواں تھا پہلے
ہر خرابہ یہ صدا دیتا ہے — میں بھی آباد مکاں تھا پہلے
اب بھی تو پاس نہیں ہے لیکن — اس قدر دور کہاں تھا پہلے
کیا سے کیا ہو گئی دنیا پیارے — تو وہیں پر ہے جہاں تھا پہلے
ہم نے آباد کیا ملکِ سخن — کیسا سنسان سماں تھا پہلے
ہم نے بخشی ہے خموشی کو زباں — درد مجبورِ فغاں تھا پہلے
ہم نے ایجاد کیا تیشۂ عشق — شعلہ پتھر میں نہاں تھا پہلے
ہم نے روشن کیا معمورۂ غم — ورنہ ہر سمت دھواں تھا پہلے
ہم نے محفوظ کیا حسنِ بہار — عطرِ گل صرفِ خزاں تھا پہلے

غم نے پھر دل کو جگایا ناصر
خانہ برباد کہاں تھا پہلے

ابنِ انشا

○

موڑ کر دیں بس نہ چلے گا ہجر کے روگ کے ماروں کا
صبح کا ہونا دوبھر کر دیں رستہ روک ستاروں کا

جھوٹے سکّے ہیں یہ انشا سمجھتے ہیں یا کرتے ہیں
ٹھیک نہیں کچھ سکنے کا، کام ہمارا بنجاروں کا

پہچان ان سے کہو نہیں گے جب ہی ہم گے عشق و گ
تم سے تو آ تا ہو سکتا ہے یہ پوچھے حال بیماروں کا

جن جن کا ذکر ہے تم سے دل کہاں کی کہی
یوں تو ہمارے شہر میں اکثر میلہ لگتا ہے نگاروں کا

ایک ذرا سی بات تھی جس کا چرچا پہنچا گلی گلی
ہم گمناموں نے پھر بھی احسان نہ مانا یاروں کا

درد کا کہنا چیخ ہی اٹھو دل کی نصیحت ضبط کرو
سب کچھ سننا چپ چپ رہنا کام ہے عزت داروں کا

انشا اب ان اجنبیوں میں چین سے باقی عمر کٹے
جن کی خاطر بستی چھوڑی نام نہ لو ان پیاروں کا

○

سائے ہم پہ یہ پیالا بھرو یہاں کوئی ایسے ملے ہم سے ملا ہے گریباں کوئی

نیم طلب کا آزار غمِ عشق جو سال ہوا اپنے رستے میں نہ تھا ہم سا بیاباں کوئی

ہم نے اپنے کو کبھی دیر سنبھالا ہوتا کن نکلتی تو سب سوز گماں کوئی

یاد وہ اس عہدِ محبت کی وفا بستہ ہوئی ڈھونڈتے ہیں گئے غمِ وصل کا عنواں کوئی

یک نظر دیکھنا، رم کرنا، ہوا ہو جانا ان سے پوچھے کہ ہے سب غنچۂ خنداں کوئی

ہم کسی سمت بھی نکلیں دیں جا کر بیٹھیں ہم سے اب قتل ہے سب کر پشیماں کوئی

ابتدا عشق میں دنیا نہ ملی تو ہو گے آج بیاں ہے کوئی دل سے پریشاں کوئی

سونا ہو تو رہے ہیں بستر خواب پہ رات بیٹھا رہتا ہے کسی بات پہ گریاں کوئی

بھیگی شاموں میں کھلے صحرا میں پھرتا کبھی کبھی نظر آتا ہے غزالاں کوئی

دو قدم اور تو بس اس شخص کو جا کر دیکھو اپنے انشا کے سنبھلنے کا بھی ساماں کوئی

یہ بھی ہم لوگوں کی وحشت پہ ہنسا کرتا تھا
آ گیا اس کا سا دیوانہ یہاں بھی کوئی

○

دل سی چیز کے گاہک ہوں گے دو یا ایک ہزار کے بیچ
انشاؔ جی کیا مال لیے بیٹھے ہو تم بازار کے بیچ

پینا پلانا عین گنہ ہے، جی کا لگانا عین ہوس
آپ کی باتیں سب سچی ہیں لیکن بھری بہار کے بیچ!

اے سخیو! اے خوش نظرو! یک گونہ کرم خیرات کرو
نعرہ زناں کچھ لوگ پھریں ہیں صبح سے شہرِ نگار کے بیچ

خار و خس و خاشاک تو جانیں ایک تجھی کو خبر نہ ملے
اے گلِ خوبی ہم تو عبث بدنام ہوئے گلزار کے بیچ

منتِ قاصد کون اٹھائے، شکوۂ درباں کون کرے
نامۂ شوق غزل کی صورت چھپنے کو دو اخبار کے بیچ

○

ساون بھادوں ساٹھ ہی دن ہیں پھر وہ رُت کی بات کہاں
اپنے اشک مسلسل برسیں اپنی سی برسات کہاں

چاند نے کتنی باتیں کر لیں — نکلا، چمکا، ڈوب گیا
ہم جو آنکھ جھپک لیں سو لیں، اے دل ہم کو رات کہاں

قیس کا نام سُنا ہے تم نے ہم سے اب ملاقات کرو
عشق و جنوں کی منزل مشکل سب کی یہ اوقات کہاں

پیٹ کا کاروبار بہت ہے اب تو ادھر بھی پھیل چلا
ادھر جو کام جہاں کے دیکھیں فرصت دیں حالات کہاں

انشاؔ جی ہم نظم کے شاعر، پھر بھی — خیر جو ہیں سو ہیں
کام کی بات غزل میں کتنا سب کے بس کی بات نہیں

○

کبھی اُن کے ملن کی آشا نے اک جوت جگا دی تھی من میں
اب من کا اُجالا سنولایا، پھر شام ہے اپنے آنگن میں

جی کھلتا ہے آنسو ڈھلتے ہیں، ہر نیر میں دیپ سے جلتے ہیں
اس برکھا سے جی کی آگ بجھے! یہ تو اور بھی بھڑکے ساون میں

کبھی بھولے سے کبھی ان گلیوں میں تم ہمیں ملنے آئے
اس من کو نہ روگ لگا دینا، یہ من ہے کسی کے بندھن میں

ہر شکل کا روپ نہیں ہوتا، ہر روپ کو نام نہیں دیتے
کچھ شکلیں ہیں اپنی آنکھوں میں کچھ رنگ بسے ہیں اپنے درپن میں

کبھی من کی بستی میں آؤ، وہ صورتیں تم کو دکھلائیں
وہ صورتیں تم کو دکھلائیں، ہم کھو گئے جن کے درشن میں

یہ چھیل چھبیلا کون پھرے اس متھرا کی نگری میں سکھیو!
کبھی باتیں کرے اپنے شیام میں تھیں، اب دیکھ لو اس منموہن میں

ہر ایک پہ نظریں اُٹھتی تھیں ہر ایک پہ جی کر چلنا تھا
اس شہر میں روپ کا کال نہیں کچھ اور ہے اپنے ساجن میں

یا بن میں چکا سے ملتے ہیں یا بیت کے مارے ملتے ہیں
کچھ پورب میں کچھ پچھم میں کچھ اُتر میں، کچھ دکھن میں

شہروں میں بھچے ہیں بیٹھا ہے بھٹکا کے تیس بھگوان کے
انشا سا کوئی رنگا دیکھا؟ کتنے کو ہیں جوگی ہر بن میں

اُس حسن کے نام پہ یاد آئے سب منظر فیض کی نظموں کے
وہی رنگِ حنا، وہی بندِ قبا، وہی پھول کھلے پیراہن میں

ہم لوگ کبھی آنے سے پہلے بھی تم لوگ ادھر سے گزرتے تھے
کبھی پھول بھی دیکھے غزلوں میں کبھی تو رُخ کسی چلمن میں

ہم ان سے جدا کر دو رہ گئے، مجبور رہ گئے، مجبور ہوئے
اب دل کا ٹھکانا مشکل ہے، ہاں جان رہے گی الجھن میں

تم لوگوں نے چاند بجھا ڈالا، شب بادہ کا لطف گنوا ڈالا
اب لاکھ چراغ جلاتے پھرو بہلاتے یہ ہر روزن میں

کسی تیر نظر کی میتوں سے کبھی غزلوں سے انشا صاحب کی
ان برہ کی بے کل راتوں میں ہم جوت جگاتے ہیں من میں

○

ہم رات بہت روئے بہت آہ و زاری
دل درد سے بوجھل ہو تو پھر نیند
سر زانو پہ رکھے ہوئے کیا سوچ
کچھ بات کھٹکتی ہو بہت دیر
تم میری طرف دیکھ کے چپ ہو گئے
وہ ساعتِ خوش وقت نشاط
اک دن یہ سمجھتے تھے کہ پایانِ تمنا
اک رات ہے مہتاب کے
اب اور ہی حالت ہے کہ
ہم نالہ کشاں، بے گنہاں غم زدہ
اس گھر کی کھلی چھت پہ چمکتے
کہتے ہو کبھی بات وہاں جا کے
برگشتہ ہوا ہم سے یہ مہتاب
بس بات سنی، راہ چلا
انشا سے ملو اس سے نہ روکیں
اس سے یہ ملاقات نکالی
مشہور ہے ہر بزم میں
باتیں ہیں بہت شہر میں
اے دوستو اے دوستو
گلیوں میں چلو سیر کریں
ہم جائیں کسی سمت کسی
کہنا نہ کوئی بات کسی
انشا کی غزل سن لو
دیوانے سے دیوانے نے
ہو تم ہی کبھی عشق میں
باتیں بھی دیکھی ہیں محبت

متغزّلین جدید

(۲)

ابنِ انشا

○

اور تو کوئی بس نہ چلے گا ہجر کے درد کے ماروں کا
صبح کا ہونا دوبھر کر دیں رستہ روک ستاروں کا

جھوٹے سکوں میں بھی اٹھا دیتے ہیں یہ اکثر سچا مال
شکلیں دیکھ کے سودے کرنا کام ہے ان بنجاروں کا

اپنی زباں سے کچھ نہ کہیں گے چپ ہی رہیں گے عاشق لوگ
تم سے تو اتنا ہو سکتا ہے پوچھو حال بیچاروں کا

جس جپسی کا ذکر ہے تم سے دل کو اسی کی کھوج رہی
یوں تو ہمارے شہر میں اکثر میلہ لگا نگاروں کا

ایک ذرا سی بات تھی جس کا چرچا پہنچا گلی گلی
ہم گمناموں نے پھر بھی احسان نہ مانا یاروں کا

درد کا کہنا چیخ ہی اٹھو دل کا کہنا وضع نبھاؤ
سب کچھ سہنا چپ چپ رہنا کام ہے عزت داروں کا

انشا جی اب اجنبیوں میں چین سے باقی عمر کٹے
جن کی خاطر بستی چھوڑی نام نہ لو ان پیاروں کا

○

سانجھ سمے یہ پیلا پیلا چہرہ جان کوئی
لیے پھرتا ہے ہاتھ میں گریباں کوئی

تیرِ طلب کا اس دل میں عجب حال ہوا
اپنے رستے میں بچھا ہے بیاباں کوئی

ہم نے لینے کو کوئی دیر سنبھالا ہوتا
آن نکلی کوئی تصویرِ پشیماں کوئی

یار اس عہدِ محبت کی دعا بھول گئے
ڈھونڈ لیں ہم کو غمِ ہستی کا دیواں کوئی

ایک نظر دیکھا، دم کھینچا، بچا رکھا
ان سے کچھ بھی ہے بہت غنچۂ خنداں کوئی

ہم کسی سمت ابھی نکلیں وہیں جا کر ٹھہریں
ہم سے اچھا بھی ہے سو کچھ ہوا ارماں کوئی

اب تو دیوانہ بنیں گے نہ بیاباں میں گئے
انکھیاں ہیں کہ کوئی دل ہے کہ ہے جاں کوئی

سونے والو ابھی بستر خواب سے اٹھو
بیٹھا رہتا ہے کسی بات پہ گریاں کوئی

جیسے شاعر ہوں کہ سوتے میں ہمیں تھا تنہا
گھر کا گھر یاد تو آتا ہے خالی مکاں کوئی

دوستو دیکھنا اس شخص کو جا کر دیکھو
اپنے انشا کے سنبھلنے کا بھی ساماں کوئی

یہ بھی ہم لوگوں کی وحشت پہ ہنسا کرتا تھا
آیا اس شہر و بیاباں میں بھی ... کوئی

○

دل سی چیز کے گاہک ہوں گے دو یا ایک ہزار کے بیچ
انشاؔ جی کیا مال لیے بیٹھے ہو تم بازار کے بیچ

پینا پلانا عین گنہ ہے، جی کا لگانا عین ہوس
آپ کی باتیں سب سچی ہیں، لیکن بھری بہار کے بیچ

اے سکھیو! اے خوش نظرو! یک گونہ کرم خیرات کرو
نعرہ زناں کچھ لوگ پھریں ہیں صبح سے شہر نگار کے بیچ

خار و خس و خاشاک تو جانیں، ایک تجھی کو خبر نہ ملے
اے گلِ خوبی ہم تو عبث بدنام ہوئے گلزار کے بیچ

منتِ قاصد کون اٹھائے، شکوۂ درباں کون کرے
نامۂ شوق غزل کی صورت چھپنے کو دو اخبار کے بیچ

○

ساون بھادوں ساٹھ ہی دن ہیں پھر وہ رُت کی بات کہاں
اپنے اشک مسلسل برسیں اپنی سی برسات کہاں

چاند نے کتنی باتیں کریں ـــ نکلا، چمکا، ڈوب گیا
ہم بھی آنکھ جھپک لیں سو لیں ـــ اے دل ہم کو رات کہاں

قیس کا نام سنا ہے ہم نے ہم سے اب ملاقات کرو
عشق و جنوں کی منزل مشکل سب کی یہ اوقات کہاں

پیٹ کا کاروبار بہت ہے اب تو ادھر بھی پھیل چلا
اور جو کام جہاں کے دیکھیں فرصت دیں حالات کہاں

انشاؔ جی ہم نظم کے شاعر، پھر بھی ــــ خیر جو ہیں سو ہیں
کام کی بات غزل میں کہنا سب کے بس کی بات نہیں

○

کبھی ان کے ملن کی آشا نے اک جوت جگا دی تھی من میں
اب من کا اجالا سنولایا، پھر شام ہے اپنے آنگن میں

جی گھلتا ہے آنسو ڈھلتے ہیں، ہر بیر یہی ہیں پہلے سے
اس برہا کے سلگی کی آگ بجھے؟ یہ تو اور بھی بھڑکے ساون میں

کبھی بھولا بھٹکا راہی ہو کبھی ان گلیوں میں تم بھی آئے
اس من کو نہ الجھاؤ، یہ من ہے جلتی ہے کے بندھن میں

پھر پل کا بسیرا نہیں ہوتا، پھر دھوپ کو نام نہیں دیتے
کچھ شکلیں ہیں اپنی آنکھوں میں، کچھ روپ ہیں اپنے درپن میں

کبھی من کے ابھٹا میں آؤ، وہ صورتیں تم کو دکھلائیں
وہ صورتیں تم کو دکھلائیں، ہم کھو گئے جن کے درشن میں

یہ چھیل چھبیلا روپ نگر، اس شہر کی گلیوں میں گھومو!
کبھی باتیں کرتے شام میں تھیں، اب کچھ دن ان کے جوبن میں

ہر ایک پتنگوں اٹھتی تھی، ہر ایک پہ جی کو چھلتا تھا
اس شہر میں روپ کا کال نہیں، کچھ اور ہے اپنے ساجن میں

یا بن میں چکارے ملتے ہیں، یا پیت کے مارے ملتے ہیں
کچھ پورب میں کچھ پچھم میں، کچھ اتر میں، کچھ دکھن میں

شہروں میں پھرے بنجاروں سے، بھٹکا کیے تیس برس ہو کے
انشا سا کوئی رستا دیکھا، کہنے کو بہت جوگی ہر بن میں

اس جوگ کے نام پہ یاد آئے سب منظر فیض کی نظموں کے
وہی رنگ حنا، وہی بند قبا، وہی پھول کھلے پیراہن میں

ہر روز گزرنے سے پہلے بھی تم لوگ ادھر سے گزرتے تھے
کبھی پھول ہی دیکھے غزلوں میں، کبھی زرد تھے کسی چلمن میں

ہم ان سے جلیں کہ دور ہوئے، کچھ رہ گئے، روگ نہ ہوئے
اب دل کا ٹھکانا مشکل ہے، اس جان پہ بھگتی [illegible] میں

تم لوگوں نے چاند بجھا ڈالا، شب کا لطف گنوا ڈالا
اب لاکھ چراغ جلاتے پھر، ڈھل جاتے یہ ہر روز [illegible] میں

کسی تیر نظر کی ہیتوں سے کبھی غزلوں سے انشا صاحب کی
ان برہ کی بے کل راتوں میں ہم جوت جگاتے ہیں من میں

○

ہم رات بہت روئے بہت آہ و فغاں [illegible]
دل درد سے بوجھل ہو تو پھر نیند [illegible]
سنا تو یہ دکھ ہوئے کیا سو [illegible]
کر بات کبھی ہو محبت ز [illegible]
تم میری طرف دیکھ کے چپ ہو رہی [illegible]
وہ ساعت خوش وقت نشاط [illegible]
اک دن یہ سمجھتے تھے کہ پایان تم [illegible]
اک رات ہے مہتاب کے [illegible]
اب اور ہی حالت ہے کہ برجان [illegible]
ہم ناوک شاں رہے گمان [illegible]
اس گھر کی کھلی چھت پہ چمکتے [illegible]
کہتے ہو کبھی بات وہاں جا کے [illegible]
برگشتہ ہوا ہم سے یہ مہتاب [illegible]
بس بات سنی، راہ چلا [illegible]
انشا سے ملو اس سے نہ دو [illegible]
اس سے یہ ملاقات نکالی ہے [illegible]
مشہور ہے ہر بزم میں، بس [illegible]
باتیں ہیں بہت شہر میں [illegible]
اے دوستو اے دوستو [illegible]
گلیوں میں چلو سیر کریں شہر [illegible]
ہم جائیں کسی سمت کسی چوک [illegible]
کہنا نہ کوئی بات کسی سے [illegible]
انشا کی غزل سن لو پہ [illegible]
ہر روز سے دیوانے لے اک [illegible]
ہو تم سے کبھی عشق میں بس [illegible]
یا ہم ہی دیکھی ہیں محبت [illegible]

مُتغزّلین جدید

(۲)

آنند نرائن مُلّا

○

ہے کہ دنیائے سوادِ دل ناؤنوش میں آ
جاں تو مری ترسی ہوئی آغوش میں آ

دنیا میں کہیں تیرا ٹھکانا ہی نہیں
ے مرے دل کی تہِ تابِ خاموش میں آ

ے رنگیں لبِ پیمانے سے اشارے کب تک
بدن ساغرِ رندانِ بلانوش میں آ

ش کا ہے تو پھر عشق کی توہین نہ کر
تو بیہوش نہ ہو، ہو تو نہ پھر ہوش میں آ

تو دل دے نہ کہیں جوہرِ نسواں کا بھی ننگ
سے سننے کے لئے دیکھ نہ یوں جوش میں آ

یہ کیا عالمِ ناقی ہے نگاہِ مُلّا
تو ! ترکیبی دستِ گُل افروش میں آ

○

نگہ و دل کا افسانہ قریبِ اختتام آیا
ہمیں اب اس سے کیا، آئی سحر یا وقتِ شام آیا

زبانِ عشق پر اک چیخ بن کر تیرا نام آیا
خرد کی منزلیں طے ہو چکیں دل کا مقام آیا

اٹھاتا ہے جو پتھر رکھ کے سینے پہ وہ کام آیا
محبت میں نری ترکِ محبت کا مقام آیا

اِسے آنسو نہ کہہ اک یادِ ایامِ گذشتہ ہے
مری عمرِ رواں کو عمرِ رفتہ کا سلام آیا

ضیا لو اور دل کی تیز کر لیا سایہ شعلہ
نہ روشن کر سکا گھر کو نہ محفل ہی کے کام آیا

مکمل تبصرہ کرتا ہوا ایامِ رفتہ پر
نگاہِ بے سخن میں ایک اشکِ بے کلام آیا

توانا کو بہانہ چاہئے شاید تشدد کا
پھر اک مجبور پر شوریدگی کا اتہام آیا

نہ جانے کتنی شمعیں گُل ہوئیں کتنے بُجھے تارے
تب اک خورشید اترا آ ہوا بالائے بام آیا

برہمن آبِ گنگا، شیخ کوثر لے اُڑا اس سے
ترے ہونٹوں کو جب چھوتا ہوا ملّا کا جام آیا

روشؔ صدیقی

○

اس سے بڑھ کر تو کوئی بے سروساماں نہ ملا
دل ملا جس کو مگر درد غریباں نہ ملا

اک خدا نقشِ تجسس میں اٹھایا تھا قدم
نکہتِ گل کو پھر آغوشِ گلستاں نہ ملا

غمِ بادہ و اندوہِ دنیا کیا کم ہے
اس میں اے دوست یہ زہرِ غمِ دوراں نہ ملا

کر لیا ہم نے گوارا غمِ آشفتہ سری
جب کسی طرح مزاجِ دلِ خوباں نہ ملا

اب کہاں جائیں بتاؤ تو کچھ اے اہلِ حرم
بت کدے میں بھی وہ غارت گرِ ایماں نہ ملا

نسبتِ پائے نگاریں ہے یہ اے موجِ نسیم
خاک سے سلسلۂ لالہ و ریحاں نہ ملا

بات اتنی سی ہے اے واعظِ افلاک نشیں
کیا ملے گا اسے یزداں جسے انساں نہ ملا

ان سے اب تشنگیٔ دولتِ کونین ہے کیا
جن غریبوں کو ترا گوشۂ داماں نہ ملا

زندگی نام ہے طوفانِ حوادث کا روشؔ
تشنۂ ساحل ہے وہ جس کو کوئی طوفاں نہ ملا

○

گزرا ہے نظر کو بسیار دیکھ کر
خوش ہوں فسونِ نرگسِ بیمار دیکھ کر

کیا جلوہ گاہِ حسرتِ نظارہ ہے بہشت!
حیراں ہوں صورتِ درِ دلدار دیکھ کر

بادہ بقدرِ ظرف سہی رسمِ میکدہ
ساقی! نزاکتِ دلِ مے خوار دیکھ کر

اب جستجوئے دوست کی منزل کہیں بھی ہو
ہم چل پڑے ہیں راہ کو دشوار دیکھ کر

شایانِ بزمِ عشق نہ تھی قیدِ زندگی
جی شاد ہو گیا رسن و دار دیکھ کر

اب اس سے کیا غرض یہ حرم ہے کہ دیر ہے
بیٹھے ہیں ہم تو سایۂ دیوار دیکھ کر

اب حشر تک حجاب نشیں ہے نگاہ کوں
چھپتا تھا رنگِ حسرتِ دیدار دیکھ کر

سازِ فروغِ آخرِ شب کچھ نہ کھل سکا
کیوں خوش ہے شمعِ صبح کے آثار دیکھ کر

سازِ غزل اٹھا ہی لیا ہم نے اے روشؔ
اس چشمِ نیم باز کا اصرار دیکھ کر

میراجی

ہنسو تو ساتھ ہنسے گی دنیا، بیٹھ اکیلے رونا ہوگا
چپکے چپکے بہا کر آنسو، دل کے دکھ کو دھونا ہوگا

بیرن ریت بڑی دنیا کی، آنکھ سے جو بھی ٹپکا موتی
پلکوں ہی سے اٹھانا ہوگا، پلکوں ہی سے پرونا ہوگا

پیاروں سے مل جائیں پیارے، انہونی کب ہونی ہوگی
کانٹے پھول بنیں گے کیسے، کب سکھ سیج بچھونا ہوگا

بہتے بہتے کام نہ آئے لاکھوں بھنور طوفانی ساگر
اب منجدھار میں اپنے ہاتھوں جیون ناؤ ڈبونا ہوگا

میراجی کیوں سوچ ستائے، پلک پلک دوری لہرائے
ست جو بھی رنگ دکھائے اپنے دل میں سمونا ہوگا

غم کے بھروسے کیا کچھ چھوڑا، کیا اب تم سے بیان کریں
غم بھی راس نہ آیا دل کو اور ہی کچھ سامان کریں

کرنے اور کہنے کی باتیں کس نے کہیں اور کس نے کیں!
کرتے کہتے دیکھیں کسی کو ہم بھی کوئی پیمان کریں

بھلی بری جیسی بھی گزری اُن کے سہارے گزری ہے
حضرتِ دل جب ہاتھ بڑھائیں، ہر مشکل آسان کریں!

ایک ٹھکانا آگے آگے، پیچھے پیچھے مسافر ہے!
چلتے چلتے سانس جو ٹوٹے منزل کا عنوان کریں

مجبوروں کی مختاروں سے دوری اچھی ہوتی ہے
مل بیٹھیں تو مبادا دونوں، ! ہم کچھ احسان کریں

دستِ خرد میں خشتِ رنگیں اس کا اشارہ کرتی ہے
ایک ہی نعرہ کافی ہے بربادیٔ ہمہ ایوان کریں

میر ملے تھے میراجی سے باتوں سے ہم جان گئے
فیض کا چشمہ جاری ہے حفظ اُن کا بھی دیوان کریں

جوشؔ ملسیانی

○

حسن والوں میں کب تابِ دیدِ زلیخا تھی غم میں کب جُز مِرا پا نہ دیکھا
مجھ اک نگاہِ سیہ مستِ حسن کے محبت کے ماروں نے کیا کیا نہ دیکھا

بہت سیر کی باغِ جنت کی ہم نے مگر کچھ مزا زندگی کا نہ دیکھا
کسی لالہ رو میں محبت نہ پائی کسی دل میں داغِ تمنا نہ دیکھا

جنوں یا تعجب ہی دیوانگی میں دری بے خودی کا بھی عالم وہی ہوں
بجا تو نے احسان مجھ پر کیا یہ، تماشا بنا کر تماشا نہ دیکھا!

غمِ آستاں گم تو کس سے پاتی کہ سے جبیں کو نہ بیٹھے ہوؤں کی
یہاں اعتبارِ سجدہ مٹا ہے کسی کا بھی نقشِ کفِ پا نہ دیکھا

محبت کہاں یہ تو بیچارگی ہے کہ تم بھی سمجھ کر کرم ہو گئے ہیں
یہ جبر اس لئے کر لیا ہے گوارا کہ اس کے سوا کوئی چارا نہ دیکھا!

نیازِ محبت یہ بے نیازی خلوصِ محبت یہ اتنا تغافل
مرا درد تم نے مرا حال تم نے نہ جانا نہ سمجھا نہ پوچھا نہ دیکھا

تمہیں جوشؔ ہم خوب پہچانتے ہیں تمہاری جو نوشیاں جانتے ہیں
کہاں تم کہاں پارسائی کا جامہ کبھی ہم نے ایسا دکھاوا نہ دیکھا

○

جسے کوئی ہاتھ ملتا رہے
تمنا کے سانچے میں ڈھلتا رہے

ہر اک دل میں ہے چھپے محبت کا لا
یہ سکہ زمانے میں چلتا رہے

وہ ہمدرد کیا جس کی ہر بات میں
شکایت کا پہلو نکلتا رہے!

جل جائے خود ہی تو حیرت ہے کیا
جو ہر روز وعدے بدلتا رہے

مری بے قراری پہ کہتے ہیں وہ
نکلتا ہے دم تو نکلتا رہے

پلائی ہے ساقی جو آنکھوں سے آج
اسی کا بس اب دور چلتا رہے

تمہیں ہم سمجھ کر بھی کہیں
امیدوں کا خرمن بھی جلتا رہے

یہ طولِ سفر یہ نشیب و فراز
مسافر کہاں تک سنبھلتا رہے

کوئی جوہری جوشؔ ہو یا نہ ہو
[illegible]

جلال الدین اکبر

○

خاموش ہیں لب اور آنکھوں سے آنسو ہیں کہ پیہم بہتے ہیں
ہم سامنے اُن کے بیٹھے ہیں اور قصۂ فرقت کہتے ہیں

اب حسن و عشق میں فرق نہیں اب دونوں کی اک حالت ہے
میں اُن کو دیکھتا رہتا ہوں، وہ مجھ کو دیکھتے رہتے ہیں

ان کی وہ حیا، وہ خاموشی، اپنی وہ محبت کی نظریں
وہ سننے کو سب کچھ سنتے ہیں، ہم کہنے کو سب کچھ کہتے ہیں

اس شوقِ فراواں کی یارب آخر کوئی حد بھی ہے کہ نہیں
انکار کریں وہ یا وعدہ ہم راستہ دیکھتے رہتے ہیں

ہمدرد نہیں ہمراز نہیں کس سے کہئے، کیوں کر کہئے
جو دل پہ گزرتی رہتی ہے جو جان پہ صدمے سہتے ہیں

دیکھ کے ظالم فرقت میں کیا حال مرا بے حال ہوا
ہونٹوں سے شرارے جھڑتے ہیں آنکھوں سے دریا بہتے ہیں

اکبر شاید دل کھو بیٹھے وہ جلوے وہ احباب نہیں
تنہا خموش سے پھرتے ہیں ہر وقت اداس سے رہتے ہیں

○

ہر آن ایک تازہ شکایت ہے آپ سے
اللہ مجھ کو کتنی محبت ہے آپ سے!

کیا آپ جانتے ہیں، مجھے تو خبر نہیں
کہتے ہیں لوگ مجھ کو محبت ہے آپ سے

اس دل کی آرزوئے محبت کو کیا کہوں
جس دل کو آرزوئے محبت ہے آپ سے

رونا تو ہے یہی کہ نہیں آہ میں اثر
شکوہ ہے آپ سے نہ شکایت ہے آپ سے

آل احمد سرور

○

غیرتِ عشق کا یہ ایک سہارا نہ گیا
لاکھ مجبور ہوئے ان کو پکارا نہ گیا

کیا ہوا ہوئے تو آیا ہے بہاروں کا سلام
صرف خوابوں سے حقائق کو سنوارا نہ گیا

سرکہ عشق کا سر دے کے بھی سر ہو نہ سکا
کون راہی تھا جو اس راہ میں مارا نہ گیا

وہ بھی وقت آتا ہے ساقی بھی بدل جاتے ہیں
مے کدے پہ کبھی مستوں کا اجارا نہ گیا

شوق کی بات کب الفاظ میں ڈھل سکتی تھی
اس پری کو کبھی شیشے میں اتارا نہ گیا

گاہ ٹکرا دیے شیشے کبھی چھلکا دیے جام
رائیگاں ایک بھی ساقی کا اشارا نہ گیا

آئینے جتنے بھی دیکھے وہ مکدر تھے سرورؔ
جوہرِ صدق و صفا پھر بھی ہمارا نہ گیا

○

ہم ہیچ و شرر کو کبھی خاطر میں نہ لائے
اس فتنۂ دوراں کو مگر دیکھ نہ پائے

گو قطرے میں دریاؤں کا طوفان سمائے
پر شوق کی روداد کب الفاظ میں آئے

زلفوں کو دیا ہے رخِ زیبا نے عجب رنگ
جلووں سے ترے اور بھی روشن ہوئے سائے

یہ عشق کے شعلے بھی عجب چیز ہیں یعنی
جو آگ لگائے وہی خود آگ بجھائے

ڈھلتی ہے وہ مے اک ترے پیمانے میں ساقی
مستی کو بھی جو ہوش کے آداب سکھائے

تیری ہی نگاہوں کا تصرف تھا کہ ہم نے
رعنائیِ افکار کے اعجاز دکھائے

جس دل پہ کسی کی نگہِ لطف پڑی تھی
بیٹھے ہیں سرورؔ اس کو کلیجے سے لگائے

ماہر القادری

○

احساسِ خوشی مٹ جاتا ہے، افسردہ طبیعت ہوتی ہے
دل پر وہ گھڑی بھی آتی ہے جب غم کی ضرورت ہوتی ہے

دو حرف بھی میرے سُن نہ سکے، تم اتنے کیوں بیزار ہوئے
میں نے تمہیں اپنا سمجھا تھا، اپنوں سے شکایت ہوتی ہے

یہ سُود و زیاں کے پیمانے، یہ جھوٹے سچے افسانے
ان اہلِ ہوس کی باتوں سے بدنام محبت ہوتی ہے

اک دوسری بوتل آنے تک یہ دُردِ تہِ ساغر ہی سہی
او تشنہ مزے! بیتاب نہ ہو، ساقی کو ندامت ہوتی ہے

ماہر کی سادہ باتوں سے اللہ بچاتا ہی رکھے!
خود تو یہ بڑے ہی حضرت ہیں اوروں کو نصیحت ہوتی ہے

○

دل میں اب آواز کہاں ہے
ٹوٹ گیا تو ساز کہاں ہے

آنکھ میں آنسو لب پہ خموشی
دل کی بات اب راز کہاں ہے

سرو و صنوبر سب کو دیکھا!
ان کا سا انداز کہاں ہے

دل خوابیدہ، رُوح فسردہ
وُہ پُرجوش آغاز کہاں ہے

پردہ بھی جلوہ بن جاتا
آنکھ تجلی ساز کہاں ہے

بُت خانے کا عزم ہے ماہر
کعبے کا در باز کہاں ہے

سراج الدین ظفر

اٹھو زمانے کے آشوب کا ازالہ کریں
بنامِ گل بدناں رخ سوئے پیالہ کریں

بیادِ دیدۂ مخمور ہم پیالہ کریں
اٹھو کہ زہر کا پھر زہر سے ازالہ کریں

وہ بد نہیں نہ اٹھائیں بہار کا احسان
درود ہم تری خلوت میں بے حوالہ کریں

کہاں کے دیر و حرم آؤ ایک سجدۂ شوق
نیازِ ہوش ربایاں بشکلِ ہالہ کریں

برس چلے ہے گلستاں میں ابرِ عکسِ شراب
جھلک جھلک کے ہم آگے سبوئے لالہ کریں

سبو اٹھا کے گدایانِ کوزۂ مے خانہ
ترے حوالے مہ و مہر کا قبالہ کریں

حدیثِ زہد ہو یا وارداتِ نہو وشاں
کسی کے نام کو ہم زیبِ ہر مقالہ کریں

دکھا صحیفۂ رخ اس طرح کہ اہلِ بہار!
ورق ورق خجالت سپاسِ لالہ کریں

اٹھو جلا کے سرِ شمع سے چراغِ امید
نشاطِ صحبتِ شب کو ہزار سالہ کریں

ادا وہ نیم نگاہوں کی ہے کہ جیسے ظفر
تلاشِ گنجِ غزالانِ خورد سالہ کریں

در مے خانہ سے دیوارِ چمن تک پہنچے
ہم غزالوں کے تعاقب میں ختن تک پہنچے

ماہ سیماؤں کے بے نقش نشاں تھے لیکن
اتفاقاً ترے گیسو کی شکن تک پہنچے

مے میں کہاں اس زلف کا پیچ جدید
رنگ پہنچے تو روایاتِ کہن تک پہنچے

راستہ ایک تھا ہم عشق کے دیوانوں کا
قدِ گیسو سے چلے دار و رسن تک پہنچے

آئے ہم وسعتِ آزادی پہ تو پہنچانے سے
سلسلہ انجمنِ سرو و سمن تک پہنچے

اک قبائے سبک و تنگ میں ہو موجِ جسم
کیا کوئی حسن کے اسرارِ کہن تک پہنچے

آپ ہی آپ اگر کھل جائے تری زلفِ ظفر
ناکساں بے ہنری نقطۂ فن تک پہنچے

اے سخن فہم ہم اس بزم سے اٹھیں جہاں
غیرتِ آئینہ اسلوبِ سخن تک پہنچے

اس طرح شوقِ غزالاں میں غزل خواں ہو ظفر
شہرۂ مشکِ غزل شہرِ ختن تک پہنچے

مختار صدیقی

○

موت کو زیست ترستی ہے یہاں
موت ہی کون سی سستی ہے یہاں

دم کی مشکل نہیں آساں کرتے
کس قدر عقدہ پرستی ہے یہاں

سب خرابے ہیں تمناؤں کے
کون بستی ہے جو بستی ہے یہاں

پھوٹ بہے صرف ہیں ساون بھادوں
دیکھو ہر آنکھ برستی ہے یہاں

اب تو ہر اوج کا تارا ڈوبا
اوج کا نام ہی پستی ہے یہاں

○

تھی تو سہی پر آج سے پہلے ایسی حقیر و فقیر نہ تھی
دل کی شرافت ذہن کی جودت اتنی بڑی تقصیر نہ تھی

سچ کہتے ہو ہم ایسے کہاں اور سوز و گداز عشق کہاں
سچ ہے مرے آشفتہ دل میں کوئی کبھی تصویر نہ تھی

اب جو اچاٹ ہوئی ہے طبیعت شاید اب ہم غربت میں
بن کارن، بے بات، وگرنہ ایسی کبھی دلگیر نہ تھی

اہل جنوں کو فصل خزاں سے اب کے بھی گونہ ربط رہا
اب کے بہار وہ آئی کہ جس کی بوئے گل بھی سفیر نہ تھی

آخر غیرت نے سمجھایا، نومیدانہ زیست کریں
باقی ہر تدبیر تو کی جو اپنے خلاف ضمیر نہ تھی

یوسف ظفر

○

تعمیرِ زندگی کو نمایاں کیا گیا
تخریبِ کائنات کا ساماں کیا گیا

گلشن کی شاخ شاخ کو عریاں کیا گیا
یوں بھی علاجِ تنگیٔ داماں کیا گیا

کم تھے جو عکس پہ تیری نظر کی نوازشیں
آئینہ دے کے اور بھی حیراں کیا گیا

آوارگیٔ زلف سے آسودگی ملی
آسودگی ملی کہ پریشاں کیا گیا

وہ خوش نصیب ہوں کہ غمِ کائنات سے
میرے غمِ حیات کا درماں کیا گیا

تنہائیاں بچھا کے جہانِ خراب میں
میرے لئے نگاہ کا ساماں کیا گیا

پہلے کے بے ثباتیٔ عالم کی داستاں
مجھ پر حرام کیفِ جاناں کیا گیا

بھڑکا کے آتشِ غمِ جاناں کی آرزو
مجھ کو رہینِ آتشِ دوراں کیا گیا

نومیدیٔ طلب نے چھپا کے طلب کا رنگ
امیدِ دیدِ دوست کو ارزاں کیا گیا

یہ بھی کرم کہ مجھ کو شبستاں سیاہ میں
ہمدردِ دلنوازیٔ ہجراں کیا گیا

جمعیتِ جمال کا حسنِ کمال ہے
آخر یہی ہوا کہ پریشاں کیا گیا

دیکھا چمن چمن کو بہار و خزاں کا رنگ
تیرے خیال و خواب پہ احساں کیا گیا

آ ۔ اے ظفر کائنات کے نوحوں کی داد دے
جس سے ترا جمال نمایاں کیا گیا

○

یا عدو ہر غمِ ایماں سے قریب آ جاؤ
یا عدو پھر فصلِ بہاراں سے قریب آ جاؤ

دُور ہو کر بھی نہیں تم سے شکایات تو
قرب میں بھی وہی ارماں ہے قریب آ جاؤ

ہم محبت کے مسافر ہیں کہیں دیکھ نہ لے
گھات میں گردشِ دوراں ہے قریب آ جاؤ

جان پیاری ہے کہ تم بھی ہو مری جاں کی طرح
غمِ جاں ہی غمِ جاناں ہے قریب آ جاؤ

آج دنیا کو نہیں اپنے غموں سے فرصت
آج مل بیٹھنا آساں ہے قریب آ جاؤ

کس لیے وقت و زمانے سے ڈریں دُور رہیں
آؤ اللہ نگہباں ہے قریب آ جاؤ

میرے ہی سینے میں سوزاں ہے کوئی چمک ہے
چار سُو گردشِ دوراں ہے قریب آ جاؤ

جاؤ اب جاؤ، کہ وہ عہدِ وفا ختم ہُوا
جب بھی دیکھو کہ پریشاں ہے قریب آ جاؤ

میں زمانے کی کڑی دھوپ کا مارا ہوں ظفر
[illegible]

انجم رومانی

○

ہرچند انہیں عہد فراموش نہ ہوگا
لیکن ہمیں اس وقت کوئی ہوش نہ ہوگا

دیکھو گے تو آئے گی تمہیں اپنی جفا یاد
خاموش ہے پاؤ گے خاموش نہ ہوگا

گزرے ہیں وہ لمحے کہ سدا یاد رہیں گے
دیکھا ہے وہ عالم کہ فراموش نہ ہوگا

ہم اپنی شکستوں سے ہیں جس طرح بغل گیر
یوں تجھ سے بھی کوئی ہم آغوش نہ ہوگا

پی جاتے ہیں زہر غم ہستی ہو کہ مے ہو
ہم سا بھی زمانے میں بلانوش نہ ہوگا

ہونے کو تو دنیا میں کئی پردہ نشیں ہیں
لیکن تری صورت کوئی روپوش نہ ہوگا

پاؤ گے نہ آزاد غم انجم کسی دل کو
ہوگا غم فردا جو غم دوش نہ ہوگا

○

جہاں تک گیا کاروان خیال
نہ تھا کچھ بجز حسرت پائمال

مجھے تیرا، تجھ کو ہے میرا خیال
مگر زندگی پھر بھی ہے خستہ حال

جہاں تک ہے دیدۂ محرم کا سوال
رہیں چپ تو مشکل کہیں تو محال

تری کائنات ایک حیرت کدہ
شناسا مگر اجنبی خد و خال

مری کائنات ایک زخم کہن
تعہد میں جس کے نہیں اندمال

نئی زندگی کے نئے مکر و فن
نئے آدمی کی نئی چال ڈھال

ہوئے رخصت انجم سحر کے قریب
نہ دیکھا گیا شامیا اپنا مآل

قیوم نظر

○

کیوں بیٹھ گئے غبار سے ہم
کچھ کہہ نہ سکے بہار سے ہم

یہ زندگی عمر بھر کا رونا
گھبرا گئے انتظار سے ہم

وہ جبر کی لذتوں کا عالم
باز آئے اس اختیار سے ہم

ہنستے ہیں کہ ہنس سکے زمانہ
خوش ہیں تو اس اعتبار سے ہم

یوں بھی تو سکوں ملا ہے برسوں
پھرتے رہے بے قرار سے ہم

وہ لمحہ ہے آج تک گریزاں
جب تم سے تھے ہمکنار سے ہم

اب آخرِ شب نظر ہے شاید
پھر جیسے ہیں ہوشیار سے ہم

○

ماتھے پر ٹیکا صندل کا اور دل کے کارن رہتا ہے
مندر میں مسجد بنتی ہے مسجد میں برہمن رہتا ہے

ذرے میں سورج اور سورج میں ذرہ روشن رہتا ہے
اب من میں ساجن رہتے ہیں اور ساجن میں من رہتا ہے

رُت بیت چکی ہے برکھا کی اور پیت کے ملنے بیٹھے ہیں
روتے ہیں رونے والوں کی آنکھوں میں ساون رہتا ہے

اک آدھ نشانی جینے کی رہتی تھی مگر جب وہ بھی نہیں
کیوں دکھ کی مالا جپنے کو یہ تنکا سا تن رہتا ہے

اے مجھ پہ ہنسنے اور کسی کو دیکھنے والو یہ تو کہو
یوں کب تک جان پہ بنتی ہے یوں کب تک جیون رہتا ہے

دل توڑ کے جانے والے سُن دو اور بھی رشتے باقی ہیں
اک سانس کی ڈوری اٹکی ہے اک پریم کا بندھن رہتا ہے

عبدالمجید حیرت

ایماں نواز گردشِ پیمانہ ہو گئی
ہم سے بھی ایک لغزشِ مستانہ ہو گئی

کوئی تو بات شمع کے جلنے میں تھی ضرور
جس پر نثار ہستیٔ پروانہ ہو گئی

صد شکر آج ہو تو گئی اُن سے گفتگو
یہ اَور بات ہے کہ حریفانہ ہو گئی

اللہ رے اشکبارئ شمعِ شبِ فراق
جو صبح ہوتے ہوتے اک افسانہ ہو گئی

حیرت کے غمکدے میں خوشی کا گزر کہاں
تم آ گئے تو رونقِ کاشانہ ہو گئی

مرہمِ زخمِ جگر ہو جائے
ایک ایسی بھی نظر ہو جائے

اک اشارہ بھی اگر ہو جائے
اس شبِ غم کی سحر ہو جائے

صبح یہ فکر کہ ہو جائے شام
شام کو، یہ کہ سحر ہو جائے

ہو نہ اتنا بھی پریشاں کوئی
کہ زمانے کو خبر ہو جائے

یوں تو ہو کچھ بھی کسی پر گزرے
دل نہ افسردہ مگر ہو جائے

فکرِ فردا بھی کریں گے حیرت
پہلے یہ شب تو بسر ہو جائے

سکندر علی وجد

○

شمیمِ زلفِ یار آئے نہ آئے
مرے دل کو قرار آئے نہ آئے

ابھی آیا ہے ہوش اے یادِ جاناں
نہ تڑپا، بار بار آئے نہ آئے

چراغِ زندگانی بجھ رہا ہے
وہ جانِ انتظار آئے نہ آئے

کیا جو تم نے اپنے دل سے پوچھو
ہمارا اعتبار آئے نہ آئے

نوائے اہلِ گلشن کہہ رہی ہے
خزاں جائے، بہار آئے نہ آئے

بڑھے گا کارواں منزل بمنزل
غبارِ رہگذار آئے نہ آئے

○

جب وہ مسرور نظر آتا ہے
ہر طرف نور نظر آتا ہے

مَیں تو مے خوار ہُوں، تو کیوں ساقی!
نشّے میں چُور نظر آتا ہے

قرب سے ہاتھ اُٹھایا میں نے
تو بڑی دُور نظر آتا ہے

مَیں ہی تنہا نہیں، دل کے ہاتھوں
تو بھی مجبور نظر آتا ہے

خاکساری کو چُھپانے کے لئے
وجدؔ مغرور نظر آتا ہے

ادیب سہارنپوری

○

اک خلش کو حاصلِ عمرِ رواں رہنے دیا
جان کر ہم نے انہیں نامہرباں رہنے دیا

آرزوئے قرب بھی بخشی دلوں کو عشق نے
فاصلہ بھی میرے ان کے درمیاں رہنے دیا

کتنی دیواروں کے سائے ہاتھ پھیلاتے رہے
عشق نے لیکن ہمیں بے خانماں رہنے دیا

اپنے اپنے حوصلے اپنی طلب کی بات ہے
چن لیا ہم نے تمہیں سارا جہاں رہنے دیا

کون اس طرزِ جفائے آسماں کی داد دے
باغ سارا پھونک ڈالا آشیاں رہنے دیا

یہ بھی کیا جینے میں جینا ہے بغیر ان کے ادیب
شمع گل کر دی گئی باقی دھواں رہنے دیا

○

وہ پو پھٹی وہ کرن سے کرن میں آگ لگی
وہ شب کی زلفِ شکن در شکن میں آگ لگی

سلگ اٹھی وہ ردائے نجوم و کاہکشاں!
وہ دیکھ دامنِ چرخِ کہن میں آگ لگی

نشاطِ گرمیِ محفل تھی جس کی تابانی
اسی چراغ سے کیوں انجمن میں آگ لگی

ہزار شمس و قمر بجھ گئے، پہ یہ نہ بجھی!
یہ کس دھنے سے پتنگوں کے من میں آگ لگی

تمام عمر کے آنسو اسے بجھا نہ سکے
جو دل سے تا بہ جگر دم زدن میں آگ لگی

بھلا سکے گی نہ دنیا یہ حادثہ کہ ادیب
چراغِ لالہ و گل سے چمن میں آگ لگی

ذوالفقار علی بخاری

○

بسائی میں نے جو قلبِ حزیں میں
وہ دُنیا کام آئی کارِ دیں میں

وہی ہے اس میں جانِ تمنا
جو حسرت ہے نگاہِ واپسیں میں

ترے شوقِ سراپا کی کشش سے
سمٹ آیا ہوں میں اپنی جبیں میں

ہے پیچ و تاب میں ہر موجِ ساحل
وہ بیتابی ہے موجِ تہ نشیں میں

حقیقت ہے کہ تم ہو جانِ خوبی
کہ خوبی ہے وطن کی سرزمیں میں

محبت ہے کہ وہ عکسِ مسرت
اتر آیا مرے قلبِ حزیں میں

جنوں کے راج میں انصاف ہوگا
نہ ہوگا فرق جیب و آستیں میں

بہت کچھ پاؤ گے دنیا میں پیارے
محبت پاؤ گے لیکن ہمیں میں

بخاری کی تڑپ حافظ کی مستی
تمہارے نغمۂ وجد آفریں میں

○

زندگی آزار تھی آزار ہے تیر
کارِ سہلِ مرگ بھی دشوار ہے تیر

کام یوں آ کر رُکے جیسے کبھی چلتے
عمرِ فانی وقت بے رفتار ہے تیر

کیا بتاؤں کس طرح اب کٹ رہی ہے
میری ہر ہر سانس اک تلوار ہے

تیرا غم تھا اور تجھ ہی سے بیاں کر
کون سا غم قابلِ اظہار ہے تیر

میرے غم کی تلخیوں کا اس سے کچھ
مجھ کو اب خوشی سے بھی انکار ہے تیر

غلام ربانی تاباںؔ

○

جنوں خود نما خود نگر بھی نہیں
خرد کی طرح کم نظر بھی نہیں

کوئی راہزن کا خطر بھی نہیں
کہ دامن میں گردِ سفر بھی نہیں

یہاں ہوش وایاں سبھی لُٹ گئے
مزا یہ ہے ان کی خبر بھی نہیں

غمِ زندگی اک مسلسل عذاب
غمِ زندگی سے مفر بھی نہیں!

نظر معتبر ہے خبر معتبر
مگر اس قدر معتبر بھی نہیں

تری انجمن مرکزِ آرزُو!
تری انجمن میں گزر بھی نہیں

کہاں جائیں تاباںؔ گنہگارِ شوق
سزا بھی نہیں در گزر بھی نہیں!

○

چھٹے غبارِ نظر بامِ طور آ جائے
پیو شراب کہ چہرہ پہ نُور آ جائے

اُٹھاؤ جام بنامِ حیات بادہ کشو
نظارے جھُومیں، نظر کو سرور آ جائے

شراب خانہ میں کوثر کا ذکر! کیا کہیے
کسی کی عقل میں جیسے فتُور آ جائے

تمام زہد و ریاضت ہو غرقِ موجِ شراب
جو میکدے میں وُہ شیدائے حور آ جائے

مقامِ دار سے گُذرو تو زندگی پاؤ!
پیو جو زہرِ ہلاہل سرور آ جائے

نگاہ تیز، نفس گرم، آرزُو بیباک!
جسے ہو ناز ہمارے حضور آ جائے!

یہ کاروبارِ مشیت بھی خوب ہے، تاباں!
کسی پہ برق گرے زد پہ طور آ جائے

راز مُرادآبادی

○

ہر اک شکستِ تمنا پہ مسکراتے ہیں
وہ کیا کریں جو مسلسل فریب کھاتے ہیں

کبھی کبھی تو وہ اس طرح یاد آتے ہیں
بھلا کے بعد ہر اک شے کو بھول جاتے ہیں

یقینِ عشق نہیں، اعتبارِ حُسن نہیں
یہ وہم کیا ہے دل میں سمائے جاتے ہیں

نگاہِ ناز بھی کیا چیز ہے، خدا جانے
نظر کے ساتھ زمانے بدلتے جاتے ہیں

کسی کے وعدۂ صبر آزما کی خیر کہ ہم
اب اعتبار کی حد سے گزرتے جاتے ہیں

○

خم کہ تھا حریفِ جاں اب حریفِ جاناں ہے
اب وہ زلف برہم ہے اب وہ چشم گریاں ہے

دستوں میں ہے ان کی ان دنوں گریباں ہے
ہم نفس کہیں شاید موسمِ بہاراں ہے

رنگ و بُو کے پردے میں کون یہ خراماں ہے
ہر نفس معطر ہے ہر نظر غزل خواں ہے

بندگی یہ کیا جانے، دیر کیا، حرم کیا ہے
ہم جہاں پہ ہیں واعظ، کفر ہے نہ ایماں ہے

شکریہ مگر ناصح تو یہ راز کیا سمجھے
جورِ برملا ان کا التفاتِ پنہاں ہے

مجید امجد

○

کیا روپ دوستی کا کیا رنگ دشمنی کا
کوئی نہیں جہاں میں کوئی نہیں کسی کا

اک تنکا آشیانہ، اک راگنی اثاثہ
اک موسمِ بہاراں مہمان دو گھڑی کا

آخر کوئی کنارا اس سیلِ بےکراں کا
آخر کوئی مداوا اس دردِ زندگی کا

میری سیہ شبی نے اک عمر آرزو کی
لرزے کبھی اُفق پر تاگا سا روشنی کا

اب میری زندگی میں آنسو ہیں اور نہ آہیں
لیکن یہ ایک میٹھا میٹھا سا روگ جی کا

او مسکراتے تارو! او کھلکھلاتے پھولو!
کوئی علاج میری افسردہ خاطری کا!

○

جنونِ عشق کی رسمِ عجیب کیا کہنا
میں اُن سے دور وہ میرے قریب کیا کہنا

یہ تیرگیٔ مسلسل میں ایک وقفۂ نور
یہ زندگی کا طلسمِ عجیب کیا کہنا

جو تم ہو برقِ نشیمن، تو میں نشیمنِ برق
اُلجھ پڑے ہیں ہمارے نصیب کیا کہنا

ہجومِ رنگ فراواں سہی - مگر، پھر بھی
بہار - نوحۂ صد عندلیب، کیا کہنا

ہزار قافلۂ زندگی کی تیرہ شبی
یہ روشنی سی اُفق کے قریب کیا کہنا

لرز گئی تری لو میرے ڈگمگانے سے
[illegible]

شان الحق حقی

○

اثر نہ ہو تو اسی طرح بے اثر سے کر
تمام عمر محبت بجان و سر سے کر

جو کر سکا ہے تو اعجاز نامہ تر سے کر
نیاز کے بعد اسے کاوش بے ہنر سے کر

چمن میں سے نکل کے جو کا پلٹ کے غزال
مذاق عشق کو بھی تلاش شہر سے کر

دیارِ عشق نہیں تیسل خیال کا محاذ
کبھی فغاں میں ادا کر کبھی نظر سے کر

نہ پوچھ سیر کے کیا کاوشِ بے اثر مطلب
مواصلات کی گمرہیاں نہ گزر سے کر

شتاب تیغ حسن کی خوں بار شعلوں کو زیب دل
مرے فسانۂ رنگیں کو مختصر سے کر

سفر ہے شرطِ حیات اور ہے یہ شرطِ سفر
نکال کر یہ رفیقانِ ہمسفر سے کر

○

اب دل تحمل کی سکت اب کہاں سے لائیں
وہ عشق کے حوصلے وہ کہاں سے لائیں

حیرت تمہیں ہے کیوں کہ ہمیں اب حوصلہ کہاں
جو ہم میں حوصلہ تھا اب کہاں سے لائیں

دیکھا تھا جو خیال حقیقت کے سامنے
اب ہے وہ حقیقت کا اثر کہاں سے لائیں

طوفان تھے جو کبھی وہ تلاطم بکھر گئے
پیاسا تھا جو کبھی وہ تماشا کہاں سے لائیں

کیا اس نگاہِ حوصلہ افزا کو دیں جواب؟
گم کر دیا ہے وہ تمنا کہاں سے لائیں

ہے لطفِ دوست حرفِ تقاضا کا منتظر
اب بے بسی مجالِ تقاضا کہاں سے لائیں

حقی بھٹک گیا ہے جنوں دشتِ زیست میں
آسودگیِ راہ وہ سودا کہاں سے لائیں

باقیؔ صدیقی

ہم ذرّے ہیں خاکِ رہگذر کے
دیکھو ہمیں بام سے اُتر کے

چُپ ہو گئے یوں اسیر جیسے
جھگڑے تھے تمام بال و پر کے

وعدہ نہ دلاؤ یاد اُن کا
نادم ہوں خود اعتبار کر کے

اے بادِ سحر نہ چھیڑ ہم کو
ہم جاگ کے سوئے ہیں رات بھر کے

شبنم کی طرح حیات کے خواب
کچھ اور بکھر گئے بکھر کے

جب اُن کو خیالِ وضع آیا
انداز بدل گئے نظر کے

یوں موت کے منتظر ہیں باقیؔ
مل جائے گا چین جیسے مر کے

رسمِ سجدہ بھی اُٹھا دی ہم نے
عظمتِ عشق بڑھا دی ہم نے

جب کوئی تازہ شگوفہ پھوٹا
کی گلستاں میں منادی ہم نے

جب چمن میں نہ کہیں چین ملا
اب زنداں پہ صدا دی ہم نے

آگ صیاد کے گھر تک پہنچی
اپنے شعلوں کو ہوا دی ہم نے

خونِ دل سے درِ مے خانہ پہ
تیری تصویر بنا دی ہم نے

دل کو آنے لگا بسنے کا خیال
آگ جب گھر کو لگا دی ہم نے

جگن ناتھ آزاد

○

جو دل کا راز بے آہ و فغاں کہنا ہی پڑتا ہے
تو پھر اپنے قفس کو آشیاں کہنا ہی پڑتا ہے

تجھے اے طائرِ شاخِ نشیمن کیا خبر اس کی
کبھی صیّاد کو بھی باغباں کہنا ہی پڑتا ہے

یہ دنیا ہے یہاں ہر کام چلتا ہے سلیقے سے
یہاں پتھر کو بھی لعلِ گراں کہنا ہی پڑتا ہے

بہ ایں مصلحت ایسا بھی ہوتا ہے زمانے میں
کہ رہزن کو امیرِ کارواں کہنا ہی پڑتا ہے

زبانوں پہ دلوں کی بات جب ہم لا نہیں سکتے
جفا کو پھر وفا کی داستاں کہنا ہی پڑتا ہے

نہ پوچھ کیا گزرتی ہے دلِ خوددار پر اکثر
کسی بے مہر کو جب مہرباں کہنا ہی پڑتا ہے

○

ممکن نہیں کہ بزمِ طرب پھر سجا سکوں
اب یہ بھی ہے بہت کہ تمھیں یاد آ سکوں

یہ کیا طلسم ہے کہ تری جلوہ گاہ سے
نزدیک آ سکوں نہ کہیں دُور جا سکوں

ذوقِ نگاہ اور بہاروں کے درمیاں
پردے گرے ہیں وُہ کہ نہ جن کو اُٹھا سکوں

کس طرح کر سکو گے بہاروں کو مطمئن
اہلِ چمن جو مَیں بھی چمن میں نہ آ سکوں

تیری حسیں فضا میں مرے اے نئے وطن
ایسا بھی ہے کوئی جسے اپنا بنا سکوں؟

آزاد سازِ دل پہ ہیں رقصاں وُہ زمزمے
خود سن سکوں مگر نہ کسی کو سُنا سکوں

عرش ملسیانی

○

…ہے دورِ جنوں اس دور میں جینا مشکل ہے
…ے کے دھوکے میں زہراب کا پینا مشکل ہے

…وحشت چلتے تھے روکے سے کسی کے رُک نہ سکے
…انسانیت بیتے ہیں تو سینا مشکل ہے

…گھونٹ سے مٹ جاتی تشنہ لبوں کی تشنہ لبی
…ستے یہ گھونٹ بھی پینا مشکل ہے

…بجھ جائے آدمی کے ایک ہی جھونکے سے
…سلیقہ آساں ہے، جلنے کا قرینا مشکل ہے

…رفو کر ہی لیں گے دنیا والے سب زخم اپنے
…زندہ دلِ انساں پہ لگا، اس زخم کا سینا مشکل ہے

…نہیں جو ڈر جائے ماحول کے خونیں منظر سے
…جینا لازم ہے جس حال میں جینا مشکل ہے

…سلے کا بالآخر اے عرشؔ سکونِ ساحل بھی
…حوادث ہے لیکن بچ جائے سفینا، مشکل ہے

○

دلِ فسردہ پہ سو بار تازگی آئی — مگر وہ یاد کہ جا کر نہ پھر کبھی آئی
چمن میں کون ہے پرسانِ حال شبنم کا — غریب روئی تو غنچوں کو بھی ہنسی آئی
نویدِ عیش سے بھی لطفِ عیش مل نہ سکا — لباسِ غم ہی میں آئی اگر خوشی آئی
کسی طرح بھی زمانے کو بس میں کر نہ سکے — نہ دوستی نہ ہمیں راس دشمنی آئی!
عجب تھا کہ غمِ دل شکست کھا جاتا — ہزار شکر ترے لطف میں کمی آئی!
زمانہ ہنستا ہے مجھ پہ ہزار بار ہنسے — تمہاری آنکھ میں لیکن یہ کیوں نمی آئی
بُنے جالے امیدوں نے دل کے گرد بہت — کسی طرف سے نہ اس گھر میں روشنی آئی

ہزار دید پہ پابندیاں تھیں پردے تھے
نگاہِ شوق مگر ان کو دیکھ ہی آئی

ظہور نظر

○

حیات وقفِ غمِ روزگار کیوں کرتے
یہ سوچتا ہوں کہ تجھ سے پیار کیوں کرتے

تری راہ میں کانٹے نہ میرے پاس چراغ
تو میرے ساتھ سفر اختیار کیوں کرتے

تھا صرف بلاوا نہیں کچھ اور بھی ہے
یہ جانتے تو ترا اعتبار کیوں کرتے؟

غمِ حیات میں ہوتا اگر نہ ہاتھ ترا!
تو ہم خرد میں جنوں کو شمار کیوں کرتے

کوئی تو بات ہے ورنہ جفاؤں کے ہوتے
تجھے بُلا کے ترا انتظار کیوں کرتے!

نظرؔ چمن میں اگر واقعی بہار آتی!
تو پھول خواہشِ ابرِ بہار کیوں کرتے

○

بولتے تھے ہنس لیتے تھے بس میں تھا جب اپنا جی
تم نے ہمیں دیوانہ کہا ہے ایسی تو کوئی بات نہ تھی

اب یہ تمہارا کام کہ جا کر ہم بہلانے تھے یاد ہے
دن بیتا تو جلتے جلتے، جلتے جلتے رات کٹی

گلشن گلشن محفل محفل ایک ہی قصہ ایک ہی بات
ظالم دنیا، جابر دنیا، جانے یہ کب بدلے گی

بچے کتنے ہاتھ نہ جانے اُن کے پیچھے دامن پر
کل تک سے تھے ہم چاک گریباں تُو نے پوچھا آج تو

ہم ہیں مشعل شعلے چلے ہم سے دو دو ہاتھ کرو
پھر پھرا لینا اندھیارا نگر نگر بستی بستی

تم ہو آگ تو ہم پانی ہیں تم ہو دھوپ تو ہم چھاؤں
اپنا تمہارا ساتھ ہی کیا ہے ہم ہیں جا تم ساحل

گلی گلی میں خون کے دھبے دیکھ کے یہ ماتم کے بعد
جشن منانے والے یارو ایک نظر اس جانب بھی

ضیا جالندھری

○

چھیڑی گئی کہ رسم و رہ کی بات
وہ سن نہ سکے نگاہ کی بات

ہر لحظہ بدل رہے ہیں حالات
مجھ سے نہ کرو نباہ کی بات

کہتے ہیں تری سحر کے نغمے
خود میری شبِ سیاہ کی بات

اب ہے نہ نگہ نہ وہ تبسم
کچھ اور تھی گاہ گاہ کی بات

کیا یاد نہ آئے گا یہ انجام!
کس دل سے کریں گے چاہ کی بات

○

کیا سروکار اب کسی سے مجھے
واسطہ تھا تو تھا تجھی سے مجھے

بے حسی کا بھی اب نہیں احساس
کیا ہوا تیری بے رخی سے مجھے

موت کی آرزو بھی کر دیکھوں
کیا امیدیں تھیں زندگی سے مجھے

پھر کسی پر نہ اعتبار آئے
یوں اتارو نہ اپنے جی سے مجھے

تیرا غم بھی نہ ہو تو کیا جینا
کچھ تسلی ہے درد ہی سے مجھے

کتنا پُرکار ہو گیا ہوں کہ تھا
واسطہ تیری سادگی سے مجھے

کر گئے کس قدر تباہ ضیا
دشمن، انداز دوستی سے مجھے

احمد ریاض

○

یہ وصفِ شوق بھی دل کا کہا نہیں کرتے
فروغِ قامت و رُخ کی ثنا نہیں کرتے

شکستِ عہدِ ستم پر یقین رکھتے ہیں
ہم انتہائے ستم کا گلا نہیں کرتے

کچھ اس طرح سے لُٹی ہے متاعِ دیدہ و دل
کہ اب کسی سے بھی ذکرِ وفا نہیں کرتے

اسی لئے ہیں سزاوارِ جور و برقِ ستم
کہ حقِ خدمتِ گلچیں ادا نہیں کرتے

مذاقِ کوہ کنی ہو کہ دشت پیمائی
جنہیں تمہاری طلب ہو وہ کیا نہیں کرتے

وہ آشنائے غمِ کائنات کیا ہوں گے
جو خود کو آپ کا درد آشنا نہیں کرتے

غمِ حبیب، غمِ زندگی، غمِ دوراں
کسی مقام پہ ہم جی بُرا نہیں کرتے

○

کیا کیا محبتوں کے زمانے بدل گئے
اب تم کبھی ملے ہو تو آنسو نکل گئے

فرطِ غمِ حوادثِ دوراں کے باوجود
جب بھی ترے دیار سے گزرے مچل گئے

میں نکتہ چیں نہیں ہوں مگر یہ بتلائیے
وہ کون تھے جو ہنس کے گُلوں کو مسل گئے

کچھ دستِ گلفروش میں سنولا کے رہ گئے
کچھ باغباں کی برق نوازی سے جل گئے

تم نے ہمیں فریبِ عیادت دیا تو ہے!
لیکن کبھی ہوا ہے کہ طوفان ٹل گئے

اک وہ بھی تھے جو بہہ گئے موجوں کے ساتھ ساتھ
اک ہم بھی ہیں جو کھا کے تھپیڑے سنبھل گئے

احمد راہی

○

غمِ حیات میں کوئی کمی نہیں آئی
نظر فریب تھی تیری جمال آرائی

وہ داستاں جو تری دلکشی نے چھیڑی تھی
ہزار بار مری سادگی نے دہرائی

فسانے عام سہی میری چشمِ حیراں کے
تماشا بنتے رہے ہیں یہاں تماشائی

تری وفا، تری مجبوریاں بجا، لیکن
یہ سوزشِ غمِ ہجراں، یہ سرد تنہائی

کسی کے عہدِ تمنا کا پاس ہے ورنہ
مجھے خیالِ جہاں ہے نہ خوفِ رسوائی

میں سوچتا ہوں زمانے کا حال کیا ہوگا
اگر یہ اُلجھی ہوئی زلف تُو نے سُلجھائی

نہیں یہ اپنی محبت کی انتہا تو نہیں
بہت دنوں سے تری یاد بھی نہیں آئی

○

کبھی تری کبھی اپنی حیات کا غم ہے
ہر ایک رنگ میں ناکامیوں کا ماتم ہے

خیال تھا ترے پہلو میں کچھ سکوں ہوگا
مگر یہاں بھی وہی اضطراب پیہم ہے

مرے مذاقِ الم آشنا کا کیا ہوگا؟
تری نگاہ میں شعلے ہیں اب نہ شبنم ہے

مرے رشتہ و امید باندھنے والے
چراغِ زیست کی لَو شام ہی سے مدھم ہے

یہ کس مقام پہ لے آئی زندگی راہی
کہ ہر قدم پہ عجب بے بسی کا عالم ہے

عارف عبدالمتین

○

میری صبح لرز اٹھی ہے دیکھ کے پیار کا یہ عالم
تیری آنکھوں سے ٹپکا ہے آنسو بن کر میرا غم

دل کو ناز ہے سلجھاؤ پہ لیکن میں نے یہ دیکھا ہے
سلجھانے سے اور الجھا ہے تیری زلف کا ایک اک خم

دن کے ہلتے سناٹے میں اکثر سہما رہتا ہے
کروٹ لیکر جاگ اٹھتا ہے رات کی چپ میں تیرا غم

ہجر کے سونے لمحوں میں آس بھی تنہا چھوڑ گئی
کس سے پوچھوں کون بتائے بات ہوئی ہے کتنی کم

تیری دھن میں تجھ سے بھی شاید آگے جا نکلا ہوں
تیرے پہلو میں بیٹھا ہوں پھر بھی آنکھیں ہیں پُرنم

تیرا غم ہم دیوانوں کو کس عالم میں چھوڑ گیا
ایک زمانہ ہم سے خفا ہے اک جہاں سے ہم برہم

○

ترے بازوؤں کا سہارا تو لے لوں مگر اور میں بھی تھک گئی تو
میں صحرا سے نکل کر چمن میں تو آؤں پہ صحرا سے کچھ کم نہیں یہ

میری زیست کی راہ تاریک تھی، چاند بن کر تم آئے تو روشن
یہ راہ آج پھر تیرہ و تار ہے، نا بتا چاند کو لگ گیا ہے

ہر اک سمت ناگن کی صورت لپکتی ہوئی تیرگی سے بچا
عجب کیا کہ لو دے اٹھے میرے لمس فروزاں سے تیرہ شب

ہے اشکوں سے بھیگی ہوئی مسکراہٹ مروت کا
غموں کی ہواؤں میں اڑتا ہوا دیکھ کر آ رہے ہیں کوئی

فراقِ لب و زلف پر منحصر کم ہی پائی ہے اہلِ وفا نے
تم آغوش کے تنگ حلقے میں ہو، پھر بھی ہر لمحہ افزوں ہے دوری

شہرت بخاری

○

وہ پاس آئے، آس بندھی اور پلٹ گئے
کتنے ہی پردے آنکھوں کے آگے سے ہٹ گئے

ہر باغ میں بہار ہوئی خیمہ زن، مگر
دامن کے ساتھ ساتھ یہاں دل بھی پھٹ گئے

لمحوں کا پلّہ کچھ ایسا پڑا کہ ہم
منزل قریب آئی تو رہبر سے کٹ گئے

دل دے کے اس طرح سے طبیعت سنبھل گئی
گویا تمام عمر کے جھگڑے نپٹ گئے

برسوں کے پیاسے دشت نوردوں سے پوچھیے
ان بادلوں کا پیار جو گھرتے ہی چھٹ گئے

بستے رہیں نہ جب غمِ دوراں کی وسعتیں
ہم لوگ اپنے گوشۂ دل میں سمٹ گئے

شہرت انہیں بھلانے کی کوشش جو کی کبھی
دامانِ دل سے سینکڑوں فتنے لپٹ گئے

○

ہم پی گئے سب، ہلے نہ لب تک
جی ہار گئے، نجومِ شب تک

ہر چند گھٹائیں چھٹ گئی ہیں
پر دل پہ غبار سا ہے اب تک

خوش ہو نہ زمانہ میرے غم پر
آئے گا یہ دورِ جام سب تک

اشکوں نے فسانہ کر دیا ہے
وہ لفظ کہ آ سکا نہ لب تک

ہر غم کو اُڑا دیا ہنسی میں
تم پیشِ نظر رہے ہو جب تک

مے خانے میں سر چھپائیں آؤ
وا ہو درِ کعبہ جانے کب تک

شہرت کوئی اور بات چھیڑو
اُٹھیں وہ نقابِ لطف جب تک

شہزاد احمد شہزاد

○

میری خاطر دیر تک رکنا اور سفر کرتے جانا
لیکن چھوڑ کے جانے والا ایک نظر کرتے جانا

اتنا سکوں اتنی خاموشی جیسے رات گزر سکتی ہے
جاتے جاتے محفلِ دل کو زیر و زبر کرتے جانا

ہجر کی شب کے لمحو! تم کو ڈھلتے جانا ہے لیکن
میرے دل پر کیا گزری ان کو تو خبر کرتے جانا

سوتی آنکھیں ہنستے لب آپ ہی اک رسوائی ہیں
چپ چپ رہنا اور طوافِ گھر کرتے جانا

اور ذرا چمکا دینا یادوں کے بھڑکتے شعلوں کو
اے غمِ جاناں اے غمِ دوراں دل پہ اثر کرتے جانا

ہم سے درد کے ماروں کی مجبوری کیا پوچھتی ہو
جینا اور نہ مرنا لیکن عمر بسر کرتے جانا

کس کو خبر شہزاد کہ ان آنکھوں میں کیا جادو ہے
کہنا اور نہ سننا لیکن دل میں گھر کرتے جانا

○

کھلے جو پھول تو منہ چھپ گیا ستاروں کا
مثالِ ابر چلا کارواں بہاروں کا

نہ مجھ سے پوچھ شبِ ہجر دل پہ کیا گزری
یہ دیکھ حال ہے کیا میرے غمگساروں کا

نئی بہار ہنسے اک نیا چمن کھل جائے
سمجھ سکے کوئی مطلب اگر اشاروں کا

شبِ سیاہ کے لمحے گزار دیجئے دو
گھڑی گھڑی نہ کرو ذکر ماہ پاروں کا

دکھائی دیتی ہے اک ایک روپ رنگ کی بات
فضا میں رقص ہو جس طرح ابر پاروں کا

ہوا نہ راہ میں حائل کوئی شگوفہ بھی
رواں دواں ہی رہا قافلہ بہاروں کا

مجھے بھی اہلِ جہاں بھول جائیں گے شہزاد
کسے خیال ہے ڈوبے ہوئے ستاروں کا

سلام مچھلی شہری

○

یہ ابر و باد یہ طوفاں، یہ اندھیری رات
اب ایک موڑ پہ آجا رفیقِ راہِ حیات

ہوا کے دوش پہ موجِ اجل خراماں ہے
مریضِ دہر پہ طاری ہیں نزع کے لمحات

حیات ایک تخیل نہیں حقیقت ہے
مجھے بتائی ہے آدم کے عزم نے یہ بات

مرے رفیق محبت کے دن بھی آئیں گے
وہی حسین سویرا وہی کنواری رات

وہی گلاب کے موسم وہی شراب کے دور
وہی شریر گھٹائیں، وہی بھری برسات

سنائی جائے گی کونپل کو ہم نوا کر کے
حسین پھولوں کو بھنوروں کی ایک ناز کی بات

غزل کی ڈال سجا کر چمن کی دلہن کو —
سلام نذر کرے گا سہاگ کی سوغات

○

ہوا زمانے کی ساقی بدل تو سکتی ہے
حیات ساغرِ رنگیں میں ڈھل تو سکتی ہے

بس اک لطیف تبسم بس اک حسین نظر
مریضِ دل کی یہ حالت سنبھل تو سکتی ہے

جہاں پہ چھوڑ رہے ہو مجھے اندھیرے میں
وہیں سے راہِ محبت نکل تو سکتی ہے

پھر اپنے غنچۂ زخمِ جگر کا کیا ہوگا
نسیمِ صبح مری سمت چل تو سکتی ہے

تری نگاہِ کرم کی قسم ہے اب بھی مجھے
یہی یقین کہ دنیا بدل تو سکتی ہے

سلام! جام و سبو کی یہ شاعری معلوم
وگرنہ اپنی طبیعت بہل تو سکتی ہے!

شاعر لکھنوی

○

آنسو شراروں میں ڈھل رہے ہیں — غم دل کی فضا بدل رہے ہیں
گلشن ہے انہیں کا گل انہیں کے — کانٹوں پہ جو ہنس کے چل رہے ہیں
ایک ایک نفس میں روشنی ہے — یادوں کے چراغ جل رہے ہیں
چپ چپ سی ہے تلخیٔ زمانہ — غم جام و سبو میں ڈھل رہے ہیں
مٹ مٹ کے ابھر رہی ہے دنیا — بجھ بجھ کے چراغ جل رہے ہیں
اللہ رے اعتبار ہستی — ہم خواب میں جیسے چل رہے ہیں
اس سمت بھی گردش زمانہ! — کچھ لوگ ابھی سنبھل رہے ہیں

ساحل پہ انہیں کا حق ہے شاعر
طوفاں کا جو رخ بدل رہے ہیں

○

جو غم حبیب کے نہ رہے وہ خود اپنی آگ میں جل
جو غم حبیب کو پا گئے وہ غموں سے ہنس کے نکل

جو تھکے تھکے سے تھے حوصلے وہ شباب بن کے مچل
جو نظر نظر سے گلے ملی تو بجھے چراغ بھی جل

نہ خزاں میں ہے کوئی تیرگی نہ بہار میں کوئی روشـ
یہ نظر نظر کے چراغ ہیں کہیں بجھ گئے کہیں جل

غم عیش یاس و امید کا نہ اثر حیات پہ ہو
مری روح عشق وہی رہی یہ لباس تھے جو بدل

نہ ہے شاعرا یہ غم زبوں نہ وہ داغ دل نہ وہ تاز
جنہیں اعتماد بہار تھا وہی پھول رنگ بدل گئے

جعفر طاہر

○

سوئے حرم سے نکلی ہے کوئے بتاں کی راہ
جانے کہاں پہ آ کے ملی ہے کہاں کی راہ

صد آسماں چمن و صد کہکشاں بدوش
بام بلندِ یار ترے آستاں کی راہ

ملکِ عدم میں قافلۂ عمر جا بسا
ہم دیکھتے ہی رہ گئے اُس بدگماں کی راہ

لُٹتا رہا ہے ذوقِ نظر گام گام پر
اب کیا رہا ہے پاس جو ہم لیں یہاں کی راہ

اے زلفِ خم بخم تجھے اپنا ہی واسطہ
ہموار ہونے پائے نہ عمرِ رواں کی راہ

کھلائے رنگ رنگ میں افکارِ نو بہ نو
یہ رہگزارِ شعر ہے کس گلستاں کی راہ

طاہر یہ منزلیں، یہ مقامات، یہ حرم
اللہ رے یہ راہ، یہ کوئے بتاں کی راہ

○

عرصۂ ظلمتِ حیات کٹے
ہم نفس مسکرا کہ رات کٹے

شہرِ آرزو کا ذکر نہ چھیڑ
چھونے پائے نہ تیشے کہ بات کٹے

کاش ہر زلف تیغ بن جائے
کاش زنجیرِ حادثات کٹے

اے بقائے دوام کے مالک
کس طرح عمرِ بے ثبات کٹے

آدمی جستجوئے راہ میں ہے
تجھ کو ضد ہے رہِ نجات کٹے

شبِ خلوت سخن سخن کی داد
اور سرِ بزم بات بات کٹے

حبیب اشعر

○

دل کے ہاتھوں کہیں دنیا میں گوارا نہ رہا
ہم کسی کے نہ رہے، کوئی ہمارا نہ رہا

صبر اے دل! اگر یہ حالت نہیں دیکھی جاتی
ٹھہر اے درد! کہ اب ضبط کا یارا نہ رہا

یوں تو اب بھی ہے وہی رنگ وہی محرومی
وہ جو اک تیری طرف سے تھا اشارا نہ رہا

اور تو کیا تھا انہیں اپنا سمجھنے کے سوا
وہ بھی اب عشق کی غیرت کو گوارا نہ رہا

چھن گئی آخری امید بھی دل سے اشعر
یہ سہارا ہے کہ اب کوئی سہارا نہ رہا

○

بے نیازی سے، مدارات سے ڈر لگتا ہے
جانے کیا بات ہے ہر بات سے ڈر لگتا ہے

ساغرِ بادۂ گل رنگ تو کچھ دور نہیں
نگہِ پیرِ خرابات سے ڈر لگتا ہے

دل پہ کھائی ہوئی اک چوٹ ابھر آتی ہے
تیرے دیوانے کو برسات سے ڈر لگتا ہے

اے دل! افسانۂ آغازِ وفا رہنے دے
ہم کو بیتے ہوئے لمحات سے ڈر لگتا ہے

ہاتھ سے ضبط کا دامن نہ کہیں چھٹ جائے
آپ کی پرسشِ حالات سے ڈر لگتا ہے

میں جو اس بزم میں جاتا نہیں اشعر مجھ کو
اپنے ہی بہکے ہوئے جذبات سے ڈر لگتا ہے

مکین احسن کلیم

○

حیات مجھ پہ اک الزام ہی سہی پھر بھی
بہت عزیز ہے مجھ کو یہ زندگی پھر بھی

نہیں کچھ اور تو ممکن تھی خودکشی پھر بھی
ہے کوئی بات کہ جیتا ہے آدمی پھر بھی

یہ تیرگی تو بس اک گردشِ زمیں تک ہے
مگر یہ رات جو ہم سے نہ کٹ سکی پھر بھی

چمن لٹا ہے خود اہلِ چمن کی سازش سے
کلی کلی ہے مگر محوِ خواب سی پھر بھی

کسی کو پا کے بھی اکثر گماں یہ ہوتا ہے
کہ جیسے رہ گئی باقی کوئی کمی پھر بھی

ہمیں پہ یورشِ ظلمت ہمیں ہیں کشتۂ شب
ہمیں ہیں پیشروِ صبح و روشنی پھر بھی

لبِ کلیم پہ اب نغمۂ بہار تو ہے
یہ اور بات کہ آنکھیں ہیں شبنمی پھر بھی

○

بہت تلخ ہیں زندگی کے فسانے
مرے خواب ہیں پھر بھی کتنے سہانے

سہارا نہ دیتی اگر موجِ طوفاں
ڈبو ہی دیا تھا ہمیں ناخدا نے

سحر کو تو آنا ہے آ کر رہے گی
کٹے کیسے لیکن یہ شب کون جانے

گری اور گرتی رہی برقِ سوزاں
بنے اور بنتے رہے آشیانے

ستاروں سے آگے بہت کچھ ہے مانا
زمیں پہ بھی جینے کے ہوں کچھ بہانے

کلیم آج کیا سوچ کر ہو گئے چپ
ارے آ گئے یاد کب کے زمانے

سلیم احمد

○

ترک ان سے رسم و راہ ملاقات ہو گئی
یوں مل گئے کہیں تو کوئی بات ہو گئی

دل تھا اُداس عالمِ غربت کی شام تھی
کیا وقت تھا کہ تم سے ملاقات ہو گئی

یہ وحشتِ جمال، یہ منزل کی دُھن، یہ شوق
یہ بھی خبر نہیں کہ کہاں رات ہو گئی

رسمِ جہاں نہ چھوٹ سکی ترکِ عشق سے
جب مل گئے تو پرسشِ حالات ہو گئی

خُو بُو رہی سہی تھی، جو تجھ میں خلوص کی
اب وہ بھی نذرِ رسمِ عنایات ہو گئی

دلچسپ ہے سلیم، حکایت تری مگر
اب سو بھی جا کہ یار، بہت رات ہو گئی

○

مانے تو کس کی دیوانہ مانے — جتنی زبانیں اُتنے فسانے
انداز اس کا، احوال میرا — کچھ میں نہ سمجھوں کچھ وہ نہ جانے
اللہ رے یہ خود اعتمادی — میں اب چلا ہوں اُن کو منانے
گم کردہ رہ کیا سوچتا ہے — چھوڑ آیا پیچھے کتنے ٹھکانے
میری وفا کا وہ معترف ہے — اپنی خطا کو مانے نہ مانے
چاہو تو آؤ چاہو نہ آؤ — دونوں کے یکساں حیلے بہانے
کچھ میرے غم سے نسبت ہے اُن کو — یاد آ رہے ہیں کتنے زمانے
کیا ہے سلیم ان باتوں کا حاصل
کس کو چلا ہے تو آزمانے

نورؔ بجنوری

○

ان گھٹاؤں میں اُجالے کا بسیرا ہی سہی
خیر اگر آپ بضد ہیں تو سویرا ہی سہی

بے غمِ زیست بلاتی ہیں مہکتی زلفیں
آج کی رات یہ پُر نور اندھیرا ہی سہی

دل میں جو آگ لگی ہے وُہ کہاں بجھتی ہے
رہِ شاداب میں ابر گھنیرا ہی سہی

ہوشیار اہلِ خرد خاک نشیں آ پہنچے
آپ کے زعم کا افلاک پہ ڈیرا ہی سہی

تو پریشان نہ ہو خالقِ فردوسِ بریں
یہ جہنم یہ جہاں آج سے میرا ہی سہی

کتنی یادیں ہیں کہ ناگن کی طرح ڈستی ہیں
نورؔ ان گیسوؤں کا اک آخری پھیرا ہی سہی

○

میری دُنیا سنگ و آہن ان کی دُنیا چاند ستارے
عقل کہاں تک دامن کھینچے عشق کہاں تک ہاتھ پسارے

اپنی اپنی دھن میں گم ہیں شاموں صبحوں کے متوالے
صُبح کے آنسو کون سکھائے رات کے گیسو کون سنوارے

آبلہ پا رہگیروں کو جھرنوں سے دل بہلانے بھی دے
عزم جواں کو اور جواں کر اپنی منزل دُور ہے پیارے

چھم چھم چھم چھم ناچتی موجیں یہ سرگوشی کرتی جائیں
طُوفانوں کی راہ تکیں گے کب تک یہ مجبور کنارے

نورؔ امیدوں کے شعلوں میں رُوحیں جلتی دیکھ چُکی ہیں
تم ہی بتاؤ ان آنکھوں سے آنسو ٹپکیں یا انگارے

اصغر سلیم

○

غبار سا ہے سرِ شاخسار کہتے ہیں
چلا ہے قافلۂ نوبہار کہتے ہیں

بدل گئی ہیں جہانِ وفا کی سب رسمیں
اُجڑ گئے ہیں دلوں کے دیار کہتے ہیں

اس ایک بات سے کلیوں کا دل دھڑکتا ہے
کہ ہم صبا سے حدیثِ بہار کہتے ہیں

یہ ہم بچے تو کسی مصلحت سے ہے ورنہ
فقیہہِ شہر بھی ہے بادہ خوار، کہتے ہیں

جسے کبھی سرِ منبر نہ کہہ سکا واعظ
وہ بات اہلِ جنوں زیرِ دار کہتے ہیں

سلیم سایۂ گل ہو کہ سختیٔ زنداں
جنوں ہے شیوۂ مردانِ کار، کہتے ہیں

○

گلشن گلشن شعلۂ گل کی، زلفِ صبا کی بات
حرفِ جنوں کی، بندِ گراں کی، جرم و سزا کی بات

زنداں زنداں شورِ جنوں ہے موسمِ گل کے آنے
محفل محفل اب کے برس ارباب وفا کی بات

حدِ ستم ہے دیکھیں ہم آشفتہ سروں پہ کیا گزرے
شہر میں اس کے بندِ قبا کی رنگِ حنا کی بات

ایک ہوا دیوانہ اک نے سر تیشے سے پھو
کیسے کیسے لوگ تھے جن سے رسمِ وفا کی بات

ٹوٹ گئیں نغموں کی طنابیں شعر کے خیمے راکھ ہو
بزمِ سخن میں جب بھی سلیم اس شعلہ نوا کی بات

ساغر صدیقی

○

گھوم کر گاؤ! میں شرابی ہوں
رقص فرماؤ! میں شرابی ہوں

ایک سجدہ بنامِ مے خانہ
دوستو آؤ! میں شرابی ہوں

لوگ کہتے ہیں رات بیت چکی
مجھ کو سمجھاؤ! میں شرابی ہوں

آج ان ریشمی گھٹاؤں کو
یوں نہ بکھراؤ! میں شرابی ہوں

حادثے روز ہوتے رہتے ہیں
بھول بھی جاؤ! میں شرابی ہوں

مجھ پہ ظاہر ہے آپ کا باطن
منہ نہ کھلواؤ! میں شرابی ہوں

○

چراغِ طور جلاؤ! بڑا اندھیرا ہے
ذرا نقاب اٹھاؤ! بڑا اندھیرا ہے

وہ جن کے ہوتے ہیں خورشید آستینوں میں
انہیں کہیں سے بلاؤ! بڑا اندھیرا ہے

مجھے خود اپنی نگاہوں پہ اعتماد نہیں
مرے قریب نہ آؤ! بڑا اندھیرا ہے

فرازِ عرش سے ٹوٹا ہوا کوئی تارا
کہیں سے ڈھونڈ کے لاؤ! بڑا اندھیرا ہے

ابھی تو صبح کے ماتھے کا رنگ کالا ہے
ابھی فریب نہ کھاؤ! بڑا اندھیرا ہے

بصیرتوں پہ اجالوں کا خوف طاری ہے
مجھے یقین دلاؤ! بڑا اندھیرا ہے

جسے زبانِ خرد میں شراب کہتے ہیں
وہ روشنی سی پلاؤ! بڑا اندھیرا ہے

بنامِ زہرہ جبینانِ خلدِ فردوس
کسی کرن کو جگاؤ! بڑا اندھیرا ہے

عظیم مرتضیٰ

○

کچھ بھی ہو مرا حال نمایاں تو نہیں ہے
دل چاک سہی غیرِ گریباں تو نہیں ہے

حسنِ طلب برق ہے تعمیرِ نشیمن
ورنہ ہوسِ سیرِ گلستاں تو نہیں ہے

کچھ نقش تری یاد کے باقی ہیں ابھی تک
دل بے سر و ساماں سہی ویراں تو نہیں ہے

ہم درد کے مارے ہی گراں جاں ہیں وگرنہ
جینا تری فرقت میں کچھ آساں تو نہیں ہے

ٹوٹا تو عزیزو اُدھر ہوا اہلِ وفا کو
دل بھی کہیں اُس شوخ کا پیماں تو نہیں ہے

○

ترا خیال بھی ہے، وضعِ غم کا پاس بھی ہے
مگر یہ بات کہ دُنیا نظر شناس بھی ہے

بہارِ صبحِ ازل پھر گئی نگاہوں میں
وہی فضا ترے کوچے کے آس پاس بھی ہے

جو ہو سکے تو چلے آؤ آج میری طرف
ملے بھی دیر ہوئی اور جی اُداس بھی ہے

خلوصِ نیتِ رہرو پہ منحصر ہے عظیم
مقامِ شوق بہت دُور بھی ہے پاس بھی ہے

جمیلؔ ملک

○

ون ہمارا درد بٹائے، کون ہمارا تھامے ہات
ن کے نگر میں جگمگ جگمگ اپنے دیس میں رات ہی رات

نیلے نیلے امبر پہ وُہ چاند ——— وہ کرنوں کی برسات
مدونوں گھوٹے گھونٹے سے ہائے وُہ مست منوہر گھات

فلش گلشن شلائے میں صحرا صحرا بھٹکوں!
ں کا یہ سودا ہے ورنہ تیرا اور میرا کیا سات

ب دُنیاداری کی باتیں، دل میں اَور زباں پر اور
رے پیار بڑھا کر آخر جان گئے تیری اوقات

بت اب اس کو اپناؤ چاہے ناز سے ٹھکراؤ!
ی سے اپنا دخل نہیں ہے دل کی ڈور تمہارے ہات

یا کا منشا ہے پہلے سے ہم گھُٹ گھُٹ کر مر جائیں!
ں کی دھڑکن یہ کہتی ہے اک دن بدلیں گے حالات

ب لوگوں نے سے تم نے سب کے دل بہلائے ہیں
یالو یہ وہم کہ میرے ہونٹوں پہ ہے اپنی بات

○

یہ منظر یہ رُوپ انوکھے سب شہکار ہمارے ہیں
ہم نے اپنے خونِ جگر سے کیا کیا نقش اُبھارے ہیں

صدیوں کے دِل کی دھڑکن ہے اُن کی جاگتی آنکھوں میں
یہ جو فلک پہ ہنس مکھ چنچل جگمگ جگمگ تارے ہیں!

ایک ذرا سی بھُول پہ ہم کو اتنا تو بدنام نہ کر
ہم نے اپنے گھاؤ چھپا کر تیرے کاج سنوارے ہیں

کچھ باتیں، کچھ راتیں، کچھ برساتیں اپنا سرمایہ
ماضی کے اندھیارے میں جلتے دیپ ہمارے ہیں

ایک جہاں کی کھوج میں اپنے پیار کی نگری چھوڑ آئے
اور زمانہ یہ سمجھا، ہم پیار کی بازی ہارے ہیں

سب سے ہنس کر ملنے والے ہم کو کسی سے بیر نہیں
دُنیا ہے محبوب ہمیں اور ہم دنیا کو پیارے ہیں

غزلِ جدید

ہری چند اختر

شباب آیا کسی بُت پر فدا ہونے کا وقت آیا
مری دنیا میں بندے کے خدا ہونے کا وقت آیا

اُسے دیکھا تو زاہد نے کہا ایمان کی یہ ہے
کہ اب انسان کو سجدہ روا ہونے کا وقت آیا

تکلم کی خموشی کہہ رہی ہے حرفِ مطلب سے
کہ اشک آمیز نظروں سے ادا ہونے کا وقت آیا

ہمیں بھی آپڑا ہے دوستوں سے کام کچھ، یعنی
ہمارے دوستوں کے بے وفا ہونے کا وقت آیا

نویدِ سربلندی دی منجم نے تو میں سمجھا
سگانِ دہر کے آگے دوتا ہونے کا وقت آیا

شعری بھوپالی

غضب ہے جستجوئے دل کا یہ انجام ہو جائے
کہ منزل دور ہو اور راستے میں شام ہو جائے

وہی نالہ، وہی نغمہ، بس اک تفریقِ لفظی ہے
قفس کو منتشر کر دو نشیمن نام ہو جائے

تصدق عصمتِ کونین اس مجذوبِ اُلفت پر
جو اُن کا غم چھپائے اور خود بدنام ہو جائے

یہ عالم ہو تو ان کو بے حجابی کی ضرورت کیا
نقاب اُٹھنے نہ پائے اور جلوہ عام ہو جائے

یہ میرا فیصلہ ہے آپ میرے ہو نہیں سکتے
میں جب جانوں کہ یہ جذبہ مرا ناکام ہو جائے

ابھی تو دل میں ہلکی سی خلش محسوس ہوتی ہے
بہت ممکن ہے کل اس کا محبت نام ہو جائے

اسد ملتانی

○

رہیں نہ رند یہ واعظ کے بس کی بات نہیں
تمام شہر ہے دو چار دس کی بات نہیں

ہیں کچھ طیور فضائے چمن کے زندانی
فقط اسیریٔ دام و قفس کی بات نہیں

نگاہ بھی نہیں اٹھتی بلندیوں کی طرف
طلب کا ذکر نہیں دسترس کی بات نہیں

نگاہِ دوست سے ہوتی ہے دل کی نشو و نما
یہاں مقابلۂ برق و خس کی بات نہیں

عجب نہیں جو محبت ہو زخمِ جاوید
کہ عرضِ شوق نفس دو نفس کی بات نہیں

پسندِ خاطرِ اہلِ صفا ہے میری غزل
کہ اس میں کوئی ہوا و ہوس کی بات نہیں

اسدؔ یہ کام ہے صد گونہ سینہ کاوی کا
حیات صرف شمارِ نفس کی بات نہیں

کشفی ملتانی

○

جل جل ہی رہیگا، کُل تر ہو نہیں سکتا
خوں ہو کے بھی منظورِ نظر ہو نہیں سکتا

جو ظلم کیا تُو نے، کیلئے جگری ہے
ایسا تو کسی کا بھی جگر ہو نہیں سکتا

تھک تھک کے تری راہ میں یوں بیٹھ گیا ہوں
گویا کہ بس اب مجھ سے سفر ہو نہیں سکتا

اظہارِ محبت مرے آنسو ہی کریں گے
اظہار یہ اندازِ دگر ہو نہیں سکتا

ہر لمحہ لہو کی کبھی بنتی نہیں آنسو
جیسے کہ ہر اک قطرہ گہر ہو نہیں سکتا

یہ عہدِ جوانی بھی ہے کچھ ایسا زمانہ
بے بادہ سرِ جوش بسر ہو نہیں سکتا

لے جائے گا یہ دل مجھے اُس بزم میں آخر
جس میں کہ صبا کا بھی گذر ہو نہیں سکتا

جب تک تری رحمت کا ہے کشفیؔ کو سہارا
بچ یہ ہے گناہوں سے حذر ہو نہیں سکتا

عشرت رحمانی

○

دل ہی نہیں تو دل کے سہاروں کو کیا کروں
جب پاس تم نہیں تو بہاروں کو کیا کروں

جلوے سے جن کے چاند ستاروں میں تھی ضیا
اب وہ ہنسی نہیں تو ستاروں کو کیا کروں

تصویر اور تصورِ جاناں یہ سب فریب،
میں اُن سے دُور اُن کے نظاروں کو کیا کروں

وہ جنتِ نگاہ، وہ فردوسِ رنگ و بُو
گذری ہوئی حسین بہاروں کو کیا کروں

نگاہوں سے نُور چھین لیا اے خیالِ یار
تیرے بغیر ایسے اشاروں کو کیا کروں

دل ہے خزاں نصیب گلستاں ہے پُر بہار
عشرتؔ بھلا میں ایسے نظاروں کو کیا کروں

شوکت تھانوی

○

ہو راہزن کی ہدایت کہ راہبر کے فریب
مری نگاہ نے کھائے نظر نظر کے فریب

یہ بُتکدے، یہ کلیسا، یہ مسجدیں یہ حرم
یہ سب فریب ہیں اور ایک سنگِ در کے فریب

بھرے رہے تھے کہ اشکوں سے ہوگا دل ہلکا
نہ جانتے تھے کہ ہیں یہ بھی چشمِ تر کے فریب

پتہ چلا کہ ہر اک گام میں تھی اک منزل
کھلے ہیں منزلِ مقصود پہ سفر کے فریب

ان ہی کا نام محبت ان ہی کا نام جنوں
مری نگاہ کے دھوکے تری نظر کے فریب

وحید قریشی

غم کے ہاتھوں اک عذاب ہے عشق کا پہلا کام نہیں
گلی گلی پتھر پڑتے تھے ہم بھی ایسے بنام نہیں

وہ بھی کیا دن تھے جن دنوں بیکاری میں کٹتے تھے
اب کیسی آفت آ پڑی ہے چین نہیں آرام نہیں

دل کے ٹوٹتے ہی آنکھوں نے حیف یہ عالم دیکھ لیا
جلوہ سرِ رہ کوئی نہیں ہے کوئی برسرِ بام نہیں

جس کے نشے سے چور ہو کر بیٹھے ہیں ہم رسوا ہوں
سچ ہے گل کے ہاتھوں میں ایسا کوئی جام نہیں

دل کا رونا، دل کا کڑھنا، لاکھ عذابِ الیم سہی
ہمت ہار کے بیٹھ ہی جائیں ہم ایسے ناکام نہیں

خلیل الرحمن اعظمی

گلی گلی کی ٹھوکر کھائی کب سے خانہ ویرانیاں ہیں
ہاں اپنا ہی چمن نہیں ہے کہ کر…

فرصت ہو تو آکر دیکھو ہم آوارہ گردوں کو
کتنے غبار ہیں ان آنکھوں میں کتنے…

سر جھکا اس شوخ کے آگے اور کہیں پہ جھک نہ سکا
ملک میں ہو خدا میں طلاطم ہماری…

کچھ تو مداوا کرنا ہوگا اس آشفتہ مزاجی کا
اے غمِ جاناں اپنے پیچھے سب ہی…

عادی ہو گئے رنگ کے جب سے تیرے شہر میں آن بسے
جل جل اٹھتے ہیں تمہارے ہم سا…

ہم نے اپنی طرف سے خواہش کب تم کو بدنام کیا
تم نے جو ہر دل غم نے پیمانہ ہو…

اہلِ زمانہ کو بس میری اک رسوائی یاد رہی
وہ میری دنیا کے جانے کتنے…

فتنہ سا کچھ بھی ہو لوح بھی پھر دنیا کی ہوا کا
معلوم کیا ہو کیا رنگ کا اس کے…

خیر سے آج کل اہلِ ستم کو دیوانوں سے کام پڑا ہے
دیکھی کتنی زنجیریں ہیں دیکھیں کتنے…

بڑے اہلِ خرد ہیں اک دن خاک چھان کے پھر اٹھے تھے
ان کا شہر جانے کیا ہو جو مقتول…

اک اک لمحہ جل بے سوز کی تب جا کر یہ رات کٹی
تیرے لیے اے صبحِ طرب ہم کب سے…

میر کا طرز اپنایا سب نے لیکن یہ انداز کہاں
اعظمی صاحب آپ کی غزلیں سن سن کر سب حیراں ہیں

شاد

نریش کمار

○

شام وعدہ کا ڈھل گیا سایا
آنے والا ابھی نہیں آیا

زندگی کے غموں کو اپنا کر
ہم نے دراصل تجھ کو اپنایا

جستجو ہی دلوں کی منزل تھی
ہم نے کھو کر تجھے، تجھے پایا

زندگی نام ہے جدائی کا
آپ آئے تو مجھ کو یاد آیا

ہم نے تیری جفا کے پردے میں
خود بھی دل پہ بہت ستم ڈھایا

زندگی سے تو خیر شکوہ تھا
مدتوں موت نے بھی ترسایا

شاد اہلِ طرب کو بھی اکثر
میری افسردگی پہ پیار آیا

حزیں

شعیب احمد

○

یوں غرق تھا ان جلووں میں حزیں نظریں بھی اٹھانا بھول گیا
خود ہی فسانہ بن تو گیا، عنوانِ فسانہ بھول گیا

مانا وہ نگاہیں بجلی تھیں، مانا وہ تبسم شعلہ تھا
دل برق کی زد پہ خود آیا، یہ بات زمانہ بھول گیا

وہ برق گرانے والا بھی خود اس کی تلافی کر نہ سکا
دامن کی ہوا ہم کیا کرتے، دل ہوش میں آنا بھول گیا

ہونٹوں پہ تبسم کی بجلی، آنکھوں میں تجلی کے طوفاں
اس طرح وہ آئے محفل میں، میں نظریں جھکانا بھول گیا

نخشب جارچوی

کوئی کس طرح رازِ الفت چھپائے
نگاہیں ملیں اور قدم ڈگمگائے

وہ مجبوریوں پر مری مسکرائے
یہاں تک تو پہنچے یہاں تک تو آئے

محبت میں کچھ اتفاقات بھی تھے
کہ جو میری تقدیر بننے نہ پائے

ترا غم بھلا کیا چھپائے سے چھپتے
بہت اشک روکے بہت مسکرائے

وہ اس طرح بیٹھے ہارے سے گُھلے
ادائیں سنبھالے نگاہیں جھکائے

زمانے کے جور و ستم توبہ توبہ
کہ اکثر تو مجھ کو نہ تم یاد آئے

ترے روبرو گر نظر مطمئن ہو
تڑپنے میں دل بھی دھڑکنے نہ پائے

میں اس امتیازِ نظر کے تصدق
نہ بیگانہ سمجھے نہ اپنا بنائے

یہی تو جوابِ شکایت تھا نخشب
مرے شعر اس نے مجھی کو سنائے

کیف

حکیم ہاشم جان

○

منزل ہے سفر میں مری یا میں ہوں سفر میں
اتنا بھی نہیں ہوش تری راہ گذر میں

حسرت ہے اب اتنی دلِ شوریدہ اثر میں
میں اُن کی نظر میں رہوں وہ میری نظر میں

کیا کیا نہ دکھائی تری رفتار نے شوخی
پس پس گئے فتنے بھی تری راہ گذر میں

تم چھپ نہیں سکتے، کہیں تم جا نہیں سکتے
تم میرے تخیل میں ہو تم میری نظر میں

ہر قافلے والے سے نہ تھی رسم شناسائی
ملتا تھا مسافر کی طرح کیف سفر میں

حمیدہ نسیم

بس جادہ ہے منزل نہیں ہے
یہ مشکل آخری مشکل نہیں ہے

دلِ رہرو میں ہیں کچھ اور خطرے
غبارِ دوریٔ منزل نہیں ہے

خرد باطل، خرد پہ ناز باطل
مگر میرا جنوں باطل نہیں ہے

یہ دل بے مہر بھی ہے بے وفا بھی
نہیں یہ دل تو میرا دل نہیں ہے

ڈرا آپ مجھے یوں خستہ بتی
بجز اندیشۂ حاصل نہیں ہے

میں اب کچھ جانتا ہوں اپنا انجام
ڈرانا اس کے قابل نہیں ہے

یہاں قعرِ دریا ہے سفینہ
نہیں اے ناخدا! ساحل نہیں ہے

یہاں مہر و وفا نادانیاں ہیں
بھلا یا عشق کے قابل نہیں ہے

یہ مرحوم امیدوں کا مدفن
کبھی دل تھا مگر اب دل نہیں ہے

تابش دہلوی

ہوگا سکوں بھی ہوتے ہوتے
سو جاؤں گا روتے روتے

آخر دل ہے، ٹھہر جائے گا
شام و سحر کے ہوتے ہوتے

وحشت ناک ہے خوابِ ہستی
چونک پڑا ہوں سوتے سوتے

داغِ دل اشکوں سے مٹے گا
دُھلتے دُھلتے دھوتے دھوتے

آپ سے آپ ترے دیوانے
ہنس بھی دیتے ہیں روتے روتے

اختر ہوشیارپوری

پھر ابر برس کے کھل گیا ہے
مے خانے کا بھید کھل گیا ہے

ان گالوں میں عکس ہے شفق کا
یا رنگ نظر میں گھل گیا ہے

ہشیار غمِ جہاں! ادھر سے
اک پیکرِ کیف ڈھل گیا ہے

یہ تیرے بدن کی کسمساہٹ
پھولوں میں زمانہ تُل گیا ہے

اُف تیری نظر کی مے فشانی
دامانِ حیات ڈھل گیا ہے

احساس تو ڈوبا۔ دور اختر
افسانہ بڑے گھل گیا ہے!

اقبال صفی پوری

نکھر گئی جو چمن پر وہ کوئی کیا جانے
چھڑے ہوئے ہیں بہار و خزاں کے افسانے

جہاں پہ چاک گریباں بھی چاکِ دل بن جائے
گزر رہے ہیں اب ان منزلوں سے دیوانے

مرے لبوں کا تبسم تو سب نے دیکھ لیا
جو دل پہ بیت رہی ہے وہ کوئی کیا جانے

ترے حضور نہیں کہہ سکی نہ گویائی
مرے سکوت نے دہرا دیے وہ افسانے

نگاہِ عشق میں دیر و حرم کی قید نہیں
کہیں بھی شمع جلے، اُڑ چلیں گے پروانے

تمام وسعتِ کونین کو ڈبو دیں گے
چھلک گئے جو کہیں اس نظر کے پیمانے

نہ اشتیاقِ نظارہ، نہ اعتبارِ جمال
ٹھہر گئی ہے کہاں زندگی خدا جانے

نہ شمعِ بزم پہ کچھ آنچ آئے گی اقبال
خود اپنی آگ میں جلتے رہیں گے پروانے

خاطر غزنوی

جب اس زلف کی بات چلی
ڈھلتے ڈھلتے رات ڈھلی

پھر بھی چٹکی پھر بھی ہنسی
دیکھ کے سب حالات کلی

شمع کا بھی انجام نہ پوچھ
پروانوں کے ساتھ جلی

اب کے بھی تم دور رہے
اب کے بھی برسات چلی

ان آنکھوں نے لوٹ کے بھی
اپنے اوپر بات نہ لی

خاطر یہ ہے بازی دل
اس میں جیت سے مات بھلی

احمد فراز

ہم بھی خود دشمن جاں تھے پہلے
تم مگر دوست کہاں تھے پہلے

اب وہاں خاک اڑاتی ہے خزاں
پھول ہی پھول جہاں تھے پہلے

اب جو دیوار بنے بیٹھے ہیں
صورت موج رواں تھے پہلے

کچھ شرابی کہ ہیں اب راہ نشیں
رونق بزم جہاں تھے پہلے

ہم کہ ہیں آج غبار پس رو
منزل ہم سفراں تھے پہلے

بن گیا قافلہ چلتے چلتے
ورنہ تنہا ہی رواں تھے پہلے

اب کے دشمن محبت کا خیال
اور ہی لوگ یہاں تھے پہلے

اب تو خود پر بھی نہیں زعم وفا
تم سے ہم شکوہ کناں تھے پہلے

دولت غم تو میسر تھی فراز
اتنے مفلس بھی کہاں تھے پہلے

فارغ بخاری

یہی ہے دورِ غمِ عاشقی تو کیا ہو گا
اسی طرح سے کٹی زندگی تو کیا ہو گا

ابھی تو ہم نفسوں کو ہے وہمِ چارہ گری
ہوئی نہ درد میں پھر بھی کمی تو کیا ہو گا

یہ تیرگی تو بہر حال چھٹ ہی جائے گی
نہ راس آئی ہمیں روشنی تو کیا ہو گا

امید ہے کہ کبھی تو لبوں پہ آئے گی
کبھی نہ آئی لبوں پہ ہنسی تو کیا ہو گا

نفس نفس میں خزاں ہے نظر نظر میں ہراس
پھر اور دن یہی حالت رہی تو کیا ہو گا

رضا ہمدانی

یہ دورِ مسرت یہ تیور تمھارے
ابھرنے سے پہلے نہ ڈوبیں ستارے

بھنور سے لڑو تند لہروں سے الجھو
کہاں تک چلو گے کنارے کنارے

عجب چیز ہے یہ محبت کی بازی
جو ہارے وہ جیتے جو جیتے وہ ہارے

سیہ ناگنیں بن کے ڈستی ہیں کرنیں
کہاں کوئی یہ روزِ روشن گزارے

پہنچنے وہاں ڈوب کر ہی رہے ہیں
جہاں حوصلے ناخداؤں نے ہارے

کئی انقلابات آئے جہاں میں
مگر آج تک دن نہ بدلے ہمارے

تمہیں سیلِ نو کی خبر دے رہے ہیں
افق کو نکھرتے ہوئے تیز دھارے

سلیم واحد سلیم

صبح کی شعلہ مزاجی کا مداوا کچھ تو ہو
دشتِ وحشت ہو کہ زندانِ تمنا کچھ تو ہو

اب تلک یونہی رہیں گے اہلِ دل محرومِ دید
جہاتِ سے ہے اک یا حسن تقاضا کچھ تو ہو

ایک سناٹے میں گم ہیں زندگی کی شورشیں
شورِ محشر یا سکوتِ حشر بپا کچھ تو ہو

اک کرن بھی تو نہیں غم کی اندھیری رات میں
کوئی جگنو، کوئی آنسو، کوئی تارا کچھ تو ہو

ہم تو دیوانے تھے بربادی مقدر میں ہی
ہوش والوں نے مگر اس در سے پایا کچھ تو ہو

نبض کے نغموں سے گونج اٹھے بیابانِ امید
یہاں نغمے یا سکوتِ شامِ صحرا کچھ تو ہو

ہم دلِ بیتاب کو بھی راہ پر لاتے سلیم
دل مگر راہِ وفا میں بھولا بھٹکا کچھ تو ہو

احمد ظفر

آپ کہیں تو گلشن ہے
ورنہ دل اک مدفن ہے

کیسے یہ دن رات کٹیں
ایک مسلسل الجھن ہے

آگ لگی ہے سانسوں میں
ہائے یہ کیسا ساون ہے

اُن سے میری بات نہ پوچھ
اُن سے میری اَن بن ہے

پنچھی پنچھی سہم گیا
دوست یہ اچھا گلشن ہے

تاریکی چھٹ جائے گی
مشعل مشعل روشن ہے

وقت کی ہر آواز ظفر
میرے دل کی دھڑکن ہے

مینائے غزل

ماہ لقا

چندا بی بی

○

تم منہ لگا کے غیروں کو مغرور مت کرو
ٹک چلنا ایسے دیسوں سے دستور مت کرو

آنسو بہا کے ہر گھڑی زاری نہیں ہے خوب
یہ رازِ عشق ہے اسے مشہور مت کرو

ہر چند دل دکھانا کسی کا برا ہے پر
رنجیں خاطروں کو تو رنجور مت کرو

اے ہمدمو جو مجھ سے ہے منظور اختلاط
جز ذکرِ یار تم کوئی مذکور مت کرو

روشن رکھو جہان میں مولا مثالِ مہر
چندا کے منہ سے نور کو تم دور مت کرو

○

شیشۂ دل کو دیا ہوں تیرے ہات
چھوڑیا نا بت ہو رکھ تو اپنے سات

کعبۂ دل ہی سمجھ کر اپنا گھر
اے بتِ نامہرباں رہ ایک رات

انتظار آخر ہوا اے گلعذار
غنچۂ لب سے نہ کی پر تو نے بات

دو ہی دن ملنے میں تم گھبرا گئے
پھر خدا ہی جانے کب ہو ایسی گھات

روبرو چندا کے ہووے کیا عجب
مشتری و زہرہ و پہ دیں کرات

ادا جعفری (بدایونی)

○

فریب کاری تخئیل پہ جو اترائے
اب ایسے سرکش و ناداں کو کون سمجھائے

ہزار غم نے چاہا الگ تھلگ رہنا
جو کوئی شوخ کرن آپ ہی اُلجھ جائے

گرہ کشائی غنچہ کی داد کیا دیں دل
ہنسی کے ساتھ ہی آنکھوں میں اشک بھر آئے

نگاہِ قہر کی گرمی کی تاب کیا لاتے
نگاہِ مہر کی شوخی سے بھی جو کمھلائے

تری نگاہ کی حیرانیوں کے الجھائے
مری نگاہ کی نادانیوں نے سلجھائے

○

ڈھلکے ڈھلکے آنسو ڈھلکے چھلکے چھلکے ساغر چھلکے
دل کے تقاضے اُن کے اشارے بوجھل بوجھل پلکیں جھپکیں
دیکھو دیکھو دامن اُلجھا ٹھہرو ٹھہرو ساغر چھلکے
ان کا تغافل اُن کی توجہ اک دل اس پہ لاکھ تہلکے
اُن کی تمنا اُن کی محبت دیکھو سنبھل کے دیکھو سنبھل کے
ہم نے اٹھائے سینکڑوں طوفاں دل نے بسائے لاکھ محلے
پل میں ہنساؤ پل میں رلاؤ پل میں اُجالے پل میں دھندلکے
ہم نے نہ سمجھا تم نے نہ جانا دل نے چلائے لاکھ تہلکے
لاکھ منایا لاکھ بھلایا نین کٹورے بھر بھر چھلکے
کتنے اُلجھے کتنے سیدھے رستے اُن کے رنگ محل کے

کڑیاں جھیلیں پاپڑ بیلے
چھلکے اب تو گھڑا جل کے

زہرہ نگاہ

○

صبر و ضبط کے لے کے بیشمار نذرانے
تیری یاد آئی تھی، آج مجھ کو بہلانے

پا گئے ہیں منزل کو خود بخود ہی دیوانے
عقل کے دوراہے پر کھو گئے ہیں فرزانے

تم نے بات کہہ ڈالی کوئی بھی نہ پہچانا
ہم نے بات سوچی تھی بن گئے ہیں افسانے

ان نئی بہاروں پر ان نئے نظاروں پہ
ایک زندگی کیا ہیں، رو رہے ہیں میخانے

ہائے کیا نصیب ہے، ہائے کیا قیامت ہے
ہم ہی کھا گئے دھوکہ، ہم چلے تھے بہلانے

○

خوش ہو آئے تھے پشیمان گئے
اے تغافل تجھے پہچان گئے

خوب ہے صاحبِ محفل کی ادا
کوئی بولا تو بُرا مان گئے

کوئی دھڑکن ہے نہ آنسو نہ اُمنگ
وقت کے ساتھ یہ طوفان گئے

اُس کو سمجھے کہ نہ سمجھے لیکن
گردشِ دہر تجھے جان گئے

تیری ایک ایک ادا پہچانی
اپنی ایک ایک خطا مان گئے

اس جگہ عقل نے دھوکا کھایا
جس جگہ دل ترے فرمان گئے

اختر

نواب اختر محل

○

اک آہِ شعلہ بار سے دل کو جلا دیا
لو آج ہم نے اس کا بھی جھگڑا مٹا دیا

لکھ کر جو میرا نام زمیں پر مٹا دیا
ان کا تھا کھیل، خاک میں ہم کو ملا دیا

خط کے نامہ بر سے جو لے کر اُڑا دیا
غیروں نے آج اُن کے تئیں کچھ پڑھا دیا

تقصیر یار کی، نہ قصورِ عدو ہے کچھ
اختر ہمارے دل ہی نے ہم کو جلا دیا

شیریں

نواب شاہجہان بیگم والیہ بھوپال

○

خالق ہے خدائے سحر و شام ہمارا
مشہور اسی نے یہ کیا نام ہمارا

پیدا ہوئے ہم اُمتِ محبوبِ خدا میں
بڑھ کر نہ ہو کیوں رتبۂ اسلام ہمارا

ہم کہتے ہیں سچ کوچۂ دلدار کا اپنے
ہے چادرِ تن جامۂ احرام ہمارا

فرقت میں تری ساتھ دیا اپنا اسی نے
کام آیا بہت یہ دلِ ناکام ہمارا

پہلی سی رکاوٹ نہیں اب ہے نظرِ لطف
آغاز سے بہتر ہوا انجام ہمارا

کافر کیا مجھ کو، تری اس زلف نے کافر
اس لام نے کھویا ترے اسلام ہمارا

دنیا میں بڑا شور ہے شکر سخنی کا
شیریں جو تخلص میں ہوا نام ہمارا

نزاکت

○

بسکہ رہتا ہے یار آنکھوں میں
ہے نظر بے قرار آنکھوں میں

مثلِ گل رُخاں میں وُہ گل رُو
لے گیا دل ہزار آنکھوں میں

سُرمہ خاکِ پا غنایت ہو
آ گیا ہے غُبار آنکھوں میں

یاد آئے کمر جو گُلشن میں
ہو رگِ گُل بھی خار آنکھوں میں

عالَم

نواب بادشاہ محل

○

مجھ سے آزردہ میرا یار ہے آج
صبر کیسا، کسے قرار ہے آج

کل تو ہنس ہنس کے کر رہے تھے کلام
باتیں کرنے میں مجھ سے عار ہے آج

ساقیا! کس کا جامِ عشق پیا
چشمِ بد دُور، کیا خُمار ہے آج

نہیں ثابت کر گیا ہُوا دل کو
مثلِ سیماب بے قرار ہے آج

جلد آ، اے عزیزِ مصرِ جمال!
تیرا عالَم کو انتظار ہے آج

مشتری

قمر جان لکھنوی

○

ے ہے، گلزار ہے، ساقی ہے، گھٹا چھائی ہے
کہ دو توبہ شکنوں سے کہ بہار آئی ہے

کیا بلا عشق ہے جیتی ہوں تو بدنام ہوں میں
جان دیتی ہوں تو اس شوخ کی رسوائی ہے

کیا جنوں خیز ہے اُس کے گُلِ عارض کی بہار
کہ جسے دیکھیے خود رفتہ ہے، سودائی ہے

لی خبر اپنے مریضِ شبِ غم کی نہ کبھی
بس انھی باتوں پہ دعوائے مسیحائی ہے

شبِ فرقت کے جلائے مشتری جاگے تھے ہم
کیا تہِ خنجرِ قاتل ہمیں نیند آئی ہے

زہرہ

امراؤ جان لکھنوی

○

حوصلہ آپ کو جفا کا ہے
یہ نتیجہ مری وفا کا ہے

زلف کھولے ہوئے وہ آتا ہے
سامنا آج کس بلا کا ہے

اپنے مطلب کے آشنا سب ہیں
آشنا کون آشنا کا ہے

شیخ نے کعبہ، برہمن نے دیر
در مے خانہ ہم نے تاکا ہے

کیا کرے رہ کے ہند میں زہرہ
عزم بالجزم کربلا کا ہے

نازک

زینت بیگم

کوچہ میں کوئی سسکے، کوئی در پہ مرے ہے
انصاف بھی کچھ ہے، تو یہ کیا ظلم کرے ہے

موجود ہے ہر آن جو نزدیک ہمارے
وُہ وہم و گماں سے بھی حقیقت میں پرے ہے

ہے نالہ و زاری کا مرے شور فلک تک
پر وُہ بُتِ مغرور کوئی کان دھرے ہے

یاد آتی ہے اِن آنکھوں میں آمد وہ نشہ کی
ساقی نے گلرنگ سے جب جام بھرے ہے

غش میں مجھے کل دیکھ کے وُہ ڈر کے یہ بولا
بس ہوش میں آ کیوں مجھے بدنام کرے ہے

پیغام اجل چاہ ہے اُس بُت کی، و لیکن
کب عاشقِ جاں باختہ مرنے سے ڈرے ہے

جلتے تمہیں ٹک دیکھا، تو آنکھیں نہ نکالو
منظور ہمیں تو نظرے خوش گذرے ہے

نازک سفرِ دور کو گویا وہ سدھارا
گرمِ طلبِ شوق کے نزدیک ورے ہے

موتی

موتی جان

گلابی رُو برو ہے اور ہم ہیں
بس اب جام و سبُو ہے اور ہم ہیں

سیا گر تو نے چاکِ جیب ناصح!
تو پھر تارِ رفو ہے اور ہم ہیں

بلا سے گو نہ ہووے دل کو واشُد
ہجومِ یاس تو ہے اور ہم ہیں

شبِ مہتاب میں تا صبح ساقی
خیالِ ماہ رُو ہے اور ہم ہیں

یہ جی میں لہر کیا آئی کہ موتی
کنارِ آبِ جُو ہے اور ہم ہیں

شیریں

سُنتا ہے کون کس سے کہوں ماجرائے دل
بہتر ہو بے کسی سے نہ کوئی لگائے دل

کیونکر رہیں حواس ہو قابو سے جائے دل
اے کاش موت آئے، کسی پر نہ آئے دل

باتیں وہ دل فریب، ادائیں وہ دل رُبا
ایسے پری جمال پہ کیونکر نہ آئے دل

بے مہر و بے مروت و ناآشنا ہو تم
تم سے خدا کرے نہ کوئی بھی لگائے دل

شیریں کا یہ کلام ہے، ہر وقت ہر گھڑی
جس کو خدا خراب کرے وہ لگائے دل

لطیف

محمدی جان صاحبہ

آیا جمالِ یار کا جلوہ نظر کہاں
نخلِ مُراد نے ابھی پایا ثمر کہاں

کرتے ہیں سیر عالمِ لاہوت کی بشر
ہوتا ہے مشتِ خاک کا دیکھو گزر کہاں

عاشق نے تیرے چھان لی دیر و حرم کی خاک
اب اے قمر تجھ کو ڈھونڈے وہ آئے سیم بر کہاں

پوچھوں میں کس سے آہ کدھر جاؤں میں لطیف
ملتی ہے رفتگانِ عدم کی خبر کہاں

شباب

سین باذی بنارسی

○

مے کشی کا لطف تنہائی میں کیا، کچھ بھی نہیں
یار پہلو میں نہ ہو جب تک مزا کچھ بھی نہیں

تم رہو پہلو میں میرے، میں تمہیں دیکھا کروں
حسرتِ دل اے صنم! اس کے سوا کچھ بھی نہیں

حسرتِ دل کی بدولت میری رسوائی ہوئی
اس کا شکوہ آپ سے اے دل ربا کچھ بھی نہیں

نسبتِ بد دیکھئے، پوچھا جو اس نے حالِ دل
بامزہ کے ہاتھوں کو میں نے کہہ دیا کچھ بھی نہیں

آپ ہی تو چھیڑ کر پوچھا ہمارا حالِ دل
ہنسے پھر منہ پھیر کے، ہم نے سنا کچھ بھی نہیں

کوچۂ الفت میں انساں دیکھ کر رکھے قدم
ابتدا اچھی ہے اس کی، انتہا کچھ بھی نہیں

دلبر

امراؤ جان

○

سوجھی ہے کتنی دُور کی مجھ کو خمار میں
بنت العنب کو پھر میں بٹھاؤں کنار میں

ہم لاکھ چاہتے ہیں نہ اس شوخ سے ملیں
پر کیا کریں کہ دل ہی نہیں اختیار میں

اللہ رے شوقِ کوچۂ قاتل کہ بعدِ مرگ
اڑ کر مرا غبار گیا کوئے یار میں

تم آ گئے تو از سرِ نو زندگی ہوئی
باقی نہیں تھی جان مرے جسمِ زار میں

دلبر کو کربلا میں بلا لیجیے حسین
گھیرا ہے آفتوں نے بہت اس دیار میں

نور جہاں ناز

○

ہے نیم جاں کا آج بھی جھگڑا نہ ہو سکا
تم سے ستم بھی اے ستم آرا نہ ہو سکا

جب درد دل کا تم سے مداوا نہ ہو سکا
پھر کچھ بھی تم سے حضرت عیسیٰ نہ ہو سکا

اللہ رے روانیٔ چشم شب فراق
یوں تیز رو کبھی کوئی دریا نہ ہو سکا

اندھیر ہے کہ موت بھی معشوق بن گئی
ہر چند چاہا مات کو مرنا نہ ہو سکا

کس وقت بہر پرسش بیمار آئے وہ
جب آنکھ سے بھی اپنی اشارا نہ ہو سکا

شوخ

شہزادی جان اکبر آبادی

○

تمہارے گیسو و رُخ پر نثار ہم بھی ہیں
اسی خیال میں لیل و نہار ہم بھی ہیں

جو دیکھا جانب غیر اُس نے دل پکار اُٹھا
نگاہِ لطف کے اُمیدوار ہم بھی ہیں

مٹے ہیں آپ تو حورانِ خُلد پہ واعظ
بتانِ ہند پہ دل سے نثار ہم بھی ہیں

خود اپنے ہاتھ سے تعزیر آپ دیں ہم کو
خطا معاف ہو! تقصیر وار ہم بھی ہیں

تمہارے ساتھ ہمیں بھی ہے ایک نسبت خاص
جو آپ شوخ ہیں تو بے قرار ہم بھی ہیں

اختتامیه

محمد حسین آزاد

○

رنج نرگس کی جو ہوں یاد میں خوں بار آنکھیں
بھرے دامن کو کریں دامنِ گلزار آنکھیں

یہ غضب ہیں تری اے ترکِ جفا کار آنکھیں
دو ہی کر دیتی ہیں ہو جاتی ہیں جب چار آنکھیں

چشمِ کافر میں نشہ کے ہیں جو ڈورے ساقی
کیا بھلی لگتی ہیں پہنے ہوئے زنّار آنکھیں

کیا ہے اک جا پہ جم کیونکر رہیں دو بیمار
میرا بیمار ہے دل اُن کی ہیں بیمار آنکھیں

اپنے حسرت نہ بر آئی کبھی دل کی آزاد
ساتھ ہی لے کے چلیں حسرتِ دیدار آنکھیں

آسی غازی پوری

○

تابِ دیدار جو لائے مجھے وُہ دل دینا
مُنہ قیامت میں دکھا سکنے کے قابل دینا

ناتوانوں کے سہارے کو ہے یہ بھی کافی
دامنِ لطفِ غبارِ پسِ محمل دینا

ذوق میں صورتِ موج آ کے فنا ہو جاؤں
کوئی بوسہ تو بھلا اے لبِ ساحل دینا

ہائے رے ہائے تری عقدہ کُشائی کے مزے
تُو ہی کھولے جسے وہ عقدۂ مشکل دینا

ایک فتنہ ہے قیامت میں بہارِ فردوس
جُز ترے کچھ بھی نہ چاہے مجھے وُہ دل دینا

درد کا کوئی محل ہی نہیں جب دل کے سوا
مجھ کو ہر عضو کے بدلے ہمہ تن دل دینا

مرزا ہادی رُسوا

○

نالہ رُکتا ہے، تو سرگرمِ جفا ہوتا ہے
درد تھمتا ہے تو بے درد خفا ہوتا ہے

پھر نظر جھنپتی ہے، آنکھ جھکی جاتی ہے
دیکھیے دیکھیے پھر تیر خطا ہوتا ہے

عشق میں حسرتِ دل کا تو نکلنا کیسا؟
دم نکلنے میں بھی کم بخت مزا ہوتا ہے

حالِ دل اُن سے نہ کہنا تھا ہمیں چوک گئے
اب کوئی بات بنائیں بھی تو کیا ہوتا ہے

آہ میں کچھ بھی اثر ہو تو شرر بار کہوں
ورنہ شعلہ بھی حقیقت میں ہوا ہوتا ہے

ہجر میں نالہ و فریاد سے باز آ رُسوا
ایسی باتوں سے وُہ بے درد خفا ہوتا ہے

راسخ عظیم آبادی

○

مرا سینہ اسے محبت جو بنے تو باغ کرنا
یہ اسی لئے بنا ہے اسے داغ داغ کرنا

وہ کہاں ملیں جنھوں کو تری جستجو نے کھویا
کبھی گم شدوں کا اپنے نہ سراغ کرنا

مجھے رفتگی سی کچھ ہے تری چشم دیکھ ساقی
نہ شراب سے لبالب تو مرا ایاغ کرنا

غمِ دہر سے رہائی نہیں جیتے جی میسّر
نہ خیال وار ہی اسے دلِ بے فراغ کرنا

دو جہاں میں تم کو بس ہے یہی داغِ یار راسخ
شبِ گور کا بھی اپنی تم اسے چراغ کرنا

بے نظیر شاہ

○

جاب نیاز بھی جو نگاہ اہلِ نیاز میں
دیہے ہوا کوئی پس پردہ محسنِ مجاز میں

ی تمہ جو حسن میں تیرے جہاں میں کوئی میں نہیں
وزوں کی نگاہ ہو، وہی غم میں تنِ لغا یا نہیں

ھر، دیر ہوں طرب آشنائے نو مریں
تش میں خموشیاں ستمگر دل کے پیچ و راز میں

اس حرم ہے تجھے کیا پڑی ہے جو تو نے
ات ہر بھی ہے کسی کی سوز و گداز میں

، ددو وفا ملی، یہ ہ زرد دستِ دعا ملی
ھنے اٹھا لیے ہیں سے پھول کی اعجاز میں

ا ٹوٹی بھی لٹ گیا ہر متاعِ جاں، دہی بن گیا
ید ذرا سے ہے، وحشی شعبدہ باز میں

قاضی صادق اختر

○

جب پردہ رخ سے دور کریں وہ نقاب کا
جلوہ ہر ایک ذرہ میں ہو آفتاب کا

کل بن کے شیخ مجتہدِ عصر آگیا
دکھلا کے باغ سبز عذاب و ثواب کا

کہنے لگا ز راہ تبختر مجھے یہ طنز
معلوم ہوگا حشر میں پینا شراب کا

ہم نے کہا کہ یہ تو ہیں ہم خوب جانتے
پر کیا کریں کہ ہے ابھی عالم شباب کا

گستاخی ہو معاف تو اک عرض ہم کریں
کیجے جواب فہم کو نہ مورد عتاب کا

تقویٰ بجا ہے آئے جو جیب آپ کا درست
اور ہو یقین آپ کے ہی اجتناب کا

بے چھوڑے کنج باغ ہو ساقی ہو ماہ وش
اور دل اگر مخل نہ ہو کوئی باعث حجاب کا

گردن میں ہاتھ ڈال کے وہ شیخ بے حیا
دے دے اٹھا زباں کو دہن کے لعاب کا

سینے سے اپنا سینہ ملا کر وہ منہ سے منہ
یہ ریش جس پہ جو ہے سمک خضاب کا

منت سے یوں کہے کہ ہمارا لہو پیے
گر پی نہ جائیے جلد یہ پیالہ شراب کا

اس وقت ہم سلام کریں قبلہ آپ کا
گر کچھ بھی خوف کیجیے روز حساب کا

اختر بغیر تو یہ آپ کا غلام
قائل نہیں ہے قبلہ کسی شیخ و شاب کا

مائل دہلوی

مرزا تقی بیگ

○

بے خودی میں قدم غیر پہ سر رکھتے ہیں
شوق سا شوق ترے خستہ جگر رکھتے ہیں

آج کہتی ہے شبِ غم کی سیاہی کچھ تو
آج ہو جائیں ہوا راہی سحر رکھتے ہیں

تم نے دیکھے ہی نہیں درد محبت والے
دکھڑے ایسے ہیں کہ باتوں میں اثر رکھتے ہیں

ہم کو مرنے کا نہیں رنج خوشی ہے اس کی
آج ہم اپنی خوشی میں اثر رکھتے ہیں

کیا ہوا حضرتِ مائل نے جو دیکھا اس کو
اہلِ دل جتنے ہیں سب ذوقِ نظر رکھتے ہیں

بزم اکبر آبادی

○

مزے اب ان کی الفت میں وہ حاصل ہوتے جاتے ہیں
کہ اعضا جس قدر اپنے ہیں سب دل ہوتے جاتے ہیں

کبھی رہتے ہیں آنکھوں میں کبھی رہتے ہیں وہ دل میں
یہ دونوں گھر ہمارے عیش منزل ہوتے جاتے ہیں

مراد آئی تری اے دل کہ ہو یا تھا شہادت کا
سنا ہے وہ ستم کرنے کے قابل ہوتے جاتے ہیں

مرے غم خوار ہمدم ہو کے دم بھرنے لگے اب تو
بڑھے غبار اب تو حسرتِ دل ہوتے جاتے ہیں

عجب کچھ بزم اب تو صاحبانِ فن کی حالت ہے
کہ منہ کی کھاتے جاتے ہیں مقابل ہوتے جاتے ہیں

سورج نرائن مہر

○

ہمارے حال کی جا کر انہیں خبر تو کریں
وہ کیوں نہ آئیں گے تدبیر چارہ گر تو کریں

لیے گئے غرض بھی کچھ چین لے ذرا اے دل
وہ انجمن میں ہماری طرف نظر تو کریں

بہت سے تشنۂ دیدار روز جا بیٹھیں
کبھی تو وہ سرِ رہگذر گذر تو کریں

جلا دے شمع کی مانند تو مجھے اے عشق
کہ اور لوگ فنا تجھ سے الحذر تو کریں

ہم ان سے ذکر نہیں کرتے بزمِ اعدا کا
کہ ذکر وہ ہے یہ منظور ہو جو شر تو کریں

نہ تجھ سے جذبۂ دل یہ بھی ہو سکا افسوس
کہ قبر پر وہ ایک دن گذر تو کریں

ثاقب کانپوری

○

اس عشق کا انجام میں کچھ سوچ رہا ہوں
ہاں اے ہوسِ خام! میں کچھ سوچ رہا ہوں

خالی ہوئے سب جام، نہیں کوئی بھی میکش
اے دُردِ تہِ جام! میں کچھ سوچ رہا ہوں

جی بھر کے تجھے آج میں دیکھوں کہ نہ دیکھوں
اے حُسنِ لبِ بام! میں کچھ سوچ رہا ہوں

اپنے دلِ بیتاب سے میں خود ہوں پریشاں
کیا دوں انہیں الزام میں کچھ سوچ رہا ہوں

تارے سے چمکتے تھے تاریک فضا میں
ہاتھوں میں لئے جام، میں کچھ سوچ رہا ہوں

امجد حیدرآبادی

کام کب حسبِ مدعا نہ ہوا
اس کے فضل و کرم سے کیا نہ ہوا

ڈھونڈتا ہوں میں ہر نفس اس کو
مجھ سے جو اک نفس جدا نہ ہوا

کیا ملا وحدت وجودی سے
بندہ بندہ رہا خدا نہ ہوا

بندگی میں یہ کبریائی ہے
عمر گذری کہ میں خدا نہ ہوا

پاک ہستی سے میری نسبت ہے
میں برا ہو کے بھی برا نہ ہوا

غیر کی کیا شکایت اے امجد
آہ! جب میرا دل، مرا نہ ہوا

جگر بریلوی

دل اکیلا رہ کے اُجڑ گیا مجھے میہماں کی تلاش ہے
گل و لالہ کی تمنا ہے ہوس ہمیں باغباں کی تلاش ہے

کوئی اور ہوں گے جو بھولے ہوں ہمیں عہدِ رفتہ ہے یاد بھی
ہمیں ہے بہار کی آرزو ہمیں گلستاں کی تلاش ہے

سرِ راہ چھوڑ کے چل دیا نہ پھر اس طرف کبھی رُخ کیا
ہمیں غیر جس نے سمجھ لیا اسی کارواں کی تلاش ہے

پر و بال پہلے درست کر تو تپش بھی دل کی مدد کرے
تجھے عندلیبِ شکستہ پر، عبث آشیاں کی تلاش ہے

ہے عجب جگر کا غمِ نہاں نہ ہے عیب حسن میں عیاں رواں
کبھی دلستاں سے ہے بے غرض کبھی دلستاں کی تلاش ہے

قمر بدایونی

○

...ہ جو کہے گا کہے کہہ چُکا
...قول اس کا قائم بھی رہ چُکا

بہت سی شے اور ظاہر نہ ہو
...راز اور مخفی سہے رہ چُکا

...و کہتا ہے مجھ سے بیاں نامہ بر
...ئی ان سے جا کے کہہ چُکا

...اس چشمِ حیراں میں آنسو کہاں
...بہ دیا کہاں تک بہے بہہ چُکا

...نے گا وہ کیا حالِ دل غور سے
...امید ہی پہ کہے کہہ چُکا

...ینوں کی بے باکیاں دیکھ کر
...مسکن میں سب رہ چُکا

...میں نقاہت سے دم ہی نہیں
...جواب کہاں تک گئے کہہ چکا

امید امیٹھوی

○

آئینہ ہے اگرچہ سکندر لیے ہوئے
شیشہ اس سے کوئی چیز ہوں بہتر لیے ہوئے

کہتا ہے ان سے دردِ محبت کی داستاں
دل کے عوض جو بیٹھے ہیں پتھر لیے ہوئے

وہ چیز ہے کچھ اور جو ہوتی ہے جانستاں
قاتل وہی نہیں کہ ہو خنجر لیے ہوئے

واعظ یہ خوبیاں تھیں جامِ طہور کی
محراب جھک پڑے نہ کہیں در لیے ہوئے

بس جانیے کہ غم سے زمانہ خراب ہے
جب دیکھیے مجھے ہے وہ ساغر لیے ہوئے

اک وہ کہ جد و جہد سے قسمت بدل گئی
اک ہم کہ رو رہے ہیں مقدر لیے ہوئے

افسانے میں بھی رحمتِ حق کے سنا کیا
اک گوشہ میں الگ سے وہ ساغر لیے ہوئے

جلتا تھا اس نظر سے نظارا کہ کوئی مہ جبیں
دل تک اتر گئی مرے نشتر لیے ہوئے

امید پھر بھی مجھ سے زمانہ خلاف ہے
تیغ و علم لیے ہوں نہ لشکر لیے ہوئے

بنواری لال شعلہ

○

ہے عشق میں ابرو کے جو کاہیدہ تن اپنا
سایہ تری تلوار کا ہوگا کفن اپنا

اس منہ کی کریں بات ذرا منہ کو تو بنوائیں
غنچوں سے کہو صاف تو کرلیں دہن اپنا

پھولے جھمے کرتی ہیں پریاں مرا ماتم
اندر کا اکھاڑا ہے یہ بیت الحزن اپنا

کیا کہتے ہیں سن سن کے مرے شعر کو شعلہ
اعدا کے لئے تیغ ہے گویا سخن اپنا

وحشی شاہجہانپوری

○

اس وعدہ کا مطلب کیا سمجھوں آسان بھی ہے دشوار بھی
ابرو پہ ہے بل ہونٹوں پہ ہنسی انکار بھی ہے اقرار بھی

ہے دور تو ہے پروا زدہی، نزدیک ہے تو امانہ
ظالم تری چتون ناز بھری کیا تیر بھی ہے تلوار بھی

دینار و درم کچھ پاس نہیں ہاں اجر وفا کی دولت
افزائے جہاں میں دل میرا نادار بھی ہے زردار بھی

جس طرح ہو اک زندانی غم آزاد محدود زندانی
اس دامِ گرِ ہستی میں بشر مجبور بھی ہے مختار بھی

دنیا کو ہے بانا ایک نے گمراہ اور ایک نے ماہ راہ
کہتے ہیں جسے مرنا وحشی آسان بھی ہے دشوار بھی

برق دہلوی

○

...شن حجابِ رخِ پرنور نہیں
...گر ہو نگہِ شوق تو کچھ دور نہیں

...ب رقت نظر آتے نہیں آثارِ حرم
...مت ہے شیخِ حرم پہ بھی نور نہیں

...بتہ فطرت نہ کُھلا ہے نہ کُھلے
...س سعی میں مصروف جو مشکور نہیں

...ب نیرنگیٔ نظارہ ہے خود اپنی نظر
...ن وحدت ہے کوئی ناظر و منظور نہیں

...ئے نہیں گو منزلِ مقصد کا نشاں
...ن سا دل یہی کہتا ہے کہ کچھ دور نہیں

کیفی چڑیا کوٹی

○

ہوئی تھیں پست جس دم ہمتیں جوشِ اسیراں کی
ستم دیکھو کہ اونچی ہو گئی دیوارِ زنداں کی

خدارا مطرب لذت نوا تو اس کو چھیڑے جا
ترے نغمے سے اب ملنے لگی جنبش رگِ جاں کی

مزا آیا ہے ان کو چھیڑنے کا صحنِ گلشن میں
اُڑا جب رنگِ رخ رنگت نکھر آئی گلستاں کی

عدم کہتے ہیں جس کو صورتِ خوابِ پریشاں ہے
یہ ہستی کچھ نہیں تعبیر ہے خوابِ پریشاں کی

بہارِ دل کشا کھولے گی بلبل نغمہ خواں ہوگی
کلی کے ہر ورق میں داستانیں ہیں گلستاں کی

میں بیٹھا ہوں جہاں تھک کے سمجھ میں آگیا کیفی
مری درماندگی سے اصل وسعت بیاباں کی

اقبال احمد سہیل

عرشِ بریں بھی اس کے مقابل نہیں رہا
جس دل کو تو نے دیکھ لیا دل نہیں رہا

درسِ جنونِ عشق کو کچھ ظرف چاہیے
دیوانہ کیا بنے گا جو عاقل نہیں رہا

چشمِ کرم کی شوخیِ طرزِ ستم نہ پوچھ
غم بھی بقدرِ حوصلۂ دل نہیں رہا

گم تھی فضائے حسن میں کل کائناتِ حسن
اٹھا غبارِ قیس تو محمل نہیں رہا

اب بھی دلِ حزیں سے تغافل شعاریاں
اب یہ تری نظر ہے مرا دل نہیں رہا

جب سے جمالِ عشق ہے پیشِ نظر سہیل
میں آب و رنگِ حسن کا قائل نہیں رہا

اکبر حیدری

جہانِ حسن میں موجِ ترنم ہے وفا میری
میں نغمہ ہوں محبت کا محبت ہے وف
دلِ مضطر کو جس پر اعتبارِ حکمرانی تھا
مرے احساسِ خودداری میں ہے وہ التجا
امینِ دورِ مستقبل ہیں میری خاک کے ذرے
حقیقت میں بقا کا پیش خیمہ ہے فن
مشیت کی نگاہوں میں جو بیا پرستش تھی
ہوئی ہے جذبِ اشکِ خوں فشاں میں وہ
جہانِ قدس تک روحِ تخیل سیر کر آئی
مری پرواز کتنی ہے کہاں تک ہے فضا
اک آنسو اور وہ بھی دل کی رنگینی سے بیگانہ
نہ دیکھی جائیگی دنیا سے تصویرِ وف
نیاز و ناز کا افسانہ لکھنے کے لیے اکبر
سنی ہے کاتبِ قسمت نے برسوں التجا میری

مانی جائسی

نہ رہی وہ کشش تیغ ادا میرے بعد
جذب کر بیٹھا ہے قاتل کا صلا میرے بعد

کیوں نہ بے رنگ ہو صحرائے بلا میرے بعد
کون کانٹوں پہ چلا برہنہ پا میرے بعد

کشتنی میں تھا سو مقتل میں تہ تیغ ہوا
اب ہو منتظر اہل وفا میرے بعد

صبح آخر ہوئی بے صبح شب ہجراں تھی مگر
شمع و پروانہ میں بھی ربط نہ تھا میرے بعد

نعش پہ پرسش محشر تھی مری بے گنہی
نظر آیا مرے قاتل کو نہ میرے بعد

رواںؔ

(جگت موہن لال)

جل دیوانہ ہوں کوئی نہیں ہے قدر داں میرا
تو ہی دیکھ لے مرے خلاق حسن رائیگاں میرا

ہوا اس کو اڑا لے جائے یا اب پھونک دے بجلی
حفاظت کر نہیں سکتا ہوں جب آشیاں میرا

یہ کہہ کر روح نکلی ہے تن عاشق سے فرقت میں
مجھے عجلت ہے بڑھ جائے نہ آگے کارواں میرا

غم سہتے ہیں دنیا کی رحمت مسکراتی ہے
کسی سے پوچھتے ہیں اہل بینش جب نشاں میرا

مرے بعد اور پھر کوئی نظر مجھ سا نہیں آتا
بہت دن تک کریں گے سوگ اہل خانداں میرا

رواںؔ سچ ہے محبت کا اثر ضائع نہیں ہوتا
وہ روتے ہیں اب بھی ذکر آتا ہے جہاں میرا

اطہر ہاپوڑی

وہ حُسنِ حیرت افزا اک نظر دیکھا نہیں جاتا
جدھر وہ جلوہ فرما ہیں اُدھر دیکھا نہیں جاتا

نظر سوزی غضب ہے اُس کے حُسنِ روز افزوں میں
بہت دیکھا ہے اس کو اب مگر دیکھا نہیں جاتا

نگاہیں جذب ہو جاتی ہیں اُس کے حُسنِ دلکش میں
کسی جانب پھر اس کو دیکھ کر دیکھا نہیں جاتا

کلیم اللہ کہتے ہیں اُس کے حُسن کا جلوہ
وہ خود دکھلائے تو بھی اک نظر دیکھا نہیں جاتا

مرے ذوقِ نظر کی داد یوں دیتے ہیں وہ مجھکو
کہ اب دنیا میں یہ ذوقِ نظر دیکھا نہیں جاتا

یہ سب سوز و گدازِ شمع سے ہے گرمیٔ محفل
کوئی پروانہ ہنگامِ سحر دیکھا نہیں جاتا

مرے غمخوار اطہر اٹھ گئے یہ کہہ کے بالیں سے
کہ بیتابی کا عالم رات بھر دیکھا نہیں جاتا

بیتاب عظیم آبادی

نہ میرے دل نے نہ ادراک نکتہ جُو نے کیا
خدا گواہ ہے جو کچھ کیا وہ تُو نے کیا
فریفتہ مجھے عالم کے رنگ و بُو نے کیا
بڑا ستم ترے ملنے کی آرزو نے کیا
کہیں کے رہتے نہ آوارگانِ دشتِ جفا
بڑا کرم کششِ زلفِ مُشکبو نے کیا
بہار آئی تو کیا ناشگفتہ خاطر کو
فسُردہ اَور بھی اس وہمِ نُمو نے کیا
تمہاری چارہ گری کو سلام ہے میرا
کہ ایک زخم کو سو زخم اک رفو نے کیا
وہ کیونکر آکے نہ خود یہ حال مجھ سے پوچھیں
برآرِ مقصدِ دل ترکِ آرزو نے کیا
جز اپنے دل کے نہ پایا کسی نے حق کا نشاں
ہزار حق کو آوارہ جستجو نے کیا
بڑی امید بندھی ہے بسوں کو محشر کی
عجب کرشمہ ترے طرزِ گفتگو نے کیا
کہوں گا یار سے میں صاف صاف حشر کے دن
کہ مجھ سے جبر میں جو کچھ ہوا وہ تُو نے کیا
بچا رہے نہ مرے عقل و ہوش اے بیتاب
غضب کا مست مجھے پہلے ہی سبو نے کیا

سید اختر علی تلہری

○

…چمن میں کھلائے گلستاں میں نہیں
…سے مذاق کے جلوے کہیں جہاں میں نہیں

…ے تھک سے قدم اٹھ رہے ہیں جادے پر
وہ ذوقِ منزلِ محبوب کارواں میں نہیں

…یثِ گردشِ دوراں سے دل کشادہ مگر
فغاں کا ذکر کہیں میری داستاں میں نہیں

…ا تو ہے شریعت پناہ اے واعظ
مگر حلاوتِ ایماں ترے بیاں میں نہیں

…ان صداؤں لبِ غنچہ سے چھیڑ کے قصے
ہوس کا باب محبت کی داستاں میں نہیں

…پرستشِ رسم و رواج بے ایماں
تو پھر گناہ کوئی سجدۂ بتاں میں نہیں

بنا زمیں کو اپنا، زمیں کی مخلوق
تری نجات مہ و مہر و کہکشاں میں نہیں

حیرت بدایونی

○

رکھتے ہو خیال اور ہی دیتے ہو بیاں اور
کیا بات ہے واللہ کہ دل اور زباں اور

طوفاں سے اگر جان بچا لی دل و جاں نے
لے آئیں گے بازار سے جا کر دل و جاں اور

ہم ماضیٔ بے روح کا ماتم نہیں کرتے
بلوائیے اہر سے کوئی مرثیہ خواں اور

ہے پیرِ خرابات کا ہونا ہی اگر فرض
ہم خود ہی بنا لیں گے کوئی پیرِ مغاں اور

ہم پیر ہیں اور پختگیٔ عمر میں حیرت

نشتر جالندھری

فضا ہے رقصاں کھلے ہیں تارے کبھی ہمارا کہا بھی مانو
ابھی چلے آؤ گھر ہمارے کبھی ہمارا کہا بھی مانو

ادھر تو آؤ کہ سازِ دل پر ترانۂ مہر و وفا کا چھیڑیں
اسی تمنا میں دن گزارے کبھی ہمارا کہا بھی مانو

کسی نے میلی نظر سے دیکھا تمہیں تو غیرت سے کٹ مرے ہم
لگے اُبلنے لہو کے دھارے کبھی ہمارا کہا بھی مانو

تمہاری خاطر لپکتے شعلوں کو ہم نے بڑھ کر گلے لگایا
گل ان کو جانا جو تھے شرارے کبھی ہمارا کہا بھی مانو

تمہارے کہنے پہ زلف و قامت سمجھ کے دار و رسن کو تھاما
میدانِ خوں میں ہم سدھارے۔ کبھی ہمارا کہا بھی مانو

یہ کس کی تربت ہے آہ نشتر کہ اب تلک آواز آ رہی ہے
ہمیں تو ہیں بے رخی کے مارے کبھی ہمارا کہا بھی مانو

نجم آفندی

ہستی کوئی ایسی بھی ہے انساں کے سوا اور
مذہب کا خدا اور ہے مطلب کا خدا اور

پھر ٹھہر گیا قافلۂ درد سنا ہے
شاید کوئی رستے میں مری طرح گرا اور

اک ضربۂ آخر کی کمی رہ گئی آخر
جتنی وہ پلاتے گئے آنکھوں نے کہا اور

منبر سے بہت فصل ہے میدانِ عمل کا
تقریر کے مرد اور ہیں مردانِ وغا اور

منہ گو کرکے میں پچھتایا ہوں کیا کیا
جب ختم ہوئی بات کہیں اُس نے کہا اور

کیا زیرِ لب اے دوست ہے اظہارِ جبار
حق ہو کہ وہ ناحق ہو زمانے تو بڑھا اور

دولت کا تو پہلے ہی گنہگار تھا منعم
دولت کی محبت نے گنہگار کیا اور

یہ وہم سا ہوتا ہے مجھے دیکھ کے ان کو
سیرت کا خدا اور ہے صورت کا خدا اور

مجنوں گورکھپوری

…وہائیں فلک والے شورش سے نہ بیگانہ
…اہد کو تڑپا دے اے نعرۂ مستانہ

…ہ اور بھی جلوے ہیں کچھ اور نظارے ہیں
…ے تیرا خدا حافظ اے جلوۂ جانانہ

…بخانے کی حرمت کا کچھ پاس بھی ہے لازم
…نوشی میں قرینے سے اے لغزش مستانہ

…زادی کی دھن میں ہیں شہرے ہیں ترقی کے
…مرقوم ہے پیشانی پر وضع غلامانہ

…ے عقل و خرد والو مجنوں کا گلہ کیسا
…دیوانے کو کیا کہیے دیوانہ ہے دیوانہ

میکش اکبر آبادی

…ات اس محفل کا عالم کیا کہوں
بات افسانہ تھی خاموشی فسوں

تجربے اپنی زندگی کے ماجرے
ٹھہر ہمدم سانس لے لوں تو کہوں

ہم نے لالے کی طرح اس دور میں
آنکھ کھولی تھی کہ دیکھا دل کا خوں

آپ کی میری کہانی ایک ہے
مجھ سے اب میں کیا سناؤں کیا سنوں

آپ کا انجان پن بھی ایک فن
اور میری عقل و دانش بھی جنوں

دیکھنا ہے تیرا یہ عالم مجھے
چاہے بہہ نکلے مری آنکھوں سے خوں

ہے زمانہ اپنے غم میں مبتلا
کس سے میکش جا کے اپنا غم کہوں

بہزاد لکھنوی

○

عشق تیری راہ میں کیا وجود کیا عدم
دل جھکا نفس نفس سر جھکا قدم قدم

مقصدِ حیات ہے مرکزِ حیات ہے
روئے یار نسخ پیچ زلفِ یار خم بہ خم

آہ دل بلند ہو اے خلش دوچند ہو
پھر سکون دے چلا اضطراب دم بدم

کچھ خرد سے کام لے کچھ جنوں سے کام لے
آ رہی ہیں منزلیں راہ میں قدم قدم

میں عجیب . نہ تھا ہوش سے نہ بچ سکا
بے خودی میں بھی رہا امتیازِ بیش و کم

جلیل قدوائی

○

سرِ جنونِ محبت تو کوئی راز نہیں
تمہی پاس مگر چشمِ امتیاز نہیں

کچھ اور دن اسے رکھ آتشِ محبت پہ
کہ تیرے شیشۂ دل میں ابھی گداز نہیں

سمجھ سکے تو سمجھ میری وجہِ خاموشی
بیانِ رازِ حقیقت میں ہے یہ راز نہیں

کرم کہوں اسے قدرت کا یا ستم کہوں
کہ دل دیا ہے مگر کوئی دل نواز نہیں

علاجِ خاص ہے تیری مرا یہ ذوقِ جنوں
علاوہ اس کے مجھ کو جنوں پہ ناز نہیں

کوئی کسی سے یہ کہہ دے کہ میرا عشق جلیل
بلند ساز ہے لیکن زمانہ ساز نہیں

اثرؔ صہبائی

○

گو سکوں کی جستجو بھی عمر بھر ہوتی رہی
دل کی دنیا منتشر ہی منتشر ہوتی رہی

ہر نفس کی بندگی ذکرِ خدا کے ساتھ ساتھ
ہر زمانے میں بہ اندازِ دگر ہوتی رہی

بارہا اٹھتی رہیں ناکامیوں کی آندھیاں
آتشِ شوق و محبت تیز تر ہوتی رہی

تجھ سے مل کر پھر تو برہم ہو گیا دل کا سکوں
منزلِ کون و مکاں زیر و زبر ہوتی رہی

یہ عجب عالم رہا ہے دورِ الفت میں اثرؔ
صبح ہر اک با شبِ کیف اثر ہوتی رہی

امینؔ حزیں

○

درد سینے میں نہاں رہ کے اثر رکھتا ہے
ہمنشیں تجھ سے بیاں حسن کی بیداد نہ کر

پھونک دے نغمۂ جاں سوز سے سامانِ قفس
بلبلِ نغمہ سرا شکوۂ صیاد نہ کر

لطف جینے کا ہے جب ہی کہ ہو دل مستِ خودی
آسماں تجھ سے یہ کہہ دے مری امداد نہ کر

یاس میں چھوڑ کے مر مرتے ہیں کم ظرف امیںؔ
ظرف عالی ہے ترا جیت فریاد نہ کر

عبدالمجید بھٹی

○

لٹے گئے چمن، وہ نہاں ہوں کہ عیاں اور
آنکھوں میں نہ آئے گا نیا کوئی سماں اور

گلشن میں ہم رہ کے بھی ہیں اجنبی دونوں
پھولوں کی زباں اور ہے کانٹوں کی زباں اور

یہ ترکِ نگاہی بھی ہے اندازِ محبت
کیوں اپنی جفا پر انہیں ہوتا ہے گماں اور

مغرور خداوندو! ڈرو صدق و صفا سے
وہ وقت بھی آتا ہے کہ کھلتی ہے کماں اور

یارب ہے وفادار طلب اُن کی جفا سے
دے اور نہ دل ان کو نہ دے ہم کو زباں اور

وامق جونپوری

○

زباں تک جو نہ آئے وہ محبت اور ہوتی ہے
فسانہ اور ہوتا ہے، حقیقت اور ہوتی ہے

نہیں ملتے تو اک ادنیٰ شکایت ہے نہ ملنے
مگر مل کر نہ ملنے کی شکایت اور ہوتی

یہ مانا شیشۂ دل رونقِ بازارِ اُلفت ہے
مگر جب ٹوٹ جاتا ہے تو قیمت اور ہوتی

نگاہیں تاڑ لیتی ہیں محبت کی اداؤں
چھپانے سے زمانے بھر میں شہرت اور ہوتی

یہ مانا حسن کی فطرت بہت نازک ہے اے و
مزاجِ عشق کی لیکن نزاکت اور ہوتی

ن ۔ م ۔ راشد

[illegible]پائے جاں پہ ملا کر میں اڑوں پھر بہ جنوں
[illegible]ن سے بچنے کہیں نظر آئے پھر سحر جنوں

[illegible]تو میں گرہ کشا نہ خرد ہوئی نہ جنوں ہوا
[illegible]سے رہیں سدا نہ پئے خرد نہ سوئے جنوں

[illegible]یہیں ہی دشت و تیرے محل نہ دل کے رہیں راہبر
[illegible]نہ وہی جستجو وہی راہ پہ خطرِ جنوں

[illegible]پھر ان کے سرود شب روز میرے غبار راہ
[illegible]سود و نفع کا ولولے بیچا بال و پر جنوں

[illegible]لئے کا ہوش تھا کوئی جوش تھا نہ خروش تھا
[illegible]پ ان کی نگاہ تھی سپر راہ پہ دو در جنوں

[illegible]یشے کا وہاں ہیں گل کے آج وہاں دو اب
[illegible]یا تھا است میں کہیں لیک تو در جنوں

[illegible]ر ستارہ میں تو تم نہ تھا سلسلے سے بکھرے
[illegible]ب نہ وہ سنگ سے بے کمال نقش گر جنوں

[illegible]مبتلا تو تو جب سے ملے اس وفا بہ لب
[illegible]نا میں نہ دشت سے نگار خود نگر جنوں

[illegible]ب شب بنا ہو سود و لت سے بہا
[illegible]

جمیلؔ مظہری

جب خاک ہی ہونا تھا مجھ کو تو خاکِ رہِ صحرا ہوتا
اک کوششِ پیہم تو ہوتی اٹھتا ہوتا گرتا ہوتا

موتی بننے سے کیا حاصل جب اپنی حقیقت ہی کھو دی
قطرے کیلئے بہتر تھا یہی قلزم بنتا دریا ہوتا

ہستی سے جدائی سے قائم جب وصل ہوا تو کچھ بھی نہیں
دریا سے اگر ہوتا نہ جدا قطرہ کیونکر قطرہ ہوتا

ق

اے شعلہ کہ بہت قفس نے فطرت کی پہنائی زنجیریں
جو زنجیریں خود پہنی ہیں اے کاش انہیں توڑا ہوتا

تعمیم فنا آزادی کی جب قطعیت خود آزاد نہیں
آزاد اگر ہوتی فطرت تو اس کا نتیجہ کیا ہوتا!

پابند نہ ہوتی گر یہ زمیں سورج سے نکل کر مل جاتی
پابند نہ گر ہوتیں موجیں ساحل کی جگہ دریا ہوتا

پابند نہ چلتے گر تارے تو آپس میں ٹکرا جاتے
سارا یہ طلسمِ ارض و سما اک پل میں ٹوٹ گیا ہوتا

پابند نہ ہوتی گر یہ ہوا چلتی اک ایسی تیز آندھی
ذرات میں اک ہلچل ہوتی شیرازۂ گل بکھرا ہوتا

گر یوں ہی محدود ہے یہ فلسفۂ اخلاق یہی
اے کاش حقیقت کو تو نے زنجیروں کی سمجھا ہوتا

آزادی مطلق سے ہوتا جو سکوں آزادی میں
زنجیروں کا خدشہ انساں نے خود شوق سے کیوں پہنا ہوتا

ہر بات جمیلؔ نادر کی ہے مدبر تھا تعمیمِ عمل!
خاموش سہی خوددار سہی تم نے تو کبھی چھیڑا ہوتا

جاں نثار اختر

○

ہر سمت افق پہ ہیں دُھندلکے
پیمانۂ صبح جلد چھلکے

آغاز نوائے شوق جیسے
چھیڑے کوئی ساز ہلکے ہلکے

کچھ بھید کھلے مری نظر سے
کچھ راز تری ہنسی سے جھلکے

موتی تو نہ بن سکیں گے آنسو
دامن پہ ترے اگر نہ ڈھلکے

وہ رنگ رہا نہ روشنی میں
اس سے تو حسین تھے دھندلکے

یہ شعبدۂ مہر و ماہ کب تک
گیتی سے کہو کہ آپ چمکے

اس شیشۂ آرزو سے اختر
کیا جانئے کتنے رنگ چھلکے

علی سردار جعفری

○

سکوں میسر جو ہو تو کیونکر، ہجوم رنج و محن وہی ہے
بدل گئے ہیں اگرچہ قاتل، نظام دار و رسن وہی ہے

لبوں پہ مہریں لگی ہوئی ہیں زباں پہ تالے پڑے ہوئے ہیں
وہی ہیں آداب محفل اب بھی طریقۂ انجمن وہی ہے

ابھی تو خاشاک کیلئے ہے ہزار طوفان کی ضرورت
اٹھی تھی جو پیچ و تاب کھاتی یہ موج گنگ و جمن وہی ہے

بلند محلوں کے بام و گنبد پہ جھوٹی کرنوں کو ناچنے دو
جو کالی کٹیاؤں کو اجالا عطا کرے گی کرن وہی ہے

کوئی یہ ایوان حکمرانی میں جا کے میری طرف سے کہہ دے
زبان چھینی ہے تم نے جس کی یہ شاعر فسوں زن وہی ہے

مخمور جالندھری

○

...ن کے نگار خانے یہی ہیں ان کے محل رفیقو
...میوں سے اپنے دل کی جلن سے ہیں کسک رہے ہیں

...ں ہو چلے ہے ہم ابتدا سے پہچانتے ہیں ان کو
...ب ذرا سی اک چھیڑ ہی سے پردے سرک رہے ہیں

...ر ن کے بند کھولے پکارتی ہے یہیں ہے سب کچھ
...ر جاؤ کر خلد و کوثر بھی طلسمِ فلک رہے ہیں

...شرق سے ساغرِ آفتاب مخمور تم تک آیا
...ر کیسے کیسے حالات شام سے صبح تک سہے ہیں

ڈاکٹر مسعود حسن

○

ابھی چمن میں کوئی فتنہ کار باقی ہے
بہار باقی ہے نہ حسنِ بہار باقی ہے

یہ انتظار کی گھڑیاں کنارِ جوئے چشم
امید ڈوب چکی، اعتبار باقی ہے

عجب نہیں ہے کہ شبنم سے روت ہو جائے
گلوں کی تشنہ لبی بے شمار باقی ہے

رفو کی بات پہ وہ شوخ ہنس کے یوں بولا
ابھی تو جیب و گریباں میں تار باقی ہے

مری بہار کی آسودگی میں اے مسعود!
سنا ہے تو ہی خلشِ بے قرار باقی ہے

عظیم قریشی

○

رنگ کہاں ہے سایا سا ہے
نقش کہاں ہے دھوکا سا ہے

صبح کی رنگت زردی مائل!
شام نہیں ہے دھڑکا سا ہے

سیلِ عشق تھا کب ہوگا
دریا ہے اور چڑھتا سا ہے

حسن و عشق بنے دو کافر
دونوں میں اک جھگڑا سا ہے

دل نے بدلا روپ ہو شاید
دور پرے جو کہرا سا ہے

آؤ پیار سے دھوئیں اس کو
نقش جہاں کچھ میلا سا ہے

آج عظیم کو شاداں دیکھا
شاعر ہے یہ کانٹا سا ہے

حامد عزیز مدنی

○

ہزار وقت کے پرتو نقطہ میں ہونے
ہم ایک حلقۂ وحشت اثر میں ہوتے

کھلا یہ دل پہ کہ تعمیرِ بام و در سے قری
بکھرے قالب دیوار و در میں ہونے

وہی ہیں آج بھی اس جسمِ نازنیں پہ
جو شاخِ گل میں، جو موجِ گہر میں ہوتے

طلسمِ خواب زلیخا و دامِ بردہ فروش
ہزار طرح کے قصّے سفر میں ہونے

گذر رہا ہے تو آنکھیں چرا کے یوں
غلط بیاں بھی بہت رہگذر میں ہوتے

سرشتِ گل ہی میں پنہاں ہیں سارے نقش
ہنر یہی تو کفِ کوزہ گر میں ہونے

شورؔ علیگ

مرے دل کی دھڑکن اس کے تبسم پر گراں کیوں ہو
میں افسانہ ہوں اُس کا وہ مرا افسانہ خواں کیوں ہو

مجھے کام آ گئی آخر مری کاشانہ بردوشی
لپکتی بجلیوں کی زد پہ میرا آشیاں کیوں ہو

کناروں سے گذر جانا ہی طوفانوں کی فطرت ہے
جہاں دُنیا ٹھہر جائے قدم میرا وہاں کیوں ہو

مرا سجدہ بھی جب تیرا ہی پردہ ہوتا جاتا ہے
تو پھر میری نگاہوں پر نگاہوں کا گماں کیوں ہو

نہ میں وارفتۂ مطرب، نہ میں خانزادۂ ساقی
اگر محفل سے اُٹھ جاؤں تو محفل بدگماں کیوں ہو

میں تنہا عالم میں ہوں اپنی جگہ اے شورؔ تنہا ہوں
بنا ہو جس کی منزل وہ رہینِ کارواں کیوں ہو

صدقؔ جائسی

کیا کرے چشمِ غلط انداز بے تقصیر ہے
اے شہِ خوباں کہاں بھاری ہے ہلکا تیر ہے

میرا منہ چھوٹا بڑی باتوں میں کیونکر دخل دوں
سامنے تصویرِ یوسف کے تری تصویر ہے

میں بھی دل رکھتا ہوں کیا مجھ کو نہیں شوقِ حرم
خاکِ بت خانے کی لیکن پاؤں کی زنجیر ہے

آنکھ کے اندر نگاہِ ناز ہے کتنی غریب
آنکھ سے باہر یہی چلتی ہوئی شمشیر ہے

صدقؔ سچ پوچھو تو پوچھا حسن ہی کی ہے بجا
لب کشائی میں خدا کا خوف دامن گیر ہے

خمار بارہ بنکوی

ہجر کی شب غمگین فضائیں اُف رے محبت ہائے جوانی
جینے کے دن مرنے کی دعائیں اُف رے محبت ہائے جوانی

وعدہ کی شب جاں بخش فضائیں دل میں خلش وہ آئیں نہ آئیں
در پہ نگاہیں لب پہ دعائیں اُف رے محبت ہائے جوانی

مہکی ہوئی گلشن کی فضائیں بہکی ہوئی ساون کی گھٹائیں
ہاتھ میں ساغر سر پہ گھٹائیں اُف رے محبت ہائے جوانی

رخصتِ جاناں ایک قیامت اس پہ قیامت مجھ سے اجازت
آنکھ میں آنسو لب پہ دعائیں اُف رے محبت ہائے جوانی

ہم تھے خمار اور پہلوئے جاناں پھر بھی تھی جیسے گردشِ دوراں
کاش وہ دن اب یاد نہ آئیں اُف رے محبت ہائے جوانی

نشور واحدی

نظر نظر کو سراپا حیات کہتے آئے ہیں
ان انکھڑیوں کو میکدوں کی رات کہتے آئے ہیں

فریبِ شوق کو تجلیات کہتے آئے ہیں
بکھر گئے تو گیسوؤں کو رات کہتے آئے ہیں

اسی کو زندگی کا ساز دے کے مطمئن ہوں میں
وہ حسن جس کو حسنِ بے ثبات کہتے آئے ہیں

یہ منصبانِ عشق بھی عجب ادا پرست ہیں
وہ مسکرا دئے تو التفات کہتے آئے ہیں

ہنسی بجا نہیں تری یہ وعظِ ترکِ عشق پر
یہ پیغمبری تو حوصلے کی بات کہتے آئے ہیں

حیات تا ممات ایک سلسلہ ہے عشق کا
کہاں ہیں وہ جو مرگ کو نجات کہتے آئے ہیں

یہ زود رس تو زندگی کو زندگی نہ کہہ سکے
جوانیوں میں موت کو حیات کہتے آئے ہیں

وہ ظرف ہے جسے نہ زہر کی نظر بجھا سکی
ہم اس کو شیشۂ تجلیات کہتے آئے ہیں

غزل ہے نام حسن کے معاملاتِ خاص کا
خطا ہوئی کہ دلبروں کی بات کہتے آئے ہیں

یکرنگ

(مصطفےٰ قلی خاں)

لب شیریں سے تلخ کاموں کو
بولنا تلخ کام ہے تیرا

ہاتھ اٹھا جور اور جفا سے تو
یہی گویا سلام ہے تیرا

اگر آوے مرے گھر وہ پیارا
کروں اس ماہ کو پتلی کا تارا

مرا دشمن ہوا یکرنگ وہ شوخ
کیا کیوں عشق میں نے آشکارا

نہ کہو یہ کہ یار جاتا ہے
میرا صبر و قرار جاتا ہے

گر خبر لینی ہو تو لے صیاد
ہاتھ سے یہ شکار جاتا ہے

کلیم

محمد حسین

ہر تار پیچ زُلف کا، عالم کی جان ہے
گویا یہ اژدہا تھا کہ سب کو نگل گیا

نقاب اپنے رُخ کا جو تو باز کرتا
تو گُل اپنی خوبی پہ کیا ناز کرتا

لگتی ہے اب تو قلقل مینا سے دل کو ٹھیس
وے دن گئے کلیم کہ یہ شیشہ سنگ تھا

قبر میں بھی لئے ہمراہ گیا اپنے کلیم
آہ کیوں دردِ دل اپنا نہ کسی کو سونپا

پیری کی بھی سیر کر گئے ہم
اس پل سے بھی بس گذر گئے ہم
واں خستہ ہوئے رقیب پُرغم
یاں اس ادب کے مر گئے ہم

محسن

محمد محسن

○

دل مرا وابستۂ ہر تارِ زلفِ یار ہے
ہے تو دیوانہ پر اپنے کام میں ہشیار ہے

اور یہ عاجز تمہارا کچھ نہیں رکھتا مگر
جان بر لب آمدہ حاضر ہے گر درکار ہے

کیا جانئے وہ شوخ کدھر ہے کدھر نہیں
پھر کو تو تن بدن کی بھی اپنے خبر نہیں

جس دن تری گلی سے میں عزمِ سفر کیا
ہر یک قدم پہ راہ میں پتھر جگر کیا

محسن مروں نہ میں تو بھلا جی کے کیا کروں
اک دل بساط میں تھا سو میں وہ بھی کھو چکا

ممتاز

حافظ فضلو

○

ہزار مرتبہ دیکھا ستم جدائی کا
ہنوز حوصلہ باقی ہے آشنائی کا

ڈروں میں کس لئے رنجش سے، پیار میں کیا تھا
میں اب خزاں کو جو روؤں، بہار میں کیا تھا

جانے یار نے کس طرح کر دیا مایوس
اور ان کی خاطرِ امیدوار میں کیا تھا

ترے ہی واسطے آئے عدم سے ہم یاں تک
وگرنہ ہستیٔ ناپائیدار میں کیا تھا

کیونکہ سرسبز ہو شاہی و گدائی کی ہوس
رہ گئی آہ مرے دل میں خدائی کی ہوس

بال و پر توڑ کے جب تو نے قفس کو سونپا
وہیں آخر ہوئی صیاد رہائی کی ہوس

گرنہ کبھی شاید کہ وہ بے باک چمن میں
آ آئے نظر جائے گا جاک جیب ہر

مجذوب

مرزا غلام حیدر

○

..وت سے تمہاری کچھ اگر ہووے تو میں جانوں
..تم زہر دے دیکھو اثر ہووے تو میں جانوں

..مارا ہم سے جو عہدِ وفا ہے اس کو تم جانو
..بیان کچھ نوعِ دگر ہووے تو میں جانوں

..دیشہ کرو پیارے کہ شب ہے وصل کی تھوڑی
..زلف کو کھولو سحر ہووے تو میں جانوں

..آوے بھی مسیحا مری بالیں پہ تو کیا ہو
..بیمار یہ ایسا تو نہیں جس کو شفا ہو

مجذوب تمہے عجز و تکبر سے ہوں نالاں
بند.. کبھی ہو بیٹھتے ہو، گاہ خدا ہو

ماہر

فخرالدین خان

○

چشم اس سے ترحم کی نہ رکھ رو رو کے ماہرؔ
کب پہنچے ہے وہ دیدۂ خوں بار کسو کا

جو اسکے در پہ بیٹھے ہیں، سمجھتے ہیں وہ در کس کا
ہوئے جو اس کے آوارہ وہ کہتے ہیں کہ گھر کس کا

میں تو مانوں ترا سخن ناصح
پر نہیں دل پہ اختیار اپنا

مدت ہوئی کہ دل کی مجھ تک خبر نہ پہنچی
ملتا نہیں نشاں کچھ اس بے نشاں سے مجھکو

تو تو کب اعتبار مانے ہے
جس پہ گذرے ہے سو ہی جانے ہے

کوئی نہ بھلا کام ہوا عمر میں ہم سے
... مرشد کا ... ...

غضنفر

غضنفر علی خاں

○

جاتے ہیں وہاں سے گر کہیں ہم
پھر پھر کے پھر آئے ہیں وہیں ہم

صد حیف کہ کنجِ بے کسی میں
کوئی نہیں اور ہیں ہمیں ہم

خاموشی کی مُہر ہے دہن پر
ہیں حلقۂ غم میں جُوں نگیں ہم

آیا نہ وُہ شوخ اور گئے آہ!
حسرت ہی بھرے تہِ زمیں ہم

تکتے رہے جانبِ دراے دلِ
مُڑ مُڑ کے بوقتِ واپسیں ہم

قسمت میں تو ہجر ہے غضنفر
اب وُہ ہے تو آپ میں نہیں ہم

نصرت

○

بن ترے آئے پریشاں ہیں سبھی سامانِ عیش
ے کہیں، مطرب کہیں، ساقی کہیں، ساغر کہیں

کاروانِ عشق سے بچھڑا ہیں اب جاؤں کدھر
گم صدائے زنگ ہے اور چل بسے رہبر کہیں

جس کو غمِ عشق گُل رخاں ہو
کب اس کو ہوائے بوستاں ہو

وہ دوست جو مہرباں ہو کیا غم
گو دشمنِ جاں مرا جہاں ہو

طبیبوں نے جو دیکھا نبض کو میری تو یہ بولے
یہ جاوے گا تمہارے جی کے ساتھ آزار دیکھو گے

نہ دوگے شربتِ دیدار گر بیمار کو اپنے
تو جی دے گا تمہارا طالبِ دیدار دیکھو گے

سحر

شیخ امان علی

○

آسماں کو غبار ہے ہم سے
ایک دن خاک میں ملا دے گا

اس کے دینے گئے ہیں ہزاروں ہاتھ
وہی دیتا ہے کوئی کیا دے گا

مے کدے سے اُٹھا ہے ابرِ بہار
میرے دل کی لگی بجھا دے گا

اپنے مٹنے کا غم نہیں ہم کو
جو بگاڑے گا وہ بنا دے گا

ترے کوچے میں بیٹھے تھے کہ بس مر کے اُٹھیں گے
اب لاش پڑی ہے وہیں، مُردا نہیں اُٹھتا

چشم سے گُلوں نے اُنہیں نادم کیا
محتسب دوڑے شرابی جان کر

تعشق

سید مرزا

○

باغ میں پھولوں کو روند آئی سواری آپ کی
کس قدر ممنون ہے بادِ بہاری آپ کی

بے وفائی آپ کی غفلت شعاری آپ کی
میرے دل نے ماہ میں سیکھی ہیں ساری آپ کی

میکدے میں ٹوٹے جاتے ہیں ہم لڑ لڑ کے جام
عشوہ پرداز ہے چشمِ خماری آپ کی

آج کس پر رحم آیا کس پہ روتے ہیں حضور
ہے نصیبِ دشمناں آواز بھاری آپ کی

عدم سے دہر میں آنا کسے گوارا تھا
کشاں کشاں مجھے لائی ہے آرزو تیری

ملا پیام صبا میرے گُل سے کہہ دینا
چلی گئی مجھے بے ہوش کر کے بُو تیری

تمام رات رہا دل سے ذکرِ خیر ترا
گلہ کیا ہو تو شاہد ہے آرزو تیری

ذکی

[illegible] علی

قاصد کے ہوش [illegible] جاتا تھا
کہتا تھا کچھ زبانی اور خط میں کچھ لکھا تھا

شکل حباب کیا کیا آنکھوں سے رنگ دیکھے
کیا چشم تر کا ساغر جام جہاں نما تھا

اک بات پر تمہارے سو جی سے ہم تصدّق
کچھ بات اب نہ پوچھو کیا جانئے وہ کیا تھا

آئی صبح رنگ پہ سُرخی شراب کی
مہتاب پر سفیدہ کھنچی آفتاب کی

جوہر تو مجھ میں تھے ملکوتی صفات کے
انساں بنا کے کیوں مری مٹی خراب کی

کس زندگی پہ کیجئے سامانِ بزمِ عیش
مہمان چار دن ہیں بہاریں شباب کی

قبول

مرزا مہدی علی خاں

یہ عشق ایسا نہیں جس کی حرارت دُور ہو دل سے
رہیں گے زندہ جب تک ہم نہ اُترے گا بخار اپنا

غرورِ حُسن سے پھر کر نظر کرتا نہیں ظالم
پریشاں توسنِ جاناں کے پیچھے ہے غبار اپنا

ملے سب دوست دشمن اپنے بوئے اُنس سے خالی
نہ گُل اپنا ہُوا گلزارِ عالم میں نہ خار اپنا

خزاں ہمیشہ ہے جامے سے گُل نہ باہر ہو
اگر بہار کی دو دن ہوا ہُوئی تو کیا

نہ کچھ جواب ملے گا، نہ تُو پھرے گی اِدھر
جو تجھ سے نامہ بری اے صبا ہوئی تو کیا

لحد میں جان سے ملنے کو جسم تڑپے گا
جو رُوح قیدِ بدن سے رہا ہُوئی تو کیا

جسم ہلکا جو ہُوا رُوح نے قُوت پائی
عشق میں ترکِ غذا سے مری طاقت نہ گئی

سحر

(رامپور) نواب علی خاں

○

دل ترے زلفِ مسلسل کا گرفتار ہُوا
سلسلہ مل گیا زنجیر سے سودائی کا

شانہ و آئینہ اب ہاتھ سے چُھٹتا ہی نہیں
خود نمائی سے بڑھا شوق خود آرائی کا

حشر کرتا ہے یہ کہنا آپ کا بالائے بام
لو ہوا نیزے پہ سُورج آشکارا ہوگیا

ہائے ناکامی تب آیا ساقیٔ پیماں شکن
جب ہماری عُمر کا لبریز ساغر ہوگیا

قفس میں نالوں سے مطلب ہے یہ اسیروں کا
بہار میں نہ چھٹے ساتھ ہم صفیروں کا

بہار ہے ترے کُوچے کی اس قدر دلکش
کہ پاؤں اٹھ نہیں سکتا ہے راہ گیروں کا

آباد

مرزا مہدی حسن خاں

○

زمیں کو آسماں تیرے تصوّر نے بنایا ہے
بلا ہے مرتبہ دل کو ہمارے عرشِ اعظم کا

اسی حسرت میں آنکھوں سے انہیں ہر دم بہاتا ہوں
کوئی تو لختِ دل میرا نگیں ہو تیرے خاتم کا

جا کے ہو آتا ہے ہر دم بارگہ پیکِ خیال
میں نہیں محتاج اب بہرِ خبر جاسوس کا

اب چُھپانے سے ہمارے عیب چُھپنے کے نہیں
ہر جگہ سے چاک پردہ ہوگیا ناموس کا

تیس دن میں ایک دن دیکھا نہ روئے رشکِ ماہ
میں نے مُنہ اس چاند میں دیکھا تھا کس منحوس کا

آتا ہے جی میں چیر کے پہلو کو ایک شان
دکھلا دُوں اُس کو حال دلِ بے قرار کا

دل میں کبھی نہ گردِ کدُورت کو راہ دے
اس آئینہ میں کام نہیں ہے غبار کا

ماہ

مرزا عنایت علی بیگ

○

برباد میری خاک نہ کر کوئے یار سے
اس سرزمیں سے مجھ کو نہ اے آسماں اُٹھا

کس روز رو برو مرے آئے وہ بے نقاب
آنکھوں کے سامنے سے یہ پردہ کہاں اُٹھا

کیا سُوجھی ہم کو مشقِ تصوّر سے دُور کی
آنکھوں کے آگے پھر گئی صورت حضور کی

تم سے پری کی شکل ہے اچھی نہ حُور کی
دل دے رہا ہے مجھ کو خبر دُور دُور کی

اچھا ہُوا حرم سے نکالے گئے صنم
صورت یہی تھی شانِ خُدا کے ظہور کی

تم سا حسیں زمانہ میں اب دوسرا نہیں
اصنام ہیں سب بشر کے تو صورت ہے حُور کی

حاصل ہُوا ہے خواب میں مجھ کو وصالِ یار
یُوسف کو ڈھونڈتا ہوں میں تعبیر کے لئے

خلیل

دوست علی

○

تھی کس کو صنم آپ کے آنے کی توقع
آنا مرے گھر میں ہے خدا ساز تمہارا

یاں داغ ہے واں آپ کا آئینہ مصفا
دل سوز یہ میرا ہے وہ دمساز تمہارا

مرتا ہوں خبر لو مری اے رشکِ مسیحا
کیا حشر کو کام آئے گا اعجاز تمہارا

دیکھیں نہ تجھے صبح و مسا ہم سے نہ ہوگا
یہ اے بُتِ کافر بہ خدا ہم سے نہ ہوگا

ترجیح عبث دیتے ہو فرہاد کو ہم پر
سر پھوڑ کے مر جائیں یہ کیا ہم سے نہ ہوگا

مُجرم ہیں گنہگار ہیں شرمندہ ہیں دل میں
مُنہ اس کی طرف وقتِ دُعا ہم سے نہ ہوگا

تعریفِ بُتاں کیجئے کیا حد سے زیادہ
کہہ دیجئے بندے کو خدا ہم سے نہ ہوگا!

منتہی

مرزا مہتاب بیگ

○

اشک کو تاثیر دی اچھا کیا
قطرۂ ناچیز کو دریا کیا

شربتِ وصلت پلایا یار نے
ہجر کے بیمار کو اچھا کیا

دستلی دکھلاؤں گا فردِ جبیں
حشر میں پوچھا جو مجھ سے کیا کیا

تاثیرِ عشق گبر و مسلماں پہ کر گیا
ساقی شرابِ ناب سے دو جام بھر گیا

اچھا ہوا شباب کا عالم گذر گیا
اک جن چڑھا ہوا تھا جو سر سے اتر گیا

اس کا بندِ نقاب وا تو نہیں
درِ باغِ ارم کھلا تو نہیں

سر بھی حاضر ہے جانِ عاشق بھی
اور صاحب کا ادعا تو نہیں

اعظم

مرزا اعظم علی

○

ساقی نے دیا جام سے بے خبری کا
اب ہوش ہے شیشے کا نہ شیشے کی پری کا

ہر ظلم رسیدہ ہے ترے جور سے راضی
شکوہ نہیں کرتا کوئی بیدادگری کا

لیلیٰ کو کھولنے دو ذرا گیسوئے دراز
مجنوں کے بند بند میں زنجیر دیکھنا

آنکھوں کی آرزو پہ ذرا کیجئے نگاہ
یہ چاہتی ہیں آپ کی تصویر دیکھنا

کوئی محمل میں نہیں ہے، پسِ پردہ ہم ہیں
برملا قیس کو دعویٰ ہے کہ لیلےٰ ہم ہیں

اس لئے چپ ہیں کہ کوئی نہیں سننے والا
ورنہ کہنے کو سراپا لبِ گویا ہم ہیں

سوانگ لاتے ہیں نئے رنگ بدلتے ہیں نئے
یہ طلسمی ہے جہاں اس میں تماشا ہم ہیں

شرف

سید سادات حسین

ٹپک ٹپک کے کہیں گل بنا، کہیں لالہ
چمن میں رنگ نہ لایا مرا لہو کیسا کیا

زباں جو اُن کی شرف نشے میں بہکتی ہے
مزے مزے کی وہ کرتے ہیں گفتگو کیا کیا

قریبِ مرگ ہوں للہ آئینہ رکھ دو
گلے سے میرے لپٹ جاؤ پھر بکھر لینا

دعا کو ہاتھ میں اس شرط سے اُٹھاتا ہوں
کروں جو عرض تو اس کو قبول کر لینا

جنوں نے میرا داغِ جگر سر پہ رکھ لیا
یہ گل وہ ہے جو طرۂ دستار ہی رہا

تو رہ گیا فقط ترے سودائی رہ گئے
یوسف رہے نہ مصر کا بازار ہی رہا

زلف اُلجھے گی تو شانہ سے سلجھ جائے گی
دل جب اُلجھے گا تو کوئی نہیں سلجھانے کا

اسد

نواب سلیمان خاں

کچھ بھی نہ تھے، سب کچھ ہوئے، پھر کچھ بھی نہ
آغاز وہ ہے، اور یہ انجام ہے

مجھ کو قضۂ تہ شمشیر اجل نے نہ دیا
دو گھڑی دل مرے قاتل کا بہلنے نہ دیا

ہم کو سمجھاتے ہیں یہ ہمدم کیا
دل ہی بس میں نہیں کریں غم کیا

دل اپنا تم کو دے کے مفت ہم بھی بن گئے بت
کہو، جو کچھ کہو تو آئے تمھارے دین و ایماں پ

دل گبر و مومن میں تیری جگہ ہے
صنم ہے کسی کا، خدا ہے کسی کا

یہ معشوقانِ بے پروا جہاں میں کس کے ہوتے ہیں
انہیں دل دے کے عاشق آپ اپنی جان کھوتے ہیں

برسوں سجدے کئے کعبہ میں تمہاری خاطر
مدتوں دیر میں جا جا کے جبیں سائی کی

واسطی

سید فضل رسول خاں سندیلوی

مائل ہے زیست وصل ہو اس جانِ جاں سے کیا
پردہ بغیر مرگ اُٹھے درمیاں سے کیا

آزاد مثلِ سرو ہیں باغِ جہاں میں ہم
نفع و ضرر ہے ہم کو بہار و خزاں سے کیا

پچھتا رہا ہوں کرکے کبوتر کو نامہ بر
نامہ تو لے چلا ہے کہیگا زباں سے کیا

ایسا خیالِ یار نے بے ہوش کر دیا
پھر اپنی یاد ہے نہ مجھے اب کسی کی یاد

کاٹی تمام عمر غمِ ہجرِ یار میں
مرنے کے بعد خاک کروں زندگی کی یاد

رُسوا کیا، خراب کیا، دربدر کیا
یادش بخیر کیا کروں دل کی بدی کی یاد

ادا حق بندگی کا بھی کسی سے ہو نہیں سکتا
بڑے نافہم ہیں کرتے ہیں جو دعویٰ خدائی کا

جوشؔ

نواب احمد حسن خان

سچ کہتے ہیں کہ نام محبت کا ہے بُرا
اُلفت جتا کے دوست کو دشمن بنا لیا

دامنِ حضرتِ یُوسف کے اُڑائے پُرزے
پاسِ عصمت تجھے اس وقت زلیخا نہ ہوا

حسرتیں مُردہ دلوں کی کبھی زندہ نہ ہوئیں
نام رکھا ہے عبث تم نے مسیحا اپنا

خضر گم کردہ راہ ہیں اے جوشؔ
چاہیے راستہ بتا دینا

مجھ جاں بلب کے پاس سے جاتے ہو گھر کہاں
پھر تم کہاں، یہ عاشقِ خستہ جگر کہاں

کہتے ہو کیا حضور کہ آئیں گے وقتِ صبح
اس شب کو خاتمہ ہے ہمارا، سحر کہاں

ان آنکھوں کی بدولت دل پہ آفت آ ہی جاتی ہے
نظر کوئی نہ کوئی اچھی صورت آ ہی جاتی ہے

جنوں

نواب سراج الدولہ سراج جنگ علی محمد خاں

○

مدعا تھا مرض عشق دوا کیا کرتا
التجا کر کے طبیبوں سے بھلا کیا کرتا

زندگی ہجر میں تھی موت سے بدتر میری
اپنے جینے کی خدا سے میں دعا کیا کرتا

چند دن ہی کے فقط فرض ادا کرنا تھا
تیرا بیمار ہو کرتا نہ قضا کیا کرتا

○

نہیں زیبا شکایت کیا کریں ہم خوش جمالوں کی
بجا ہوتی ہیں سب خصلتیں ان بے مثالوں کی

گرایا دیدۂ معصوم سے ہم کو چشم گریاں نے
دکھائی شوخی رخسار نے صورت ملالوں کی

○

وہاں تک فلک پر تو نہیں ملتا رسائی کا
ہمارا قصد ہے در سے قسمت آزمائی کا

جہاں میں یار پر شہرہ ہے کس کی بیوفائی کا
ستم دل دے کے کیوں الزام لوں ساری خدائی کا

ہوش

نواب نیاز احمد خاں

○

باغباں تو دشمن بلبل ہے اے غیرت چمن
تو بڑھا کر ہاتھ گلچیں کا گریباں گیر ہو

تب ہو لطف قید جب ڈالو گلے میں اے صنم
طوق گردن میں بنا ہو ہاتھ میں زنجیر ہو

زیست میں کیا پوچھتے ہو ہم سے حال ہجر کو
خواب سے پہلے بیاں کیا خواب کی تعبیر ہو

○

ابھی تو عالم وحشت میں چاک کر دیتا
جو میرے ہاتھ میں دامان آرزو ہوتا

بجا ہے شیخ کو ہم راز دار تب سمجھا
کہ لب پہ ذکر بتاں اور دل میں تو ہوتا

○

قطرۂ اشک ہوں دکھلائیے مجھ کو جلوہ
قہر طوفاں نہیں ہوں جو میں چلا جاؤں گا

گرم کیوں ہوتے ہو محفل میں مجھے دیکھ کے تم
شمع ساں خود ہی سحر تک میں جل جاؤں گا

ریحاں

دیا کرشن

○

نت ہے تیغِ تیز پہ غنچہ پہ ابتسام
ال میں کشتہ ہوں تری ترچھی نگاہ کا

عقدہ کھلتا ہی نہیں تقدیر کا
گھس گیا ناخن مری تدبیر کا

نوکِ مژگاں کی خطا اس میں نہیں
خود بنا عاشق نشانہ تیر کا

تیرے لب کو نبات کہتے ہیں
ہم بھی کیا میٹھی بات کہتے ہیں

خواہ ثابت ہوں خواہ سیارے
سب کو ہم بے ثبات کہتے ہیں

ہ رنجیدہ کہتا ہے نہ بولوں یار سے لیکن
ب آنکھیں چار ہوتی ہیں مروت آ ہی جاتی ہے
بت سے نہیں چھپتا ہے ریحاں نشۂ الفت
آنکھوں میں کچھ اس مے کی رنگت آ ہی جاتی ہے

مخمور

محمد جعفر لکھنوی

○

ترے چمن کی روش باغباں نہیں معلوم
اسیر تازہ ہوں طرزِ فغاں نہیں معلوم

کیا ہے شرمِ محبت نے ایسا پوشیدہ
کہ مجھ کو بھی مرا رازِ نہاں نہیں معلوم

یاروں سے میں گو جدا رہا ہوں
پر دل سے تو آشنا رہا ہوں

گلشن اک مدرسہ ہے میرا
بلبل کو سبق پڑھا رہا ہوں میں

غم ہو تو امید رکھ خوشی کی
رونا بھی دلیل ہے ہنسی کی

ہر ایک نفس کی آمد و شد
دیتی ہے خبر روا روی کی

عیشیؔ

طالب علی خاں لکھنوی

جلا دے طور او سوزِ نہانی
اٹھائے کون نازِ لن ترانی

کہاں ہم اور کہاں یہ نکہتِ گل
نسیمِ صبح تیری مہربانی

شرابِ صاف کا دے جام ساقی
مکدر ہے زلالِ زندگانی

نہ پیری میں ستا اے منعِ عشق
اٹھائی تھی ترے صدمے جوانی

کیا خاکِ درِ میخانہ مجھ کو
جزاک اللہ دورِ آسمانی

شبِ غم میں موا جل جل کے عیشیؔ
سنائے شمعِ محفل کی زبانی

غافلؔ

منور خاں

اب کے سجادہ نشیں قیس ہوا میرے بعد
نہ رہی دشت میں خالی مری جا میرے بعد

دوستی کا بھی تجھے پاس نہ آیا ہے ہے
تو نے دشمن سے کیا میرا گلا میرے بعد

گرم بازاریٔ الفت ہے مجھی سے ورنہ
کوئی لینے کا نہیں نام وفا میرے بعد

منہ پہ لے دامنِ گل روئیں گے مرغانِ چمن
باغ میں خاک اڑائے گی صبا میرے بعد

تیز رکھنا سرِ ہر خار کو اے دشتِ جنوں
شاید آ جائے کوئی آبلہ پا میرے بعد

مسرور کاکوروی

شیخ میر بخش

○

دن وصل کے، رنج شب غم بھول گئے ہیں
یہ خوش ہیں کہ اپنے تئیں ہم بھول گئے ہیں

جس دن سے گئے اپنی خبر تک نہیں بھیجی
شاید ہمیں یارانِ عدم بھول گئے ہیں

راحت و رنج اب ہے مساوات ہمیں کو
آپ ہی کچھ طرزِ ستم بھول گئے ہیں

کچھ ہوش ٹھکانے ہوں تو لیں نام کسی کا
ہم ہوے کے کہیں دل کی رقم بھول گئے ہیں

تو مجھ سے دشمنی بھی فلک اس قدر نہ کر
کس نے کہا ہے ہجر کی شب کو سحر نہ کر

مرنے کو زندگی تو سمجھ دردِ عشق میں
مسرور اپنی جان کا ہرگز خطر نہ کر

اختر

محمد صادق خان

○

عجب ڈھب کی یہ تعمیرِ خراب آباد ہستی ہے
کہ پستی یاں بلندی ہے، بلندی یاں کی پستی ہے

تردد کیوں تمہیں اے ساکنانِ ملکِ ہستی ہے
عدم کی راہ سیدھی ہے بلندی ہے نہ پستی ہے

وصال اس کا عوض مرنے کے گر ٹھہرے غنیمت ہے
متاعِ وصلِ جاناں، جان دینے پر بھی سستی ہے

حصولِ جاہ کی تدبیر جو ہم لوگ کرتے ہیں
ہماری سعی باطل دیکھ کر تقدیر ہنستی ہے

سمجھ ہر ایک کو ہشیار ہم آئے تھے یاں اختر
بچشمِ غور جو دیکھا تو متوالوں کی بستی ہے

صاحب و شفیق

پچھمی نرائن

شمع یہ پھاند جل کر راکھ ہو
عاشقی کا نام روشن کر گیا

بہار آئی جنوں نے سر اٹھایا ہے خدا حافظ
نسیم صبح نے دل کو ستایا ہے خدا حافظ

مرا دل پہلے ہی تک آشنا تھا
تری آنکھیں پھرانے کے تصدق

میں اپنے دردِ دل کہنے کے صدقے
ترے سن سن کے چپ رہنے کے صدقے

مست کوئی روشن کرے تربت پہ مجنوں کی چراغ
صبح جل جاوے گی دیوانے کی پروانے کے ساتھ

کیا ہوا ہے کس طرح کا ابر ہے
جس کو دل چاہے نہ ہو کیا جبر ہے

جوشش

شیخ محمد روشن

نہ پھولتے ہیں شگوفے نہ غنچے کھلتے ہیں
چمن میں شور پڑا کس کے مسکرانے کا

قیس پھرتا جو رہا دشت میں دیوانہ تھا
اس کو لیلے ہی کے دھیانے پہ رہا تھا

کل بزم میں سب پہ نگہِ لطف و کرم تھی
اک میری طرف تو نے ستمگار نہ دیکھا
جز چشمِ بتاں میکدۂ دہر میں جوشش
ہم نے تو کسی مست کو ہشیار نہ دیکھا

نگاہِ لطف سے دیکھا یہی غنیمت ہے
سلام اس نے ہمارا لیا لیا نہ لیا

بیتاب

منشو کم ملے

ر رہے باغِ جہاں میں کبھو آرام سے ہم
پھنس گئے قیدِ قفس میں جو چھٹے دام سے ہم

اپنے مذہب میں ہے اک شرطِ طریقِ اخلاص
پر غرض کفر سے رکھتے ہیں نہ اسلام سے ہم

ی بھی کچھ ہوتی نہیں کیا ہم نشیں ہیں
ہاں یوں ہمیں دکھ دیں ہم ان کو اس طرح چاہیں

ت سے انتظار میں اپنی کٹی ہے یاں
اب تک جو ہم نہ آئے الٰہی کہاں رہے

عشق میں کا ہے وصل کی گنجائش ہے
نت نیا یاں عجب اندیشہ ہے

خدا کسی کو گرفتارِ زلف کا نہ کرے
نصیب میں کسی کا [illegible] نہ کرے

گرفتار

نگی بیگ

ساقی یہ غنیمت ہے جو دم جام کے گذرے
اس عالمِ فانی میں بھروسا نہیں دم کا

جستجو دنیا میں مت کر اے گرفتار اس قدر
کیا بھروسا ہے جہاں میں عمرِ بے بنیاد کا

خانہ خراب عشق کا ہو اور کیا کہوں
خوابِ عدم سے سوتوں کو ناحق جگا دیا

لطف سے تیرے تو کچھ اور نہیں پر ہم کو
ناتوانی سے ہے ہر ایک قدم پہ منزل

شکایت ترے جور کی کیا کریں ہم
خدا جو دکھاتا ہے ہم دیکھتے ہیں

جگر جل گیا آتشِ غم سے اپنا
تعجب ہے آنکھوں کو نم دیکھتے ہیں

حسن

خواجہ حسن

○

یہی سوزشِ عشق ہے تو الٰہی
اس آغاز کا کیونکر انجام ہوگا

رہی بے قراری اسیروں کی یوں ہی
تو صیاد! ٹکڑے ترا دام ہوگا

سوئے ہم تو پر بے قراری وہی ہے
خدا جانے کب دل کو آرام ہوگا!

اگر تیغ سے جان بخشی کو آئے
تو اس میں تمہارا بڑا نام ہوگا

کیا قتل اور جان بخشی بھی کی
حسن اس نے احساں دوبارہ کیا

امنڈ کے آنکھ سے اک بار بہ چلے آنسو
ہنسی ہنسی میں جو ذکرِ وداعِ یار ہوا

وہ جب بنک کر زلفیں سنوارا کیا
کھڑا اس پہ میں جان وارا کیا

خاموشی

شاہ معین الدین

○

شکلِ انساں میں خدا تھا مجھے معلوم نہ تھا
حق سے ناحق میں جدا تھا مجھے معلوم نہ تھا

ایک مدت حرم و دیر کو ڈھونڈا ناحق
یہ ہر بت میں چھپا تھا، مجھے معلوم نہ تھا

ہو کے خاموش عجب سیر و تماشا دیکھا
رنگ بے رنگ ہوا تھا، مجھے معلوم نہ تھا

کفر کافر کو بھلا شیخ کو اسلام بھلا
عاشقاں آپ بھلے اپنا دل آرام بھلا

آشیاں اپنا گلستاں سے اٹھالے بلبل
باغ کو چھوڑ دے، جنگل کی ہوا لے بلبل

پیچھے کرتی ہے کیا؟ اس سے نہیں کچھ حاصل
شکلِ پروانہ پر و بال جلا لے بلبل

چڑھا ہے سولی پہ خاموش ہو کے جب منصور
سوائے حق نظر آئی نہ دار آنکھوں میں

فیض

میر شمس الدین

○

حرم میں، دیر میں جب کوئی روبرو آیا
مجھے یقین ہوا بس یہی کہ تو آیا

اڑائیں جیب کی لاکھوں ہی دھجیاں میں نے
مگر نہ قبضے میں دامنِ آرزو آیا

کسی کا کوئی بھی ممنوں نہیں ہے کر انصاف
ادھر سے میں نکل آیا ادھر سے تو آیا

خطِ جادہ ہوں یا میں نقشِ پا ہوں
غرض، افتادگاں کا رونما ہوں

عبث رکھتے ہیں مجھ پر تہمتِ مرگ
بہت راتوں جگا تھا، سو رہا ہوں

نہ کر! اس چشم کا پھر مجھ کو بیمار
ابھی اے فیض مر مر کے جیا ہوں

نہیں فرق کچھ دیر میں اور حرم میں
جو بت چاہتے ہیں خدا چاہتا ہے

راقم

بندرابن

○

نامہ کا میرے اس سے لے کر جواب پھرنا
پر واسطے خدا کے قاصد! شتاب پھرنا

اک وے بھی دن تھے یارب! جو تھا ہمیں میسر
گلشن میں ساتھ اس کے پیتے شراب پھرنا

کہے کیا دردِ دل بلبل گلوں سے
اڑا دیتے ہیں اس کی بات ہنس کر

جو چاہے گوہرِ مقصود اے دل
صدف کی طرح تو پاسِ نفس کر

مژگاں سے دل بچے تو ٹکڑے کرے ہے ابرو
یہ کہہ کے میں نے اس سے جب دل کی داد چاہی

کہنے لگا کہ ترکش جس وقت ہووے خالی
تلوار پھر نہ کھینچے تو کیا کرے سپاہی

وفاؔ

نول رائے

○

عارض پہ تمہارے یہ پسینا
ہیرے کا ہے، لعل پر نگینا

اس غم میں بھی گر رہا سلامت
پتھر سے بھی سخت ہے یہ سینا

اُس کو منظور یاں سے جانا تھا
گریہ میرا فقط بہانا تھا

دل نہ کرتا تھا اس طرح سے خراب
عاقبت وہ ترا ٹھکانا تھا

کل دل کو لیا، مگر گئے مُکر آج
بس! آپ کا اعتبار دیکھا

نیچی ہے اک نگاہ پہ دل کے تئیں وفاؔ
لینا ہو گر تمہیں تو کچھ اتنا گراں نہیں

لطفؔ

مرزا علی

○

چمن کو گل جو تری بے کسی کا دھیان رہا
ہر ایک پات کے کھڑکے پہ گل کا کان رہا

جو عمرِ خضر ہو شاید تو وصل ہو نصیب
یہ زندگی جو تھی اس میں تو امتحان رہا

میں کیا ہوں باختہ رنگ اس شعلہ رُو کے آگے
مہتاب کے بھی مُنہ پہ چھٹتی ہوائیاں ہیں

طاقت حباب ساں، اک نظارہ کی ملی ہے
ان فرصتوں پہ ظالم یہ خود نمائیاں ہیں

اے لطفؔ! اس غزل پر کہنا بقولِ سوداؔ
یہ عاشقی نہیں ہے زور آزمائیاں ہیں

وہ خود فروش آ گیا بارے چمن میں کل
بوئے خودی نکل گئی گل کے دماغ سے

ہووے فضائے ہستیِ موہوم کا بُرا
کنجِ عدم میں کاٹتے تھے کس فراغ سے!

مائل

میر محمدی

○

آتا میں مر کے دل سے تمھے دُور ہوگیا
اک دن بھی آکے تُو نہ سرِ گور ہوگیا

نالے کو ہم نے ضبط کیا نا سما تو کیا
منہ سے تو زرد رنگ چھپایا نہ جائے گا

اشک کی طرح گرا جب تو پھر اُٹھنا معلوم
میں وُہ اُفتادہ نہیں ہُوں کہ سنبھل جاؤں گا

سب یار ہیں تمہارے اغیار ہیں تو ہم ہیں
آنکھوں میں یاں سبھوں کے اک خار ہیں تو ہم ہیں

چنگا بھلا ہے تُو تو، پیارے! تری بلا سے
آزار ہے تو ہم کو، بیمار ہیں تو ہم ہیں

کیا تعجب نہیں گر مر گیا مائل تیرا
یار کیا لگتا ہے انسان کے مرجانے کو

عشق

رکن الدین

○

اس کی لذت کو دل سمجھتا ہے
اس کو مَیں کیا کہوں کہ کیا دیکھا

دشت! تجھ کو قسم ہے مجنوں کی
عشق سا کوئی برہنہ پا دیکھا

اپنی آنکھوں سے دیکھ اے خوش چشم
مُجھ سے کیا پُوچھتا ہے کیسا دیکھا

اس کے دامن تلک نہ پہنچے ہم
خاک میں آپ کو ملا دیکھا!

بات کہنے کی نہیں طاقت، شکایت کیا کروں
عشق رخصت دے تو شورِ حشر اب برپا کروں

باتیں نہ سُن تُو میری جل جائے گا دوانے
مَیں برقِ آسماں ہُوں یا عشق کی زباں ہُوں

شاعر

میر تقی

بھول کر بھی ادھر نگاہ نہ کی
کہہ بھلا اس میں کیا ضرر ہوتا

دیوانہ ہے جنوں سے کہیں مر نہ جائے دل
نامِ بہار روبرو اس کے نہ لو عبث

رونے میں دم کے رکنے کی گو ہے یہی طرح
تو جوشِ غم سے ہم نہیں بچتے کسی طرح

یاں تک تو عزیز تھا ترا غم
لے گور میں بھی اسے گئے ہم

کیوں نہ ہووے بہار آنکھوں میں
ہے مرا گلعذار آنکھوں میں

کیا کیا اثر دیے ہیں بتوں کی نگاہ کو
یارب عطا ہو کچھ تو ہماری بھی آہ کو

جوہر

مادھو رام

کیا یاد کر کے روؤں کہ کیسا شباب تھا
کچھ بھی نہ تھا، ہوا تھی، کہانی تھی، خواب تھا

اب عطر بھی ملو تو تکلف کی بو کہاں
وہ دن ہوا ہوئے کہ پسینہ گلاب تھا

محمل نشیں جب آپ تھے لیلیٰ کے روپ میں
مجنوں کے بھیس میں کوئی خانہ خراب تھا

پیری میں ایک ہی سے ہمیشہ رہیں گے دن
وہ اور تھا زمانہ جسے انقلاب تھا

تیرا قصور وار خدا کا گناہگار
جو کچھ کہ تھا یہی دلِ خانہ خراب تھا

ذرہ سمجھ کے یوں نہ ملا مجھ کو خاک میں
اے آسمان، میں بھی کبھی آفتاب تھا

جوہر

منشی جواہر سنگھ

○

صنم بھی اس کے مظہر ہیں کروں سجدہ نہ کیوں حق پر
نظر آتا ہے جو کچھ ہے نمونہ اس کی قدرت کا

ٹھہرا وصال وعدۂ فردائے حشر پر
دل کو یہاں تحمّلِ روزِ دگر نہ تھا

خار کی طرح ملی باغِ جہاں میں تقدیر
جس سے لپٹوں وہ چھڑا لیتا ہے دامن اپنا

ہم آئے عشقبازی کو تم آئے دلنوازی کو
کوئی اس عالمِ اسباب میں کب بے سبب آیا

سب کھینچتے ہیں نالۂ گرم اس کے واسطے
اس شمع نے لگائی ہے یہ انجمن میں آگ

وہ بادہ خوار ہوں چھوڑوں گا جب لبِ کوثر
تو دیں گے ساقیٔ کوثر ہی بھر کے جام مجھے

ذاکر

ذاکر علی

○

اندوہ و درد و یاس و غم و حسرت و ملال
کیا کیا نہ ساتھ لے کے چلے اس جہاں سے ہم

ویرانیٔ چمن کا نہ صدمہ ہوا نصیب!
مر جائیں کاش پہلے ہی فصلِ خزاں سے ہم

نظروں سے آج اُن کی یکایک اُتر گئے
رونے کا ہے محل کہ گرے آسماں سے ہم

صیاد کس کو اب ہے رہائی کی آرزو
کنجِ قفس میں خوش ہیں کہیں آشیاں سے ہم

اسیری نے کیا ہے تنگ جاں سے
گلا گھٹنے لگا طوقِ گراں سے

خدائی کا ہے دعویٰ کس زباں سے
کوئی پوچھے بتانِ بے دہاں سے

جیا تنہا مثالِ خضر تو کیا!
میں درگذرا حیاتِ جاوداں سے

سحر

اقبال بادروما

سی رنگ میں داستاں نہیں ہے
کوئی شے بیاں جاودانی نہیں ہے

ہے شعر اس کا حرفِ فانی نہیں ہے
حقیقت ہے دنیا کہانی نہیں ہے

خیالات کی سفاد و آلودہ دنیا
کسی طرح بھی آنی جانی نہیں ہے

ئو ہے تو سب یہ توبہ کا دل میں
سبو ہے مے ارغوانی نہیں ہے

ہمہ ہے یہ حالت مرے آنسوؤں کی
نری آگ ہے ان میں پانی نہیں ہے

ے بھی میں چھپ کر یہ کیا کہہ رہے ہو
مری بات میری زبانی نہیں ہے

رے ہیں دلوں میں گماں کیسے کیسے
یہ کیا ہے اگر بدگمانی نہیں ہے

بینا خوشی کا نہ مرنا خوشی کا
خوشی تب ہے جب زندگانی نہیں ہے

ں پہ ہے پہرا اِک آسماں کا
محبت نہیں، مہربانی نہیں ہے

خود میں ہے آپ اپنی نشانی
غلط ہے کہ اس کی نشانی نہیں ہے

جو اس صنف میں سحر ہے مشق کم کم
غزل میں وہ جادو بیانی نہیں ہے

عزیز صفی پوری

منشی ولایت علیخاں

ہنس کے بات بھی کی اور مسکرا بھی
کیا شہید بھی قاتل نے خوں بہا

گیا جو نامہ بر، آیا بست سر
کہا کہ چاک کیا خط کو اور جلا

سنبھلے حضرت موسیٰ مگر ستم
دکھا کے جلوۂ دیدار کچھ سنا بھی

میں وہ چراغ ہوں جس کو فروغ ہستی
قریب صبح کیا روشن اور بجھا بھی

عزیز اس کے کرم پر خفا نہ ہوں کیونکہ
[illegible] کے مجھے عشق کا مزا بھی

احسن لکھنوی

صدی حسن

○

دل کی وحشت نہ گئی خاک میں مل جانے سے
آندھیاں اُٹھنے لگی ہیں مرے ویرانے سے

روز کرتا ہُوں درستیٔ شکست توبہ
لے کے ٹوٹے ہوئے ٹکڑے ترے پیمانے سے

جام کے دورِ تسلسل سے ہے دُنیا قائم
چرخ نے سیکھی ہے گردش مے پیمانے سے

ل نہ جائے کوئی رستے میں خُدا کا بندہ
مُنہ لپیٹے ہوئے نکلا ہُوں صنم خانے سے

ہوتی جاتی ہیں بہت وصل کی راتیں کوتاہ
آسماں دور بدل لے مرے پیمانے سے

پردۂ رازِ حقیقت جو اُٹھا دوں احسن
شورِ تکبیر ہو پیدا ابھی بُت خانے سے

سرور

منشی دُرگا سہائے جہاں آبادی

○

کس مستِ ناز کا ہے عبث انتظار سو جا
کہ گذر گئی شب آدھی دلِ بے قرار سو جا

نہ تڑپ زمیں پہ ظالم تجھے گود میں اُٹھا لوں
تجھے سینے سے لگا لوں تجھے کرلوں پیار سو جا

یہ تری صدائے نالہ تجھے مُتّہم نہ کر دے
مرے پردہ دار سو جا مرے راز دار سو جا

یہ نسیم ٹھنڈی ٹھنڈی یہ ہوا کے سرد جھونکے
تجھے دے رہے ہیں لوری مرے غمگسار سو جا

تجھے پہلا سابقہ ہے، شبِ غم بُری بلا ہے
کہیں مر نہ جائے ظالم، دلِ بے قرار سو جا!

تشنہ

حافظ محمد یوسف خاں بلند شہری

ہر چند کہ ہے نشو و نما تیرے کرم سے
خالق ترے انعام بیاں ہونگے نہ ہم سے

اس پر بھی تو تقدیر کا لکھا نہیں مٹتا
رگڑی ہے جبیں ہم نے ترے نقشِ قدم سے

وعدے پہ قسم سوچ کے کھاؤ مرے آگے
جھوٹے نہ ٹھہر جاؤ کہیں جھوٹی قسم سے

اے تشنہ کہاں ذوق کہاں مومن و غالب
اس فن کا فقط نام ہے اب داغ کے دم سے

دل میں ہے یہ پوچھوں اس سے جا کر
کیا تجھ کو ملا مجھے ستا کر

اتنا نہ ستا کہ یہ دلِ زار
فریاد کرے کسی سے جا کر

شوق

(پنڈت جگموہن ناتھ رینہ)

عشق کا راز نہ کیوں دل سے نمایاں ہو جائے
کاش یہ بھی کسی ناکام کا ارماں ہو جائے

نہیں امید کہ وہ حشر بداماں ہو جائے
ایسا دیوانہ جو خود داخلِ زنداں ہو جائے

صد قابو کا نہیں کاش وہ اُٹھ کر شبِ غم
سرگذشتِ دلِ ناشاد کا عنواں ہو جائے

نہ تسلی نہ دلاسا نہ کہیں نام کو صبر
حیف اس دل پہ کہ یوں بے سروساماں ہو جائے

غنچے چٹکیں کہ کھلیں پھول بڑھے جوشِ نمو
حسنِ پنہاں کسی عنواں سے نمایاں ہو جائے

ہو یہ وحشت کا اثر خندۂ گل سے ظاہر
پھول جب کھلنے لگیں چاک گریباں ہو جائے

چشمِ تر، نالۂ دل، سوزِ دروں، دردِ فراق
ایک مجھ کو کیا کیا سروساماں ہو جائے

شوق سے نزع کو اتنا بھی گوارا نہ ہوا
عمر میں جو وُہ نہ بنے منہ حیرتاں ہو جائے

طالب باغپتی

کنور محمد لطافت علی خاں

○

پہلے تو آفتاب بنایا شباب نے
پھر اس میں چار چاند لگائے حجاب نے

ناحق کسی کو ڈال دیا پیچ و تاب میں
یہ کیا غضب کیا دلِ پُر اضطراب نے

اب کیا کہوں؟ کہوں کہ کشمکش میں ہوں
مارا ہے دلفریبیٔ طرزِ خطاب نے

نظارہ سوزِ رُوئے تجلّی نہیں رہا
خود دیکھنے کی چیز بنایا نقاب نے

لی کچھ ازل میں حُسن سے سُورج نے روشنی
سورج سے کسبِ نُور کیا ماہتاب نے

نقش و نگارِ عہدِ تمنا بھی ہٹ گئے
ایسا مٹا دیا دلِ خانہ خراب نے

نظر بھی کسی کے سامنے اُٹھ ہی نہیں سکی
ناکام ہی رکھا تگِ انتخاب نے

نُور

میر وزیر علی

○

نہ داد ملتی تو پھر داد خواہ کیا کرتا؟
خُدا کے سامنے عذرِ گناہ کیا کرتا؟

مواخذہ نہ بُتوں سے تھا حشر میں منظور
خُدا کو ظُلم و ستم کا گواہ کیا کرتا؟

کسی میں نام کو بوئے وفا نہیں باقی
ہر ایک گُلِ چمنِ روزگار میں دیکھا

سفید بال ہوئے موسمِ جوانی میں
خزاں کا رنگ شروعِ بہار میں دیکھا

پاس جانا کہاں نصیب ہمیں
دُور سے دیکھنا غنیمت ہے

رات دن اس کا نام جپتے ہیں
عاشقوں کی یہی عبادت ہے

تیرے قدموں پہ دم نکل جائے
بس یہی دل میں ایک حسرت ہے

مدہوش

سنت پرشاد

○

عشق کی رَو میں کچھ اس طرح سے بہ جاتے ہیں
جو کہ کہنا نہ ہمیں چاہیئے کہہ جاتے ہیں

اور جب کہنے کی جو بات تو اُن کے آگے
دل کو ہم تھام کے خاموش سے رہ جاتے ہیں

ہاں کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ رُکتے رُکتے
حُسن توفیق جو دیتا ہے تو کہہ جاتے ہیں

حسن سے سب پہ گرانی تھی بقولِ شاعر
ناتواں عشق کے اس بار کو سہہ جاتے ہیں

بات پردے کی ہے جو حضرتِ مدہوش آہ
پردۂ شعر میں کس لطف سے کہہ جاتے ہیں

کیفی حیدرآبادی

سید رضی الدین حسن

○

ترے انداز ظالم کیا ہیں کچھ پروا نہیں!
سمجھ جاتا ہوں لیکن مجھ سے سمجھایا نہیں

ترا چہرہ برابر دُور سے دیکھا نہیں ج
جھجکتا کیوں ہے! آ نزدیک آ، میں کھا نہیں

ترے جور و ستم بھولے، ہم اپنے درد و غم بھ
مگر ظالم ترا یہ بھولنا بھولا نہیں

طبیعت اس کی، مرضی اس کی، دل اس کا، خوشی ا
جہاں جی چاہے جاتا ہے، نہیں چاہا نہیں

ذرا دل لینے والے بھی تو سوچیں اپنی کمزور
کسی پہ ادعا کر تو مرا دل آ نہیں سب

آسی

عبدالعلیم

○

تابِ دیدار جو لائے مجھے وہ دل دینا
نہ قیامت میں دکھا سکنے کے قابل دینا

شک خورشید جہاں تاب دیا دل مجھ کو
ئی دلبر بھی اسی دل کے مقابل دینا

درد کا کوئی محرم ہی نہیں جب اس کے سوا
مجھ کو ہر عضو کے بدلے ہمہ تن دل دینا

سی کے جلوے تھے لیکن وصالِ یار نہ تھا
میں اس کے واسطے کس وقت بیقرار نہ تھا

خرامِ جلوہ کے نقشِ قدم تھے لالہ و گل
پھر اور اس کے سوا موسمِ بہار نہ تھا

وزِ بیخودی ہم سے نہ پوچھ، رات
کوئی بجز نگہِ یار ہوشیار نہ تھا

لحد کو کھول کے دیکھو کہ اب کفن بھی نہیں
کوئی لباس نہ تھا جو کہ مستعار نہ تھا

پیر مُراد شاہ

○

یہاں حجرہ میں کوئی دم دیکھتے ہیں
نہیں پھر تو مُلکِ عدم دیکھتے ہیں

جو اخلاص آپس میں ہوتے تھے یارو
سو رسم اس زمانے میں کم دیکھتے ہیں

اجل نے جو دی ہم کو فرصت تو ہم بھی
شتاب آپ کے آ قدم دیکھتے ہیں

ہم اعمال پر اپنے اے بندہ پرور
تمہارا ہی لطف و کرم دیکھتے ہیں

لٹا آہے غیروں سے لے شوخ آنکھیں
چُرا آہے جس وقت ہم دیکھتے ہیں

سیہ بختی ہے اپنی اس زُلف میں دل
گرفتار پُر پیچ و خم دیکھتے ہیں

یہاں سیرِ دل جس کو مدِ نظر ہے
وہ کب جا کے باغِ ارم دیکھتے ہیں

مرادؔ آج کیا ہو گیا ہے جو تیری
بیں خشک اور چشمِ نم دیکھتے ہیں

وسیم

سید محمد عسکری خیر آبادی

○

تیرا غم دل میں اک دن کے لئے
سینکڑوں بے تاب ہیں ان کے لیے

ہائے کیا آئی جوانی کیا گئی
کر گئی بدنام دو دن کے لئے

وہ گھٹا اٹھی ہے پی لو واعظو
ورنہ پھر ترسو گے اس دن کیلئے

غش ہوئے موسیٰ تو آئی یہ صدا
پردہ ہم کرتے تھے اس دن کیلئے

کامل

علی میاں

○

مدار کار ہے نخوت پہ نکتہ دانوں کا
ہوا کے ہاتھ میں دامن ہے بادبانوں کا

عزیز زخم جگر اس سبب سے ہے مجھ کو
کہ یادگار ہے احباب کی زبانوں کا

مٹائے نقش قدم رہرووں نے خوب کیا
کہ بیٹھنا بھی تو مشکل تھا ناتوانوں کا

خزاں میں غم شب تیرہ کا بلبلیں نہ کریں
چراغ بن کے جلے گا خس آشیانوں کا

ہمارے دل کو شکار الم، ملال نہ دو
کہ تیر خوردہ ہے افلاک کی کمانوں کا

جگر بسوانی

حکیم محمد افتخار علی خان

○

وار کرتے ہیں وہ شمشیرِ ادا سے پہلے
جان لے لیتے ہیں عاشق کی قضا سے پہلے

دل پہ کرتے ہیں جفا آپ وفا سے پہلے
روز ملتی ہے سزا ہم کو خطا سے پہلے

عشق میں موت کا احسان اُٹھانا کیسا
جان دینے کا ارادہ ہے قضا سے پہلے

دلِ ناکامِ تمنا کا ہے یہ ہجر میں حال
نااُمیدی ہوئی جاتی ہے دُعا سے پہلے

ہم خطاوار سرِ حشر نہ رُسوا ہوں گے
بخش دیتا ہے وہ اقرارِ خطا سے پہلے

کوئی اندازِ جفا کرتے ہیں ایجاد اگر
پُوچھ لیتے ہیں وہ اربابِ وفا سے پہلے

خونِ دل تُجھ سے جگر کا نہ ملا ہو اے شوخ
ہاتھ یوں سرخ نہ ہوتے تھے حنا سے پہلے

باسط بسوانی

○

اگر پردہ دوئی ڈالے نہ رہتی درمیاں اپنا
تو میرے امتحاں کو وہ سمجھتے امتحاں اپنا

کیا یُوں رازِ دل ہم نے اشاروں میں بیاں اپنا
کہ جیسے حال کہتا ہے بہ مشکل بے زباں اپنا

وہی اک داستانِ عشق ہم دُہراتے رہتے ہیں
بدلتا رہتا ہے کچھ کچھ مگر رنگِ بیاں اپنا

چھری گردن پہ رکھے رو رہے ہیں آج مقتل میں
وہی کل جو ہنسی سمجھے تھے باسطؔ امتحاں اپنا

فیروز طغرائی

حکیم فیروز الدین

آ رہا ہے تیر سہم تیر پر	آ رہا ہے جذبۂ نخچیر پر
ختم ہے ہم پہ اسیری عشق کی	قفل ہے ہر حلقۂ زنجیر پر
دیکھ کر خط ڈال آنکھیں ہو گئیں	خوب سرخی ہے مری تحریر پر
مر مٹے ہم پر رقیب رُو سیہ	خلقتیں صدقے ہوئیں تنویر پر
کاخ ہستی ہے طلسم بے ثبات	رنگ ویرانی ہے اس تعمیر پر
ساتھ پیری سے جوانی کا نہیں	منحصر کیا ہے کمان و تیر پر
کر دیا جس نے ان آنکھوں کو غزال	صاد ہے اس شخص کی تقریر پر
کر تو دیں تاخیر وعدے کو ترے	پہلے تقدیم ہے تاخیر پر

دیکھ کر فیروز خواب زندگی
کھل گئیں آنکھیں مری تعبیر پر

جالب دہلوی

سید بشارت علی

کسی عاشق پہ جب بیداد
ہمیں بھی او ستمگر یاد

تمہیں ظالم بنایا ظلم سے
نہ یہ محنت مری برباد

نیا عاشق ہو گر پیدا تو تم
کوئی تازہ ستم ایجاد

مٹانا خاک پہ لکھ کر مرا
بنوں جب میں تو یوں بیداد

فوقؔ

منشی محمد الدین

○

...س درجہ زمانے کی ہوا ہے — انجام کے احساس سے دِل کانپ رہا ہے

...ھو اس کو وہ پتھر کا ہے ٹکڑا — جس میں نہ حمیت نہ حرارت نہ وفا ہے

...ھتے ہی نظر ہو گئی غائب — جادو ہے کہ بجلی کہ چھلاوہ کہ بلا ہے

...ر تم نے ظلم و ستم پر بھی دُعا گو — تُو وہ کہ مرے عجز و وفا پر بھی خفا ہے

...ی موہوم پہ غافل یہ تکبر — اتنا تو سمجھ کوئی رہے گا نہ رہا ہے

...سے کہتے ہیں سب جنتِ فردوس — جب تجھ ہی نہیں پاس تو دوزخ سے سوا ہے

...پیا ہے کے پھرتے ہوئے سائے — اک عالمِ شاداب تجھے ڈھونڈ رہا ہے

...ہے تو محل ہے تہ پا — اللہ عجب منظرِ پر زیب فضا ہے

...ن چشمِ تصور میں سما جا — آئینہ ترا دیدے سے بے عکس پڑا ہے

...وہ سب کچھ ہے باندازِ حقیقی — بندہ ہے تو بندہ ہے خدا ہے تو خدا ہے

اے فوقؔ ہیں ہو دل سلئے محتاجِ رفاقت
تنہا رہِ منزل میں کوئی چھوڑ گیا ہے

حامیؔ

پیر وزیر علی شاہ

○

ستم کر، ظلم کر، جور و جفا کر
میں خوش رہتی، جو ہو تیری رضا کر

اگر کچھ ہے مسیحائی کا دعویٰ
تو میرے درد دل کی بھی دوا کر

خیالِ یار بھی پردہ نشیں ہے
کہ چھپ جاتا ہے اپنے دل میں آکر

دلِ عشاق پر گرتی ہے بجلی
وہ جب کرتے ہیں باتیں مسکرا کر

نیرنگ

سید غلام بھیک

○

اک ہجومِ غم و کلفت ہے خدا خیر کرے
جان پر نت نئی آفت ہے خدا خیر کرے

جائے ماندن ہمیں حاصل ہے نہ پائے رفتن
کچھ مصیبت ہی مصیبت ہے خُدا خیر کرے

آچلا اُس بُتِ عیار کی باتوں کا یقیں
سادگی اپنی قیامت ہے خدا خیر کرے

دل گیا جانے دو کافر کی ہے ایماں پہ نظر
آنکھ میں اپنی موت ہے خدا خیر کرے

ابھی تشخیصِ مرض میں ہے طبیبوں کو کلام
جان ادھر در پئے رُخصت ہے خُدا خیر کرے

رہنماؤں کو نہیں خود بھی پتہ رستے کا
ماہ رو پیکرِ حیرت ہے خُدا خیر کرے

ازلؔ

ابوالاعجاز منشی عبدالمجید

○

اس نے مژگاں کا تان کر بھالا
اپنے عاشق کو مار ہی ڈالا

عشق گیسو کو دی جگہ دل میں
سانپ کو آستیں میں پالا

تیری زلفوں کا تیری آنکھوں کا
کوئی وحشی ہے کوئی متوالا

اک نیا ظُلم روز کرتا ہے
کس ستمگر سے پڑ گیا پالا

بے نوائی میں خوش ہوں اپنی ازلؔ
نے غمِ دزد نے غمِ کالا

شوق نیموی

ظہیر احسن

○

...اب ہیں سینے سے نکلنے کے لئے
...ے کوئی کہہ دے سنبھلنے کے لئے

...میں جو تم ہو یہاں جی گھبرائے
...میری آنکھوں میں ٹہلنے کے لئے

...ان کی سرِ بزم حیا سے بولیں
...ل سے ہوا حکم نکلنے کے لئے

...دو ہوئے نہ کیوں کر اٹھے
...آتے ہیں کوئی ٹلنے کیلئے

...بھی اُن کا جو ہے شکوہ دل کو
...ہے کوئی پہلو یہ مچلنے کے لئے

...ہو مگر چاہ بُری ہوتی ہے
...ضد ہے اسی کوچے میں چلنے کیلئے

...میں کیوں شمع جلائی تم نے ؟
...کوئی نہ تھا رشک سے جلنے کیلئے

...بر گئیں اے شوقؔ یہاں تک دل میں
...تمنّا ہے ملاقات کے لئے

ناظم

میرزا ناظر حسین لکھنوی

○

نور کا تیرے ازل سے آفتابِ آئینہ تھا
لاجوابِ آئینہ ہیں تھا لاجوابِ آئینہ تھا

طالعِ بیدار نے دیکھا کھلی آنکھوں تجھے
تھی تری تصویر تعبیر اور خوابِ آئینہ تھا

دیدۂ جوہر نے آنکھیں ہی آنکھیں تھیں کھلی
دیکھنے والوں کی نظروں کا حسابِ آئینہ تھا

تُو نے یوں دیکھا کہ مُنہ پانی میں دیکھیں جس طرح
آب و تابِ حسن سے کیا آب آبِ آئینہ تھا

عکسِ خال و خط تھے سب رُو رُو کتابی کے عیاں
ایک صفحہ تھا مگر پوری کتابِ آئینہ تھا

اپنے گھر میں رہنے پر بھی دربدر پھرتا رہا
سخت حیرت ہے عجب خانہ خرابِ آئینہ تھا

بن کے حیرت خانہ میں آیا جو وہ صورتِ سوال
سارے غائب تھے مگر حاضر جوابِ آئینہ تھا

صبح ہونے کو ہے دیکھیں دیکھتا ہے وہ کسے
شام سے میں جاگتا تھا محوِ خوابِ آئینہ تھا

جس نے رکھا اُس کو آنکھوں ہی میں اے ناظمؔ رکھا
مردمک تصویر تھی چشم پُر آبِ آئینہ تھا

احمد

خان احمد حسین خاں

○

مجھے ڈھونڈے نہ کوئی اے مقدر اشکباروں میں
کسی کو مجھ سے ملنا ہے تو آئے جاں نثاروں میں

دلِ پُر داغ و چشمِ خوں فشاں کے نام لیوا ہیں،
لگے ہیں ورنہ کیا سرخاب کے پر لالہ زاروں میں

عجب مہماں نوازی ہے سرائے ملکِ فانی کی
کہ مہمانوں کو لے جا کر سلاتے ہیں مزاروں میں

فلک سمجھائے اپنے ناز پروردہ ستاروں کو
چُرا لیتے ہیں میری نیند یہ شب کو اشاروں میں

ہمارے دامنِ ہستی کے ٹکڑے ہوں نہ اے ہمدم
جو وحشت زندگی میں ہم کو اُلجھاتے ہیں خاروں میں

مَیں تجھ سے پُوچھتا ہُوں اے تپِ فرقت کی بیہوشی
یہی تھی یاس جو بیٹھی رہی تیمارداروں میں

ہمارے دل کو دیکھو دل میں آئے داغ کو دیکھو
نہ دیکھو ماہِ کامل کو نہ جاؤ لالہ زاروں میں

بہت خوش ہوگا سن کر بھولنے والا مرا احمد
مری تربت بھی یاروں کو نہیں ملتی مزاروں میں

سجاد

سجاد علی انصاری

○

آنکھ جب تک فریب کار نہ تھی
پھُول میں شوخیٔ بہار نہ تھی

اس سے پہلے بھی تیری خاموشی
تھی مگر ایسی طرفہ کار نہ تھی

یاس پہ تُو نے کر دیا مجبور
ورنہ امید مجھ پہ بار نہ تھی

مَیں نے دیکھا تری نگاہوں کو
ان میں وہ شانِ اعتبار نہ تھی

کس طرف لے کے چلا شوق کا انداز مجھے
آج کیوں روک رہی ہے تری آواز مجھے

خارِ رہ میں بھی نظر آتی ہے شادابیٔ گُل
لیے جاتا ہے کدھر حُسنِ فسوں ساز مجھے!

مجھ کو افسونِ محبت نے مٹا کر چھوڑا
تو سمجھتا ہی رہا شعبدہ پرواز مجھے

جس کے ہر رنگ پہ یہ خوبیٔ انجام نثار
یاد آتی ہے وہ نیرنگیٔ آغاز مجھے

شیدا

رام رچھپال سنگھ دہلوی

یامت ڈھائیں گے رفتار سے اصلا نہ مانیں گے
ہ جب تک حشر ہی برپا نہ ہولے گا نہ مانیں گے

نہ مانوگے تو روزِ حشر تم پچھتاؤ گے دیکھو
مناؤ گے مگر عشاق بے پروا نہ مانیں گے

وہ موسیٰ تھا کہ فقرہ چل گیا واں لن ترانی کا
تمہارے طالبِ دیدار یہ دعویٰ نہ مانیں گے

بجز عشقِ بتاں عشقِ خدا ہو، ہو نہیں سکتا
اگر ہم مان بھی لیں حضرتِ شیدا نہ مانیں گے

شمس مینائی

ابوالمعانی شیخ عبدالرحمٰن امرتسری

سناؤں کیا کسی کو میں سنے گا کوئی کیا میری
نہ وہ عالم ہے اب میرا نہ وہ دلبستگی میری

گئے وہ دن کہ میں اور وہ شریکِ بزم ہوتے تھے
سنا کرتے تھے اہلِ دل کبھی اُن کی کبھی میری

یہ منظر آخرِ شب کا ہے دیکھو چشمِ عبرت سے
کہ ہے مہمان کوئی دم کی شمعِ زندگی میری

نہ پوچھو کچھ یہ ظاہرداریاں رہنے بھی دو صاحب
کسی کو کیا کٹی جیسی کٹی ہاں کٹ گئی میری

تمہیں تو ایک ساعت کیلئے بھولا نہیں ہوں میں
مگر کہئے تمہیں بھی یاد کیا آئی کبھی میری

غضب ہوتے ہوئے آنکھیں دکھائی کچھ نہیں دیتا
سیاہی سے بدل کر رہ گئی ہے روشنی میری

یہ فیضِ صحبتِ اہلِ سخن ہے کچھ جو لکھتا ہوں
نہیں تو شمس کیا اردو مرا کیا فارسی میری

اشک

واجد علی خاں عرف اچھن صاحب رامپوری

○

اک دن وہ مل گئے تھے سرِ رہ گزر کہیں
پھر دل نے بیٹھنے نہ دیا عمر بھر کہیں

اندازِ اعترافِ محبت تو دیکھئے
میری نظر کہیں ہے تو اُن کی نظر کہیں

اِن ہمدموں کی کارگزاری نہ پوچھئے
دل سے بنا بنا کے اِدھر کی اُدھر کہیں

اے رازداں یہ سب ترے کہنے کی بات ہے
رکھتے ہیں ورنہ کان بھی دیوار و در کہیں

اس نکتہ چیں کو حال سُنانے چلے تو اشکؔ
اپنی زباں جواب نہ دے وقت پر کہیں

اظہر امروہوی

نمائش

○

یہ روزِ قیامت ہے تکمیلِ تمنا کر
یا آج بھی دھوکا دے یا وعدۂ فردا کر

یا پردے سے باہر آ جلوے کو بھی رُسوا کر
یا عشق کی رُسوائی چُھپ چُھپ کے نہ دیکھا کر

یہ میرا سیہ خانہ یہ ہجر کی تاریکی
آ تُو بھی یہاں روشن شمعِ رُخِ زیبا کر

اے ساقیِ مے خانہ اک ساغرِ بادہ سے
مفلس کو سکندر کر نادار کو دارا کر

مفہومِ تمنا پر آتی ہے ہنسی مجھ کو
جس وقت وُہ کہتے ہیں اظہارِ تمنا کر

امروز کی محفل میں پینے دے مجھے واعظ
تو بیٹھ کے مسجد میں اندیشۂ فردا کر

میں طالبِ جلوہ ہوں وہ کہتے ہیں اے اظہرؔ
سُورج کی نگاہوں سے شبنم کو نہ دیکھا کر

عابد شاہجہانپوری

عابد حسین

○

لہے آشنا تھی نظر	ہم اُٹھے میکدے سے جب پی کر
ہوں انقلابِ عالم سے	میری دُنیا میں شام ہے نہ سحر
، اور پرسشِ دلِ غم گیں	یہ بھی شاید ہے اک فریبِ نظر
یہ عالم ہے وحشتِ دل کا	لوٹ آتا ہوں دو قدم چل کر
شتِ نگاہ کیسا کہئے	جیسے اک برق جیسے اِک محشر
آیا میں سمجھا آپ آئے	اللہ اللہ یہ بے خودئ نظر
آلودہ ہے جبینِ حسیں	جیسے شبنم گری ہو پھولوں پر

ذرّے لَو دے رہے ہیں اے عابدؔ
رشکِ فردوس ہے فضائے سحر

عیش

جان محمد خان غوری فیروزپوری

○

ہم یوں تڑپ رہے ہیں ترے آستاں سے دُور
جیسے کوئی اسیرِ قفس آشیاں سے دُور

تُو ہر مقام پہ ہے نگاہوں کے سامنے
مَیں ہر مقام پہ ہُوں ترے آستاں سے دُور

منزل جُدا، خیال جُدا، شوقِ دل جُدا
مَیں کارواں کے ساتھ ہُوں یا کارواں سے دُور

بزمِ جہاں کی سیر بہت کر چکا ہُوں مَیں
اے عشق لے چل اَور کہیں اس جہاں سے دُور

جنت کی جُستجو ہے جسے چل کے دیکھ لے
نزدیک ہے کہ پیرِ مغاں کی دُکاں سے دُور

ایک ایک سے زیادہ ہیں دُنیا میں کم نصیب
بلبل چمن سے ہم ہیں ترے آستاں سے دُور

اُن کا خیال عیشؔ پھر اُن کا خیال ہے
رہتے جہاں میں رہ کے ہوں رہتے جہاں سے دُور

نیّر واسطی

حکیم سیّد علی احمد

ہو ہجر و فراق کی گھڑی ہے — عمرِ غمِ آرزو بڑی ہے
ٹوں پہ مچل رہے ہیں انجم — کس چاند سے آنکھ جا لڑی ہے
جاؤ کہ ایک بار ہنس لیں — رونے کو تو زندگی پڑی ہے
ظلمتِ شب یہ جوشِ گریہ — برسات کی رات کی جھڑی ہے
جنگل پہ لپک رہے ہیں شعلے — طاؤس کو رقص کی پڑی ہے

نیّر کو سلامِ غم مبارک
منزل مگر عشق کی کڑی ہے

عبرت

مرتب مبارک علی صدیقی

گو میسر تھا پھولوں کا سایا
پھر بھی کانٹوں کو ہنسنا نہ آیا

بے نیازانہ گذرے چمن سے
ہم نے پھولوں سے دامن بچایا

ان کی آنکھیں اور اشکِ محبت
یہ ستارہ کہاں جھلملایا

ان کی آواز پہ بڑھ رہا ہوں
اب نہ منزل نہ منزل کا سایا

درد گہوارۂ زندگی ہے
غم نے دل کو تھپک کر سلایا

یہ کہیں میرا دل تو نہیں ہے
ان کی مژگاں پہ کیا جگمگایا

اشک آنکھوں میں آئے امنڈ کر
پرسشِ غم نے طوفاں اٹھایا

میرا کردار ہی مجھ کو عبرت
عرش سے فرش پہ کھینچ لایا

ہادیؔ مچھلی شہری

○

شوریدگیٔ حرماں جائے گی نہ یوں سر سے
تلچھٹ ہی عنایت ہو ساقی مجھے ساغر سے

نقاشِ غمِ پنہاں ہے کون سوا اس کے
زیبائشِ داماں ہے نوکِ مژۂ تر سے

دنیائے محبت میں اک حشر سا برپا ہے
بالیدگیٔ غم سے شوریدگیٔ سر سے

مانا کہ نصیبوں کا ہوتا ہے لکھا پورا
ٹکراؤں میں سر کب تک بے درد ترے در سے

اے پائے طلب لے چل، اے جوشِ وفا کام آ
سودائے محبت کو کچھ کام ہے اس در سے

بدنام نہ ہو جائے اندازِ ستم گاری
کیوں آنکھ چراتے ہو میرے دلِ مضطر سے

لاتا ہے غمِ فرقت کچھ اور ارادوں سے
سر پھوڑ کے دیوانے جاتے ہیں ترے در سے

بیکار گئی کوشش تدبیر نہ کام آئی
کچھ بس نہ چلا ہادیؔ آخر کو مقدر سے

رساؔ جالندھری

محمد کبیر خاں

○

لرزاں ہے ایک برق سی جلوہ کہیں جسے
دھوکا نہیں نگاہ کا دھوکا کہیں جسے

پھیلی ہے ان لبوں پہ تبسم کی روشنی
ٹوٹے ہوئے دلوں کا سہارا کہیں جسے

اللہ میرے عشق کا انجام ہو بخیر
دیکھوں وہ خواب، خوابِ زلیخا کہیں جسے

دل کی رگوں میں دوڑ کے بیتاب کر گئی
ہلکی سی ایک لہر تمنا کہیں جسے

نقاش کوئی ایسی بھی تصویر کھینچنا
بگڑے ہوئے نصیب کا نقشا کہیں جسے

آخر ٹپک کے آنکھ سے دامن پہ آ رہی
وہ اک لہو کی بوند کلیجا کہیں جسے

روتی ہے بیکسی کہ ہوا ہے وبالِ دوش
خوں گشتہ حسرتوں کا جنازا کہیں جسے

اپنے تجھے جو کہتے ہیں اچھا تو کیا رساؔ
اچھا وہی ہے غیر بھی اچھا کہیں جسے

نیر واسطی

حکیم سید علی احمد

پھر ہجر و فراق کی گھڑی ہے — عمرِ غمِ آرزو بڑی ہے
پلکوں پہ چمک رہے ہیں انجم — کس چاند سے آنکھ جا لڑی ہے
آجاؤ کہ ایک بار ہنس لیں — رونے کو تو زندگی پڑی ہے
یہ ظلمتِ شب یہ جوششِ گریہ — برسات کی رات کی جھڑی ہے
جنگل پہ لپک رہے ہیں شعلے — طاؤس کو رقص کی پڑی ہے

نیر کو سلامِ غم مبارک
منزل مگر عشق کی کڑی ہے

عبرت

محمد مبارک علی صدیقی

گو میسر تھا پھولوں کا سایا
پھر بھی کانٹوں کو ہنسنا نہ آیا

بے نیازانہ گزرے چمن سے
ہم نے پھولوں سے دامن بچایا

ان کی آنکھیں اور اشکِ محبت
یہ ستارہ کہاں جھلملایا

ان کی آواز پہ بڑھ رہا ہوں
اب نہ منزل نہ منزل کا سایا

درد گہوارۂ زندگی ہے
غم نے دل کو تھپک کر سلایا

یہ کہیں میرا دل تو نہیں ہے
ان کی مژگاں پہ کیا جگمگایا

اشک آنکھوں میں آئے اُمڈ کر
پرسشِ غم نے طوفاں اُٹھایا

میرا کردار ہی مجھ کو عبرت
عرش سے فرش پہ کھینچ لایا

هادی مچھلی شہری

شوریدگیٔ حرماں جائے گی نہ یوں سر سے
تھوڑی ہی عنایت ہو ساقی مجھے ساغر سے

نقاشِ غمِ پنہاں ہے کون سوا اس کے
زیبائشِ داماں ہے نوکِ قطرۂ تر سے

دنیائے محبت میں اک حشر سا برپا ہے
بالیدگیٔ غم سے شوریدگیٔ سر سے

مانا کہ نصیبوں کا ہوتا ہے لکھا پورا
ٹکراؤں میں سر کب تک بے درد ترے در سے

اے پائے طلب ہے چل، اے جوشِ وفا کام آ
سودائے محبت کو کچھ کام ہے اس در سے

بدنام نہ ہو جائے اندازِ ستم گاری
کیوں آنکھ چراتے ہو میرے دلِ مضطر سے

لاتا ہے غمِ فرقت کچھ اور ارادوں سے
سر پھوڑ کے دیوانے جاتے ہیں ترے در سے

بیکار گئی کوشش تدبیر نہ کام آئی
کچھ بس نہ چلا ہادی آخر کو مقدر سے

رسا جالندھری

محمد کبیر خاں

لرزاں ہے ایک برق سی جلوہ کہیں جسے
دھوکا نہیں نگاہ کا دھوکا کہیں جسے

پھیلی ہے ان لبوں پہ تبسم کی روشنی
ٹوٹے ہوئے دلوں کا سہارا کہیں جسے

اللہ میرے عشق کا انجام ہو بخیر
دیکھوں وہ خواب، خوابِ زلیخا کہیں جسے

دل کی رگوں میں دوڑ کے بیتاب کر گئی
ہلکی سی ایک لہر تمنا کہیں جسے

نقاش کوئی ایسی بھی تصویر کھینچنا
بگڑے ہوئے نصیب کا نقشا کہیں جسے

آخر ٹپک کے آنکھ سے دامن پہ آ رہی
وہ اک لہو کی بوند کلیجا کہیں جسے

روتی ہے بے کسی کہ ہوا ہے وبالِ دوش
خوں گشتہ حسرتوں کا جنازا کہیں جسے

اپنے تجھے جو کہتے ہیں اچھا تو کیا رسا
اچھا وہی ہے غیر بھی اچھا کہیں جسے

وفا

پنڈت میلا رام

التفاتِ عام ہے وجہِ پریشانی مجھے
کس قدر مہنگی پڑی ہے ان کی ارزانی مجھے

میں ہوں اور آزارِ استقبالِ دشمن صبح و شام
یعنی اس نے دی ہے اپنے گھر کی دربانی مجھے

سعیِ لاحاصل ہے دل کی کوششِ اخفائے راز
کر گئی رسوا نگاہوں کی پریشانی مجھے

بحرِ ہستی ہے مری نظروں میں اک دشتِ سراب
ریت کا ہوتا ہے دھوکا دیکھ کر پانی سے مجھے

تیرے جلووں کا تو ہر اک ذرہ ہے آئینہ دار
مانعِ نظارہ ہے خود میری حیرانی مجھے

اس قدر ناپید ہیں اہلِ کمال اب اے وفاؔ
کوئی اپنا بھی نظر آتا نہیں ثانی مجھے

نظیر

اصغر حسین خاں

تاریخ میں جب تک مرا افسانہ رہے گا
فرزانہ جو ہوگا ترا دیوانہ رہے گا

شغلِ دف و چنگ و مے و پیمانہ رہے گا
ہم ہیں تو یہی جلسۂ رندانہ رہے گا

یہ شہرِ محبت بھی عجب شعبدہ گر ہے
آباد بھی ہو جائے تو ویرانہ رہے گا

تم آپ نہ آؤ گے تو میں پہنچوں گا اُڑ کر
اک رات بھی بے شمع نہ پروانہ رہے گا

چلتے ہوئے دو جام ہیں ساقی تری آنکھیں
اب کس کو سرِ ساغر و پیمانہ رہے گا

کیا غم ہے جو اٹھوایا ہے مجھ کو دمِ آخر
اب اس کی گلی میں مرا افسانہ رہے گا

گر ہیں یہی افکار نظیرؔ اہلِ حرم کے
کعبہ میں بھی اندازِ صنم خانہ رہے گا

طالب بدایونی

○

دل سے ترا خیال بھلایا نہ جائے گا
پتھر کا نقش ہے یہ مٹایا نہ جائے گا

اے یاس اب نہ خانۂ دِل کو تباہ کر
اُجڑا ہوا یہ نگر تو بسایا نہ جائے گا

اس کی تجلیاں ہیں مری آنکھ کا حجاب
پردہ وہ آپڑا کہ اٹھایا نہ جائے گا

ہم سے نہ ہوگی بندگیٔ ماسوا کبھی
یہ سر کسی کے در پہ جھکایا نہ جائے گا

جاتے ہیں اُس سے کہنے کو ہم اپنا حالِ دل
پُوچھا اگر اس نے حال بتایا نہ جائے گا

دل میں نہ چُھپ سکے گا کبھی رازِ حُسن و عشق
شعلوں کو خار و خس میں چھپایا نہ جائے گا

طالب بغیر عشق و محبت کے دہر میں
ہستی کو لازوال بنایا نہ جائے گا

ثاقب زیروی

محمد صدیق

○

دل و نظر پہ مسلط ہے اک سکوں دشمن
بدل رہی ہے محبت جنوں کا پیراہن

بنی ہے زمزمۂ شوق قلب کی دھڑکن
یہ کس کے پاؤں کی آہٹ ہوئی پسِ چلمن

نگاہِ شوق ہے اور ان کا عارضِ روشن
مچل رہی ہے دمِ صُبح آشنہ پہ کرن

یہ کون حُسنِ بہاراں اِدھر سے گذرا ہے
مہک رہے ہیں ابھی تک گلوں کے پیراہن

نظر کو شوقِ نظارا ہے دِل میں خودداری
دل و نگاہ کے رشتہ میں پڑ گئی اُلجھن

یہ اتفاق ہے یا مُعجزہ گناہوں کا
کہاں وہ رحمتِ کامل، کہاں میں تردامن

رہ طلب میں کوئی کس پہ اعتبار کرے
جنوں خرد کا مخالف۔ خرد جنوں دشمن

وہ آنسوؤں پہ مرے مُسکرا دئے ثاقب
بکھر گئے مری حدِ نگاہ تک گلشن

حرماں خیرآبادی

فریاحمد

○

آہ اس گھڑی مجھ کو آپ یاد آتے ہیں
صبح و شام جب مل کر کچھ پیام لاتے ہیں

جذبۂ محبت میں کیا طلسم ہے یارب!
ورنہ سحر تو اکثر بن کے دُھند جلتے ہیں

کیا چمن میں پھر کوئی غیرتِ بہار آیا!
پھول مسکراتے ہیں خار گنگناتے ہیں

کچھ تو لطف دیتی ہے آرزوئے دیرینہ
ہم جبھی تو آنکھوں سے اشکِ خوں بہاتے ہیں

آپ کی جفاؤں سے عذر کا کسے یارا
بس یہی قیامت ہے آپ بھول جاتے ہیں

اک غریقِ اُلفت کو خطرۂ تلاطم کیا
یعنی ڈوبنے والے آپ ڈوب جاتے ہیں

سب کو ایک اِک ساعت زندگی کی بھاری ہے
اس تباہ انساں کو آپ آزماتے ہیں!

دل میں عشقِ رفتہ کی یاد تک نہیں باقی
اک شکستہ خاطر کو کیا یونہی ستاتے ہیں!

اپنے دل کی حالت پر رحم کیجیے حرماں
آپ کی کہانی ہے آپ ہی سناتے ہیں

ماصی کرنالی

○

میں بھی پابندِ وفا ہوں تجھ پہ بھی بیداد ہو
مجھ سے لوگوں نے کہا ہے تم ستم ایجاد ہو

آپ اس کی خوش مذاقی کا تصور کیجیے
بجلیاں گرنے سے جس کا آشیاں برباد ہو

آؤ لکھ دیں وقت کی تاریخ کا اِک باب ہم
کچھ مرا افسانہ ہو کچھ آپ کی روداد ہو

وہ فضا وہ سرمئی شب، وہ تری پہلی نظر
وہ تغافل آشنا، شاید تجھے کچھ یاد ہو

دیکھتا ہوں حُسن ابھی کچھ زندہ دِل ہے یا نہیں
وہ ستم فرمائیے جو آپ کی ایجاد ہو

یُوں غمِ دوراں کو ہنستے کھیلتے دیجے شکست
مسکرا دیجے اگر دل مائلِ فریاد ہو

ایک تارا ٹوٹ کر سارے اُفق پر چھا گیا
ہو کوئی برباد تو اس شان سے برباد ہو

شعر کے سانچے میں ڈھل جاتا ہے ہستی کا وجود
جب وہ کہتے ہیں کہ ماصی اک غزل ارشاد ہو

لطیف انور گورداسپوری

رہِ وفا میں خاک خود اپنی اُڑا کے دیکھ
کچھ دیکھنا ہے تجھکو تو سب کچھ لُٹا کے دیکھ

گرداب ہے قریب کہ ساحل قریب ہے
اے ناخدا بچا کے خدارا بچا کے دیکھ

دل مطمئن نہیں ہے حکایاتِ طُور سے
اِک بار اَور میری نظر آزما کے دیکھ

اے بادِ صُبح غنچے ابھی تک ہیں محوِ خواب
رنگِ بہاراں کو ذرا گدگدا کے دیکھ

دیکھا نہیں ہے تو نے اگر ظرفِ بادہ نوش
اے پیرِ میکدہ کبھی مجھ کو پلا کے دیکھ

کشتی کا رُخ بدلتا رہا کیوں ہوا کے ساتھ
ہر موجِ حشر خیز کو ساحل بنا کے دیکھ

منظُور

چودھری منظور احمد

کل تیرے لب پر تھی اب میری زبانی ہے — رودادِ محبت بھی اِک رام کہانی ہے
یہ مست نظر توبہ، یہ چال معاذاللہ — اُڑتے ہوئے شعلے میں بہتا ہوا پانی ہے
اک گوشۂ عزلت میں اک بامِ تماشا پر — یہ میری تمنا ہے وہ تیری جوانی ہے
اک دُودِ چراغِ دل اِک بوئے گلِ رعنا — یہ میرا فسانہ ہے وُہ تیری کہانی ہے
کرنوں کا قلم لے کر خورشید کے پردے میں — اے برقِ نظر تیری تصویر بنانی ہے
یہ کلبۂ غم جس کی تصویر سے ہے روشن — قندیلِ فلک! تجھ کو وُہ شمع دِکھانی ہے
آ دیدے سے پھولوں کی بدامانِ نظر بھر لیں — خوش رنگ مناظر ہیں اور صُبح سہانی ہے
گلزار میں اے مہوش! کچھ دیر ٹھہر جانا — خوشبو ترے بالوں کی غنچوں میں بسانی ہے

کچھ روز کی مُہلت دے منظور کو محفل میں
اے موت ابھی دل کی روداد سُنانی ہے

پیام شاہجہانپوری

محمد مبین خان

جو مصائب میں سے ہنس ہنس کے گذر جاتے ہیں
منزلیں ساتھ ہی رہتی ہیں جدھر جاتے ہیں

بات جب ہے کہ خزاں میں بھی ہو گلشن پہ بہار
موسمِ گل میں تو کانٹے بھی نکھر جاتے ہیں

ہم بھلا تیری جفا سے کبھی مُنہ پھیریں گے
ہم تو وہ لوگ ہیں جو بات پہ مرجاتے ہیں

لُوٹ کر میرا سکوں اپنا بچا کر دامن
ٹھیرئیے میرے حضور! آپ کدھر جاتے ہیں

کیا خبر کون ہیں آتے ہیں کہاں سے یہ لوگ
جب گذرتے ہیں تو رستے بھی سنور جاتے ہیں

کوثر نیازی

محمد حیات خاں

زہرِ اجل ہے چشمۂ حیواں ترے بغیر
صبحِ وطن ہے شامِ غریباں ترے بغیر

کٹتے نہیں کسی طرح لمحاتِ زندگی
رُک سی گئی ہے گردشِ دوراں ترے بغیر

"دوزخ میں ڈال دے کوئی لے کر بہشت کو"
ہے دشمنِ سکوں سروساماں ترے بغیر

کیا اب حیات و موت کی قدریں بدل گئیں
کچھ لوگ زندہ ہیں غمِ جاناں ترے بغیر

تُو بھی عجیب چیز ہے اے ابتلائے دہر!
پُختہ نہ ہو سکا کوئی انساں ترے بغیر

اک روز میرے طالعِ بیدار آ ہی جا!
جینا ہے ایک خوابِ پریشاں ترے بغیر

اے رحمتِ تمام! نگاہِ کرم ادھر
کیسے کٹے گا عرصۂ زنداں ترے بغیر

کسریٰ منہاس

غلام حسن

کہیں بھی خیر نہیں اپنے آشیانے کی
یہ کہہ رہی ہے پریشاں ہوا زمانے کی

جو رُودہیں جھیل چکیں سختیاں زمانے کی
تلاش اُن کو بھی ہے اب مرے فسانے کی

شگوفے باغ میں پھولے نہیں سماتے ہیں
خبر بہار نے دی ہے یہ کس کے آنے کی

جو سمجھے جورِ حوادث کو زندگی کا نشاں
مٹا سکیں اُسے کیا گردشیں زمانے کی

یہ بے بسی کا ہے عالم کہ کچھ نہیں معلوم
کشش کہاں لیے جاتی ہے آب و دانے کی

ذرا میں عمرِ گذشتہ سے پوچھ لوں تو کہوں
مجھے تو یاد نہیں تلخیاں زمانے کی

ہمارے سامنے سب کچھ ہے مثلِ آئینہ
"قسم نہ کھاؤ ضرورت نہیں بہانے کی"

بتا نہ دو انہیں کسریٰ! کہ یہ زبان نہیں
سند جو ڈھونڈتے پھرتے ہیں نغمہ گانے کی

تبسّم

ʼ ، ؛

عبدالرشید

غمِ دل کو عطائے دلبراں کہنا ہی پڑتا ہے
بمجبوری زمیں کو آسماں کہنا ہی پڑتا ہے

حقیقت میں ہم اپنے حال سے خود بھی نہیں واقف
مگر یاروں کو اپنے رازداں کہنا ہی پڑتا ہے

یہ مانا منتشر تنکے چمن میں بے حقیقت ہیں
انہیں ترتیب دے کر آشیاں کہنا ہی پڑتا ہے

فنا کر دے حواس و ہوش کو جس حُسن کا جلوہ
تکلم ساتھ دے تو اس کو بیاں کہنا ہی پڑتا ہے

دروغِ مصلحت آمیز ہے مجبور کا مذہب
یہاں ظالم کو اکثر مہرباں کہنا ہی پڑتا ہے

پیا جاتا ہے خونِ مزدور کا بزمِ امارت میں
مگر اس کو شرابِ ارغواں کہنا ہی پڑتا ہے

تبسّم! بادشاہی حرص و خواہش کی غلامی ہے
غلامِ نفس کو شاہِ زماں کہنا ہی پڑتا ہے!

ضیا جعفری

سید عنایت علی شاہ

فضا میں پھیلتے جاتے ہیں رات کے سائے
خدا کرے کوئی گاتی ہوئی سحر آئے

اک ایسا دور بھی آیا ہے درد مندوں پر
فقط خوشی کے تصور سے اشک بھر آئے

تبسمِ لبِ شیریں کہ جاگ اُٹھیں کلیاں
پیامِ زیرِ لب ایسا کہ پھول مسکائے

ہم اپنی بیکسیٔ غم پہ شب بہت روئے
کھلی جو چاندنی تم بار بار یاد آئے

بہارِ نو کی حکایت ہے لالہ زاروں میں
شرارِ گل سے نہ دامن ترا بھڑک جائے

یہ شبنمی سا بدن پیرہن کے سائے میں
کہ جیسے چاند کسی جھیل میں اُتر آئے

یہ کارواں بھی ہراساں ہے رات بھی تاریک
جو تیرگی ہو مسلسل کوئی کدھر جائے

ولی

سید شاہ ولی الرحمٰن کاکوی (بہاری)

حسن صبیح ہے غضب قہر ہے گیسوئے دراز
خالِ سیاہ ہے ستم فتنہ ہے چشمِ سحر ساز

نعمتِ لازوال ہے عشق نے کر دیا غنی!
جان ہے وقفِ بیخودی، دل ہے رہینِ سوز و ساز

اشک فشاں ہے چشمِ زار در پہ ہوں تیرے سجدہ بار
مذہبِ عشق میں یہی اپنا وضو ہے اور نماز

برق بھی بے قرار ہے ہائے رے تیری شوخیاں
حشر بھی پائمال ہے اُف رے ترا خرامِ ناز

دیر میں وُہ حرم میں وُہ مسجد و مے کدہ میں وُہ
عالمِ عشق میں نہیں فرقِ حقیقت و مجاز

میری جبینِ سجدہ ریز بن گئی جزوِ خاکِ در
تو بھی ہوئی نہ ملتفت تیری ادائے بے نیاز

شاہ و گدا کی کیا تمیز مسلکِ حُسن و عشق میں
ہے دلِ غزنوی یہاں بستۂ گیسوئے ایاز

آخرِ شب ہے اے ولی اور وُہ محوِ خواب ہیں
اپنا فسانۂ الم ختم کر اب زباں دراز

اختر اورینوی

پروفیسر اختر احمد

پہلے تو بہت نادان تھے وہ اب اُن کی شرارت کیا کہیے
اُس شوخ ادا کی باتوں میں جملوں کی لطافت کیا کہیے

تم تم کے وہ رونا آنکھوں کا اور زخمِ جگر کا ہنس دینا
آنا وہ تصور میں اُن کا اور چپکے سے رخصت کیا کہیے

ہوتے وہ مرے کیا کہنا تھا حاصل نہ ہوا مجھ کو یہ شرف
کیا راز ہوا فاش الفت کا اب حرفِ محبت کیا کہیے

اختر بھی تڑپتا ہے تیری چاہت کی کہانی کوشش کر
دکھ درد یہ سب کے سہتا ہے شاعر کی بھی حالت کیا کہیے

جگر

سید شاہ نصیرالدین (بہاری)

اس قدر میں سب کی نظروں میں جو بے توقیر ہوں
بانگِ بے ہنگام ہوں یا آہِ بے تاثیر ہوں

وہ ملا دل آہ جو کھلنے نہ پائے گا کبھی
گلشنِ ہستی میں گویا غنچۂ تصویر ہوں

زندگی بھر لاکھ تم دامن بچاتے ہی چلے
خاک ہو کر اب یہ ہمت ہے کہ دامنگیر ہوں

کیوں مٹاتا ہے فلک کیا دیکھتا سنتا نہیں
صانعِ قدرت کی میں اک بولتی تصویر ہوں

کوئی کتنا ہی جگائے ہوں گا اب بیدار خاک
بختِ خفتہ یعنی میں سوئی ہوئی تقدیر ہوں

تمنّا عمادی

مولانا محی الدین مجیبی (پھلواروی)

○

جس گلی سے لوگ لائے تھے بصد مشکل مجھے
لو وہیں پھر لے چلا کم بخت میرا دل مجھے

رُخ تو میرا پھیر دے لے موجِ دریا اِس طرف
دور ہی سے کچھ کہے شاید لبِ ساحل مجھے

خاک تو مَیں ہوں مگر خاکسترِ پروانہ ہوں
جانئے اک یادگارِ گرمیٔ محفل مجھے

ناتواں ہوں کس طرح دوڑوں ذرا نغمہ ساربان
کچھ اشارے کر رہا ہے پردۂ محمل مجھے

جاگتے میں کون آتا دل ہی کتنا چور کا
حشر پہنچا دیکھ کر سویا ہوا غافل مجھے

لوگ کرتے ہیں تمنّا کس لئے کسبِ ہنر
اتنی تحصیلِ ہنر سے کیا ہوا حاصل مجھے

محمود عالم وفا

○

ٹھہر جا اے دلِ مضطر ذرا آہ و فغاں کر لوں
نگہ جب ظلم پرور ہے خلش کو بھی جواں کر لوں

غلط ہے جستجوئے آستاں اے غیرتِ سجدہ
مزہ جب ہے کہ پیدا ہر جگہ اک آستاں کر لوں

بہار آئی کھلے غنچے، ہنسائی کونپلیں پھوٹیں
مگر اتنی کہاں فرصت کہ سیرِ بوستاں کر لوں

بڑے صنّاعِ عالم ہو بڑے مختارِ مطلق ہو
مٹا دو دستِ قدرت سے مرے دستِ پریشاں کو

زہے قسمت یہیں موجود ہر سامانِ وحشت ہے
جنوں میں کس لئے گھر چھوڑ کر جاؤں بیاباں کو

تمہاری بے بسی پر خود مجھے اب رحم آتا ہے
بڑھے ناوک فگن نکلے نکالو نوکِ پیکاں کو

شمس منیری

پروفیسر حافظ شمس الدین

○

رے غم الم کو نہ پوچھئے مجھے چین ہے نہ قرار ہے
نہ خزاں رسیدہ ریاضِ دل مجھے کیا امید بہار ہے

ے ڈھیر خاک کا جان کے نہ مٹا کہ پھر نہ ملے گا یہ
بہ نشانِ راہ ہے یہ کسی راہ رو کا مزار ہے

جو جلائے تجھ کو تو آگ ہے جو دکھائے راہ تو روشنی
فقط ایک فرقِ مجاز ہے وہی نور ہے وہی نار ہے

ہو غم نصیب اسے یا خوشی، رہی شمس حالتِ دل وہی
ہیں وہ ریاض ہے واقعی کہ خزاں بھی جس کی بہار ہے

غم نہیں حسرت نہیں وحشت نہیں
وہ بھی کیا دل جس میں کیفیت نہیں

درد دل کہنے کی طاقت تھی کبھی
اور اب سننے کی بھی طاقت نہیں

کیا کرے گا کوئی عزت آپ کی
آپ اپنے دل میں جب عزت نہیں

ہے غزل میں شمس اک لطفِ زباں
اس میں مضموں کی اگر وسعت نہیں

بیدل

پروفیسر عبدالمنان

○

جھکی کس آستانے کی زمیں پر
نشاں خنجر کا ہے اپنی جبیں پر

لبوں پر آگیا آخر تبسم
نہ زور ان کا چلا چین جبیں پر

وہ دل جو تھا حریفِ شوخیٔ ناز
ہوا قربان چشمِ سرمگیں پر

یہ الزام مصیبت تیرا ناصح
غلط ہے عشقِ راحت آفریں پر

کہا کس نے کہ میں مایوس لوٹا
غبار آستاں تو ہے جبیں پر

کیا جس وقت ضبطِ نالہ بیدل
قیامت ہو گئی قلبِ حزیں پر

منیر نیازی

○

یہ لڑکی جو اس وقت سرِ بام کھڑی ہے
اُڑتا ہُوا بادل ہے کہ پھولوں کی لڑی ہے

شرماتے ہوئے بندِ قبا کھولے ہیں اس نے
یہ شب کے اندھیروں کے مہکنے کی گھڑی ہے

اک پیرہنِ سُرخ کا جلوہ ہے نظر میں
اک شکل نگینے کی طرح دل میں جڑی ہے

کھلتا تھا کبھی جس میں تمنا کا شگوفہ
کھڑکی وُہ بڑی دیر سے ویران پڑی ہے

طاؤس کی آواز سے روشن ہے شبِ تار
صد نغمۂ ناہید یہ ساون کی جھڑی ہے

بشیر منذر

○

آکے بادیدۂ تر جائیں گے / تجھ پہ کچھ تہمتیں دھر جائیں گے
موت لے جائیگی مہ پاروں کو / ہائے یہ لوگ بھی مر جائیں گے
کم ہوئیں وسعتیں ویرانوں کی / تیرے دیوانے کدھر جائیں گے
چشمِ لیلےٰ سے گرے ہیں تو کیا / دلِ مجنوں میں اُتر جائیں گے
درِ مے خانہ ذرا وا کردو / صورتِ دور گذر جائیں گے

دلِ بیتاب! کوئی بات نہیں
یہ زمانے بھی گذر جائیں گے

اُردو غزل اور متغزّلین

اِس مضمون کے دو حصّے ہیں :

پہلے حصّہ میں غزل پر جتنے ممتاز اہلِ قلم کی آرا مل سکی ہیں، انھیں یکجا کردیا ہے۔ مولانا حالؔی اور کلیم الدین احمد کے مضامین اس لیے مفصّل دے دیے ہیں کہ حالؔی نے پرانی غزل سے روگردانی کا نعرہ بلند کیا اور کلیم الدین احمد نے اسے نیم وحشی صنفِ سخن قرار دے دیا۔ بہرحال اس موضوع پر اتنی مخالف اور موافق آرا اکٹھی کر دی گئی ہیں کہ آپ بآسانی اردو غزل کے مستقبل کے بارے میں خود کوئی فیصلہ کریں گے۔

دوسرے حصّے میں تذکرہ نویسوں نے ممتاز شعرا کے بارے میں جو کچھ کہا تھا، اُسے بھی یکجا کردیا گیا ہے تاکہ شاعر کے بارے میں تمام ناقدین کی آرا کا ایک نظر میں علم ہو جائے۔

(ادارہ)

اُردو غزل اور متغزلین

حالی

(۱)

غزل میں جیسا کہ معلوم ہے کوئی خاص مضمون مسلسل بیان نہیں کیا جاتا۔ الا ماشاء اللہ۔ بلکہ ہر شعر میں جداگانہ خیالات الگ الگ بیتوں میں ادا کیے جاتے ہیں۔ اس صنف کا زیادہ تر رواج موجودہ حیثیت کے ساتھ اول ایران میں اور کوئی ڈیڑھ سو برس سے ہندوستان میں ہوا ہے۔ اگرچہ غزل کی بنا جیسا کہ لفظ غزل سے پایا جاتا ہے محض عشقیہ مضامین کے بیان پر رکھی گئی تھی مگر ایک مدت کے بعد وہ اپنی اصلیت پر قائم نہ رہی۔ ایران میں اور ہندوستان میں چند شاعر ایسے بھی ہوئے ہیں جنھوں نے غزل میں عشقیہ مضامین کے ساتھ تصوف اور اخلاق و مواعظ کو بھی شامل کر دیا ہے۔

اگرچہ اس لحاظ سے کہ غزل کی حالت فی زمانہ نہایت ابتر ہے وہ محض ایک بے سود اور ازکار رفتہ صنف معلوم ہوتی ہے۔ شاعر کو ہمیشہ طولانی مسلسل نظمیں لکھنے کا ہمیشہ موقع نہیں مل سکتا اور اس کی قوت تخیل ہر وقت یکساں نہیں رہ سکتی اس لیے بسیط خیالات جو وقتاً فوقتاً شاعر کے ذہن میں فی الواقع گزرتے ہیں یا تازہ کیفیات جو اس کے دل پر روزمرہ کسی واقعہ کو دیکھ کر یا کسی حالت کو دیکھ کر پیچ پیچ منکشف ہوں ان کے اظہار کا کوئی آلہ غزل یا رباعی یا قطعہ سے بہتر نہیں ہو سکتا۔ بعض خیالات جو دو مصرعوں میں بالکل یا زیادہ خوبی کے ساتھ ادا نہیں ہو سکتے قطعہ یا رباعی کے ذریعہ میں ظاہر کیا جا سکتا ہے اور چند بسیط خیالات جو ایک دوسرے سے کچھ تعلق نہیں رکھتے۔ وہ غزل کے سلسلہ میں بشرطیکہ ردیف اور قافیہ کی ناقابل برداشت قیدیں کسی قدر ڈھیلی کر دی جائیں منسلک ہو سکتے ہیں۔ ردیف اور قافیہ کی بابت اگر وقت نے مساعدت کی تو کسی موقع پر اپنی رائے ظاہر کریں گے۔ یہاں نفس غزل کے متعلق چند باتیں بیان کرتے ہیں۔

غزل کی اصلاح تمام اصناف سخن میں سب سے زیادہ اہم اور ضروری ہے۔ قوم کے لکھے پڑھے اور ان پڑھ سب غزل سے آشنا ہیں۔ بچے، جوان اور بوڑھے سب تھوڑا بہت اس کا چسکا رکھتے ہیں۔ وہ بیاہ شادی کی محفلوں میں اور وجد و سماع کی مجلسوں میں، لہو و لعب کی مجلسوں میں اور رنڈیوں میں برابر گائی جاتی ہے۔ اس کے اشعار ہر موقع اور ہر محل پر بطور سند یا تمثیل کلام کے پڑھے جاتے ہیں۔ جو لوگ کتب مطالعہ سے گھبراتے ہیں اور نثر یا نظم میں لمبے چوڑے مضمون پڑھنے کا دماغ نہیں رکھتے وہ بھی غزلوں کے دیوان شوق سے پڑھتے ہیں۔ غزل کے اشعار ہر شخص کو یاد ہو جاتے ہیں، کوئی کلام یاد نہیں ہو سکتا کیونکہ اس میں ہر مضمون دو مصرعوں پر ختم اور سلسلۂ بیان منقطع ہو جاتا ہے۔ پس جو صنف قوم میں اس قدر رائج ہو اور جو مرغوب خاص و عام ہو اس کا اثر قومی مذاق اور قومی اخلاق پر جس قدر پڑ سکتا ہے ظاہر ہے۔ اسی لیے ہمارے نزدیک شعراء کو سب سے پہلے غزل کی اصلاح کی طرف متوجہ ہونا چاہیے۔ لیکن غزل کی اصلاح جس قدر ضروری ہے اسی قدر دشوار بھی

یہ جو عام دلچسپی ہے اصلاح کے بعد اس کا قائم رہنا نہایت مشکل ہے۔ جو کان ٹھپے ٹھمری سے مانوس ہو جاتے ہیں وہ دھرپت اور خیال سے لذت نہیں اٹھا سکتے۔ داستان سننے والوں کی پیاس تاریخی واقعات سے ہرگز نہیں بجھ سکتی۔ بوالہوسی اور کامجوئی کی باتوں میں جو مزہ ہے وہ عشق و محبت میں ہر شخص کو حاصل نہیں ہو سکتا۔ اوباش والواط کی بولی ٹھولیوں میں جو چٹخارہ ہے وہ سنجیدہ باتوں میں کسی بے حس ہی کو محسوس ہو سکتا ہے۔ یہی مذاقوں پر غزل و معاشرہ کا رنگ چڑھ جاتا ہے جہاں پر حکمت اور اخلاق کا منتر کارگر نہیں ہوتا۔ جو لوگ سُرمہ کاجل کنگھی چوٹی پر فریفتہ ہیں وہ فانی کی حقیقت تک کیونکر پہنچ سکتے ہیں لیکن زمانہ با آواز بلند کہہ رہا ہے کہ یا عمارت کی ترمیم ہو گی یا عمارت خود نہ ہو گی۔

غزل کو جن لوگوں نے چمکایا اور مقبول خاص و عام بنایا ہے یہ وہ لوگ تھے جو آج تک اہل اللہ اور صاحب باطن یا کم سے کم اسی کا راگ گانے والے سمجھے جاتے ہیں جیسے سعدی، رومی، خسرو، حافظ، عراقی، مغربی، احمد جام اور جامی وغیرہم۔ ان بزرگوں سے پہلے غزل کی طرف زیادہ اعتنا نہیں پایا جاتا۔ ہم نے حیات سعدی میں کسی موقع پر بیان کیا ہے کہ ان کی غزل کا موضوع جیسا کہ ظاہر الفاظ سے مفہوم ہوتا ہے عشق مجازی نہ تھا بلکہ وہ حقیقت کو مجاز کے پردہ میں ظاہر کرتے یا یوں کہو کہ چھپاتے تھے۔ ان کے ایک ایک لفظ سے پایا جاتا ہے کہ وہ عشق و محبت کے رنگ میں شرابور تھے۔ ان کے کلام میں ضرور کوئی ایسی چیز ہے جس کو روحانیت کے ساتھ تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ ان کی غزل سن کر دنیا کی بے ثباتی اور بے اعتباری کا سماں دل پر چھا جاتا ہے۔ وہ خال و خط کا ذکر اس طرح کرتے ہیں جس سے شاہد پرستی کی ترغیب نہیں بلکہ دنیا پرستی سے نفرت ہوتی ہے۔ وہ شراب کی بدمستی کو دنیادار مکاروں کی ہوشیاری سے بہتر بتاتے ہیں۔ وہ رندی و بدنامی و رسوائی کو سوفیوں کی دلق طمع اور زاہدوں کے زہد ریائی پر ترجیح دیتے ہیں۔ وہ کوئی گناہ مکر و ریا سے، کوئی حماقت غرور مال و جاہ سے، کوئی شرک خود پرستی و نفس پرستی سے اور کوئی دھوکا دنیا سے بڑھ کر نہیں بتاتے۔ ان کا کوئی کلام اثر سے خالی نہیں اور اس سے ظاہر ہے کہ انھوں نے جو کچھ کہا ہے وہ ان کے دل سے نکلا ہے۔

ان لوگوں کی غزل گوئی بعض حیثیتوں سے قوم کی موجودہ حالت کے مناسب نہ ہو لیکن وہ اس حالت کے بالکل مناسب تھی جبکہ زور تصدیا کو یا دنیا نے قوم کو شکار کر رکھا تھا۔ ان کے اشعار ان لوگوں کے حق میں تازیانہ کا حکم رکھتے تھے جو حب دنیا اور حب جاہ میں منہمک، خدا سے غافل اور بادۂ نخوت میں مدہوش تھے۔ ان سے ظالم، طماع، حریص اور بخیل عبرت حاصل کرتے تھے۔ وہ ریاکار زاہدوں، واعظوں اور صوفیوں کی قلعی کھولتے تھے۔ وہ سادہ لوح امیروں کو حیا ر فقیروں کے دام تزویر سے بچاتے تھے۔ وہ اہل اللہ اور ارباب صدق کو نفس امارہ کی چوریوں اور خیانتوں سے آگاہ اور متنبہ کرتے تھے۔

اُردو میں عام طور پر یہ رنگ تو ایک آدھ کے سوا کسی کی غزل میں کبھی پیدا نہیں ہوا لیکن عاشقانہ خیالات، نیچرل اور سادہ طور پر ادا کرنے والے غزل گویوں کے ہر طبقہ میں کم و بیش ہوتے رہے ہیں مگر افسوس ہے کہ اب یہ رنگ بھی روز بروز گھٹتا جاتا ہے الفاظ، صنعت اور خیالات میں رکاکت و سخافت روز بروز بڑھتی جاتی ہے۔ ہم بجائے اس کے کہ غزل گوئی کے موجودہ طریقہ پر نکتہ چینی کریں یہ زیادہ مناسب سمجھتے ہیں کہ عام طور پر اس کی اصلاح کے متعلق اہل وطن کی خدمت میں چند مشورے پیش کریں۔

(۱) غزل کے لیے یہ ایک ضروری سی بات قرار پا گئی ہے کہ اس کی بنا عشقیہ مضامین پر رکھی جائے اور حق یہ ہے کہ اگر غزل عشق و محبت کی چاشنی نہ دی جائے تو حالت موجودہ میں اس کا سرسبز اور مقبول رہنا ایسا ہی مشکل ہے جیسا شراب میں سرکہ بن جانے کے بعد قائم رہنا۔ لیکن اصل اور نقل میں آسمان و زمین کا فرق ہے جو کیفیت عشق میں ہے وہ نقش میں ہرگز پیدا نہیں ہو سکتی۔ جو غزلیں محض تقلیداً

کہی جاتی ہیں ان میں اتنا ہی اثر ہو سکتا ہے جتنا کہ ایک بھانڈ کی نقل میں جو مجنوں یا فرہاد بن کر مجلس میں آئے۔ اثر قائل اور سامعین کی حالت کا تابع ہے۔ اگر قائل اور سامع میں یا کم سے کم صرف قائل کے دل میں فی الواقع کوئی کیفیت موجود ہے تو اس کیفیت کا بیان ضرور مؤثر ہوگا۔ جو شخص فی الواقع مظلوم یا مصیبت زدہ ہے جب وہ اپنی سرگزشت بیان کرے گا ضرور اس کے بیان سے لوگوں کے دل پر چوٹ لگے گی لیکن اگر یہ بیان کسی ایسے شخص کی زبان سے سرزد ہوگا جس کی حالت خود اس کی تکذیب کرتی ہے تو اس سے سوائے اس کے کہ لوگوں کو ہنسی آئے اور کوئی اثر مترتب نہیں ہو سکتا۔ پس ایک پارسا نوجوان جس کو ہوا و ہوس کی کبھی ہوا تک نہیں لگی یا ایک ستر برس کا پیر مرد جس میں ابوالہوسی کی قابلیت نہیں رہی ان کو ہرگز زیبا نہیں معلوم ہوتا کہ غزل میں شاہد بازی اور ہوا پرستی کے مضمون باندھ کر بے وجہ اپنے اوپر بہتان باندھے اور دوسروں میں اپنے تئیں رسوا اور بدنام کرے۔

محبت کچھ ہوا و ہوس اور شاہد بازی و کامجوئی پر موقوف نہیں بندہ کو خدا کے ساتھ، اولاد کو ماں باپ کے ساتھ، ماں باپ کو اولاد کے ساتھ، بھائی بہن کو بھائی بہن کے ساتھ، خاوند کو بی بی کے ساتھ، بی بی کو خاوند کے ساتھ، نوکر کو آقا کے ساتھ، رعیت کو بادشاہ کے ساتھ، دوستوں کو دوستوں کے ساتھ، آدمی کو جانور کے ساتھ، مکین کو مکان کے ساتھ، وطن کے ساتھ، ملک کے ساتھ، قوم کے ساتھ، خاندان کے ساتھ، غرض کہ ہر چیز کے ساتھ لگاؤ اور دل بستگی ہو سکتی ہے۔ پس جبکہ عشق و محبت میں اس قدر عام اور جامعیت ہے اور جبکہ عشق کا اعلان کرنا عرفی اور معشوق کا پتہ بتانا سب بے غیرتی ہے تو کیا ضرور ہے کہ عشق کو محض ہوائے نفسانی اور خواہشِ حیوانی میں محدود کر دیا جائے اور ایسے سرِ مکتوم کو فاش کر کے اپنی تنگ ظرفی اور بے حوصلگی ظاہر کی جائے۔

اسی لیے ہمارے نزدیک بہتر ہے کہ غزل میں جو عشقیہ مضامین باندھے جائیں وہ ایسے جامع الفاظ میں ادا کیے جائیں جو دوستی اور محبت کی تمام انواع و اقسام اور تمام جسمانی اور روحانی تعلقات پر حاوی ہوں اور جہاں تک ہو سکے کوئی ایسا لفظ نہ آنے پائے جس سے کھلم کھلا مطلوب کا مرد یا عورت ہونا پایا جائے مثلاً کلاہ، چیرہ، دستار، جامہ، قبا، سبزہ و خط، مسیں بھیگنا، زرگر پسر، مطرب پسر، مغبچہ، ترسابچہ وغیرہ وغیرہ یا مثلاً کرتی، مہندی، چوڑیاں، چوٹی، موباف، آرسی، جھومر وغیرہ۔

اگرچہ (جیسا کہ حیاتِ سعدی کے خاتمہ میں ہم نے مفصل بیان کیا ہے) امرد کو مطلوب قرار دینا جو ایران اور ہندوستان کی شاعری میں مروج ہے یہ محض ایک غلط فہمی اور قومی حیثیت کے خیال پر مبنی ہے نہ کہ حقائق و واقعات پر، لیکن پھر بھی یہ ایک ایسا قبیح اور ناموافق دستور ہے جو قومی اخلاق کو داغ لگاتا ہے لہٰذا اس کو جہاں تک جلد ممکن ہو ترک کرنا چاہیے اور اس بات کا خیال بالکل چھوڑ دینا چاہیے کہ ایران اور ہندوستان کے تمام شعرائے نامور اسی طریقہ پر غزل لکھتے چلے آئے ہیں۔ ہر زمانہ کا اقتضا الگ ہوتا ہے۔ جو فحش اور بے حیائی کی باتیں ایران اور ہندوستان کے بڑے بڑے شاعروں کے کلام میں موجود ہیں، اگر ہم آج ویسی باتیں ان کی تقلید کریں تو قانوناً مجرم ٹھہرتے ہیں۔ پس جہاں ہم نے ان کی بہت سی خرافات مواخذۂ عدالت کے خوف سے چھوڑی ہیں ان کی ایک اور خرافت محض عقل اور اخلاق کے حکم سے بھی چھوڑنی چاہیے۔

اسی طرح غزل میں ایسے الفاظ استعمال کرنے جو عورتوں کے لوازمات اور خصوصیات پر دلالت کریں اس قوم کی حالت کے بالکل نامناسب ہیں جو پردہ کے قاعدہ کی پابند ہو۔ کیونکہ اگر معشوق کوئی منکوحہ یا مخطوبہ ہے تو اس کے حسن و جمال کی تعریف کرنی اور اس کے کرشمہ و ناز و انداز کی تصویر کھینچنی گویا اپنے ننگ و ناموس کو اپنوں اور پرایوں سے آشکارا و تشہیر کرنا ہے اور اگر کوئی بازاری بیسوا ہے تو اپنی بد اخلاقی یا بدچلنی کا ڈھنڈورا پیٹنا ہے۔ اسی بنا پر ایران میں جتنے متانت اور برگزیدہ اور اعلیٰ درجے کے غزل گو گزرے ہیں ان کی غزل میں عورتوں کی خصوصیات کم پائی جاتی ہیں کہ گویا بالکل نہیں ہیں اور یہی بات اب تک ہندوستان میں بھی موجود ہے کہ گو غزل میں مطلوب کبھی مرد کو اور کبھی عورت کو قرار دیتے

و مرد کی اور کبھی عورت کی خصوصیات کا بھی ذکر کرتے ہیں لیکن کبھی مطلوب کے لیے افعال یا صفات مؤنث نہیں لاتے بلکہ ہمیشہ مذکر لاتے ہیں۔ یوں کبھی نہیں کہتے کہ وہ روزنِ دیوار سے جھانکتی تھی، یا وہ پری جامہ اوڑھ لے گئی، یا وہ آرسی میں منہ دیکھتی تھی، یا وہ بال سلجھا رہی تھی، یا وہ صورت کی متوالی ہے، یا وہ عاشق کا دل جلانے والی ہے، بلکہ ایسی حالتوں میں بھی افعال و صفات ہمیشہ مذکر ہی لاتے ہیں حالانکہ مقام تانیث متقضی ہوتا ہے۔ مثلاً ذوق کہتے ہیں ؎

جھانکتے تھے وہ ہمیں جس روزنِ دیوار سے
وائے قسمت ہو اسی روزن میں گھر زنبور کا

یا امانت لکھنوی کہتے ہیں ؎

شانوں میں وہ پری زلف کو شانا کیا کرتا   مو شگافوں کو گرفتار بلا کیا کرتا

غرض کہ کسی اردو غزل گو نے معشوق کے لیے جہاں تک کہ ہم کو معلوم ہے فعل یا صفت مذکر (اصل، مؤنث) استعمال نہیں کی۔

اگر معشوق کو اطلاق کی حالت پر چھوڑ دیا جائے اور کوئی خصوصیت رجال یا نساء کی غزل میں ذکر نہ کی جائے تو اس صورت میں افعال و صفات کا مذکر لانا بالکل قاعدہ کے موافق ہوگا۔ تمام دنیا کی زبانوں میں یہ قاعدہ عام معلوم ہوتا ہے کہ جب کوئی حکم مطلق انسان کی نسبت لگایا جاتا ہے اور مرد یا عورت کی تخصیص مقصود نہیں ہوتی تو گو نوعِ انسان میں ذکور و اناث دونوں داخل ہیں مگر اس حکم کا موضوع ہمیشہ فردِ کامل یعنی مذکر قرار دیا جاتا ہے نہ مؤنث۔ مذہب میں، فلسفہ میں، طب میں، اخلاق میں اور تمام علوم و قوانین میں یہی قاعدہ عموماً جاری ہے لیکن معشوق کبھی چہرہ یا قبا یا سبزۂ خط کے ساتھ اور کبھی چوٹی، مو باف، آرسی اور چوڑیوں کے ساتھ ذکر کرنا اور باوجود اس کے افعال و صفات کو ہمیشہ مذکر لانا اس کے یہ معنی ہوں گے کہ معشوق نہ مرد ہے اور نہ عورت بلکہ زنانہ ہے یا ہیجڑا۔

ایسے اشعار جن میں عشق کا بیان ایسے لفظوں میں کیا گیا ہو جو محبت کے عام مفہوم پر حاوی ہوں یا جو محض عشقِ روحانی یا عشقِ الٰہی پر محمول ہو سکیں اور جن سے مطلوب کا مرد یا عورت ہونا مطلقاً نہ پایا جاتا ہے، کیا فارسی اور کیا اردو دونوں زبانوں کی غزل میں بکثرت موجود ہیں۔ خصوصاً شعرائے متصوفین کے کلام میں زیادہ تر اسی قبیل کے اشعار پائے جاتے ہیں۔ پس غزل میں ہمیشہ کے لیے ایسا التزام کرنے کی کوشش کرنی کوئی ایسی بات نہیں ہے جس کو تکلیف مالایطاق سمجھا جائے۔

(۲) جس طرح عشقیہ مضامین غزل کے خمیر میں داخل ہیں، اسی طرح خمریات یعنی شراب اور اس کے لوازمات کا ذکر اور زہد و زہاد اور تمام اہلِ ظاہر پر طعن و تعریض کرنی، اپنی مے خوری و توبہ شکنی و خرابات نشینی پر فخر کرنا اور اہلِ شرع اور اہلِ تقویٰ کے اعمال و اقوال میں عیب نکالنے اور اسی قسم کی اور باتیں جو عقل و شرع کے خلاف ہوں، یہ مضامین بھی غزل کے اجزائے غیر منفک قرار پا گئے ہیں۔ سب سے پہلے غزل میں یہ طریقہ شعرائے متصوفین نے جو اہل اللہ اور صاحبِ باطن سمجھے جاتے ہیں اختیار کیا تھا جیسے سعدی، رومی، حافظ اور خسرو وغیرہم۔ چونکہ ان بزرگوں کی غزل نے ایران اور ہندوستان میں زیادہ رواج اور حسنِ قبول پایا اور خاص کر خواجہ حافظ کی غزل جس میں ان مضامین کی مقدار سب سے بڑھ کر ہے حد سے زیادہ مشہور و مقبول ہوئی اس لیے متاخرین نے بھی ان کی تقلید سے یہی شیوہ اختیار کر لیا مگر ہم کو دیکھنا چاہیے کہ ان بزرگوں نے جو ایسے مضامین باندھنے میں اس قدر غلو کیا ہے اس کا منشا کیا تھا۔

فقہا اور اہلِ ظاہر ہمیشہ دو فرقوں کے سخت مخالف رہے ہیں۔ ایک اہلِ باطن کے دوسرے اہلِ سماع کے۔ فقہا کے فتووں سے

ان دونوں گروہوں کو ہمیشہ سخت نقصان پہنچتے رہے ہیں۔ قتل کیے گئے ہیں، دار پر چڑھائے گئے ہیں، مشکیں بندھی ہیں، کوڑے کھائے ہیں، قیدیں بھگتی ہیں، جلاوطن کیے گئے ہیں، کتابیں جلائی گئی ہیں اور کیا کیا کچھ ہوا ہے جب کہ فقہا کی مخالفت کا ان لوگوں کے ساتھ یہ حال تھا تو بھی اپنی تصنیفات میں نثر ہو یا نظم خوب دل کے بخارات نکالتے تھے بقول شخصے "کسی کا ہاتھ چلے کسی کی زبان" فقہا و واعظین ان کے اقوال و افعال پر گرفت کرتے تھے انھوں نے ان کے اخلاق کی قلعی کھولنی شروع کی۔ وہ کہتے تھے کہ یہ لوگ خلافِ شرع کام کرتے ہیں انھوں نے کہا شراب خوری، قمار بازی جو اکبر الکبائر ہیں وہ بھی جو فروشی و گندم نمائی سے بہتر ہیں۔ وہ کہتے تھے کہ یہ لوگ خلافِ شرع باتیں کہتے ہیں، انھوں نے کہا صلاحیہ کفر بکنا اس سے بہتر ہے کہ دل میں کفر ہو اور زبان پر اسلام۔ وہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرتے تھے انھوں نے کہا کہ اوروں کو ہدایت کرنے اور آپ گمراہ۔ بخے سے بڑھ کر کوئی گناہ نہیں۔ وہ کہتے تھے کہ تم حقوق الٰہی ادا نہیں کرتے انھوں نے کہا زہد فروشی جاہ دین زیادت کرتے ہو۔ الغرض شعرائے متصوفین نے جو اہلِ ظاہر پر خردہ گیریاں کی ہیں وہ اسی قسم کی تعریضات اور مطارحات ہیں۔

اس کے سوا ان لوگوں کی غزل میں اکثر شراب و ساقی و جام، صراحی اور ان کے لوازمات اور خلافِ شرع الفاظ مجاز اور استعارے کے طور پر استعمال ہوتے ہیں۔ یہ لوگ ایا تو اس خیال سے کہ دوست کا راز اغیار پر ظاہر نہ ہو یا اس نظر سے کہ لوگوں کا حسنِ ظن جو بہترین حقیقت ہے اس سے محفوظ رہیں یا اس لیے کہ عشق و محبت کی بطر اس آزادانہ اور رندانہ گفتگو میں بہ نسبت سنجیدہ اور مؤدب گفتگو کے خوب کھلتی ہے اور یا اس غرض سے کہ سوفیوں کو چھیڑ چھیڑ کر اور زیادہ بھڑکائیں اور ان کی زجر و ملامت جو بےگناہ ملزموں کو تحسین و آفریں سے زیادہ خوشگوار ہوتی ہے ہمیشہ سے لے کر سہیں روحانی کیفیات کو شراب و شاہد کے پیرایہ میں بیان کرتے تھے۔ سب سے اخیر درجہ کا ثبوت مولانا روم کی اس رباعی سے ہوتا ہے ؎

دی بر سرِ کوئے زلہ غارت کردم | مر پاکاں را جذب زیارت کردم
شکرانۂ آنکہ روزہ خوردم ز رمضان | در عید نماز بے طہارت کردم

شاہ ولی اللہ صاحب نے اس رباعی کی شرح لکھی ہے۔ وہ کہتے ہیں رمضان میں روزے کھانے کے یہ معنے ہیں کہ جب مجاہدہ سے مشاہدہ تک نوبت پہنچ گئی تو ریاضت ترک کر دی گئی اور نماز بے طہارت سے یہ مراد ہے کہ جب وصل کی عید میسر آ گئی اور جمالِ یار کا اب جا... اب حضوری ہے کیفیت جو کہ حقیقتِ صلوٰۃ ہے ہر وقت رہنے لگی۔ یہاں تک کہ ظاہری طہارت اور عدم طہارت اور جاگتے اور سوتے غرض کہ ہر حالت میں دولتِ حضوری موجود ہے۔ خواجہ حافظ کا یہ شعر بھی اسی قبیل کا ہے ؎

پیر ما گفت خطا در قلم صنع نہ رفت
آفریں بر نظرِ پاک خطا پوشش باد

دوسرے مصرع میں خطا پوش کے لفظ سے قلمِ صنع کی خطا پوشی کا خیال ذہن میں گزرتا ہے مگر فی الحقیقت یہ مطلب نہیں ہے بلکہ انسان کی عیب پوشی مقصود ہے کیونکہ قلمِ صنع میں کبھی خطا نہ ہونے کے یہ معنی ہیں کہ جو کچھ اس نے لکھ دیا ہے وہ اٹل ہے اور اس سے انسان کا مجبور ہونا اور اس لیے اس کا بے خطا ہونا ثابت ہوتا ہے۔

مذکورہ بالا اشعار سے صاف پایا جاتا ہے کہ یہ بزرگوار قصداً ایسے الفاظ برتتے تھے جن سے اہلِ ظاہر کو نکتہ گیری کرنے کا موقع ملے۔ اسی لیے مولانا روم فرماتے ہیں ؎

خوشتر آں باشد کہ سرِّ دلبراں		گفتہ آید در حدیثِ دیگراں

ان بزرگوں کے سوا بعض شعرا ایسے بھی گذرے ہیں جو فی الواقع شراب پینے کے عادی تھے اور نشہ یا خمار کی حالت میں جو کیفیت ان کے دل پر گذرتی تھی یا جو اثر ان کی طبیعت یا اخلاق پر ہوتا تھا اس کو شعر میں بیان کرتے تھے۔ چونکہ شاعری کا جزوِ اعظم (جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا ہے) یہ ہے کہ اس میں جو خیال باندھا جائے اس کی بنیاد اصلیت پر ہونی چاہیے اس لیے اصولِ شاعری کے موافق شراب و کباب کے مضمون باندھنا صرف ان لوگوں کا حق ہونا چاہیے جو یا تو خود اس میدان کے مرد ہوں، یا اپنے اصلی خیالات خمریات کے پیرایہ میں بطور مجاز و استعارہ کے ادا کر سکتے ہوں ورنہ وہ قدما کے ایسے ہی مقلد سمجھے جائیں گے جیسا بندر انسان کا ہوتا ہے۔ نیز واعظ و زاہد وغیرہ کو تاڑنا اور ان پر نکتہ چینی کرنی انہی لوگوں کو زیبا ہے جن کو فی الواقع ان کے ساتھ کوئی وجہ مخالفت کی ہو۔ ہاں باوجود نہ ہونے کسی قسم کی مخالفت کے صرف ایک صورت سے واجبی طور پر ایسے مضامین باندھے جا سکتے ہیں یعنی نکتہ چینی ایسے طریقہ سے کی جائے جس سے معلوم ہو کہ محض ریا و مکر و سالوس کی برائی بیان کرنا منظور ہے نہ کہ زہاد اور واعظین کی ذات پر حملہ کرنا۔ کیونکہ رذائل کی برائی اور فضائل کی خوبی بغیر اس کے دل نشین نہیں کی جا سکتی کہ کسی شخص یا گروہ کو ان کا موضوع فرض کر لیا جائے اور معقولات کو محسوسات کے پیرایہ میں ظاہر کیا جائے۔ ظلم اور عدل کا بیان واضح طور پر اسی طرح ہو سکتا ہے کہ ظالم یا منصف بادشاہ کی مذمت یا تعریف کی جائے اور نامردی یا بہادری کی تصویر یوں ہی دکھائی جا سکتی ہے کہ ان کو کسی بزدل یا بہادر کے قالب میں ڈھالا جائے لیکن اس صورت میں ضرور ہے کہ واعظ و زاہد وغیرہ کی کسی ایسی صفت کی طرف جو عقلاً یا شرعاً قابلِ الزام ہو کھلا اشارہ کیا جائے ورنہ کہا جائے گا کہ نیکوں پر نہ اس لیے کہ وہ قابلِ الزام ہیں بلکہ اس لیے کہ وہ نیک ہیں حملہ کیا جاتا ہے۔ یہاں بطور مثال کے ہم شیخ ابراہیم ذوق کے دو شعر لکھتے ہیں ؎

رندِ خراب حال کو زاہد نہ چھیڑ تو
تجھ کو پرائی کیا پڑی اپنی نبیڑ تو

اس شعر میں کسی قدر اس خصلت کی طرف اشارہ پایا جاتا ہے جو اکثر زاہدوں اور عابدوں میں ہوتی ہے کہ اوروں کو نذرانہ سے قصور پر ملامت کرتے ہیں اور اپنے ظاہری احکام کی پابندی پر مغرور رہ کر باطن کی اصلاح سے غافل بنتے ہیں لہٰذا اس طرزِ بیان پر کوئی اعتراض نہیں ہو سکتا مگر دوسری جگہ وہ اس طرح فرماتے ہیں ؎

زاہد زیبا ہے جو ہو ریشِ سفیدِ شیخ پہ
وسمہ آبِ بنگ سے مہندی مئے گلرنگ سے

اس شعر میں شیخ کا کوئی گناہ یا قصور سوا اس کے کہ شیخ شیخ ہے نہیں جتلایا گیا اور شعر میں اس کے سوا اور کوئی خوبی نہیں رکھی گئی کہ ایک مقدس بزرگ پر دو پھبتیاں کہہ کر لوگوں اور شرابیوں کی ضیافتِ طبع کی جائے۔ ایسے اشعار ہمارے شعرا کے کلام میں بکثرت پائے جاتے ہیں اور ایسے شعروں کو اگر ہم اپنے شعرا کا حد سے زیادہ ادب کریں تو مسخرگی اور سوقیانہ ہزلیات سے زیادہ وقعت نہیں دے سکتے۔

(۳) مذکورہ بالا مضامین کے سوا اور جس بات کا سچا جوش اور ولولہ دل میں اٹھے خواہ اس کا منشا خوشی ہو یا غم، یا حسرت، یا ندامت یا شکر، یا شکایت، یا صبر یا رضا، یا قناعت یا توکل، یا رغبت یا نفرت، یا رحم یا انصاف، یا غصہ یا تعجب، یا امید یا ناامیدی، یا شوق یا انتظار یا حبِ وطن یا قومی ہمدردی، یا رجوع الی اللہ یا حمایتِ دین و مذہب، یا دنیا کی بے ثباتی اور موت کا خیال یا کوئی اور جذبہ جذباتِ انسانی میں سے اس کا

غزل میں بیان کر سکتے ہیں۔

اگرچہ اصل وضع کے لحاظ سے غزل کا موضوع عشق و محبت کے سوا کوئی اور چیز نہیں ہے لیکن ہمارے شعرا نے اس کو ہر مضمون کے لیے عام کر دیا ہے اور اب بھی اس صنف کو محض مجازاً غزل کہا جاتا ہے۔ پس ہر قسم کے خیالات جو شاعر کے دل میں وقتاً فوقتاً پیدا ہوں وہ غزل یا رباعی یا قطعہ میں بیان ہو سکتے ہیں مگر یہ صحیح نہیں ہے کہ جو خیالات اگلوں نے زمانے کے اقتضا سے یا اپنے جذبات کے جوش میں ظاہر کیے ہیں ہم بھی وہی راگ گائے رہیں اور انھی کے خیالات کا اعادہ کرتے رہیں۔ نہیں بلکہ ہم کو چاہیے کہ اپنی غزل کو خود اپنے خیالات اور اپنے جذبات کا آئینہ بنائیں۔ ممکن ہے کہ اگلوں میں سے کسی نے دنیا کے لیے ہاتھ پاؤں مارنے اور کوشش کرنے کو عبث اور فضول بتلایا ہو لیکن ہمارے دل میں اس خیال کی حقارت ہو، یا انھوں نے اس کے برعکس پاؤں توڑ کر بیٹھنے کو نامردی اور بے غیرتی کی بات سمجھا ہو لیکن ہم میں سے کسی کے دل پر اس کے برخلاف حالت طاری ہو۔ دونوں صورتوں میں ہمارے منہ سے وہی صدا نکلنی چاہیے جو ہمارے دل سے اٹھی ہو۔ یہ بھی ممکن ہے کہ خود ہم پر ایک وقت ایسا گزرے کہ مثلاً کوشش و تدبیر ہم کو محض بے سود و لاحاصل معلوم ہو اور دوسرے وقت ہمارے ہی دل میں ایک ایسا جوش پیدا ہو کہ پہاڑ کو جگہ سے ہٹا دینے کا ارادہ کریں۔ ہم کو دونوں حالتوں کی تصویر اپنے اپنے موقع پر بے کم و کاست کھینچ دینی چاہیے۔ اس سے نہ صرف فطرت انسانی کے دقائق و غوامض اور جو انقلاب کہ اس کی طبیعت میں آناً فاناً پیدا ہوتے ہیں وہی منکشف ہوں گے بلکہ قومی اخلاق پر بھی عمدہ اثر ہوگا۔ کیونکہ جب تک ہر چیز کا اچھا اور برا دونوں پہلو نہ دکھلائے جائیں تب تک اعتدال کی خوبی جلوہ گر نہیں ہوتی۔ مثلاً صائب ایک جگہ لکھتے ہیں ؎

قناعت کن بہ نان خشک تا بے آرزو گردی
کہ خواہش ہائے الوانست نعمت لقمہ شاہاں را

دوسری جگہ یہی صاحب کہتے ہیں ؎

صرف بیکاری مگرداں روزگار خویش را
پردۂ روئے توکل ساز کار خویش را

ظاہر ہے کہ جب تک دونوں مختلف خیال ملحوظ نہ رکھے جائیں تب تک قناعت کا وہ درجہ جو تن آسانی اور حرص کے بیچوں بیچ واقع ہے حاصل نہیں ہو سکتا۔

شاید کسی کو یہ خیال ہو کہ اخلاقی مضامین سے غزل میں وہ گرمی پیدا نہیں ہو سکتی جو عشقیہ مضامین میں ہوتی ہے۔ جو اثر شوق و آمد اور درد جدائی اور کاہش انتظار اور رشک اغیار کے بیان میں ہے وہ واعظانہ پند و نصیحت میں ہرگز نہیں ہو سکتا۔ بے شک اخلاقی مضامین کو موثر پیرایہ میں بیان کرنا نہایت مشکل کام ہے اور بلاشبہ غزل جس میں سوز و گداز نہ ہو اور بچہ جو چلبلا اور چنچل نہ ہو دونوں میں کچھ کشش اور گیرائی نہیں ہوتی۔ لیکن ہمارے معاصرین کے لیے سوز و گداز کا اس قدر مصالحہ موجود ہے جو صدیوں تک ختم نہیں ہو سکتا۔ دنیا میں ایک انقلاب عظیم ہو رہا ہے اور ہوتا چلا جاتا ہے۔ آج کل دنیا کا حال صاف اس درخت کا سا نظر آتا ہے جس میں برابر نئی کونپلیں پھوٹ رہی ہیں اور پرانی ٹہنیاں جھڑتی چلی جاتی ہیں۔ تناور درخت زمین کی تمام طاقت چوس رہے ہیں اور چھوٹے چھوٹے تمام پودے جو ان کے گرد و پیش ہیں سوکھتے چلے جاتے ہیں پرانی قومیں جگہ خالی کرتی جاتی ہیں اور نئی قومیں ان کی جگہ لیتی جاتی ہیں اور یہ کوئی گنگا جمنا کی طغیانی نہیں ہے جو آس پاس کے دیہات کو دریا برد کر کے

رہ جائے گی بلکہ سمندر کی طغیانی ہے جس سے تمام کرۂ ارض پہ پانی پھرتا نظر آتا ہے۔ اگر کوئی دیکھے اور سمجھے تو صدہا تماشے صبح سے شام تک ایسے عبرت خیز نظر آتے ہیں کہ شاعر کی تمام عمر اس کی جزئیات کے بیان کرنے کے لیے کافی نہیں ہو سکتی۔ کسی واقعہ کو دیکھ کر افسوس ہوتا ہے کہ یہ کیوں ہوا؟ کبھی خوف معلوم ہوتا ہے کہ کیا ہوگا اور کبھی یاس دل پہ چھا جاتی ہے کہ بس اب کچھ نہیں۔ اس سے عجیب میٹیریل غزل کے لیے اور کیا ہو سکتا ہے۔ ہر بات کا ایک محل اور ہر کام کا ایک وقت ہوتا ہے۔ عشق و عاشقی کی ترنگیں اقبال مندی کے زمانہ میں زیبا تھیں۔ اب وہ وقت گیا۔ عیش و عشرت کی رات گزر گئی اور صبح نمودار ہوئی۔ اب کا لنگڑے اور بہاگ کا وقت نہیں رہا۔ اب جوگیے کی الاپ کا وقت ہے۔

اس کے سوا بڑے بڑے استادوں نے اکثر مسلسل غزلیں بھی لکھی ہیں جن میں ایک شعر کا مضمون دوسرے شعر سے الگ نہیں ہے بلکہ ساری ساری غزل کا مضمون اول سے آخر تک ایک ہے۔ ایسی غزلیں اگر کوئی لکھنی چاہے تو ان میں کسی قدر طولانی مضمون بھی بندھ سکتے ہیں مثلاً ہر ایک موسم کی کیفیت، صبح اور شام کا سماں، چاندنی رات کا لطف، جنگل یا باغ کی بہار، میلے تماشوں کی چہل پہل، قبرستان کا سناٹا، سفر کی روداد، وطن کی دلبستگی اور اسی قسم کی اور بہت سی باتیں مسلسل غزل میں بہت خوبی سے بیان ہو سکتی ہیں۔

الغرض غزل کو باعتبار زمین اور خیالات کے جہاں تک ممکن ہو وسعت دینی چاہیے، شعر کی لوگوں کو ایسی ضرورت نہیں ہے جیسی کہ بھوک میں کھانے کی ضرورت ہوتی ہے۔ انسان کو اگر ہمیشہ طرح بہ طرح کے کھانے میسر نہ آئیں تو وہ تمام عمر ایک ہی کھانے پر قناعت کر سکتا ہے لیکن شعر یا راگ میں جب تک تلون اور تنوع نہ ہو ان سے جی اکتا جاتا ہے۔ جو گویا صبح شام، رات اور دن بھیرویں ہی الاپے جائے اس کا گانا اجیرن ہو جاتا ہے۔ اسی طرح شعر میں ہمیشہ ایک ہی قسم کے مضامین سنتے سنتے نفرت ہو جاتی ہے ؎

مکرر گرچہ سحر آمیز باشد
طبیعت را ملال انگیز باشد

اگرچہ اس میں شک نہیں کہ جس طرح شعر میں جدت پیدا کرنی اور ہمیشہ نئے اور اچھوتے مضامین پر طبع آزمائی کرنی شاعر کا کمال ہے اسی طرح ایک ایک مضمون کو مختلف پیرایوں اور متعدد اسلوبوں میں بیان کرنا بھی کمال شاعری میں داخل ہے لیکن جب ایک ہی مضمون ہمیشہ نئی صورت میں دکھایا جاتا ہے تو اس میں تازگی باقی نہیں رہتی۔ ہر مضمون کے چند محدود پہلو ہوتے ہیں۔ جب وہ تمام پہلو ہو چکتے ہیں تو اس مضمون میں تنوع کی گنجائش نہیں رہتی۔ اب بھی اگر اسی کو پیٹتے چلے جائیں گے تو بجائے تنوع کے تکرار اور اعادہ ہونے لگے گا۔ بہروپیا دو چار روپ بھر کر لوگوں کو شبہ میں ڈال سکتا ہے مگر پھر اس کی قلعی کھل جاتی ہے۔ ہر کوئی اس کو دور ہی سے دیکھ کر پہچان لیتا ہے کہ بہروپیا ہے۔ ہم لوگ جب غزل لکھ کر مشاعرہ میں جاتے ہیں تو اپنے دل میں سمجھتے ہیں کہ ہم سب سے الگ اچھوتے مضمون باندھ کر لے چلے ہیں مگر غزل کو دیکھیے تو ٹھیک انگریزی مٹھائی کا عکس ہے کہ مٹھائیوں کی شکلیں مختلف ہیں لیکن مزا سب کا ایک ہے۔ فرض کرو کہ مختلف شکلوں کے متعدد سانچے تیار ہیں، کوئی مدور، کوئی مستطیل، کوئی مثلث، کوئی مربع، کوئی مسدس اور کوئی مثمن، اب ہر سانچے میں موم پگھلا کر ڈالو۔ ظاہر ہے کہ ہر سانچے سے موم نئی شکل پر ڈھل کر نکلے گا بعینہٖ ایسا ہی حال غزل کا ہے۔ مضمون وہی معمولی ہیں مگر بحر و ردیف و قافیہ کے اختلاف سے نئی صورتیں پیدا کر لیتے ہیں۔ ایک مشہور شاعر کا دیوان غزلیات اس وقت ہمارے سامنے موجود ہے۔ اس میں "چاک گریباں" کا مضمون مفصلہ ذیل صورتوں میں بندھا ہوا ہے:-

۱۔ اے جنوں گریباں تو چاک کر چکے، اب کیا کریں کوئی اور شغل بتا۔

۲ - لوگ پھر جامہ دری کرنے لگے اور ہمارا ہاتھ پھر گریبان تک جانے لگا۔

۳ - بہار کے دن قریب آ گئے سو گریبان خود بخود پھٹا جاتا ہے۔

۴ - اگر بہار میں میری پوشاک چھین لی جاتی تو جنوں پر نہ دامن نظر آتا نہ گریبان۔

۵ - اگر عقل کی پابندی نہ ہوتی تو ہم دامن اور گریبان سب پھاڑ ڈالتے۔

۶ - وہ ہاتھ چھڑا کر چلا گیا میں بھی اب گریبان کو پھاڑ کر چھوڑوں گا۔

۷ - اے جنوں ہم جدائی میں گریبان پھاڑتے ہیں تو ساری رات اس کے تار گنتا رہ۔

۸ - اس کی نظر پڑتے ہی ایسا دیوانہ ہوا کہ پیراہن چاک کر ڈالا۔

۹ - اس کی چست قبا کا دامن دیکھ کر گریبان پھٹتے ہیں۔

۱۰ - اے جنوں دامن کی طرح گریبان کے بھی لتے لے۔

۱۱ - دیکھیے ہم کب تک کپڑے پھاڑتے ہیں اور کب تک ہم کو جنوں سوسن کی طرح عریاں رکھتا ہے۔

۱۲ - اے جنوں اب جامہ دری مت کر ہم دامن کو پھاڑ کر کب تک گریبان میں رفو کرتے رہیں۔

۱۳ - بہار میں ہاتھ کیسے بیکار رہیں آؤ گریبان ہی چاک کریں۔

۱۴ - اے جنوں گریبان مجھ کو پھانسی سے بھی زیادہ تنگ کرتا ہے۔ اس کی دھجیاں اڑا دے۔

۱۵ - اے جنوں اب کے سال بہار میں گریباں کو ایسا چاک کر کہ کسی سے رفو نہ ہو سکے۔

۱۶ - تم تو ہاتھ سے دامن چھڑا کے نکل گئے ہم اپنا گریبان چاک کر کے نکل گئے۔

۱۷ - جنوں جو حد سے بڑھا تو گریباں چاک ہوئے۔ اس سے نکل گئے۔

۱۸ - مجھے چاک گریبانوں پہ حسرت آتی ہے کہ جیسے دامن صحرا کی طرف دوڑے جاتے ہیں۔

۱۹ - ہمارے ہاتھ جنوں کی بدولت دو رو پر ہیں کہ نئے نئے گریبان چاک ہوتے ہیں۔

۲۰ - اے جنوں میرے ہاتھوں سے کتنا تنگ ہوں۔ روز نئے گریبان کہاں سے لاؤں۔

۲۱ - اس کے عاشق ہمیشہ گریبان چاک رکھتے ہیں۔ گل کے گریبان میں کہیں بھی رفو ہے؟

۲۲ - بہار آئی اور جنوں پھر کپڑے پھاڑنے لگا۔ کتنے ہی گریبان چیتھڑے ہو ہو کر اڑ گئے۔

۲۳ - اے جنوں مجھ کو سودائے زلف کی قسم ہے جو گریبان کا ایک تار بھی بیکار جانے دے۔

جن دیوانوں سے یہ ایک مضمون کے ۲۳ اسلوب بیان نقل کیے ہیں یہ کچھ اوپر دو سو صفحے کا دیوان ہے۔ جب ایک مختصر دیوان کا یہ حال ہے تو اندازہ کیجیے تمام دیوانوں میں دیکھنا چاہیے کہ یہی ایک مضمون کتنی شکلوں میں باندھا گیا ہوگا اور اگر فارسی کے وہ اوہام بھی ان میں شامل کر لیا جائے تو میں خیال کرتا ہوں کہ اسی ایک مضمون کے اشعار سے کئی ضخیم جلدیں تیار ہو سکتی ہیں حالانکہ مضمون ایسا تنگ ہے کہ اس میں ایک دو اسلوب سے زیادہ گنجائش نہیں معلوم ہوتی۔ اسی سے قیاس ہو سکتا ہے کہ غزل کے وہ معمولی مضامین جن میں اس مضمون کی نسبت زیادہ پہلو نکل سکتے ہیں، ان کی کہاں تک نوبت پہنچی ہوگی جیسے جفائے یار، رشک اغیار، شب وصل، رنج ہجران، زلف پریشاں

زبان، بت پرستی، توبہ شکنی، رندی، بادہ خواری وغیرہ وغیرہ۔ اس میں بالکل مبالغہ نہیں معلوم ہوتا ہے کہ اگر تمام فارسی و اردو کی غزلیات کا
ہ کیا جائے اور مکررات کو چھوڑ کر محض اصل مضامین چھانٹے جائیں تو سو سوا سو صفحہ سے زیادہ کل مضامین کی مقدار نہ نکلے گی اور اگر یہ التزام
جائے کہ ہر ایک مضمون جتنے عمدہ پہلوؤں سے باندھا گیا ہو ان سب کو انتخاب کر لیا جائے تو بے شک اس سے کسی قدر مقدار بڑھ
ے گی مگر اکثر عمدہ پہلو قدما کے کلام میں نکلیں گے اور ان کے فضلات متاخرین کے کلام میں۔ یہی "چاک گریباں" کا مضمون جو متاخرین میں سے
سے نے ۴۲ طرح پر باندھا ہے، میر تقی کے ہاں اس طرح بندھا ہوا ہے ؎

اب کے جنوں میں فاصلہ شاید نہ کچھ رہے
دامن کے چاک اور گریباں کے چاک میں

مجھ کو ہرگز امید نہیں کہ متاخرین میں سے کسی نے اس سے بہتر "چاک گریباں" کا مضمون باندھا ہو۔
مذکورۂ بالا تقریر سے ہمارا یہ مطلب نہیں ہے کہ متاخرین قدما کے کلام سے کوئی بات اخذ نہ کریں اور جو مضمون وہ باندھ گئے
ب اس کو کسی پہلو سے نہ باندھیں یا اپنے باندھے ہوئے مضامین کا پھر اعادہ نہ کریں۔ کیونکہ اخیر اس کے نہ صرف شعر میں بلکہ ہر فن اور ہر
نعت میں کسی طرح کام نہیں چل سکتا۔ کعب ابن زہیر جو ایک مخضرمی شاعر اور آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا مداح ہے وہ کہتا ہے ؎

مَا اَرَانَا نَقُولُ اِلَّا مُعَارًا　　اَوْ مُعَادًا مِنْ قَوْلِنَا مَکْرُوْرًا

(یعنی ہم جو کچھ کہتے ہیں یا تو اوروں کے کلام سے لیتے ہیں یا اپنے ہی کلام کو بار بار دہراتے ہیں)
ب آج سے ساڑھے تیرہ سو برس پہلے شعرا کا ایسا خیال تھا تو ہم کیونکر کہہ سکتے ہیں کہ قدما کی خوشہ چینی سے ہم کو استغنا حاصل ہے یا ہم کو
ت ہے کہ کوئی مضمون ایک دفعہ باندھ کر پھر اس کا اعادہ نہ کریں۔

عربی میں دو متناقض مثلیں مشہور ہیں، ایک یہ ہے کہ:

کَمْ تَرَکَ الْاَوَّلُ لِلْاٰخِرِ　　(یعنی اگلے بہت کچھ پچھلوں کے لیے چھوڑ گئے ہیں)

دوسری یہ مثل ہے کہ

مَا تَرَکَ الْاَوَّلُ لِلْاٰخِرِ شَیْئًا　　(یعنی اگلوں نے پچھلوں کے لیے کچھ نہیں چھوڑا)

ان دونوں مثلوں میں تطبیق یوں ہو سکتی ہے کہ اگلے بہت سی ادھوری باتیں چھوڑ گئے ہیں تاکہ پچھلے ان کو پورا کریں لیکن انھوں نے
چھلوں کے لیے کوئی ایسی چیز نہیں چھوڑی جس کا نمونہ موجود نہ ہو۔
اس بات پر تمام قوم کا اتفاق ہے کہ پچھلا شاعر جو کسی پہلے شاعر کے کلام سے کوئی مضمون اخذ کرے اس میں کوئی ایسا لطیف اضافہ
دیں کر دے جس سے اس کی خوبی یا متانت یا فصاحت زیادہ ہو جائے وہ درحقیقت اس مضمون کو پہلے شاعر سے چھین لیتا ہے مثلاً
دی شیرازی کہتے ہیں ؎

اند ورطۂ ما خبر ندارد　　آسودہ کہ بر کنار دریاست

یہی مضمون کو خواجہ حافظ نے اس طرح ادا کیا ہے ؎

شب تاریک و بیم موج و گردابے چنیں حائل　　کجا دانند حال ما سبکباران ساحل ہا

ظاہر ہے کہ حافظ نے اس مضمون میں گویا اس کمی کو پورا کر دیا ہے جو شیخ کے بیان میں رہ گئی تھی۔ یہی کہا جا سکتا ہے کہ حافظ نے شیخ سے یہ مضمون چھین لیا اسی مطلب کو نظیری نے یوں تعبیر کیا ہے۔

به زیر شاخ گل افعی گزیده بلبل را　　　نواگران نخورده گزند را چه خبر

اگرچہ نظیری نے اصل مضمون پر کوئی ایسا اضافہ نہیں کیا جس کے لحاظ سے کہا جائے کہ خواجہ حافظ سے مضمون چھین لیا لیکن اس نے مضمون کو ایسے بدیع اسلوب میں ادا کیا ہے کہ بالکل ایک نیا مضمون معلوم ہوتا ہے۔

ایک روز خواجہ حافظ کا یہی شعر ایک موقع پر پڑھا گیا۔ ایک صاحب جو شعر کا صحیح ذوق رکھتے تھے یہ شعر سن کر بولے کاش دوسرے مصرع میں بھی اسی قسم کی مشکلات اور سختیوں کا بیان ہوتا جیسی کہ پہلے مصرع میں بیان کی گئی ہیں اور اس بات کا کچھ اظہار نہ کیا جاتا کہ بیدردوں کو ہمارے حال کی کیا خبر ہے تاکہ اپنے حال میں مبتلا ہونے اور غیر کے تصور سے ذہول (ذھول: اصل) ہونے کا زیادہ ثبوت ہوتا۔ میں نے غالب مرحوم کو یہ شعر پڑھا ہے

ہوا مخالف و شب تار و بحر طوفاں خیز　　　گسستہ لنگر کشتی و ناخدا خفت است

وہ یہ شعر سن کر پھڑک گئے اور کہا کہاں بس میرا یہی مطلب تھا۔ ان مثالوں سے یہ بات بخوبی ظاہر ہے کہ قدما کے کلام میں بعض اوقات کوئی کمی رہ جاتی ہے جس کو پچھلے پورا کر دیتے ہیں کبھی قدما ایک مضمون کو کسی خاص اسلوب میں محدود سمجھ لیتے ہیں۔ متاخرین اس کے لیے ایک نرالا اسلوب پیدا کر دیتے ہیں اور کبھی متاخرین قدما کے اسلوبوں میں سے ایک خوبی کم کر کے ایک دوسری خوبی بڑھا دیتے ہیں اور اس سے شاعری کو بے انتہا ترقی ہوتی ہے۔ پس یہ کیونکر ہو سکتا ہے کہ شاعر اپنے محدود فکر اور تخیل پر بھروسہ کر کے قدما کی خوشہ چینی سے دست بردار ہو جائے۔

شفائی صفاہانی یا متاخرین شعرائے ایران میں سے کوئی اور شخص غزل میں کہتا ہے ؎

مشاطہ را بگو کہ بر اسباب حسن دوست
چیزے فزوں کند کہ تماشا بما رسید

قائل کا یہ مطلب معلوم ہوتا ہے کہ ہماری پسند کے لیے معشوق کے معمولی بناؤ سنگار کافی نہیں ہیں۔ پس مشاطہ کو چاہیے کہ اس پر کچھ اور اضافہ کرے۔ کیونکہ اب اس کے دیکھنے کی نوبت ہم تک پہنچی ہے۔ شاعر نے مضمون میں جدت تو پیدا کی مگر بے سیندی۔ اول تو اس نے جس کو دوست قرار دیا ہے معلوم ہوتا ہے کہ ابھی اس کی محبت کا نقش اس کے دل میں نہیں بیٹھا پھر اس کو دوست کہنا کیونکر صحیح ہو سکتا ہے۔ دوسرے اس کے بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ معشوق کے حسن ذاتی سے کچھ وابستگی نہیں رکھتا بلکہ عارضی بناؤ سنگار پر فریفتہ ہے تیسرے عشق جو ہمیشہ بے قصد و بے ارادہ پیدا ہوتا ہے اس کو قصد اور ارادہ سے پیدا کرنا چاہتا ہے مرزا غالب مدح میں کہتے ہیں ؎

زمانہ عہد میں ہے اس کے محو آرائش
بنیں گے اور ستارے اب آسماں کے لیے

ظاہرا یہ خیال اسی فارسی شعر سے قصداً یا بلاقصد پیدا ہوا ہے مگر مرزا نے اس مضمون کو اصل خیال کے بالکل ضد اپنے بالکل چھین لیا ہے جو قباحتیں تغزل کی حالت میں اس میں موجود تھے وہ مدح کی حالت میں بالکل نہیں رہے۔ مرزا نے ممدوح کو ایک ایسے ملک

ساتھ موصوف کیا ہے جو تمام کمالات کی جڑ ہے یعنی وہ ہر چیز کو کامل تر اور افضل تر حالت میں دیکھنا چاہتا ہے۔ اسی لیے ہر شے کو بہترین حالت میں اس کو دیکھنا چاہتی ہے کہ اگر یہی حال ہے تو شاید آسمان کی زیب و زینت کے لیے اور ستارے پیدا کیے جائیں اس پر اس کے کہ کوئی منطقی اعتراض کیا جائے اور کسی طرح کی گرفت نہیں ہو سکتی۔ بخلاف فارسی شعر کے کہ اس کی بنا خود اصولی شاعری اور ب عشق و محبت کے برخلاف ہے۔ عرفی شیرازی کہتا ہے ؎

ہر کس نہ شناسندۂ راز ست وگرنہ
اینہا ہمہ راز ست کہ معلوم عوام ست

غالب مرحوم نے اسی مضمون کو دوسرے لباس میں اس طرح جلوہ گر کیا ہے ؎

محرم نہیں ہے تو ہی نوا ہائے راز کا
یاں ورنہ جو حجاب ہے پردہ ہے ساز کا

اگرچہ گمان غالب یہ ہے کہ عرفی کی رہبری اس خیال کی طرف قرآن مجید کی اس آیت سے ہوئی ہو گی " وَإِنْ مِنْ شَيْءٍ إِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهِ وَلٰكِنْ لَا تَفْقَهُوْنَ تَسْبِيْحَهُمْ " لیکن ہر حالت میں عرفی کا یہ شعر آب زر سے لکھنے کے قابل ہے اور جس اسلوب میں کہ یہ خیال اس سے ادا ہو گیا ہے اب اس سے بہتر اسلوب ہاتھ آنا دشوار ہے۔ با ایں ہمہ مرزا کی جدت اور تلاش بھی کچھ کم تحسین کے قابل نہیں ہے جس مضمون میں بظاہر اضافہ کی گنجائش نہ تھی اس میں ایک لطیف اضافہ کیا ہے جو باوجود الفاظ کی دلفریبی کے لطف معنی سے بھی خالی نہیں ہے۔ عرفی کا یہ مطلب ہے کہ جو باتیں عوام کو معلوم ہیں یہی درحقیقت اسرار ہیں۔ مرزا یہ کہتے ہیں کہ جو چیزیں مانع کشف راز معلوم ہوتی ہیں وہی درحقیقت کاشف راز ہیں۔

بہر حال اس قسم کے اقتباسات ہمیشہ متاخرین قدما کے کلام سے کرتے رہے ہیں اور چراغ سے چراغ جلتا چلا آیا ہے۔ شعرائے عرب جب کوئی اچھوتا مضمون باندھتے تھے اور لوگ متعجب ہو کر ان سے پوچھتے تھے کہ کس تقریب سے یہاں تک ذہن پہنچا تو وہ صاف صاف اپنے خیال کا ماخذ بتا دیتے تھے۔ ابو نواس نے فضل بن ربیع کی شان میں یہ شعر کہا تھا ؎

وَلَيْسَ لِلّٰهِ بِمُسْتَنْكَرٍ   اَنْ يَّجْمَعَ الْعَالَمَ فِيْ وَاحِدٍ

(یعنی خدا سے یہ بات بعید نہیں ہے کہ تمام عالم کو ایک شخص کی ذات میں جمع کر دے)

جب کسی نے اس سے پوچھا کہ یہ مضمون کیونکر سوجھا؟ ابو نواس نے صاف کہہ دیا کہ یہ خیال جریر کے اس شعر سے پیدا ہوا جو اس نے بنو تمیم کی تعریف میں کہا ہے ؎

إِذَا غَضِبَتْ عَلَيْكَ بَنُوْ تَمِيْمٍ   حَسِبْتَ النَّاسَ كُلَّهُمْ غِضَابًا

(یعنی جب بنی تمیم تجھ سے ناراض ہو جائیں تو سمجھنا چاہیے کہ تمام بنی آدم تجھ سے ناراض ہیں)

شاعری پر کچھ موقوف نہیں بلکہ تمام علوم و فنون میں انسان نے اسی طرح ترقی کی ہے کہ اگلے جو ادھورے نمونے چھوڑتے گئے پچھلے ان میں کچھ تصرف کرتے رہے یہاں تک کہ ہر ایک علم اور ہر ایک فن کمال کے درجہ کو پہنچ گیا۔ شعر کی ترقی بھی اسی طرح متصور ہے کہ قدما کے خیالات میں کچھ کچھ معقول تصرفات ہوتے رہیں لیکن اس قسم کے تصرفات کرنے کے لیے شاعر کی پوری لیاقت ہونی چاہیے ورنہ پہلے کی بات

ہمارے عہد کے اکثر شعرا کرتے ہیں ان سے بجائے ترقی کے روز بروز شاعری نہایت ذلیل و پست و حقیر ہوتی جاتی ہے۔

فارسی میں کم اور عربی میں زیادہ اور انگریزی میں بہت زیادہ نہ صرف نظم میں بلکہ نثر میں نظم سے بھی زیادہ ہر قسم کے بلند و عالی اور پاکیزہ خیالات کا ذخیرہ موجود ہے پس ہمارے ہم وطنوں میں جو لوگ ایسے دماغ رکھتے ہیں کہ غیر زبانوں سے نئے خیالات اخذ کر کے ان میں عمدہ تصرفات کر سکتے ہیں وہ اپنے مبلغ فکر کے موافق تصرف کر کے اور جو کی قوت متخیلہ ان سے کم درجہ کی ہے وہ انہی خیالات کو بعینہ اپنی زبان میں صفائی اور سادگی کے ساتھ ترجمہ کر کے اردو شاعری کو سرمایہ دار بنائیں سنسکرت اور بھاشا میں خیالات کا ایک دوسرا عالم ہے اور اردو زبان بہ نسبت اور زبانوں کے سنسکرت اور بھاشا کے خیالات سے زیادہ مناسبت رکھتی ہے۔ اس سلسلے ان زبانوں سے بھی خیالات کے اخذ کرنے میں کمی نہ کریں اور جہاں تک کہ اپنی زبان میں ان کے ادا کرنے کی طاقت ہو ان کو شعر کے لباس میں ظاہر کریں اور اس طرح اُردو شاعری میں ترقی کی روح پھونکیں۔

ہم دیکھتے ہیں کہ ہمارے شعراء نے جو کہیں کہیں فارسی اشعار کا ترجمہ اُردو اشعار میں کر دیا ہے اس پر لوگوں نے اعتراض کیے ہیں لیکن ہمارے نزدیک یہ کوئی اعتراض کا محل نہیں ہے۔ ایک زبان کے شعر کا عمدہ ترجمہ دوسری زبان کے شعر میں کرنا کوئی آسان بات نہیں ہے ایک بزرگوار نے سارا سکندر نامہ بحری اُردو میں ترجمہ کر ڈالا ہے اور ہم نے سُنا ہے کہ وہ شاعر بھی تھے اور مولوی بھی۔ ان کے چند شعر ملاحظہ ہوں ؎

کہ سے میوہ زیبا جو ہر شاخ پر — کہ یا سرفرازش کہ سے خاک پر
ہوا جب کہ آراستہ باغ خوش — بہر میوہ شیریں و ہم ترش
بہ شادی لب پستہ خنداں ہوا — رطب اس سے بھی تیز دنداں ہوا
ہوا چہرۂ نازہ افسردہ خستہ — کہ ہوں تا کے پر مثل ہوں وہ خم
بہ رغبت بہ ہر شاخ انجیر دار — لٹکنے لگے مرغ انجیر خوار
اٹھایا لبہ سوئے فم نے جوش خیز — ہم از ورسے شیرو ہم از بہے شیر

شاید اس مترجم کی نسبت تو یہ کہا جائے کہ وہ مشاق شاعر نہ تھا اس لیے عمدہ ترجمہ نہ کر سکا لیکن ہم مشاق شاعروں سے کہتے ہیں کہ ازراہ عنایت زیادہ نہیں تو انہی چھ شعروں کو فصیح اُردو نظم میں ترجمہ کر دیں۔ جو شخص دوسری زبان کے شعر کو اپنی زبان کے شعر میں عمدگی کے ساتھ ترجمہ کرتا ہے گو اس سے اس کی قوت متخیلہ کا کمال ثابت نہیں ہوتا مگر وہ ایک دوسری لیاقت کا ثبوت دیتا ہے جو ہر ایک شاعر میں نہیں ہو سکتی۔

ہمارے بعض شعراء نے بعض ایسے خیالات کو جو فارسی اشعار میں تھے اُردو میں ایسی خوبی سے ادا کیا ہے کہ وہ اصل شعر سے بڑھ گئے ہیں۔ نظیری کا شعر ہے ؎

بر ستم یار من ازیں سست وفا می آید — گلم از دست بگیرید کہ از کار شدم

سوداؔ کہتے ہیں ؎

کیفیت چشم اس کی مجھے یاد ہے سوداؔ — ساغر کو مرے ہاتھ سے لینا کہ چلا میں

اس میں شک نہیں کہ سوداؔ نے اپنے شعر کی بنیاد نظیریؔ کے مضمون پر رکھی ہے بلکہ کہا جا سکتا ہے کہ تھوڑے سے تغیر کے ساتھ

اس کا ترجمہ کر دیا ہے لیکن بلاغت کے لحاظ سے سودا کا شعر نظیری سے بہت بڑھ گیا ہے۔ دوست کے یاد آنے سے بھی ممکن ہے کہ عاشق از خود رفتہ ہو جائے لیکن شاعر شراب کو دیکھ کر معشوق کی نشیلی آنکھ کے تصور سے بے خود ہو جانا قرین قیاس ہے۔ اس کے سوا "از کار شدم" میں وہ تعمیم نہیں ہے جو اس میں ہے کہ "چلا میں"۔ نہیں معلوم کہ آپے سے چلا یا دین و دنیا سے چلا یا جگہ سے چلا یا کہاں سے چلا اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ "چلا میں" ہمیشہ ایسے موقع پر بولا جاتا ہے جب آدمی مدہوش و بدحواس ہو کر گرنے کو ہوتا ہے اور "از کار شدم" میں یہ بات نہیں ہے۔ معطل ہونے، معزول ہونے، اپاہج اور نکمے ہونے کو بھی "از کار شدن" سے تعبیر کرتے ہیں۔

در محفل خود راہ مدہ ہمچو منے را
افسردہ دل افسردہ کند انجمنے را (لا اعلم)

نہ کہیں عیش تمہارا بھی منغص ہو جائے
دوستو دردؔ کو محفل میں نہ تم یاد کرو (خواجہ میر دردؔ)

ممکن ہے کہ خواجہ میر دردؔ نے فارسی شعر سے یہ مضمون اخذ کیا ہو لیکن یقیناً ان کا شعر فارسی شعر سے بہت بڑھ گیا ہے۔ اوّل تو فارسی مطلع کے مضمون کو اپنے مقطع میں لانا جس میں خود دردؔ کا لفظ ہی شاعر کے دعویٰ پر دلیل کا حکم رکھتا ہے۔ پھر راہ مدہ کی جگہ یاد کرو بولنا جس کے دو معنی ہیں۔ ایک تو یہی کہ دردؔ کا اپنی محفل میں ذکر نہ کرو، دوسرے یاد کرنے کے معنی ہیں اس کا اور اس کو اپنے پاس بلانا اور بڑی خوبی دردؔ کے شعر میں یہ ہے کہ محفل میں نہ بلانے کی وجہ جو فارسی میں یقینی طور پر بیان کی گئی ہے اس کو میر دردؔ نے احتمال کی صورت میں اس طرح بیان کیا ہے "نہ کہیں عیش تمہارا بھی منغص ہو جائے" ان دونوں اسلوبوں میں ایسا ہی فرق ہے جیسے ایک شخص تو یوں کہے کہ "بد پرہیزی سے آدمی ہلاک ہو جاتا ہے" اور دوسرا یہ کہے "دیکھو کہیں بد پرہیزی سے جان سے ہاتھ نہ دھو بیٹھو" دوسرے اسلوب میں جیسا کہ ظاہر ہے نسبت پہلے اسلوب کے زیادہ تخویف و تحذیر ہے۔

دوستاں منع کنندم کہ چرا دل بتو دادم
باید اوّل بتو گفتن کہ چنیں خوب چرائی؟ (سعدی شیرازی)

پیار کرنے کا جو خوباں ہم پہ رکھتے ہیں گناہ
ان سے بھی تو پوچھیے تم اتنے کیوں پیارے ہوئے! (میر تقی میرؔ)

میرؔ کا یہ شعر ظاہراً سعدی کے شعر سے ماخوذ معلوم ہوتا ہے مگر سعدی کے ہاں 'خوب' کا لفظ ہے اور میرؔ کے ہاں 'پیارے' کا لفظ ہے۔ ظاہر ہے کہ خوب کا محبوب ہونا کوئی ضروری بات نہیں ہے لیکن پیارے کا پیارا ہونا ضرور ہے۔ پس سعدی کے سوال کا جواب ہو سکتا ہے مگر میرؔ کے سوال کا جواب نہیں ہو سکتا۔

بہر حال ترجمہ کا جبھی ٹھیک ترجمہ کے فرائض پورے پورے ادا ہو جائیں کوئی عیب کی بات نہیں ہو سکتی۔ سعدی جو فارسی شاعری کا پیمبر ہے خود اس کے کلام میں عربی اقوال و امثال کے ترجمے ہیں ان کا ماحصل موجود ہے مثلاً:

اقوال عربی

اَلْکَلْبُ اَنْجَسُ مَا یَکُوْنُ اِذَا اغْتَسَل

سعدی

۱۔ سگ بدریائے ہفتگانہ بشوے
چونکہ تر شد پلید تر باشد

سعدی	اقوالِ عرب
۲- ترا خامشی اے خداوند ہوش وقارست و نااہل را پردہ پوش	اَلصَّمْتُ زِيْنَةُ الْعَالِمِ وَ سَتْرُ الْجَاهِلِ
۳- تو بجائے پدر چہ کردی خیر تا ہمان چشم داری از پسرت	رَاعِ اَبَاكَ يُرَاعِ اِبْنُكَ
۴- شپرہ گر وصلِ آفتاب نخواہد رونقِ بازارِ آفتاب نکاہد	سَنَاءُ ذُكَاءٍ لَا يَزُوْلُ مِنْ دُعَاءِ الْخُفَّاشِ
۵- نیک بخت آنکہ خورد و کشت و بدبخت آنکہ مرد و ہشت	اَلسَّعِيْدُ مَنْ اَكَلَ وَ زَرَعَ وَالشَّقِيُّ مَنْ مَاتَ وَ وَدَعَ
۶- پادشاہان بخردمندان محتاج تراند کہ خردمندان بہ پادشاہان	اَلسُّلْطَانُ اَحْوَجُ اِلَى الْعُقَلَاءِ مِنَ الْعُقَلَاءِ اِلَى السُّلْطَانِ

اہلِ یورپ جو آج لٹریچر میں بھی مثل علوم و فنون و صنائع کے تمام دنیا سے فائق ہیں۔ اس کا سبب اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ دنیا میں کوئی مشہور قوم ایسی نہیں جس کی شاعری اور انشاء کا لب لباب ان کی زبانوں میں موجود نہ ہو۔ پس ہم کو بھی چاہیے کہ جس قوم اور جس زبان کے خیالات ہم کو بہم پہنچیں ان سے جہاں تک ممکن ہو فائدہ اٹھائیں اور صرف انہی چند فرسودہ اور بوسیدہ خیالات پر جو صدیوں سے برابر بندھتے چلے آتے ہیں قناعت کر کے نہ بیٹھ رہیں کیونکہ علم و ہنر میں قناعت ویسی ہی قابلِ ملامت ہے جیسی مال و دولت میں حرص۔

(۲) جس طرح ہماری غزل کے مضامین محدود ہیں اسی طرح اس کی زبان بھی ایک خاص دائرے سے باہر نہیں نکل سکتی کیونکہ چند معمولی مضمون جب صدیوں تک برابر بندھے جاتے ہیں تو زبان کا ایک خاص حصہ ان کے ساتھ مخصوص ہو جاتا ہے جو کہ زبانوں پر بار بار آنے اور کانوں سے بار بار سننے کے سبب زیادہ مانوس اور گوارا ہو جاتا ہے۔ یہاں تک کہ اگر ان الفاظ کی جگہ دوسرے الفاظ جو ان کے ہم معنی ہوں استعمال کیے جائیں تو غریب اور اجنبی معلوم ہوتے ہیں۔

عشقیہ مضامین ہمارے ان کچھ غزل ہی کے ساتھ خصوصیت نہیں رکھتے بلکہ قصیدے اور مثنوی میں بھی ہمیشہ ان کا عمل دخل رہا ہے۔ فارسی اور اردو زبانوں میں چند کے سوا کل مثنویاں عشقیہ مضامین پر لکھی گئی ہیں۔ اسی طرح قصائد کی تشبیبوں میں بھی زیادہ تر یہی رنگ اختیار کیا گیا ہے۔ واسوخت تو عشق کی پسلی ہی سے پیدا ہوا ہے لیکن چونکہ قصیدہ، مثنوی اور واسوخت کا میدان وسیع ہے لہٰذا ان میں غریب اور اجنبی الفاظ کی بہت کچھ کھپت ہو سکتی ہے۔ بخلاف غزل کے کہ یہاں ایک لفظ بھی غیر مانوس ہو تو ناگوار معلوم ہوتا ہے۔ گلاب کے تختے میں کانٹے بھی پھولوں کے ساتھ نبھ جاتے ہیں مگر گلدستے میں ایک کانٹا بھی کھٹکتا ہے اسی واسطے جن بزرگوں نے غزل کی بنیاد تصوف اور اخلاق پر رکھی ہے ان کو بھی وہی زبان اختیار کرنی پڑی ہے جو غزل میں عموماً برتی جاتی ہے۔ عشقیہ مضامین میں جو الفاظ حقیقی معنوں پر اطلاق کیے جاتے تھے انہی الفاظ کو ان بزرگوں نے مجاز و استعارہ کے طور پر استعمال کیا ہے اور رمز و کنایہ و تمثیل میں اپنے اصلی خیالات ظاہر کیے ہیں۔ پس غزل میں ضرور ہے کہ بہ نسبت اور اصناف کے سادگی اور صفائی کا زیادہ خیال رکھا جائے۔ آج تک فارسی یا اردو میں جن لوگوں نے

زیادہ مقبول ہوتی ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جنھوں نے اس اصول کو نصب العین رکھا ہے۔ اردو میں دلی سے لے کر انشا اور مصحفی تک جو سب کی غزل میں صفائی، سادگی اور روزمرہ کی پابندی زیادہ پائی جاتی ہے گو صورت استعارات میں بھی پائی جاتی ہے۔ ان کے بعد دلی میں مومن، غالب، مرزا اور شیفتہ وغیرہ کے ہاں فارسی ترکیبوں نے اردو غزل میں بہت کچھ دخل پایا۔ مگر یہ لوگ بھی اعلیٰ درجہ کا شعر اسی کو سمجھتے تھے جس میں پاکیزہ اور بلند خیال بحیثیت اردو کے عمدہ میں ادا ہو جاتا تھا۔ ان لوگوں کا یہ خیال تھا کہ سو غزلوں میں اعلیٰ درجہ کا شعر ایک دو سے زیادہ نہیں نکل سکتا باقی بھرتی ہوتی ہے۔ اگلے شعرا شعر گوئی کی پروا نہ کرتے تھے۔ ایک دو شعر اچھا نکل آیا باقی کہتے اور ایسے پھیکے شعروں سے غزل کا نصاب پورا کر دیا۔ ہم لوگ یہ کہتے ہیں کہ اپنے بھرتی کے اشعار کو فارسی ترکیبوں سے بہت کچھ دیتے ہیں تاکہ یا تو الفاظ میں چھپ کر معلوم ہوں۔ بات یہ ہے کہ یہ لوگ ان معمولی خیالات کو جو مدت سے مختلف شکلوں میں دہرتے چلے آتے تھے بہت کم باندھتے تھے بلکہ ہر شعر میں جدت پیدا کرنی چاہتے تھے اس لیے اللہ روزمرہ کا رشتہ اکثر ہاتھ سے جاتا رہتا تھا۔ بایں ہمہ حقیقت کہ شاعر ان کے تمام کلام میں پائی جاتی ہے۔ اور صاف و بامحاورہ اور بلند اشعار ان کے ہاں بھی نسبتاً زیادہ نکل سکتے ہیں جتنے کہ قدما کی غزلیات میں۔ ذوق کی غزل میں محاورہ زبان کا شمار اپنے معاصرین کے کلام سے زیادہ ہے مگر وہ بھی جہاں مضمون آفرینی کرتے ہیں صفائی سے بہت دور جا پڑتے ہیں۔ ظفر کا تمام دیوان زبان کی صفائی اور روزمرہ کی خوبی سے اول سے آخر تک یکساں ہے لیکن اس میں تازگی خیالات بہت کم پائی جاتی ہے۔ ناسخ کی غزل میں بلحاظ زبان کی صفائی روزمرہ کی پابندی اور صنعت کی پابندی کے طرز ادا میں ایک شوخی اور بانکپن ہے جو اسی شخص کا حصہ ہے۔ مگر نہایت تعجب ہے کہ لکھنؤ میں متاخرین نے سادگی اور صفائی کا غزل میں بہت کم خیال رکھا ہے۔ باوجودیکہ زبان کے لحاظ سے دلی اور لکھنؤ میں کوئی معتدبہ فرق نہیں معلوم ہوتا اس کے سوا شجاع الدولہ کے زمانے سے سعادت علی خاں کے وقت تک اودھ کے تمام نامور شعرا کا مجمع لکھنؤ ہی میں رہا یہاں تک کہ میر، سودا، سوز، جرأت، مصحفی اور انشا وغیرہ اخیر دم تک وہیں رہے اور وہیں مرے مگر متاخرین کی غزل میں ان کی طرز بیان کا اثر بہت کم پایا جاتا ہے۔ بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جب دلی بگڑ چکی اور لکھنؤ سے زمانہ موافق ہوا اور دلی کے اکثر شریف خاندان اور ایک آدھ کے سوا تمام نامور شعرا لکھنؤ ہی میں جا رہے اور دولت و ثروت کے ساتھ علوم مذہبیہ بھی ایک خاص رنگ سے ترقی کی۔ اس وقت یقیناً اہل لکھنؤ کو ضرور یہ خیال پیدا ہوا ہوگا کہ جس طرح دولت اور منطق و فلسفہ وغیرہ میں ہم کو فوقیت حاصل ہے اسی طرح زبان اور لب و لہجہ میں بھی ہم دلی سے فائق ہیں۔ لیکن زبان میں فوقیت ثابت کرنے کے لیے ضرور تھا کہ اپنی اور دلی کی بول چال میں کوئی امر مابہ الامتیاز پیدا کرتے۔ چونکہ منطق و فلسفہ، طب و علم کلام وغیرہ کی ممارست زیادہ تھی خود بخود طبیعتیں اس بات کی مقتضی ہوئیں کہ بول چال میں بہت سے الفاظ، فارسی ترکیب اور اردو کی جگہ عربی الفاظ کثرت سے داخل ہونے لگے یہاں تک کہ سیدھی سادی اردو امرا اور اہل علم کی سوسائٹی میں تہذیب سے گری ہوئی سمجھی گئی یہاں تک کہ عبارت سے بے تکلفی جاتی رہی اور محبوب اور معشوقوں کی گفتگو بھی جانے لگی اور یہی رنگ رفتہ رفتہ نظم و نثر پر غالب آگیا۔ نظم میں جرأت اور ناسخ کے دیوانوں کو نثر میں باغ و بہار اور فسانۂ عجائب کا مقابلہ کرنے سے اس کا کافی ثبوت ملتا ہے۔ بایں ہمہ انصاف یہ ہے کہ مرثیہ اور مثنوی میں خاص خاص شخصوں پر (جیسا کہ آگے بیان کیا جائے گا) زمانہ کے اقتضا نے کچھ اثر نہیں کیا۔ انھوں نے زبان کے اصلی جوہر کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا بلکہ اس کو بزرگوں کا تبرک سمجھ کر اس انقلاب کے زمانہ میں نہایت احتیاط سے محفوظ رکھا۔

بہرحال غزل میں زبان اور بیان کی صفائی کی غرض سے چند باتوں کا لحاظ رکھنا ضروری ہے۔

(۱) ہم اوپر کہہ آئے ہیں کہ غزل کو محض عشقیات میں اور عشقیات کو محض ہوا و ہوس کے مضامین میں محدود رکھنا ٹھیک نہیں ہے بلکہ اس کو ہر قسم کے جذبات کا آلہ بنانا چاہیے۔ یہ بھی ظاہر ہے کہ غزل میں معمولی مضامین بندھتے بندھتے اس کی ایک خاص زبان قرار پاگئی

جو اس قدر تنگ ہو گئی ہے کہ اگر منشا اس کی کثرت سے غیر مانوس ہو یا ان ترکیبوں اور اسلوب بیان میں کمی ہو جائے تو غزل ایسی بے کار ہو جاتی ہے جیسی بعض شعراء کی غزل ہو جاتی ہے کہ غیر مانوس تشبیہوں اور ترکیبوں کا استعمال کرنے سے ہو گئی ہے جیسے کہ غزل کو ایک قید کی گنجائش نہیں دیتا بلکہ اس بات کا مقتضی ہے کہ زبان میں وسعت پیدا کی جائے اور جدت کی جائے۔ پس ضرور ہے کہ کوئی ایسا طریقہ اختیار کیا جائے کہ طرح طرح کے خیالات ... اس کے غزل میں ہر قسم کے خیالات عمدگی کے ساتھ ادا ہو سکیں۔

آج کل دیکھا جاتا ہے کہ شعر کے لباس میں اکثر نئے خیالات جو ہمارے اگلے شعراء نے کبھی نہیں باندھے تھے ظاہر کیے جاتے ہیں مگر وہ اس خاص زبان میں جو شعراء کی کثرت استعمال سے کانوں میں رچ گئی ہے ادا نہیں کیے جاتے بلکہ نئے خیالات جن الفاظ میں براہ راست ظاہر ہونا چاہتے ہیں انہی الفاظ میں ظاہر کر دیئے جاتے ہیں۔ اس لیے وہ مقبول خاص و عام نہیں ہوتے۔ لیکن نئی طرز کی عام شاعری اگر سردست مقبول نہ ہو تو کچھ ہرج نہیں۔ جب لوگوں کے مذاق رفتہ رفتہ اس سے آشنا ہو جائیں گے اور اس کی لذت اور حلاوت سے واقف ہوں گے اس وقت وہ خود بخود مقبول ہو جائے گی۔ البتہ غزل کو ابتدا ہی سے جہاں تک ممکن ہو عام پسند اور مطبوع طبائع بنانا ضرور ہے کیونکہ یہی ایسی صنف ہے جو خاص و عام کی زبان پر جاری ہوتی ہے۔ اس کے اشعار ہر شخص کو یکساں یاد رہ سکتے ہیں اور یہی تمام خوشی کے جلسوں اور سماع کی مجلسوں اور یاروں کی صحبتوں میں گائی اور پڑھی جاتی ہے۔ پس ملک میں نیچرل شاعری پھیلانے کا اس سے بہتر کوئی طریقہ نہیں کہ غزل میں ہر قسم کے لطیف و پاکیزہ خیالات بیان کیے جائیں۔ اس کو تمام انسانی جذبات کے ظاہر کرنے کا آلہ بنایا جائے اور باوجود اس کے اس کو ایسے لباس میں ظاہر کیا جائے جو ہماری نظر میں اجنبی اور غیر مانوس نہ ہو۔

سب سے بڑی دلیل اس بات کی کہ نئے اور اعلیٰ سے اعلیٰ خیالات بھی اول اول اسی زبان اور روزمرہ میں ادا ہو سکتے ہیں جس میں پرانے اور پست خیالات ادا کیے جاتے تھے۔ اس کی شان یہ ہے کہ کلام الٰہی میں تمام روحانی اور اخلاقی باتیں ویسے ہی محاورات و تشبیہات و استعارات و تمثیلات میں بیان کی گئی ہیں جن میں شعرائے جاہلیت عشقیات و خمریات اور تفاخر و مدح و ذم وغیرہ کے مضامین بیان کرتے تھے۔

یہ ممکن ہے کہ کسی قوم کے خیالات میں دفعتاً ایک نمایاں ترقی اور وسعت پیدا ہو جائے مگر زبان میں دفعتاً پیدا نہیں ہو سکتی بلکہ نامعلوم طور پر بیان کے اسلوب آہستہ آہستہ اضافہ کیے جاتے ہیں اور ان کو رفتہ رفتہ پبلک کے کانوں سے مانوس کیا جاتا ہے اور قدیم اسلوب جو کانوں میں رچ گئے ہیں ان کو بدستور قائم و برقرار رکھا جاتا ہے یہاں تک کہ اگر علم کی ترقی سے بہت سے قدیم شعرا خیالات محض غلط اور بے بنیاد ثابت ہو جائیں تو بھی جن الفاظ کے ذریعے سے وہ خیالات ظاہر کیے جاتے تھے وہ الفاظ ترک نہیں کیے جاتے۔ فرض کرو کہ آسمان کا وجود اور اس کا گردش کرنا، زمین کا ساکن ہونا، پانی اور ہوا کا بسیط ہونا، عناصر کا چار میں منحصر ہونا، ابلیس کا جان ہونا، ظلمات میں چشمۂ حیوان کا مخفی ہونا، سیمرغ اور دیو اور پری کا موجود ہونا اور اسی قسم کی اور بہت سی باتیں علم انسانی کی ترقی سے غلط ثابت ہو جائیں تو بھی شاعر کا یہ کام نہیں ہے کہ ان خیالات سے بالکل دست بردار ہو جائے بلکہ اس کا کمال یہ ہے کہ حقائق و واقعات اور سچے اور نیچرل خیالات کو انہی غلط اور بے اصل باتوں کے پیرایہ میں بیان کرے اور اس طلسم کو جو قدما باندھ گئے ہیں ہرگز ٹوٹنے نہ دے ورنہ وہ بہت جلد دیکھے گا کہ اس نے اپنے منتر سے وہی اثر کھو دیا ہے جس سے وہ دلوں کو تسخیر کرتے تھے۔

بہرحال جو لوگ اردو شاعری کو ترقی دینا یا یوں کہو کہ اس کو ... برقرار رکھنا چاہتے ہیں ان کا فرض ہے کہ اصناف ...

یہ بھی اور غزل میں خصوصاً اس اصول کو ملحوظ رکھیں کہ مسدود نہیں نئے اسلوب جہاں تک ممکن ہو کم اختیار کیے جائیں اور نیز نامانوس الفاظ کم برتے جائیں مگر نامعلوم طور سے رفتہ رفتہ ان کو شعار کرتے رہیں اور زیادہ تر کلام کی بنا قدیم اسلوبوں اور مستعمل الفاظ و محاورات پر رکھیں مگر الفاظ کے حقیقی معنوں ہی پر قناعت نہ کریں بلکہ ان کو کبھی حقیقی معنوں میں، کبھی مجازی معنوں میں، کبھی استعارہ اور کنایہ کے طور پر اور کبھی تمثیل کے پیرایہ میں استعمال کریں ورنہ ہر قسم کے خیالات ایک ہی تنگ اصل زبان میں کیونکر ادا کیے جا سکتے ہیں۔

استعارہ و کنایہ اور تمثیل کی تعریف اور ان کی تقسیمیں علم بیان کی کتابوں میں دیکھنی چاہئیں۔ یہاں ہم صرف اس قدر کہنا چاہتے ہیں کہ استعارہ بلاغت کا ایک رکن اعظم ہے اور شاعری کو اس کے ساتھ وہی نسبت ہے جو قالب کو روح کے ساتھ۔ کنایہ اور تمثیل کا حال بھی استعارہ کے قریب قریب ہے۔ یہ سب چیزیں شعر میں جان ڈالنے والی ہیں۔ جہاں اصل زبان کا قافیہ تنگ ہو جاتا ہے وہاں شاعر انہی کی مدد سے اپنے دل کے جذبات اور دقیق خیالات عمدگی کے ساتھ ادا کرتا ہے اور جہاں اس کا اپنا منتر کارگر ہوتا نظر نہیں آتا وہاں انہی کے زور سے وہ لوگوں کے دلوں کو تسخیر کر لیتا ہے۔

بعض مضامین فی نفسہ ایسے دلچسپ اور دلکش ہوتے ہیں کہ ان کو محض صفائی اور سادگی سے بیان کر دینا کافی ہوتا ہے مگر بہت سے خیالات ایسے ہوتے ہیں کہ معمولی زبان ان کو ادا کرنے وقت رو دیتی ہے اور معمولی اسلوب ان میں اثر پیدا کرنے سے قاصر ہوتے ہیں ایسے مقام پر اگر استعارہ اور کنایہ یا تمثیل وغیرہ سے مدد نہ لی جائے تو شعر شعر نہیں رہتا بلکہ معمولی بات چیت ہو جاتی ہے مثلاً داغ کہتے ہیں ؎

گیا تھا کہہ کے اب آتا ہوں قاصد کو تو موت آئی
ملے گا اب وہاں جا کر کہیں تو بھی نہ مر رہنا

اس شعر میں دیر لگنے کو موت آنے اور مر رہنے سے تعبیر کیا۔ اگر یہ دونوں لفظ نہ ہوں بلکہ اس طرح بیان کیا جائے کہ قاصد نے تو بہت دیر لگائی، اے دل کہیں تو بھی دیر نہ لگا تب تو شعر میں کچھ جان باقی نہیں رہتی۔ یا مثلاً مرزا غالب کہتے ہیں ؎

کی مرے قتل کے بعد اس نے جفا سے توبہ
ہائے اس زود پشیماں کا پشیماں ہونا

دوسرے مصرع میں طنزاً بطور استعارہ کے "دیر پشیماں" کی جگہ "زود پشیماں" کہا گیا ہے جس سے شعر میں جان پڑ گئی ہے۔ یہ ایسا ہی استعارہ ہے جیسا قرآن مجید میں "اَنْذِرْهُمْ" کی جگہ "بَشِّرْهُم بِعَذَابٍ اَلِیْمٍ" فرمایا ہے۔ اسی طرح میر تقی کہتے ہیں ؎

کہتے ہو اتحاد ہے ہم کو   ہاں کہو اعتماد ہے ہم کو

یہاں بھی "اعتماد نہیں ہے" کی جگہ طنزاً "اعتماد ہے" کہا گیا ہے مرزا غالب کہتے ہیں ؎

وفاداری بشرط استواری اصل ایماں ہے
مرے بت خانے میں تو کعبے میں گاڑو برہمن کو

دوسرے مصرع کا اصل مدعا یہ تھا کہ وفاداری ایسی عمدہ صفت ہے کہ اگر برہمن وفاداری کے ساتھ ساری عمر بت خانہ میں رہا ہو تو اس کے ساتھ وہ برتاؤ کرنا چاہیے جو اعلیٰ سے اعلیٰ درجہ کے مسلمان کے ساتھ کرنا زیبا ہے۔ اس مطلب کو یوں ادا کیا گیا ہے کہ اگر وہ بت خانہ میں مرے تو اس کو کعبہ میں دفن کرنا چاہیے۔ جو خوبی اس طرز بیان میں ہے وہ ظاہر ہے۔ دوسری جگہ مرزا غالب کہتے ہیں ؎

کوئی ویرانی سی ویرانی ہے
دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا

دوسرے مصرع میں بطور نکتہ یہ کہ یہ خوف معلوم ہوا کی جگہ "گھر یاد آیا" کہا گیا ہے کیونکہ جنگل میں خوف معلوم ہونے کو گھر یاد آنا لازم ہے اور چونکہ اس میں صنعت ایہام بھی ملحوظ رکھی گئی ہے اس لیے شعر میں اور زیادہ لطف پیدا ہو گیا ہے یعنی اس کے یہ معنی بھی نکلتے ہیں کہ ہمارا گھر اس قدر ویران ہے کہ دشت کو دیکھ کر گھر یاد آتا ہے۔ مرزا غالب کا فارسی شعر ہے

ہوا مخالف و شب تار و بحر طوفاں خیز
گسستہ لنگر کشتی و ناخدا خفتہ است

اس شعر میں اپنی مشکلات اور مصیبتوں کو بطور تمثیل کے بیان کیا ہے۔ جس حالت کو شاعر نے اس عنوان سے بیان کیا ہے وہ کچھ ہی کیوں نہ ہو اگر اس کو صاف اور سیدھے طور پر جیسی کہ وہ ہے بیان کیا جائے تو وہ ہرگز دو مصرعوں میں نہیں سما سکتی اور علاوہ اس کے جس ہیبت ناک صورت میں اس کو یہ تمثیل کا پیرایہ ظاہر کرتا ہے یہ بات ہرگز نہیں پیدا ہو سکتی۔ مرزا غالب کا اردو شعر ہے

پنہاں تھا دام سخت قریب آشیان کے
اڑنے نہ پائے تھے کہ گرفتار ہم ہوئے

اس شعر میں بھی اس بات کو کہ آدمی نے جہاں ہوش سنبھالا اور تعلقات دنیوی میں پھنسا بطور تمثیل کے بیان کیا ہے اور اس عنوان سے بیان کی خوبی ظاہر ہے۔

بہرحال شاعر کا یہ ضروری فرض ہے کہ مجاز و استعارہ و کنایہ و تمثیل وغیرہ کے استعمال پر قدرت حاصل کرے تاکہ ہر ایک مضمون کو آب و تاب کے ساتھ بیان کر سکے لیکن استعارہ وغیرہ میں اس بات کا خیال ضرور ہے کہ مجازی معنی فہم سے بعید نہ ہوں ورنہ شعر چیستان اور معما بن جائے گا۔ مثلاً شاہ نصیر کہتے ہیں

چرائی چادر مہتاب شب میکش نے جیحوں پر
کٹورا صبح دوڑانے لگا خورشید گردوں پر

چادر مہتاب چرانے سے چاندنی کا لطف اٹھانا اور اس سے متمتع ہونا مراد رکھا ہے جو نہایت بعید الفہم ہے۔ جن لوگوں نے استعارہ وغیرہ کے استعمال میں مذکورہ بالا اصول کو ملحوظ نہیں رکھا ان کا کلام ہمیشہ غیر مقبول اور متروک رہا ہے جیسے بدر چاچی کے قصائد جن میں نہایت بعید الفہم استعارے استعمال کیے گئے ہیں۔ کہیں آہوئے مادہ سے آفتاب مراد لی ہے کہیں اشک زلیخا سے کواکب، کہیں اگنی سے شربت عقرب کہیں برگ بنفشہ سے حروف، کہیں آب خشک سے پیالہ، کہیں موج دریا سے پانچ انگلیاں اور اسی طرح کہیں زمین سے آسمان اور کہیں آسمان سے زمین۔

اردو میں شعراء نے استعارہ کا استعمال زیادہ تر محاورات کے ضمن میں کیا ہے کیونکہ اکثر محاورات کی بنیاد اگر غور کر کے دیکھا جائے تو استعارہ پر ہوتی ہے۔ مثلاً جی اچٹنا۔ اس میں جی کو ان چیزوں سے تشبیہ دی گئی ہے جو سخت چیز پر لگ کر اچٹ جاتی ہیں جیسے کنکر پتھر گولی وغیرہ یا مثلاً جی جلنا۔ اس میں جی کو ایسی چیز سے تشبیہ دی گئی ہے جو مشتعل اور محترق ہو سکے۔ آنکھ لگنا، دل لگانا، غصہ پی جانا، کام چلنا وغیرہ اسی طرح بہت سے محاورے استعارہ پر مبنی ہیں اور یہ وہ استعارے ہیں جن میں شعرا کی کارستانی کو کچھ دخل نہیں ہے بلکہ ہر ایک قوم میں بغیر فکر اور تصنع کے اہل زبان

مزے سے وقتاً فوقتاً نکل کر زبان کا جزو بن گئے ہیں۔ کنایہ بھی زیادہ تر محاورات ہی کے ضمن میں استعمال ہوا ہے مگر اردو شعرا نے تمثیل بہت کم برتا ہے۔ البتہ نئی طرز کی شاعری میں اس کا کچھ کچھ رواج ہو چلا ہے اور ضرورت نے لوگوں کو اس کے برتنے پر مجبور کیا ہے چونکہ موقع پر استعارہ کی تقریب سے محاورہ کا ذکر آ گیا ہے اس لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ محاورہ کے متعلق چند ضروری باتیں بیان کی جائیں۔

(ب) محاورہ لغت میں مطلقاً بات چیت کرنے کو کہتے ہیں۔ خواہ وہ بات چیت اہلِ زبان کے روزمرہ کے موافق ہو خواہ مخالف اصطلاح میں خاص اہلِ زبان کے روزمرہ یا بول چال یا اسلوبِ بیان کا نام محاورہ ہے۔ پس ضرور ہے کہ محاورہ تقریباً ہمیشہ دو یا دو سے زیادہ الفاظ میں پایا جائے کیونکہ مفرد الفاظ کو روزمرہ یا بول چال یا اسلوبِ بیان نہیں کہا جاتا۔ بخلاف لغت کے کہ اس کا اطلاق ہمیشہ مفرد الفاظ پر یا بہ الفاظ جو دو یا (۱) بمنزلہ مفرد کے ہیں کیا جاتا ہے۔ مثلاً پانچ اور سات دو لفظ ہیں جن پر الگ الگ لغت کا اطلاق ہو سکتا ہے مگر ان میں سے ایک کو محاورہ نہیں کہا جائے گا بلکہ دونوں کو ملا کر جب "پانچ سات" بولیں گے تب محاورہ کہا جائے گا۔ یہ بھی ضرور ہے کہ وہ ترکیب جس پر محاورہ کا اطلاق کیا جائے 'قیاسی' نہ ہو بلکہ معلوم ہو کہ اہلِ زبان اس کو اس طرح استعمال کرتے ہیں۔ مثلاً اگر پانچ سات یا سات آٹھ یا آٹھ سات پر قیاس کر کے آٹھ یا آٹھ چھ یا سات نو بولا جائے گا تو اس کو محاورہ نہیں کہیں گے۔ کیونکہ اہلِ زبان کبھی اس طرح نہیں بولتے یا مثلاً بلا ناغہ پر قیاس کر کے اس کی جگہ بے ناغہ، ہر روز کی جگہ ہر دن، روز روز کی جگہ دن دن یا آئے روز بولنا، ان میں سے کسی کو محاورہ نہیں کہا جائے گا کیونکہ یہ الفاظ اہلِ زبان کی بول چال میں کبھی نہیں آتے۔

کبھی محاورہ کا اطلاق خاص کر ان افعال پر کیا جاتا ہے جو کسی اسم کے ساتھ مل کر اپنے حقیقی معنوں میں نہیں بلکہ مجازی معنوں میں استعمال ہوتے ہیں۔ جیسے اتارنا اس کے حقیقی معنے کسی جسم کو اوپر سے نیچے لانے کے ہیں مثلاً گھوڑے سے سوار کو اتارنا، کھونٹی سے کپڑا اتارنا، کوٹھے پر سے پلنگ اتارنا، لیکن ان میں سے کسی پر محاورہ کے یہ دوسرے معنی صادق نہیں آتے۔ کیونکہ ان سب مثالوں میں اتارنا اپنے حقیقی معنوں میں مستعمل ہوا ہے۔ ہاں نقشہ اتارنا، نقل اتارنا، دل سے اتارنا، دل میں اتارنا، ہاتھ اتارنا، پیچ اتارنا، یہ سب محاورے کہلائیں گے کیونکہ ان سب مثالوں میں اتارنے کا اطلاق مجازی معنوں پر کیا گیا ہے۔ یا مثلاً کھانا، اس کے حقیقی معنے کسی چیز کو دانتوں سے چبا کر یا بغیر چبائے حلق سے اتارنے کے ہیں۔ مثلاً روٹی کھانا، دوا کھانا، افیم کھانا وغیرہ۔ لیکن ان میں سے کسی کو دوسرے معنی کے لحاظ سے محاورہ نہیں کہا جائے گا کیونکہ ان سب مثالوں میں کھانا اپنے حقیقی معنوں میں مستعمل ہوا ہے۔ ہاں غم کھانا، قسم کھانا، دھوکا کھانا، پچھاڑیں کھانا، ٹھوکر کھانا، یہ سب محاورے کہلائیں گے۔

محاورہ کے جو معنے ہم نے اوّل بیان کیے ہیں وہ عام یعنی دوسرے معنوں کو بھی شامل ہیں لیکن دوسرے معنے پہلے معنے سے خاص ہیں۔ پس جس ترکیب کو پہلے (دوسرے) معنوں کے لحاظ سے محاورہ کہا جائے گا اس کو دوسرے (پہلے) معنوں کے لحاظ سے بھی محاورہ کہا جا سکتا ہے لیکن یہ ضرور نہیں کہ جس ترکیب کو پہلے معنوں کے لحاظ سے محاورہ کہا جائے اس کو دوسرے معنوں کے لحاظ سے بھی محاورہ کہا جائے۔ مثلاً تین پانچ کرنا (یعنی جھگڑا فساد کرنا) اس کو دونوں معنوں کے لحاظ سے محاورہ کہہ سکتے ہیں کیونکہ یہ ترکیب اہلِ زبان کی بول چال کے بھی موافق ہے اور نیز اس میں تین پانچ کا لفظ اپنے حقیقی معنوں میں نہیں بلکہ مجازی معنوں میں بولا گیا ہے۔ لیکن روٹی کھانا یا میوہ کھانا یا پانچ سات یا دس بارہ وغیرہ پہلے معنوں کے لحاظ سے محاورہ قرار پا سکتے ہیں نہ دوسرے معنوں کے لحاظ سے کیونکہ یہ تمام ترکیبیں اگرچہ اہلِ زبان کی بول چال کے موافق اور ضرور ہیں مگر ان میں کوئی لفظ مجازی معنوں میں مستعمل نہیں ہوا آئندہ ہم دونوں معنوں میں تمیز کے لیے پہلی قسم کے محاورہ پر روزمرہ کا اور دوسری قسم پر محاورہ کا اطلاق کریں گے۔

روزمرہ اور محاورہ میں من حیث الاستعمال ایک اور بھی فرق ہے۔ روزمرہ کی پابندی جہاں تک ممکن ہو ضروری اور لازمی سمجھی گئی ہے۔ یہاں تک کہ کلام میں جس قدر روزمرہ کی پابندی کم ہو گی، اسی قدر وہ فصاحت کے درجے سے ساقط سمجھا جائے گا۔ مثلاً کہتے ہیں کہ "پشاور تک سات آٹھ کوس پر ایک پختہ سرا اور ایک کوس پر مینار بنا ہوا تھا۔" یہ جملہ روزمرہ کے مطابق نہیں ہے بلکہ اس کی جگہ یوں کہنا چاہیے "کلکتے سے پشاور تک سات سات آٹھ آٹھ کوس پر ایک ایک پختہ سرا اور کوس کوس بھر پر ایک ایک مینار بنا ہوا تھا۔" یا مثلاً "کئی دن سے ملنے کا موقع نہ ملا۔" یہاں "نہ ملا" کی جگہ "نہیں ملا" کہنا چاہیے یا "وہ خاوند کے مرنے سے درگور ہو گئی۔" یہاں "زندہ درگور ہو گئی" چاہیے یا

"سو گئے سب بخت تب بیدار آنکھیں ہو گئیں"

یہاں "ہو گئیں" کی جگہ "ہوئیں" کہنا چاہیے یا

"دیکھتے ہی دیکھتے یہ کیا ہوا"

یہاں "کیا ہو گیا" کہنا چاہیے۔

الغرض نظم ہو یا نثر روزمرہ کی پابندی جہاں تک ممکن ہو نہایت ضروری ہے مگر محاورہ کا ایسا حال نہیں ہے۔ محاورہ اگر عمدہ طور سے باندھا جائے تو بلاشبہ پست شعر کو بلند اور بلند کو بلند تر کر دیتا ہے لیکن ہر شعر میں محاورہ باندھنا ضروری نہیں بلکہ ممکن ہے کہ شعر بغیر محاورہ کے بھی فصاحت و بلاغت کے اعلیٰ درجہ پر واقع ہو اور ممکن ہے کہ ایک پست اور ادنیٰ درجے کے شعر میں بے تیزی سے کوئی لطیف و پاکیزہ محاورہ رکھ دیا گیا ہو۔ ایک مشہور شاعر کا شعر ہے ؎

گوہر اشک سے لبریز ہے سارا دامن ‏ ‏ ‏ ‏ آج کل دامن دولت سے ہے سارا دامن

اس شعر میں کوئی محاورہ نہیں باندھا گیا باوجود اس کے شعر تعریف کے قابل ہے۔ دوسری جگہ یہی شاعر کہتا ہے ؎

ان کا خط دیکھتے ہی جب صیاد

طوطے ہاتھوں کے اڑا کرتے ہیں

اس شعر میں نہ کوئی خوبی ہے نہ مضمون ہے، صرف ایک محاورہ بندھا ہوا ہے اور وہ بھی روزمرہ کے خلاف یعنی "اڑ جاتے ہیں" کی جگہ "اڑا کرتے ہیں"۔ محاورہ کو شعر میں ایسا سمجھنا چاہیے جیسے کوئی خوبصورت عضو بدن انسان میں اور روزمرہ کو ایسا جاننا چاہیے جیسے تناسب اعضا بدن انسان میں۔ جس طرح بغیر تناسب اعضا کے کسی خاص عضو کی خوبصورتی سے شخص بشری کامل نہیں سمجھا جا سکتا اسی طرح بغیر روزمرہ کی پابندی کے بعض محاورات کے جا و بے جا رکھ دینے سے شعر میں کچھ خوبی پیدا نہیں ہو سکتی۔

شعر کی معنوی خوبی کا اندازہ اہل زبان اور غیر اہل زبان دونوں کر سکتے ہیں لیکن لفظی خوبیوں کا اندازہ کرنا صرف اہل زبان کا حصہ ہے۔ اہل زبان عموماً اس شعر کو زیادہ پسند کرتے ہیں جس میں روزمرہ کا لحاظ کیا گیا ہو اور اگر روزمرہ کے ساتھ محاورہ کی چاشنی بھی ہو تو وہ ان کو اور بھی زیادہ مزا دیتی ہے مگر عوام اور خواص کی پسند میں بہت بڑا فرق ہے۔ عوام محاورہ یا روزمرہ کے ہر شعر کو خوش ہو کر سر دھننے لگتے ہیں اگرچہ شعر کا مضمون کیسا ہی مبتذل یا رکیک اور سبک ہو اور اگرچہ محاورہ کیسا ہی بے سلیقگی سے باندھا گیا ہو۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جن اسلوبوں میں وہ ایک دوسرے سے بات چیت کرتے ہیں جب انہی اسلوبوں میں وزن کی کھپاوٹ اور قافیوں کا تناسب دیکھتے ہیں اور معمولی بات چیت کو شعر کے سانچے میں ڈھلا ہوا پاتے ہیں تو ان کو ایک طرح کا تعجب اور تعجب کے ساتھ خوشی پیدا ہوتی ہے مگر خواص کی پسند اور تحسین کے لیے صرف اتنی

کے سامنے بچے میں طرح حال دینا کافی نہیں ہے۔ ان کے نزدیک محض تک بندی اور معمولی بات چیت کو موزوں کر دینا کوئی تعجب خیز بات
ہے۔ ہاں اگر وہ دیکھتے ہیں کہ ایک سنجیدہ مضمون معمولی روزمرہ میں کمال خوبی اور صفائی اور بے تکلفی سے ادا کیا گیا ہے تو بلاشبہ ان کو بے انتہا
حیرت ہوتی ہے کیونکہ فی الحقیقت شعر میں اور خاص کر اردو زبان میں کوئی بات اس سے زیادہ مشکل نہیں ہے کہ عمدہ مضمون معمولی بول چال اور
میں پورا پورا ادا ہو جائے۔ جن لوگوں نے روزمرہ کی پابندی کو سب چیزوں سے مقدم سمجھا ہے۔ ان کے کلام کو بھی جب نکتہ چینی کی نگاہ
سے دیکھا جاتا ہے تو جا بجا فروگذاشتیں اور کسریں نظر آتی ہیں۔ پس جب کوئی شعر باوجود مضمون کی متانت اور سنجیدگی کے روزمرہ اور محاورہ میں
ادا ہو جائے تو لامحالہ اس سے ہر صاحب ذوق کو تعجب ہوتا ہے مثلاً میر انشا اللہ خاں اس بات کو کہ افسردگی کے عالم میں خوشی اور
عشرت کی چھیڑ چھاڑ سخت ناگوار گزرتی ہے' اس طرح بیان کرتے ہیں ؎

نہ چھیڑ اے نکہت باد بہاری راہ لگ اپنی
تجھے اٹکھیلیاں سوجھی ہیں ہم بیزار بیٹھے ہیں

یا مثلاً مرزا غالب اتنے بڑے مضمون کو کہ (جب جو معشوق کے مکان پر پہنچا تو اول خاموش کھڑا رہا۔ پاسبان نے سائل سمجھ کر کچھ نہ کہا
معشوق کے دیکھنے کا حد سے زیادہ شوق ہوا اور صبر کی طاقت نہ رہی تو پاسبان کے قدموں پر گر پڑا۔ اب اس نے جانا کہ اس کا مطلب
اور ہے۔ اس نے غصے سے ساتھ وہ سلوک کیا کہ ناگفتہ بہ ہے) دو مصرعوں میں اس طرح بیان کرتے ہیں ؎

گدا سمجھ کے وہ چپ تھا مری جو شامت آئی
اٹھا اور اٹھ کے قدم میں نے پاسباں کے لیے

یا مثلاً مرزا غالب کہتے ہیں ؎

رونے سے اور عشق میں بے باک ہو گئے　　دھوئے گئے ہم ایسے کہ بس پاک ہو گئے

قاعدہ ہے کہ جب تک انسان عشق و محبت کو چھپاتا ہے اس کو ہر ایک بات کا پاس و لحاظ رہتا ہے لیکن جب راز فاش ہو
جاتا ہے تو پھر اس کو کسی سے شرم اور حجاب نہیں رہتا۔ اس شعر میں یہی مضمون ادا کیا گیا ہے۔ دھویا جانا، بے حیا اور بے لحاظ ہو جانے کو
کہتے ہیں اور پاک، آزاد اور نڈر ہونے کو کہتے ہیں۔ رونے کے لیے دھویا جانا اور دھوئے جانے کے لیے پاک ہونا۔ باوجود مناسبت لفظی نہایت بلیغ
محاورہ کی نشست اور روزمرہ کی صفائی کے مضمون پہلو پورا ادا ہو گیا ہے اور کوئی بات ان نیچرل نہیں۔ یا مثلاً مومن خاں کہتے ہیں ؎

کل تم جو بزم غیر میں آنکھیں چرا گئے
کھوئے گئے ہم ایسے کہ اغیار پا گئے

کھویا جانا، اغماض و بے توجہی کرنا ہے دیکھ پایا جانا، شرمندہ اور کھسیانا ہونا۔ پا جانا، سمجھ جانا یا تاڑ جانا یعنی ظاہر ہے، اس شعر کا مضمون
بالکل نیچرل ہے اور محاورات کی نشست اور روزمرہ کی صفائی قابل تعریف ہے۔ اگرچہ اس کا ماخذ مرزا غالب کا یہ شعر ہے ؎

گرچہ ہے طرز تغافل پردہ دار راز عشق
پر ہم ایسے کھوئے جاتے ہیں کہ وہ پا جائے ہے

مگر مومن کے ہاں زیادہ صفائی سے بندھا ہے۔ اسی قبیل کے یہ اشعار ہیں ؎

منہ خراب حال کو زاہد نہ چھیڑ تو   تجھ کو پرائی کیا پڑی اپنی نبیڑ تو
(ذوق)

چال ہے مجھ ناتواں کی مرغِ بسمل کی تڑپ   ہر قدم پر ہے یقیں یاں رہ گیا واں رہ گیا
(آتش)

جو ہے اختیار میں سو ہے تو قاصد   ہمیں آ کے اس کے قدم دیکھتے ہیں
(میر)

شاید اسی کا نام محبت ہے شیفتہ   اک آگ سی ہے سینے کے اندر لگی ہوئی
(شیفتہ)

یاں وفا اٹھ گئی زمانے سے   کبھی گویا جہاں میں تھی ہی نہیں
(داغ)

الغرض ردیف کی پابندی تمام اصناف سخن میں عموماً اور غزل میں خصوصاً جہاں تک ہو سکے نہایت ضروری چیز ہے اور معاملہ بندی کے سلیقے سے باندھا جانا شعر کا زیور ہے۔

(ج) صنائع و بدائع پر کلام کی بنیاد رکھنے سے اکثر معنی کا سر رشتہ ہاتھ سے جاتا رہتا ہے اور کلام میں بالکل اثر باقی نہیں رہتا کیونکہ مطلب کے حاصل ہونے میں یہ خیال گزرتا ہے کہ شاعر نے شعر کی ترتیب میں تصنع کیا ہے اور الفاظ میں اپنی کاریگری ظاہر کرنی چاہی ہے بالکل شعر کی تاثیر کو زائل کر دیتا ہے۔ پس صنائع کی پابندی اور التزام سے تمام اصناف سخن میں عموماً اور غزل میں خصوصاً ہمیشہ بچنا چاہیے۔ صنعتیں جیسا کہ اوپر مفصل مذکور ہے دو قسم کی قرار دی گئی ہیں ایک معنوی جیسے طباق، مشاکلہ، عکس، ایہام، حسن تعلیل، تجاہل عارفانہ، تعجب وغیرہ دوسری لفظی جیسے تجنیس، رد العجز علی الصدر، منقوط غیر منقوط، رقطا، خیفا، مقطع، موصل، ترصیع وغیرہ۔ پہلی قسم کی کل صنعتیں اور دوسری قسم کی خاص خاص صنائع و بدائع کے تمام نامور شعرا نے برتی ہیں مگر کبھی ان کا التزام نہیں کیا اور کلام کی بنیاد ان پر نہیں رکھی۔ ہاں اگر حسن اتفاق سے کبھی کوئی ایسا مناسب لفظ موجود ہو گیا جس سے معنی مقصود میں خلل واقع نہ ہو اور بیان میں زیادہ حسن پیدا ہو جائے ایسے موقع کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا جیسے خواجہ حافظ کہتے ہیں۔

بزیر دلق ملمع کمندہا دارند   دراز دستی این کوتہ آستیناں بین

اس شعر میں دراز اور کوتہ کے لحاظ سے صنعت طباق اور دست و آستین کے اعتبار سے مراعات النظیر ہے مگر دونوں صنعتیں ایسی بے تکلف اور مناسب طور پر واقع ہوئی ہیں کہ معنی مقصود میں بجائے اس کے کہ خلل پیدا ہو اور زیادہ قوت پیدا کر دی ہے اور شعر کا حسن دوبالا کر دیا جیسے میر تقی کہتے ہیں۔

یہ چشم شوخ آب میں رو دیں   ایک خانہ خراب ہیں دونوں

اس میں ایک کا لفظ ایسا بے ساختہ اور بے تکلف واقع ہوا ہے کہ گویا شاعر نے اس کو قصداً نہیں کہا۔ میاں ایک کے معنی میں نہایت بے مثل انتخاب، پڑھا جا سکتے ہیں وہ ایک صفت ہے یعنی وہ لوگ کہ ایک ہی پشت میں دو دو نسل کے ساتھ

...ایک لفظ نے اگر شعر کو نہایت بلند کر دیا ہے ورنہ نفسِ مضمون کے لحاظ سے اس کی کچھ بھی حقیقت نہ تھی۔ یہاں فی الحقیقت محض مراعاۃ النظیر ...س شعر میں اصلی معجز کی بلاغت پیدا نہیں کی بلکہ اس بات نے پیدا کی ہے کہ دو چیزوں پر لفظ 'ایک' کا اطلاق ایسی خوبی اور بے تکلفی سے ہوا ...اس سے بہتر تصور میں نہیں آ سکتا ورنہ ایک شعر یا ایک مصرع میں 'ایک' اور 'دو' کا جمع کر دینا کہ اسی کا نام مراعاۃ النظیر ہے کوئی بڑی ...نہ تھی۔

حسنِ مطلع

ایک سب آگ ایک سب پانی
دیدہ و دل عذاب ہیں دونوں

اس شعر میں بھی آگ اور پانی کا مقابلہ نہایت بے تکلفی سے واقع ہوا ہے۔ پس اگر اس قسم کی مناسبت لفظی اتفاق سے شعر ...پیدا ہو جائے تو یہ شاعری کا زیور ہے مگر قصداً ایسی رعایتوں کی جستجو کرنے سے آخر کار شاعری شاعری نہیں رہتی بلکہ مسخرا پن ہو جاتا ہے۔ ...مشہور شاعر فرماتے ہیں ؎

مرغِ دل کو تو ڑلے گی بلی ترے دروازہ کی
رخصت تو کر کترے گا چوہا تمہاری ناک کا

چونکہ بلی کے لیے چوہا لانا واجبات سے تھا اس لیے جب اصل چوہا نہ ملا نا چار ناک ہی کے چوہے پر قناعت کی۔

کھانے کی اصل خوبی یہ ہے کہ لذیذ ہو، مفید ہو، جزوِ بدن بننے کے لائق ہو، بو باس اور رنگ و روپ بھی اچھا رکھتا ہو، اگر با وجود ...ب باتوں کے چینی کے باسنوں میں کھایا جائے تو اور بھی بہتر ہے۔ یہی حال شعر کا ہے۔ شعر کی اصل خوبی یہ ہے کہ نیچرل ہو، موثر ہو، لفظاً اور ...سانچہ میں ڈھلا ہو۔ اگر اس کے ساتھ کوئی لفظی رعایت بھی اس میں پائی جائے تو اور بہتر ہے ورنہ اس کی کچھ ضرورت نہیں۔

ہر زبان میں صنعتِ الفاظ (اگر ہمارا قیاس غلط نہیں ہے) متقدمین کی نسبت متاخرین کے کلام میں زیادہ پاؤ گے کیونکہ اکثر متاخرین معنی ...یں کو دہرا سکتے ہیں جہاں سے پہلے قدما نعرہ گئے ہیں پس تا وقتیکہ وہ صنعتِ الفاظ کو کام میں نہ لائیں انہیں (انہی؟) معمولی باتوں میں کوئی کرشمہ ...دکھا سکتے۔

متاخرین میں صنائع کا خیال زیادہ تر اس سبب سے پیدا ہوتا ہے کہ قدما کے کلام میں کچھ اشعار ایسے پائے جاتے ہیں جن میں ...ر خوبی معنی کے اتفاق سے کوئی لفظی مناسبت بھی پیدا ہو گئی ہے چونکہ وہ اشعار عموماً پسند کیے جاتے ہیں بعض لوگ غلطی سے خیال کر لیتے ...ان کی مقبولیت کا سبب وہی لفظی مناسبت ہے اور بس، اب وہ بہ تکلف انہی صنعتوں کو اپنے کلام میں جا و بے جا استعمال کرنا شروع کرتے ...اصل خوبی قدما کے کلام میں ہوتی ہے اس کا مطلق خیال نہیں کرتے۔ اس کی مثال بعینہٖ ایسی ہے کہ ایک جامہ زیب اور حسین آدمی جس پر ...لباس بدنما نہیں معلوم ہوتا، اتفاق سے بسنت کی ٹوپی اور کارچوبی انگرکھا پہن کر نکلے اور لوگ اس کی ریس سے ویسے ہی کپڑے پہننے لگیں اور ...سمجھیں کہ اس کی زیبائش کا اصلی سبب حسن و جمال ہے نہ بسنت کی ٹوپی اور کارچوبی انگرکھا۔

صنعتِ الفاظ نے ہماری شاعری بلکہ ہمارے تمام لٹریچر کو جس انتہا درجہ پر پہنچایا ہے جس کی تفصیل کے لیے ایک جدا کتاب لکھنے ...ضرورت ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ جس طرح عجائبِ قدرت کی تعظیم ہوتے ہوتے آخر کار دنیا میں عجائب پرستی ہونے لگی اور خدا کا خیال جاتا رہا ...طرح ہمارے لٹریچر میں صنائع لفظی کی لے بڑھتے بڑھتے آخر کار محض الفاظ پرستی باقی رہ گئی اور معنی کا خیال بالکل جاتا رہا۔ صنائع بدائع کی پابندی

دلی کے شعراء میں بھی بہت کم پائی جاتی ہے بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ بالکل نہیں پائی جاتی۔ البتہ لکھنؤ کے بعض شعراء نے اس کا بہت پابندی کے ساتھ التزام کیا ہے اور بتابعہ اہلِ دہلی لکھنؤ کے عام شعراء بھی رعایتِ لفظی کا زیادہ خیال کرتے ہیں۔ لیکن ایران کی غزل کے مقابلہ میں اُردو شاعری اس آفت سے بہت محفوظ ہے۔ جہاں تک ہم کو معلوم ہے وہ بیہودہ لفظی صنعتیں جن میں معنی سے بالکل قطع نظر کر لی جاتی ہے اور بعض ایک لفظوں کا توڑ کر دھندا بنایا جاتا ہے جیسے منقوط، غیر منقوط، رقطا، خیفا، ذوقافتین اور ذوالحرفین وغیرہ وغیرہ اُردو شاعری میں کیا ہے ہیں مگر بجائے صنائع لفظی کے اُردو غزل میں ایک اور رنگ پیدا ہو گیا ہے جو صنائع سے بھی زیادہ معنی کا خون کرنے والا ہے۔

(د) سنگلاخ زمینوں میں لکھنؤ اور دلی کے شعرائے متاخرین نے ہزاروں غزل لکھی ہے۔ میرؔ، سوداؔ، جراتؔ، دردؔ وغیرہ کے ہاں ایسی زمینوں میں بہت کم غزلیں پائی جاتی ہیں۔ اس کی ابتداء مصحفیؔ اور انشاؔ کے وقت سے ہوئی ہے اور شاہ نصیرؔ نے سب سے زیادہ اس میں طبع آزمائی کی ہے۔ ذوقؔ کو بھی ابتدائی شاعری میں اس کا بہت چسکا رہا ہے۔ ظفرؔ کے کلام میں بھی ایسی زمینیں بہت ہیں۔ البتہ غالبؔ، ممنونؔ، مومنؔ، شیفتہؔ، داغؔ وغیرہ نے ایسی زمینیں بہت کم اختیار کی ہیں۔ لکھنؤ کے شعراء نے بھی سخت زمینوں میں بے انتہا غزلیں لکھی ہیں۔

جو لوگ شاعری کے فرائض پورے پورے ادا کرنے چاہتے ہیں وہ اس بات کا اندازہ کر سکتے ہیں کہ شعر کے سرانجام دینے میں کوئی چیز ایسی مشکل نہیں جیسا مضمونِ شعر کے لیے مناسب قافیہ بہم پہنچانا۔ اسی لیے جب کسی کو سخت وقت پیش آتا ہے تو کہتے ہیں کہ اس کا قافیہ تنگ ہو گیا۔ اسی قافیہ کی مشکلات سے بچنے کے لیے یورپ کے شعراء نے آخرکار ایک بلینک ورس یعنی نظمِ غیر مقفّیٰ نکال لی ہے اور اب زیادہ تر وہاں اسی طرح کی نظم پر شاعری کا دار و مدار ہے۔ ہمارے ہاں اس پر طرّہ یہ ہے کہ قافیہ کے پیچھے ایک ردیف کا دُم چھلا اور لگا لیا گیا ہے۔ اگرچہ ردیف ایسی ضروری نہیں سمجھی جاتی جیسا قافیہ سمجھا جاتا ہے لیکن غزل میں اور خاص کر اُردو غزل میں تو اس کو وہی رتبہ دیا گیا ہے جو قافیہ کو۔ اگر تمام اُردو دیوانوں میں غیر مردّف غزلیں تلاش کی جائیں تو دس بیس غزلیں شاید گنتی کی نکلیں۔ پس جب کہ ردیف اور قافیہ کی گھاٹی خود دشوار گزار ہے تو اس کو اور زیادہ کٹھن اور ناقابلِ گزر بنانا انہی لوگوں کا کام ہو سکتا ہے جو معنی سے کچھ سروکار نہیں رکھتے اور شاعری کو تاں صرف قافیہ پیمائی سمجھتے ہیں اور بس۔

جہاں تک سنگلاخ زمینوں کا استقرا کیا جاتا ہے ان میں یا تو ردیف اور قافیہ ایسا اختیار کیا جاتا ہے جن میں باہم ذرا کچھ مناسبت نہ ہو۔ مثلاً تقریر پشتِ آئینہ، زنجیر پشتِ آئینہ، تدبیر پشتِ آئینہ اور جبل کی مکھی، محل کی مکھی، دھول اور حسس کی تیلیاں، طلس کی تیلیاں، نفس کی تیلیاں یا ردیف ایسی بھی اختیار کرتے ہیں جو ایک آدھ سے زیادہ شعروں میں معقول طور پر نہیں آ سکتی جیسے فلک پہ بجلی، زمیں پہ باراں، سر پہ مژہ، ڈر گئے ہیں، نگاہ خدنگ و نگاہ کماں، غرض یہ کہ قصداً ایسی طرح تجویز کرتے ہیں جس میں عمدہ مضمون بندھنا تو یقیناً ناممکن ہو اور با معنی شعر نکالنا بھی نہایت مشاق و ماہر استادوں کے سوا عام شعراء کے لیے قریب ناممکن کے ہو۔ ایسی زمینوں میں بڑا کمال شاعر کا یہ سمجھا جاتا ہے کہ قافیہ اور ردیف میں جو منافرت ہو وہ بظاہر جاتی رہے گویا تیل اور پانی کو ملایا جاتا ہے۔ ایسی غزلوں میں اور امیر خسروؔ کی انمل میں کچھ تھوڑا ہی سا فرق معلوم ہوتا ہے۔ امیر خسروؔ نے کھیر، چرخہ، ڈھول اور کتا ان چار چیزوں کا اس طرح پیوند ملایا ہے ؎

کھیر پکائی جتن سے چرخہ دیا جلا
آیا کتا کھا گیا تو بیٹھی ڈھول بجا

ایک شاعر گلگیر اور پشت آئینہ کو اس طرح پیوند دیتا ہے ؎

آرسی پہنے ہوئے وہ گل جو لیوے شمع کا
ہم انگوٹھے کو کہیں گلگیر پشت آئینہ

ایک اور شاعر نے گل اور مکھی کو اس طرح گانٹھا ہے ؎

صنعت لعبت چینی دیکھ و لاحا کو تو
دیکھنی گر تجھے منظور ہو گل کی مکھی

اسی پر قیاس کر لینا چاہیے کہ کل سنگلاخ زمینوں میں اس کے سوا اور کچھ مقصود نہیں ہوتا کہ دو بے میل چیزوں میں میل ثابت کیا جائے۔ پس شاعر کو چاہیے کہ ہمیشہ ردیف ایسی اختیار کرے جو قافیہ سے میل کھاتی ہوئی ہو اور ردیف و قافیہ دونوں مل کر دو تین لفظوں سے زیادہ نہ ہوں بلکہ رفتہ رفتہ مردف غزلیں لکھنی کم کرنی چاہئیں اور سر دست محض قافیہ پر قناعت کرنی چاہیے۔ قافیہ ایسا اختیار کرنا چاہیے جس کے لیے قدر ضرورت سے دس گنے بلکہ بیس گنے زیادہ الفاظ موجود ہوں ورنہ مضمون کو قوافی کا تابع کرنا پڑے گا۔ قافیے مضمون کے تابع نہ ہو سکیں گے۔ جتنے نامور شعراء گزرے ہیں انھوں نے یہی اصول مد نظر رکھا ہے اور ہمیشہ ایسی زمینیں اختیار کی ہیں جن میں ہر قسم کے مضمون کی گنجائش ہو۔

مولانا عبدالسلام ندوی

اردو غزل گوئی کے چار دور ہیں اور چاروں کی خصوصیات الگ الگ ہیں۔
قدماء کے پہلے اور دوسرے دور کی زبان نہایت ثقیل اور مکروہ ہے اور ان میں لفظی غلطیاں بکثرت پائی جاتی ہیں۔ چنانچہ تاریخ شعرائے اردو میں شاہ مبارک آبرو کے حال میں لکھا ہے:

"مگر استعمال الفاظ مکروہ کا اور نہ پروا کرنا باریک باتوں کا یعنی جائز رکھنا قافیہ سین اور صاد کا اس کے کلام سے دریافت ہوتا ہے۔ نہ صرف اسی کے کلام میں بلکہ اس کے ہم عصروں کے کلام میں اس سے زیادہ ہے۔" (تاریخ شعرائے اردو صفحہ ۱۵)

ایک نامعلوم الاسم قلمی تذکرے میں جو انجمن اردو لکھنؤ کی نمائش میں پیش کیا گیا تھا، شاہ حاتم کے حالات میں لکھا ہے:-

"زبانش بازبان ولی دکنی مناسبت دارد"

سودا مسلم زبان ہیں لیکن مصحفی اپنے تذکرے میں ان کے متعلق تحریر فرماتے ہیں:

"و بعضے بسبب دریافت اغلاط صریح و توارد صاف در بعض اشعارش بجہل و منفراتش نیز نسبت میدہند"

تذکرہ مہر جہاں تاب میں ہے:

"در بیشتر اشعارش الفاظ رکیک و غیر فصیح اندراج یافتہ و بسبب انکساری بعضے از کلمات از چشم صحت ملاحظہ نفرمودہ۔"

لیکن قدما کے تیسرے دور میں جب مناظرہ کا عام رواج ہوا اور شعراء میں باہم رد و قدح ہونے لگی تو صحت الفاظ کی طرف
کسی قدر توجہ دی گئی اور اس قسم کی غلطیوں پر اعتراضات کیے جانے لگے۔ چنانچہ میر حسن انشاء بندرابن راقم کے اس مصرعے پر ؎

"کام عاشقوں کا کچھ تجھے منظور ہی نہیں"

ان الفاظ میں نکتہ چینی کرتے ہیں:

"اغلب کہ این شعر بے اصلاح باشد، چرا کہ از وقتادن عین نامعلوم می شود۔ در ین جا عین کی
افتادن خطا است، در دانستہ فقیر چنین بہتر می شود ؎
میاں ز کام کچھ ہے تجھے منظور ہی نہیں"

شیخ معین الدین مبتلی کے تذکرے میں فرماتے ہیں:

خوش ہم عریانی سے استغنا ہیں رنگ بجائے گل
نکلے جاتے ہیں ٹھہرتے نہیں پوشاک میں ہم

"خوش ہم عریانی ناموزوں است۔ پیرا کہ میم با پیچان ساکن پیوستہ است کہ میم چون چشم غزال از میان
رم کردہ است و این سخت عیب است۔"

بالخصوص سعادت خاں رنگین نے اس طرف زیادہ توجہ کی اور اپنے معاصرین کے کلام پر اس حیثیت سے سخت نکتہ چینیاں کیں
چنانچہ تذکرۂ مہر جہاں تاب میں ہے:

"ہر چند کلامے ہم عہدش از ایراد بعض الفاظ کہ بہ ہندی و ثقل نشست آں بعد رفع کلمات ثقیلہ قدماء
جائز داشتند و در شعر خود ہا درج کردند آں ہم از اشعار خود برانداخت و از ینجا است کہ کسے از
قدماء و ہم عہدانش نبود کہ در شعرش نباختے بر نیاوردہ و اعتراض نفرمودہ و بلا خلاف مباحث و
غلطہائش پیداست کہ اعتراض بے جا نہ بود" (تذکرۂ مہر جہاں تاب، تذکرۂ رنگین)

اسی دور نے ترقی کر کے متوسطین کے زمانے میں شیخ ناسخ جیسا مصلح زبان و مجدد فن پیدا کیا جنھوں نے الفاظ کی تنقیح و تہذیب
نہایت مکمل طور پر کر دی اور ان کے بعد کے شعراء اسی زبان کی پیروی کرتے ہیں البتہ دور جدید کے بعض شعراء ان قیود کی پابندی ضروری نہیں
سمجھتے۔ ان مکروہ، ثقیل اور غلط الفاظ کے ساتھ قدماء بعض مضامین بھی نہایت سبک اور مبتذل باندھتے ہیں مثلاً ؎

چوپڑ کے کھیلنے کا سامان ہے خلاصہ — شاید کبھی وہ رکھ بیٹھے ہمارے پاس آ (آبرو)
وہی ہے دریا اور پر بھی — لاد لاتا ہے میں اسے کس گھاٹ (آبرو)
یا رب وہ صنم کبھی نہ کرے کام خدا کا — رام اس کا خدا ہے وہ نہیں رام خدا کا (احسن)

ولی، میر درد اور میر سوز کے کلام میں بے شبہ اس قسم کے الفاظ اور مضامین نہیں پائے جاتے لیکن سودا، میر اور قائم کا
کلام اس داغ سے پاک نہیں ہے۔

غالباً اس زمانے میں ہجوگوئی کا جو عام رواج ہوگیا تھا اسی نے اس زمانے میں اس قسم کی فحش اور مبتذل زبان پیدا کر دی تھی۔

وجہ ہے کہ غزل میں بھی جہاں جہاں ہجو گوئی کا موقع آیا ہے وہیں اس قسم کی زبان استعمال کی گئی ہے۔ مثلاً واعظ، محتسب اور رقیب کو جہاں جہاں صلواتیں سنائی گئی ہیں اسی قسم کی زبان میں سنائی گئی ہیں۔ لیکن متاخرین کے تیسرے دور میں زبان کسی قدر فحش الفاظ سے پاک ہوئی اور متوسطین کے دور میں جیسا کہ اوپر گذر چکا ہے، ناسخ نے زبان کو نہایت مہذب اور شائستہ بنا دیا اور آج تمام شعراء اسی زبان کے مقلد ہیں بلکہ دورِ جدید کے شعراء بوسہ اور وصل وغیرہ کا نام بھی لینا پسند نہیں کرتے۔

غالباً انہی خصوصیات کا اثر یہ ہے کہ قدماء کے کلام میں سخت ناہمواری پائی جاتی ہے مثلاً ایک غزل میں ایک شعر نہایت بلند اور دوسرا نہایت پست ہوتا ہے۔ ایک شعر کی زبان نہایت شیریں، لطیف اور نرم ہوتی ہے اور دوسرے میں فحاشی اور بدزبانی پائی جاتی ہے۔ ایک شعر نہایت مہذب اور باوقار ہوتا ہے لیکن دوسرے شعر میں ابتذال اور رکیکی موجود ہوتی ہے۔ صرف خواجہ میر درد ایک ایسے بزرگ ہیں جن کا کلام اول سے آخر تک اس قدر ہموار ہے کہ اس میں انتخاب کی گنجائش نہیں۔ چنانچہ میر حسن ان کے تذکرے میں لکھتے ہیں:

"دیوانش اگرچہ مختصر است لیکن چوں کلام حافظ سراپا انتخاب۔"

ایک نامعلوم الاسم تذکرے کی عبارت جو انجمن اردو لکھنؤ کی نمائش میں پیش کیا گیا تھا اس سے زیادہ صاف ہے:

"دیوانِ ریختہ اش اگرچہ از ہزار بیت تجاوز نیست لیکن ہمہ یکدست واحتیاج بہ انتخاب ندارد۔"

ان کے علاوہ اور جتنے قدیم شعرا ہیں سب کے کلام میں نشیب و فراز موجود ہے چنانچہ نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ سودا کے حال میں لکھتے ہیں:

"مقدار را مانند فصحائے متاخرین پیرامونِ حافظہ ناگزیر، دل نہ این بود کہ ہر شعر دل پسند برآید، و
ہر بیت تحاشِ نشین۔ لہٰذا در کلام ایشاں رطب و یابس واقع شدہ، چہ در قصیدہ و چہ در غزل۔"

میر کی نسبت بعض تذکروں میں لکھا ہے کہ:

"پستش بغایت پست و بلندش بسیار بلند۔"

اگرچہ نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ اس رائے کو تسلیم نہیں کرتے چنانچہ گلشن بےخار میں لکھتے ہیں:

"پستش اگرچہ اندک پست است اما بلندش بسیار بلند"

تاہم جیسا کہ اس عبارت سے ثابت ہوتا ہے ان کو بھی اس سے انکار نہیں کہ ان کے کلام میں جا بجا پستی پائی جاتی ہے لیکن شعراء کے تیسرے دور میں سب سے پہلے جیسا کہ اوپر گذر چکا ہے مصحفی نے اس طرف توجہ کی اور متوسطین میں ناسخ و آتش نے زمینِ شعر کو بالکل ہموار کر دیا اور شعرائے دہلی کی فارسی ترکیبوں نے اس ہمواری میں اور اضافہ کیا۔ چنانچہ مولانا حالی اپنے دیوان کے مقدمہ میں لکھتے ہیں:

"ان کے بعد دلی میں مومن، غالب، موتمن اور شیفتہ وغیرہ کے یہاں فارسی ترکیبوں نے اردو غزل میں زیادہ دخل پایا۔ ان لوگوں کا یہ خیال تھا کہ غزل میں اعلیٰ درجہ کا شعر ایک یا دو سے زیادہ نہیں نکل سکتا۔ باقی بھرتی ہوتی ہے۔ اگلے شعراء شعر گوئی کی کچھ پروا نہ کرتے تھے

ایک تو وہ شعرا چھانکل آیا باقی کمندہ اور اچھے شعروں سے غزل کا نصاب پیدا کر دیں اگر
یہ کر سکتے ہیں کہ اپنے بھرتی کے اشعار کو فارسی ترکیبوں سے چست کر دیتے ہیں لیکن یہ انداز

میں تجربہ معلوم ہوں :۔ (مقدمہ حالی مطبوعہ نامی پریس صفحہ ۱۴۸ ، ۱۴۸)

لیکن غلطی سے دورِ جدید کے بعض شعراء انہی فارسی ترکیبوں کو اصلی زیور سمجھتے ہیں۔

قدماء کے دورِ اوّل کی ایک امتیازی خصوصیت ایہام گوئی یعنی رعایتِ لفظی بھی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب مرزا جانِ جاناں نے اردو شاعری کو فارسی قالب میں ڈھالنا چاہا تو سب سے پہلے راستے سے اسی سنگِ راہ کو دور کیا اور ان کے بعد تمام مصلحین شاعری نے یہی روش اختیار کی لیکن باایں ہمہ یہ خصوصیت کچھ نہ کچھ ہر دور میں قائم رہی۔ میر مصلحین شاعری کے زمرے میں شامل ہیں لیکن یہ صنعت ان کو نہایت مرغوب ہے چنانچہ فرماتے ہیں ؎

یاں چلتیں ہل گیا واں خبر — اپنی تھگی چلائے جاتا ہے
یہ جملی کہ دعویٰ اس کے لبِ خنداں سے — بس کچھ نہ چلا ورنہ چلتے کو چپ جاتا

انھوں نے خود نکات الشعراء میں لکھا ہے:

"اکنوں طبعہا مصروف ایں صنعت کم است مگر بسیار شستگی بستہ شود"

مصحفی اگرچہ بجائے خود اس صنعت کو پسند نہیں کرتے چنانچہ اپنے تذکرے میں لکھتے ہیں:

"اما فقیر اشعارِ ایہام را دوست ندارد"

✦

اس کے بعد ناسخ و آتش کا زمانہ آیا تو انھوں نے نہایت وسعت کے ساتھ اس سرمایۂ محفوظ سے کام لیا اور ان کے بعد ایک مدت تک اہلِ لکھنؤ اس صنعت میں کمالات دکھاتے رہے بالخصوص امانت لکھنوی اس شریعت کے خاتم المرسلین قرار پائے۔

✦

اس زمانے میں فارسی شاعری کا سب سے بڑا عیب یہ خیال کیا جاتا ہے کہ اس میں مرد کو معشوق بنایا گیا جس سے متعدد غیر فطری مضامین پیدا ہو گئے لیکن یہ عیب اردو کے شعرائے قدیم میں فارسی شاعری سے بھی زیادہ نمایاں ہو گیا ہے۔

✦

شعرائے لکھنؤ نے زنانہ خصوصیات کو زیادہ نمایاں کیا یہی وجہ ہے کہ ان لوگوں کے یہاں انگیا، کرتی، دوپٹہ، مسی، پازیب اور چھاگل وغیرہ کے مضامین بکثرت پائے جاتے ہیں۔ البتہ شعرائے دہلی کا کلام ان دونوں قسم کی بے اعتدالیوں سے محفوظ رہا بالخصوص مولانا حالی کی اصلاح کے بعد دورِ جدید کے شعراء نے ایک وجودِ مطلق کو اپنا معشوق قرار دیا جو مرد اور عورت دونوں پر یکساں صادق آسکتا ہے۔

لیکن اگر ان معائب سے قطع نظر کر لی جائے تو قدما کا کلام متعدد حیثیتوں سے موجودہ مذاق کے بالکل مطابق ہے مثلاً اردو شاعری کی اصلاح کے متعلق جدید تعلیم یافتہ گروہ کا ایک مطالبہ یہ ہے کہ اردو اور فارسی زبان میں ردیف کا التزام کیا ایک شاعرانہ

ے شاعری کی پابندیاں بڑھ جاتی ہیں اور اظہار خیال کے لیے میدان تنگ ہو جاتا ہے۔
ں یہ ہے روایت کو بالاے طاق رکھ کر صرف قافیہ کا التزام کر لینا چاہیے اور تعداد نشاں کے اس مطالبے کو بہت کچھ پورا کر دیا ہے۔

◆

جس طرح صوفیہ کے نزدیک شریعت کے ظاہری اور باطنی دو رخ ہیں اسی طرح محققین کے نزدیک شاعری بھی خارجی اور
ں میں منقسم ہے۔ خارجی شاعری میں اشیاء کے ظاہری خال و خط نمایاں کیے جاتے ہیں اس لیے اس سے صرف نظم مدت
ناٹکی اور واقعہ نگاری میں کام لیا جا سکتا ہے کیونکہ ان تمام اصناف میں شاعر صرف انھی چیزوں کی تصویر کھینچتا ہے جو حس
ں ہے۔ خود اس کو اپنے اندرونی جذبات کی آمیزش سے ان تمام چیزوں کو علیحدہ رکھنا پڑتا ہے لیکن غزل تمام تر شاعر
ی جذبات و کیفیات کی تشریح ہوتی ہے اس لیے اس میں صرف شاعری کے داخلی پہلو سے کام لیا جا سکتا ہے اور
کلام کا اصلی امتیازی وصف یہی ہے کہ انھوں نے شاعری کے ان دونوں حصوں کو بالکل الگ الگ رکھا، یعنی قصائد وغیرہ
حصے سے کام لیا ہے اور غزل کو تمام تر جذبات و کیفیات سے لبریز کر دیا۔
غزل کی یہی حقیقت ہے جس کو ولی نے نہایت اختصار کے ساتھ ایک شعر میں بیان کیا ہے ؎

ولی شعر میرا سراپا ہے درد خط و خال کی بات ہے خال خال

اور ولی کے بعد میر، سودا، درد، سوز اور مصحفی وغیرہ نے اسی فن کی تفسیر کی ہے۔

◆

قدماء کے دور میں سب سے پہلے مصحفی، انشا اور جرأت نے اس طرز میں کسی قدر تغیر پیدا کیا اور خارجی مضامین یعنی
ل خد و خال کے ذکر سے بھی غزل کو آشنا کیا اس کے بعد متوسطین کے دور میں ناسخ، آتش اور ان کے تلامذہ نے اپنی تمام تر توجہ
رجی اوصاف کی طرف مبذول کر دی اور متاخرین اساتذۂ لکھنؤ کے زمانہ تک وہاں کے تمام شعراء زلف و گیسو کے پھندے میں الجھے
یں اساتذۂ دلی نے قدماء کی روش کو بدستور قائم رکھا اس لیے ان کی غزلیں حدود غزل سرائی سے باہر ہونے نہ پائیں۔

◆

شعرائے لکھنؤ میں جلال نے بھی کم و بیش قدماء ہی کے طرز کا تتبع کیا ہے۔

◆

اور شعرائے دور جدید کی گرم بازاری تو تمام تر اسی طرز کی بدولت ہے۔
(شعر الہند)

فیسر حامد حسن قادری

غزل کے معنی ہیں عشق و جوانی کا ذکر کرنا۔ شاعری میں غزل اس نظم کو کہتے ہیں جس میں حسن و عشق، اخلاق و تصوف وغیرہ مختلف
ہا بند اور ہر شعر الگ مضمون کا ہو۔

غزل کے پہلے شعر کے دونوں مصرعوں کا قافیہ ہوتا ہے۔ اس کو مطلع کہتے ہیں [illegible]
کو حسن مطلع کہتے ہیں۔ سب غزل شروع میں ایک ہی مصرعے کے بعد [illegible] باقی اشعار میں دوسرے مصرعے میں [illegible]
ہے۔ آخری شعر میں شاعر کا تخلص ہوتا ہے اس کو مقطع کہتے ہیں۔ غزل کے مضامین کو شاعری [illegible] تغزل کہتے ہیں۔

اردو شاعری فارسی شاعری کی تقلید ہے اور فارسی عربی کی۔ عربی قصائد کی تشبیب میں جو غزل کی شکل کی [illegible] قصیدہ میں عاشقانہ مضامین لکھتے تھے اور اس کو غزل و تغزل کہتے تھے لیکن یہ قصیدہ غزل مسلسل ہوتی تھی۔ فارسی والوں نے اس کو غزل کے نام سے مستقل صنف شاعری بنا لیا۔ رفتہ رفتہ غزل عشق و محبت کے مضامین تک محدود نہ رہی بلکہ حقیقت و تصوف [illegible] لگے۔ ایک شعر میں محبت، دوسرے میں نفرت، تیسرے میں وصل [illegible] اخلاق [illegible] تصوف اس طرح غزل تمام اقسام کے مضامین و خیالات کا مجموعہ ہوگئی اور یہ رنگا رنگی غزل کی مقبولیت کا سبب ہو گئی۔

(پہلا دور) جس وقت اُردو زبان بنی اور بول چال میں آنی شروع ہوئی اسی وقت سے فارسی شاعروں نے ایسی نظمیں کہنی شروع کر دی تھیں جن میں آدھا مصرع فارسی آدھا اُردو یا ایک مصرع فارسی ایک اُردو ہوتا تھا۔ چنانچہ حضرت امیر خسرو کی بعض غزلیں اسی طرح کی موجود ہیں۔ مثلاً امیر خسرو کی غزل کا ایک شعر یہ ہے ؎

بحالِ یک از دل دو چشم جادو بصد فریبم ببرد تسکیں
کسے پڑی ہے جو جا سناوے پیارے پی کو ہماری بتیاں

اس کے بعد اُردو ہی میں غزلیں لکھی جانے لگیں۔ کبیر داس (وفات [illegible]) مشہور درویش اور شاعر گزرے ہیں
غزل کا مطلع ہے ؎

ہمن ہے عشق مستانہ ہمن کو ہوشیاری کیا
رہیں آزاد یا جگ میں ہمن دنیا سے یاری کیا

اس کے بعد اکبر و جہانگیر کے زمانے میں بھی بعض شعراء نے غزلیں لکھیں۔ اسی زمانے میں دکن کی سلطنت گولکنڈہ [illegible] محمد قلی قطب شاہ (وفات ۱۶۱۱ء) بڑا زبردست اُردو شاعر تھا۔ اس کا کلیات نظم جس میں غزلیں، قصیدے، مثنویاں، رباعیاں سب کچھ ہیں، حیدرآباد کے سرکاری کتب خانہ آصفیہ میں محفوظ ہے۔ اس کے دو شعر یہ ہیں ؎

قطب شہ نہ دے مجھ دوانے کو پند　　　دوانے کوں کچھ پند دیا جاتے نا

مجھ عشق کے گدا کوں او ملک شاہی دیتا　　　سب عاشقاں میں اچھے ہیں قطب جگ دبستاں

(دوسرا دور) قطب شاہ کے زمانے کے بعد غزل کا سب سے بڑا شاعر ولی اورنگ آبادی ہے۔ ولی کے کلام [illegible] الفاظ اور محاورے زیادہ ہوتے تھے۔ جب وہ دہلی آئے تو یہاں کی زبان لکھنے لگے۔ شروع میں ولی نے بھاشا کی انداز بیان اور خیالات و جذبات اختیار کئے اور ایسے شعر لکھے ؎

برہ کی جو کہاتے ہیں انھیں گھر بار کیا کرنا　　　ہو جوگی جو کمائی پی کی اسے سنسار کیا کرنا

...رولی کا اثر قبول کیا اسلوب بھی کہا ہے

مستی کی عزت شیشہ ہوئی دیکھ رتبہ دیدۂ بیدار کا

...س دور کے استاد شاعر آبرو، ناجی، مضمون، یکرنگ، آرزو وغیرہ ہیں - اس زمانے میں ایہام گوئی اور رعایت لفظی کا بہت

...، مثلاً یکرنگ کا شعر ہے ۔

اس زلف کا یہ دل ہے گرفتار بال بال

یکرنگ کے سخن میں خلاف ایک مو نہیں

(تیسرا دور) اس زمانے میں شاہ حاتم دہلوی (۱۶۹۹ء تا ۱۷۸۳ء) نے غزل کی زبان، الفاظ، محاوروں میں اصلاح کی ضرورت

(۱۶۹۹ء تا ۱۷۸۳ء) نے ایہام گوئی کو ترک کیا اور سلاست و واقعیت، لطف و تاثیر کا خیال رکھا ۔ مثلاً ۔

ستم سے تیرے میں جاتا ہوں چھوڑ کیوں تو کہ آشنائی کا حاتم نباہ بھی نہ کیا

کوئی آزردہ کرتا ہے جو اپنے کو بے ظالم کہ دولت خواہ اپنا، مظہر اپنا، جانجاں اپنا

(چوتھا دور) اس دور کے تین شاعر غزل گوئی میں سب سے مشہور ہیں ۔ سودا، درد، میر، ان کے بعد میر سوز، میر حسن، یقین،

... ہے اس زمانے میں جس قدر خوبیاں اور دلکشیاں زبان و بیان، سادگی، صفائی، لطف و اثر کے اعتبار سے پیدا ہوئیں

پہلے اور اس کے بعد نظیر نہیں ملتی مثلاً ۔

تو نے سودا کے تئیں قتل کیا کہتے ہیں یہ اگر سچ ہے تو ظالم اسے کیا کہتے ہیں

سے تھے ہم تو میر کو عاشق اسی گھڑی جب سن کے تیرا نام وہ بیتاب سا ہوا

(پانچواں دور) اس زمانے کے شاعر گزشتہ دور والوں کے ساتھی ہیں لیکن ان سے کچھ چھوٹے یعنی مصحفی، جرأت، آتش، ناسخ

... وغیرہ - ان شاعروں کی غزل میں اکثر وہی خوبیاں ہیں جو پہلے تھیں ۔ صرف میر تقی کا سوز و گداز، میر درد کا تصوف نہیں ہے ۔ اس کے

...ات، آتش و رنگین نے اصلی جذبات اور بازاری معاملات و زبان کا اضافہ کر دیا ہے ۔ زبان پہلے سے کچھ زیادہ صاف

...ہ ہے نمونہ یہ ہے ۔

پھٹ گیا جب سے گریبان اپنا ہاتھ پہ ہاتھ دھرے بیٹھے ہیں

مصحفی یار کے گھر سے آگے ہم سے کتنے نکمے بیٹھے ہیں

دل وحشی کو خواہش ہے تمہارے در پہ آنے کی

دوانہ ہے ولیکن بات کہتا ہے ٹھکانے کی

(چھٹا دور) یہ زمانہ ۱۸۵۷ء سے شروع ہوتا ہے ۔ زمانہ انقلاب سے دہلی کے قدیم شاعروں کی سی سادگی اور [illegible]

[illegible] شاعری اور اس کے [illegible]
[illegible] سے غزل کے [illegible] کے شعر [illegible]
[illegible] سنجیدگی پیدا ہو گئی ہے۔

دوسرا [illegible] غزل [illegible] بیان کا ہے۔ دہلی [illegible]
ذوق، غالب کی غزلیں [illegible]
استادوں سے بہتر [illegible] پیدا کیے [illegible]۔

[illegible] لکھنؤ [illegible] سے [illegible] کی سی مضمون آفرینی [illegible]
مومن و غالب کی سی نازکی [illegible] پہلے سے زیادہ
سادہ ہو گئی ہیں۔ دہلی کے داغ، حالی، [illegible] شعراء ہیں۔

دلی میں [illegible] بیسویں صدی کے شروع [illegible] کے استقلال کے بعد قدیم طرز کی [illegible]
سادہ جدید رنگ کی غزل لکھی جانے لگی [illegible] شاعر پہلے [illegible] مثلاً بیخود، سائل [illegible]
مضطر وغیرہ وہ اپنی طرز پر قائم رہے لیکن بعض رنگ [illegible] نے پامال روش کو چھوڑ کر
سنجیدہ بنا دیا۔ رشک و رقابت کے مضامین معشوق کے حلیہ اور [illegible] کا ذکر [illegible]
ترک کر دیے اور غزل کو روحانی کیفیت و نشاط سے بھر دیا یہ رنگ غزل [illegible] رہے۔ ان کے علاوہ [illegible]
کم عمر شاعر بھی ہیں جن کی شاعری بیسویں صدی ہی میں شروع ہوئی مثلاً حسرت موہانی، [illegible] لکھنوی، [illegible]، فانی بدایونی [illegible]
اصغر گونڈوی وغیرہ۔ ان شعراء نے اس سنجیدگی و پاکیزگی، روحانیت و حقیقت [illegible] کو جو شاد و صفی نے [illegible]
مذاق و طبیعت اور فکر و تخیل کے ذریعے سے کہیں سے کہیں پہنچا دیا۔ (تاریخ و تنقید ادبیات اردو)

ڈاکٹر مسعود حسن رضوی ادیب

میں غزل کی خوبیوں کا دل سے قائل ہوں مگر نہ غزل گوئی پر ایسا فریفتہ ہوں کہ شاعر اور قصائد میں امتیاز نہ کر[illegible]
ایسا شیفتہ ہوں کہ مسلسل نظموں سے لطف اندوز نہ ہو سکوں۔ اردو شاعری میں جو نئے تجربے کیے جا رہے ہیں [illegible]
میدان نکالے جا رہے ہیں، جو نئی نئی شکلیں اختیار کی جا رہی ہیں ان میں سے بعض [illegible] کو انفرادی طور پر غلط [illegible]
باوجود مجموعی طور سے ان کو اردو شاعری کی حیات کے آثار اور ترقی کے اسباب [illegible] کران کی قدر کرتا ہوں۔ مگر [illegible]
جو قدیم اصناف سخن میں داد سخنوری دے چکے ہیں اور کمال شاعری صرف کر چکے ہیں ان کے کارناموں کو غلط [illegible]
نہیں دیکھ سکتا اور شاعری کا جو سرمایہ ہماری زبان نے دو تین صدیوں کی طویل مدت میں جمع کیا ہے اس کو تباہ [illegible]
نہیں دیکھ سکتا۔

[illegible] ۱۹۴۹ [illegible]

نیاز فتحپوری

لفظ "غزل" کے لغوی معنی اس قدر عام و مشہور ہو چکے ہیں کہ اس کے اظہار کی ضرورت نہیں، جس نے محبت کی ہو اسے تو خیر جاننا ہی چاہیے لیکن جو اس کوچہ سے نابلد ہے، اس کو بھی سماعی یا قیاسی طور پر معلوم ہو گا کہ "محبوب سے باتیں کرنے کا نام غزل و تغزل ہے یا عاشقانہ اگر یہ گفتگو باہمدگر ہو" اب غور طلب امر یہ ہے کہ "محبوب سے ایک عاشق کیا باتیں کر سکتا ہے اور ان باتوں کا انداز و لب و لہجہ کیا ہونا چاہیے؟"

محبت یا عشق فی الحقیقت ایک شدید قسم کا احساس پسندیدگی ہے اور اسی احساس و تاثر کے اظہار کا نام شعر ہے، ہم پھول کو دیکھتے ہیں اور اس کے رنگ و بو سے متاثر ہو کر اس کی تعریف کرتے ہیں یہ بھی شعر ہے، ہم شفق کی رنگینی سے متاثر ہوتے ہیں اور اس کا اظہار کرتے ہیں، یہ بھی شعر ہے۔ ہم قوس قزح کو دیکھتے ہیں اور بے اختیارانہ کلمات تحسین زبان سے نکل جاتے ہیں یہ بھی شعر ہے۔ اس طرح کائنات میں قدرت کے جتنے مظاہر و آثار ہیں وہ سب انسان کے احساس پر اثر انداز ہو سکتے ہیں اور جو کیفیت ان سے پیدا ہوتی ہے اس کو ظاہر کر دینا شعر ہو سکتا ہے بشرطیکہ اس اظہار میں ترنم کو قائم رکھا جائے اور اسی ترنم کو پیدا کرنے کے لیے مخصوص لب و لہجہ اور مخصوص اوزان مقرر کیے گئے ہیں۔

پھر اگر یہی جذبہ پسندیدگی افراد نوع انسانی سے کسی کے ساتھ ہو تو وہ بھی محبت کہلاتا ہے لیکن جس محبت کا تعلق غزل گوئی سے ہے وہ مخصوص ہے، اس جذبہ سے جو جنسی کشش و خواہش سے پیدا ہوتا ہے۔ محبت، ماں، بھائی، اولاد اور عزیز و احباب سے بھی ہوتی ہے۔ لیکن ان میں سے کوئی غزل کا موضوع نہیں، اس کا تعلق صرف ایسے فرد سے ہوتا ہے جس سے انسان میں ہیجان پیدا ہو سکتا ہے۔ بعض احباب کو میں نے کہتے ہوئے سنا ہے کہ علاوہ جنسی محبت کے ایک چیز ذہنی و روحانی محبت بھی ہے جسے (INTELLECTUAL LOVE) کہتے ہیں، لیکن میں اس کو محض شاعری سمجھتا ہوں اور اس کا وجود جنسی کیفیت سے علیحدہ میری سمجھ میں نہیں آتا۔ تاہم اگر تھوڑی دیر کے لیے مان لیا جائے کہ اس عنقا کا وجود ممکن ہے تو بھی اس کا غزل گوئی سے کوئی واسطہ نہیں۔

الغرض تغزل کا تعلق میرے نزدیک صرف اُن جذبات محبت سے ہے جو اس گوشت و پوست سے پیدا ہوتے ہیں اور جن کے پورا ہونے کی تمنا ہر محبت کرنے والے کو ہوتی ہے۔

اب اس حقیقت کو سامنے رکھ کر دیکھا جائے تو بظاہر معلوم ہو گا کہ یہ نہایت محدود چیز ہے، عاشق نے کہا "میں تم پر جان دیتا ہوں" معشوق نے کہا "میری بلا سے" چلئے قصہ ختم ہو گیا لیکن اگر آپ اس سلسلہ میں ان تمام کیفیات و جزئیات پر نگاہ ڈالیں جو اسی ایک خواہش جنسی سے متعلق ہو سکتے ہیں تو آپ کو اس کی وسعت کا اعتراف کرنا پڑے گا ....

دور حاضر کی غزل گوئی خواہ وہ لکھنؤ میں ہو یا لکھنؤ سے باہر بالکل دہلوی رنگ کی ہے اور اب عام احساس اس امر کا ہو چلا ہے کہ تغزل کا تعلق صرف جذبات سے ہے اور کوشش کی جاتی ہے کہ جو کچھ کہا جائے وہ تاثرات کا نتیجہ نظر آئے

[illegible]

[illegible] شاعری اور اس کے [illegible]
[illegible]
[illegible] جدید [illegible] ہوئی۔

(ستقل صدر) [illegible] غزل [illegible] بیان کا
ذوق، غالب کی [illegible] سے [illegible]
استادوں سے بہتر [illegible] کر دیا۔

(دائشیان صدر) اس [illegible] ناسخ اور میر کی سی
مومن و غالب کی سی [illegible]
سا تر ل گئی ہیں۔ دہلی کے داغ، حالی [illegible] غزل

(قرآن صدر) [illegible] بیسویں صدی کے شروع [illegible] کے انتقال کے
ساتھ جدید رنگ کی غزل گوئی بھی جاری ہو گئی۔ جو شاعر پرانے [illegible] خیالات کے دلدادہ تھے مثلاً
مضطر وغیرہ وہ اپنی طرز پر قائم رہے لیکن بعض [illegible] مثلاً شاد عظیم آبادی، [illegible] لکھنوی نے پامال رہ
سنجیدہ بنا دیا۔ رشک و رقابت کے مضامین معشوق کے حلیہ اور زیب و زینت کا ذکر پست وا
ترک کر دیے اور غزل کو روحانی کیف و نشاط سے بھر دیا۔ یہ بزرگ غزل جدید کے پیش رو ہیں۔ ان کے
کم عمر شاعر بھی ہیں جن کی شاعری بیسویں صدی ہی میں شروع ہوئی مثلاً حسرت موہانی، عزیز لکھنوی، صفی، جگر مراد آبادی،
اصغر گونڈوی وغیرہ۔ ان شعرا نے اس سنجیدگی و پاکیزگی، روحانیت و حقیقت، نزاکت و لطافت کو جو شاعرو
مذاق طبیعت اور فکر و تخیل کے ذریعے سے کہیں سے کہیں پہنچا دیا۔ (تاریخ و تنقید)

ڈاکٹر مسعود حسن رضوی ادیب

میں غزل کی خوبیوں کا دل سے قائل ہوں مگر نہ غزل گو ہوں نہ ایسا فریفتہ ہوں کہ شاعر اور تمنا
ایسا شیفتہ ہوں کہ مسلسل نظموں سے لطف اندوز نہ ہو سکوں۔ اُردو شاعری میں جو نئے تجربے کیے
میدان نکالے جا رہے ہیں، جو نئی نئی شکلیں اختیار کی جا رہی ہیں ان میں سے بعض چیزوں کو انفرادی
باوجود مجموعی طور سے ان کو اُردو شاعری کی حیات کے آثار اور ترقی کے اسباب سمجھ کر ان کی قدر کرتا
جو قدیم اصنافِ سخن میں دادِ سخنوری دے چکے ہیں اور کمالِ شاعری صرف کر چکے ہیں ان کے کارنامو
نہیں دیکھ سکتا اور شاعری کا جو سرمایہ ہماری زبان نے صدیوں کی طویل مدت میں جمع کیا ہے ا
نہیں دیکھ سکتا۔

(نگار [illegible] ۱۹۳۲ء)

نیاز فتح پوری

لفظ "غزل" کے لغوی معنی اس قدر عام و مشہور ہو چکے ہیں کہ اس کے اظہار کی ضرورت نہیں، جس نے محبت کی ہے اسے تو خیر جاننا ہی چاہیے لیکن جو اس کوچہ سے نابلد ہے، اس کو بھی سماعی یا قیاسی طور پر معلوم ہوگا کہ "محبوب سے باتیں کرنے کا نام غزل و تغزل ہے یا مغازلہ اگر یہ گفتگو باہمدگر ہو" اب غور طلب امر یہ ہے کہ "محبوب سے ایک عاشق کیا باتیں کر سکتا ہے اور ان باتوں کا انداز و لب و لہجہ کیا ہونا چاہیے؟"

محبت یا عشق فی الحقیقت ایک شدید قسم کا احساس پسندیدگی ہے اور اسی احساس و تاثر کے اظہار کا نام شعر ہے، ہم کسی پھول کو دیکھتے ہیں اور اس کے رنگ و بو سے متاثر ہو کر اس کی تعریف کرتے ہیں یہ بھی شعر ہے، ہم شفق کی رنگینی سے متاثر ہوتے ہیں اور اس کا اظہار کرتے ہیں، یہ بھی شعر ہے۔ ہم قوس قزح کو دیکھتے ہیں اور بے اختیارانہ کلمات تحسین زبان سے نکل جاتے ہیں یہ بھی شعر ہے۔ اس طرح کائنات میں قدرت کے جتنے مظاہر و آثار ہیں وہ سب انسان کے احساس پر اثر انداز ہو سکتے ہیں اور جو کیفیت ان سے پیدا ہوتی ہے اس کو ظاہر کر دینا شعر ہو سکتا ہے بشرطیکہ اس اظہار میں ترنم کو قائم رکھا جائے اور اسی ترنم کو پیدا کرنے کے لیے مخصوص لب و لہجہ اور مخصوص اوزان مقرر کیے گئے ہیں۔

پھر اگر یہی جذبہ پسندیدگی افراد نوع انسانی سے کسی کے ساتھ ہو تو وہ بھی محبت کہلاتا ہے لیکن جس محبت کا تعلق غزل گوئی سے ہے وہ مخصوص ہے، اس جذبہ سے جو جنسی کشش و خواہش سے پیدا ہوتا ہے۔ محبت، ماں، بھائی، اولاد اور عزیز و احباب سے بھی ہوتی ہے۔ لیکن ان میں سے کوئی غزل کا موضوع نہیں، اس کا تعلق صرف ایسے فرد سے ہوتا ہے جس سے انسان میں ہیجان پیدا ہو سکتا ہے۔ بعض احباب کو میں نے کہتے ہوئے سنا ہے کہ علاوہ جنسی محبت کے ایک چیز ذہنی و روحانی محبت بھی ہے جسے (INTELLECTUAL LOVE) کہتے ہیں، لیکن میں اس کو محض شاعری سمجھتا ہوں اور اس کا وجود جنسی کیفیت سے علیحدہ میری سمجھ میں نہیں آتا۔ تاہم اگر تھوڑی دیر کے لیے مان لیا جائے کہ اس عنصر کا وجود ممکن ہے تو بھی اس کا غزل گوئی سے کوئی واسطہ نہیں۔

الغرض تغزل کا تعلق میرے نزدیک صرف اُن جذبات محبت سے ہے جو اس گوشت و پوست سے پیدا ہوتے ہیں اور جن کے پورا ہونے کی تمنا ہر محبت کرنے والے کو ہوتی ہے۔

اب اس حقیقت کو سامنے رکھ کر دیکھا جائے تو بظاہر معلوم ہوگا کہ یہ نہایت محدود چیز ہے، عاشق نے کہا "میں تم پہ جان دیتا ہوں" معشوق نے کہا "میری بلا سے" چلئے قصہ ختم ہو گیا لیکن اگر آپ اس سلسلہ میں ان تمام کیفیات و جذبات پر نگاہ ڈالیں جو اسی ایک خواہش جنسی سے متعلق ہو سکتے ہیں تو آپ کو اس کی وسعت کا اعتراف کرنا پڑے گا........

دور حاضر کی غزل گوئی خواہ وہ لکھنؤ میں ہو یا لکھنؤ سے باہر، بالکل ذہنی رنگ کی ہے اور اب عام احساس اس امر کا ہو چلا ہے کہ تغزل کا تعلق صرف جذبات سے ہے اور کوشش کی جاتی ہے کہ جو کچھ کہا جائے وہ تاثرات کا نتیجہ نظر آئے

ختم ہوگئی۔ لکھنؤ کی شاعری اور اس کے بعد [illegible] ہوگئی [illegible]
کے [illegible] سے [illegible] کے [illegible] [illegible]
لکھنؤ [illegible] لکھنؤ [illegible] وغیرہ ہیں۔

[illegible] یہ کہ غزل [illegible] تنگ خیالات [illegible] ہے۔ دہلی [illegible]
ذوق، غالب کی غزلیں [illegible] ہیں [illegible] ہیں۔ [illegible] رشک [illegible]
استاد [illegible] سے [illegible] پیدا [illegible] کر دیا۔

[illegible] کے [illegible] ہے، آتش اور [illegible] آخر [illegible] نہیں
مومن و غالب کی سی [illegible] کہ [illegible] سے زیادہ [illegible]
سا [illegible] گئی ہیں۔ دہلی کے داغ، حالی، [illegible] [illegible] شعرا ہیں۔

[illegible] کے شروع [illegible] کے انتقال کے [illegible] طرز کی غزل
سا [illegible] جدید رنگ کی غزل [illegible] جاتی ہے [illegible] شاعر [illegible] خیالات کے علاوہ [illegible] ثاقب، یاس،
مضطر وغیرہ وہ اپنی طرز پر قائم رہے لیکن بعض [illegible] شاد عظیم آبادی، حسرت لکھنوی نے پامال روش کو چھوڑ کر غزل کو
سنجیدہ بنا دیا۔ رشک و رقابت کے مضامین معشوق کے حلیہ اور زیب و زینت کا ذکر، پست و ادنیٰ جذبات و معاملات
ترک کر دیے اور غزل کو روحانی کیف و نشاط سے بھر دیا۔ یہ بزرگ غزل جدید کے پیش رو ہیں۔ ان کے علاوہ اس زمانے میں
کم عمر شاعر بھی ہیں جن کی شاعری بیسویں صدی ہی میں شروع ہوئی مثلاً حسرت موہانی، [illegible] لکھنوی، صفی، [illegible]، فانی بدایونی، جگر مراد آبادی،
اصغر گونڈوی وغیرہ۔ ان شعرا نے اس سنجیدگی و پاکیزگی، روحانیت و حقیقت [illegible] لطافت کو جو شاد و حسرت نے شروع کی تھی
مذاق و طبیعت اور فکر و تخیل کے ذریعے سے کہیں سے کہیں پہنچا دیا۔ (تاریخ و تنقید ادبیات اردو)

ڈاکٹر مسعود حسن رضوی ادیب

میں غزل کی خوبیوں کا دل سے قائل ہوں مگر نہ غزل گویوں پر ایسا فریفتہ ہوں کہ شاعر اور متشاعر میں امتیاز نہ کر سکوں نہ
ایسا شیفتہ ہوں کہ مسلسل نظموں سے لطف اندوز نہ ہو سکوں۔ اردو شاعری میں جو نئے تجربے کیے جا رہے ہیں، جو نئے
میدان نکالے جا رہے ہیں، جو نئی نئی شکلیں اختیار کی جا رہی ہیں ان میں سے بعض [illegible] کو انفرادی طور پر غلط یا مضر سمجھنے
باوجود مجموعی طور سے ان کو اردو شاعری کی حیات کے آثار اور ترقی کے اسباب سمجھ کر ان کی قدر کرتا ہوں۔ مگر ہمارے [illegible]
جو قدیم اصناف سخن میں داد سخنوری دے چکے ہیں اور کمال شاعری صرف کر چکے ہیں ان کے کارناموں کو غلط فہمی کی بدولت
نہیں دیکھ سکتا اور شاعری کا جو سرمایہ ہماری زبان نے دو تین صدیوں کی طویل مدت میں جمع کیا ہے اس کو ہیچ بینی کی آنکھ
نہیں دیکھ سکتا۔

[illegible]

نیاز فتحپوری

لفظ "غزل" کے لغوی معنی اس قدر عام و مشہور ہو چکے ہیں کہ اس کے اظہار کی ضرورت نہیں، جس نے محبت کی ہے اسے تو خیر جاننا ہی چاہیے لیکن جو اس کوچہ سے نابلد ہے، اس کو بھی سماعی یا قیاسی طور پر معلوم ہوگا کہ "محبوب سے باتیں کرنے کا نام غزل و تغزل ہے یا مغازلہ اگر یہ گفتگو باہمدگر ہو" اب غور طلب امر یہ ہے کہ "محبوب سے ایک عاشق کیا باتیں کر سکتا ہے اور ان باتوں کا انداز و لب و لہجہ کیا ہونا چاہیے"؟

محبت یا عشق فی الحقیقت ایک شدید قسم کا احساس پسندیدگی ہے اور اسی احساس و تاثر کے اظہار کا نام شعر ہے، ہم کسی پھول کو دیکھتے ہیں اور اس کے رنگ و بو سے متاثر ہو کر اس کی تعریف کرتے ہیں یہ بھی شعر ہے، ہم شفق کی رنگینی سے متاثر ہوتے ہیں اور اس کا اظہار کرتے ہیں، یہ بھی شعر ہے۔ ہم قوس قزح کو دیکھتے ہیں اور بے اختیارانہ کلمات تحسین زبان سے نکل جاتے ہیں یہ بھی شعر ہے۔ اس طرح کائنات میں قدرت کے جتنے مظاہر و آثار ہیں وہ سب انسان کے احساس پر اثر انداز ہو سکتے ہیں اور جو کیفیت ان سے پیدا ہوتی ہے اس کو ظاہر کر دینا شعر ہو سکتا ہے بشرطیکہ اس اظہار میں ترنم کو قائم رکھا جائے اور اسی ترنم کو پیدا کرنے کے لیے مخصوص لب و لہجہ اور مخصوص اوزان مقرر کیے گئے ہیں۔

پھر اگر یہی جذبہ پسندیدگی افراد نوع انسانی سے کسی کے ساتھ ہو تو وہ بھی محبت کہلاتا ہے لیکن جس محبت کا تعلق غزل گوئی سے ہے وہ مخصوص ہے۔ اس جذبہ سے جو جنسی کشش و خواہش سے پیدا ہوتا ہے۔ محبت، ماں، بھائی، اولاد اور عزیز و احباب سے بھی ہوتی ہے۔ لیکن ان میں سے کوئی غزل کا موضوع نہیں، اس کا تعلق صرف ایسے جذبے سے ہوتا ہے جس سے انسان یہ ہیجان پیدا ہو سکتا ہے۔ بعض احباب کو میں نے کہتے ہوئے سنا ہے کہ علاوہ جنسی محبت کے ایک چیز ذہنی و روحانی محبت بھی ہے جسے (INTELLECTUAL LOVE) کہتے ہیں، لیکن میں اس کو محض شاعری سمجھتا ہوں اس احساس کا وجود جنسی کیفیت سے علیحدہ میری سمجھ میں نہیں آتا۔ تاہم اگر تھوڑی دیر کے لیے مان لیا جائے کہ اس عنقا کا وجود ممکن ہے تو بھی اس کا غزل گوئی سے کوئی واسطہ نہیں۔

الغرض تغزل کا تعلق میرے نزدیک صرف اُن جذبات محبت سے ہے جو اس گوشت و پوست سے پیدا ہوتے ہیں اور جن کے پورا ہونے کی تمنا ہر محبت کرنے والے کو ہوتی ہے۔

اب اس حقیقت کو سامنے رکھ کر دیکھا جائے تو بظاہر معلوم ہوگا کہ یہ نہایت محدود چیز ہے، عاشق نے کہا "میں تم پر جان دیتا ہوں" معشوق نے کہا "میری بلا سے" چلیے قصہ ختم ہو گیا لیکن اگر آپ اس سلسلہ میں ان تمام کیفیات و جزئیات پر نگاہ ڈالیں جو اسی ایک خواہش جنسی سے متعلق ہو سکتے ہیں تو آپ کو اس کی وسعت کا اعتراف کرنا پڑے گا........ دور حاضر کی غزل گوئی خواہ وہ لکھنؤ میں ہو یا لکھنؤ سے باہر، بالکل دوسری رنگ کی ہے اور اب عام احساس اس امر کا ہو چلا ہے کہ تغزل کا تعلق صرف جذبات سے ہے اور کوشش کی جاتی ہے کہ جو کچھ کہا جائے وہ تاثرات کا نتیجہ نظر آئے

ذکر محض تصورات کا۔ (انتقادیات دوسرا حصہ)

غزل کے آپ جتنے دور چاہیں قائم کریں لیکن ولی اور میر کے زمانے سے کر چند سال پہلے تک حسن و عشق کا ذکر خالص عشق و محبت کی زبان میں کم و بیش ہر دور میں قدر مشترک کی حیثیت سے پایا جاتا تھا۔ لیکن اب کچھ عرصے سے حسن پرستی "کا ختم ہو یا نہ ہوا ہو، لیکن "بیان اپنا" مزید بدلتا جا رہا ہے۔ یقیناً یہ تبدیلی دفعتاً نہیں ہوئی بلکہ وقت و زمانہ کے لحاظ سے آہستہ آہستہ ہر دور میں کچھ تغیر ہوا اور اس تغیر کا اثر چونکہ موضوع شاعری پر بھی پڑا، اس لیے غزل کی زبان اور اس کا اسلوب بیان بھی بدلتا رہا، لیکن اب اس تغیر نے چونکہ انقلاب کی صورت اختیار کر کے غزل گوئی کی طرف سے انحراف و بغاوت کے جذبات لوگوں میں پیدا کر دیئے ہیں، اس لیے ہم اب اسے نمایاں طور پر محسوس کرنے لگے ہیں۔

غزل میں سب سے پہلی آمیزش فلسفہ و تصوف کی ہوئی اور اس میں شک نہیں کہ جس نے اول اول غزل گوئی میں یہ مذہب اختیار کیا وہ سخت مذاق کا فرد انسان تھا جو ہمارے کرۂ زمین سے کندبرِ ان مہوش کی "کارگاہِ حسن و محبوبی" کو ہمیشہ کے لیے ویران کر گیا۔

(نگار - جنوری فروری ۱۹۴۱ء)

ڈاکٹر یوسف حسین خان

گزشتہ دو برس میں میر صاحب کے زمانے سے لے کر حسرت و جگر کے موجودہ دور تک اردو غزل کے اسلوب میں برابر تبدیلیاں ہوتی رہی ہیں۔ لیکن اس کی بنیادی حقیقت میں کوئی فرق نہیں پیدا ہوا۔ اس سے صاف طور پر یہ پتہ چلتا ہے کہ یہ صنف سخن اپنی اصلی حیثیت کو برقرار رکھتے ہوئے مختلف حالات سے مطابقت کی صلاحیت رکھتی ہے جو اس کے جاندار ہونے کی دلیل ہے ہر غزل گو شاعر کے کلام میں ایک قسم کی مخصوص فضا ملتی ہے جو اس شاعر کی داخلی کیفیات اور ان تمدنی احوال کا نتیجہ ہوتی ہے جن میں اس نے نشو و نما پائی ہے۔ حسرت و جگر کے ہاں حسن و عشق کے معاملات کا اظہار اس سے ایک حد تک مختلف ہے جو ہمیں میر و غالب کے ہاں ملتا ہے۔ اور ایسا کیوں نہ ہو! دنیا کی ہر چیز ازلی بدلتی رہتی ہے۔ آج ہمارا لباس، ہماری معاشرت اور طرز فکر و احساس وہ نہیں جو اگلے زمانے کے لوگوں کا تھا۔ ہمارے موجودہ دور کا غزل گو شاعر بعض اوقات حسن و عشق کو تجزیاتی نقطۂ نظر سے دیکھتا ہے۔ جس کی مثال اردو کے ابتدائی یا درمیانی دور کے شاعروں کے یہاں نہیں ملتی۔ وہ اب حسیاتی جمال کو حیات و کائنات کے سمجھنے کے لیے بطور قدر استعمال کرتا ہے جس سے اس کے پیشرو بڑی حد تک نابلد تھے اور اگر واقف تھے تو بالکل مبہم طور پر......

مولانا حالی نے غزل پر جو نکتہ چینی کی وہ اصلاحی تحریکات کے تحت تھی نہ کہ ادبی مقاصد کے تحت۔ انھیں غزل پر سب سے بڑا اعتراض یہ تھا کہ یہ حسن و عشق کے معاملات کی شاعری ہے۔ عشق عقل اور اخلاق کو خراب کرنے والی چیز ہے۔ اس سے جتنا بھی اجتناب کیا جائے اتنا ہی قوم کے عمل کی ترقی کا موجب ہوگا کیونکہ بیکاری کا مشغلہ ہے۔ لیکن یہ نقطۂ نظر سطحی ہے۔ مولانا حالی کی نیک نیتی اور ان کے اخلاص میں شبہ نہیں۔ لیکن اس ضمن میں ان کا مشورہ قابل قبول نہیں۔ یہ بات ہمارے ادبی مزاج کی صحت پر دلالت کرتی ہے کہ مولانا حالی کے مشورہ کو قبول نہیں کیا گیا۔ اگر قبول کیا جاتا تو ہماری زبان حسرت اور جگر، اصغر، فانی اور اقبال کی غزل سے محروم رہتی

طرز میں رہتی ہو ایک ناقابلِ تلافی نقصان ہوتا۔

ایک لحاظ سے دیکھا جائے تو پچھلے پچیس تیس سال میں غزل نے نظم پر اور نظم نے غزل پر اپنا اثر ڈالا ہے۔ غزل کی ریزہ کاری اگرچہ حقیقت میں کوئی عیب نہیں لیکن پھر بھی یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ عہد جدید کی زندگی کا رجحان کلام میں تسلسل کا متوقع رہتا ہے، کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آئندہ غزل میں تسلسل پیدا کیا جائے گا اور منفرد اشعار کے پس منظر میں وحدت احساس کی کارفرمائیاں بڑھتی جائیں گی اور اس کے ساتھ ساتھ نظم بھی اپنے اندر رمز و کنایہ اور موسیقیت کے ذریعہ تغزل کی صفات پیدا کرنے کی کوشش کرے گی اور اس طرح دونوں اصناف ایک دوسرے سے قریب آجائیں گی۔

"غزل"

ڈاکٹر سید عبداللہ

غزل اپنی تعمیر و ترکیب کے لحاظ سے نہایت خوشگوار امتزاج کی متقاضی ہے۔ لفظ و معنی کا حسین و لطیف پیوند، جذبے کی سچائی اور کیفیت — خونِ جگر اور لطفِ نظر کا امتزاج ایک خاص قسم کی شگفتگی اور موسیقیت، یہ سب ایک اعلیٰ غزل کی خصوصیات ہیں۔ غزل حسن کا ایک ایسا نمونہ ہے جس میں ذرا سی بے اعتدالی بھی ناگوار محسوس ہونے لگتی ہے۔ کامل تناسب اور موزونیت غزل کی بنیادی صفت ہے اور اعتدال و توازن اس کی اساسی شرط۔

اچھی غزل کی بڑی ظاہری خصوصیت یہ ہونی چاہیئے کہ وہ ساخت کے اعتبار سے متناسب ہو۔ علمائے فن نے غزل کی ساخت میں تعداد اشعار کو معین اور محدود کرنے کی کوشش کی ہے۔ اور غزل کی طوالت کو عیب قرار دیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ غزل کا جسم ایک خاص صورت رکھتا ہے۔ جس کے حصوں کے بیچ ہر دوسرے جسم کی طرح تناسب کا لحاظ ضروری ہے۔ غزل کے اشعار تعداد میں جب آٹھ نو سے بڑھ جاتے ہیں تو عموماً اس کے جسم میں ڈھیلا پن، بے ڈھنگا پن اور کھوکھلا پن پیدا ہو جاتا ہے۔ اور غزل کا جسم اپنے تناسب کو کھو بیٹھتا ہے۔ اور غزل اپنے مرکزی نقطے سے ہٹ جاتی ہے۔

غزل میں مرکزی نقطے سے مراد وہ مرکزی جذبہ ہے جس سے غزل کی تحریک ہوتی ہے، یا وہ خیال جو غزل کا سب سے نمایاں خیال ہوتا ہے۔ اگرچہ شاعروں کے رواج نے غزل کو میکانکی عمل بنا دیا ہے۔ اور اس کے لیے عموماً مصرع طرح کے سوا کوئی خارجی تحریک ضروری نہیں سمجھی جاتی، مگر اصل شاعری کسی بھی جذباتی تحریک کے بغیر نمودار نہیں ہو سکتی ہے۔ اسی لیے سب بڑے غزل گوؤں کی غزل میں یہ نمایاں جذبہ یا مرکزی خیال (جو اس غزل کی تخلیق کا باعث ہوتا ہے) صاف صاف نظر آ جاتا ہے۔ یہ مرکزی جذبہ ہر اچھی غزل میں ضرور ہوتا ہے۔ باقی شعر بھی غزل میں اس مرکزی جذبے کے زیر اثر نمودار ہوتے ہیں۔

اس خاص پہلو سے غزل میں تعداد اشعار کی اہمیت بہت بڑھ جاتی ہے۔ جب غزل میں اشعار کی تعداد زیادہ ہو جاتی ہے تو غزل کے مرکزی جذبے کا اثر بکھر جاتا ہے۔ قوافی کے تقاضوں سے بعض اوقات متضاد اور بے آہنگ مضمون پیدا ہو جاتے ہیں۔ بلکہ اکثر جذبے کے بالمقابل دوسری لہریں اس بے ہنگم طریق سے غزل میں گھس جاتی ہیں کہ غزل کا سرچشمۂ تحریک بالکل غائب ہو جاتا ہے۔ اس کی وجہ سے غزل کی مرکزیت کو سخت نقصان پہنچتا ہے۔

(بحث و نظر)

کلیم الدین احمد

اردو شاعری میں ایک انقلاب سا آیا لیکن غزل کی اہمیت اور ہر دلعزیزی میں کسی قسم کی کمی نہ ہوئی۔ آج بھی غزل کی وہی فراوانی ہے جو عصر حاضر کے آغاز سے پہلے تھی۔ اس کی ایک وجہ تو صنفِ غزل کی آسانی ہے۔ غزل کے لیے نہ قوتِ حاسہ کی ضرورت ہے نہ دماغ کی مدد کی۔ تخیل اور قوتِ تعمیر کی بھی ضرورت نہیں۔ کسی مکمل خیال یا تجربہ کی ترجمانی مقصود نہیں۔ خیالات و جذبات موجود ہیں، الفاظ، بندشیں، ترکیبیں بھی موجود ہیں۔ بحریں اور زمینیں بھی موجود ہیں۔ ذرا سی زحمت کی اور غزل تیار ہو گئی۔ جب اس قدر سہل و آسان طریقے پر شاعر ہو سکتا ہو تو پھر کوئی کسی دشوار گزار راستے کی طرف توجہ ہی کیوں کرے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ جو اعتراضات غزل پر کیے گئے وہ مضامینِ غزل سے وابستہ تھے۔ کسی نے صنفِ غزل کی خامیوں کو آشکار نہ کیا اور یہ ممکن ہی کب تھا جب وہ شعری ہیئت اور اس کے نقائص سے آگاہ ہی نہ تھے۔ حالی و آزاد نے غزل کو حسن و عشق کی قید سے آزاد کرنے کی کوشش کی تھی۔ اس میں ایک حد تک کامیاب بھی ہوئے۔ غزل حسن و عشق کی قید سے آزاد تو نہ ہو سکی لیکن ہاں کچھ زیادہ آزادی کے ساتھ فضا میں سانس لے سکی۔ نئے نئے مضامین خصوصاً اخلاقی مضامین، داخلِ غزل ہو گئے۔ لیکن حالی اور آزاد کی کوششوں سے کوئی اہم تغیر پیدا نہ ہو سکا اور اردو شعرا اپنے پرانے راستے پر چلتے رہے۔ اس لیے ضرورت ہوئی کہ حالی اور آزاد کی تحریک کا اعادہ کیا جائے۔ شعرا کے ایک طبقے نے از سرِ نو غزل کو وسعت دینے کی کامیاب کوشش کی۔

سیماب کہتے ہیں:

> "ہمارے معزز شعرائے متغزلین آج بھی اپنی اکثریت کے ساتھ تغزل کی دلنشیں شاعری کی ترویج و تہذیب میں بدستور مصروف و منہمک ہیں۔ وہ شاعری اور شاعروں کو صرف تحفظِ قواعد و زبان کا ذریعہ بنا کر اس کے احیا کی کوشش میں لگا رہے ہیں مگر اپنے محدود ماحول سے ایک انچ بھی آگے نہیں بڑھے۔ وہی ان کی شاعری ہے، وہی شاعر ہے اور وہی ردیف و قافیہ کی جولانگاہ ہے"

شاعری کی ہیئت اور اس کی اہمیت سے وہ آشنا نہیں۔ شاعری اور غالباً شاعروں کو وہ غزل کا مترادف سمجھتے ہیں۔ محض ایک ذریعہ تفریح ہے اور حقیقی تفریح کے علاوہ اگر اس سے کوئی فائدہ مقصود ہے تو وہ تحفظِ زبان کا تحفظ۔ اس سے وہ پرانے فرسودہ خیالات و مضامین کو دہرا دہرا اور با محاورہ زبان میں بیان کرتے ہیں۔ سیماب بھی حالی و آزاد کی طرح اصلیت کے فقدان پر زور دیتے ہیں اور تقلید و رکاکت کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرتے ہیں۔ مختصر یہ نظریہ نیا نہیں، حالی و آزاد کا ہے۔ حالی کی طرح سیماب بھی اخلاقی معیار سے شعرائے متغزلین کو جانچتے ہیں۔ مضامین ہی نہیں، زبان پر بھی نظر ڈالتے ہیں اور شعرا کی تنگ نظری کا انکشاف کرتے ہیں:

> "ملک میں زبان کے حامیوں کا ایک گروہ ہے جو چاہتا تو ہے کہ زبان کی سلامت پر حرف نہ آئے مگر فی الحقیقت اس کی ترقی کی راہیں بند کرنے کا خواہشمند ہے۔ نئے الفاظ، نئے سانچے اور نئے اسالیبِ بیان سے حد سے زیادہ ڈرتا ہے۔ ایک زبان کے لیے اس سے کچھ ہی کم خطرہ ہے جتنا کہ ان حضرات کی قطعی روک تھام سکتا ہے:"

حالی نے بھی زبان کی طرف توجہ کی تھی اور جس طرح حالی نے غزل کو ابتذال سے نکالنے کے لیے چند مشورے پیش کیے تھے اسی طرح مجتبیٰ اپنے مشورے پیش کرتے ہیں۔ یہ حالی کے ہم خیال ہیں:

> یہی تغزل کی روح واردات و جذبات ہیں۔ جو کیفیت حقیقتاً ہم پر طاری ہو اور جو واقعات ہمارے مشاہدے اور مطالعے میں آئیں وہی ہماری غزل کا اصلی موضوع ہیں۔
>
> فلسفۂ عشق و حسن، معاملات و حقیقت شناسی، عروس و پیام، واردات و جذبات اور معاملات سب موضوعات غزل ہیں لیکن یہ تغیر صرف مضامین پر منحصر نہیں، زبان میں بھی تغیر لازم ہے۔
>
> میں زبان کی سادگی کو خیالات کی پاکیزگی اور جذبات کی بلندی کی عدم موجودگی میں غلط خیال کرتا ہوں۔ غزل کی یہ زبان اور صورت یہی ہو سکتی ہے کہ زبان میں الفاظ منضبط و لطیف، پرشوکت و شیریں ہوں۔ سادگی کے ساتھ متناسب فارسی تراکیب اگر بے تکلف استعمال کی جائیں تو یقیناً غزل میں بلندی پیدا ہو سکتی ہے:

یہ خیالات کچھ نئے نہیں۔ دونوں خیالات پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ جدید رنگ غزل کے علمبردار واقعی کوئی نیا رنگ قائم کرنا نہیں چاہتے۔ وہ غزل میں پھر وہ اصلیت، واقعیت، وہ تنوع خیالات، وہ شوکت و وسعت دیکھنا چاہتے ہیں جو میر، درد، مصحفی، غالب اور مومن میں موجود ہیں۔ فرسودہ خیالات، عامیانہ الفاظ غزل میں نہ ہوں، خیالات رفیع و بلند ہوں، جذبات ذاتی ہوں اگر خیالی ہوں تو بھی دل میں محسوس کیے گئے ہوں، الفاظ بھی لطیف بھی اور پرشوکت ہوں۔ سیماب اور جس طبقے کے خیالات سے وہ متعلق ہیں صنفِ غزل کے نقائص سے واقف نہیں۔ وہ بھی غالباً حالی ہی کی طرح غزل کو شاعری کی ایک مذموم صنف سمجھتے ہیں۔ یہی نہیں کہ غزل اپنی صنفی خامیوں کے سبب سے "فنونِ لطیفہ میں ایک فنِ لطیف و شریف" بھی نہیں مانی جا سکتی اور ساری اردو شاعری ترقی کر ہی نہیں سکتی جب تک غزل سے ایک مدت کے لیے کنارہ کشی نہ کی جائے۔ بہر کیف سنئے اور پرانے رنگ تغزل کی مثال اقبال کی ان دو غزلوں میں ملتی ہے۔ پرانا رنگ ـــ

نہ آتے ہمیں اس میں تکرار کیا تھی   مگر وعدہ کرتے ہوئے عار کیا تھی
تمہارے پیامی نے سب راز کھولا   خطا اس میں بندے کی سرکار کیا تھی
بھری بزم میں اپنے عاشق کو تاڑا   تری آنکھ مستی میں ہشیار کیا تھی
تامل تو تھا ان کو آنے میں قاصد   مگر یہ بتا طرزِ انکار کیا تھی

کہیں ذکر رہتا ہے اقبال تیرا
فسوں تھا کوئی تیری گفتار کیا تھی

نیا رنگ ـــ

پھر بادِ بہار آئی اقبال غزل خواں ہو   غنچہ ہے اگر گل ہو گل ہے تو گلستاں ہو
تو خاک کی مٹھی ہے اجزا کی حرارت سے   برہم ہو پریشاں ہو وسعت میں بیاباں ہو

کیوں ساز کے پردے میں مستور ہو لے تیری　　　تو نغمۂ رنگیں ہے ہر گوش پہ عریاں ہو
اے رہروِ فرزانہ رستے میں اگر تیرے　　　گلشن ہے تو شبنم ہو صحرا ہے تو طوفاں ہو

ساماں کی محبت میں مضمر ہے تن آسانی
مقصد ہے اگر منزل غارت گرِ ساماں ہو

پہلی غزل میں خیالات نہایت معمولی ہیں۔ ان کو سادگی کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ خیالات صرف معمولی ہی نہیں فرضی بھی ہیں۔ ان خیالات و جذبات نے شاعر کے دل میں ہیجان اور تخیل میں طوفان نہیں برپا کیا ہے اس لیے ان میں اصلیت مفقود ہے۔ اسی اصلیت کی کمی کی وجہ سے زبان اپنی سادگی کے باوجود بالکل پھیکی اور بے رنگ معلوم ہوتی ہے۔ لیکن شعراء کا ایک معتدبہ حصہ ابھی تک اسی قسم کی شاعری کے دام میں پھنسا ہوا ہے جس کا نمونہ ان دو مصرعوں میں ملتا ہے:

(۱) "خطا اس میں بندے کی سرکار کیا تھی"
(۲) "تری آنکھ مستی میں ہشیار کیا تھی"

اسی پر سر دھنتا ہے اور ایسی غزلوں کی بناء پر اپنے کو شاعر کہلانے کا مستحق سمجھتا ہے۔ اس قسم کی غزلیں معیارِ شاعری پر پوری نہیں اتر سکتیں۔ اگر انھیں غزلیت کے معیار سے بھی جانچا جائے تو نہایت ہی مبتذل ثابت ہوں گی۔ دوسری غزل بھی غزل ہے نظم نہیں۔ اقبال پھر غزلوں میں ہیں لیکن یہاں ایک دوسرا عالم ہے۔ خیالات غزل کے عام خیالات سے یکسر مختلف ہیں۔ ہر شعر میں ایک پیغامِ عمل پنہاں اور رازِ زندگی مستور ہے۔ خیالات بذاتِ خود اہم و بلند پایہ ہیں لیکن ان کی اہمیت کی اصل وجہ یہ ہے کہ ان میں اصلیت موجود ہے۔ یہ محض فرضی اور خیالی نہیں، تقلید و نقالی کا نتیجہ نہیں اس لیے ان میں گرمیٔ جذبات اور رنگینیٔ تخیل دونوں چیزیں موجود ہیں۔ خیالات کی بلندی نے الفاظ کو بھی رفیع و بلند پایہ بنا لیا ہے۔ ایک طرف یہ رنگ ہے

بھری بزم میں اپنے عاشق کو تاڑا
تری آنکھ مستی میں ہشیار کیا تھی

جس میں اگر کوئی حسن ہے بھی تو محض لفظی، مضمون عامیانہ اور طرزِ ادا بھی انفرادی نہیں اور دوسرا رنگ یہ ہے

ساماں کی محبت میں مضمر ہے تن آسانی
مقصد ہے اگر منزل غارت گرِ ساماں ہو

جس سے دل سے بلکہ انھیں الفاظ اور دو مصرعوں کی جولانگاہ بن جاتے۔ یہی جوش ہے جس نے ہر ہر لفظ میں ایک بے پناہ نمود ڈال دیا ہے۔

پرانے رنگ سے علیحدہ ایک دائرۂ محدود سے نکلا اور رنگ و تغزل کی مقررہ قیود سے باہر آ گیا۔ گزشتہ دور کہتے ہیں ... کے جہاں اس کرگس میں اور اس کرگس کے جہاں اس کرگس میں عشق کرنا اس کا ایک مستقل مشغلہ ہے۔

ہم یہ نہیں کہتے کہ عشق و عاشقانہ کلام شعراء بھی اسی شکل میں نظر آتے ہیں۔ یہ نہیں چاہتے کہ غزل سے ... تجاوز کریں اس کے اسالیب و موضوعات میں فلسفہ و تصوف کی گنجائش پیدا ہوتی ہے ... کی تبدیلی کے حامی ہیں۔ معاملات عشق اور

... بندی کو اصل شاعری سمجھتے ہیں۔ ان کے اشعار میں لطفِ بیان کے سوا کچھ بھی نہیں اور اس معاملہ میں بھی وہ اپنے متقدمین داغ و امیر کے پایہ تک نہیں پہنچتے اس لیے وہ کا پایہ بیان اور نامکمل فرحت بھی جو صنفِ غزل سے حاصل ہوتی ہے ان کی غزلوں میں نہیں ملتی۔ ان غزلوں کی اہمیت محض شاعرانہ مشق کی سی ہے اور یہ مشق بھی زیادہ تحسین کے لائق نہیں۔ کیونکہ شاعر کسی جدت طرازی یا اثر و الفاظ کی اہمیت ظاہر نہیں کرتا۔ ذوق کی طرح یہ سنگلاخ زمینوں کو سرسبز و شاداب نہیں کرتے ہیں۔ چند مثالوں سے یہ نکتے واضح ہو جائیں گے۔

۱۔ ریاض خیرآبادی

فرمائشیں شباب میں ہیں جسمِ یار کی — محرم بنے نقاب عروسِ بہار کی
بے بال و پر بھی آج قفس سے کے اُڑ گئے — کس نے اُڑائی آج فصلِ بہار کی
مینا ہے سبز اور یہ جامِ زمردیں — کون ان کے بھر نے بیر کے سبزہ زار کی
خم کیا ہے گھر بھی کوئی جو بھرنے شراب سے — نیت کبھی بھرے گی نہ بادہ خوار کی
یہ شوخیاں نہیں ہیں تیری اے نگاہِ شوخ — بے بے قراریاں ہیں دلِ بے قرار کی

زبان صاف و سادہ و پاکیزہ ہے۔ خیالات و جذبات میں کوئی جدت یا اصلیت نہیں۔ جو شعرائے متقدمین کہہ چکے ہیں انہی خیالات کی تکرار مقصود ہے اور ساری توجہ محض زبان پر صرف کی گئی ہے۔ مطلع میں خیال کی حرف بات کم توجہ نہیں۔ چند الفاظ کو ایک شعر میں منسلک کر دیا گیا ہے اور بس۔ دوسرے شعر میں رعایتیں ہیں "قفل رہا بتیں" "بے بال و پر" "اُڑ گئے" "اُڑائی" اسی طرح "سبز" "زمردیں" "سبزہ زار" "گھر بھرو" "نیت نہ بھرے گی" تمام ہی رعایت لفظی ہے۔ اگر ان میں کو وحدت مل جاتی ہے تو اس لفظی ضیافت کی۔ اس ضیافت میں بھی کھانا سو اور بے مزا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اُردو شعرا کسی لفظی ضیافت میں دعو ہوئے تھے اور وہاں سے کچھ ٹکڑے پا۔ بچا کر لے آئے ہیں اور اسی ٹکڑوں پا چوں سے دوسروں کی ضیافت کرنے میں۔ پہلا مزا تو کہاں ہی نہیں اکثر اس کا شائبہ موجود ہوتا ہے اور بس۔ بہرکیف آخری شعر میں کچھ شوخی ہے اور شوخیاں "میں" "نگاہِ شوخ" "ایک طرف" "بے قراریاں" اور "دلِ بے قرار" دوسری جانب اس توازن سے کچھ لطف حاصل ہوتا ہے لیکن یہ بھی محض الفاظ سے وابستہ ہے۔

۲۔ جلیل

شریکِ بزمِ رنداں کب کوئی دیوانہ ہوتا ہے — جو ہوتا ہے وہ شمعِ حسن کا پروانہ ہوتا ہے
سمجھانے کچھ سکتے نہیں رازِ محبت کو — وہی کچھ با خبر ہوتا ہے جو دیوانہ ہوتا ہے
جفا ہو یا لگاوٹ ہو وفا ہو یا کاوش ہو — حسینوں کا ہر انداز معشوقانہ ہوتا ہے
شبِ وعدہ یہاں آخر ہوئی جاتی ہے وہ ظالم — وہاں زلفِ پریشاں بھی آج کم شانہ ہوتا ہے

آخری دو شعروں میں خیالات نہایت ہی عامیانہ ہیں۔ اسی قسم کے خیالات عام طور سے نظم کیے جاتے ہیں اور ان کی ستائش ہوتی ہے اور سامعین سر دھنتے ہیں اور بار بار پڑھتے ہیں ؎

شبِ وعدہ یہاں آخر ہوئی جاتی ہے وہ ظالم — وہاں زلفِ پریشاں بھی آج کم شانہ ہوتا ہے

یہ وہم گمان بھی نہیں ہوتا کہ خیال بھی پامال ہے اہمیت سے بنا ہے اور بندش انفعالی ہوتے کیونکہ اور کوئی عمدگی نہیں - طرزِ ادا انوکھی نہیں ہر شاعر اس قسم کے اشعار آسانی سے نظم کر سکتا ہے - جہاں شاعر کے ذہن میں "شانہ" کا قافیہ آیا ، ساتھ ہی " زلفِ پریشاں " کا خیال بھی ذہن میں آتا ہے - پھر ردیف کی رعایت سے " زلفِ پریشاں میں شانہ ہوتا ہے " کا مضمون مرتب ہو سکتا ہے اور پہلا مصرع " وہاں زلفِ پریشاں میں ابھی تک شانہ ہوتا ہے " نظم ہو گیا - پھر " وہاں " " ابھی تک " کی رعایت تو لفظ سکتے ہیں دوسرے مصرع کی تخلیق میں کوئی دقت پیش نہیں آ سکتی - اس قافیہ پیمائی کو شاعری تصور کیا جاتا ہے - پہلے تین شعروں میں بھی خیالات نئے نہیں لیکن وہ مبتذل بھی نہیں - خیالات کی بلندی کی وجہ سے الفاظ اور لہجہ میں بھی بلندی نمایاں ہو گئی ہے .... اشعار میں شوکت اور متانت آ گئی ہے ۔

کچھ وانے بکھر سکتے نہیں رازِ محبت کو
وہی کچھ باخبر ہوتا ہے جو دیوانہ ہوتا ہے

رعایتِ لفظی یہاں بھی ہے " کچھ " " بکھر واسطے " " باخبر " " دیوانہ " لیکن قاری کی توجہ دامِ الفاظ میں پھنس کر رہ نہیں جاتی - یہ اس خیال سے بھی باخبر ہوتی ہے جس کا اس شعر میں اظہار کیا گیا ہے - خیال کی اہمیت الفاظ پر غالب ہے - غور طلب امر یہ بھی ہے کہ ابھی تک ایک غزل میں شعراء ہر قسم اور ہر رنگ کے اشعار داخل کر دیتے ہیں - اس معاملے میں بھی لکیر کے فقیر بنے ہوئے ہیں - غزل میں مربوط و مسلسل اشعار نہ سہی کم از کم یہ تو ممکن تھا کہ کم و بیش ایک ہی پایہ کے اشعار ایک غزل میں داخل کیے جاتے ۔

۳ - نوح ناروی

یہ بسمل ہو نہیں سکتا وہ بسمل ہو نہیں سکتا
کوئی قاتل بنے بننے سے قاتل ہو نہیں سکتا

جو پہنچیں گے تو ہم پہنچیں گے مر کر کوچۂ جاناں تک
کہ جیتے جی کوئی جنت میں داخل ہو نہیں سکتا

یہ کہہ کہہ کر کیا مجبور اسے آنکھیں لڑانے پر
نظر ہے جس کی شرمیلی وہ قاتل ہو نہیں سکتا

سرِ مقتل وہ دیں کیسا ابروئے خمدار کو جنبش
کوئی اس بال کے خنجر سے بسمل ہو نہیں سکتا

یہ ضد ہے یہ چاہیں ہیں یہ باتیں ہیں یہ گھاتیں ہیں
مرے دشمن کو تم سے عشق کامل ہو نہیں سکتا

استعجاب ہوتا ہے کہ بیسویں صدی میں تہذیب و تعلیم یافتہ طبقے میں ایسے شاعری سمجھا جاتا ہے ۔

سرِ مقتل وہ دیں کیسا ابروئے خمدار کو جنبش
کوئی اس بال کے خنجر سے بسمل ہو نہیں سکتا

ایسے اشعار سے کسی تربیت یافتہ دماغ کو بے لطفی کے سوا اور کچھ حاصل نہیں ہو سکتا لطیف احساسات کو ایک صدمہ پہنچتا ہے - طبیعت سراسر منغض ہو جاتی ہے - لیکن اُردو شاعری کا ایک بڑا حصہ ابھی تک اسی قسم کے اشعار پر مشتمل ہے - دوسرے اشعار میں بھی کوئی خاص بات نہیں - داغ کے رنگ کا اتباع کیا گیا ہے اور بس - دوسرے شعر میں " کوچۂ جاناں " کو شاعر نے جنت قرار دیا ہے - یہی اس شعر کی جان ہے - اگر کوچۂ جاناں کو ایک لمحے کے لیے " جنت " نہ تصور کیا جائے تو شعر بے معنی اور مبہم ہو جاتا ہے؟

مع اور آخری شعر میں داغ کی بے ساختگی اور برجستگی کی نقالی ہے اور تیسرے شعر میں داغ کی شوخی کا اتباع کیا گیا ہے۔ لیکن یہ روانی اور برجستگی، شوخی، یہ معنویت اور سادگی جو چاشنی داغ میں بدرجہ اتم موجود ہے۔ پھر اس کی نقالی تحصیلِ حاصل ہے۔ جو اس قسم کی چیزوں کو پسند کرتے ہیں وہ داغ کے کلام ہی سے لطف اندوز ہو سکتے ہیں۔ پھر وہ داغ کے متبعین کے اشعار کی طرف متوجہ ہی کیوں ہوں۔ خصوصاً جب کہ داغ میں علاوہ بھی اوصاف موجود ہیں جو ان میں موجود نہیں۔ داغ کے اشعار کامیاب اشعار ہیں تازگی اور شگفتگی ملتی ہے جن کے مقابلہ میں یہ اشعار پژمردہ و خشک پھول کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس شاعری کے علاوہ داغ کے اشعار میں اصلیت بھی ہے۔ وہ اپنے جذبات کی ترجمانی کرتے ہیں اور ذاتی واقعات کے نقش و نگار کھینچتے ہیں ——— لیکن ان کے متبعین دوسروں کے خیالات و جذبات کی نقالی کرتے ہیں اس لیے اصلیت کہیں نہیں ملتی۔

۴۔ احسن مارہروی

نصیب سیرِ چمن دورِ باغباں میں نہیں — قفس میں رہتے ہیں گویا ہم آشیاں میں نہیں
کھنچی ہوئی چلی آتی ہے کس لیے یہ جبیں — کوئی کشش جو ترے سنگِ آستاں میں نہیں
یہ مانتا ہوں کہ پامالِ کن ہے وہ بھی مگر — تمھاری چال کے انداز آسماں میں نہیں
بڑا ہے خضر سے بھی عمر میں اور اس کے سوا — کرامت اور کوئی پیرِ آسماں میں نہیں

یہ میرے ضعفِ دلی کی قوی ہے ایک دلیل
کہ طاقت اس کے بیاں کی مری زباں میں نہیں

کیا خشک سامانی ہے۔ تاثیر کا کہیں نام و نشان نہیں، اصلیت معدوم، تخیل کا معیار اس شعر سے ظاہر ہے ؎

بڑا ہے خضر سے بھی عمر میں اور اس کے سوا
کرامت اور کوئی پیرِ آسماں میں نہیں!

خیالات بھی مصنوعی اور پیش پا افتادہ ہیں۔ ان کی ترجمانی میں بھی جدت و کاوش سے کام نہیں لیا گیا ہے۔ اگر کچھ ہے تو بس یہ کہ الفاظ کی نشست میں کوئی جھول نہیں۔ بندشیں پختہ ہیں جس سے مشاقی کا پتہ چلتا ہے لیکن شعریت مفقود ہے۔ اس پامال بے لطف، بے رنگ طریقۂ شاعری سے عاجز آ کر بعض تعلیم یافتہ طبقوں نے اس سے کنارہ کشی کی ہے۔ نئے رنگ کے متبعین زیادہ سنجیدہ ہیں اور نئے خیالات یا نئی طرزِ ادا کے حامل ہیں۔ غزل کو حسن و عشق کی قید سے آزاد کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور انواع و اقسام کے تصورات و محسوسات و واقعات کو داخلِ غزل کرتے ہیں اور الفاظ میں علمیت، بلندی، شوکت، متانت کا خیال رکھتے ہیں یعنی وہی اصول اختیار کرتے ہیں جو کہ سودا، غالب، مومن کی شاعری کی بنا تھی۔ انھیں خود اعتراف ہے کہ اس قسم کی غزلوں میں بھی زیادہ گنجائش نہیں۔ لیکن پھر بھی غزل سے کنارہ کش نہیں ہوتے۔ جوش اس طبقے کے خیالات کی پوری ترجمانی کرتا ہے ؎

دل رسم کے سانچے میں نہ ڈھالا ہم نے — اسلوبِ سخن نیا نکالا ہم نے
ذرات کو چھوڑ کر [illegible] کے لیے — خورشید پہ بڑھ کے ہاتھ ڈالا ہم نے

تحقیق یعارف یہ شعرا نظم کی قید سے آزاد رہنا چاہتے ہیں اور ہر شاعر ایک انفرادی اسلوب کی بنیاد رکھنا چاہتا ہے وہ ان کی غزلوں میں کم از کم ظاہری تکرار سے طلق نہیں پیدا کرتی۔ آسمان کے موضوعات بھی۔ یہ ذرات کو ہر چیز کہ خورشید کی طرف اڑ کر جاتے ہیں لیکن ان ذرات میں کامیاب نہیں ہوتے۔ ان کی ناکامیابی کی وجہ یہی معلوم ہوتی ہے جو پرانے رنگ کی غزلوں میں سب سے قوی پائی جاتی ہے یعنی اصلیت کا فقدان۔ اس طبقے کے شعرا جدت طرازی اور نازک خیالی یا معنی آفرینی میں اس قدر منہمک ہو جاتے ہیں کہ صداقت اصلیت کا خیال بھی نہیں رہتا۔ لفظی شکوہ تو حاصل ہو جاتا ہے لیکن تاثیر باقی نہیں رہتی ؎

تیری نمود ارتقا جلوہ گہِ حیات کا
تیرا وجود معجزہ عالمِ کائنات کا

کھینچ دیں اصل و فرع میں آپ نے حدِ امتیاز
ذہن و نظر کو دے دیا علم صفات و ذات کا

تیرگی وجود سے زندگیاں ہوئیں طلوع
عقدہ کیا ہو تو نے حل فلسفۂ حیات کا

کشمکشِ مآل سے روح کو کر دیا رہا
آخری رہنما ہے تو مرحلۂ نجات کا

سہنے لگے جو بے خودی خاطرِ پُر خروش کو
راز کہیں نہ فاش ہو قیدِ تعینات کا

الفاظ بلند آہنگ و وضیع الفاظ کی کثرت ہے۔ "ارتقا" "جلوہ گہِ حیات" "فلسفۂ حیات" "کشمکشِ مآل" "مرحلۂ نجات" "خاطرِ پُر خروش" "قیدِ تعینات" "تیرگیٔ وجود" نمایاں طور سے ہے۔ صلاۃ و عوام کی زبان سے علیحدہ بھی ہے۔ لفظی حیثیت سے ان اشعار کو تزئین اور امتیاز بھی حاصل ہے لیکن یہاں شاعری رضمون کی جان نہیں۔ لفظی شوکت معنوی شوکت کے مترادف ہے۔ خیالات عامیانہ و پیش پا افتادہ نہیں لیکن پھر بھی یہ اشعار نہیں اس لیے کہ خیالات محسوسات کے سانچے میں نہیں ڈھالے گئے ہیں۔ خیالات کی اہمیت وصداقت، الفاظ اور بندشوں کی رفعت و ندرت میں اہمیت نہ ہو اگر حقیقی جذبات معدوم ہوں تو شعریت کے لیے کافی نہیں۔ اکثر نئے سے شعرا زندگی کو جوش کا مترادف سمجھتے ہیں۔ جو خیالات ان کے دماغ میں آتے ہیں انھیں پرکھتے نہیں۔ محض زور و شور لفظی رعب و شکوت کے ساتھ بیان کرتے ہیں۔ اس لیے وہ بیں اکثر مجذوب کی بڑ سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتیں۔

جب دل سے شعلہ کو شعلۂ داماں بنا دیا
میں نے ہر ایک خار کو جنت بنا دیا

نغموں کی ہر اک کو عطا کی متاعِ دل
ابرو کی جنبشوں کو رگِ جاں بنا دیا

جوروں کو دی نظام دو عالم کی دلکشی
شوخی کو کائنات بداماں بنا دیا

حشروں کی خیزش کو عطا کی استقلال
شبنم کی بوند کو دُرِ غلطاں بنا دیا

کج کر کلاہِ فخر کو تیرے شباب کو
میں نے خدائے عالمِ امکاں بنا دیا

جب یہ شعرا لفظی شوکت و ندرت کی قید سے آزاد ہو کر غزلیں کہتے ہیں تو کچھ زیادہ کامیاب ہوتے ہیں۔ سادہ پیرایے اور مختصر بحروں میں اکثر دلچسپ اشعار موزوں کر لیتے ہیں۔ غالب و مومن کا رنگ و انداز تو ان میں نہیں آتا لیکن یہ اشعار سادہ بے مزہ نہیں ہوتے اور کانوں پر گراں نہیں گزرتے ؎

سنبھل بھی تھی دل نہ سنبھلتی تھی
کسی کو بھی دو سے دو سب کہتے

کوئی دیکھے مری وحشت سرائی
انھیں کی آنکھوں میں انھیں سے

کسی نے حال کچھ اس طرح پوچھا دعا نکلی دلِ اندوہ گیں سے
یہ مایوسی کا تیرِ آخری تھا بچے رہنا نگاہِ واپسیں سے
عنایت ہو جو سوئی دے بخیہ گر تو
مرا دامن کسی کی آستیں سے

"تہ نشیں"، "وحشت سوالی"، "اندوہ گیں"، علمیت و ادبیت کی چاشنی حاوی ہے لیکن یہاں خیالات کی اہمیت الفاظ کی اہمیت سے کم نہیں۔ شاعر محض نئی بندشوں کے اختراع یا علمی الفاظ کی جستجو میں سرگرداں نہیں۔ معانی پر نظر ہے اور انھیں صفائی اور پختگی کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ خیالات جدید نہ سہی ان کی ترجمانی دلکش پیرایہ میں کی گئی ہے —

کوئی پوچھے مری وحشت سوالی
انھیں کو مانگتا ہوں میں انھیں سے

وحشت سوالی کا کتنا اچھا ثبوت دوسرے مصرع میں پیش کیا گیا ہے۔ چوتھے شعر میں بھی ایک اچھوتا پن ہے۔ "نگاہِ واپسیں" کو مایوسی کا "تیرِ آخری" قرار دینا پھر بچے رہنا کا ٹکڑا نہایت پُرلطف ہے۔ یہ ہے نیا رنگِ تغزل لیکن اس رنگ میں کامیاب غزلیں کم ملتی ہیں۔

(اردو شاعری پر ایک نظر)

سید اعجاز حسین ایم۔ اے

دورِ حاضر کی غزلوں کا رجحان بھی قابلِ دید ہے۔ اس دور سے پہلے جو خرابیاں غزل میں آگئی تھیں نہ صرف وہ دور ہوئیں بلکہ بعض لحاظ سے وہ خصوصیات بھی نمایاں ہوئیں جو شاید کسی ایک دور میں اردو نہیں پیدا کر سکی تھی۔ ایک ایک خصوصیت کو بالتفصیل بیان کرنا تو طوالت کا باعث ہوگا۔ مختصراً موجودہ دور کی غزل گوئی میں حسبِ ذیل خصوصیات قابلِ ذکر و توجہ ہیں۔

دورِ حاضر میں غزل نے بھی نئے انداز سے نغمہ سرائی کی۔ تاثیر، ترنم، درد، خلوص، ہمواری، یک رنگی، جذباتی اور ذہنی کیفیت کے اظہار میں خاص توجہ کی گئی۔ تصنع اور لفظی بھرمار اور بے کار سیاقوں کے بجائے شعراء نے سادگی، سچائی، روانی، بندش کی چستی اور ہیئت کی یکجہتی سے لطیف و پُرمعنی کنایات موجودہ اردو غزل کی امتیازی خصوصیات سے ہیں۔ عام طور پر غزلوں میں فلسفۂ حیات اور حقیقتِ ہستی کا بیان زیادہ ہو چلا ہے۔ جو امکانات و امورِ بادی النظر میں مخصوص و محدود نظر آتے تھے ان کو دورِ جدید کی نگاہوں نے غیر متناہی اور بے پایاں دیکھ کر شعراء کے کلام میں حیرت کا عنصر بہت بڑھا دیا ہے۔

تصوف نے اصل اور بھی پیرایۂ بیان سے قدم بڑھ کر اکثر مقامات پر زیادہ سنجیدہ اور شاعرانہ شکل اختیار کر لی ہے۔ مسائلِ تصوف کا بیان سیکڑوں نئے عنوانات سے شعراء کہنے لگے ہیں۔ اپنی شخصیت اور انفرادی لب و لہجہ کو قائم رکھنے کی کوشش بھی دورِ حاضر کی ایک مخصوص چیز ہے۔ متعدد غزلیں عشقِ حقیقی اور مجازی دونوں عنوانوں سے الگ ہو کر محض مسئلۂ حیات کے موضوع پر ملیں گی۔

ایک نمایاں خصوصیت جو موجودہ غزل میں نظر آتی ہے وہ اس کی حقیقت و واقعیت پسندی ہے۔ مبالغہ سے گریز کر کے ابتذال کے گندے نالے سے بچتے ہوئے ہمارے شعراء نے جذبات و تخیل کی پاکیزہ دنیا کو آباد کرنا سب سے پہلا کام سمجھا۔ جن کو وہ ایسے خیالات کو نظم کرنا چاہتے ہیں جن میں حقیقت و کیفیت ہو۔ نیز شوخی و بے کیف مبالغہ سے بڑی حد تک دور جدید نے محفوظ رکھا فرسودہ اور مبتذل مضامین، تصنع اور محض رسمی باتیں مفقود ہو چلی ہیں۔ جو الفاظ و تراکیب کثرت استعمال سے پامال ہو چکی تھیں۔ ان سے گریز اور نئی ترکیبوں اور نئے انداز سے کلام کو سنوارنے کی جدوجہد جاری ہے۔

زبان سے زیادہ خیالات کی بلندی و پاکیزگی پر زور ہے۔ اس وجہ سے آج کل کبھی کبھی نامانوس ترکیبیں تو ضرور نظر آتی ہیں لیکن خیالات کی بلندی اور مضامین کی نوعیت پہلے سے اب بہت زیادہ قابل قدر ہے۔ نفسیاتی تحلیل ذہن اور اس کے بالواسطہ سے غزل کی دنیا آراستہ کی جا رہی ہے۔ حسن تخیل کی مثالیں زیادہ تر صدے کی اور قابل قبول آنے لگی ہیں۔ اس میدان میں بھی ہم دیکھتے ہیں کہ فلسفۂ حیات و رموز ہستی کا بیان زیادہ ہو چلا ہے۔ کبھی کبھی اپنی خامیوں کا بحیثیت انسان بیان کر دینا غزل گو شاعر نے بھی عاشق کے مستحسن سمجھا ہے۔ حسرت موہانی کا شعر ہے ؎

نہیں آتی جو یاد ان کی مہینوں تک نہیں آتی
مگر جب یاد آتے ہیں تو اکثر یاد آتے ہیں

واردات قلب کے فطری پہلو کو شاعر نے اس لیے ضروری سمجھا کہ معیاری عشق کی تلقین میں حقیقت پس پشت ہو جاتی ہے اور ایسے جذبات کا غلبہ ہوتا ہے جو واقعیت سے الگ ہوتے ہیں۔ عہد ماضی میں شعرا مثالیت پسندی سے متاثر ہو کر انسان کی فطری کمزوریوں کا بھی شمار معائب میں کرنے لگے تھے۔ ہر عاشق کو مجنوں و فرہاد کے افسانوی عشق کی کسوٹی پر کسنا چاہتے تھے لیکن عہد جدید میں نفسیاتی اور حقیقی رنگ غالب رہتا ہے۔

تیرہویں صدی کے زمانے میں داخلی پہلو غزل کی جان سمجھا جاتا تھا مگر دور متوسط میں ایک ایسا بھی زمانہ گزرا ہے کہ جس میں خارجی پہلو کو زیادہ جگہ مل گئی تھی۔ غزل اب ظاہری حسن و جمال کو اول تو سطحی چیز سمجھ کر اپنے یہاں جگہ ہی نہیں دیتی اور اگر دیتی بھی ہے تو محض تعریف کر کے چپ نہیں ہو جاتی بلکہ ان کے دیکھنے سے جو کیفیات دل پر گزر سکتی ہیں ان کو مزے لے کر بیان کرنے کی کوشش کرتی ہے

ایک دوسری خصوصیت بھی آج کل کی غزل میں خاص طور پر نظر آتی ہے۔ اب سے پہلے بہت کم شعرا کا کلام ایسا ہے کہ جو شروع سے آخر تک ہموار ہو۔ آج کل کے ممتاز شعرا اس کا زیادہ خیال رکھنے لگے ہیں۔ ہم تو یہ کہنے کو تیار نہیں کہ موجودہ غزلوں میں ناہمواری بالکل نہیں ہے مگر اس سے کافی تسکین ہو جاتی ہے کہ ایک بڑی حد تک لوگوں کا کلام اس عیب سے پاک ہے۔

یہ سب تو ہوا مگر قدما کے کلام کی سادگی، بھولا پن، معصومیت اور خالص تغزل کے تیز اثر کرنے والے نشتر موجودہ غزلوں میں کم نظر آتے ہیں لیکن مایوس ہو کر واپس آتی ہیں۔ نکہت اور خوشگوار آورد کی جھلک بڑھتی جا رہی ہے۔ سہل ممتنع کی مثالیں بہت کم ہوتی جا رہی ہیں۔ فارسی اور عربی کی نئی ترکیبوں کی تلاش و استعمال میں لوگوں سے کبھی کبھی لغزش ہو جاتی ہے اور قدم ڈگمگا کر راہ راست سے الگ پڑ جاتا ہے۔

دورِ حاضر میں غزل کی ایک نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ حسن و عشق کے تصادم کو ذرا دور سے دیکھا جا رہا ہے جیسا میں یا افسانوں میں یا دوسروں کی آنکھوں میں پایا سرا ہے گو ہے اور یہ دیکھنا بھی تفریح کی پہلو پر مبنی ہوتا ہے۔ بہت کم سپردگی اور بودگی کی کیفیتیں پیدا ہوتی ہیں۔ چنانچہ بجز چند شعرا کے زیادہ تر لوگوں کی غزلوں میں جو عاشقانہ اشعار ہوتے ہیں ان میں بھی انہماک و گم شدگی بہت کم ہے۔ یہ معلوم ہوتا ہے کہ زندگی کو بہت قریب سے نہیں دیکھا گیا۔ عشق میں مٹ جانے کی صلاحیت بہت کم غزل گو شعرا میں نظر آتی ہے یا تو رسمی باتوں پر اکتفا کرتے ہیں یا ان کا عشق سرسری مشاہدہ کا نتیجہ ہوتا ہے۔ ذاتی تجربات اور ان میں عمق کی کمی اور درد و شدت کو اشعار کا زیادہ نہیں ابھرنے دیتی۔

ان باتوں کا جواب اس بات میں مضمر ہے کہ غزل اور عشق کا نظریہ موجودہ دور میں وہ نہیں رہا جو اس سے پہلے تھا۔ اب غزل میں تنقیدِ حیات اور دیگر مضامین کو کافی جگہ دینے کا خیال رہتا ہے۔ محض حسن و عشق کی داستان تک محدود کرنا ضروری نہیں سمجھا جاتا اور عشق کو مثالی درجے پر رکھ کر نصب العین قرار دینا بھی ضروری نہیں خیال کیا جاتا ہے۔ محبت کا روحانی پہلو جنسی خواہشات میں تبدیل ہو چلا ہے۔ یہ مسلم نظریہ ایسا ہے کہ انہماک و سپردگی کو خود کم کر دیتا ہے۔ بقول فراق ؏

بدلتی جا رہی ہیں بزمِ ناز کی روایتیں

نظموں کے دائرے کو وسیع ہوتے دیکھ کر موجودہ غزل گوئی نے بھی بعض بعض خواص جذب کرنے کی کوشش کی جس کا اثر کچھ اچھا نہیں پڑا ہے۔ اشعار میں مضامین لانے کی فکر نے کسی قدر خشکی پیدا کر دی ہے اور ساتھ ہی ساتھ مضامین کو پوری طرح واضح کرنے میں ایک ایسا تسلسل پیدا ہو گیا کہ یہ غزلیں نہ نظم رہتی ہیں اور نہ غزل ہی کے صحیح مفہوم کو پورا کرتی ہیں۔

بلندیٔ تخیل کی کمی کہیے یا معاشی زندگی کی ابتری سے انتشار کا نتیجہ سمجھئے کہ موجودہ غزلوں میں ایسا مجموعہ بھی ہے جس میں غیر عاشقانہ اشعار کی بھرمار ہے۔ دیکھنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ کسی نظریۂ باہمی یا قطعہ میں سے نکال لیے گئے ہیں اور اپنی ساخت کی وجہ سے چند عاشقانہ اشعار کی آمیزش سے ان کے مجموعہ کو بھی غزل کہا جا رہا ہے۔

موجودہ غزل میں ایسے مضامین کا آنے لگے ہیں جن میں سائنس کے ان پہلوؤں پر زیادہ توجہ کی گئی ہے جو تخلیق عالم یا جنیات کی طرف اشارہ کرتے رہتے ہیں جو ہمارے غیر شعوری احساسات کی لہروں کے حرکات و سکنات کا پتہ دیتے رہتے ہیں۔ نفسیاتی تحلیل اور اس کے اثرات کا نتیجہ اردو غزلوں میں کچھ کم جگہ نہیں پا رہا ہے۔ نظموں کی طرح یہاں بھی اجرام فلکی اور خوشگوار یا ناخوشگوار مناظرِ قدرت کو بڑی خوبی کے ساتھ تخیلی و جذباتی رنگ دے کر پیش کیا جا رہا ہے۔ یہ جملہ خصوصیات ہمارے نزدیک غزل کی دنیا میں معنوی حیثیت سے ایک خاص اضافہ ہیں جن کا وجود غزل کی تجدید و بقا کا ضامن ہو سکتا ہے۔

(نئے ادبی رجحانات)

آل احمد سرور

ولی کے وقت سے لے کر غالب اور ان کے ہم عصر شعرا تک تقریباً ڈیڑھ سو سال ہوتے ہیں۔ اس عرصہ میں غزل نے تکمیلِ فن کے تمام مراحل طے کیے اور وہ ہماری شاعری کی سب سے اہم اور سب سے مقبول صنف بن گئی۔ کہا جاتا ہے کہ آزاد اور حالی

نے سب سے پہلے غزل کے خلاف بغاوت کی تھی۔ دراصل آزاد اور حالی غزل سے باغی نہ تھے۔ اس غزل کے خلاف تھے جو بڑی محدود اور مصنوعی ہو گئی تھی۔ یہی اس معنی میں کہ استادی شاگردی کی روایت صنعتی معیار سے آگے بڑھ کر شاعر کی راستے کو بھی مقید کرتی تھی۔ محدود اس معنی میں کہ معاملہ بندی، روز مرہ، صنائع و بدائع، تصوف و فلسفہ کی آمیزش وغیرہ وغیرہ غزل کے لیے لازمی چیزیں بن گئی تھیں اور مصنوعی اس حیثیت سے کہ ناسخ اور ان سے پہلے دہلوی متقدم شاہ نصیر نے غزل کو بھی مناظرہ و رنجش یا کمال فن کا ایک ذریعہ سمجھ لیا تھا لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ شروع سے غزل یوں ہی مصنوعی اور محدود تھی۔ غزل میں شروع ہی سے بادہ و ساغر کے پردے میں مشاہدۂ حق بھی ہے اور مشاہدۂ نفس بھی مگر زوال کے دور میں صنعتی معیار زیادہ اہم ہو گیا تھا اور زمانہ زوال کی قدریں زیادہ دھندلی ہو گئی تھیں اس لیے مشاہدۂ گردوپیش جو غزل میں بار بار ملتا ہے وہ اس زمانے میں اتنا نمایاں نہ رہا تھا۔ اردو کے غزل گو شاعر کے متعلق یہ خیال بہت عام ہے کہ وہ اپنے ماحول سے بے نیاز اپنے خیالات کی نئی دنیا بسائے رہتا تھا۔ دراصل اس کے خیالات کی دنیا اتنی الگ تھلگ نہ تھی وہ ان تمام چیزوں سے پوری طرح اثر لیتا تھا جو سیاسی، معاشرتی یا اس زمانے کی ادبی زندگی پر اپنا سایہ ڈالتی تھیں۔ وہ اس دنیا کی زنجیروں میں جکڑا ہوا ضرور تھا مگر اپنی شاعری میں ان زنجیروں کو اس طرح جھٹکے دیتا تھا کہ قید میں آزادی بھی نصیب ہو جاتی تھی۔ اس کے یہاں انتشار و پراگندگی ضرور تھی مگر نہ اتنی کہ کوئی خاص مرکزی خیال یا تصور سرے سے ناپید ہو۔ حسن و عشق اس کی زندگی میں بڑی اہمیت رکھتے تھے مگر ان کے سوا کچھ اور چیزوں کا بھی وہ قائل تھا۔ ان چیزوں کے ذکر کے لیے وہ غزل سے پورا کام لیتا۔ اشارۂ ایمائیت تھا اور بادہ و ساغر اور قفس و آشیاں کے پردے میں صرف تصوف اور فلسفہ ہی نہیں بلکہ اور بہت کچھ بیان کر جاتا تھا۔ اردو شاعری میں یہ رمزیت (SYMBOLISM) اس قدر عام تھی کہ اس سے ہر چھوٹے بڑے شاعر نے فائدہ اٹھایا۔ ہماری غلطی تھی کہ ہم نے اپنے شعرا کے یہاں سوائے قافیہ، روز مرہ، معاملہ بندی، مگر شاعرانہ خمریات، پند و نصائح، صنعت مراعات النظیر کے اور کچھ تلاش نہ کیا۔ حالی اور آزاد کے بعد وہ تھی اور بھی زیادہ ہو گئی جو ہمارے شعرا محسوس کرنے لگے کہ عشق پر وہ شیریں بہلانا چاہتے تھے مغرب کے اثر سے شاعر کے نصب العین ہی آزادی ہوئی۔ مغربی اور پرانا میں بحث لگی۔ سیاسی حالات بد سے بدتر ہوتے گئے یہاں تک کہ حکومت کی بساط ہی بدل گئی اور اب نظموں میں وہ باتیں صاف صاف بیان ہونے لگیں جن کے لیے غزل میں پردے تلاش کیے جانے لگے۔ جدید غزل قدیم غزل سے علیحدہ کوئی چیز نہیں۔ اس کی نئی یا صورت ہے۔ صرف زبان اور فن کے لحاظ سے اس میں قدیم غزل کے مقابلے میں تھوڑی سی بے راہ روی آ گئی ہے اور اچھے اچھے شاعر خیال کے پیچھے لفظ کی صحت کو قربان کر دیتے ہیں یا کسی شاعرانہ جواز کے پردے میں پناہ لیتے ہیں مگر شاعر کی زندگی پہلے سے بدل گئی ہے۔ اس میں اجتماعی نقطۂ نظر آ رہا ہے۔ وہ بیک وقت محبوب کی کم نگاہی اور سماج کی نا اہلی دونوں کو محسوس کرتا ہے۔ دنیا اب مغرب ہی میں چھوٹی نہیں ہوئی بلکہ مشرق میں بھی چھوٹی ہو گئی ہے۔ سیاسی حالات نے زیادہ تلخی اور شدت حاصل کر لی ہے۔ برسوں کی غلامی کا بوجھ بعض اوقات اتنا گراں معلوم ہوتا ہے کہ ساقی کی مست نگاہی بھی اسے بھلا نہیں سکتی۔ اس وجہ سے اس دور کی غزل میں ایک بے چینی، بے ہوشی و گرمی کی اور ایک اندرونی لہر ناکامی و مایوسی کی پائی جاتی ہے۔ غزل اور نظم کے درمیان خلیج بھی کم ہو گئی ہے مگر پھر بھی اشارے اور کنایے غزل میں اور صاف صاف باتیں نظم میں بیان ہونے لگی ہیں۔ اس سے دونوں کو فائدہ ہوا ہے۔

غزل کے میدان میں جو تجربے اس زمانے میں کیے گئے ہیں ان کا ذکر بھی یہاں ضروری معلوم ہوتا ہے۔ یہ تجربے غزل کے لیے شاید مفید ثابت ہو سکتے ہیں۔ ایک بڑی کوشش تو وہ ہے جو حالی کے وقت سے شروع ہوئی اور آج تک جاری ہے غزل کی

کو آسان، عام فہم اور بول چال سے قریب لانے کے لیے بہت سے اشخاص نے کوشش کی ہے۔ اس سادگی میں اور میر و درد زمانے کی سادگی میں باوجود تھوڑی سی قدر مشترک کے فرق بھی ہے چنانچہ آزاد، آرزو، اثر، حفیظ، افسر وغیرہ کے یہاں جو رجحان ہے وہ زوروں نہیں، ایک بہت بڑی ادبی تحریک کا نتیجہ ہے اور اس سے شاید ہی کوئی شاعر محفوظ رہ سکا۔ غزل میں مسلسل مضمون نظم کرنے کا خیال میں مگر شاید کسی شاعر نے اتنی پابندی اور استقلال سے اسے نباہنے کی کوشش کی ہو جتنی جوش نے کی ہے۔ مسلسل مضمون غزلیں یہاں بہت ملتے ہیں اور میر و غالب کی بہت سی غزلیں اس کے ثبوت میں پیش کی جا سکتی ہیں مگر جوش کا تتبع عام طور پر نہیں کیا گیا شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ مسلسل غزل، غزل نہیں رہتی، نظم بن جاتی ہے اور جوش کے ہاں رجز خوانی زیادہ ہے جو غزل کے لیے اتنی ضروری نہیں۔ اس کے علاوہ غزل کے مضامین کو وسیع کر کے اس میں ایک طرف حیاتی اور دوسری طرف آفاقی رنگ پیدا کرنا بھی لوگوں نے سیکھا ہے اگرچہ یہ روش ابھی عام نہیں ہوئی۔ غالب کی تقلید نے لکھنؤ والوں کو کنگھی اور نقش سے نجات دلائی اور عام طور پر فرسودہ روش سے پرہیز سکھایا۔ یہی وجہ ہے کہ اب ہمارے شاعر فرسودہ زبان برتنے کے بجائے خود زبان ایجاد کرتے ہیں یعنی جو الفاظ وہ استعمال کرتے ہیں ان میں ان کا جذبہ زیادہ شریک ہوتا ہے وہ اتنے عام نہیں کہ اپنی انفرادیت کھو چکے ہوں۔ اس دور کا تفلسف بھی غالب کی تقلید کا نتیجہ ہے۔ ایک عرصہ تک یہ خشک فلسفہ نظم کرنے اور علمیت بگھارنے کے مترادف رہا مگر اب اس کی وجہ سے غزل میں محض جذبہ کے بجائے فکر کا جزو بھی آ گیا ہے جو قدیم رنگ پر چلنے والے ہیں۔ وہ بھی اپنی غزلوں میں نیا تلفظ اور نئی شگفتگی پیدا کرنے میں کامیاب ہوئے۔ یہی وجہ ہے کہ بیسویں صدی میں غزلوں کا سرمایہ کسی طرح دوسرے دوروں سے کم نہیں ہے بلکہ بعض حیثیتوں سے زیادہ اہم ہے۔

(نئے اور پرانے چراغ)

احتشام حسین

اردو غزل گوئی نیم وحشی صنف سخن ہو یا محض روایت پرستی مگر کبھی کبھی اس تاریکی میں ایسے شعلے بھڑک اٹھتے ہیں کہ دل کی فضا کچھ دیر کے لیے سبک تر ہو جاتی ہے کیونکہ ہمارے وجدان کی تعمیر میں قدیم روایات کا بہت شاندار حصہ ہے۔ روایتی شاعری میں مقدار اور تعداد کا اضافہ ہر وقت ہوتا رہتا ہے۔ نئی خصوصیتیں مشکل سے پیدا ہوتی ہیں۔ صرف منضبط اور جاندار انفرادیت رکھنے والے اس روایت کو توڑتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں اور اپنے حدود ہی کے اندر رہ کر اپنے سینے کی آگ اور اپنے دل کا لہو اپنی شاعری میں بھر دیتے ہیں پھر چونکہ ان کے پڑھنے والے اپنے معاشی اور معاشرتی روابط کی وجہ سے خود اس ماحول سے طبعی مناسبت رکھتے ہیں اس لیے اشاریت کی خصوصیت پیدا ہو جاتی ہے۔ ہم اور آپ غزل کی شاعری سے متنفر ہوں، عاجز ہوں، اس کے مٹا دینے کے درپے ہوں، ایام جاہلیت کی یادگار سمجھ کر اس دور تہذیب کو اس سے پاک کر دینا چاہتے ہوں، منسوخ کرنا چاہتے ہوں، اس کا اثر لینے سے دور بھاگتے ہوں مگر ہمارے اندر وہ قلعہ توڑ کر کوئی میر، کوئی غالب، کوئی آتش، کوئی حسرت، کوئی جگر، کوئی فانی، کوئی فراق ہمارے وجود کے اندر جھانکتا ہے اور وہ نغمہ چھیڑتا ہے جسے ہماری روح قبول کرنے پر تیار ہو جاتی ہے۔ زندگی کی کوئی گہری حقیقت، فکر و درد اور محبت کا کوئی پریشان کرنے والا خیال، اس سے بھاگ کر کوئی کہاں جائے گا! اس کی آواز بھٹکا کرتی ہے اور اشعار دہرانے پڑتے

ہیں کیونکہ صرف عقل ہی اسے علیحدہ رکھنے کی کوشش کرے تو کرے ہمارا دل اسے اپنی قیمتی پناہ دیتا ہے اور غلاف دیتا رہے گا۔ پھر غور کیجئے تو غزل صرف دل کی شاعری ہے بھی نہیں اسے عقل سے گہرا تعلق ہے اور یہی امتزاج اچھا غزل گو پیدا کرتا ہے۔ اس لئے کہنے سے چاہے تغزل اور (LYRICISM) کا مفہوم مجروح ہوتا ہوا چلا ہو لیکن حقیقت یہی ہے کہ اچھا غزل گو عقل کے ساتھ بہت زیادہ دور نہیں رہتا۔

(تنقیدی جائزے)

عبادت بریلوی[1]

غزل ایک ایسی صنف بھی ہے جس میں ارتقائی صلاحیتیں تو موجود ہیں لیکن ان ارتقائی صلاحیتوں کا احساس ذرا مشکل ہوتا ہے۔ دوسری اصناف میں تو یہ کیفیت خود نمایاں ہو جاتی ہے کیونکہ ان کا عام انداز خارجیت سے مطابقت رکھتا ہے۔ توضیح و تفصیل ان کے مزاج کا جزو ہوتی ہے بات کو براہ راست کہنا ان کا شعار ہوتا ہے لیکن غزل کا انداز اس سے ذرا مختلف ہے۔ غزل میں زندگی کے ہر خارجی پہلو کا اظہار داخلیت کا روپ اختیار کر لیتا ہے۔ بات اس میں اگرچہ عمومی اور آفاقی انداز میں کی جاتی ہے لیکن توضیح و تفصیل کی جگہ اس میں اشاروں اور کنایوں سے کام لیا جاتا ہے۔ ان اشاروں اور کنایوں کی تعمیر و تشکیل مختلف عناصر سے ہوتی ہے۔ یہی عناصر غزل کے اہم اجزا ہیں اور انہی کو غزل کی روایات سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ غزل اپنی ان روایات کو بہت عزیز رکھتی ہے اور ان کو چھوڑنے کا خیال بھی اسے گراں گزرتا ہے۔ اس کی ارتقائی کیفیت پرانی روایات کے پردے میں چھپی رہتی ہے۔ ان کی پہچان ہر ایک کے بس کی بات نہیں۔ اس کا اندازہ وہی کر سکتا ہے جو غزل کے مزاج سے صحیح واقفیت رکھتا ہے۔

زندگی کی ہر تبدیلی اور تبدیلی کے زیر اثر ارتقائی کیفیت غزل میں اپنا اثر دکھاتی ہے۔ خارجی طور پر زندگی میں جو تغیر ہوتا رہتا ہے اس کے اثرات غزل میں پوری طرح نمایاں ہوتے ہیں۔ سیاسی، معاشی، معاشرتی اور تہذیبی تبدیلیوں کا عکس اس میں صاف نظر آتا ہے اس کا ایک ثبوت تو یہ ہے کہ وہ اس بدلتی ہوئی زندگی کی عکاسی کرتے ہوئے خود اپنے آپ کو بھی بدل دیتی ہے۔ یہ تغیر غزل میں خارجی طور پر کم نمایاں ہوتا ہے لیکن در پردہ وقت کی تبدیلی کے ساتھ اس کی دنیا بدلتی جاتی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ غزل اپنی ظاہری ہیئت کو بہت کم بدلتی ہے لیکن اس میں پیش کیے ہوئے خیالات و نظریات باوجود اظہار و بیان کی یک رنگی کے اپنے اندر رنگا رنگی پیدا کرتے رہتے ہیں۔ ہر دور میں اس کا سلسلہ جاری رہتا ہے اس لیے زندگی کی ارتقائی کیفیت اس میں جگہ جگہ اپنے آپ کو نمایاں کرتی ہے۔

اگر ایسا نہ ہوتا تو غزل میں اتنے متنوع موضوعات نظر نہ آتے اس میں خیالات کی اتنی رنگا رنگی نہ ہوتی۔ اس میں سموئے ہوئے افکار میں اس درجہ بوقلمونی نہ ہوتی۔ غزل کی بڑائی اسی تنوع اور رنگا رنگی میں ہے۔ اسی کے سہارے اس میں وسعت اور ہمہ گیری کی خصوصیات پیدا ہوتی ہیں۔ غزل کا بنیادی موضوع عشق ہے لیکن صرف اس عشق کی داستان ہی نہیں اس کی بلاغ

---

[1] انھوں نے ایک کتاب بھی "غزل اور مطالعۂ غزل" کے نام سے لکھی ہے۔

ہی ہے۔ اس کی بڑائی تو اسی میں ہے کہ اس نے عشق کی تشریح اور مختلف کیفیات کی ترجمانی کی ہے اور وقت کے ساتھ ساتھ بدلتے ہوئے عشقیہ تصورات کو اپنے دامن میں سمویا ہے۔ زندگی کے مختلف ادوار میں عشق کے جو تصورات رہے ہیں ان سب کی تفصیل غزل میں موجود ہے۔ صرف یہی نہیں بلکہ ایک ہی دور کے مختلف تصورات عشق کی زندگی سے بھرپور تصویریں جس طرح غزل میں ملتی ہیں کسی دوسری جگہ نہیں مل سکتیں۔ پھر فلسفے کی اقدار جس طرح ان کیفیات میں تغیر ہوا ہے۔ غزل نے اس کی عکاسی بھی کی ہے اور غزل صرف اس بات پر کہ اسی حد تک محدود نہیں کیا ہے۔ وہ اس حصار سے باہر بھی نکلی ہے جب زندگی نے مادی اور مابعد الطبیعی موضوعات کو اہمیت دی ہے تو اس نے بھی ان کو اپنایا ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو غزل میں تصوف کے مسائل کی ترجمانی ایک مستقل رجحان کی صورت میں نظر نہ آتی۔ تصوف اور اس کے مسائل کو غزل نے بڑی خوبی سے اپنایا اور تصوف نے اس کو وسعت اور ہمہ گیری عطا کی، زندگی کے نئے سے نئے مسائل کے لئے غزل کے دروازے کھول دے اور پھر حیات غزل کا موضوع بننے لگی۔ تصوف کے توسط ہی سے حیات و کائنات کے بے شمار مسائل کی ترجمانی کا رجحان اردو میں عام ہوا اور اس طرح اس میں اپنے دامن کو وسیع کر لینے کی روایت قائم ہوئی۔ غزل میں سیاسی، سماجی اور تہذیبی مسائل کی ترجمانی جو اس کی تاریخ کے مختلف ادوار میں ملتی ہے اس میں اسی صورت حال کے اثرات جھلک رہے ہیں۔

ولی اور میر سے لے کر حسرت اور فراق تک اردو غزل اسی ارتقائی کیفیت کی داستان نظر آتی ہے اس میں ہماری تاریخ کا تدریجی ارتقا بھی موجود ہے۔ سماجی حالات کی بدلتی ہوئی کیفیت بھی موجود ہے۔ زندگی کے بدلتے ہوئے تصورات کی حقیقت بھی موجود ہے لیکن یہ سب "بادہ و ساغر" اور "دشنہ و خنجر" کے پردے میں پڑے ہوئے ہیں۔

"ماہ نو" فروری ۱۹۵۳ء

وقار عظیم

کیا غزل میں اس بات کے امکانات ہیں کہ وہ ہر آن آگے بڑھتے ہوئے زمانہ کا ساتھ دے سکے اور کیا اس کے نظام میں وہ صلاحیت موجود ہے کہ وہ اپنے آپ کو بدلتے ہوئے ماحول اور حالات کے سانچے میں ڈھال کر ان سے مطابقت اور ہم آہنگی پیدا کر سکے؟

اس سوال کا ایک بالکل غیر منطقی جواب تو یہ ہے کہ اردو غزل کی دو سوا دو سو برس کی زندگی خود ایک ایسی شہادت ہے جس سے غزل کی ارتقائی صلاحیتوں کو تسلیم کرنے کا جواز پیدا ہوتا ہے۔ ولی سے لے کر حسرت اور جگر بلکہ حفیظ ہوشیارپوری اور فیض تک زمانہ کے بہت گردشیں آئیں اور تصوف کے ساتھ غزل کو جذب و سلوک کی نہ جانے کتنی منزلیں طے کرنی پڑیں لیکن ہر منزل میں غزل نے اپنی انفرادیت اور امتیازی شان برقرار رکھی اور گرد و پیش کی سیاسی، سماجی اور ذہنی فضا کو اپنے اندر سمو کر برابر آگے بڑھتے ہوئے زمانہ کے ساتھ آگے بڑھتی رہی لیکن اس طرح کہ اس کی آن بان میں سر مو فرق پیدا نہیں ہونے دیا۔ زمانہ کچھ سے کچھ بن گیا لیکن غزل غزل ہی رہی۔

زمانہ کے ان انقلابات کے علاوہ ادبی زندگی میں بھی انقلاب آئے اور کبھی کبھی تو ان انقلابات کا مقصد ہی یہ تھا کہ غزل کے

ماحول کو ختم کر کے کسی اور کو اس کی تحت حکم کو سونپ دیا جائے۔ غزل کو زندگی کی ہر ایک تحریک کا دشمن گردانا گیا اور ملک، وطن، قوم اور انسانیت ہر ایک کی دہائی دے کر غزل کے خلاف سخت سے سخت محاذ قائم کیے گئے۔ یہاں تک کہ غزل کے مذمت والوں کا یہ اجتہاد اور انقلاب پسندی کی شان ہو گیا لیکن غزل پر اس قدر یلغاروں نے مطلق اثر نہ کیا۔ وہ ہر ایسے محاذ کو ریت کی دیوار سمجھ کر اس پر اور اس کے دیوانوں پر مسکراتی رہی۔ اس کی اس مسکراہٹ میں استہزا بھی تھا اور خود اعتمادی بھی اور اس کا یہ استہزا اور یہ خود اعتمادی آج اپنے زمانے میں اگر اتنی حق بجانب ثابت ہوئی ہے کہ اپنی زندگی میں شاید ہی کوئی اور بات اتنی ثابت ہوئی ہو۔ ہماری زندگی نے پچھلے پچاس برسوں میں ایک ایسا انقلاب دیکھا ہے جس کی مثال انسانی تاریخ میں مشکل ہی سے ملے گی۔ لیکن اس ہنگامہ آشوب دور سے گزر کر بھی غزل نے اپنی انفرادیت کو برقرار اور قائم رکھا ہے ـــــ غزل کی دنیا اب بھی اچھے غزل گویوں سے خالی نہیں ہوئی۔ اب بھی اس کے آسمان پر مسلسل ان کے ساتھ نئے نئے ستارے روشن ہو کر فضا کو منور بنانے کے کام میں مصروف دکھائی دیتے ہیں۔ غزل اپنی دو صدی کی روایت کے تسلسل کے باوجود نئے زمانے کی ضرورتوں اور نئے مسائل اور مزاج کے تقاضوں سے ہم آہنگ نظر آ رہی ہے۔ اس میں زندگی کے دوام کی علامتیں زیادہ مستحکم ہو رہی ہیں۔

تاریخ کی یہ شہادت ایک طرف ہے ایسی شہادت جسے ہم نے غیر مشروط شہادت کہا تھا لیکن عدم مقبولیت کے پیچھے ایک بہت بڑی منطق بھی ہے۔ وہ منطق غزل کی ان خصوصیتوں سے وابستہ ہے جو بہر حال زمان و مکان کی قید و بند سے آزاد رہ کر اس کا جزو لازم ہیں۔ غزل میں فن اور ہیئت کے اعتبار سے بھی اور موضوع کے نقطۂ نظر سے بھی کچھ ایسی باتیں ہیں جو اسے ہر زمانہ کی چیز بناتی ہیں اور جن کی بنا پر اس میں ایسی لچک پیدا ہوتی ہے کہ وہ ہر طرح کے حالات، ہر دور کے ماحول اور ہر درجہ کی فضا کو اپنے لیے سازگار بنا لیتی ہے اور اس کی اثر انگیزی کسی ایک خاص طرح کا مزاج اور رجحان رکھنے والوں کے لیے مخصوص یا کسی خاص طبقہ یا گروہ تک محدود نہیں ہوتی۔

فن کے اعتبار سے سب سے پہلی چیز غزل میں ایجاز کا ہونا ایک ایسی خصوصیت ہے جس سے غزل کے علاوہ نثر اور نظم کی ہر صنف محروم ہے۔ غزل کے ایک ایک شعر میں زندگی کی بڑی سے بڑی حقیقت اور دقیق سے دقیق نزاکت کو انتہائی حسن و لطافت اور اثر کے ساتھ بیان کر دینے کی یہ قدرت اسے رمزیت کا وہ شرف بخشتی ہے جو کسی اور صنف کو کسی زمانہ میں میسر نہیں آیا۔

ایجاز کی اس قابلِ رشک صفت کے علاوہ ایمائیت اور رمزیت دوسری خصوصیت ہے جسے غزل کی روایت نے اپنا طرۂ خاص بنایا ہے۔ غزل اس وقت تک غزل ہی نہیں بنتی جب تک وہ اس رمزیت اور ایمائیت کو اپنا نہ بنائے۔ اس کا یہ رمز اور ایمائی طلسم اسے تصور آفرینی اور تاثر انگیزی کی دوسری قابلِ رشک خصوصیت بخشتا ہے اور شاعر اپنی بات کہنے کے لیے جو اسلوب کنایے، تشبیہیں، استعارے اور محاکات کے دوسرے وسیلے کام میں لاتا ہے۔ اور یہ اتنی وسعت ہوتی ہے کہ ہر دل کو ان میں اپنی دھڑکن سنائی دیتی اور اپنی کسک محسوس ہوتی ہے۔ صوفی، فلسفی، رند، عاشق، مصلح اور سیاست داں سب ایک ہی اشارے سے اپنے اپنے دل کی بات پا لیتے ہیں۔ وہی شاعر جو فطرت کا محرمانہ پرستار بن کر یہ کہتا ہے کہ ؎

اتنا مانوس ہوں فطرت سے کلی جب چٹکی
جھک کے میں نے یہ کہا مجھ سے کچھ ارشاد کیا
جوش

یا ؎

فطرت پرست ہوں مجھے گل ہی نہیں عزیز
کانٹوں سے بھی نباہ کیے جا رہا ہوں میں
جگر

جب عاشق، فلسفی، سیاست داں اور مفکر کا ترجمان بنتا ہے تو گل اور پھول کے اشاروں میں ان کے دل کی بات اس طرح ادا کرتا ہے ؎

پتہ پتہ بوٹا بوٹا حال ہمارا جانے ہے
جانے نہ جانے گل ہی نہ جانے باغ تو سارا جانے ہے

کہا میں نے گل کو ہے کتنا ثبات
کلی نے یہ سن کر تبسم کیا
میر

وہ توڑتے ہیں تو کلیاں شگفتہ ہوتی ہیں
وہ روندتے ہیں تو سبزہ نہال ہوتا ہے
اکبر

غزل اپنے اس ایمائی انداز میں جو غزل کی فطرت ہے، زندگی میں بہت سے خارجی اور سارے داخلی پہلوؤں اور کیفیتوں کی ترجمانی اور عکاسی کرتی ہے۔ جذبہ اور احساس کی نزاکت، ذہن اور نفس کی ہر خلش اور الجھن، سیاسی، معاشرتی زندگی کی ہر وہ کیفیت جو انسان کے دل میں گداز اور تڑپ پیدا کرتی، جگر کو درد آشنا بناتی اور آنکھوں سے اشک خونیں کا خراج وصول کرتی ہے۔ غزل کا موضوع ہے ۔۔۔ اس کا ایک ایک شعر زندگی کی ساری وسعتوں کا حامل بھی ہے اور اس بات پر پوری طرح قادر بھی کہ ان ساری وسعتوں کو پڑھنے والے کے دل کی گہرائیوں میں جذب کر دے۔

غزل کی یہی خصوصیتیں ہیں جو اسے ہر دیوانہ اور فرزانہ کے دل کی ترجمانی اور رازداری کا منصب عطا کرتی ہیں۔ ہر درد کو اپنا درد بنانا، غزل کی سرشت اور ہر ایک کا رمز شناس ہو کر رموز کا احترام اس کی فطرت ہے۔ صرف غزل کے شعر سن اور پڑھ کر ہی آدمی یہ محسوس کرتا ہے کہ اس میں اس کے دل کی بات کہی گئی ہے اور صرف غزل ہی کے شعر پڑھ اور سن کر اسے یہ معلوم اور محسوس ہوتا ہے کہ اس کے زخموں میں ٹھنڈک پڑ رہی ہے اور کوئی نامعلوم قوت اس کے دل اور جگر کے چاکوں کو رفو کر رہی ہے۔

اور یہی سب کچھ ہے جس نے غزل کو یہ ارتقائی صلاحیت بخشی ہے کہ وہ زندگی کے ہر دور میں، اس کی ہر رفتار کے ساتھ قدم سے قدم ملا کر چلتی ہے نہ پچھڑتی ہے نہ تھکتی ہے اب تک اس نے ہمیں جو کچھ دکھایا ہے۔ اس کی بنا پر یہ حکم لگانا کچھ عجب نہیں کہ اس کی یہی سرشت اسے ہمیشہ زندہ رکھے گی۔

(ماہِ نو)

ڈاکٹر ابواللیث صدیقی

غزل میں دو عناصر ایسے ہیں جنھوں نے اب تک غزل کا ساتھ دیا ہے اور جو بڑی حد تک غزل کو بحیثیت ایک صنفِ شعر کے زندہ رکھنے کے ذمہ دار ہیں۔ ایک شدید قسم کی داخلیت اور دوسرے اس داخلیت سے براہِ راست متعلق ایک خاص قسم کی شکست جسے اب غزل کی رمزیت کا نام دیا جاتا ہے۔ حالی کے عہد سے اردو غزل کے خلاف تنقید کا ایک طوفان اٹھا اور گو حالی کا مقصد صرف غزل کی اصلاح تھی لیکن شاعر اور نقاد یہ سمجھے کہ حالی نے دلِ زندہ کی کہانی جس دن ختم کی شب کے دلوں کی دھڑکنیں اس دن بند ہو گئیں، عشق اور محبت کے سوتے خشک ہو گئے، حسن اور جوانی ابدی نیند سے ہم کنار ہو گئے اور اس طرح غزل کا دور ختم ہو گیا۔ شاعر کا کام بیواؤں کی شادی کرانا، یتیم خانوں کے لیے چندہ جمع کرنا، کسی کانفرنس کے آغاز یا انجام پر امدادِ باہمی کا فرض ادا کرنا رہ گیا ہے۔ یہ سب نہایت مبارک افعال ہیں لیکن ان پر شاعری کی تہمت کیوں رکھیے۔ بہرحال حالی سے اقبال تک غزل پر ایک آزمائش کا دور گزر گیا لیکن اس میں بھی غزل کا شعلہ بالکل بجھا نظر نہیں آیا۔ لکھنؤ میں آخر آخر تک عزیز، رند اور رنگین سے لے کر باقی برِ عظیم میں حسرت، اصغر، فانی اور جگر نے غزل کو اپنے خون سے سینچا اور سنوارا۔

جیسا میں نے ابھی عرض کیا داخلیت اور رمزیت کو میں حیاتِ غزل سمجھتا ہوں اور غزل کی تاریخ بھی اسی کی تائید کرتی ہے۔ اردو غزل کے عہدِ زریں یعنی میر و مرزا کے دور کا جائزہ لیجیے۔ اس عہد کے خاص سیاسی، ذہنی اور معاشرتی حالات پیشِ نظر رکھیے۔ معاشرہ میں ایک بے چینی، ایک کرب، ایک اضطراب کی کیفیت نظر آتی ہے۔ سیاسی انقلاب اور درباری سازشوں اور معاشی بدحالی نے ایک بحران پیدا کر دیا تھا۔ اس میں بے اطمینانی سب سے نمایاں عنصر ہے۔ امرا کے دربار آئے دن بنتے بگڑتے رہتے تھے۔ دلی کے تخت پر نام نہاد بادشاہ کٹھ پتلیوں کی طرح چڑھتے اترتے، تجار اور پیشہ ور مفلسی اور ناداری کا شکار تھے تو پھر شاعروں کو کون پوچھتا، ان کی قدردانی رئیسوں کی مجلسوں اور مشاعروں کی محفلوں تک محدود تھی۔ یہ نظام درہم برہم ہوا تو یہ بھی بے سر و ساماں ہو گئے۔ قدرتی طور پر یہ ایک شدید قسم کے داخلی ردِ عمل کا شکار ہو گئے اور یہ شدت غزل کے ان بے شمار مضامین سے پائی جاتی ہے جو میر کی کلیات میں موجود ہیں۔ تباہی و بربادی، غارت گری، قیامت، ہنگامۂ قیامت، خون، آگ، برق، طوفان، موج، گرداب کے سارے مضامین اسی داخلی کرب و بے چینی کی تفصیل بیان کرتے ہیں جو شاعروں کی رگ و پے میں سما رہی تھی۔

اور اس کے بعد غزل کا ایک اور دور ہمارے سامنے آتا ہے۔ ناسخ اور آتش کے زمانے کی لکھنوی غزل جو اپنے انداز اور آہنگ میں میر کی غزلوں سے بالکل مختلف ہے۔ ان غزلوں کو بعض ناقدوں نے قصیدہ طور کہا ہے۔ بعض کو شبہ ہے کہ انھیں غزل کہنا بھی چاہیے یا نہیں کیونکہ ان میں محبوب کی وصف نگاری کے علاوہ اور کچھ نہیں ملتا۔ بہرحال ناسخ، آتش اور ان کے بے شمار شاگردوں نے اصلاحِ زبان کے لیے جو کوششیں کی ہیں، ان کا پورا احترام کرتے ہوئے یہ تسلیم کرنے میں کسی کو تامل نہیں کہ شاعری اگر شدتِ جذبات کے اظہار کا وسیلہ ہے تو ان حضرات کی شاعری کسی قسم کے جذبے سے یکسر محروم ہے۔ اگر اس زوال کے اسباب کا جائزہ لیا جائے تو ذہن فوراً اس پُرتکلف معاشرہ کی طرف منتقل ہوتا ہے جو لکھنویت کا دوسرا نام ہے اور جو غزل کے علاوہ بھی رفتار و گفتار، دستار اور کردار میں ہر جگہ نمایاں ہے۔ یہاں تکلف، احتیاط، رکھ رکھاؤ کا تقاضا جذبات کی شدت پر قابو پا لیتے ہیں اور جذبات [illegible]

راستوں اور وسیلوں کو تلاش کرتے ہیں جو اس خاص معاشرے نے ان کے لیے مقرر یا مستحسن قرار دیے ہیں۔ پھر یہ دور بھی ختم ہوتا
۔ مومن، غالب، امیر و داغ کی غزلیں دیکھیے۔ غزل اپنے اصلی رجحان کی طرف رجعت کرتی ہے۔ میر کی شاعری کا اعتراف کیا جاتا
، دہلی شاعروں کا تو ذکر ہی کیا۔ میر کی روایت دلی کی روایت تھی۔ لکھنؤ میں عزیز اور ثاقب، میر کی عظمت کے سامنے سر جھکاتے
اور اس کا نتیجہ یہی ہوا کہ غزل پھر اپنے اصلی رنگ پر آگئی۔ حسرت، اصغر، فانی اور جگر اس نشاۃ ثانیہ میں غزل کے استاد اور امام
ے لیکن اس نشاۃ الثانیہ کا شباب ۱۹۴۷ء سے پہلے نظر نہیں آتا۔ اس سال جو سیاسی انقلاب ہوا اس نے معاشرہ کو کئی
۔ نیا دستور اور ایک نیا انداز فکر بخشا، پاکستان و ہندوستان کو بڑی امیدوں اور بڑی جد و جہد سے آزادی نصیب ہوئی۔ وہ آزادی
ں سے بہت سی امیدیں وابستہ تھیں، بہت سی آرزوئیں تھیں جن کی شادابی اس آزادی پر منحصر تھی لیکن بہت سی توقعات پوری نہیں
ہیں، بہت سی امیدیں ہنوز تشنۂ تکمیل ہیں۔ پھر فرقہ وارانہ فسادات اور بڑے پیمانے پر آبادی کا نقل مکان ایسے سانحات ہیں جن سے
یر جذباتی رد عمل پیدا ہونا ناگزیر تھا۔ عورتوں کی عصمت دری، بچوں کا ہولناک قتل، بوڑھوں کی بے کسی اور بے بسی کی موت، بھرے گھروں
ا اجڑنا اور لہلہاتے کھیتوں کا چھوٹنا ایسے سانحات ہیں جو آسانی سے بھلائے نہیں جا سکتے اور ابھی اس طوفان کو گزرے اتنی مدت
ذری ہے کہ آج بھی اس کے نقوش نظر آتے ہیں۔ وہ شدت اور ہیجان جو جذبات میں پیدا ہوا ہنوز باقی ہے اور اسی نے غزل
و ایک نئی توانائی بخشی ہے۔

غزل کا دوسرا پہلو اس کی رمزیت ہے۔ اس کا ایک سبب جملہ فنون لطیفہ کی لطافت پسندی یا استعارہ پسندی ہے۔
ہلکے ہلکے نقوش، دور سے آنے والی مدھم اور مبہم صدائیں ہمیشہ زیادہ کشش رکھتی ہیں۔ شاعری میں یہ پردہ جان لطافت ہے اور جذبات
جب انتہائی شدید اور فاتی قسم کے ہوں تو اس پردہ داری کی اور بھی ضرورت پیش آتی ہے۔ ایک ایسی سوسائٹی میں جہاں سوائے میاں بیوی
کے ایک مرد اور ایک عورت کا عشق سماج کی نظر میں نہایت قبیح فعل ہو لیکن جہاں دھڑکنے والے دل اور سوز دروں موجود ہو، عشق و عاشقی
کا اظہار پردے ہی میں ہو سکتا ہے۔ اس پردہ داری کی مجبوری اتنی بڑھی ہے کہ بعض عاشقوں نے جو عورتوں سے عشق کرتے تھے ہر
امردوں کو اپنا محبوب بنایا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ بعض غزل گو شعراء نے امرد پرستی بھی کی ہو لیکن اس کا بنیادی سبب صرف یہی ہو سکتا ہے
کہ جنسی تسکین کے صحت مند ذرائع مسدود ہونے کے باعث جنسی جذبے نے یہ بے راہ روی اختیار کی ہو۔

اس مسئلے سے ہٹ کر غزل کی اشاریت اور رمزیت دیکھیے۔ میر کا زمانہ سیاسی، سماجی اور ذہنی انتشار کا تھا لیکن وہ انگریز
کا بھی تھا۔ شخصی آزادی کا تصور، یا تحریر و تقریر کی آزادی کے حقوق کے نعرے اس وقت تک بلند نہیں ہوئے تھے، پاسبان کا ڈر اور
محتسب کا کھٹکا ہر وقت لگا رہتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اس عہد کی غزل میں جگہ جگہ کچھ گھٹن سی محسوس ہوتی ہے اور بار بار قفس، صیاد،
دام، زنجیر، حلقۂ زنجیر، زندان یوسف اور اسی قسم کے مضامین آتے ہیں۔
اسی زمانے میں دلی پامال ہوئی اور نادری غارت گری نے دلی کا سہاگ لٹا دیا، اس دلی کی ویرانی پر ہزاروں شاعروں
نے نوحہ کیا ہے۔ اس نوحے میں بھی خزاں، صرصر اور اسی قسم کے بہت سے اشارے پائے جاتے ہیں۔ پھر دلی کی تباہی کے بعد
ارباب علم و فضل لکھنؤ اور دوسرے مقامات کا رخ کرتے ہیں۔ وطن چھوٹتا ہے، نیا وطن قفس معلوم ہوتا ہے۔ بھانت بھانت کے
پنچھی دگر ملک کے شہر میں جمع ہوتے ہیں۔ سب اپنی اپنی بولیاں بولتے ہیں۔ سننے والا سنتا ہے اور اس کا دم گھٹتا ہے لیکن مجبور ہے کچھ نہیں کر سکتا اور

کچھ نہیں کر سکتا۔ یہاں بھی یہ رمزیت ہی اس کا سہارا بنتی ہے۔

اور آج ہم پھر اسی قسم کے حالات اور واقعات سے گزر رہے ہیں۔ سیاسی انقلاب کے بعد حالات اور واقعات ابھی مکمل پر نہیں آسکے۔ فضا میں ٹھہراؤ پیدا نہیں ہوا۔ یقین اور گمان میں کشمکش ہے، پرانی قدروں اور نئے تقاضوں میں تصادم ہے۔ نئے نئے عناصر کی ترکیب سے ایک نیا تصور تشکیل پا رہا ہے۔ بعض لوگ بہت مایوس ہیں اور بعض ابھی تک بہتری کی امید میں زندہ ہیں۔ اس تمام صورتِ حالات نے جو جذباتی ردِ عمل کیا ہے وہ پھر غزل میں ظاہر ہو رہا ہے۔ آج جب میں ایسی غزلیں پڑھتا ہوں جو تپ کے صاف ہو کر لکھی گئی ہیں تو میں، پہلے سے زیادہ غزل کی ہمہ گیری، اس کی وسعت اور ابدیت محسوس کرتا ہوں۔

۱۳ و ۱۴ جنوری ۱۹۵۲ء

سید باقر حسین

پرانی اور فرسودہ غزل کا دور یقیناً ختم ہو چکا۔ اب گھسی پٹی معاملہ بندی اور سستی جذباتیت کو کوئی نہیں پوچھتا۔ ایسی غزل میں کسی ارتقاء کا سوال نہیں پیدا ہوتا۔

فرسودہ غزل گوئی کے بعد نظموں کا دور آیا۔ ہزاروں نظمیں کہی گئیں اور خوب خوب لکھی گئیں۔ نظموں کی مقبولیت کو دیکھتے ہوئے کیسے خیال آسکتا تھا کہ غزل دوبارہ زندہ ہوگی لیکن ہم آپ سب دیکھ رہے ہیں کہ غزل ایک حسن و رعنائی کے ساتھ جلوہ گر ہو رہی ہے۔

بات دراصل یہ ہے کہ زندگی کے ہر شعبے کی طرح شعر و ادب میں بھی عمل اور ردِ عمل کا اصول کار فرما ہے۔ لوگ جب ایک چیز سے سیر ہو جاتے ہیں تو دوسری چیز کے متلاشی ہوتے ہیں۔ نظموں کا دور پرانی غزل گوئی کے خلاف ردِ عمل تھا اور اب جدید غزل نظموں کے سیلاب کے خلاف ردِ عمل ہے۔ بہت لوگ ہیں جو غزل اور نظم کی خوبیوں کو پرکھنے کے بعد کوئی متوازن رائے قائم کرتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ غزل اور نظم محض صوری حیثیت سے مختلف نہیں ہیں بلکہ ان کے موضوع، ان کے کیف و کم اور ان کی اثر آفرینی میں اختلاف موجود ہے۔ اپنے اپنے مقام پر دونوں ضروری ہیں۔ بعض خیالات کے اظہار کے لیے نظم کا سانچہ ٹھیک ہے اور بعض کے لیے غزل کا۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ہم دونوں کی جدا جدا نوعیتوں کو ملحوظ رکھیں۔ اگر ہمارا یہ رویہ ہو تو ہم نہ غزل سے سیر ہوں گے اور نہ نظم سے۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ غزل کی مقبولیت کا جدید دور کہاں تک باقی رہنے والا ہے اور آیا اس صنفِ کلام میں مزید ترقی کی گنجائش ہے یا نہیں۔ میرا خیال یہ ہے کہ اگر ہم غزل کی خصوصیتوں کا مختصر جائزہ لیں تو خود بخود معلوم ہو جائے گا کہ غزل کہاں تک بقا اور ارتقا کی صلاحیت رکھتی ہے۔ میرے نزدیک غزل کی خصوصیتیں چار ہیں:-

۱۔ تغزل
۲۔ صوت و آہنگ
۳۔ ایمائیت اور رمزیت
۴۔ اختصار اور جامعیت

تغزل کی صحیح تعریف تو میں جانتا نہیں البتہ میرے نزدیک غزل کی مخصوص زبان اور لب و لہجہ کو تغزل کہتے ہیں الفاظ اور ترکیبوں کی خوبصورتی، سبک اور مانوس ہونا تغزل میں شامل ہے۔ غزل کی یہ خصوصیت جذباتی شاعری کی جان ہے اور غزل تو ہے ہی جذباتی شاعری۔ یہ نہیں کہ غزل میں سنجیدگی کا سامان نہیں ہوتا یا نہیں ہو سکتا۔ کہنا صرف یہ ہے کہ غزل کا مضمون خواہ کچھ ہو اس کا حل دماغ کی بجائے دل سے ہوتی ہے۔ عام انسانی نفس میں جذبات کا تناسب ذہن کے مقابلے میں زیادہ ہوتا ہے اس لیے جب تک انسان اپنے جذبات کے اظہار کے لیے کسی ذریعہ کا محتاج رہے گا اس وقت تک اسے تغزل کی ضرورت رہے گی۔ دوسرے لفظوں میں جہاں جذبات ہوں گے وہاں تغزل بھی ہوگا۔ خواہ وہ ہماری غزل کی صورت میں ہو یا انگریزی کی سانیٹ کی شکل میں، اس لحاظ سے تغزل غزل کے ارتقا کا ضامن ہے۔

غزل کے صوت و آہنگ کا دارومدار اس کے وزن، بحر، قافیہ، ردیف اور مترنم الفاظ کے استعمال پر ہوتا ہے۔ یہ چیزیں کم و بیش ہر صنفِ سخن میں ہوتی ہیں لیکن غزل اور دیگر اصنافِ سخن کے صوت و آہنگ میں فرق یہ ہے کہ غزل میں مترنم الفاظ کے استعمال کی گنجائش زیادہ ہوتی ہے، برخلاف بیانیہ نظموں کے کہ جن میں رزم و بزم کی مختلف صورتیں زیادہ متنوع الفاظ کے استعمال کی متقاضی ہوتی ہیں۔ غزل کی اس خصوصیت سے بھی اس کی ارتقائی صلاحیتوں پر روشنی پڑتی ہے۔ صوت و آہنگ کے مناسب استعمال سے جذبات کے تاروں کو خفیف سے خفیف ارتعاش بھی غزل کے اشعار میں "ریکارڈ" کیا جا سکتا ہے۔ ہمارے جذبات کا تنوع اور ان کا کیف و کم ایسے ساز کا محتاج ہے جس کے پردوں میں ہر لفظ کی تخلیق ہو سکے۔ ایسا ساز غزل کے سوا کسی اور صنفِ کلام میں نہیں مل سکتا۔ جب تک جذبات کی نزاکت کا احترام ہے اس وقت تک غزل کی ضرورت بھی باقی رہے گی۔ تمدن کی ترقی کے ساتھ جذبات کی سادگی کم ہوتی جا رہی ہے اور ان میں پیچیدگی اور گہرائی پیدا ہوتی جا رہی ہے۔ غزل کے صوت و آہنگ کی خصوصیت ان تغیرات کا ساتھ بخوبی دے سکتی ہے لہٰذا اس کے ارتقا کی ایک صورت یوں بھی نظر آتی ہے۔

غزل کی سب سے اہم خصوصیت اس کی ایمائیت اور رمزیت ہے۔ یہ خصوصیت چند مخصوص علامات کے استعمال سے پیدا ہوتی ہے۔ یہ علامات وہی ہیں جو سطح بیں لوگوں کے نزدیک غزل کی فرسودگی کا باعث ہیں یعنی گل و بلبل، قفس و آشیانہ وغیرہ لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان علامتوں کے لفظی معنی سے لپٹا رہنا بد مذاقی ہے۔ جدید غزل میں ان علامتوں کو نئے نئے معنوں میں استعمال کیا جا رہا ہے اور یہی بات تو یہ ہے کہ علامت کو اگر محض علامت سمجھا جائے تو غزل کے وہ اشعار جن میں ایمائیت اور رمزیت ہے بے اندازہ پرمعنی ہو جاتے ہیں۔ ایسے اشعار کو فن کی مناسبت سے نئے نئے معنوں میں استعمال کیا جا سکتا ہے۔ لطف یہ ہے کہ ہر بامحل استعمال پر ایسا محسوس ہوتا ہے گویا یہ شعر خاص اسی موقع کے لیے کہا گیا تھا۔ غزل کے اشعار کی یہ خصوصیت بالخصوص موجودہ سیاسی اور سماجی مسائل کی ترجمانی کے لیے نہایت موزوں اور کارآمد ثابت ہوتی ہے۔ ذیل کے شعر میں جشنِ نوبہار اور بجلیٔ بہار کا ذکر ہے لیکن دیکھیے کہ علامات کے استعمال نے اسے سیاسی شعور کا کس قدر کامیاب نمونہ بنا دیا ہے ؎

کچھ اس طرح سے بہار آئی ہے کہ بجھنے لگے ہوائے لالہ و گل سے چراغِ دیدہ و دل

غزل کے ارتقا کے لیے اس کی محض یہ خصوصیت کافی ہے۔ غزل کی چوتھی خصوصیت اس کے اشعار کا اختصار اور

جامعیت ہے۔ غزل کے اشعار میں تفصیل و تشریح کی گنجائش نہیں ہوتی۔ کہانی کا تجربہ ہوتا ہے کہانی نہیں ہوتی۔ تجربے کا نچوڑ ہوتا ہے، خود تجربہ نہیں ہوتا۔ تاریخ کا ماحصل ہوتا ہے تاریخ نہیں ہوتی۔ آہ ہوتی ہے داستانِ غم نہیں ہوتی۔ غزل کے شعر میں قرنوں کے ہونے کی داستان صرف ایک مصرعے میں بتائی جاتی ہے ؎ شمشیر و سناں اول طاؤس و رباب آخر

انگریزی میں اگرچہ غزل نہیں ہوتی لیکن بعض اشعار میں تغزل ضرور ہوتا ہے۔ ملاحظہ ہو:۔

OUR SWEETEST SONGS ARE THOSE WHICH TELL OF SADDEST THOUGHT

یعنی ؎ ہمارے وہی نغمے ہیں سب سے شیریں ــــ ہے جن میں بیاں سوزشِ اہلِ دل کا

غزل کی یہ خصوصیت بھی اس امر کی شاہد ہے کہ اس میں ارتقا کی بے شمار صلاحیتیں موجود ہیں۔ انسانی تجربوں اور نصیحات کے بیان میں آفاقیت، تجرید اور ضرب المثل کیفیت پیدا کرنا صرف غزل کی تکنیک ہی سے ممکن ہے۔ میرے خیال میں ایسی تکنیک کی ضرورت ہمیشہ رہے گی بلکہ موجودہ زمانے کی عدیم الفرصتی اس بات کی متقاضی ہے کہ یہ تکنیک دنیا کی دیگر ترقی یافتہ زبانوں میں بھی اختیار کر لی جائے۔ اگر ہماری غزلوں کے کامیاب تجربے غیر زبانوں میں ہونے لگیں تو عجب نہیں کہ دوسری زبانوں میں بھی غزل گوئی ہونے لگے۔

(ماہِ نو، فروری ۱۹۵۳ء)

فیض احمد فیض

تو اور آرائشِ خمِ کاکل ـــــ میں اور اندیشہ ہائے دور و دراز

یوں تو اس شعر میں کئی منطقی رعایتیں موجود ہیں جنہیں روایتی غزل سے منسوب کیا جاتا ہے لیکن شعر کی خوبی کا انحصار ان لفظی رعایتوں پر بہت کم ہے۔ اس کا انحصار اس دھندلی سی جذباتی فضا پر ہے جو الفاظ کے اصوات و معانی مل کر پیدا کرتے ہیں۔ اس فضا میں تصورات کے کئی ٹکڑے لہریں لیتے ہوئے ادھر سے ادھر نکل جاتے ہیں اور ہاتھ نہیں آتے۔ کئی خاکے، کئی نقشے کئی رنگ، چہرے، دھبے نظر کے سامنے ابھرتے ہیں اور مکمل ہونے سے پہلے محو ہو جاتے ہیں۔ ایک طرف الفاظ کی تکمیل، تراش اور نکھار ہے اور دوسری جانب معانی کی وسیع اشاریت۔ یوں تو یہ امتزاج ہر اچھے کلام میں لازمی ہے لیکن غزل کا اختصار اور جامعیت اس کی خاص طور سے متقاضی ہے۔ ہر چند سعدی سے حسرت موہانی تک ہر بڑے غزل گو کا اپنا اپنا رنگ، اپنے اپنے مضامین اپنا اپنا طریقِ اظہار ہے لیکن اس ذاتی طرز کے باوجود بڑا عظیم یہ نیم محسوس غنائیت ان سب کے کلام کا خاصہ ہے اور اسی غنائیت کو ہم نے غزل کے مزاج سے منسوب کر دیا ہے۔

(سرِ آغاز، نیم کاکل)

سردار جعفری

"بعض ترقی پسندوں نے غزل کے غیر جمہوری تاریک، اندیشہ فراری، گھسے پٹے اور سوقیانہ مضامین کی مخالفت کے بجائے غزل کی صنف ہی کو غیر جمہوری اور بے کار قرار دے دیا۔ اس رجحان کی امامت شاعرِ انقلاب جوش ملیح آبادی نے کی

خود حالی کی طرح جتنا اچھی غزلیں کہہ چکے تھے اور غزل کی بہترین روایات کو اپنی شاعری میں سمو چکے تھے۔ حضرت جگر مرادآبادی نے جب ۱۹۳۹ء یا ۱۹۴۰ء میں اپنی ایک غزل میں ترقی پسندوں کے خلوص اور نیت پر حملہ کیا اور انھیں قوم و وطن کا بت پرست قرار دیا اور اس کے بعد مرزا یگانہ چنگیزی نے غزل کے سوا کسی اور صنفِ سخن کو شاعری ماننے ہی سے انکار کر دیا اور ترقی پسند ادیبوں اور ادب کے لیے انتہائی غیر ادبی زبان استعمال کی تو غزل کی مخالفت کے رجحان نے اور زور پکڑ لیا لیکن اس سلسلے میں ترقی پسندوں نے مجموعی طور سے کوئی عملی فیصلہ نہیں کیا تھا۔ اسی طرح غزل کی مخالفت بھی ترقی پسند تحریک کا پروگرام نہیں بنی۔ غزل موضوعِ بحث رہی اور نیا ادب اور دوسرے ترقی پسند رسائل کے صفحات پر غزل کی مخالفت اور موافقت میں مضامین شائع ہوتے رہے۔ یہی وجہ ہے کہ غزل پر بحث بھی ہو رہی تھی اور ترقی پسند غزل کہی بھی جا رہی تھی اور یہ واقعہ ہے کہ اس زمانے میں بہترین غزلیں صرف جگر اور حسرت نے نہیں بلکہ ترقی پسند شاعروں نے بھی کہی ہیں جن میں فراق گورکھپوری، مجاز، فیض، جذبی، مجروح بہت سے نام گنائے جا سکتے ہیں۔ یہ بھی یاد رکھنے کی بات ہے کہ غزل کی مخالفت سب سے پہلے حالی نے شروع کی تھی۔ قطع نظر اس کے کہ حالی کا نظریہ کہاں تک صحیح یا غلط تھا، ترقی پسند ادب کے معترضین حالی کے لیے تاویلیں تلاش کر لیتے ہیں اور ترقی پسند ادب پر مہمل الزامات لگاتے ہیں ۔۔۔ ۔۔۔

ترقی پسند تحریک نے نظموں کے ساتھ ساتھ غزل پر بھی اثر ڈالا ہے۔ اب انفرادی جذبات اور مجرد تصورات کی جگہ اجتماعی جذبات اور سماجی احساسات آ رہے ہیں۔ سیاسی مسائل بھی غزل کے سانچے میں ڈھل رہے ہیں۔ ایک طرف تو روایتی تشبیہوں اور استعاروں کا نیا اور شگفتہ استعمال ہے اور دوسری طرف نئے الفاظ اور نئی ترکیبوں کی آمیزش ہے جو روزمرہ زندگی سے حاصل کی گئی۔ اس کوشش میں فراق گورکھپوری، فیض احمد فیض، جاں نثار اختر، جذبی، حفیظ ہوشیارپوری اور مجروح سلطانپوری ہی نہیں، جگر مرادآبادی بھی شریک ہیں۔"

(ترقی پسند ادب)

(۲)

شمس الدین ولی

"از کمالِ شہرت احتیاجِ تعریف ندارد۔"

(نکات الشعرا)

"جب کا یہ سلسلہ ریاست و دیوان دلپسند نکلے"

(گلشن گفتار)

عروج فرمودہ:

"از کلامش زور سخن نا بیدہ سے محرمت شنیدہ و ناوک اندیشہ اش بہدفِ معنی رسیدہ۔"

(تذکرہ گردیزی)

"در تعریفش احاطۂ تحریر و تقریر بیرون است بنائے ریختہ را چنین مستحکم نمود کہ کمال از بلندی طاقِ سپہر افزود۔"

(تذکرہ شعرائے اردو)

"در ریختہ نسبت بہ فصاحت و بلاغت می گفت کلا کمہ شاعرانِ آن وقت از راہ موزونی شعر ریختہ موزوں می نمودند۔"

(مخزن نکات)

"در شاعری اول قدر و محکی سنو شیریں گفتہ است۔

تربیت سخن ریختہ از زبانش بروجہ کمال رسیدہ۔"

(چمنستان شعرا)

"در شعرائے دکن بسیار ممتاز ست ولی کہ دیوانش در دکن مشہور و معروف گشتہ۔"

(گلزار ابراہیم)

"قطع نظر از زبانِ دکنی سوز و مزہ ء شاعری و کشش

بدرجۂ علیائے سخنوری است۔"

(مجموعہ نغز)

"اس کی انشا پردازی اور شاعری کی دلیل اس سے زیادہ کیا ہوگی کہ ایک زبان کو دوسری زبان سے ایسا بے معلوم پیوند لگایا ہے کہ آج تک زمانے نے کئی پلٹے کھائے ہیں مگر پیوند میں جنبش نہیں آتی۔"

(آبِ حیات)

"اس میں کچھ شبہ نہیں کہ ولی اپنے ہم عصر شاعروں میں سب سے زیادہ ممتاز ہے اور اس کے کلام کو قبولِ عام حاصل ہو جانا اس کی شاعری کا عمدہ اعتبار ہے۔"

(گلِ رعنا)

میر سراج الدین سراج دکنی

"... سخن او خالی از مزہ نیست۔"

(نکات الشعرا)

"... طبع روشنش شمع بزم سخن"

(تذکرہ گردیزی)

"... روشن طبع معروف می شود"

(تذکرۂ شعرائے ...)

"... اینچہ از سلیقہ شعر فہمی معلوم می شود بسیار ... صورت می زند"

(مخزن نکات)

"... ما در سخنش بوئے عشق و محبت استشمام می نماید۔"

(مجموعہ نغز)

"با مجموعہ غزلے کہ شعر مصارانِ ایران کردہ است شہرۂ ... شہرتِ تمام دارد۔"

(گلشن بے خار)

"سودا کے بعد دکن میں اس پائے کا کوئی شاعر نہیں ہوا۔"
(گلِ رعنا)

میاں نجم الدین شاہ مبارک آبرو

"......شاعر نادرہ گوئے ریختہ می گویند کہ طبع شوخ داشت خوش مسلکی۔ وقتِ خود بود......" (نکات الشعرا)

"......اشعارش در تمام ممالک محروسہ مشہور و معروف خصوص در دار الخلافہ شاہجہان آباد مسلّم شعرائے وقت است۔"
(گلشنِ گفتار)

"......حقا کہ معنی تلاشی را بر طاقِ بلند گذاشتہ و به استفادہ حکمت سخن رایت شاہی افراختہ......"
(تذکرۂ گردیزی)

"شاعرِ خوش گو در وقتِ خود بود۔"
(تذکرۂ شعرائے اردو)

"......بالجملہ شعر ریختہ بوضع خود بسیار مربوط می گفت......"
(مخزنِ نکات)

"......ترکیب میں بیشتر اشعار الفاظ سے ایہام کے کہتے ہیں یعنی اکثر وہ الفاظ شعر میں لاتے ہیں کہ جن کے دو معنی ہیں اگرچہ باہمی یا لاحقی......"
(گلشنِ ہند)

"......شعر را بطوری کہ در آن زمانہ معمول داشت بسیار بجا می گفتہ......"
(تذکرۂ ہندی)

"......در طرزِ گفتار حسبِ رواج آں وقت بیشتر بہ ایہام گوئی صرف ہمت می نمود......" (مجموعۂ نغز)

"......از زبان آوران طبقہ ۲ پیشین است بصنعت ایہام مائل بود......"
(گلشنِ بے خار)

"......بیشتر صنعتِ ایہام میں شعر کہتے تھے۔"
(طبقاتِ شعرا)

"یہ اپنے زمانہ میں مسلّم الثبوت شاعر زبانِ ریختہ کے اور صاحبِ ایجادِ نظمِ اردو کے شمار ہوتے تھے۔"
(آبِ حیات)

"طبیعت رسا اور فکر منزہ یاب تھی۔ اس زمانے کے دستور کے موافق تشبیہ اور ایہام میں کلام الجھا ہوا ہے مگر محاورہ کی چاشنی نے اس کو بامزا کر دیا ہے۔" (گلِ رعنا)

ظہور الدین شاہ حاتم

"......مرد یست عامل مخلص و متقی و منبع دیانت و آشنا خاندار و دریافتہ نمی شود کہ این رنگ سخن بسبب شاعری است کہ بجز من دیگری نیست یا وضع او ہمیں است۔ خوب است ما را با اینہا چہ کار۔ شعر بسیار دارد...... با من ہم آشنا است بیگانہ است۔"
(نکات الشعرا)

"......مرد صاحبِ ہمت و طبیعت عالی دارد و بخل مدد معاونی شعر ہرگز نہ کردہ و درین امر کرفی التحقیق محمد سعید بشابہ درست گوئی از حاتم بردہ مرغوبہ دارد......"
(گلشنِ گفتار)

"......طبع منیرش نقد و طلب سخن مانقاد۔"
(تذکرۂ گردیزی)

"......کلیاتش ضخیم است و ابیات دیوانش قریب چہار ہزار بیت از نظر گذشتہ بیشتر خوب جستہ جستہ می بر آید۔"
(مخزنِ نکات)

"......صاحبِ کمال و پسندیدہ افعال و عالی فطرت و بلند ہمت معاصر میاں آبرو، دو دیوان ترتیب دادہ یکے بزبانِ قدیم بطور ایہام و دوم بہ زبانِ حال الحالیہ، شہرۂ اشعارش بسیار است، اکثر غزل ہائے او را مغنیانِ ہندی می خوانند۔"
(تذکرۂ شعرائے اردو)

"...... شاعر خوش بیان تھا۔ صاحبِ دو دیوان تھا۔ ایک دیوان میں نہایت خوب ایہام کیا ہے اور دوسرا بطور متاخرین کے سرانجام کیا ہے۔ جامع ہے طرز متاخرین و متقدمین کا۔"
(گلشنِ ہند)

"............ نظر سنجانِ حال فرزین و شریف اور استاد مسلم الثبوت می دانند۔" (تذکرۂ ہندی)

"...... شاعر عجب با تمکین با طبیعت معنی ......"
(مجموعۂ نغز)

"......... در اوائل حال فکر ریختہ مقصور بر تتبع قدما مانند آں دیگراں بود، چوں طرز متاخرین از بس مروج گشت، دست ہمت بدامانِ ایشاں زدہ بنائے دیوانِ ثانی بریں طریقہ نہاد۔" (گلشنِ بے خار)

"...... اس سے ایک دیوان بہ طرز قدیم اور دوسرا بطرز سودا و ہمعصر دیوان زادہ یادگار ہے ......"
(مخزن شعراء)

"مضمون ان کے صاف عاشقانہ عارفانہ ہیں جیسے آپس کی باتیں اور زبان شستہ و رفتہ ہے۔" (آبِ حیات)

"شعر و سخن کا شوق شروع ہی سے تھا۔ مشقِ سخن کرتے کرتے استاد ہو گئے۔" (گلِ رعنا)

اشرف علی خاں فغاں

"بسیار جوان قابل و ہنگامہ آرا۔ شعر ریختہ را بہ خوبی می گوید۔" (نکات الشعراء)

"موضع ظرافت دارد۔ بمقتضائے ظرافت و حالی با ارباب سخن گرم می جوشد و مرہم اختلاط مبذول می نماید۔"
(تذکرۂ گردیزی)

"خان ظریف طبع و خوش اختلاط بود با ہر کس خوش طبعی داشت۔ شاعر ریختہ خوش طلاقت و ظرافت خوش داشت۔"
(تذکرۂ شعرائے اردو)

"سلیقۂ سخن نیز درست داشت۔" (مخزن نکات)

"نظم ریختہ میں طبیعت اس کی رسا ہے۔"
(گلشنِ ہند)

"شعر را بہ صفائی تمام می گوید۔" (تذکرۂ ہندی)

"شعرش پختگی تمام دارد۔" (مجموعۂ نغز)

"اگرچہ فغاں کی زبان بھی زمانے کی زبان ہے لیکن اس کے اعتبار سے نہایت با اصول اور برجستہ ہے اور الفاظ کی بندش ان کی مشقِ سخن کی گواہی دیتی ہے۔" (آبِ حیات)

"فغاں شعر و سخن ہی میں ماہر نہ تھے بلکہ بذلہ سنجی اور لطیفہ گوئی میں یکتائے زمانہ تھے۔" (گلِ رعنا)

میر تقی میر

"فقیر میر اشعارش نمودہ چشمے آب دار حقائق و دقائق تلاش سخن بیگانہ کردہ است و حرف آشنا بر صفحۂ کار آوردہ۔"
(تذکرۂ گردیزی)

"از استادان صاحب قدرت است۔ طرزش مائل بطرز عاشقانہ۔" (تذکرۂ شعرائے اردو)

"تازگیٔ مضامین اور معانی کا بیان ان کے ظاہر ہے۔ فی الحقیقت کہ شاعر مذکور ریختہ گویان سے ریختہ کی بحر کا ماہر ہے۔ میر کے شعر میں اور ریختہ گویان سابق و حال میں نسبت خورشید و ماہ کی ہے اور فرق سفید و سیاہ ہے بلکہ جواب اگر مانع نہ ہو تو تفاوت ہے زمین اور آسمان کا۔ اقسام نظم میں یہ صدر نشینی اس کا ہر قسم پسندیدۂ خاطر سخن فہم رکھتا ہے لیکن کا قد ہے کہ نظم غزل میں یہ ہی جیسا رکھتا ہے۔"
(گلشنِ ہند)

"استادِ فنِ ریختہ بود مسلّم است۔ بہر ریختہ گویانِ ہند
سازِ کلامش ہائی آئینہ دار ما درین فن مستفیدانند و الحق کہ چنین است۔"
(تذکرۂ ہندی)

"شاعرے ست بے نظیر و سخن سنجے است خوش تقریر"
"......میر اقلیمِ شیریں بیانی، دبیرِ قلمرو عذب البیانی، طرزِ گفتارش
بے بدل، انداز اشعارش ضرب المثل۔" (مجموعۂ نغز)

"در لا سیما در غزل سرائی و مثنوی گوئی گوئے سبقت می
ربایہ پست و بلند کردر کلامش بینی و رطب و یابس کہ در ابیاتش
بنگری منظر مکنی و از نظر ش بنگشی کہ گفتہ اند۔ فرد ؎
شعر گر اعجاز باشد بی بلند و پست نیست!
در ید بیضا ہمہ انگشت ہا یکدست نیست!"
(گلشنِ بے خار)

"میر صاحب کی زبان شستہ، کلام صاف، بیان
ایسا پاکیزہ جیسے باتیں کرتے ہیں۔ دل کے خیالات کو جو کہ سب
کی طبیعتوں کے مطابق ہیں، محاورہ کا رنگ دے کر باتوں باتوں
میں ادا کر دیتے ہیں اور زبان میں خدا نے ایسی تاثیر دی ہے کہ وہی
باتیں ایک مضمون ہو جاتی ہیں اس واسطے ان میں بہ نسبت اور شعرا
کے اصلیت کچھ زیادہ قائم رہتی ہے بلکہ اکثر جگہ یہی معلوم ہوتا ہے
گویا نیچر کی تصویر کھینچ رہے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ دلوں پر اثر بھی
زیادہ کرتی ہیں۔ وہ گویا اُردو کے سعدی ہیں۔"
(آبِ حیات)

"میر صاحب غزل کے بادشاہ ہیں۔"
(گل رعنا)

مرزا محمد رفیع سودا

"مرد سودا مزاج و کرم خو...... غزل و قصیدہ و
مثنوی و قطعہ و مخمس و رباعی ہمہ را خوب می گوید سرآمد شعرائے ہندی
اوست۔ بسیار خوش گو است، ہر شعرش طرف لطف پسند رستہ،
در چمن بندیٔ الفاظش گل معنی دستہ دستہ۔ ہر مصرعِ برجستہ اش را
سرو آزاد بندہ، پیش فکرِ عالیش طبع عالی شرمندہ، شاعرِ ریختہ چنانچہ
ملک الشعرائی ریختہ او را شاید۔" (نکات الشعراء)

"حقا کہ رتبۂ شعرش عالی است و سخن دردمندانہ اش
عالی۔ امروز در میدان گفت و گوئے سبقت از اقران و امثال خود
می رباید و داد معنی و رنگینیِ خیالی می دہد۔" (تذکرۂ گردیزی)

"زندگیِ سخن وابستۂ ذات اوست۔"
(تذکرۂ شعرائے اُردو)

"در ریختہ نزہت گاہ معنی بر روئے وے کشادہ است
کہ در مدح ملک طرازش شہرت را آمادۂ اشعار رنگین و قصائد متین
دارد۔" (مخزن نکات)

"نظم ریختہ کہ طبع معنی آفرین پر اس کے ختم ہو گئی۔"
(گلشنِ ہند)

"در روانیِ طبع نظیر خود نداشت۔ اگر در مثال بنگاہ
اشعارِ غزل صائب قتیلش گویم بجا است و اگر در علو مراتب معانیٔ
ابیات قصیدہ خاقانی گویم روا۔ در نقاش اول نظم قصیدہ در زبان ریختہ
اوست۔" (تذکرۂ ہندی)

"شعر ترو بلی شعارش کیفیتے دارد کہ سامع نکتہ پرداز صاحب
فراست داند طرز کلام صحت انتظامش حلاوتے دارد کہ ذائقہ طبع
سخن سنج صاحبِ گفتار شناسد۔" (مجموعۂ نغز)

"بین الانام شہرت پیدا است کہ قصیدہ اش بہ از
غزل است حرف بیست عمل۔ بزعم فقیر غزلش بہ از قصیدہ است و
قصیدہ اش بہ از غزل۔" (گلشنِ بے خار)

"ریختہ... وقت کی زبان سے قطع نظر کر کے
باضابطہ ہر کلام سرتا پا فصیح ہے۔ بہت سی غزلیں ایسی بندشیں
بحروں میں ہیں کہ اس وقت تک اردو میں نہیں آئی تھیں۔ زمینیں

سنگلاخ ہیں اور ردیف قافیے بہت مشکل، مگر جس پہلو سے انھیں جما دیا ہے ایسے جمے ہیں کہ دوسرے پہلو سے کوئی بٹھائے تو معلوم ہو۔"

(آبِ حیات)

"طبیعت شعر و سخن کے مناسب تھی۔ کثرتِ مشق نے اس میں جلا دے دی تھی۔ استاد کی زندگی ہی میں ان کی استادی کو خاص و عام نے تسلیم کیا تھا اور ان کی غزلیں گھر گھر ہر ایک کی زبان پر چڑھ گئیں۔"

(گلِ رعنا)

خواجہ میر درد

"از شعرائے ممتاز زمانہ است و در سخن گوئی یگانہ بے اغراق جمیع بلندش رسا است و فکر دل پسندش عالا۔"

(تذکرۂ گردیزی)

"دیوانش اگرچہ مختصر است لیکن چوں کلام حافظ سراپا انتخاب۔"

(تذکرۂ شعرائے اُردو)

"ابیاتِ دیوانش قریب ہفت صد شعر از نظر گذشتہ ہمہ لب لباب و تمامی انتخاب است۔" (مخزن نکات)

"اگرچہ دیوان ان کا بہت مختصر ہے لیکن سراپا درد عاشقی ہے۔"

(گلشنِ ہند)

"شعر ہندیش از بس شہرت تام مشہور ہر دیار۔"

(تذکرۂ ہندی)

"دیوانے مختصر بہ مثابۂ چشمۂ آبِ حیات در ریختہ از طبع وقاد ایشاں ریختہ۔ در بحر سخن بدرجۂ علیا فصاحت و مرتبۂ اقصیٰ بلاغت است و از ہمہ شاعراں کہ ایں مرتبہ آں مسکین پیمانہ گشتہ است۔"

(مجموعۂ نغز)

"فکرش صحیح و طبعش فصیح گفتارش از رکاکت منزہ و پاک و در جنب گلہائے خیالش گلہائے چمن ہم از خس و خاشاک دیوانش از نظر گذشت۔ از اشعار پر کہ خالی است و اکثر ابیات

با معانی و مضامین دلکش و عالی۔" (گلشنِ بے خار)

"خواجہ میر تقی صاحب کی غزل سات شعر، نو شعر کی ہوتی ہے مگر انتخاب ہوتی ہے۔ خصوصاً چھوٹی چھوٹی بحروں میں جو اکثر غزلیں کہتے تھے گویا تلواروں کی آبداری نشتروں میں بھر دیتے تھے۔ خیالات ان کے سنجیدہ اور متین تھے۔ کسی کی ہجو سے زبان آلودہ نہیں ہوئی۔ تصوف جیسا انھوں نے کہا، اُردو میں آج تک کسی سے نہیں ہوا۔"

(آبِ حیات)

"قصیدہ کی طرف مائل نہیں ہوئے۔ اس لیے کہ جس مرتبہ کے وہ آدمی تھے اس کو مدح سے کیا نسبت۔ غزل کا دیوان بقول میر حسن کے مثل دیوانِ حافظ کے سراپا انتخاب ہے۔ تصوف اور اخلاق کی چاشنی کے اعتبار سے ان کا کلام میر تقی میر کے کلام سے زیادہ دلآویز ہے۔"

(گلِ رعنا)

مظہر جانِ جاناں

"دیوانِ مختصر شعر فارسی او بہ لفظ فقیر قبول آمدہ است از سلیم و کلیم پایۂ کم ندارد۔ اگرچہ شعر گفتن دون مرتبہ است لیکن گاہے توجہ بایں فن بے حاصل نیز می شود۔"

(نکات الشعراء)

"اشعار فارسی و ہندی او از جواہر ہندوستان تا ترکی زبان زد عالم و اظہر من الشمس است۔"

(گلشنِ گفتار)

"شعر فارسی اش بنہایت لطافت و نظم ریختہ اش نہایت خوب است۔"

(تذکرۂ گردیزی)

"میرزا جامع فقر و فضیلت و سخن گستر است۔"

(چمنستانِ شعرا)

"مشہور مخدوم میں ہیں، ان کے نظم و نثر ریختہ میں نہایت خوش بیان اور انداز گفتگو میں نامور تھے۔"

(گلشنِ ہند)

"در معنی ایہام گویان ماقبل کسے کہ شعر ریختہ بہ تتبع فارسی
(تذکرۂ ہندی)
باوست۔"

"مختصر کلام ملائم و سوز تصنیفش پایانے ندارد۔"
(مجموعۂ نغز)

"مگر سخن فارسی بسیار می کرد و ہر چند اہل سخن را در بنا
ال حرف است اما اکثر بعض خیالات بنا بہت پسندیدہ و
رب و مقبول دارد۔ وقتی ابیات ریختہ بسیار گفت۔"
(گلشن بے خار)

"زبان کی اصلاح اور انداز سخن اور طرز کے ایجاد
انہیں ویسا ہی حق ہے جیسا کہ سودا اور میر کو۔"
(آب حیات)

"شعر و سخن سے ان کو خداداد مناسبت تھی۔ اردو
بلا بار دیوان نہیں، غزلیں اور اشعار ہیں۔ جو سودا اور میر کی زبان
ہے وہی ان کی ہے۔"
(گل رعنا)

سید محمد میر سوز

"در عہد خود از جملہ اہل بندش ممتاز۔"
(تذکرۂ شعرائے اردو)

"سید عالی نسب اور خوش گفتاری میں استاد فرزند اوجی
کے بار شاہ اور صورت مضمون ہمدوہ آہ تھے۔ کلام ان کا سرے
پاؤں تک سوز و ساز ہے اور سراپا سوز سے ہر یک انداز۔"
(گلشن ہندی)

"بطرز خود استاد است۔" (تذکرۂ ہند)

"در ریختہ گوئی طرز خاص دارد و تتبع طرز گفتارش
اکثرے از مشتاقان این فن نمایند و اکثر کے نحو بہ اندازہ
رسانیدہ۔"
(مجموعۂ نغز)

"کلام خوش با جادۂ مستقیم گراں۔" (گلشن بے خار)

"میر سوز مرحوم کی زبان عجب میٹھی زبان ہے لطف حقیقت
میں غزل کی جان ہے۔ چنانچہ غزلیں خود ہی کہے دیتی ہیں۔ ان کی
انشا پردازی کا حسن تکلف اور صنائع مصنوعی سے بالکل پاک
ہے۔ اس خوش نمائی کی ایسی مثال ہے جیسے ایک گلاب کا پھول
ہری بھری ٹہنی پر کھلا سا دھرا ہے اور سبز سبز پتیوں میں اپنا اصلی
دکھا رہا ہے۔ جن اہل نظر کو خدا نے نظر باز آنکھیں دی ہیں، وہ
جانتے ہیں کہ ایک ٹہنی خداداد کے سامنے ہزاروں بناوٹ
کے بناؤ سنگار قربان ہوا کرتے ہیں۔ البتہ غزل میں دو تین شعر
کے بعد ایک آدھ پھیکا لفظ ضرور کھٹک جاتا ہے۔"
(آب حیات)

شیخ قیام الدین قائم

"شعرش پسندیدہ است و فکرش سنجیدہ۔"
(تذکرۂ گردیزی)

"...... طرزش بطرز طالب آملی می ماند۔"
(تذکرۂ شعرائے اردو)

"نظم ریختہ میں استاد مسلم الثبوت تھے۔ سلیقہ
طبع بلند اور ذہن رسا کے موصوف، مضمون تراشی اور معنی بندی
میں معروف۔ حق تو یہ ہے کہ بجز سودا اور میر کے کسی ریختہ گو
کی نظم کا یہ اسلوب نہیں ہے۔" (گلشن ہند)

"در ہر قسم کلام وحشی مثل غزل و قصیدہ و
مثنوی وغیرہ موافق محاورہ زمانہ و ثبوت استادی میرسد
بلکہ در بعض مقام غلبہ می جوید۔"

(تذکرۂ ہندی)

"شاعرے بود فصیح زبان شیریں بیان فصاحت آگین
بلاغت آگین صاحب گفتار استوار، مالک اشعار آبدار
عندلیب خوش نوا بوستان۔" (مجموعۂ نغز)

"شاعریست خوش گفتار چند بیت موزونش عالی افتادہ نظر آمد۔"
(گلشن بے خار)

"ان کے انداز ادا کو دیکھ کر سودا کے کلام کا دھوکا ہوتا ہے۔"
(گل رعنا)

انعام اللہ یقین

"نہ تنہا شعر فہمی مطلق ندارد و شاید از ہیچ ماہر ہم گمان ناموزونیت در حق او داشتہ باشند چہ بسا ایں اتفاق ماند کہ شعرش او خالی از نقص نیست۔"
(نکات الشعراء)

"شاعر متین است۔"
(گلشن گفتار)

"شہباز خیالش بہ سپہر معنی بلند پرواز است و ہمائے اندیشہ اش بر قلہ قاف سخن پرفشانی می نماید سبب طرز ریختہ گوئی را بر طاق بلند گذاشتہ دیگر معنی در نظم نیز کم گذاشتہ۔"
(تذکرہ گردیزی)

"...... اشعارش بسیار نمکین و بر شاہد سخن او خالی از دردمندی نیست۔"
(تذکرۂ شعرائے اردو)

"شاعر صاحب طرز یگانہ عرصہ عہد و بہار است۔ بہ اخلاق حمیدہ انصاف مانند و مصرع از زبان اسے سحر طرازش با ایں ہمہ لطف و غزل می تراود کہ مجرد استماع دل عشاق قطرات خون شدہ از دیدہ فرو می چکد۔"
(مخزن نکات)

"بالحاصل یقین یکتائے عصر و یگانۂ زمانہ است۔"
(چمنستان شعراء)

"در دورۂ ایہام گویان ایں کسے کہ ریختہ را شستہ و رفتہ گفتہ ایں جوان بود بعد ازاں تتبعش بدیگراں رسیدہ۔"
(تذکرہ ہندی)

"در فن نظم نکاتی مطلوب با او سلامتی سلیقہ ہست حلاوت دل خواہ دارد۔"
(گلشن بے خار)

"۲۵ برس کے سن میں یقین کا کام تمام ہو گیا اگر جیتے رہتے تو میر بھی یا مرزا کسی کا چراغ نہیں جل سکتا تھا۔"
(گل رعنا)

میر محمدی بیدار

"مصرع ریختہ درست موزوں میکند۔"
(نکات الشعراء)

"طبع دردمند داشت۔" (تذکرۂ شعرائے اردو)

"نزاکت سے معنی کے بخوبی آشنا اور زبان دان دلی سے ہمیشہ ہم نوا رہے ہیں۔"
(گلشن ہند)

"زبانش بسیار شستہ و رفتہ۔"
(تذکرہ ہندی)

"شعرش بسیار باکیفیت و پختگی و بہ نہایت حلاوت و دل بستگی است بندش الفاظ و استخوان بندی آں بحد جزا اعلیٰ دارد و با ایں ہمہ نزاکت معانی بر حد ملی نازک خیالاں نیچے مے سازد۔"
(مجموعۂ نغز)

"مدتہا بر سر مشق سخن بود و مہارتے شایاں بدست آوردہ۔"
(گلشن بے خار)

"بیدار میر درد کے ہم عصر تھے جب انھوں نے رعایت لفظی کے ناپسندیدہ رنگ کو ترک کیا تو بیدار نے بھی یہی کوشش کی اور صفائی کے ساتھ تصوف کا رنگ بقدر مناسب شامل کر کے اپنی طرز کلام کو خوش رنگ کر لیا۔ ان کے اشعار درد کے دیوان کے باعث اب تک لوگوں کی زبانوں پر چڑھے ہوئے ہیں۔"
(گل رعنا)

میر عبد الحی تاباں

"خوش فکر و خوب صورت خوش خلق پاکیزہ سیرت"

"ذوق عاشق مزاج کمال معتقد شعرا بود شاعر خوش طبع ظاہر اکثر
... ہمہ بر منظور جلوہ گستر شدہ بود۔ سنا ہے تحسینش پالفتہ اند
... دل گلستہ ... نازک دماغ بلبل بستہ رنگینی فکرش با
... بہار علاقہ انس با حق است۔" (نکات الشعراء)

"... خوب صورت و خوش ... شعر ...
... چراغ بزم ..." (تذکرۂ گردیزی)

"شاعر با مزاج رنگین طبع بود۔" (تذکرۂ شعرائے اردو)

"... بود در نہایت حسن و جمال ہم صحبت یاران ...
وجود ... عشق مجنون ... آداب صحبت آموختہ و باکمال انجمن آرائی
... دماغ بہ جگر سوختگی۔ اخلاق حمیدہ و اوصاف پسندیدہ داشت۔"

(مخزن نکات)

"متانت معنیش دل نازک خیالان را صید می نمود۔"

(چمنستان شعر)

"دیوان ریختہ اش مشہور است۔"

(تذکرۂ ہندی)

"با مجموعہ اشعار آبدارش بیشتر بر زبان خاص و عام
جاری است و خالی از کیفیت عشاقی و عاری از چاشنی درد یابی
نیست۔"

(مجموعۂ نغز)

"ان کے اصل حال سے زبان ان کی زیادہ آب
وشستہ و شفاف ہے۔" (آب حیات)

سید محمد میر اثر

"... است محقق و صاحب سخن است و نثر
عالم و فاضل، رتبۂ قصائدش نہایت بلند، گو ہر ... در شعر نہایت رتبہ ..."
(تذکرۂ شعرائے اردو)

"مشہور ... خاص ... اکثر برادر بزرگ می گزیند۔"
(تذکرۂ ہندی)

"دیوان قلیل الحجم او ملاحظہ شد بعض خیالات ایشاں
بتصرف غایت درد مندانہ و دل پذیر و مطبوع واقع شدہ۔"

(گلشن بے خار)

"تصوف و شاعری میں جو رنگ بڑے بھائی کا ہے
وہی ان کا بھی ہے۔" (گل رعنا)

رنگین

"خیالش بسیار خوش فکر بہ ہر چند چنداں بہرہ از
علم ندارد اما ذکاوت طبعش بہ صاحب کمالان غالب چوں مزاجش
عشقباز افتادہ اکثر قطعہ ہائے خوب خوب در غزل و ... نغز نغز
بہ سلک نظم کشیدہ۔" (تذکرۂ ہندی)

"چند دیوان با اصناف سخن نظم کردہ و آں را در جلد
فراہم آوردہ نورتن نام کردہ چوں در دواوین دیگر مبنی بر ہزل و ریختہ
وغیرہ است کہ ایراد آں بایں تذکرہ نمی سازد۔ بنا براں از دیوان
ریختہ و تحفہ بدقت تمام ایں ابیات گزیدہ شد۔"

(گلشن بے خار)

"رنگینی ہمہ گیر طبیعت رکھتے تھے، ہر رنگ میں
انھوں نے اپنے جوہر دکھائے ہیں۔" (گل رعنا)

مصحفی

"قصیدہ و غزل و مثنوی ہمہ خوب بگوید مشق شاعرانہ ..."
(تذکرۂ شعرائے اردو)

"... نظم میں ایک صفائی و شیرینی ہے
اور بعض بندش میں اس کے بلندی و رنگینی۔" (گلشن ہند)

"... نظر سے خوب ...
... زبان سخن سازی ... کا ..."

(مجموعۂ نغز)

"ہر چند تتبع صنائع شیخ بسیار کردہ لیکن اکثر کلامش
بحکم پایہ ماز مضامین خالی است اگرچہ اشعار بعد نہایت
رتبت عالی و تہ تہ خالی است: (گلشنِ بے خار)

"ان کی اکثر غزلیں جیسے کہ ہم نے کہا رنگ برنگ ہیں
نہیں کسی ایک کے کلام میں کہیں میر کا تتبع ہے کہیں سودا کا انداز
کہیں مصحفی کی سادگی اور جان کہیں انشاء کی سی شوخی اور استادوں اپنے
پیشرو استادوں کی غزلیں کہا کرتے ہیں تو وہ اس شاعری کے
بعد بھی نمونے قرار دیے جا سکتے ہیں: (گلِ رعنا)

میر غلام حسن حسن

"اقسام نظم سے تو کچھ معلوم ہیں، نہیں کچھ ملال
ہے کہاں مگر اشعار ان کے البتہ ایک مسلسل و بلاغی ہے:
(گلشنِ ہند)

"چوں استاد اوائل عمر جعفر علی حسرت بود و اکثر خود مشغول
باین شغل خطیر بیاضات و شعر خود را از نظر میر ضیاء الدین ضیاء کہ
در آن ایام ایشان از مستعدان زمان مہدی دیار، بعضی گزرانیدہ
بعد از آنکہ مدعیہ بر ناسخ شعر زبان ریختہ چنانکہ باید و شاید بر آن
دریں دیار۔ رسوخ یافت۔ بحکم فطرت تیز مقدم بر جادۂ مستقیم
سلیم الطبعت یعنی خواجہ میر درد صاحب فیض سردار و میر محمد تقی گذشتہ
کلام خود را بہ پایۂ پاکیزگی و دلکشی رسانیدہ دیوانی ضخیم و مثنوی ہائے متعدد
در سلک نظم کشیدہ خصوصاً در مثنوی آنکہ سحر البیان نام دارد
بر بیضائے وہ انگشت گذاشتہ است۔ قطع نظر از بلاغت شاعری
زبانش بسیار بامزہ و شیرین و عالم پسند افتادہ۔"
(تذکرۂ ہندی)

"مطلع گلشن رشید شاعر فصاحت افروز میر حسن
مرحوم ما ما است حقہ کلام شاعر فصیح زبان مذہب بیان است
و در انشائے کار اقسام سخن ماہر: (مجموعۂ نغز)

سامع فطرت سلیم محبت است و مضمون فہم
فی الجملہ قدرتے داشت۔۔۔ ہر چند نظر آنہا خورد است شاعر
بمحاورہ و بحد بجد دلربا و خوش طبع: (گلشنِ بے خار)

ان کے اشعار غزل کے اصول میں گلاب کے
پھول ہیں اور محاورات کی خوشبو بیان کی صفائی عاشقانہ رنگ
میں معلوم ہوتی ہے میر حسن کا انداز بستہ تھا ہے:
(آبِ حیات)

مثنوی میں ان کا درجہ بہت بلند ہے اور مثنوی میں
تو کمال کے نمونے ہیں جن سے کسی کو بھی انکار نہیں ہو سکتا:
(گلِ رعنا)

شیخ قلندر بخش جرأت

"در کلامش نمکینی و شیرینی بے حد پیداست و خوش آمد
کرده بسیاری، ہمہ جملہ بسیار رعنائی ہمگی از وی است:
(تذکرۂ شعرائے اردو)

شاعر شیریں کلام ہے: (گلشنِ ہند)

در شعر خود تلاش تازہ بسیاری کند بسیار تمام
از کلامش تا بعد از این بیرون مسلسل گرفتہ غزل در غزل تخمیس
خالی است: (تذکرۂ ہندی)

در اسباب میر مشتی صاحب سلیقہ آں حیا کہ چنان
استعمال ما در شعر گر بہ باشد تلاش میکند کہ مقصود خصلت شان
نیست: (مجموعۂ نغز)

در سخن بہ صاحب کہ بیا عاشق و معشوق گم شدہ کہ
حسب مراد داشت: (گلشنِ بے خار)

"ان کی غزل اپنی بلند پایگی کے سبب آج تک ان
کے لیے خاص ہے جیسی اس وقت محاورہ عام تھی آج تک
ویسی ہی بولی آتی ہے خصوصیت اس کی یہ ہے کہ فصاحت سے

کی جان ہے۔ خط و خال حسن و عشق کے معاملات ہیں ——— اور عشق کے تنوعات گویا اس میں شراب و آب کا سا مزہ دیتے ہیں۔"

(آب حیات)

"مصحفی میں رطب و یابس بہت نہیں ہے۔"

(گل رعنا)

انشاء اللہ خاں انشا

"در عشق است اکثر طرز نو بطرز پرسوز مے نماید"

(تذکرہ شعرائے اردو)

"میاں ان کا زبان ریختہ میں مشہور ہے اور کلام ان کا ... ت اور خوش اسلوبی سے معمور۔"

(گلشن ہند)

"سلانا بندلے کہ بحکم بزرگی طبع شعر در بر سر زبان [illegible] ری و معد طبیعت می نماید لیکن میلان طبع اش بطرف ریختہ بیشتر است۔"

(تذکرہ ہندی)

"میر موصوف شاعرے است زبردست که سخن ... ست قوی بانده"

(مجموعہ نغز)

"ہیچ صنف را بطریقه ما سخنہ شعرا نگفته ... در ... ری طبع و جودت ذہن او سخنے نیست"

(گلشن بے خار)

"غزلوں کا دیوان عجب طلسمات کا عالم ہے۔ ثبات قدرت کلام، زبان کا لطف، محاوروں کی نمکینی، ترکیبوں کی استعارات بیشتر دیکھنے کے قابل ہیں۔ مگر عالم یہ ہے کہ ابھی کچھ ہیں، ابھی کچھ ہیں۔ جو غزلیں یا غزلوں میں اشعار اصول پر گئے وہ ایسے ہیں کہ جواب نہیں، اور جہاں طبیعت اور طرف جا پڑی وہاں ٹھکانا نہیں۔ غزلوں میں غزلیت کے اصول کی پابندی نہ ہونے کا سبب یہ ہے کہ وہ بھی آخر ایک ذخیرہ ناخیر مضامین و الفاظ کا اپنے پاس رکھتا تھا۔ اس سے جس قسم کی مخلوق چاہتا تھا پیدا کر دیتا تھا۔"

(آب حیات)

"میرا تو یہ خیال ہے کہ سید انشا جیسا ذہین و ذکی اگر اپنی طبیعت پر قابو رکھتا ہوتا تو سعادت علی خان کے مزاج میں در خور ہو جانے پر وہ کوئی اور چیز بن جاتا اور اس کا دیوان لطائف و ظرائف سے مالا مال ہونے کی جگہ ملک کے سامنے آج ایک نیا نمونہ پیش کرتا۔"

(گل رعنا)

نظیر اکبر آبادی

"شاعرے است پر بیہ مشق که با فضل ... زاج طبع، شاعری می افزود۔"

(مجموعہ نغز)

"اشعار بسیار دارد که بر زبان سوقین جاریست و نظر بآں ابیات واحد شعر انشا پرتر۔"

(گلشن بے خار)

نصیر

"فقیر دریافته در شاہجہان آباد بود اکثر مشاعرہ می آمد۔ در آں جا عالم نو مشقی در طبعش روانی و تیزی دریافت میشود حالا گویند که قوت شاعری بسیار پیدا کردہ۔"

(تذکرہ ہندی)

"در روانی طبعش شکے نیست۔"

(ریاض الفصحا)

"روش پر معلوم می شود۔" (مجموعہ نغز)

"زمین ہائے سنگلاخ طرح میکند"

(گلشن بے خار)

"زبان شکوہ الفاظ اور چستی ترکیب میں سودا کی بان تھی اور گرمی و لذت اس میں ضداد تھی۔ انھیں ایسی ہی تشبیہوں اور استعاروں کا شوق تھا اور یہ شوق نے بہا تعلیٰ کی زمینیں نہایت برجستہ اور پسندیدہ نکالتے تھے مگر ایسی سنگلاخ ہوتی تھیں جن میں بڑے بڑے شعرا قدم نہ رکھ سکتے تھے تشبیہ

اور استعارہ کر لیا ہے اور نہایت آسانی سے برتا ہے جسے اکثر زبردست انشا پرداز ناپسند کر کے کم استعمال کی توجیہ نکالتے ہیں اور کہتے ہیں کہ تشبیہ یا استعارہ شاعرانہ نہیں بلکہ بے تکلف بیان کی فصل ہے۔ اگر وہ ایسا نہ کہتے تو کلام میں یہ خم کیونکر ہوتا اور ہم ایسی سنگلاخ زمینوں میں گرم گرم شعر کیوں سنتے پھر وہ ہزاروں شاعروں میں خاص و عام کے منہ سے واہ وا کیونکر لیتے۔"

(آبِ حیات)

"کلام میں نکھرے الفاظ کے ساتھ نئی نئی تشبیہیں اور استعارے پائے جاتے ہیں۔ زمینیں بھی نئی نئی نکالی ہیں جن میں شعر کو مرتب کرنا ہر کسی کا کام نہیں۔ زبان منجھی ہوئی اور جدت کی ہے۔ کچھ الفاظ ان کے ہاں متروک ہیں مگر اتنے نہیں ہیں کہ ناسخ و آتش کے ساتھ ان کو جگہ دی جائے۔"

(گلِ رعنا)

میر نظام الدین ممنون

"بہ راستی اسپ سخن مرد واقف اکثر اصول این فن سلیس گفتار فصیح زبان بود ... خدمت ہمایون در سلک شعرا پاسخ ... پیر خاقانی انتظام بعد روشناسی و دیدہ وری حضرت ظل سبحانی بخطاب مستطاب فخرالشعرائی و ... احترام داشت و موافق طبع مشکل پسند بادشاہی بدیہہ میرا دو سرانجام می یافت۔"

(مجموعۂ نغز)

"در زمرۂ متقدمین قوت شاعری چنانکہ شاعر را باید کردہ کلام خود در رتبۂ کلام پیرو رسانید۔" (تذکرۂ ہندی)

"طرز گفتارش خیلی دلچسپ و دلنشین است و طرح کلامش نہایت مہذب و شستہ و درست تلاش مضامین یگانۂ زمانہ است و ذکر صائب از تلاشش استادانہ قوت نظم اکثر اصناف سخن دارد۔"

(گلشنِ بے خار)

"زبان ان کی صاف اور شیریں ہے۔ اس پر جب محاوروں کی چاشنی دیتے ہیں تو کلام اور بھی مزیدار ہو جاتا ہے۔ پھر ترکیب و بندش کی چستی سے پامال و فرسودہ مضامین بھی اس انداز سے ادا کرتے ہیں کہ اس میں ایک قسم کی لطافت و نزاکت پیدا ہو جاتی ہے۔"

(گلِ رعنا)

اسد اللہ خاں غالب

"پایۂ اش از فحول استادان یکہ نسبت غزلش چون غزل نظیری بے نظیر و قصیدہ اش چون قصیدۂ عرفی دلپذیر مضامین شعر را کہ اختراعی فکر و بلیغ نکات و لطائف بیشتر پی بردہ۔"

(گلشنِ بے خار)

"جس قدر عالم میں مرزا کا نام بلند ہے اس سے ہزاروں درجہ عالمِ معنی میں کلام بلند ہے بلکہ اکثر شعر ایسے اعلیٰ درجۂ رفعت پر واقع ہوئے ہیں کہ ہمارے نارسا ذہن وہاں تک نہیں پہنچ سکتے۔ اس میں کلام نہیں کہ وہ اپنے نام کی تاثیر سے مضامین معانی کے بیشہ کے شیر تھے۔ دو باتیں ان کے انداز کے ساتھ خصوصیت رکھتی ہیں۔ اوّل یہ کہ معنی آفرینی اور نازک خیالی ان کا شیوۂ خاص تھا۔ دوسرے چونکہ فارسی کی مشق زیادہ تھی اور اس سے انھیں طبعی تعلق تھا۔ اس لیے اکثر الفاظ اس طرح ترکیب دے جاتے تھے کہ بول چال میں اس طرح بولتے نہیں لیکن جو شعر صاف صاف نکل گئے ہیں وہ ایسے ہیں کہ جواب نہیں رکھتے۔"

(آبِ حیات)

"مرزا صاحب نے اپنی تغزل کی بنیاد ایسے اچھوتے اسالیب پر رکھی ہے جن کو اور شعرا کی فکر نے مس تک نہیں کیا۔ وہ معمولی سے معمولی مضمون کو ایسے نرالے انداز سے ادا کرتے ہیں جو بالکل نیا معلوم ہوتا ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ ہر ایک مضمون ان کا نیا ہے۔ ان کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ عام

بتذل تشبیہیں جو عموماً شعرا کے کلام میں پائی جاتی ہیں ان سے
ں تک ہو سکتا ہے بچتے ہیں اور نئی نئی تشبیہیں پیدا کرتے
مثلاً سانس کو موج سے، بے تابی کو دریا سے، گرداب کو
دہ جبار سے، اعضو سر کو خیمۂ باش سے، دانۂ انگور کو عقد عمل
سے، استخوان کو خشت سے، بدن کو قالب خشت سے اور اسی
کی بہت سی تشبیہیں ان کے ابتدائی ریختہ میں موجود ہیں۔ ان
کا ایک خصوصیت ہے کہ متانت اور سنجیدگی کو شوخی اور ظرافت
سے ایسا پیوست کرتے ہیں کہ دونوں مل کر شعر میں تڑپ پیدا کر
دیتے ہیں۔ سودا اور انشا شوخی اور ظرافت میں غالب سے
بڑھ کر ہیں مگر جب وہ شوخی پر آتے ہیں تو متانت ان کے ہاں سے
رخصت ہو جاتی ہے۔"

"ایک خصوصیت مرزا کی یہ ہے کہ ان کے کلام
میں ایک خاص چیز ہے جو (مومن کے سوا) اوروں کے کلام بہت
کم دیکھی جاتی ہے۔ ان کا کلام ایسا پہلودار ہوتا ہے کہ بادی النظر
میں ان کے کچھ اور معنی مفہوم ہوتے ہیں مگر غور کرنے کے بعد
دوسرے معنی نہایت لطیف پیدا ہوتے ہیں جس کی وجہ سے ان
کا شعر ہمیشہ ایک نیا لطف دیتا ہے۔" (گل رعنا)

مومن

"بزعم فقیر بقوت شاعری ایشاں کم کسی برخاستہ
ہر جنس سخن آں چناں ملکہ ای دارد کہ کسے را در یک صنف بہ
میسر نیامدہ و باوجود تخالف لسانین بہ ہر دو لفظ چنداں دستگاہ کہ
نصیب او گشتہ کہ پارسیاں از آں تحیر دل انگاشتہ و ہندیاں خود طرح
با نسبت چہ نازہا کردہ اند۔" (گلشن بے خار)

"غزلوں میں ان کے خیالات نہایت نازک اور
مضامین عالی ہیں اور استعارہ و تشبیہ کے زور نے اور بھی
اعلیٰ درجہ پر پہنچایا ہے۔ ان میں معاملات عاشقانہ عجیب مزے
سے ادا کیے ہیں۔ اسی واسطے جو شعر صاف ہوتا ہے اس کا انداز
جرأت سے ملتا ہے اور اس پر وہ خود بھی نازاں تھے۔ اشعار
مذکورہ میں فارسی کی عمدہ ترکیبیں اور دلکش تراشیں ہیں کہ اردو کی
صلاحیت میں اشکال پیدا کرتی ہیں۔ ان کی زبان میں چند وصف خاص
ہیں جن کا جتانا لطف سے خالی نہیں۔ وہ اکثر اشعار میں ایک
شے کی طرف نسبت کرتے ہیں اور اس ہیر پھیر سے شعر میں عجب
لطف لطیف بلکہ معانی نہانی پیدا کرتے ہیں۔"

(آب حیات)

"مومن خاں نے جس قدر اسالیب بیان میں
نزاکت و لطافت پیدا کر دی ہے وہ ان کی ذہانت اور جولانی طبع
کا نتیجہ ہے۔ قصیدوں میں، غزلوں میں، مثنویوں میں ہر جگہ ان کا
انداز بیان کیفیت سے خالی نہیں مگر افسوس ہے کہ ان کو مرزا غالب
جیسا نقاد نہیں ملا جو ان کی کاوش فکر کے نتائج کو ملک میں نمایاں
کرتا۔" (گل رعنا)

ذوق

"قوت مشق را او راستہ دیگرے را دیدہ نشد
و معہذا رطب و یابس کہ شیوۂ بسیار گویاں است در کلامش
کمتر، و بر تبیین اصناف سخن قدرت تمام دارد و بالجملہ از متوسطین متجاوز
و مقرر است۔" (گلشن بے خار)

"عام جوہر ان کے کلام کا نازکی مضمون و صفائی
کلام و چستی ترکیب و خوبی محاورہ اور عام فہمی ہے مگر حقیقت
میں رنگ مختلف وقتوں میں مختلف رہا۔ ابتدا میں مرزا رفیع کا انداز
تھا شاہ نصیر سے ان دنوں معرکے ہو رہے تھے۔ ان کا طرز
وہی تھا اس لیے انھوں نے بھی وہی اختیار کیا اس کے علاوہ
کہ ناز کو جلسے کے لگانے میں اور لوگوں کے سب و دبی سے
مادہ نکال لیتے ہیں۔ ایک عجیب جادو کا اثر ہے چنانچہ

وہی شکل طرحیں، چست بندشیں، برجستہ ترکیبیں، معانی کی بلندی، الفاظ کی شکوہ، ان کے کلام میں بھی پائی جاتی ہیں۔ چند روز کے بعد الٰہی بخش خاں معروف ایک دیرینہ سال مشاق اور مقصود الخصوص تھے۔ ان کی پسند طبع کے بموجب انہیں بھی تصوف اور معاملہ اور درد مندی کی طرف خیالات کو مائل کرنا پڑا۔ نوجوان ولیعہد سلطنت کے بادشاہ تھے۔ ادھر یہ بھی جوان اور ان کی طبیعت بھی جوان تھی۔ وہ جرأت کے انداز کو پسند کرتے تھے اور جرأت اور سید انشا اور مصحفی کے مطلع اور اشعار بھی لکھنؤ سے اکثر آتے رہتے تھے، ان کی غزلیں انہی کے انداز میں بناتے تھے۔ نتیجہ اس کا یہ ہوا کہ ان کی غزل اخیر کو ایک گلدستہ گل ہائے رنگا رنگ کا ہو تی تھی۔ وہ تین شعر بلند خیالی کے، ایک دو تصوف کے، دو تین معاملے کے اور ایک آدھ اس میں یہ ہوتا تھا کہ ہر قافیہ بھی ایک خاص انداز کے ساتھ خصوصیت رکھتا ہے کہ اسی میں بندھے تو لطف دے۔ نہیں تو پھیکا رہے۔ یہ وہ مشاق باکمال اس بات کو پہچانتے ہوتا تھا اور جس قافیہ کو جس پہلو کے مناسب دیکھتا تھا اس میں باندھ دیتا تھا اور اس طرح باندھتا تھا کہ اور پہلو نظر نہ آتا تھا۔ ساتھ اس کے صفائی اور محاورہ کو ہرگز ہاتھ سے نہ جانے دیتے تھے اور انہی اصول کے لحاظ سے میر، مرزا، درد، مصحفی، سید انشا، جرأت بلکہ تمام شعرا سے متعدد ہیں کہ اس طرح یاد کرتے تھے گویا انہی کے شاگرد ہیں۔"

(آبِ حیات)

بہادر شاہ ظفر

"شعر سے کہ از طبع دریا بار جناب ایشاں می تراود وارستہ باشد و لائے گفتے کہ از قلم صائب حضرت شان سر برآورد ہمہ باشد بکسر صفا و مہر بہا۔"

(مجموعہ نغز)

"بایں ہمہ بسیار سالف است۔"

(گلشن بے خار)

"تمام دیوان زبان کی صفائی اور روز مرہ کی خوبی میں اول سے آخر تک یکساں ہے لیکن اس میں نازک خیالات بہت کم پائے جاتے ہیں۔ ظفر کی کمزوری صحیح اور ان کے استاد کا ذوق بھی مسلم مگر اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ ان کی ساری عمر کی محنت پر پانی پھیر کر استاد متعلق کو ان کے دیوان کا مالک بنا دیا جائے۔"

(گل رعنا)

نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ

"در مراتب نظم و نثر ادا سے خاص وارد و بہبود زبان ریختہ و پارسی ہم سے طرازد۔" (طور کلیم)

"اس زمانہ میں نواب کی سخن گوئی سے زیادہ ان کی سخن فہمی کی دھوم تھی۔ مرزا نوشہ تک ان کی سخن فہمی کے معترف تھے۔ مرزا کے نزدیک نواب کی پسند شعر کے حسن کا قطعی سند تھی۔"

(گل رعنا)

ناسخ

"از سن بست سالگی بتقاضائے موزونی طبع فکر شعر بلند میکند و در تلاش اسے معنی تازہ می نماید۔"

(ریاض الفصحا)

"والا پایہ عالی پایہ بلند اندیشہ نازک خیال است و در تلاش مضمون تازہ و معنی سیراب بے مثل و مثال از اقسام سخن ہر غزل سرائی مائل و غیر از غزلیات مد با حیات صفحے آخر اند دیدہ نشد۔"

(گلشن بے خار)

"غزلوں میں شوکت الفاظ اور بلند پروازی اندازہ تک پہنچا بہت ہے لو تاثیر کم، صائب کی تشبیہہ و تمثیل کو اپنی صنعت میں

یب دے کہ ایسی دستکاری اور مینا کاری فرمائی کہ بعض موقع پر
بل اور ناصر علی کی حد میں جا پہنچے، اور اُمور میں وہ اکثر صاحب مرزا
رباب، انھیں ناسخ لکھنا بجا ہے کیونکہ طرز قدیم کو نسخ کیا۔"
(آبِ حیات)

"ناسخ کی قوت تخئیل نہایت زبردست ہے،
یک چیز کو وہ سو سو طرح دیکھتے ہیں اور ہر دفعہ اس کو ایک عالم نظر
ا ہے، پھر وہ کلام کی بنیاد اس پر قائم کر کے تمثیل اور مبالغہ سے
س میں گرمی پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں مگر اس قوت کے
ستعمال کرنے میں اکثر اعتدال سے گزر جاتے ہیں۔"
"کہیں پر مبالغہ اصلیت اور واقعیت سے اتنا
دور جا پڑتا ہے کہ ان کی بلند پروازی کے سامنے آفتاب تارا
بن کر رہ جاتا ہے، کہیں پر تمام عمارت کی بنیاد صرف لفظی تناسب
یا ایہام پر ہوتی ہے، کہیں فرضی تشبیہوں اور استعاروں پر شعر کی
بنیاد قائم کرتے ہیں جو لطیف اور قریب المآخذ نہیں ہوتے،
کہیں پر کسی چیز سے تشبیہ دے کر اس کے تمام لوازم اور صفات
س میں ثابت کرتے ہیں، حالانکہ اس سے کسی قسم کی مناسبت
نہیں ہوتی۔"

"یہ ان کا انداز بیان ہے جس کا نام نازک خیالی
یا خیال بندی رکھا گیا ہے اور اس نے متاخرین کی شاعری کو تباہ
کر کے چھوڑا۔ یہ لوگ صرف گل و بلبل سے دیوان تیار کر کے،
اس کو چیستانِ خیال بنا دیتے ہیں اور افسوس ہے کہ یہی ان کی
شاعری کا طرۂ افتخار ہے۔"
(گلِ رعنا)

آتش

"اگر عمرش وفا کردے و چند سال بر بیں و تیرہ رفت
و فکر بینش ما مانعے در پیش نیا مید کہ از بے نظیراں روزگار
خواہد شد۔"
(ریاض الفصحا)

"جو کلام ان کا ہے، حقیقت میں محاورۂ اُردو کا
دستور العمل ہے اور انشا پردازیٔ ہند کا اعلیٰ نمونہ، شرفائے لکھنؤ
کی بول چال کا انداز اس سے معلوم ہوتا ہے۔ جس طرح لوگ
باتیں کرتے ہیں اسی طرح انھوں نے شعر کہہ دیے ہیں۔ ان
کے کلام نے پسندِ خاص اور قبولِ عام کی سند حاصل کی۔"
(آبِ حیات)

"زبان کی صحت و صفائی میں یہ اپنے حریف ناسخ
کے دوش بدوش چلتے ہیں مگر نازک خیالی اور بلند پروازی میں
ان کا حریف ان سے بہت زیادہ اونچا جاتا ہے۔ سلاستِ زبان و سوز و گداز
میں یہ ان سے آگے ہیں۔"
(گلِ رعنا)

شہیدی

"طبع خوشے دارد و در عروض دستگاہے معقول
و در حساب مکانی مقبول۔"
(گلشنِ بے خار)

"شعر و سخن میں ایسی قدرت کامل بہم پہنچائی تھی کہ
زمین کیسی ہی سنگلاخ ہو ایک طرح میں چار چار غزلے پانچ غزلے لکھتے تھے
اور کوئی غزل پچیس و پینتیس شعر سے کم نہ ہوتی۔"
(گلِ رعنا)

مرزا قربان علی سالک

"چند روز کی مشق میں سخن سنجی اور سخن فہمی میں اپنے
معاصرین سے بہت بڑھ گئے اور مرزا غالب کے شاگردوں
میں سب سے بہتر نظر آنے لگے۔"
(گلِ رعنا)

میر مہدی مجروح

"مجروح کی زبان نہایت صاف و سادہ ہے۔
چھوٹی چھوٹی بحروں میں اکثر غزلیں لکھی ہیں جن میں محاوروں کی چاشنی

زبان صاف چلتی ہے مگر اسالیب کلام میں بہت رنگارنگی نہیں ہے۔ ان مضمونوں کو جنھیں متوسط طبقے کے شعرا نے اپنی مخصوص زبان طرز بیان میں ادا کیا ہے، یہی کام میں ہوئے ہیں مگر بعض جگہ نزاکت خیال کی ملاوٹ نہ ہونے سے کچھ عامیانہ پن کا رنگ پیدا ہو گیا ہے تاہم اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ زبان کی صفائی اور سادگی کے ساتھ کلام میں پختگی کے لوازم اچھی طرح پائے جاتے ہیں۔" (گل رعنا)

میر حسین تسکین

"صاحب فکر بلند و اسلوب گفتارش حل پسند۔" (گلشن بے خار)

"استادی کی طرز ادا، معاملہ نگاری اور شوخی کو روز مرہ کی صفائی اور سادگی کے ساتھ اس طرح سے ملا جلا دیا ہے کہ ان کے کلام میں رنگ دہلی کی شان جلوہ گر ہے اور مومن خاں کے ساتھ اس قدر یکرنگی پیدا ہو گئی ہے کہ اگر ان دونوں کے کلام کو مخلوط کر دیا جائے تو ایک کے کلام کو دوسرے کے کلام سے تمیز کرنا دشوار ہو جائے گا۔" (گل رعنا)

نواب مرزا خاں داغ

"شوخی کہ در کلام اوست، بندہ خدا از کرا مرد بیگر را مادہ باشند و زمانے کہ او را بخشیدہ اند فی زمانہ ہیچ کس را نیست۔ بیش ازیں ستائش گفتار او چہ توان گفت۔ خیر الکلام ما قل و دل۔" (طور کلیم)

"زبان میں فصاحت و سادگی، بیان میں شوخی اور بانکپن، کلام کو دیکھو فصاحت اور محاورے کا دریا بہہ رہا ہے۔ علم عشق کے معاملات ہیں اور عاشق و معشوق کے خیالات، گویا اس میں شراب دو آتشہ کا سرور پیدا کرتے ہیں جس کو شوکر

کلام سر تا پا صنعت میں اور خواص مزے سے لیتے ہیں۔" (گل رعنا)

منشی امیر احمد امیر

"اہل سخن کا اتفاق ہے کہ امیر اس فن میں استاد مسلم الثبوت تھے۔ وہ ایسی طبیعت لے کر آئے تھے جو شعر و انشا کے لیے موزوں تھی۔ انھوں نے تمام اصناف سخن میں طبع آزمائی کی ہے۔ اس پر کلام کا یہ وصف ہے کہ نزاکت سے ہر جگہ دست و گریباں ہے۔ بندش کی چستی اور ترکیب کی دلکشی سے لفظوں کو خوبصورتی سے پہلو بہ پہلو جڑے جاتے ہیں۔ خیالات نازک اور مضامین بلند اس طور پر باندھتے تھے کہ اس باریک نقاشی پر فصاحت آمیز کا کام دیتی ہے۔ ان میں ایک خصوصیت یہ بھی ہے جو داغ میں نہیں ہے کہ جیسے جیسے یہ بوڑھے ہوتے گئے کلام میں جوانی کی امنگیں بڑھتی گئیں۔" (گل رعنا)

خواجہ الطاف حسین حالی

"اردو کا دیوان انھوں نے مرتب کیا ہے اور اردو شاعری پر سوا سو صفحہ کا ایک مبسوط مقدمہ لکھ کر اس میں شامل کر دیا ہے جو دیکھنے کے قابل ہے اور اردو زبان میں اپنی طرز کے لحاظ سے بالکل نئی چیز ہے۔ اس سے مولانا کے مذاق شاعری کا صحیح اندازہ ہو سکتا ہے۔" (گل رعنا)

حکیم ضامن علی جلال

"کثرت مشق سے کلام میں رنگ پیدا ہو گیا۔" (گل رعنا)

شیخ امیر اللہ تسلیم

"عام جوہر ان کے کلام کا پختگی کلام و رنگینی کلام

۔۔۔ الفاظ اور دلپذیری مضامین ہے جس سے بے ساختگی کی
۔۔۔ اس میں کھلی چھپی معلوم ہوتی ہے۔" (گلِ رعنا)

سید اکبر حسین اکبر

۔۔۔ پنشن لے کر خانہ نشین ہونے کے بعد ان کی شاعری
۔۔۔ اور زمانے کے میلانِ عام اور جدید طرزِ معاشرت کی خرابیاں
۔۔۔ جو شاعر کے دل پر چھایا ہوا تھا، اس کو ظرافت کے پردے
۔۔۔ میں ظاہر کرنے کی راہ انھوں نے ڈھونڈ نکالی۔ اکبر روشن خیالی
۔۔۔ کے ساتھ مشرق کی سچی محبت کا واعظ ہے اس کے نزدیک ہر

مشرقی نژاد کا فرض ہے کہ اپنے ملک سے محبت رکھے، اپنے مذہب کی حفاظت کرے، اپنے بزرگوں کا ادب ملحوظ رکھے اور اپنے ہر رسم و رواج کو صرف اس سبب سے موہوم نہ سمجھے کہ وہ کسی مغربی رسم و رواج کے خلاف ہے بلکہ جائز حد تک اپنی چیزوں پر نازاں ہو۔ اپنے ماضی سے واقف ہو۔ اپنے حال کی تنقید کر سکے اور اپنے مستقبل کی نسبت اچھی امید رکھے، یہ خیالات اس زور اور اس خوبی کے ساتھ معاصرین سے کسی کے یہاں نہیں ملتے۔"

(گلِ رعنا)

شاد عظیم آبادی

۔۔۔ غزلِ جدید کے پیش رو کہے جا سکتے ہیں۔ انھوں
۔۔۔ نے دہلوی طرزِ تخیل کو لکھنوی زبان کے ساتھ اس خوبصورتی کے
ساتھ ملایا ہے کہ غزلِ قدیم و غزلِ جدید کے درمیان میں نہایت
دلکش و موثر غزل نکل آتی ہے۔ ان کی فکر میں جودت، تخیل میں وسعت
اور بیان میں لطافت ہے۔ مولوی سید سلیمان صاحب ندوی کے
۔۔۔ شاد کا آئینہ ہے۔ اس کو نقل کرنا کافی ہے:

"شاد کی شاعری حسن و عشق کے معاملات اور صوفیانہ
انداز بیان سے تمام تر پاک ہے۔ پاکبازانہ حسن و عشق، ندرت
کی دلکشی، رو در داد کے علاوہ ان کی شاعری میں اخلاق، فلسفہ، تصوف
اور توحید کا عنصر بہت زیادہ ہے۔ غزل گوئی کے لحاظ سے شاد
میں میر کے بہت سے انداز پائے جاتے ہیں۔ حسن و عشق کی
داستان سرائی میں وہی سادگی اور متانت ہے۔ چھوٹے الفاظ
میں سادہ ترکیبیں ہیں۔ بیان میں وہی رفعت ہے۔ میر ہی کے
اوزان و بحور ہیں۔ وہی انداز کلام ہے۔ وہی طرزِ ادا ہے
اس لیے شاد کو اس دور میں کا میر کہا جائے تو بالکل بجا ہے۔"

اس پر اس قدر اضافہ کی ضرورت ہے کہ شاد اپنی ضعیفِ عمری کے اثر سے اور انشائے قدیم کی مہارت و عادت کے سبب سے عربی کے ثقیل الفاظ اور ترکیبیں بھی استعمال کر گئے ہیں جس طرح ڈاکٹر مرزا محمد دہلوی اپنے زمانہ اس عہدِ جدید میں بھی لکھتے ہیں۔ انداز ان سخنوں نے ناسخ، ذوق، امیر وغیرہ کے "فالق الاصباح"، "مژدہ بان"، "طلایہ"، "الیھور"، "عین الحیات" جیسے الفاظ کو لطافتِ غزل کے منافی قرار دیا ہے۔ شاد عظیم آبادی کا کلام بھی اس انداز سے خالی نہیں۔" (تاریخ و تنقید) ادبیاتِ اُردو

ریاض خیر آبادی

ریاض کے لسان العصر ہونے میں شک و شبہ کی ذرا بھی گنجائش نہیں۔ وہ یقیناً اپنے زمانہ کی آواز تھے اور ایسی آواز جس کے آگے ہر آواز کچھ بیٹھ سی گئی۔ وہ زبان پر وہی قدرت رکھتے ہیں جو ایک کھلاڑی یا بازی گر اپنے ناخنوں پر رکھتا ہے ان کی شاعری ایسی فقرہ بازی ہے جو کسی وقت کسی صحبت میں کم نہیں ہوتی۔ بعض نقادوں نے شاعری کو فاضل فن کا نمائندہ بتایا ہے۔ کہ سے کم ریاض کی شاعری یہی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے

کہ شاعر بلوغ کے بعد بھی دور سے گزر رہا ہے اور اس کی بولی بولی پھڑک رہی ہے۔ قوت اور توانائی کی فراوانی کا بڑھتا ہوا احساس اس کو طرح طرح کی دلچسپ حرکتیں کرنے پر مجبور کر رہا ہے جن پر سنجیدہ سے سنجیدہ اور بڑے سے بڑے آدمی کو تھوڑی دیر کے لیے ایسا مزا آتا ہے کہ وہ اپنی سالمی زندگی اور سنجیدگی بھول جاتا ہے جیسے بچوں کے بعض کھیل ہوتے ہیں مثلاً پتنگ بازی کہ سن رسیدہ سے سن رسیدہ اور مشغول سے مشغول ہستیاں بھی ایک مرتبہ نظر اٹھا کر کچھ دیر کے لیے محو ہو جاتی ہیں۔ اگرچہ منشا یہ بھی احساس ہونے لگتا ہے کہ بچوں کا کھیل ہے، زیادہ وقت نہ دو ورنہ کام حرج ہو جائے گا۔"

(تنقیدی حاشیے)

آرزو لکھنوی

"آرزو ان شعراء میں سے ہیں جو پہلے تنے لکھنؤ کی آخری بہار یعنی جلال کی گرمی اور چستی سے لیکن اس سے غزل نے انداز بیان کی سادگی بھی پیدا کی۔ یہاں تک کہ آج اردو کے ممتاز شعراء میں آرزو کا نام دو حیثیتوں سے قابل ذکر ہے۔ ایک خیال کی سادگی اور نرمی کی وجہ سے دوسرے زبان کی عام فہم شیرینی کی وجہ سے غزل کی زبان کو بول چال کی زبان کے قریب لا کر شاعر نے یہ واضح کیا ہے کہ شاعری کی بولی دنیا والوں کی بولی سے الگ نہیں ہوتی اور نہ وہ قدیم بحروں کی قید میں ہمیشہ اسیر رہتی ہے۔"

(شاعر پرانے چراغ)

اقبال

"اقبال کی غزل کی خصوصیت اس کا جوش بیان اور رمزیت ہے جس کی مثال حافظ اور غالب کو چھوڑ کر دوسروں کے ہاں مشکل ہی سے ملے گی۔ اس کے نظم الفاظ میں بلا کی اچھائی قوت پوشیدہ ہوتی ہے۔ وہ علم اور اس کے معانی سے انسانی ذہن کو مسحور کر دیتا ہے۔

اس کی تمام غزلوں میں فنی حسن کا بہترین نمونہ ہے۔ وہ ایسی بحریں اور زمینیں منتخب کرتا ہے جو غزل کے لیے خاص طور پر موزوں ہوتی ہیں۔ شگفتہ زمین اور مضمون کے مناسب وزن منتخب کرنے سے شاعر اپنے کلام میں بے پایاں دلآویزی اور دلکشی پیدا کر دیتا ہے۔ اقبال کے ہاں بھی شراب و نغمہ، بادہ خوار اور مے فروش، زلف و خال اور رخسار و عارض کا پیرایۂ بیان موجود ہے لیکن وہ ان کے ذریعے رمز و کنایہ کی ایسی دنیا تخلیق کر دیتا ہے کہ جذبہ و وجدان مچلنے لگتے ہیں۔—

اقبال نے اپنی شاعری کے بالکل ابتدائی زمانے میں ایک غزل لکھی تھی جس کا ایک شعر یہ ہے ؎

موتی سمجھ کے شانِ کریمی نے چن لیے
قطرے جو تھے مرے عرقِ انفعال کے

اس ایک شعر پر بہت سے شعراء کے دیوانوں کو قربان کیا جا سکتا ہے۔

بعض اردو غزلیں سہل ممتنع کے معیار پر پوری اترتی ہیں ان کا ایک ایک لفظ جذبات و کیفیات کی آواز بازگشت ہے۔ لوازم عشق کی کیفیات کو وہ کس لطف اور بے تکلفی کے ساتھ بیان کرتا ہے ؎

نہ آتے ہمیں اس میں تکرار کیا تھی　　مگر وعدہ کرتے ہوئے عار کیا تھی
تمہارے پیامی نے سب راز کھولا　　خطا اس میں بندے کی سرکار کیا تھی
بھری بزم میں اپنے عاشق کو تاڑا　　تری آنکھ مستی میں ہشیار کیا تھی

ترے عشق کی انتہا چاہتا ہوں　　مری سادگی دیکھ کیا چاہتا ہوں
ستم ہو کہ ہو وعدۂ بے حجابی　　کوئی بات صبر آزما چاہتا ہوں
بھری بزم میں راز کی بات کہہ دی　　بڑا بے ادب ہوں سزا چاہتا ہوں

(بانگ درا)

کسے خبر تھی کہ غالب مرحوم کے بعد ہندوستان میں پھر کوئی ایسا شخص پیدا ہوگا جو اُردو شاعری کے جسم میں ایک نئی روح پھونکے گا اور جس کی بدولت غالب کا بے نظیر تخیل اور نرالا اندازِ بیان پھر وجود میں آئیں گے اور ادبِ اُردو کے فروغ کا باعث ہوں گے مگر زبانِ اُردو کی خوش اقبالی دیکھیے کہ اس زمانے میں اقبال ایسا شاعر اسے نصیب ہوا جس کے کلام کا سکہ ہندوستان بھر کی اُردو دان دنیا کے دلوں پر بیٹھا ہوا ہے اور جس کی شہرت روم و ایران بلکہ فرنگستان تک پہنچ گئی ہے۔

غالب اور اقبال میں بہت سی باتیں مشترک ہیں۔ اگر میں تناسخ کا قائل ہوتا تو ضرور کہتا کہ مرزا اسد اللہ خاں غالب کو اُردو و فارسی کی شاعری سے جو عشق تھا اس نے ان کی روح کو عدم میں جا کر بھی چین نہ لینے دیا اور مجبور کیا کہ وہ پھر کسی جسدِ خاکی میں جلوہ افروز ہو کر شاعری کے چمن کی آبیاری کرے اور اس نے پنجاب کے ایک گوشے میں جسے سیالکوٹ کہتے ہیں دوبارہ جنم لیا اور محمد اقبال نام پایا۔"

(دیباچہ بانگ درا)

حسرت موہانی

حسرت اپنی زندگی ہی میں کلاسیکل حیثیت حاصل کر چکے ہیں۔ انھوں نے ہر استاد سے فیض اٹھایا ہے لکھنؤ کی زبان کے باوجود رنگِ دہلی کو برقرار رکھی ہے۔ مومن، جرأت، نسیم، تسلیم سب کا نام روشن کیا ہے۔ ان کا حسن و عشق ان کے ہجر و فراق سب اسی دنیا کی چیزیں ہیں مگر انھوں نے ان میں ایک ابدی چاشنی بھر دی ہے اور زمان و مکاں سے بے نیاز کر دیا ہے۔ حسرت نے نگہِ لطیف سے حسن کو دیکھا ہے اور اس دنیا کی عورت میں حورِ آسمان کا تقدس اور جمال دکھایا ہے۔ ان کے حسن کی طرح ان کا کلام بھی سدا بہار ہے۔"

(نشاطِ رفتہ، پیشِ چراغ)

اصغر گونڈوی

جناب اصغر فطرتاً شدید الاحساس، بلند نظر اور صاحبِ وجد و حال ہیں اس لیے ان کا ایک ایک شعر بلندیٔ خیال، شکوہِ الفاظ، رقصِ ترکیب، جوشِ بیان اور ندرتِ ادا کا ایک دلفریب مجسم ہے۔ اسرار و معارف ان کی شاعری کا ہیولیٰ، وجد و حال اس کی روح، ندرتِ ادا اس کی صورت اور رنگینیٔ بیان اس کا رنگ ہے۔ مثالاً شعر ذیل ملاحظہ طلب ہے —

خونِ گل سے لپٹ کر وہیں مر جانا تھا
اب کرے کیوں گلۂ تنگیٔ داماں کوئی

حقیقت یہ ہے کہ غالب و مومن نے اساتذۂ ایران کے تتبع اور اپنے زورِ طبیعت سے اُردو شاعری میں جو دو نئے باب اضافہ کیے تھے وہ محض نقشِ اول تھے۔ جناب اصغر حکیم مومن خان کے سلسلۂ تلامذہ میں ہیں اور غالب کے شیدائی ہیں اور خوش قسمتی سے بادۂ عرفان کے ذوق شناس بھی ہیں اس لیے ان کی شاعری میں حکیم مومن خان کی جدتِ اسلوب اور شگفتگیٔ ترکیب اور غالب کا زورِ بیان اور نکتہ آفرینی شیر و شکر ہو کر ایک نئی صورت میں جلوہ گر ہوئے ہیں جس میں تصوف و عرفان نے تاثیر کی روح پھونک دی ہے۔ ان کی شاعری چونکہ نقشِ ثانی ہے اس لیے نقشِ اول کی خامیوں سے پاک ہے۔ اس حیثیت سے اگر ان کو ایک طرزِ خاص کا موجد کہا جائے گا تو کوئی مبالغہ نہ ہوگا

(مجموعہ نشاطِ روح)

احباب میری کم علمی سے بے خبر نہیں ہیں۔ خصوصاً تقریظ کے معاملے میں۔ لیکن بعض تقاضے ایسے ہوتے ہیں جن کی تعمیل کرنی ہی پڑتی ہے۔ ایسا ہی ایک تقاضا ان سطور کی نگارش کا باعث ہوا ہے۔ تقاضا اگر صاحبِ کلام کا ہوتا تو میں حسبِ معمول معذرت کر دیتا مگر خود کلام کا تقاضا ہے

اور اس کے لیے میرے پاس کوئی معذرت نہیں۔

اردو شاعری کی موجودہ صف طویل نہیں ہے اور اگر معیار بندی پوری طرح قائم رکھی جائے تو محدود سے چند اصحابِ ذوق سے شمار آگے نہیں بڑھتا۔ انھی اصحابِ ذوق میں مولوی اصغر حسین صاحب اصغر بھی ہیں جن کے کلام کا پہلا حصہ "نشاطِ روح" اور دوسرا حصہ "سرودِ زندگی" کے نام سے شائع ہو رہا ہے۔

کئی سال کی بات ہے انھوں نے اپنے کلام کا پہلا مجموعہ جو "نشاطِ روح" کے نام سے شائع ہوا تھا مجھے بھیجا تھا۔ اس وقت تک ان کا کلام میری نظر سے نہیں گزرا تھا۔ چونکہ وقت کی عام ادبی سرگرمیوں کی طرف سے طبیعت مایوسی کی عادی ہو چکی ہے اس لیے قدرتی طور پر جی کسی غیر معمولی دلچسپی کے لیے مستعد نہ تھا۔ میں نے بے دلی سے مجموعہ اٹھایا اور چاہا کہ ورق گردانی کرکے رکھ دوں۔ لیکن مجھے اس اعتراف میں تامل نہیں کہ جونہی دو چار شعر نظر سے گزرے میں چونک اٹھا اور جوں جوں مطالعہ کرتا گیا، میری تعجب انگیز مسرت بڑھتی گئی۔ میں نے محسوس کیا کہ وقت کی عام مایوسیاں مستثنیات سے خالی نہیں۔

میری نگاہ نکتہ چینی میں کمی نہیں کرتی۔ میں معیار کی پستی پر کسی طرح اپنے آپ کو راضی نہیں کر سکتا۔ اہلِ فن کو مجھ سے خوش گمانی کی نہیں بدگمانی کی شکایت ہے۔ تاہم میں محسوس کرتا ہوں جس شاعر کے کلام میں حسبِ ذیل اشعار موجود ہوں اس کی شاعری کی وقعت بحث و اثبات کی محتاج نہیں ہو سکتی ۔

قیدِ قفس میں طاقتِ پرواز اب کہاں
رعشہ سا کچھ ضرور ابھی بال و پر میں ہے

بنا سے درد و الم دور، غم کی لذت ہے
وہ رنگ عشق ہے جو آہ اثر کے لیے

نہ کی کچھ قدر افتادگی کی اقتضا میں نے
مجھے دیکھا کیے اٹھ کر غبارِ کارواں ہو کر

(تقریظ: سرودِ زندگی)

فانی بدایونی

"فانی کے یہاں فلسفہ طرازی، غم، تغزل اور لطفِ زبان سبھی کا امتزاج ہوتا ہے۔ اس دور میں غالب کی پیروی میں اگر کوئی صحیح معنی میں کامیاب ہوا ہے تو وہ فانی اور اقبال ہیں۔ اقبال نے نظم میں غالب کی رفعتِ تخیل اور بلاغتِ اسلوب کو، فانی نے غزل ہی کے میدان میں غالب کی تقلید کی۔ فانی کی زندگی الم سے عبارت ہے۔ یہ لوگ یہ کہہ کر فانی کی عظمت کو کم کرنا چاہتے ہیں کہ ان میں سوائے رونے اور بسورنے کے کچھ نہیں، وہ حق تلفی کرتے ہیں۔ فانی نے زندگی اور موت دونوں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر ان کے چہرے سے نقاب اٹھایا ہے۔ انھوں نے موت سے اس کی ہیبت اور پُراسرار کیفیت چھین لی ہے اور اسے زندگی کی طرح گوارا بنا دیا ہے۔"

(نئے اور پرانے چراغ)

جگر مرادآبادی

"جگر اس دور کے سب سے زیادہ مقبول اور مشہور غزل گو شعرا میں سے ہیں، ان کو لوگ مانیں یا نہ مانیں ان کے کلام پر سبھی سر دھنتے ہیں۔ جگر کے یہاں داغ، حسرت اور کچھ مومن کی شان پائی جاتی ہے۔ بعض کے نزدیک ان میں داغ کا رنگ کم اور حسرت کا رنگ زیادہ ہے۔ بجا ہے لیکن والہانہ انداز کے ایک ہیجانی اضطراب کی کیفیت نظر آتی ہے۔ جگر نے اردو غزل کو حافظ کی رنگینی و سرمستی پھر سے عطا کی، حسرت کے یہاں شگفتگی و شادابی ہے، جگر کے یہاں تغزل، تیزی، مگر اس

...ور کے تمام شعراء سے زیادہ سپردگی ...... اور سرمستی جگر کے یہاں ہے۔" (نئے اور پرانے چراغ)

جوش ملیح آبادی

"جوش ان شعراء میں سے ہیں جو نظم اور غزل دونوں پر یکساں قدرت رکھتے ہیں۔ اقبال کے بعد یہی غزل کو نظم کا تسلسل اور کاسا تاثر یا اس اور نظم کو غزل کی رنگینی اور شیرینی بخشنے میں کامیاب ہوئے ہیں۔ ان کے یہاں جگر سے زیادہ بلند آہنگی اور مردانگی پائی جاتی ہے۔ جگر کے یہاں رنگینی اور مستی زیادہ ہے۔ جوش کو شاعر شباب اور شاعر انقلاب کے نام سے اکثر یاد کیا جاتا ہے۔ نظموں میں انھوں نے بہت سے انقلابی مضامین نظم کیے ہیں مگر نظموں میں ان کی مدنیت یکساں موجود ہے۔"
(نئے اور پرانے چراغ)

فراق گورکھپوری

"ہمارے تمام شعراء میں فراق گورکھپوری سب سے زیادہ مغربی ادب سے واقف اور مغربی سانچوں سے آشنا ہیں مگر اس سے ان کی مشرقیت میں زیادہ تغیر حیات کی ایک مسلسل کوشش ملتی ہے اور یوں بھی انھیں اردو کا نقاد شاعر کہا جاتا ہے۔ فراق کے یہاں نفسیاتی تجزیہ بھی ہے ...... بھی۔ ان کی اکھڑی اکھڑی سی مگر منفرد زبان بھی ایک دلکشی رکھتی ہے مگر جس نزاکت شعار کی طرف وہ خود اشارہ کرتے ہیں، ابھی وہ نیم خوابیدہ سی ہے شاید وقت اسے بیدار کر دے۔"
(نئے اور پرانے چراغ)

اثر لکھنوی

"اثر اس وقت جس مقام پر ہیں وہ کافی بلند ہے۔

لکھنؤ کی شاعری میں ...... کی کمی ہے، یا خشک آہیں ہیں یا سرد فلسفہ، غالب کی تقلید بھی انھیں تصنع کی طرف لے گئی ...... تمام لکھنوی شعراء میں اگر کہیں بھی رنگینی اور سرشاری ملتی ہے تو عشق، یاس، ریاض اور اثر کے یہاں۔ ان کے یہاں قدیم رنگ کی پختگی ہے اور جدید رنگ کی سادگی۔ وہ بھی بدمست اور بے خود نہیں ہوتے، ان کی لطیف اور ہلکی چاشنی بھی مزا دے جاتی ہے۔"
(نئے اور پرانے چراغ)

یاس یگانہ

"لکھنؤ اسکول سے ردعمل کے طور پر ان کے یہاں بیچارگی کے خلاف بغاوت ضرور ملتی ہے مگر اسے صحت بخش نہیں کہہ سکتے۔ ان کے یہاں نہ وہ مردانگی ہے جو جوش میں ہے، نہ وہ رعنائی جو حسرت میں، نہ وہ نفاست جو اصغر کے یہاں ہے، نہ وہ مستی جو جگر کے یہاں ہے، نہ وہ ندرت جو اقبال میں ہے۔ غزلوں سے زیادہ یہ رباعیوں میں اور قطعات میں کامیاب ہوتے ہیں جہاں کوئی ایک خاص بات یا خاص اشارہ ہی کافی ہوتا ہے۔ ان کے یہاں قوت ایجاد کی کمی نہیں، انھیں کوئی کسی کا مقلد نہیں کہہ سکتا مگر ان کی سب سے بڑی کمزوری یہ ہے کہ انھوں نے خود ستائی ہی کو ...... سمجھ لیا ہے۔"
(نئے اور پرانے چراغ)

حفیظ جالندھری

"حفیظ کے یہاں آرزو اور اختر کی طرح گیتوں کا رسیلا پن پایا جاتا ہے۔ غزل میں ایک سادگی تو وہ تھی جو ترقی پسند نے بنائی، دوسری وہ جو حالی اور عظمت اللہ خاں کے اثر سے آئی۔ اس میں موسیقی کا زیادہ لحاظ، ہندی کے نرم اور شیریں الفاظ، بول چال کی زبان، لمبی لمبی بحریں نمایاں ہیں۔ حفیظ نے پہلے پہلے

گیتوں کے ذریعہ سے شہرت پائی مگر ان کی غزلوں میں بھی گیتوں کی سادگی اور شیرینی موجود ہے:"

(نئے اور پرانے چراغ)

سیماب اکبرآبادی

"سیماب اچھے شاعروں میں سے ہیں۔ وہ ان اکمل میں نہیں جو کوئی ذاتی آہنگ، کوئی نیا جذبہ، کوئی نیا احساس رکھتے ہیں مگر وہ خوش گو اور خوش فکر ضرور ہیں۔ ان کے یہاں خوشنما ترکیبیں بھی ہیں اور لطیف اور نرم جذبات بھی، مگر باوجود استاد ہونے کے کبھی وہ اقبال، کبھی جوش اور بعض وقت جگر کے شاگرد معلوم ہوتے ہیں۔ سیماب کے کلام سے اس دور کے تمام رجحانات معلوم ہو جاتے ہیں۔ انھوں نے ہر رنگ میں شعر کہے ہیں اور ہر جذبہ کی ترجمانی کی ہے۔"

(نئے اور پرانے چراغ)

کتابیات

میر، محمد تقی	نکات الشعراء
حمید الدین خواجہ اورنگ آبادی	گلشن گفتار
فتح علی حسینی گردیزی	تذکرۂ گردیزی
قائم، قیام الدین چاند پوری	مخزن نکات
شفیق، لچھمی نرائن	چمنستان شعراء
حسن، میر غلام حسن	تذکرۂ شعرائے اردو
علی ابراہیم خاں۔	گلزار ابراہیم
مصحفی، غلام ہمدانی	تذکرۂ ہندی۔ ریاض الفصحاء
لطف، مرزا علی	گلشن ہند
شیفتہ، نواب مصطفیٰ خاں	گلشن بے خار
نساخ، عبدالغفور خاں	سخن شعراء
آزاد، مولوی محمد حسین	آب حیات
عبدالحی، مولوی حکیم	گل رعنا
حالی، خواجہ الطاف حسین	مقدمہ شعر و شاعری
نیاز فتحپوری، نیاز محمد خاں	انتقادیات (حصہ دوم)
عبدالسلام ندوی	شعر الہند
حامد حسن قادری	تاریخ و تنقید
	طور کلیم

مسعود حسن رضوی ادیب، ڈاکٹر سید	نگار لکھنؤ، انتقاد نمبر ۱۹۴۲ء
کلیم الدین احمد	اردو شاعری پر ایک نظر
یوسف حسین خاں، ڈاکٹر	غزل (طبع اول)، روح اقبال
اعجاز حسین، سید	نئے ادبی رجحانات
سرور، آل احمد	نئے اور پرانے چراغ (طبع دوم)
احتشام حسین	تنقیدی جائزے
عبداللہ، ڈاکٹر سید محمد	بحث و نظر
عبادت بریلوی، ڈاکٹر	ماہ نو کراچی، فروری ۱۹۵۲ء
وقار عظیم، سید	ماہ نو کراچی، فروری ۱۹۵۲ء
ابواللیث صدیقی، ڈاکٹر	ماہ نو کراچی، جنوری ۱۹۵۲ء
باقر حسین، سید	ماہ نو کراچی، فروری ۱۹۵۲ء
فیض، فیض احمد	سرآغاز "خم کاکل"
سردار جعفری، علی	ترقی پسند ادب
عبدالقادر، سر	دیباچہ "بانگ درا"
مجنوں گورکھپوری	تنقیدی حاشیے
سہیل، اقبال احمد	تبصرہ "انشائے داغ"
آزاد، ابوالکلام	تقریظ "سرود زندگی"

سمپوزیم

اُردو غزل کا مستقبل

حصہ لینے والے :-

— چراغ حسن حسرت
— عبدالمجید سالک
— ابواللیث صدیقی
— وقار عظیم
— عبادت بریلوی
— حفیظ جالندھری
— حامد علی خاں
— صوفی تبسم
— احمد ندیم قاسمی
— سبط حسن
— احسان دانش
— ظہیر کاشمیری
— حبیب اشعر

اُردو غزل کا مستقبل

حفیظ جالندھری:- اچھا تو آپ پہلے یہ طے کر لیا جائے کہ غزل کیا ہے؟

چراغ حسن حسرت:- غزل کا آغاز دراصل قصیدہ کی تشبیب ہوا۔

صوفی تبسم:- شاید یہی وجہ ہے کہ بعض لوگوں کے نزدیک غزل قصیدہ ہی کی ایک قسم ہے۔

حامد علی خاں:- اس سلسلہ میں ہمیں دو خصوصیات کو پیش نظر رکھنا پڑے گا۔ ایک ترنم اور دوسری موضوع۔ غزل کا موضوع ایسے انسانی جذبات ہیں، جو داخلی طور پر ایک فرد کے ہیں۔ لیکن ان میں ایک آفاقیت ہے۔ وہ زیادہ سے زیادہ انسانوں کے دل کے تاروں کو جھنجھوڑتے ہیں۔ سب سے بڑا موضوع محبت ہے۔

ابو اللیث صدیقی:- یہ موضوع تو نظم کا بھی ہو سکتا ہے۔

حامد علی خاں:- غزل کے تمام اشعار کا موضوع ایک نہیں ہوتا۔ ہر شعر میں مختلف پہلو ہوتے ہیں۔ مثلاً ایک شعر میں نفرت ہو سکتی ہے۔ اور دوسرے شعر میں انتہائی اُلفت۔

حفیظ جالندھری:- نفرت بھی تو محبت ہی کا ایک پہلو ہے۔

حامد علی خاں:- لیکن اگر غزل میں ہجو بنانے کا طریقہ بتایا جائے تو وہ غزل نہیں ہو سکتی۔

حفیظ جالندھری:- اس کا ایک اپنا مزاج ہے۔

حامد علی خاں:- مگر یہ کہئے کہ ایک فرد اپنے تجربہ کو اس طرح پیش کرے کہ وہ سب کا تجربہ معلوم ہو تو وہ غزل ہے۔

صوفی تبسم:- صرف محبت کا تجربہ؟

حامد علی خاں:- یہ ضروری نہیں مثلاً اقبال کے ہاں حب وطن اور محبت کا ذکر کم ہے۔

حفیظ جالندھری:- اگر آپ اس بحث میں اقبال کی غزل کو لائیں گے تو ہم اپنی عقیدت کی وجہ سے اس سے الگ ہو جائیں گے۔

صوفی تبسم:- ہمیں کسی ترتیب سے چلنا چاہئے۔

ظہیر کاشمیری:- یہ ان فروعی باتیں ہیں۔ ہم تو بنیادی عناصر کا تجزیہ کرنے چلے ہیں جو اسے دوسری اصنافِ سخن سے علیحدہ کرتے ہیں۔

حامد علی خاں:- میں یہ کہوں گا کہ نظم میں ربط اور توضیح ضروری ہے۔ برخلاف اس کے غزل میں تسلسل نہیں ہوتا۔ غزل میں خیال کے اس عمل کو نہیں پیش کرتے جو CONCENTRATED ہے۔ اس کے مقابلہ میں نظم میں زیادہ کوشش کی ضرورت ہے۔ کلیم الدین احمد نے شاید اس لئے غزل کو نیم وحشی صنف سخن کہا ہے۔ میں سمجھتا ہوں ان کے خیال میں غزل میں عمومیت زیادہ ہے۔

ظہیر کاشمیری:- غزل کے ایک شعر میں مضمون ادا کر دیا جاتا ہے۔ لیکن نظم میں منطقی تسلسل ہوتا ہے۔ اور فکر کا دائرہ محدود ہوتا ہے۔

صوفی تبسم:- غزل کی پہلی خوبی اس کا ایجاز اور اختصار ہے۔

چراغ حسن حسرت:- تبسم صاحب نے درست فرمایا۔ ایجاز، اختصار اور رمز و کنایہ غزل کی خصوصیات ہیں۔

حفیظ جالندھری:- شاعر پورا جو کر رباعی کہتا ہے، اس لئے کہ دو مصرعوں میں خیال کو ادا نہیں کر سکتا تو چار مصرعے

کہتا ہے۔

احسان دانش: لیکن اُسے جو کچھ کہنا ہوتا ہے ۔ وہ پھر بھی صرف ایک ہی مصرع میں کہتا ہے اور باقی تین مصرعے اسے تمہیداً یا رسماً کہنے پڑتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ رباعی زیادہ مقبول نہ ہو سکی۔

چراغ حسن حسرت: ۔ اکثر نظمیں غزل کے ایک شعر کو پھیلا کر کہی گئی ہیں۔

ظہیر کاشمیری: ۔ غزل میں مرکزی ہم آہنگی فارم میں ہوتی ہے لیکن اشعار میں نہیں۔ ہر شعر بذات خود خیال کی اکائی ہوتا ہے ۔

سبط حسن: ۔ غزل کی صنف پر گفتگو کرتے وقت یہ محسوس کر رہا ہوں کہ ہمیں غزل کی جامع تعریف بیان کرنی چاہیئے ۔ اگر اس پر تاریخی نقطۂ نظر سے روشنی ڈالی جائے تو زیادہ بہتر ہو۔ غزل کی ایک مسلسل ارتقائی تاریخ ہے اور ہر دور میں تبدیلیاں ہوتی ہیں ۔ فارم کے علاوہ بحور بھی نئی ایجاد ہوئی ہیں۔

حامد علیخاں: ۔ فارم سے مراد علاحدہ ذہنیت ہے ۔ مطلع ، اشعار اور مقطع ـــــ یہ فارم ہے ۔

سبط حسن: ۔ میری مراد اس سے نہیں ۔ غزل فارسی زبان سے آئی ہے ، ہندی میں گیت اس سے پہلے موجود ہے ، جسے آپ غزل کا مزاج کہتے ہیں ۔ غزل عورتوں سے بات چیت کرنے کو کہتے ہیں ، ہو سکتا ہے کہ غزل میں ابتدا میں محبت کے جذبات بیان ہوتے ہوں ۔ اور بعد میں تصوف یا فلسفے کے مسائل شامل ہوئے ہوں ۔ اقبال تک آتے آتے اس میں بڑی بڑی تبدیلیاں آگئی ہیں ۔ علامتیں ، اشارات اور شکل کے علاوہ معانی بھی بدل گئے ہیں۔

حامد علیخاں: ۔ یہ فارم نہیں ۔ بلکہ اس کی ظاہری ہیئت فارم ہے ۔

حفیظ جالندھری: ۔ ہم نے فارسی سے فارم لی ہے ۔ عربی میں غزل نہیں تھی۔

چراغ حسن حسرت: ۔ یہ درست ہے کہ عربی میں غزل نہیں ہے ۔ لیکن قصائد میں تشبیب تو ہے ۔

حفیظ جالندھری: ۔ میری مراد یہ ہے کہ مضمون کو ادا کرنے کا یہ طریقہ یعنی پورے مضمون کو ایک اکائی میں بیان کرنے کا طریقہ کسی دوسری زبان میں نہیں تھا ۔

ظہیر کاشمیری: ۔ غالباً حفیظ صاحب غزل سے مراد LYRICAL THOUGHT لیتے ہیں ۔ اس وجہ سے بات اور سمت کو چلی گئی ۔

چراغ حسن حسرت: ۔ ہم غلط راستہ پر جا پہنچے ۔ غزل فارسی سے آئی ہے ۔ اور اقبال تک پہنچنے میں اس نے بڑی لمبی مسافت طے کی ہے ۔ سعدیؔ غزل کا استاد ہے ۔ سعدی کے ہاں موڈ کا تسلسل ہے ۔ زمانہ گزرتا گیا اور موڈ کا تسلسل کم ہوتا گیا ۔ حافظؔ کے ہاں بھی موڈ کا تسلسل ہے ۔ بعد میں ہر شعر الگ الگ ہونے لگا ۔

ظہیر کاشمیری: ۔ فارم کے لحاظ سے غزل دیگر اصناف سخن سے علیحدہ ہے ۔ جہاں تک خیالات کو کہنے کا تعلق ہے ۔ زمانہ کے عروج و زوال کے ساتھ اپنے اندر مختلف خیالات کو سموتی رہی ہے ۔

احسان دانش: ۔ یہ بات تو سارے شعر پر صادق ہو سکتی ہے

ظہیر کاشمیری: ۔ لیکن قصیدہ مر گیا ہے اور غزل زندہ ہے

احسان دانش: ۔ یہ بالکل درست ہے ، یہی ایک صنف سخن ہے جس میں ہم ایک شعر کے اختصار میں وسیع خیالات کو بند کرتے ہیں ۔ اور یہی اس صنف کی مقبولیت اور ہردلعزیزی کی وجہ ہے ۔

ابواللیث صدیقی: ۔ ہمیں بحث کو محدود کرنا چاہیئے موجودہ غزل کی فارم وہ ہے جو فارسی سے آئی ۔ ہمارے یہاں اردو میں امیر خسرو کی مثال فارسی کی بہ نسبت ہندی سے قریب ہے اور اس کی بعض غزلیں خسرو کی ہندی شاعری سے متاثر معلوم ہوتی ہیں رفتہ رفتہ غزل نے اپنی مخصوص انفرادیت کے ساتھ ترقی

کی تمیز میں سے گئی۔ وہ نظم کی ایک ایسی شکل ہے جس کے اشعار میں کوئی باہم ابطی ضروری نہیں اس کا موضوع محض محبت نہیں۔ محبت قصیدہ اور نظم کا موضوع بھی ہو سکتی ہے بلکہ اس کی روح وہ شدید قسم کی داخلیت ہے جس کے تحت شاعر اپنے جذبات اور احساسات کو اس انداز سے بیان کرتا ہے کہ وہ غم دوراں کا پرتو معلوم ہونے لگتے ہیں۔ یہ مطلب نہیں کہ غزل گو شاعر خارجی حالات سے متاثر نہیں ہوتا اثر وہ انہی سے لیتا ہے۔ لیکن اس کا انداز بیان اور اظہار کیفیت احساسات کے تابع ہوتا ہے جو اس تاثر کے بعد اس کے اپنے اندر پیدا ہوتے ہیں۔ اور یہی وہ کیفیت ہے جسے رمزیت یا اشاریت کے نام سے موسوم کیا گیا ہے ——

اس کی روح وہ شدید قسم کی داخلیت ہے جس کے تحت شاعر اپنے جذبات اور احساسات کو اس انداز سے بیان کرتا ہے کہ وہ غم جاناں و دوراں کا پرتو معلوم ہونے لگتے ہیں

ظہیر کاشمیری: اس سے مجھے اختلاف ہے۔ شاعر ([illegible]) مکمل طور پر داخلی نہیں ہوتا۔ خارجی بھی ہو سکتا ہے۔ بلکہ یوں کہئے کہ غزل کا تقاضا یوں ہوتا ہے کہ اس میں خیال کے عمل کو کسی (OBJECTIVE CORRELATIVE) انداز میں ظاہر کیا جائے۔

ابواللیث صدیقی: غزل کا یہ تقاضا ہرگز نہیں۔ لکھنؤ کی ساری غزلیہ شاعری داخلیت سے عاری ہے۔ آپ کو ایسی بہت سی غزلیں مل جائیں گی جن میں داخلیت قطعاً نہیں۔ لیکن ان میں تغزل کی کمی ہے۔

چراغ حسن حسرت: اگر یہ بحث اسی طرح جاری رہی تو غزل کے مستقبل کا فیصلہ نہ ہو سکے گا۔ ہمیں اب جلد از جلد تشبیب سے گریز کرنی چاہئے۔

(انتقہ)

حفیظ جالندھری: اب تک جو کچھ بحث ہوئی اس سے ہم اس نتیجے پر پہنچ چکے ہیں کہ شاعر جو کچھ کہتا ہے وہ (UNIVERSAL) ہوتا ہے۔ وہ اپنے محسوسات اور تجربے کو اس طرح بیان کرتا ہے کہ سننے والا یہ کہنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے اور غزل اس کی سب سے بڑی خصوصیت ہے جس کی رو سے ہر شعر ایک علیحدہ اکائی ہوتا ہے اور مختلف موڈوں کی نمائندگی کرتا ہے ہر شعر میں ایک خاص تاثر ہوتا ہے۔ جس کے بعد کوئی بات باقی نہیں رہتی۔ اگر وہ جائے تو اسے تشنج بند کہتے ہیں۔

صوفی تبسم: غزل کی سب سے پہلی خصوصیت غزل کو رنگینی بلکہ اس کی ایمائیت اور رمزیت اس کی سب سے بڑی جان ہے۔ جسے ابواللیث صاحب نے شدید داخلیت سے تعبیر کیا ہے۔ یہ ایمائی قوت جس شعر میں زیادہ سے زیادہ کار فرما ہوگی وہ شعر تغزل کی جان ہے۔

چراغ حسن حسرت: ـــ بہ رمز نکتہ ، ادائی کنم کہ خلوتیاں
سر بہ کشا وند و در فرد بستند
(نظیری)

صوفی تبسم: جذبے کا پھیلاؤ نظم ہے خواہ محبت کا ہو یا کوئی اور۔ یہی جذبہ جب سمٹ کر یا بقول ظہیر صاحب کنسنٹریٹ ہو کر غزل کے شعر میں آ جاتا ہے تو وہ غزل ہے، تغزل ایک اسلوب بیان ہے۔ دوسری بات جو سبط حسن نے کہی غزل اور تغزل میں ہر دور میں تبدیلی ہوتی رہتی ہے۔

ابواللیث صدیقی: یہاں ایک بات رہ گئی ہے جس کی طرف ابتدائی بحث میں سبط حسن صاحب نے اشارہ کیا تھا کہ غزل کی عام تعریف جو کی گئی ہے۔ عورت سے ہم کلام ہونا تو اس سے ایک مغالطہ پیدا ہو گیا ہے۔ شاعر فی الحقیقت اپنے آپ سے زیادہ ہم کلام ہوتا ہے۔

سلطان دانش: لوگ اس صنف کو غلطی سے صرف حسن و عشق کے معاملات بیان کرنے کا ذریعہ کہتے ہیں۔ دراں حالیکہ اس کی صحیح وجہ تسمیہ یہ ہے کہ جس احتیاط سے عورتوں کے ساتھ بات چیت کی جاتی ہے کہ انداز بیان میں اختصار ہو، شیرینی ہو، رچاؤ ہو، سلاست ہو، جامعیت ہو، وہی احتیاط غزل کا مزاج ہے۔

ظہیر کاشمیری: اس بحث سے اب تک ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ جہاں تک غزل کی فارم کا تعلق ہے تاریخ کے مختلف ادوار کے ساتھ ساتھ اس میں تبدیلی ہوتی رہی ہے۔ جہاں تک خیال کا تعلق ہے، یہ کلیہ نہیں بن سکتا کہ ماضی کے تصورات ہی غزل کے مزاج کا حصہ ہیں۔ دکنی اشعار بیک وقت داخلی اور خارجی حقیقتوں کی زندہ مثالیں ہیں۔

صوفی تبسم: مثالیں بھی تو دیجئے۔

ظہیر کاشمیری: گردن جھکا کر جام دینا، بہار مستی تو دیکھیں ہم
نظروں سے نکلے گا عکس مستی، ہوا کرے گی شراب پیدا

کوئی بھی خیال جب تک شاعر کی اپنی ذات کا حصہ نہیں بنتا اس وقت تک کسی اچھی تخلیق کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ بڑا اچھا غزل گو جب تک غم دوراں کو اپنی ذات کا حصہ بنا کر اور خارجی حقیقتوں کو اپنا کر پیش نہیں کرے گا۔ اس وقت تک کوئی با معنی شعر نہیں کہہ سکتا۔

ابواللیث صدیقی: یہ تو وہی داخلیت ہوئی۔

(خاموشی)

ابواللیث صدیقی: بحث نظم سے شروع ہو کر موضوع تک آگئی۔ میرے خیال میں اب یہ زیادہ مناسب ہوگا۔ کہ قلی قطب شاہ سے لے کر فیض تک غزل کے مختلف ادوار کا تجزیہ ہو جائے۔

سبط حسن: لیکن ہمیں تو اس کا مستقبل پیش کرنا ہے۔

ابواللیث صدیقی: جی ہاں، میں اسی سلسلہ کی تمہید کرنا چاہتا ہوں۔ پہلے دور میں امیر خسروؒ اور قلی قطب شاہ تک ریختہ کا دور رہا ہے۔ یعنی نصف ہندی اور نصف فارسی ملا کر شعر کہنا۔ یہ روایت ولی دکنی تک چلی گئی ہے۔ ولی سے فارسی کی شدت میں نمایاں کمی ہو گئی ہے۔ شاہ سعد اللہ گلشن نے مضامین اردو میں شروع کئے...... لکھنوی شعراء کے زمانے سے یعنی بیچ کے ادوار میں ایہام اور صنائع و بدائع کا دور رہا ہے اور اس دور کا موضوع محبت تھی۔ دلی تک کم و بیش یہی حال رہا۔ دوسرا اہم موضوع تصوف اور اس سے متعلق مسائل تھے اور تیسرا موضوع ذاتی غم تھا۔ جسے غم جاناں کہا گیا ہے۔ اور جو درحقیقت غم دوراں تھا۔ یہ تین بڑے موضوعات ہیں، جو غزل کے ہر دور میں نمایاں رہے ہیں اور اب اس کا معیار داخلیت ہے۔

ظہیر کاشمیری: بہرحال غزل ہر دور میں مختلف خیالات کی ترجمانی کرتی رہی ہے۔ اور غم جاناں کو غم دوراں بنا کر پیش کرنا اس کا حقیقی منصب قرار پایا ہے۔ جس میں رمزیت اور اشاریت اور ایہام کے باعث مزید کشش اور حسن پیدا ہو گیا ہے۔ اور جب تک جمالیاتی ذوق رکھنے والے اس رمزیت اور اشاریت سے لطف اندوز ہوتے رہیں گے۔ غزل کبھی نہیں مر سکتی۔

ابواللیث صدیقی: ظہیر صاحب نے جو الفاظ استعمال کئے ہیں ان میں مجھے ایہام سے اختلاف ہے۔ غزل میں ایہام کا صرف ایک ہی دور آیا ہے۔

صوفی تبسم: ایہام کو ظہیر صاحب غالباً ایمائیت کے معنوں میں استعمال کر رہے ہیں۔

حامد علی خاں: خوب، یہ بھی ہو سکتا ہے کہ آئندہ لفظ اور معنی بدل دئیے جائیں۔ (قہقہہ)

(خاموشی)

صوفی تبسم:۔ بہر حال جو جاذبیت غزل میں ہے اور جس کی بنا پر اس کے مقبول ہونے کا رجحان روز بروز بڑھ رہا ہے۔ اس سے انکار نہیں ہو سکتا۔ سوچ بچار کا مادہ بڑھ رہا ہے، سائنس کا دور، فکر طرازی، زندگی کی پیچیدگیوں کا بڑھنا، تعلیم کی نوعیت اور وقت کی تنگی میں ایجاز و اختصار پسندی کا بڑھتا ہوا احساس یہ سب چیزیں غزل کے حق میں بہت سازگار ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اقبال جیسا شاعر بھی جس نے نظمیں کہیں زیادہ اور غزلیں کہیں کم کہیں ہیں۔ اپنی نظموں میں اتنا زیادہ کامیاب نہیں جتنا کہ غزلوں میں ہے

احسان دانش:۔ غزل زمانے کی قید سے آزاد ہوتی ہے۔ اس کے اس میں ایک آفاقیت اور پائیداری ہوتی ہے۔ نظم کسی خاص ہنگامے یا تحریک کی بنیاد پر کہی جاتی ہے۔ اس لئے اس کی عمر مختصر ہوتی ہے

حامد علیخان:۔ غزل کی سب سے بڑی خصوصیت ایمائیت ہے جس میں آدمی لطیف اشاروں اور کنایوں میں وہ سب کچھ کہہ سکتا ہے جو وضاحت اور تفصیل کے ساتھ کہنے میں قابل گرفت ٹھہرایا جا سکتا ہے۔ مثلاً ایک سیاسی آدمی بھی اس مفہوم کو کہ   آج ہمارے اقتدار کی باگ ڈور مخالفوں کے ہاتھ میں ہے آج اپنی قسمت رقیب کے ہاتھ میں ہے۔ کہے گا۔ اور یہ قابل گرفت نہ ہوگا۔

صوفی تبسم:۔ الغرض محدود الفاظ، اشارات، اختصار، رمز و کنایات غزل کی جان اور حسن ہیں۔ اور آنے والا پیچیدہ دور اس کے لئے موزوں ہے۔ کئی سال ہوئے میں نے مولوی شرر مرحوم کی ایک نظم "شب غم" پڑھی تھی جو ایک سلسلے کی شکل میں تھی، حسرت صاحب نے ضرور دیکھی ہوگی اس وقت میرے اندر ادبی شعور بالکل بیدار نہ تھا۔ اس کے بعد میں نے غالب کا ایک شعر پڑھا

کہوں کس سے میں کہ کیا ہے شب غم بری بلا ہے
مجھے کیا برا تھا مرنا اگر ایک بار ہوتا

اگرچہ اس وقت میں بہت چھوٹا تھا اور تعلیم کے بالکل ابتدائی دور میں تھا لیکن میں نے سوچنا شروع کیا کہ یہ تمام طویل نظم جب غزل کے ایک شعر میں کہی جا سکتی ہے تو ایک نظم کی کیا ضرورت تھی۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس طرح سوچنے کا رجحان بڑھتا رہے گا۔

سبط حسن:۔ لیکن غزل کی افادیت کے راستے میں بعض دشواریاں بھی ہیں۔ غزل بڑے خیال کو اور تفصیلی تاثر کو پیش کرنے سے عاجز ہے۔ چنانچہ ادب کی پوری تاریخ شاہد ہے کہ جب بھی شاعر بڑے خیال کو ایک دو مصرعوں میں قید نہیں کر سکتا تو مثنوی یا قصیدہ کا سہارا لیتا ہے۔ بڑے خیالات کے لئے غزل کا دامن شاید کبھی ساتھ نہیں دے سکتی۔

صوفی تبسم:۔ گویا آپ کا مطلب یہ ہے کہ جہاں تجربہ وسیع ہو، وہاں غزل موزوں نہ ہوگی۔ میرے خیال میں کسی تجربے کا وسیع ہونا اس کی دلیل نہیں کہ اس کے بیان کے لئے جگہ اور پیمانہ بھی وسیع ہو۔ طویل تجربے چھوٹے پیمانے میں ادا ہو سکتے ہیں ——— حافظ کا شعر

بفراغ دل زمانے نظرے بماہ روئے

اس کی ایک عمدہ مثال ہے۔

ظہیر کاشمیری:۔ سبط حسن کے دلائل تو ٹھیک ہیں لیکن نیم درست ہیں۔ پھیلے ہوئے خیالات کو منطقی تسلسل کے ساتھ پیش کرنے کے لئے نظم ہے۔ لیکن اشاراتی انداز میں بات کہنے کے لئے غزل بہتر ہے اگر لوگوں کو فراغ نصیب ہو تو نظم کی کامیابی کا امکان زیادہ ہے۔ لیکن اگر معاشرہ بحران میں ہو تو غزل بہترین خادم ہو سکتی ہے۔

حفیظ جالندھری:۔ یہ افادیت کی بحث آگئی ہے۔ یہ تو ظاہر ہے کہ جس قسم کا معاشرہ سامنے ہو۔ اس کی بیک گراؤنڈ پیش کرنے اور لوگوں تک کچھ عملی تجاویز اور مقصدی خیالات پہنچانے کے لئے غزل کارگر نہیں ہو سکتی۔ وہاں آپ کو نظم کا پیرایہ اختیار کرنا ہوگا۔

چراغ حسن حسرت:۔ یہ درست ہے کہ غزل کی زبان اور استعلات کو عام لوگ نہیں سمجھ سکتے۔ شمع و پروانہ، فلک، گل و بلبل، صیاد و آشیانہ اور چمن وغیرہ اشارات سے عوام کے ذہن کو براہ راست متوجہ نہیں کیا جا سکتا۔ اگرچہ آہستہ آہستہ ایمائیت کا معیار بدل گیا ہے۔ لیکن ان میں تفصیلات کے اظہار کی تاب نہیں۔

سبط حسن:۔ میں تو سمجھتا ہوں کہ یہ صرف ایک نفری صنف ہے۔ مقصدی اور تعلیمی اغراض کے لئے شعراء کو ہمیشہ غزل کو ترک کرنا پڑا ہے۔ جب کوئی بڑا فلسفۂ حیات یا مسئلہ حیات پیش کرنا ہو تو نظم کہی جاتی ہے۔ جب بھی کوئی فکری مسئلہ درپیش ہو، وہاں آپ ایک نظم پڑھیں اور ایک غزل لیکن غزل سے ذہنی انقلاب ہرگز پیدا نہ ہوگا۔

ابو اللیث صدیقی:۔ افادیت کے معیار سے غزل اور نظم کی بابت آپ کے خیالات صحیح ہیں۔ نظیر تک غزل کے شباب کا دور رہا ہے۔ لیکن فکری مسائل کے لئے اس زمانے میں بھی شاعروں کو شہر آشوب لکھنا پڑے۔

حفیظ جالندھری:۔ اسے مانو، بھنو، بیٹھو، غزل میں نہیں کہا جا سکتا تھا۔

چراغ حسن حسرت:۔ حالی کی غزل "تذکرۂ دہلی مرحوم اے دوست نہ چھیڑ۔" داغ کے شہر آشوب سے زیادہ مؤثر ہے۔

ظہیر کاشمیری:۔ اس سے ہم یہ نتیجہ نہیں نکال سکتے کہ غزل میں تفکر نہیں۔ البتہ اگر تفصیل و دلائل کے ساتھ کوئی چیز بیان کی جائے تو اس کے لئے کوئی اور فارم اختیار کرنی ہوگی۔

حفیظ جالندھری:۔ میرا خیال ہے کہ جہاں زندگی اتنی گھٹ جائے کہ کچھ کہنے کی پابندی ہو وہاں غزل زیادہ کامیاب رہے گی کیونکہ وہاں کنایہ سے کام لینا پڑے گا۔

سبط حسن:۔ ہاں یہ ٹھیک ہے۔

چراغ حسن حسرت:۔ تاتاریوں کے عہد میں غزل زیادہ پھلی ہے۔

صوفی تبسم:۔ یہاں دو تین غزل گو شاعر موجود ہیں وہ اپنے تجربات بتائیں کہ کون سا موڈ ایسا ہوتا ہے جب وہ غزل کہتے ہیں اور کون سا ایسا جب وہ نظم کہتے ہیں۔

احمد ندیم قاسمی:۔ سبط حسن کی بات دہرانی پڑے گی فکری بحث کے پھیلاؤ کے لئے نظم اور کنایہ کیلئے غزل۔

حفیظ جالندھری:۔ مجھے جب غزل کہنی ہوتی ہے تو میں ہر ہر شعر کو ایک لمبی نظم یا گیت کی فارم میں سوچتا ہوں اور اسے دو مصرعوں میں کہتا ہوں۔

ظہیر کاشمیری:۔ ہیئت خیال کوئی چیز نہیں۔ خیال جب آتا ہے تو اپنے ساتھ سب کچھ لاتا ہے۔ بعض خیالات اس طرح آتے ہیں کہ ان کا اظہار غزل ہی میں لازمی ہوتا ہے اور بعض خیالوں کا عمل ایسا ہوتا ہے کہ غزل میں نہیں سماتا اور نظم کی فارم اختیار کرنی پڑتی ہے۔ خیال کا عمل ذہن میں فارم اپنے ساتھ لاتا ہے۔

سبط حسن:۔ یہ تو طے ہوا۔ اب ایک دشواری معنوی پابندیوں کی ہے۔ جس سے غزل کے مستقبل کا براہ راست تعلق ہے مثلاً قوافی، ردیف وغیرہ۔ یہ پابندیاں فضا کو مصنوعی بنا دیتی ہیں۔ کیوں کہ سارا خیال قافیہ کے تابع ہوتا ہے۔

ظہیر کاشمیری:۔ قافیہ اور ردیف کوئی ایسی چیز نہیں جو اظہار

کے بجائے پاٹر انداز ہوں۔ سارا قافیہ خیال کے تابع ہوتا ہے۔ شاعر جب خیال کے سندر پر شعر کہتا ہے۔ تو قافیہ اور ردیف کا تصنع معلوم ہی نہیں ہوتا۔

حفیظ جالندھری:۔ بہرحال غزل کامیاب رہے گی یہ ضرور ہے کہ یہ عوام الناس تک خیالات پہنچانے کے لئے نہیں۔

ظہیر کاشمیری:۔ جب تک شاعر غم عشق کو غم دوراں نہ بنائے گا اس وقت تک غزل زندہ نہیں رہ سکتی۔ جب وہ غم دوراں بنا کر کہے گا تو غزل ضرور زندہ رہے گی۔

حامد علی خاں:۔ جب تک یہی کہ ہم اپنی تخیل کو کسے نہ پیش کیا جائے۔ واقعی اس وقت تک غزل کا کوئی مستقبل نہیں۔

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اس نے کہا
میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

چراغ حسن حسرت:۔ ہر کامیاب شاعر ہر دور میں یہی کرتا رہا ہے۔ قدماء کی غزلوں کا جائزہ لیجئے جا بجا فقیہ شہر، واعظ، عالم دین اور امام کی مخالفت کی گئی ہے جس سے اس دور کی روایتی قیود و حدود کے خلاف بغاوت کا اظہار ہوتا ہے اس لحاظ سے حافظ سب سے بڑا باغی شاعر ہے جو ایک بناؤ اور بگاڑ کے ساتھ زندگی کی ترجمانی کرتا ہے۔

محمد طفیل:۔ اس کی کیا وجہ تھی کہ آج سے سترہ اٹھارہ سال پیشتر غزل کے مقابلے میں نظم کو زیادہ فروغ حاصل ہوا تھا۔

حفیظ جالندھری:۔ بعض اشتراکی شعراء نے مخالفت کی تھی۔

ظہیر کاشمیری:۔ بالکل غلط۔ مخالفت حالی، عظمت اللہ اور کلیم نے بھی کی ہے اور ان میں سے کوئی بھی اشتراکی نہیں۔ اس کی تہ میں بعض سماجی محرکات ہیں۔ جن میں مغربی علوم کی تعلیم کو سب سے زیادہ دخل ہے۔ مغربی ادب کی تقلید میں ہمارے شعراء اس صنف سخن کی اہمیت ہی کو نظر انداز کر بیٹھے تھے۔

احسان دانش:۔ دوسری بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ اس وقت ہمارے سامنے خاص خاص تحریکیں تھیں۔ جن کو چلانے کے لئے عوام تک APPROACH ضروری تھی اور اس کے لئے نظم کی فارم ہی موزوں ہو سکتی تھی۔ آج ہمارے سامنے مسائل ہیں۔ تحریکیں نہیں۔ تحریکیں ختم ہو چکیں۔ اس لئے نظمیں بھی ختم ہو چکیں۔ اب کوئی خاص مطمح نظر نہیں۔ اب تو موجودہ ماحول کی اصلاح اور اس کے عیوب و محاسن پر اشارات کافی اثر رکھتے ہیں۔ اور غزل ان کی متحمل ہو سکتی ہے۔ اس لئے غزل پھر زندہ ہو گئی ہے اور یہ اس لئے بھی زندہ رہے گی کہ اس میں زمانہ کا ساتھ دینے کی پوری پوری صلاحیتیں ہیں۔ اس لحاظ سے اس کا مستقبل بھی درخشاں ہے۔

محمد طفیل:۔ چند دن پہلے اردو غزل کے مستقبل پر چند ایک دوستوں کے درمیان گفتگو ہوئی تھی۔ اب چونکہ بعض احباب یہاں پھر جمع ہیں۔ اس لئے میں مناسب سمجھتا ہوں کہ اس موضوع پر تھوڑی سی اور باتیں ہو جائیں۔

وقار عظیم:۔ جب ہم غزل کے مستقبل کے متعلق سوال کرتے ہیں تو ہمیں کچھ تردد سا ہوتا ہے کہ اس کا مستقبل شاندار ہے بھی یا نہیں۔ لیکن اگر غزل کی موجودہ زمانے تک کی ترقی پر نظر ڈالی جائے تو یہ معلوم ہوگا کہ بہت سی روایتی خامیاں

رنگ کر دیا گیا ہے۔

احمد ندیم قاسمی:- اور اس نے کسی حد تک نئی چیزوں کو قبول بھی تو کیا ہے۔

عبدالمجید سالک:- یہ ٹھیک ہے کہ غزل ہر دور میں اپنے آپ کو دوسری اقدار کے ساتھ جس حد تک مطابقت دے سکتی تھی اس نے دی۔ اس کی فارم تعدد ون مسلمات اور روایات میں تو کوئی تبدیلی نہیں آئی لیکن معنوی حیثیت سے وہ اظہار نالی، تضاد اور ابہام کے دائرے سے نکل چکی ہے۔

وقار عظیم:- غزل میں دو باتیں اہم ہیں۔ جو اس دور میں بھی اور اس سے پہلے بھی ہمیں اس کے اندر ملتی ہیں کہ اس نے اپنے مزاج کی خصوصیات کو برقرار رکھتے ہوئے ہر زمانے کے مخصوص انداز کی ترجمانی کی ہے۔

عبدالمجید سالک:- غزل گو ہر دور میں زمانے سے متاثر ہوتا رہا ہے۔ اس دور میں اور اس سے پہلے بھی۔ مثلاً حافظ کے کلام میں آپ کو بیشتر خارجی انداز کی (OBJECTIVE) غزلیں بھی مل جائیں گی مثلاً

ایں چہ شوریست کہ در دور قمر می بینم

اس زمانے میں ملا، صوفی اور واعظ کی قسم کی چیزیں معاشرہ پر حاوی تھیں۔ اس کے کلام سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ وہ ان لوگوں سے گریز کر رہا ہے۔ اس لئے وہ حقیقتاً ترقی پسند شاعر تھا۔ وہ روایت کی مخالفت کرتا ہے۔ مذہب کی مخالفت کرتا ہے حتیٰ کہ وہ بادشاہوں پر بھی چوٹ کر جاتا ہے۔ صوفیوں اور مولویوں کو تو معاف ہی نہیں کرتا۔

احمد ندیم قاسمی:- بعض لوگ اعتراض کرتے ہیں کہ اس زمانے میں داخلی انداز کی شاعری ہوتی تھی اور اس دور کے شعراء نے تغیرات زمانہ اور ماحول کا کوئی اثر نہیں لیا۔ لیکن بعض مثالیں واضح طور پر یہ ظاہر کرتی ہیں کہ وہ حالات سے متاثر ہو کر اور اپنے تاثرات کو غم زمانہ بنا کر شاعری کرتے تھے اور یہی غزل کا صحیح مزاج ہے۔

عبدالمجید سالک:- جی ہاں۔ بالکل صحیح ہے۔ مثلاً یہ شعر ؎

ایں چہ شوریست کہ در دور قمر می بینم

قطعاً اس دور کے سیاسی حالات کا نہایت واضح تاثر ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے میں سوسائٹی UNSETTLED تھی اور سیاسی تغیرات کا اس پر اثر ہو رہا تھا۔

عبادت بریلوی:- شاعر غزل میں ان خیالات کا اظہار کرتا ہے جو خارجی حالات کے رد عمل کے نتیجے میں پیدا ہوتے ہیں۔ لیکن یہ ضروری نہیں کہ وہ ان کی ہو بہو ترجمانی کرے۔ غزل کا عام انداز رمزیت اور ایمائیت سے مطابقت رکھتا ہے۔ اور یہ رمزیت اور ایمائیت اس بات کی اجازت ہی نہیں دیتی۔ غزل کے اشعار میں بڑی نہیں ہوتی ہیں۔ جن کے اندر اس تمدنی اور ماحول کی عکاسی ہوتی ہے۔ غالب کی پوری شاعری اس کی مثال ہے۔ ان کا یہ شعر بظاہر عشقیہ معلوم ہوتا ہے۔

جوئے خوں آنکھوں سے بہنے دو کہ ہے شام فراق
میں یہ سمجھوں گا کہ شمعیں دو فروزاں ہو گئیں

کہنے کو یہ ایک انفرادی تجربہ معلوم ہوتا ہے لیکن اس میں ایک پوری تہذیب کی آواز شکست کی گونج سنائی دیتی ہے۔

احمد ندیم قاسمی:- غزل گوئی کا کمال یہ ہے کہ شاعر واقعات یا سانحات کا مشاہدہ اور آفاقی انداز میں پیش کرتا ہے اور [illegible] کہ وہ اس قسم کی شاعری کر سکتا ہے

شہاں کہ کحل جواہر تھی خاک پا جن کی
انھی کی آنکھوں میں پھرتے سلائیاں دیکھیں

عبادت بریلوی: میر تو غزل کے شاعر ہیں۔ انھوں نے تو اپنے زمانے کے حالات سے اس حد تک اثرات قبول کیے ہیں کہ غزل کا انداز تک بدل دیا ہے۔ اس زمانے کی تباہی کو سامنے رکھ کر انھوں نے نئے اشارے تک وضع کیے ہیں۔ ان کا یہ شعر

دل کی ویرانی کا کیا مذکور ہے
یہ نگر سو مرتبہ لوٹا گیا

دل کی ویرانی کو نگر کے لٹنے سے تعبیر کرنا حالات کے بہاؤ سے متاثر ہونے کا نتیجہ ہے۔

وقار عظیم: تو غزل کی روایت اصل چیز ہے اور ایک بڑے دور کے تاثر کو چند لفظوں میں بیان کر دینا ہی غزل کی خوبی ہے۔

خواجہ درد اپنے گوشے میں بیٹھے کہتے ہیں۔

کوہکن کو نہ چھیڑ اے پرویز
اس کے تیشے کی بھی زباں ہے تیز

عبادت بریلوی: اور اصغر کا شعر بھی تو اسی حقیقت کا آئینہ دار ہے۔

آلام روزگار کو آساں بنا دیا
جو غم ملا اسے غم جاناں بنا دیا

تو بہر حال غزل ایک روایت کا تسلسل ہے اور ایک تہذیب اور معاشرت کا تسلسل ہے۔ اور اپنی اسی خصوصیت کی بنا پر وہ آج تک زندہ ہے۔ یہ اور بات ہے کہ بعض اوقات ایسے حالات پیدا ہو جاتے ہیں جن سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ غزل اب ختم ہو جائے گی جیسا کہ آج سے کچھ عرصہ پہلے جب آزاد نظم کے عروج کے زمانے میں ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے اس کی فضا ارتقا ختم ہو گئی ہے لیکن پچھلے چند سال سے غزل کی مقبولیت پھر بڑھتی جا رہی ہے اور اب یہ احساس پھر ہونے لگا ہے کہ غزل بڑی اہم صنف سخن ہے اور ہمارے مزاجوں سے [illegible] رکھتی ہے۔

وقار عظیم: اس عارضی عدم تعلق کی وجہ غالباً یہ ہے کہ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ اس کی صلاحیتیں اس کا ساتھ نہیں دے رہیں۔ لیکن پھر وہ ساتھ دینے لگتی ہیں۔

عبدالمجید سالک: اور بعض بعض شعراء کی صلاحیتیں اتنی پختہ اور مخصوص ہوتی ہیں کہ ہم فوراً ان کے کلام سے ان کو پہچان لیتے ہیں۔

ان کے اشارات اتنے پختہ ہوتے ہیں کہ ہم فوراً کہہ دیتے ہیں کہ یہ ان کا کلام ہے۔ میں میراجی اور آزاد نظم والوں سے کہا کرتا ہوں کہ جہاں تمہیں شاہ عالمی دروازہ کہنا ہوتا ہے، وہاں تم دو ٹانگیں کہا کرتے ہو۔

(قہقہہ)

عبادت بریلوی: موجودہ دور کی غزل میں بعض نئے اشارے (Symbols) بھی پیدا کیے گئے ہیں اور پرانے اشارات کو نئے معنوں میں بھی برتا گیا ہے۔ علامہ اقبال کی جو غزلیں بال جبریل میں شامل ہیں وہ اس رنگ کی بہت اچھی مثالیں ہیں۔ اقبال کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے اس تجربے کے باوجود غزل کو غزل باقی رکھا ہے۔ اسی لیے ان کی غزلیں ایک امتیازی حیثیت رکھتی ہیں۔ انھوں نے غزل کو ایک نیا آہنگ دیا ہے۔ ان غزلوں سے یہ حقیقت ذہن نشین ہوتی ہے کہ غزل محدود نہیں ہے

وقار عظیم: یہ غزلیں اشارات اور رمزیت کی مقبولیت کا اثر ہے کہ اقبال کو بھی بعض اوقات کچھ رمز [illegible]

ہے کہ وہ تغزل کا رنگ نظم میں بھی اختیار کریں۔

عبدالمجید سالک:۔ حالی اور اقبال میں یہی فرق ہے۔ حالی خشک اور ناصحانہ انداز میں نظمیں لکھتے ہیں اور اقبال ان میں تغزل کا رنگ دیتے ہیں۔

عبادت بریلوی:۔ اقبال کا مزاج غزل کا مزاج ہے۔ در حقیقت اسی مزاج نے ان کی نظموں میں تغزل کو پیدا کیا ہے "ذوق و شوق" "مسجد قرطبہ" "شمع اور شاعر" اور "خضر راہ" اس کی بہت اچھی مثالیں ہیں۔ یہ سب نئی معنویت کی حامل ہیں لیکن ان میں تغزل ہے۔

عبدالمجید سالک:۔ یہ ٹھیک ہے کہ اشارات اور علامتیں پرانی ہیں۔ لیکن انھوں نے ان کو نئے معنی میں لیا ہے۔

وقار عظیم:۔ یہ خصوصیت تو ہر کامیاب شاعر کے ہاں ملتی ہے۔ مثلاً اکبر کے ہاں

وہ توڑتے ہیں تو کلیاں شگفتہ ہوتی ہیں
وہ روندتے ہیں تو سبزہ نہال ہوتا ہے
ستم کی کامیابی پر مبارک باد دیتا ہوں
یہ ان کی بدگمانی ہے کہ فریادی سمجھتے ہیں

حبیب اشعر:۔ جن لوگوں نے جان بوجھ کر سیاسی شعر نہیں لکھے ان کے کلام میں بھی ایسے اشارے ملتے ہیں۔ جو لوگ خالص غزل گو ہیں اور غزل کو صرف بازنان سخن گستن سمجھتے ہیں۔ ان کے کلام سے بھی ماحول کی ترجمانی ہوتی ہے اور تشبیہات کے پردے اٹھا کر دیکھیں تو ماحول کی عکاسی ملتی ہے۔

وقار عظیم:۔ نتیجہ یہ نکلا کہ قدیم اور جدید غزل گو شعراء غزل کے ذریعے اپنے زمانے کی عکاسی کرتے ہیں۔ اسی لئے آج بھی غزل کو مقبولیت حاصل ہے۔

احمد ندیم قاسمی:۔ الغرض غزل کا مستقبل درخشاں ہے اور جیسا کہ وقار صاحب نے ابتداء میں فرمایا تھا کہ جب ہم غزل کے مستقبل کے متعلق سوال کرتے ہیں کہ اس کا مستقبل شاندار ہے بھی یا نہیں تو ہمیں کچھ تردد سا ہوتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ آج سے دس پندرہ سال پہلے نظم گو عروج ہوا۔ جس کی وجہ مغربی شاعری کا اثر تھا۔ قافیہ اور ردیف کی پابندی کو برا سمجھا گیا۔ مثلاً کلیم کی کتاب، جوش کی نظمیں۔ یہ سب چیزیں لوگوں کے سامنے ہیں اور موجود ہیں ان کو دیکھ کر بھی لوگ بھٹکتے ہیں۔

عبادت بریلوی:۔ مشاعرہ باز شاعروں نے بھی غزل کو خراب کیا ہے۔ پڑھنے کا ڈرامائی انداز اور داد دینے کا رواجی طریقہ ان سب چیزوں نے غزل کی روح ختم کر دی۔ آپ نے اکثر دیکھا ہوگا کہ بہت سے اشعار مشاعروں میں بہت پر لطف معلوم ہوتے ہیں لیکن مشاعرے سے اٹھتے ہی ان میں کچھ بھی نظر نہیں آتا۔ غزل کی مخالفت کا ایک سبب یہ بھی

عبدالمجید سالک:۔ اقبال کہتے تھے۔ I HATE THE MUSHAIRAS THESE ARE CALCULATED TO VULGARISE LITERATURE

عبدالمجید سالک:۔ میں نے اپنی پہلی غزل لاہور میں ایک مشاعرہ میں پڑھی تھی۔ جہاں اقبال بھی موجود تھے اس کا قافیہ تھا۔ "دل میں" "ستاروں میں"۔ میں نے شعر پڑھا:

یہ کس کا نام لے کر جان دی بیمار الفت نے
یہ کس ظالم کا چرچا رہ گیا تیمار داروں میں

لوگوں نے بڑی داد دی لیکن ڈاکٹر اقبال خاموش رہے۔ اس طرح ساری غزل میں انھوں نے صرف دو شعروں کی داد دی لیکن ہم لوگوں کی داد پر نہ گئے۔ بلکہ ڈاکٹر صاحب کی داد کو معیار رکھا۔ اور نتیجہ یہ ہوا کہ بہت اشعار سے

ہماری جمعیت چھٹ گئی۔

حبیب اشعر:۔ ادب کی تاریخ میں بہت سے شاعروں کا ذکر آ جاتا ہے لیکن شاعروں کے لئے یہ مشاعرے معیار کبھی بھی نہیں رہے۔

عبادت بریلوی:۔ مشاعرے شعر کی معنویت کے کبھی معیار نہیں رہے۔ مشاعروں میں داد حاصل کرنے والے شعر کے لئے ضروری نہیں کہ وہ زندہ بھی رہے۔ بالکل یہی معیار خود غزل کا ہے۔ ایک اہم صنف ادب کی حیثیت سے وہ ضرور زندہ رہے گی۔

عبدالمجید سالک:۔ ایک بات جو نذیر صاحب نے غزل کے متعلق اس سے پہلے کہی تھی کہ غزل کو بعض تحریکات نے دبایا تو میں بیان کروں گا کہ ادب کو کبھی کسی تحریک سے خوفزدہ ہونے کی ضرورت نہیں۔ ادب برابر ادب اور ہر صنف خود اپنے زور پر زندہ رہتی ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ ادب تجربوں کے تسلسل کا نام ہے۔ اور ہم دیکھتے ہیں کہ غزل نے ابتدا سے اب تک اپنے مزاج کو کافی بدل لیا ہے۔ اب رفتہ رفتہ اس کی وہ ناہمواری ختم ہو رہی ہے جو پہلے کسی دور میں دخیل تھی کہ ایک شعر زمین کا ہے اور ایک آسمان کا۔ ایک میں زار نالی ہے اور دوسرے میں خوشی اور انبساط۔ آج کل غزل میں موڈ کے تسلسل کی رعایت کی جاتی ہے اور آئندہ کی غزل شاید اسی قسم کی چیز ہو۔

عبادت بریلوی:۔ اس قسم کی غزلیں قدماء کے ہاں بھی کافی ملتی ہیں۔ مثلاً میر و غالب کی بہت سی غزلوں میں یہ خصوصیت پائی جاتی ہے۔

حبیب اشعر:۔ بعض پرانے شعراء تو مسلسل غزلیں ہی کہتے تھے۔ مثلاً مصحفی، جرأت اور قطعہ بند بھی اسی کی ایک شکل ہے۔

عبادت بریلوی:۔ لیکن پرانے زمانے میں شعراء کو موڈ کی ہم آہنگی کا احساس بہت کم تھا۔ وقت کے ساتھ ساتھ جیسے جیسے شعور بڑھتا گیا۔ موڈ کی ہم آہنگی اور تسلسل کا یہ احساس بڑھتا گیا ہے۔ اس لئے جدید دور کی غزلیں پرانی غزلوں کے مقابلے میں اس اعتبار سے زیادہ اہم معلوم ہوتی ہیں۔

وقار عظیم:۔ مثلاً اس دور میں اگر فیض اور ناصر کاظمی کی غزلوں میں یہ خصوصیت کافی نمایاں ہو گئی ہے۔ فیض کی غزل۔

؎ ہم پرورشِ لوح و قلم کرتے رہیں گے

اور ناصر کاظمی کی غزل ؎

ہم نے دیکھے ہیں خزاں کے صدمے
ہم سے پوچھے کوئی افسانۂ گل

کا ہر شعر اگرچہ الگ ہے لیکن ملا کر پڑھئے تو اس میں ایک وحدت کا احساس ہوتا ہے۔

عبادت بریلوی:۔ جوش کی نظم نما غزلیں بھی اسی چیز کی آئینہ دار ہیں۔

وقار عظیم:۔ مومن کی غزل "تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو" اور حسرت کی غزل "آغازِ محبت کا زمانہ یاد ہے" کسی ایک واقعہ کی ترجمان معلوم ہوتی ہیں۔ اسی لئے ان میں ایک تسلسل کا احساس ہوتا ہے۔ اسے مسلسل غزل بھی کہہ سکتے ہیں۔

عبادت بریلوی:۔ لیکن مسلسل غزل موڈ کی ہم آہنگی سے بالکل الگ چیز ہے۔ موڈ کی ہم آہنگی کا مطلب یہ ہے کہ غزل کے تمام اشعار میں ایک خاص ذہنی کیفیت ہو۔ چاہے جذبات و کیفیات میں کتنا ہی تنوع ہو۔ مسلسل غزل کے لئے ضروری ہے کہ اس میں کوئی

خاص تاثر یا ذہنی کیفیت ایک ایسے تسلسل کے ساتھ بیان کی جائے جس کو تمام اشعار ایک وحدت کی صورت میں ظاہر کریں۔

[حب]یب اشعر:۔ یہ اسی چیز سے ملتی جلتی کوئی چیز ہے جسے قطعہ کہتے ہیں۔

[ع]بادت بریلوی:۔ جی ہاں۔

[و]قار عظیم:۔ غزل مسلسل کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ اگر اس کا ایک شعر نکال دیں تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ کوئی چیز کم ہے۔ لیکن ایک موڈ کی غزل میں یہ بات نہیں ملے گی۔

احمد ندیم قاسمی:۔ مسلسل غزل کے سلسلے میں ذاتی طور پر میں سوچتا ہوں کہ غزل کی یہ خصوصیت کہ ہر شعر اپنی جگہ مکمل ہو آئندہ برقرار بھی نہ رہ سکے گی۔ اور وہ نظم کے قریب قریب پہنچ جائے گی۔

عبادت بریلوی:۔ نظم اور غزل میں فرق ہمیشہ باقی رہے گا غزل کی تکنیک نظم سے بالکل مختلف ہے۔ غزل میں عموماً طور پر موڈ کی ایک وحدت ہوتی ہے لیکن اس کا ہر شعر بھی اپنی جگہ پر مکمل ہوتا ہے۔ یہ خصوصیت اس میں ہر حال باقی رہنا چاہیے ورنہ وہ یقیناً نظم ہو جائے گی۔

عبدالمجید سالک:۔ مسلسل غزلوں یعنی ایسی غزلوں کا تناسب جو ایک موضوع سے متعلق ہوں ——— موجودہ شعراء کے ہاں زیادہ نہیں۔ مرزا غالب کے ہاں زیادہ ہے۔

عبادت بریلوی:۔ نوجوانوں کے ہاں بھی مسلسل غزلیں کم ہیں۔ موڈ کی ہم آہنگی کی غزلیں زیادہ ہیں۔ فیض اور ناصر کاظمی کی غزلیں اس کی بہت اچھی مثالیں ہیں۔

حبیب اشعر:۔ ایسی غزلیں قدماء کے یہاں بھی ملتی ہیں۔

عبادت بریلوی:۔ میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ قدماء شعوری طور پر ایسا نہیں کرتے تھے۔ ان کے نزدیک ایسا کرنا ضروری بھی نہیں تھا۔ لیکن اس کے باوجود جذبے کی شدت اور خلوص نے اس صورت حال کو پیدا کیا ہے۔ میر کی غزلوں میں یہ خصوصیت سب سے زیادہ نمایاں نظر آتی ہے۔ مثلاً میر کی یہ غزل ؎

ابتدائے عشق ہے روتا ہے کیا — آگے آگے دیکھیے ہوتا ہے کیا
یہ نشانِ عشق ہیں جاتے نہیں — داغ چھاتی کے عبث دھوتا ہے کیا
سبز ہوتی ہی نہیں یہ سرزمیں — تخمِ خواہش دل میں تو بوتا ہے کیا
قافلے میں صبح کے اک شور ہے — یعنی غافل ہم چلے سوتا ہے کیا

غیرتِ یوسف ہے یہ وقتِ عزیز
میرؔ اس کو رائیگاں کھوتا ہے کیا

اس کی بہت اچھی مثال ہے۔ لیکن یہ تو ایک ایسی غزل ہے جس کے اشعار کم و بیش ایک ہی طرح کے خیالات اور جذبات و احساسات کے حامل ہیں۔ بعض غزلیں ان کے یہاں ایسی بھی ہیں جن میں خیالات اور جذبات و احساسات مختلف اور متنوع ہیں۔ لیکن اس کے باوجود ان میں موڈ کی ہم آہنگی پائی جاتی ہے۔ ان کی مشہور غزل ہے ؎

الٹی ہو گئیں سب تدبیریں کچھ نہ دوا نے کام کیا
دیکھا اس بیماریِ دل نے آخر کام تمام کیا
عہدِ جوانی رو رو کاٹا پیری میں لیں آنکھیں موند
یعنی رات بہت تھے جاگے صبح ہوئی آرام کیا
ناحق ہم مجبوروں پر یہ تہمت ہے مختاری کی
چاہتے ہیں سو آپ کریں ہیں ہم کو عبث بدنام کیا
سرزد ہم سے بے ادبی تو وحشت میں بھی کم ہی ہوئی
کوسوں اس کی اور گئے پر سجدہ ہر ہر گام کیا
کاش اب برقع منہ سے اٹھا دے ورنہ پھر کیا حاصل ہے
آنکھ مندے پر ان نے گو دیدار کو اپنے عام کیا

یہاں کے سپید و سیہ میں ہم کو دخل جو ہے سو اتنا ہے
رات کو رو رو صبح کیا اور دن کو جوں توں شام کیا

ساعدِ سیمیں دونوں اُس کے ہاتھ میں لا کر چھوڑ دیئے
بھولے اُس کے قول و قسم پر ہائے خیالِ خام کیا

ایسے آہوئے رم خوردہ کی وحشت کھونی مشکل تھی
سحر کیا، اعجاز کیا، جن لوگوں نے تجھ کو رام کیا

میر کے دین و مذہب کو اب پوچھتے کیا ہو اُن نے تو
قشقہ کھینچا، دیر میں بیٹھا، کب کا ترک اسلام کیا

یہ تمام اشعار مختلف خیالات اور متنوع جذبات و احساسات کے حامل ہیں۔ لیکن اس کے باوجود ان میں ایک وحدت پائی جاتی ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ سب کے سب ناکامی، حسرت اور مایوسی کے گرد گھومتے ہیں۔ اسی پس منظر نے اس غزل میں موڈ کی ہم آہنگی کو پیدا کیا۔

وقار عظیم:۔ جب آپ نے دوسری غزل کا ذکر کیا تھا تو میں یہ کہنا چاہتا تھا کہ آپ یہ اعتراض کریں گے کہ اس میں موڈ کی ہم آہنگی نہیں ہے۔ لیکن اس میں تو ہے۔

عبادت بریلوی:۔ ظاہر ہے میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اتنی متنوع ہونے کے باوجود اس میں ایک توازن بھی ہے۔

حبیب اشعر:۔ تمام مستند غزل گوؤں کے ہاں کم از کم موڈ کی وحدت ملتی ہے۔

عبادت بریلوی:۔ بے شک ملتی ہے لیکن اس کو محسوس کرنے کے لئے ایک مخصوص ذہنی اور جذباتی تربیت کی ضرورت ہے۔ غزل اسی تربیت کا تقاضا کرتی ہے۔ ہمارے بزرگ شعراء اس ہم آہنگی کو غزل کا لازمی جزو نہیں سمجھتے تھے بلکہ وہ [illegible] کہ شعر [illegible] ہے۔

عبدالمجید سالک:۔ میر کے یہاں کہیں کہیں یہ ہم آہنگی نہیں

بھی ملتی۔ مثلاً وہ غزل جس کا مطلع ہے

حفظِ آبروئے زاہد علامہ لے گیا
اک مغبچہ اتار کے عمامہ لے گیا

میر ہی پر کیا منحصر ہے، تقریباً تمام غزل گو شعراء کے یہاں یہ صورت حال ملتی ہے۔ میر کا شعر زیادہ عجیب معلوم ہونے کا سبب یہ بھی ہے کہ اس میں ایک شگفتگی پائی جاتی ہے۔ یہ شگفتگی میر کے یہاں بظاہر عجیب معلوم ہوتی ہے۔ شاید یہ اس حزن و یاس کا رد عمل ہے جو میر کے یہاں شیخ اور واعظ پر کہیں کہیں جو پھبتیاں ملتی ہیں۔ وہ اسی رد عمل کے اظہار کا نتیجہ ہیں۔ اس لئے یہ بھی اسی سلسلے کی کڑی معلوم ہوتی ہے لیکن بہر حال موڈ کی ہم آہنگی کا اس میں کوئی تعلق نہیں۔

وقار عظیم:۔ اس میں قافیہ پیمائی کو بھی بڑا دخل ہے۔ قافیہ کی کمی پوری کرنے کے لئے انہیں مجبوراً دو چار شعر زبردستی کے کہنے پڑتے تھے مثلاً اسی وزن پر علامہ ایک قافیہ تھا جسے باقی غزل کہنے کے بعد شاعر نے مطلع میں عمامہ کے ساتھ جوڑ دیا۔

عبادت بریلوی:۔ کہیں کہیں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قافیوں کی ایک فہرست پہلے سے تیار کر لی ہے اور اس کے مطابق شعر ڈھالے جا رہے ہیں۔

حبیب اشعر:۔ سہ غزلے اور چار غزلے یہ سب اسی قافیہ پیمائی کی پیداوار تھے۔

عبدالمجید سالک:۔ بعض بعض جگہ تو یہ احساس ہوتا ہے کہ وہ لوگ ARTIST نہیں تھے بلکہ ARTISAN تھے۔ اور شعر قافیہ کے مطابق ڈھالا کرتے تھے۔

عبادت بریلوی:۔ آتش نے تو اس کا اظہار کر دیا ہے

بندشِ الفاظ جڑنے سے نگوں کے کم نہیں
شاعری بھی کام ہے آتش مرصع ساز کا

شاعری کو یہ لوگ مرصّع سازی سمجھتے تھے۔ اس زمانے کا یہی معیار تھا۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ معنویت کا خیال ان کے پیشِ نظر نہیں تھا۔ وہ معنویت کا خیال بھی رکھتے تھے لیکن الفاظ کی اہمیت بھی ان کے نزدیک کم نہیں تھی۔ اور شاعری میں الفاظ کے استعمال کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ بات درحقیقت یہ ہے کہ قافیہ پیمائی وہیں پیدا ہوتی ہے جہاں جذبے کی شدت اور احساس کا خلوص نہیں ہوتا۔ غزل کے لئے یہ دونوں باتیں ضروری ہیں۔ اسی لئے غزل کے بارے میں امداد امام اثر نے وارداتِ قلبیہ اور رموزِ ذہنیہ کو ضروری قرار دیا ہے اور یہ سچ ہے اگر ایسا نہ ہو تو وہ قافیہ پیمائی بن جاتی ہے۔

عبدالمجید سالک: غزل کے لئے ریاضت ضروری ہے۔ غزل خلوصِ بیان کی چیز ہے۔

عبادت بریلوی: غزل میں واقعی ریاضت کی ضرورت تھی اور ہے۔ ہمارے نوجوان شعراء میں اس کی زبردست کمی محسوس ہوتی ہے اور اسی نے انہیں خراب کیا ہے۔ صرف چند غزلیں لکھ کر وہ سمجھتے ہیں کہ استاد ہو گئے۔ اسی وجہ سے ان میں سے بعض تو قافیہ پیمائی کی صلاحیت بھی نہیں رکھتے۔

عبدالمجید سالک: ان نوجوانوں کو پریس نے بھی بہت خراب کیا ہے۔ اچھا برا مطلب ہر بات سب ہی کا کلام چھپ جاتا ہے۔ نوجوان پہلی یا دوسری غزل کہنے کے بعد پریس کی طرف بھاگتے ہیں۔

وقار عظیم: غزل کی بحیثیت گہرائی اور گیرائی معنویت اور دیگر تقاضوں سے کامل عہدہ برآ ہونے کے لئے زبان پر عبور بہت ضروری ہے۔

عبادت بریلوی: صرف غزل ہی پر کیا منحصر ہے زبان پر عبور تو ہر صنفِ ادب کے لئے نہایت ضروری ہے۔ کولرج نے شاعری کے بارے میں جو (BEST WORDS IN BEST ORDER) کہا ہے وہ بالکل صحیح ہے۔ نوجوان شعراء کو اس طرف توجہ کرنے کی ضرورت ہے۔

عبدالمجید سالک: نظم و نثر کے جمالیاتی پہلو اور زبان دانی کی طرف اور بالخصوص شعراء کو واقعی توجہ دینی چاہئے۔ جس کی آج کل بے حد کمی ہے۔ حسنِ بیان، حسنِ زبان، حسنِ ترتیب ایک اچھے شاعر یا ادیب کی پہلی صفت ہونی چاہئے۔

وقار عظیم: اس گفتگو سے یہ خاص بات نمایاں ہوئی کہ ہمارے بہت سے نوجوان غزل گو اندازِ بیان اور زبان کی طرف توجہ نہیں کر رہے۔ اور اگر چند سال یہی حال رہا تو غزل ترقی نہیں کر سکے گی۔

عبدالمجید سالک: قدما ہر شاگرد کو دواوین کے مطالعہ کی نصیحت کرتے تھے۔ آج کل یہ چیز مفقود ہے۔ پھر اصلاحِ سخن کا رواج بھی ایسا نہیں رہا۔ یہ چیز غزل اور شاعری کے مستقبل کے لئے کوئی نیک فال نہیں۔

عبادت بریلوی: قدماء کے کلام کے مطالعہ اور موازنہ کے بغیر غزل کی روایت کا صحیح احساس پیدا نہیں ہو سکتا۔ غزل کا مزاج اور انداز اس کی مخصوص فضا اور مخصوص علامتی زبان اور بیان، اساتذۂ قدیم کے یہاں سب مطالعہ ہی سے پیدا ہو سکتی ہیں۔

وقار عظیم: اس کی بعض زندہ مثالیں موجود ہیں۔ ہمارے جدید شعراء میں جنہوں نے فارسی کا مطالعہ کیا ہے ان کے یہاں بھی رچی ہوئی غزلیں ہوتی ہیں۔ مثلاً ن۔ م۔ راشد۔

عبدالمجید سالک: لیکن راشد صاحب ایران جلدی

پہلے زیادہ اچھی فارسی ترکیبیں لکھتے تھے۔ (تعقد)

عبادت بریلوی: سالک صاحب کا یہ فرمانا بالکل صحیح ہے کہ غزل میں شاعری اور شاگردی کا سلسلہ ایک اچھا رواج تھا۔ اس سے مشق ہوتی تھی اور نوجوان محنت کرتے تھے۔ اس لئے اس کا ہونا آج بھی ضروری ہے۔ اگر ایسا نہ ہوا تو غزل ناتجربہ کاروں کی تختۂ مشق بنتے بنتے پست ہو جائے گی۔

عبدالمجید سالک: جی ہاں یہ بہت ضروری ہے۔ فی زمانہ نکاتِ سخن، اور رموزِ سخن کی قسم کی چند کتابیں موجود ہیں لیکن ان سے اتنا کچھ میں نہیں آتا جو اساتذہ کی اصلاح اور عملی ہدایات سے آ جاتا تھا۔ اور موجودہ شاعر تو ان کتابوں کو بھی نہیں پڑھتے۔

وقار عظیم: آج کل کے شاعر قدیم اساتذہ کو پڑھتے تو ہیں۔ اور بڑے معذرت کے ساتھ ان کے عنوانوں سے ان کے رنگ میں لکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔

عبادت بریلوی: بلکہ بعض اپنی غزلوں پر "بطرزِ میر" لکھ دیتے ہیں۔ حالانکہ میر سے انھیں کوئی نسبت نہیں ہوتی۔

عبدالمجید سالک: اسی لئے تو لکھنے کی ضرورت پڑتی ہے کہ وہ بطرزِ میر نہیں ہوتیں۔ اصل میں انھوں نے میر کو پوری طرح پڑھا نہیں ہوتا۔ حالانکہ اگر وہ میر کو پڑھ لیں تو میر کا طرز خود ہی پیدا ہو سکتا ہے۔

احمد ندیم قاسمی: موجودہ شعراء میں زبان کے علاوہ فکر کی کمی بھی ہے۔

عبدالمجید سالک: فکر کی کمی کا تو کوئی علاج ہی نہیں۔ یہ تو علم اور مطالعہ کی کمی سے پیدا ہوتی ہے اور مطالعہ اور علم سے استفادہ کرنا ہی اس کا ماحصل ہے۔

عبادت بریلوی: موجودہ دور کے شعراء کا اندازِ فکر ذرا مختلف ہے۔ سماجی اور عمرانی مسائل یہاں کے ہاں فکر کی کمی نہیں۔ ہاں مابعد الطبیعیاتی اخلاق اور فلسفیانہ انداز جو غالب کے ہاں پیشتر ہے۔ اس کی کمی ضرور ہے۔ ہمارے غزل گو شعراء کو سماجی اور عمرانی مشکلات کا احساس ہے اور بہت سے شعراء کے کلام سے تو معلوم ہوتا ہے کہ جیسے اپنے وقت کے سماجی حالات سے متاثر ہو رہے ہیں۔

حبیب اشعر: احساس تو ہے لیکن علاج اور حل ان کے پاس کوئی نہیں۔ ویسی روشنی جو اقبال کے کلام سے نظر آتی ہے۔ ان کے کلام سے نہیں حاصل ہوتی۔

عبادت بریلوی: اس کی وجہ یہ ہے کہ ابھی کوئی ویسا واضح نصب العین لوگوں میں پیدا نہیں ہوا جیسا کہ اقبال کے ہاں تھا۔

عبدالمجید سالک: اب تو جمہوریت ہر چیز کو تباہ کر رہی ہے۔ ادب، مذہب، سیاست، سب کو اس جمہوریت نے خاک میں ملا کر رکھ دیا ہے۔ اور یہی نصب العین کے فقدان کی ذمہ دار ہے۔

وقار عظیم: فراق جیسے شاعر کے ہاں بھی زندگی کی کشمکش کا احساس تو ہوتا ہے لیکن کوئی بڑی ہمہ گیری ان کے ہاں بھی نہیں۔

حبیب اشعر: اقبال کو بھی چھوڑیئے۔ اصغر کے ہاں رجا اور رحمت ہے۔

احمد ندیم قاسمی: مجھے اس سے اختلاف ہے۔ اصغر کے ہاں رجا بالکل نہیں بلکہ اپنے کو کھو دینے کا احساس ہے۔

عبادت بریلوی: میرے خیال میں یہاں غلط فہمی پیدا ہو رہی ہے۔ شاید حبیب اشعر صاحب کی مراد یہ ہے کہ اصغر کے یہاں جو ایک سرمستی پائی جاتی ہے اور ایک والہانہ انداز

نظر آتا ہے وہ غزل میں بالکل نئی چیز ہے۔ اصغر نے غزل کو بالکل ایک نیا انداز اور آہنگ دیا ہے۔ ان کی ساری شاعری میں پھول سے کھلے ہوئے نظر آتے ہیں۔

وقار عظیم:- اصغر کے ہاں یہ احساس پہلی بار ہوتا ہے۔

حبیب اشعر:- یہی میری مراد ہے۔

عبادت بریلوی:- حبیب اشعر جو بات کہہ رہے ہیں وہ صحیح ہے بعض نوجوان شاعروں کے ہاں ماحول کی قنوطیت کا اثر ہے مثلاً جذبی، ناصر کاظمی کی شاعری سے معلوم ہوتا ہے کہ ان پر غم حزن و یاس کے بادل چھائے ہوئے ہیں۔ شاید یہ سیاسی اور سماجی ماحول کا اثر ہے۔

وقار عظیم:- ماحول کی قنوطیت نے لوگوں پر بہت کچھ اثر کیا ہے۔ ملک کی تقسیم سے لوگ ادھر ادھر بٹ گئے اس قریب قریب ہر شاعر نے اس پر اظہار خیال کیا ہے مثلاً احسان کا یہ شعر ہے

میں دیوانہ بھلا مجھ کو مرے گھر ایں سبب دو
کریں پابند تو اب گلستاں ہو نہیں سکتا

اسی رجحان کی عکاسی کرتا ہے۔

عبادت بریلوی:- لیکن یہ قنوطیت سب کے یہاں نہیں ہے۔ جگر صاحب کے یہاں بھی یہ رجحان پیدا ہوا ہے لیکن اس رجحان کو پیش کرتے ہوئے وہ قنوطی نہیں ہوتے ان کے دو شعر مجھے یاد آ رہے ہیں ؎

کوئی کعبہ نہ سہی کوئے صنم خانہ سہی
خاک اڑانی ہے تو پھر کوئی بھی ویرانہ سہی
تشنہ لب ہاتھ پہ کیوں ہاتھ دھرے بیٹھے ہیں
کچھ نہیں ہے تو شکستِ خم و خمخانہ سہی

یہ اشعار گذشتہ چند سال کے سیاسی معاملات کو پیش کرتے ہیں لیکن ان میں رجائی نقطۂ نظر اور جارحانہ انداز ہے۔ پھر بھی یہ غزل کے شعر معلوم ہوتے ہیں۔

وقار عظیم:- یہ تو غزل کا رچا ہوا انداز ہے۔ اقبال کے متعلق جو کچھ ہم کہہ رہے تھے اس میں شخصیت اور کردار کو بھی بڑا دخل ہے۔ موجودہ دور میں اخلاقی اقدار کا کوئی احساس نہیں اس لئے اقبال کے ہاں جو پیغام ہے اور احساس کے ساتھ ملا ہوا ہے وہ موجودہ دور کے نوجوان شعراء میں اسی وجہ سے کم ملتا ہے۔

عبادت بریلوی:- ایک بات یہ بھی ہے کہ نوجوانوں کے شعور میں وہ ارتقائی کیفیت ہے جو اقبال کے یہاں تھی۔ نوجوان شعراء کی غزلوں میں اسی وجہ سے واضح نقطۂ نظر نہیں ملتا۔ حزن و یاس کی کیفیت بھی اسی لئے پیدا ہوتی ہے۔

عبدالمجید سالک:- شاید جس حزن کا ہمارے شعراء کے ہاں ملتی ہے وہ بھی عارضی ہے اس کے پیچھے فکر نہیں۔ اگر یہ عارضی نہ ہو تو یہ ملائکہ کا مجمع بن جائیں۔

(قہقہہ)

اقبال کے ہاں یاسیت و حرماں کہیں کہیں سارے کلام میں اندر رنگ موجود ہے

عبادت بریلوی:- لیکن اس کے باوجود یہ ضرور محسوس ہوتا ہے کہ نوجوان شعراء اپنے زمانے کے مسائل سے متاثر ہوتے ہیں۔ اور ان مسائل کو اپنی غزل کا موضوع بنا رہے ہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ اس میں فکر کی گہرائی اور شعور کی پختگی ہو۔ کیونکہ شاعری صرف جذبات کی پختگی کا نام نہیں ہے۔ جدید تنقید اس کے لئے فکر و شعور کو بھی لازمی قرار دیتی ہے۔ اگر ہمارے نوجوان شعراء نے اس جانب توجہ نہیں کی تو ان کی غزل میں گہرائی پیدا نہیں ہو سکے گی۔

سالک:- ایک بات یہ بھی ہے کہ اگر ان پر جو واردات ہوتا ہے اور یہ غم بھی کرتے ہیں تو اس کو بیان نہیں کر پاتے۔

جوش تو ملتی ہے۔ درد کا احساس بھی ہوتا ہے۔ لیکن صحیح اظہار کی صلاحیت نہیں۔

عبادت:۔ غزل کو نوجوان غزل گو شعرا سے یہ شکایت ہے کہ انھوں نے متفکرانہ انداز پیدا نہیں کیا۔ اس کے کئی اسباب ہیں۔ سب سے بڑا سبب تو یہ ہے کہ ماحول مدح کش ہے۔ نوجوان شعرا زندگی کی تلخیوں سے گھبراتے ہیں۔ انھیں برداشت نہیں کر سکتے۔ اس لئے ان کی زندگی اور ادب دونوں میں ایک فرار کی ذہنیت نظر آتی ہے۔ اس سال کی غزلیں بھی غم غلط کرنے کا ایک ذریعہ ہیں۔ وہ اسی میں ڈوبے رہتے ہیں۔

وقار:۔ اسے ہم مان بھی لیں کہ ابھی شاید ایسا ماحول نہیں جو فکر کے لئے سازگار ہو۔ تاہم فنی پہلو تو بہرحال لازمی ہے۔

سالک:۔ جیسا کہ عبادت صاحب نے فرمایا لوگ پڑھتے ہی نہیں۔ اور اسی لئے فکر کی کمی نظر آتی ہے

وقار:۔ اور شاید کچھ معاشی بدحالی بھی اس کی وجہ ہے۔

ندیم:۔ فکر کی کمی کا الزام موجودہ معاشی بدحالی پر نہیں ڈال سکتے۔ حافظ کا دور بھی ایسا ہی تھا۔ گذشتہ پندرہ سال میں ترقی پسند مصنفین نے اسے غلط ثابت کر دکھایا ہے۔

عبادت:۔ آپ بالکل درست کہتے ہیں۔ انسان کی بڑائی تو یہ ہے کہ ماحول کا اسیر ہو کر نہ رہ جائے۔ اس پر قابو حاصل کرنے کی کوشش کرے۔ جدید غزل گو شعرا کے لئے یہ ضروری ہے۔ ایسے شعرا بھی ہمارے یہاں موجود ہیں۔ جنھوں نے اسے صحیح ثابت کر دکھایا ہے۔

سالک:۔ لیکن کم ہیں اور ہر دور میں ایسا ہوتا ہے۔ پچاس ہزار شاعروں میں سے پانچ باقی رہ جاتے ہیں۔ باقی شعرا زندہ نہیں رہتے۔

عبادت:۔ غزل کی تاریخ سے یہ بات صحیح ثابت ہوتی ہے باقی رہنے والے وہی شعرا ہوتے ہیں جن کے یہاں زندگی کا شدید احساس اور حالات کا صحیح شعور ہوتا ہے۔ اور جو ان سب کو غزل کے انداز میں پیش کر سکتے ہیں۔

جیب اشعر:۔ اسی کو ایک عمومی انداز کہہ سکتے ہیں۔

سالک:۔ غزل کے لئے یہ عمومی کیفیت ضروری ہے۔

عبادت:۔ غزل میں فکر کے ساتھ بھی یہ عمومی انداز پیدا کیا جا سکتا ہے۔ جدید دور میں یگانہ کی شاعری اس کی بہت اچھی مثال ہے۔ فانی کے یہاں بھی اس کی کمی نہیں ہے

سالک:۔ یہ صحیح ہے لیکن جس زمانے میں آتش گزرے اس زمانے میں آتش ہی کیوں استاد مانے گئے۔ حالانکہ کئی اور شعرا تھے۔

اشعر:۔ بقائے اصلح

سالک:۔ بقائے اصلح ٹھیک ہے لیکن اس کے اسباب دیکھئے تو وہی تعلیم، فکر، مشق اور محنت کا فرق ہے۔

اشعر:۔ ہاں یہ ضروری چیزیں ہیں

سالک:۔ یگانہ، یزدانی کے یہاں یہ خصوصیات ملتی ہیں۔ لیکن ان کی طرف توجہ نہیں کی گئی۔

عبادت:۔ وقار صاحب نے ان پر ایک مضمون لکھا ہے۔

(قہقہہ)

وقار:۔ وہ جو سروائیول آف دی فٹسٹ کی بات ہے ہمیں تو آج کل کے سینکڑوں شعرا میں ایسا معیاری شاعر کون ہے۔ کوئی بھی نہیں۔ بلکہ میں تو یہ کہوں گا کہ ڈیا کریں ... سے تو [illegible] ٹھیک تھا۔

امیر مینائی اسی لئے سراغ لینے کی کوشش کرتے ہیں

سالک:۔ جی ہاں حتیٰ کہ ناس ہو گیا اتنے بڑے شاعر کا۔

وقار:۔ شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ ایک سیدھے سادے ...

عبادت:۔ امیر مینائی ضروری شاعر تھے لیکن ماحول نے ...

خراب کیا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ ماحول کے اسیر ہو گئے۔ لکھنؤ کے دورانِ قیام میں انھوں نے اپنے آپ کو طبعی شاعر کے رنگ میں رنگنے کی کوشش کی۔ قیصر باغ کی تعریف میں انھوں نے اس طرح کے شعر کہے۔

پاؤں کا یاں ذکر کیا صاف ہے ایسی زمیں
دل پھسلتے ہیں سرِ بازار قیصر باغ میں

رام پور میں انھوں نے داغؔ کی تقلید کی۔ اسی نے انھیں خراب کیا۔ کاش وہ صوفی رہتے۔

وقار:۔ یہ خیال بالکل ٹھیک ہے۔ لیکن ریاضؔ اس کے بالکل برعکس ہیں۔ وہ نیک آدمی تھے لیکن خمریات کے انھوں نے ایسے شعر کہے کہ جن کا جواب نہیں۔ حالانکہ کبھی شراب کو منہ نہ لگایا۔

عبادت:۔ نئے شعراء میں بھی خاص ذکر ہوا ہے۔ بعض شعراء ایسے بھی ہیں جو زندگی سے بھرپور غزلیں لکھتے ہیں اور انھیں دیکھ کر بڑی خوشی ہوتی ہے۔ بعض شعراء نے جذبات کے اظہار میں حالات سے ایسی مطابقت باقی رکھی ہے کہ معلوم ہوتا ہے بالکل ڈوب کر لکھا ہے۔ پوری سماجی طبقاتی الجھنوں کا بیان اور زندگی کے معاملات کا اظہار ان کے ہاں ملتا ہے۔ اسی احساس نے ان کی غزلوں میں غمِ جاناں کو غمِ دوراں سے ہم آہنگ کیا ہے۔ یہ جدید غزل کا سب سے اہم رجحان ہے اور اس رجحان نے اس کو حقیقت سے قریب کیا ہے۔

سالک:۔ یہی ان کی حقیقت پسندی نہیں معلوم ہوتی۔

وقار:۔ بہت سی باتیں اگرچہ غزل کے لئے اس حد میں سازگار نہیں لیکن بعض کرمیں ضرور دکھائی دیتی ہیں اور اسی لئے ہم کہتے ہیں کہ غزل کا مستقبل روشن ہے۔

عبادت:۔ جدید غزل نے بہت سے مسئلے کو غزل کی حقیقت سے قریب کیا ہے اور اسی سے ہم غزل کی ترقی اور اس کے آئندہ امکانات کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔

سالک:۔ حقیقت کی طرف آنا ہی غزل کی ترقی کا ثبوت ہے۔

عبادت:۔ بہرحال نوجوان شعراء بالکل گردن زدنی نہیں ہیں۔ انھوں نے غزل کو نکھارا ہے۔ اس کو زندگی سے ہم آہنگ کرنے کی کوشش کی ہے اور اس میں اظہار و بیان کی نئی راہیں نکالی ہیں۔

سالک:۔ لیکن نقادوں کو غافل نہیں رہنا چاہیے۔ کوتوالی ضرور کرنی چاہیے۔ (قہقہہ)

وقار:۔ سوچ اور فکر ضروری ہے۔ نوجوان شعراء کو چاہیے کہ وہ پوری روایت کو اپنے اندر جذب کریں اور بیان میں زور اور رچاؤ پیدا کریں۔

سالک:۔ زمانے کی رفتار کا ساتھ دینا چاہیے۔ اس وقت جو ذہنیت تن آسانی اور سہل انگاری کی ہے اسے ترک کرنا ضروری ہے۔ ہر صنف محنت چاہتی ہے۔

ندیم:۔ قدماء کی کوششوں سے استفادہ کرنا ضروری ہے۔ مجھے میر دردؔ کی ایک تشبیہ بہت ہی بھاتی ہے۔

جدھر گزرے ہے پھیلاتا ہے
آوازۂ کہسار ہیں ہم

ایسی چیزوں سے فائدہ اٹھانا ضروری ہے۔

وقار:۔ مجموعی حیثیت سے غدر کے بعد سے آج تک دیکھیں تو آج کل کے شعراء کے ہاں اکثر اچھے شعر ملتے ہیں۔

ندیم:۔ شاید اس لئے کہ پڑھنے والا اسی دور کا آدمی ہے۔

سالک:۔ وجہ یہ ہے کہ فکر ترقی کر گئی ہے۔

وقار:۔ بہرحال غزل امتحان سے گزر رہی ہے۔ اسے نئے طور سے برتنا چاہیے۔ غزل میں ایسی صلاحیتیں ہیں کہ وہ زمانے کا ساتھ دے سکے۔

عبادت:۔ غزل میں زمانے کا ساتھ دینے کی صلاحیت ہے اسی نے اس کو زندہ رکھا ہے۔ ہر دور میں غزل میں جو انقلاب انگیز تبدیلیاں ہوئی ہیں وہ اس کا زندہ ثبوت ہیں۔ تاریخ میں نئے اشاروں اور نئے کنایوں کی فراوانی ہے۔ اسی نے اس میں

نئی ... کو پیدا کیا ہے ... حالات سے مطابقت کی ہے۔ اقبال کے وقت سے اس کا آغاز ہوتا ہے جو جدید دور اور شعراء میں فیض، ندیم، ناصر کاظمی اور مجروح نے اس سلسلے میں اچھا کام کیا ہے۔

وقار:۔ جدید غزل ان کو کبھی فراموش نہیں کر سکتی۔

عبادت:۔ جدید غزل کا شعراء پر غلبہ کے باعث یکسانیت پیدا ہوگئی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ زیادہ ... نہیں ہوتے۔ ان کی حیثیت تسلسل کی سی ہوتی ہے جیسے تخلیقی کاوشوں کا سلسلہ خاص حد تک جاری رہتا تھا۔ ... میں شعراء چند غزلیں لکھ کر خاموش ہو جاتے ہیں۔

وقار:۔ یہ غزل ہی پر منحصر نہیں۔ افسانہ نگاروں کا بھی یہی حال ہے۔

عبادت:۔ اس کی وجہ شاید یہ ہے کہ حالات سازگار نہیں ہیں۔ ناسازگار حالات اعصاب کو مضمحل کر دیتے ہیں اور اس سے تخلیقی صلاحیتیں ختم ہو جاتی ہیں۔

وقار:۔ ایک وجہ یہ بھی ہے کہ نوجوان شعراء محنت نہیں کرتے۔ چند غزلیں کہہ کر اپنے آپ کو استاد سمجھ لیتے ہیں۔

سالک:۔ معاشی مشکلات بھی اس کا ایک سبب ہیں۔ یہ سب ہیں مگر ... کی تخلیق پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ برنارڈ شا کی مثال ہمارے سامنے ہے۔

عبادت:۔ لیکن اس کے باوجود جدید غزل کا یہ سب سے بڑا کارنامہ ہے کہ اس نے اپنے ماحول کی عکاسی کی ہے اور اس طرح ایک نئی معنویت کو پیدا کیا ہے۔ حالات اور ماحول کے باوجود اس میں زندگی کو سمجھنے اور اس کو برتنے کی خواہش نمایاں نظر آتی ہے۔ اصغر نے اس کا اظہار بھی کیا ہے:

غزل کیا اک شرارِ معنوی گردش میں ہے اصغر
یہاں افسوس گنجائش نہیں ... یا ... کی

ندیم:۔ یہاں مجھے اپنا ایک شعر یاد آ رہا ہے:

ہم نے ہر غم سے نکھاری ہیں تمہاری یادیں
ہم کوئی تم سے جو وابستہ غم بھی نہ ہوئے

عبادت:۔ زندگی کو بہتر بنانے اور اس سے بیزار نہ ہونے کا جذبہ جو آج جدید غزل میں پایا جاتا ہے اس کی تربیت سب زیادہ فیض کے یہاں ملتی ہیں۔ ان کے اس شعر میں:

گراں ہے دل پہ غمِ روزگار کا موسم ... ہے آزمائش حسنِ نگار کا موسم
غمِ روزگار کر آزمائش حسنِ نگار کا موسم کہ اس خیال کی کیا قیمت ہوتی ہے۔ اس اعتبار سے جدید غزل قدیم غزل سے آگے نظر آتی ہے اور یہی ثبوت ہے کہ وہ آگے بڑھ رہی ہے اور آئندہ بھی آگے بڑھتی جائے گی۔

سالک:۔ غزل کی زندگی کا یہی ثبوت ہے۔ جو صنف انقلاب کا مقابلہ کرنے کی سکت رکھتی ہو اس کا کوئی کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ وہ زندہ رہے گی۔

عبادت:۔ غزل نے انقلاباتِ زمانہ سے اپنے آپ کو ہم آہنگ کیا ہے۔ اس میں تجربے بھی ہوئے ہیں۔ لیکن ان تجربات میں انتہا پسندی نظر نہیں آتی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ غزل کی صنف انتہا پسندی کو روا نہیں رکھتی۔ نظم میں جو تجربات ہوئے ہیں ان کا عکس غزل میں نہیں ملتا۔ لیکن تجربات ہوئے ضرور ہیں۔ یہ تجربات نئی اصطلاحیت، نئی ایمائیت، نئے الفاظ اور نئے آہنگ کی صورت میں نظر آتے ہیں۔

سالک:۔ نئے الفاظ اور آہنگ میں ہندی کی بحروں کو بھی خاصا دخل ہے۔ اس طرف خصوصیت کے ساتھ توجہ کی ضرورت ہے۔

عبادت:۔ بحروں کے استعمال کا شعور موجودہ دور کی غزل میں بہت بڑھا ہے۔ ہندی کی بحروں کے استعمال میں خاصے تجربے کئے گئے ہیں۔ موضوع کی مناسبت سے بحریں استعمال کی گئی ہیں۔

سالک:۔ اس بحث سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ غزل ترقی کر رہی ہے اور آئندہ بھی اس کے لئے ترقی کا امکان ہے۔ لیکن نقادوں کو غافل نہیں رہنا چاہئے۔

شعرائے متغزلین

شیخ محمد اسماعیل پانی پتی

جن جن شعرائے کرام کی غزلیں "غزل نمبر" میں شائع ہوئی ہیں ان کے مختصر حالات زندگی جس وقت مجھ سے مرتب کرنے کیلئے مدیر صاحب "نقوش" نے فرمائش کی تو میں نے اسے معمولی کام سمجھ کر حامی بھر لی لیکن جس وقت کام کرنے بیٹھا تو معلوم ہوا کہ کام اتنا آسان نہ تھا جتنا میں سمجھا تھا۔ بیسیوں تذکروں، تاریخوں، رسالوں اور اخباروں کو الٹنا پلٹنا پڑا۔ تب جا کر چھ ماہ کی مدت میں کچھ حالات جمع ہو سکے میں نے اپنے دوستوں اور کرم فرماؤں سے بھی اس کام میں مدد لی اور خود بھی یونیورسٹی لائبریری اور پنجاب پبلک لائبریری کے چکر لگائے اور جہاں سے جو کچھ ملا جمع کرتا رہا۔ بعض شعراء جن کے حالات کہیں لکھے ہوئے نہ مل سکے ان سے خود بھی ملا اور اپنے احباب کو بھی ان کے پاس بھیجا۔ تب جا کر بہت تگ و دو اور تلاش و جستجو کے بعد میں یہ حالات قارئین کرام کی خدمت میں پیش کرنے کے قابل ہو سکا۔ اب بھی اگر کسی محترم بزرگ کے حالات اس میں آپ کو نظر نہ آئیں تو اس کی وجہ صرف یہ سمجھیں کہ مجھے باوجود کوشش کے ان کے حالات دستیاب نہیں ہو سکے۔

میں نے اس تذکرہ کے مرتب کرنے میں اگرچہ بہت اختصار سے کام لیا ہے مگر اس امر کو ضرور ملحوظ رکھا ہے کہ اختصار میں بھی جامعیت پیدا ہو جائے اور کسی شاعر کے حالات میں سے کوئی اہم اور ضروری بات چھوٹنے نہ پائے۔ جہاں کسی شاعر کے سنہ پیدائش یا کسی واقعہ کے بیان میں اختلاف تھا وہاں حتی الامکان تلاش و تحقیق کر کے ٹھیک سنہ یا درست واقعہ اس تذکرہ میں درج کیا گیا ہے۔ اس طرح یہ اوراق ایک جدید تذکرۂ شعراء کے حامل بن گئے ہیں جو امید ہے کہ شعر و سخن کے شائقین اور شعراء کے تذکروں کے طالبین کے لیے اچھے مواد کا کام دیں گے۔

میں نے اس تذکرہ کی ترتیب شاعروں کے تخلص کا خیال رکھتے ہوئے حروف تہجی کے لحاظ سے رکھی ہے یعنی آپ کو جس شاعر کا حال دیکھنا ہو اس کا بیان شاعر کے تخلص کے لحاظ سے دیکھیں نہ کہ نام کے لحاظ سے اور اس تخلص میں حروف تہجی کی ترتیب کا خیال رکھیں۔ ترتیب کی بعض اور صورتیں بھی پیش نظر تھیں مگر تخلص کے لحاظ سے حروف تہجی کی ترتیب ہی نسبتاً آسان اور بہتر معلوم ہوئی اس لیے وہی اختیار کی گئی۔ امید ہے کہ ناظرین بھی اس ترتیب کو پسند فرمائیں گے البتہ اس کے تین حصے ہیں۔ پہلے حصہ میں پرانے شعراء، دوسرے میں متوسطین اور تیسرے میں وہ جو باقی رہ گئے تھے۔

حالات شعراء کی فراہمی کے سلسلہ میں یہ آخری بات بھی عرض کر دوں کہ میں نے شعرائے کرام کے سوانح تلاش کرنے میں بڑی

سے کوشش کا کوئی دقیقہ باقی نہیں چھوڑا اور بغیر اس خیال کے کہ کسی شاعر کا حال تلاش کرنے میں کتنا وقت خرچ ہوتا ہے، اس کام کو کیا ہے۔ قدیم اور مشہور شعراء تو تقریباً سب آ گئے اور ان کے کم و بیش حالات مل گئے۔ بالکل جدید اور موجودہ شعراء کے حالات فراہم کرنے کی بھی انتہائی سعی کی گئی مگر افسوس ہے کہ اس کوشش میں سو فی صدی کامیابی نہیں ہوئی اور بعض کے حالات دستیاب نہیں ہو سکے جس کے لیے میں ان سب احباب سے معذرت خواہ ہوں کیونکہ ان کے سوانح نہ کسی جدید تذکرۃ الشعراء میں مل سکے نہ کسی اور ذریعے سے حاصل ہو سکے اس لیے میں باوجود خواہش کے ان کو اس تذکرہ میں شامل کرنے سے قاصر رہا۔

آبرو :- نجم الدین نام عرف شاہ مبارک تخلص آبرو۔ درویش منش، قلندر مشرب اور حسن پرست انسان تھے۔ سراج الدین علی خاں آرزو کے شاگرد ہیں۔ وطن گوالیار تھا۔ طبقۂ اول کے مشہور شعراء میں سے ہیں۔ صاحبِ دیوان تھے لیکن کلام تلف ہو گیا۔ لچھمی نرائن اورنگ آبادی نے اپنے تذکرہ چمنستانِ شعراء میں ان کے بہت سے اشعار تلاش کر کے نقل کیے ہیں۔ ۱۱۴۶ھ میں بہ عہد محمد شاہ بادشاہ دہلی وفات پائی۔

آتش :- خواجہ حیدر علی نام، خواجہ علی بخش کے بیٹے تھے۔ آبائی وطن دہلی۔ نانہالی بزرگوں کے والدین ترک وطن کر کے فیض آباد چلے گئے تھے اور وہیں ان کا انتقال ہو گیا۔ پیری مریدی کا سلسلہ کرتے تھے۔

والد کی وفات چونکہ صغر سنی میں ہو گئی تھی اس لیے باقاعدہ تعلیم نہیں پائی۔ بڑے ہو کر نواب میر محمد تقی کی سرکار میں سپاہی بھرتی ہو گئے جو ان کو لکھنؤ کے قریب لکھنؤ میں لے آئے۔ اس کے بعد انھوں نے ساری عمر اسی شہر میں گزار دی۔ یہیں مصحفی کی شاگردی کی اور شاعری میں نام پیدا کیا۔ سرکار اودھ سے اسّی روپیہ ماہوار وظیفہ ملتا تھا جو پورا چار دن بھی نہ رہتا اور مہینے کے باقی دن قرض پر گزارا چلتا تھا۔ مزاج میں توکل کچھ ضرورت سے زیادہ ہی تھا۔ جو کچھ آتا خرچ کر دیتے اور کل کے لیے کچھ بچا کر نہ رکھتے۔ ننگے بدن صرف ایک لنگوٹ باندھے سارا دن ایک جھونگے پر تکیہ لگائے بیٹھے رہتے تھے۔ ایک ٹوٹا پھوٹا مٹی کا حقہ سامنے رکھا رہتا تھا۔ جو آتا اس کے سامنے یہ حقہ پیش کر دیا جاتا۔ بھنگ کا بھی شغل جاری رہتا تھا۔ خوب گھٹتی تھی اور خوب پی جاتی تھی۔ وضع سپاہیانہ تھی جب مشاعرہ میں غزل پڑھنے جاتے تو تلوار میان سے دو انگل باہر رہتی تھی۔ ۱۱۷۰ھ (بقول صاحب مراۃ الشعراء ۱۱۸۰ھ) میں پیدا ہوئے اور ۱۲۶۳ھ میں انتقال کیا۔ دو دیوان چھوڑے جو تقریباً ساڑھے آٹھ ہزار اشعار پر مشتمل ہیں۔ بعض نامور شاگرد رہے تھے۔ سید محمد خاں رند، میر وزیر علی صبا، میر دوست علی خلیل، ہدایت علی خلیل، مرزا ہدایت علی قبول اور پنڈت دیا شنکر نسیم۔

اثر :- شمس العلماء نواب امداد امام اثر، ۱۷ اگست ۱۸۴۹ء کو پٹنہ میں پیدا ہوئے۔ عربی و فارسی اور انگریزی زبان کے فاضل تھے۔ ان کی شاعری فطری جذبات اور حکیمانہ مسائل سے معمور ہے۔ دیوان چھپ چکا ہے۔ بڑے معرکے کی ایک کتاب کشف الحقائق کے نام سے بھی لکھی ہے۔ انتقال کی تاریخ معلوم نہیں ہو سکی۔

میر اثر: سید محمد میر المتخلص بہ اثر۔ خواجہ میر درد کے چھوٹے بھائی تھے اور فقیری اور شاعری دونوں میں اپنے بھائی کے پیرو اور مرید۔ کلام اگرچہ صاف اور سادہ ہے مگر درد و اثر میں میر درد کے برابر نہیں۔ مولوی عبدالحق ان کے متعلق لکھتے ہیں "یہ مضمون کو دیکھئے تو اس میں تصوف ہے نہ اخلاق، نہ حکمت ہے نہ فلسفہ بلکہ سچے دل کی واردات ہے جو صاف صاف سیدھے الفاظ میں اس طرح بیان کر دی ہے جیسے کوئی باتیں کرتا ہو۔" دیوان اثر کو مولوی عبدالحق نے مع مقدمہ کے انجمن ترقی اردو کی جانب سے شائع کر دیا ہے ان کی مثنوی خواب و خیال بھی انجمن نے شائع کی ہے۔

احسان: منشی احسان علی خاں المتخلص بہ احسان۔ بریلی کے رہنے والے تھے۔ ان کے والد ترک وطن کر کے شاہجہانپور (یو۔پی) آ گئے تھے۔ جلال لکھنوی کے شاگرد تھے۔ شاہجہانپور کی عدالت میں مختار تھے۔ ارمغان کے نام سے ایک ماہوار رسالہ بھی جاری کیا تھا۔ ۱۸۵۵ء میں بمقام اوٹار (ضلع بریلی) پیدا ہوئے اور ۱۹۱۲ء میں انتقال کیا۔ کشمیر کے مؤرخ منشی محمد الدین فوق انہی کے شاگرد تھے۔

بتکدۂ خیال ان کے دیوان کا نام ہے۔ شاہجہانپور کی تاریخ بھی لکھی تھی۔ فن تشبیہ پر ایک رسالہ موسوم بہ شبیہ یار بھی تصنیف کیا تھا اور اپنے گلدستہ ارمغان کے ساتھ بالاقساط چھاپا تھا۔

شعر و سخن کا شوق ۱۶ سال کی عمر سے ہو گیا تھا۔ پہلے شاہجہانپور میں حافظ نثار احمد خاں ثاقب کے شاگرد ہوئے۔ پھر حکیم میر ناصر علی جلال کے، پھر دکن جا کر داغ کی شاگردی اختیار کی۔ لالہ سری رام مؤلف خمخانۂ جاوید ان کے متعلق لکھتے ہیں: "عربی کی لیاقت قدر ضرورت اور فارسی کی استعداد زبردست ہے۔ آپ کے اشعار عیوب و اسقام سے مبرا اور پاک ہوتے ہیں۔ بلندی مضمون و شیرینی زبان کلام میں دلچسپی پیدا کرتی ہیں۔ طبیعت غزل گوئی کی طرف زیادہ مائل ہے۔ گو چند قصیدے بھی لکھے ہیں۔"

احسن مارہروی: سید علی احسن المتخلص احسن اردو زبان کے نہایت کامیاب مصنف۔ اعلیٰ پایہ کے ادیب، زبان کے ماہر، قادر الکلام سخنور اور کامل الفن استاد تھے۔ بہت سی کتابوں کے مصنف ہیں جن میں تاریخ نثر اردو نہایت مفید اور بلند پایہ کتاب ہے۔ تحفۂ احسن کے علاوہ اور کوئی مجموعہ کلام شائع نہیں ہوا۔ یہ کتاب بھی انھوں نے بچوں کے لیے لکھی تھی جس میں اردو ضرب الامثال کی کہانیوں کو نظم کیا گیا ہے۔ ۹ نومبر ۱۸۷۶ء کو مارہرہ (ضلع ایٹہ) میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام حاجی سید مجتبیٰ تھا جو حسن تخلص کرتے تھے۔ چودہ سال کی عمر سے شوق سخن ہوا اور آخر تک رہا۔ ۱۸۹۵ء میں ایک ماہوار گلدستہ ریاض سخن کے نام سے جاری کیا جو عرصہ تک جاری رہا۔ فن شعر میں آپ داغ کے شاگرد ہیں۔ انھوں نے استاد کی سوانح بھی جلوۂ داغ کے نام سے لکھی ہے۔ داغ کے انتقال کے بعد ان کی یاد میں ایک رسالہ فصیح الملک کا اجرا کیا جو ۱۹۱۰ء تک شائع ہوتا رہا۔ کچھ دنوں تک خمخانۂ جاوید کی ترتیب و تصنیف بھی ان سے متعلق رہی۔ ایک دفعہ تلاش معاش کے سلسلے میں لاہور بھی آئے تھے اور برس ڈیڑھ برس یہاں قیام کیا تھا۔ ۱۹۲۳ء میں مسلم یونیورسٹی میں اردو فارسی کے پروفیسر مقرر ہوئے اور ۱۹۳۸ء تک کام کرتے رہے۔ ۳۰ یا ۳۱ اگست ۱۹۴۰ء کو پٹنہ میں انتقال کیا جہاں آپ علاج کے لیے گئے ہوئے تھے۔

احسن :- مرزا احسن علی نام احسن تخلص۔ سودا اور ضیا کے ارشد تلامذہ میں سے تھے۔ زیادہ حالات نہ مل سکے۔

اختر :- نواب واجد علی شاہ اختر اودھ کا آخری بادشاہ اپنے باپ امجد علی شاہ کے انتقال کے بعد ۱۸۴۷ء میں تخت پر بیٹھا ہر وقت عیش و عشرت اور لہو و لعب میں مشغول رہتا۔ انتظام سلطنت اور ملک کی خبر گیری سے کچھ واسطہ نہ رکھتا تھا۔ کاشانۂ قیصر باغ کی محفل ہر وقت جمی رہتی۔ انگریزوں نے ۱۸۵۶ء میں معزول کر کے مٹیا برج کلکتہ میں بھیج دیا مگر اس کی رنگ رلیاں وہاں بھی ختم نہ ہوئیں۔ پندرہ لاکھ سالانہ وظیفہ ملتا تھا اور سب کا سب خرچ ہو جاتا تھا۔ اسی عیش و نشاط کی حالت میں ۲۱ ستمبر ۱۸۸۷ء کو سفر آخرت کیا۔ اسیر اور فتح الدولہ برق سے اصلاح لیتا تھا۔ اردو زبان کا بہت اچھا شاعر تھا۔ علمی لیاقت میں بھی کچھ کم نہ تھا۔ فن موسیقی کا ماہر تھا۔ چالیس کے قریب تصانیف چھوڑی ہیں۔ حال میں "واجد علی شاہ اور ان کا عہد" کے نام سے مرزا رئیس احمد جعفری نے اس پر ایک ضخیم کتاب لکھی ہے۔

آرزو :- سراج الدین علی خاں نام آرزو تخلص۔ فارسی اور اردو کے بلند پایہ شاعر۔ اعلیٰ درجہ کے انشا پرداز اور چند کتابوں کے مصنف ہیں۔ والد کا نام شیخ حسام الدین تھا بمقام آگرہ ۱۶۸۹ء میں پیدا ہوئے۔ جوان ہوئے تو گوالیار میں منصب دار مقرر ہو گئے فرخ سیر کے عہد میں دہلی آئے اور شاہ عالم ثانی کے زمانہ میں لکھنؤ چلے گئے اور وہیں ۱۷۵۶ء میں انتقال کیا مگر لاش حسب وصیت دہلی لا کر دفن کی گئی۔ تمام تذکرہ نویس متفق ہیں کہ نہایت ذہین طباع، فن شعر میں کامل اور فصاحت و بلاغت میں بے مثل تھے۔ ان کے متعلق میر تقی میر کا قول ہے کہ ان کے زمانہ میں ان سے بڑھ کر کوئی محقق اور قادر الکلام نہ تھا۔ لطف یہ کہ ان کے شاگرد ان سے بھی زیادہ نامور ہوئے ہیں مثلاً مرزا مظہر جان جاناں، مرزا رفیع، میر تقی میر اور خواجہ میر درد۔

نہایت شگفتہ مزاج بذلہ سنج واقع ہوئے تھے مگر مزاج میں بہت انکسار تھا۔ سلطنت کی طرف سے قاضی القضاۃ کے عہدہ پر متعین تھے مگر غرور اور فخر نام کو نہ تھا۔

ان کے فارسی دیوان میں تقریباً ۳ ہزار اشعار ہیں۔ تصانیف کی مختصر فہرست یہ ہے۔ شرح سکندر نامہ، شرح قصائد عرفی، شرح گلستان، سراج اللغات (فارسی)، غرائب اللغات (اردو)، موہبت عظمیٰ، عطیہ کبریٰ، تذکرہ مجمع النفائس، داد سخن، تنبیہ الغافلین

آرزو لکھنوی :- نام سید انور حسین تخلص آرزو اور وطن لکھنؤ ہے۔ آپ کے آباؤ اجداد حضرت اورنگ زیب کے عہد میں ہرات سے وارد ہند ہوئے اور اجمیر میں قیام کیا۔ اجمیر سے لکھنؤ چلے گئے اور یہیں ۱۲۸۹ھ (۱۸۷۲ء) میں آرزو پیدا ہوئے۔ والد کا نام سید ذاکر حسین تھا۔ پانچ برس کی عمر میں تعلیم شروع ہوئی۔ ذہن عمدہ تھا اس لیے جلد ہی فارسی و عربی کی کافی لیاقت حاصل کر لی۔ ۱۲ سال کی عمر میں شعر کہنے لگے تھے۔ فن شعر میں جلال لکھنوی کے شاگرد ہیں۔ غزل گو شعرا میں ممتاز درجے کے مالک ہیں۔ کلکتہ اور بمبئی کی فلم کمپنیوں کے لیے جو صدہا رنگ انھوں نے نغمے اور گیت لکھے ہیں۔ فغان آرزو، جہان آرزو اور سریلی بانسری ان کے کلام کے مجموعے ہیں۔ سریلی بانسری کی زبان نہایت سادہ آسان ہے۔ عام فہم ہے اور فارسی اور عربی الفاظ سے خالی۔ ۱۹۵۱ء میں وفات پائی۔

ارشد: خاندان مغلیہ کے چشم و چراغ صاحب عالم مرزا عبد الغنی گورگانی تخلص بہ ارشد ۱۸۵۰ء میں قلعہ معلیٰ دہلی میں پیدا ہوئے۔ شاعری میں مرزا قادر بخش صابر کے شاگرد تھے۔ طرز قدیم اور طرز جدید دونوں ہی کی نظمیں لکھتے تھے۔ ملکہ وکٹوریہ کی سوانح عمری نظم میں لکھی ہے جو اب نایاب ہے۔ یہ اپنے بزرگوں میں بہت قابل اور لائق شخص تھے۔ پنجاب میں سررشتہ تعلیم میں مدرس ہو گئے تھے اور اسی میں ساری عمر گزار دی۔ ملتان میں ۱۲ فروری ۱۹۰۶ء کو وفات پائی۔

آزاد انصاری: ابو الاحسان حکیم الطاف احمد آزاد انصاری ۲ اکتوبر ۱۸۷۱ء کو ناگپور میں پیدا ہوئے۔ حضرت ابو ایوب انصاری کی اولاد سے تھے اور سہارن پور میں رہتے تھے۔ عربی، فارسی کی تحصیل کے بعد طب پڑھی اور ڈیرہ دون، کانپور، سہارنپور، انبالہ، علی گڑھ، دہلی اور حیدر آباد وغیرہ میں پھرتے اور تلاش معاش میں مصروف رہے۔ کہیں طبابت کی اور کہیں عینکوں کی تجارت۔ فن شعر میں مولانا حبیب الرحمٰن بیدل سہارن پوری سے اصلاح لی اور پھر شمس العلماء مولانا حالی کی شاگردی اختیار کی جن سے ان کو نہایت درجہ عقیدت تھی۔ کلام نہایت ستھرا، شائستہ، بلند پایہ اور سنجیدہ ہوتا تھا۔ ان کی نظموں کا مجموعہ چھپ گیا ہے۔ ۱۹۴۲ء میں انتقال کیا۔

آزردہ: مفتی صدر الدین نام، آزردہ تخلص، مولوی لطف اللہ کے بیٹے، کشمیری الاصل، دہلی کے باشندے۔ ۱۲ دسمبر ۱۷۸۹ء کو پیدا ہوئے۔ حضرت شاہ عبد العزیز، شاہ عبد القادر اور مولانا فضل امام خیر آبادی سے علوم عقلیہ و نقلیہ کی تکمیل کی۔ فن شعر میں شاہ نصیر اور میر ممنون دہلوی کے شاگرد تھے۔ دہلی کے مفتی اعظم تھے لیکن ۱۸۵۷ء کی قیامت میں قید ہو گئے۔ جائداد، کتب خانہ اور مکان سب ضبط ہوا۔ بہ ہزار خرابی قید سے مخلصی پائی۔ ۱۶ جولائی ۱۸۶۸ء کو انتقال ہوا۔ اپنے علم و فضل اور اپنے اعلیٰ اخلاق کے لیے مشہور تھے۔ یگانہ عالم اور یگانہ فاضل ہونے کے ساتھ عربی، فارسی اور اردو کے نادر الکلام شاعر تھے۔ نواب یوسف علی خاں والی ریاست رامپور، نواب صدیق حسن خاں آف بھوپال، سرسید احمد خاں، مولانا فیض الحسن سہارنپوری وغیرہ ان کے شاگرد تھے۔

اسد: میر امانی نام تھا اور اسد تخلص کرتے تھے۔ سودا کے شاگرد تھے۔ تلاش معاش میں لکھنؤ آئے۔ ... میں وفات پائی۔ مجموعہ نغز کا مصنف ان کے متعلق لکھتا ہے۔ میر امانی بہ خوش مزاج، شیریں زبان، بذلہ سنج، طبیب بیان، خلیق و یار باش، خوش فکر پاکیزہ تلاش بود۔

اسمٰعیل: محمد اسمٰعیل نام، میرٹھ کے باشندے۔ ۱۲ نومبر ۱۸۴۴ء کو پیدا ہوئے۔ مروجہ عربی فارسی تعلیم کے بعد ۱۶ سال کی عمر میں محکمہ تعلیم میں ملازم ہو گئے۔ سنٹرل نارمل سکول آگرہ سے ۱۸۹۹ء میں ریٹائر ہوئے۔ باقی عمر تصنیف و تالیف میں گزار دی۔ یکم نومبر ۱۹۱۷ء کو میرٹھ میں انتقال ہوا۔
بچوں کے لیے آسان نظمیں لکھنے میں ان کو خاص درجہ حاصل ہے۔ بچوں کی ابتدائی تعلیم کے لیے جو ریڈریں لکھیں وہ بہت مقبول ہوئیں۔ بحیثیت مجموعی قادر الکلام شاعر تھے۔ ان کی بیشتر شاعری طرز جدید کی حامل ہے جس میں اصلاحی رنگ جھلک رہا ہے۔

ان کی شاعری کے متعلق مولانا شبلی فرماتے ہیں کہ "حالی کے بعد اگر کسی نے سننے کے قابل کچھ کہا ہے تو وہ اسماعیل میرٹھی ہیں۔" کلیات اسمٰعیل
مدت ہوئی چھپا تھا مگر آج کل کمیاب ہے۔

آسی: مولوی عبدالباری نام، آسی تخلص، جائے پیدائش الدن (ضلع میرٹھ)، سالِ ولادت ۱۸۹۳ء مگر ۱۹۱۱ء سے
لکھنؤ میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ ناطق گلاؤٹھوی کے شاگرد تھے۔ آپ نے بہت سی کتابیں لکھی ہیں جن کی تعداد ۴۲ تک پہنچتی ہے۔
بصائر آپ کی رباعیات اور قطعات کا مجموعہ ہے۔ دیوانِ غالب اور تحفۃ العراقین کی شرحیں بھی آپ نے کی ہیں جو شائع ہو چکی ہیں۔

اسیر: سید مظفر علی نام، مدبر الدولہ خطاب اور اسیر تخلص تھا۔ علامہ سید مدد علی کے فرزند تھے اور ۱۲۲۹ھ (۱۸۱۴ء)
میں قصبہ امیٹھی (نواح لکھنؤ) میں پیدا ہوئے۔ دس برس کے ہوئے تو لکھنؤ چلے آئے۔ تحصیل علوم متداولہ کے بعد شاعری کا شوق پیدا ہوا
تو اسیر تخلص رکھ کر شیخ غلام ہمدانی مصحفی کی شاگردی اختیار کی۔ نصیر الدین حیدر کے زمانہ میں سرکاری ملازم ہوئے۔
اور ۲۴ گھنٹے خدمت میں حاضر رہتے تھے جس نے ان کو جیلخانوں کا افسرِ اعلیٰ اور خلاصہ نویس تمام کچہریات سرکاری کا
بنا دیا تھا۔ جب واجد علی شاہ معزول ہو گئے تو رام پور چلے گئے اور وہاں عزت کے ساتھ رہے۔ ۱۲۹۹ھ (۱۸۸۲ء) میں بعمر
۷۰ سال انتقال کیا۔ شاعری کے علاوہ فنِ عروض کے ماہر تھے۔ معیار الاشعار کا نہایت قابلیت سے ترجمہ کیا۔ شعر العروض اور کئی رسالے
فنِ عروض پر لکھے۔ اردو کے چار اور فارسی کے دو دیوان یادگار چھوڑے۔ ان کے علاوہ مراثی اور مثنویاں بھی بہت سی لکھیں۔ فنِ شعر میں
ان کی وقعت کا اندازہ اس سے لگاؤ کہ منشی امیر مینائی، مہدی حسن ماہر، احمد علی شوق قدوائی، اسلیمان خاں اسد، ظہور الحسن ظہور، ریاض خیرآبادی،
نواب سید یوسف حسن طباطبائی اور پنڈت رتن ناتھ سرشار جیسے مشاہیرِ ادب ان کے شاگرد تھے۔

اشتیاق: شاہ ولی اللہ نام اور اشتیاق تخلص ہے۔ سرہند (ریاست پٹیالہ) کے رہنے والے اور وہاں کے بزرگوں
سے تھے۔ شیخ ظہور الدین حاتم کے ہم عصر تھے مگر شعر کبھی کبھی کیا کرتے تھے۔ نہایت متوکل اور عابد زاہد شخص تھے۔ ۱۱۴۳ھ میں وفات پائی۔

آشفتہ: ان کا نام علیم الدین تھا لیکن بھورے خاں کے نام سے مشہور تھے۔ آشفتہ تخلص کرتے تھے۔ مصنف مجموعہ نغز
ان کے متعلق لکھتے ہیں: "جوانے است خوش فکر، شیریں بیان، عالی طبیعت، فصاحت بیان، غزل طرحے از و خوب سرانجامی یافت
بہ فصاحت می نگاشت۔" شروع میں شاعری کا نہایت شوق تھا لیکن بعد میں ایک بزرگ میاں مجیب الدین کے ہاتھ پر بیعت کر کے
شاعری چھوڑ دی اور زہد و پارسائی کی زندگی اختیار کی۔ مگر صوفیانہ اشعار کبھی کبھی کہتے تھے۔ شاہ محمدی مائل کے شاگرد تھے۔

آشفتہ: مرزا رضا علی نام اور آشفتہ تخلص تھا۔ حکیم محمد شفیع کے صاحبزادے تھے۔ میر سوز کے شاگرد اور فنِ طبابت میں
ماہر تھے۔ طبیعت درد مند پائی تھی اور شعر با مزا کہتے تھے۔

اصغر گونڈوی :- نام اصغر حسین، تخلص اصغر، وطن گورکھپور ہے مگر گونڈہ میں مستقل قیام کے باعث گونڈوی کہلاتے ہیں۔ یکم مارچ ۱۸۸۴ء کو پیدا ہوئے۔ باقاعدہ تعلیم کسی سکول یا کالج میں نہیں پائی مگر پرائیویٹ طور پر انگریزی عربی اور فارسی کی خاصی قابلیت پیدا کرلی تھی۔ فن شعر میں منشی خلیل احمد وجد بلگرامی اور منشی امیر اللہ تسلیم کے شاگرد رہے۔ نظم و نثر دونوں پر یکساں قدرت رکھتے تھے۔ کلام میں متانت اور سنجیدگی اور انداز بیان میں شگفتگی اور رنگینی پائی جاتی ہے۔ نظموں میں فارسی الفاظ و محاورات کی کثرت ہے مگر ساتھ ہی سلاست اور روانی بھی موجود ہے۔ کچھ دنوں تک لاہور میں رہ کر ادبی خدمت کی۔ پھر انڈین پریس میں الٰہ آباد چلے گئے۔ وہاں ہندوستانی اکیڈمی کے رسالہ ہندوستانی کے ایڈیٹر ہو گئے اور وہیں ۳۰ نومبر ۱۹۳۶ء کو انتقال ہوا۔ نہایت زاہد اور متقی اور درویش صفت بزرگ تھے۔ تصوف سے خاص ذوق رکھتے تھے۔ نشاطِ روح اور سرودِ زندگی ان کے کلام کے مجموعے ہیں۔

آصف :- یحییٰ خاں نام، مرزا زمانی عرف، آصف تخلص تھا۔ لکھنؤ کے نواب تھے ۱۱۸۸ھ میں تخت نشین ہوئے اور ستمبر ۱۷۹۷ء کو وفات پائی اور اپنے ہی بناکردہ امام باڑہ میں دفن ہوئے۔ امام باڑہ آصف الدولہ لکھنؤ کے تمام امام باڑوں میں مشہور سمجھا جاتا ہے۔ انھوں نے اپنا دارالسلطنت فیض آباد سے لکھنؤ میں منتقل کرلیا تھا۔

شعر و سخن کا بہت اچھا ذوق رکھتے تھے۔ میر سوز کے شاگرد تھے۔ میر قدرت اللہ ان کے متعلق اپنے تذکرہ مجموعۂ نغز میں لکھتے ہیں "گاہ گاہ طبع فیض بخش میل سخن می کرد و بامزاج گفت"۔ خمخانۂ جاوید کے مصنف کی ان کے متعلق یہ رائے ہے "ان کے کلام میں استاد میر سوز کی سی سادگی اور درد نمایاں ہے۔ خیال ستھرا ہے اور زبان پاکیزہ"۔

آفتاب :- ابوالمظفر جلال الدین سلطان عالی گوہر شاہ عالم دہلی میں مغلیہ دورِ انحطاط کا ایک کمزور بادشاہ تھا۔ ایک طرف مرہٹوں نے سلطنت پر قبضہ کر رکھا تھا۔ دوسری طرف انگریز چھائے ہوئے تھے۔ تیسری طرف روہیلے قتل و غارت مچا رہے تھے۔ غلام قادر روہیلے نے قلعہ معلی دہلی پر قابض ہوکر اور چھاتی پر چڑھ کر بادشاہ کی آنکھیں نکال ڈالیں مگر بعد میں خود بھی کتے کی موت مارا گیا۔ بادشاہ علم کا قدردان اور شعراء کا سرپرست تھا۔ خود بھی اردو اور فارسی میں شعر کہتا تھا۔ آفتاب تخلص تھا اور صاحبِ دیوان تھا۔ سودا، میر، نصیر، منت، مضمون اور احسان سب اس کے ہاں سے وظیفہ پاتے تھے۔ سنہ ۱۱۴۱ھ (۱۷۲۸ء) میں پیدا ہوا ۱۱۷۳ھ (۱۷۵۹ء) میں تخت نشین ہوا اور کم و بیش ۴۵ سال سلطنت کرنے کے بعد ۸۰ سال کی عمر میں ۷ رمضان سنہ ۱۲۲۱ھ مطابق ۱۹ نومبر ۱۸۰۶ء کو انتقال کیا۔

افسوس :- میر شیر علی نام، افسوس تخلص۔ فورٹ ولیم کالج کے مصنفین میں بہت مشہور شخص گزرے ہیں۔ میر حیدر علی حیران میر سوز کے شاگرد تھے۔ نارنول (قریب آگرہ) کے رہنے والے۔ دلی میں ۱۷۳۵ء میں پیدا ہوئے۔ چھ برس کی عمر میں ... لکھنؤ آتے ہوئے تھے۔ انھوں نے علوم پڑھے۔ پھر تلاشِ معاش میں لکھنؤ پہنچے۔ مرزا جواں بخت جہاندار شاہ ولیعہد دولت مغلیہ ... لکھنؤ آئے ہوئے تھے ... کلام سنا تو اپنی سرکار میں ملازم رکھ لیا۔ جب دہلی واپس جانے لگے تو افسوس نے لکھنؤ کی شاعرانہ دلچسپیوں کو چھوڑنا نہ چاہا اور یہیں رہ گئے۔ نواب سرفراز الدولہ نے سرپرستی کی اور ان کو تلاش معاش سے آزاد کر دیا۔ کچھ دنوں کے بعد فورٹ ولیم کے لیے لائق اور قابل مصنفوں

کی تلاش ہوئی۔ نواب سرفراز الدولہ نے ان کا نام پیش کر دیا اور یہ لکھنؤ روانہ ہو گئے۔ دو سو روپے ماہوار تنخواہ مقرر ہوئی اور آٹھ نو سال تک اس منصب پر عمر نہایت آرام سے کٹی۔ ۱۸۸۰ء میں انتقال کیا۔ تصانیف میں ایک دیوان یادگار چھوڑا۔ اس کا ایک قلمی نسخہ برٹش میوزیم میں موجود ہے۔ (۲) گلستانِ سعدی کا اردو میں ترجمہ کر کے باغِ اردو نام رکھا (۳) لیکن ان کا سب سے بڑا کارنامہ "آرائشِ محفل" ہے جو "خلاصۃ التواریخ" کا اردو ترجمہ ہے۔ یہ کتاب ابتداً منشی سجان رائے ساکن پٹیالہ نے فارسی میں ہندوستان کی تاریخ کے متعلق لکھی تھی جو عہدِ قدیم کی بڑی مستند تاریخوں سے اسے ترتیب دیا تھا مگر "آرائشِ محفل" صرف عہدِ ہنود کی تاریخ کا ترجمہ ہے۔ پوری کتاب کا ترجمہ نہیں۔

اقبال:۔ شاعرِ مشرق، ترجمانِ حقیقت ڈاکٹر سر محمد اقبال ۲۲ فروری ۱۸۷۳ء کو سیالکوٹ میں پیدا ہوئے۔ آباؤ اجداد کشمیری پنڈت تھے۔ بچپن میں شمس العلماء مولوی سید میر حسن کی صحبت سے مستفید ہوئے۔ بی۔ اے گورنمنٹ کالج لاہور سے پاس کیا جہاں مشہور مستشرق پروفیسر آرنلڈ فلسفہ کے معلم تھے اور اقبال کے ساتھ نہایت شفقت سے پیش آتے تھے۔ ایم۔ اے کرنے کے بعد اورینٹل کالج لاہور میں فلسفہ اور تاریخ کے پروفیسر مقرر ہوئے۔ ۱۹۰۵ء میں مزید تعلیم کے لیے یورپ چلے گئے۔ جرمنی سے پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ ۱۹۰۸ء میں وطن واپس آئے اور بیرسٹری شروع کر دی۔ ۱۹۲۲ء میں سر کا خطاب ملا۔ ۱۹۳۰ء میں مسلم لیگ کے صدر مقرر ہوئے۔ ۱۹۳۱ء اور ۱۹۳۲ء میں گول میز کانفرنس میں شرکت کے لیے انگلینڈ گئے۔ پاکستان کا نظریہ سب سے پہلے ڈاکٹر اقبال ہی نے قوم کے سامنے پیش کیا تھا۔ آخری عمر نہایت تکلیف اور درد و کرب میں گزری اور مختلف عوارض لاحق ہو گئے جنھوں نے آخر وقت تک پیچھا نہ چھوڑا اور بالآخر اسی حالت میں ۲۱ اپریل ۱۹۳۸ء کو ایشیا کا یہ بہت بڑا شاعر ہمیشہ کے لیے خاموش ہو گیا۔ ڈاکٹر اقبال کا نام ان کی لافانی نظموں کے باعث ہمیشہ زندہ رہے گا۔

ان کی نظموں کے مجموعے مندرجہ ذیل ہیں:۔ بانگِ درا۔ اسرارِ خودی۔ رموزِ بے خودی۔ پیامِ مشرق۔ زبورِ عجم۔ جاوید نامہ بالِ جبریل۔ ضربِ کلیم۔ پس چہ باید کرد اے اقوامِ شرق۔ مسافر۔ ارمغانِ حجاز۔ باقیاتِ اقبال۔ ان کی سب سے پہلی کتاب کا نام علم الاقتصاد ہے۔

اکبر الٰہ آبادی:۔ سید اکبر حسین نام، اکبر تخلص، لسان العصر لقب، وطن الٰہ آباد، تاریخِ پیدائش ۱۶ نومبر ۱۸۴۶ء۔ والد کا نام سید تفضل حسین رضوی تھا۔ گھر میں خوشحالی اور امیری نہ تھی اس لیے معمولی تعلیم کے بعد نوکری کی فکر ہوئی اور محکمۂ تعمیرات میں ملازم ہو گئے۔ پھر نوکری چھوڑ کر مختاری کا امتحان پاس کیا۔ پھر وکالت کا امتحان دیا۔ ۱۸۸۱ء میں منصف ہو گئے۔ ۱۸۹۴ء میں جج عدالت خفیفہ مقرر ہوئے اور ۱۹۰۳ء میں ملازمت چھوڑ کر تصنیف و تالیف کا شغل اختیار کیا۔ اہلیہ کی وفات اور اپنے بیٹے ہاشم کی موت کے باعث آخری عمر نہایت حزن و غم میں گزری۔ ۱۹۲۱ء میں انتقال کیا۔ اصلی پایہ کی ظریفانہ شاعری ان پر ختم تھی۔ ان کا کلیات چار جلدوں میں چھپ چکا ہے۔

الم:۔ حضرت خواجہ میر کے لڑکے صاحب میر نام، میاں صاحب کے لقب سے مشہور تھے۔ الم تخلص کرتے تھے۔ قدرت اللہ قاسم ان کے متعلق لکھتے ہیں: کلامِ صحت نظامِ ایشان معرفت دارد کہ زمقفۂ سخن دان مانند شیفتہ را بگرد جدائی مادہ نوشانہ جامِ وحدت شناسد۔

امانت:- نام سید آغا حسن تخلص امانت، پیدائش ۱۲۳۱ھ (۱۸۱۵ء) وطن لکھنؤ، میر آغا رضوی کے بیٹے تھے۔ شاعری کا شوق بچپن سے تھا۔ بیس برس کی عمر میں کسی بیماری کے باعث گونگے ہو گئے۔ یہ سخت تکلیف دہ مرض ۹ برس تک عذاب جان رہا۔ اس کے بعد اس سے رہائی ملی۔ اردو میں سب سے پہلے ڈراما انھوں نے ہی لکھا جس کا نام اندر سبھا ہے۔ اپنے واسوخت کے لیے بھی مشہور ہیں۔ دلگیر کے شاگرد تھے۔ ۱۲۷۵ھ (۱۸۵۸ء) میں وفات پائی۔

امانی:- میر لال نام، امانی تخلص تھا۔ ۱۱۷۵ھ میں انتقال ہوا۔ زیادہ تفصیل کے ساتھ ان کے حالات نہیں ملے۔

امید:- ان کا نام مرزا محمد رضا تھا۔ بہادر شاہ بادشاہ دہلی کے دربار سے قزلباش خاں خطاب اور منصب یک ہزاری ملا تھا۔ ہمدان وطن تھا۔ جوانی میں اصفہان آئے۔ وہاں مرزا طاہر وحید کے شاگرد ہوئے پھر ہندوستان چلے آئے۔ فارسی کے شاعر تھے اور یہ تخلص کرتے تھے مگر کبھی کبھی اردو میں بھی کہتے تھے۔ ۱۱۵۹ھ (۱۷۴۶ء) میں سکتے کی بیماری سے وفات پائی۔

امیر مینائی:- امیر احمد نام۔ امیر تخلص۔ ایک بزرگ حضرت شاہ مینا کی اولاد میں سے تھے اس لیے امیر مینائی کہلاتے ہیں۔ فن شعر میں منشی مظفر علی اسیر کے شاگرد ہیں۔ ۱۸۲۹ء میں پیدا ہوئے۔ عربی و فارسی کی تحصیل کے بعد شاعری کی طرف متوجہ ہوئے۔ آپ اپنے زمانے میں مسلم الثبوت استاد تسلیم کیے جاتے ہیں۔ ۲۰ سال کی عمر تھی کہ شاعری کا شہرہ واجد علی شاہ تک پہنچا۔ اس نے بلا کر کلام سنا۔ ۱۸۵۷ء میں نواب یوسف علی خاں والی رامپور نے بلایا اور نہایت تعظیم و تکریم کی۔ بعد میں نواب کلب علی خاں نے ان کو اپنا استاد بنایا۔ آپ وہاں عدالت دیوانی کے حاکم بھی تھے۔ ۴۲ برس نہایت عزت کے ساتھ رامپور میں گزارے پھر نظام کے ایما پر داغ نے حیدرآباد بلایا۔ مگر وہاں قضا لے گئی تھی۔ پہنچتے ہی تھے کہ بیمار ہو گئے اور ۱۳ اکتوبر ۱۹۰۰ء کو انتقال کیا۔ مرحوم نہایت عالم، زاہد، متقی، پرہیزگار اور نہایت نیک نفس بزرگ تھے۔ فن شعر میں کامل ہونے کے علاوہ عربی و فارسی کے جید عالم تھے۔ ہندی اور سنسکرت بھی بہت اچھی جانتے تھے۔ طب سے بھی واقف تھے اور علم جفر کے بھی ماہر تھے۔ نظم اور نثر میں بہت سی کتابیں لکھیں۔ بعض نام یہ ہیں۔ ارشاد السلطان، ہدایت السلطان، مرآۃ الغیب (دیوان)، صنم خانۂ عشق (دیوان)، محامد خاتم النبیین، مینائے سخن نظم میں ہیں۔

نثر کے بعض رسائل یہ ہیں۔ خیابان آفرینش، نماز کے اسرار، زاد الامیر۔ شعرا کا ایک تذکرہ انتخاب یادگار کے نام سے لکھا جس میں ۵۰۰ سے زیادہ شاعروں کا حال ہے۔ امیر اللغات لکھنی شروع کی جو اردو کی بے نظیر لغت ہوتی مگر صرف ۲ جلدیں چھپ سکیں جن میں الف کی تکمیل آتی ہے۔ حضرت امیر مینائی کے بعض شاگردوں کے نام یہ ہیں۔ حافظ جلیل حسن جلیل، حفیظ جونپوری، ... ریاض خیرآبادی، حضرت حافظ سید مختار احمد مختار شاہجہانپوری جو الحمد للہ حیات ہیں اور جو دہلی ... لاہور میں سکونت پذیر رہے، حکیم ... شاہجہانپور میں تشریف رکھتے ہیں۔ آپ کے ایک ممتاز شاگرد مولوی احسن اللہ خاں ثاقب اکبرآبادی نے آپ کے خطوط کا مجموعہ مکتوبات امیر مینائی کے نام سے شائع کیا تھا مگر اب نہیں ملتا۔

امیر: نواب [illegible] ہر

وقت [illegible] شعر و شاعری [illegible] کر

شعراء ان کے ملازم تھے اور [illegible] شعر و شاعری کی مجلس [illegible] کے [illegible]

رام پور چلے گئے جہاں انھوں نے [illegible] ۱۲۷۲ھ

میں انتقال ہوا۔

امین: ان کا نام شاہ امین الدین تھا اور تخلص امین کرتے تھے۔ عظیم آباد کے رہنے والے تھے۔ [illegible] میں انتقال کیا۔ غزلیات کا ایک دیوان یادگار چھوڑا۔

انجام: ۔ نواب امیر خاں نام، عمدۃ الملک خطاب، انجام تخلص۔ شاہ نعمت اللہ ولی کی نسل میں سے محمد شاہ رنگیلے کا منہ چڑھا تھا۔ کچھ عرصہ اس کا میر بخشی بھی رہا۔ نہایت حاضر جواب اور بذلہ سنج تھا اس لیے بادشاہ کو بہت عزیز تھا اور وہ اس کو اپنے سے جدا کرنا نہ چاہتا تھا مگر بیشتر ہی عنایات کے بدولت یہ نہایت گستاخ ہو گیا آخر بادشاہ نے ناراض ہو کر ایک امیر کو اشارہ کیا اور اس نے ۱۱۵۹ھ میں اسے قتل کر دیا۔ دہلی سوسائٹی روح اللہ خاں میں دفن ہوا۔ فارسی اور اردو میں شعر کہتا تھا۔ مختلف تذکروں میں اس کے قتل کا سنہ مختلف لکھا ہے ہم نے نسخۂ معتبر تاریخ کو لیا ہے۔

انشا: ۔ سید انشاء اللہ خاں نام، حکیم ماشاء اللہ خاں مصدر کے بیٹے اور اردو کے نہایت نامور شاعر تھے۔ نہایت ذہین مگر طبیعت کو ہزل اور مسخرہ پن میں ڈال کر اپنے علم سے ناجائز فائدہ اٹھایا۔ اسی مسخرے پن کی بدولت آخر عمر نہایت مصیبت سے کٹی اور بڑی حسرت کے ساتھ جان دی۔ مرشد آباد میں پیدا ہوئے۔ جوان ہو کر دہلی آئے۔ یہاں سے لکھنؤ پہنچے اور وہیں ۱۲۳۳ھ (۱۸۱۷ء) میں فوت ہو گئے۔ کلیات کے علاوہ دریائے لطافت ان کی بہت مشہور کتاب ہے جو صرف و نحو، معانی و بیان، عروض و قافیہ پر اردو میں سب سے پہلی تصنیف کی حیثیت ہے۔

انیس: ۔ میر ببر علی انیس مرثیہ گوئی کے فن میں اپنا جواب نہیں رکھتے۔ جب تک واقعۂ کربلا کی یاد لوگوں کے دلوں میں باقی ہے جس کا نام بھی باقی رہے گا۔ ابتدا میں شاعری میں کچھ غزلیں کہیں پھر ہمیشہ کے لیے چھوڑ دیں۔ فیض آباد میں پیدا ہوئے۔ بڑے ہو کر لکھنؤ چلے گئے اور وہیں ساری عمر گزار دی۔ نہایت ذکی اور بڑے خوددار شخص تھے۔ انتہا یہ ہے کہ اپنے گھر والوں سے بھی صرف معینہ اوقات پر ملتے تھے۔ استغنا، خودداری اور قناعت کے گویا مجسمہ تھے۔ جب تک کوئی آدمی لینے نہ آیا اور اصرار سے نہ بلایا گیا اس وقت تک دنیا داروں کے ہاں بھی نہ گئے۔ اردو شعرا میں چوٹی کے شخص سمجھے جاتے ہیں۔ ساری عمر میں نعالی لاکھ کے قریب اشعار کہے۔ ان کی زبان نہایت مستند اور ٹکسالی مانی جاتی ہے۔ اردو کو انھوں نے بہت سے نئے محاورے، پہلو اور پہلو کے نئے نئے مضامین، جو ان کے ساتھ ملو کی لغات

[illegible] میں [illegible] کا بہت اعلیٰ درجہ کا سلیقہ رکھتے تھے۔ الفاظ اور محاورات کا استعمال ان کے ہاں بڑی خوبصورتی [illegible] میں [illegible] کو انتقال کیا۔

بحر: شیخ امداد علی نام تھا اور بحر تخلص کرتے تھے۔ ناسخ کے نامور شاگردوں میں سے تھے اور لکھنؤ کے شعراء میں خصوصیت [illegible] شعر و شاعری کے شغل کے سوا کوئی کام نہ تھا۔ اس لیے ساری عمر عسرت و تنگی میں گزری۔ ارادے بڑے بڑے تھے مگر سب بے پریشانی ثابت ہوئے۔ زبان کے استاد تھے اور صحت الفاظ کا خاص خیال رکھتے تھے۔ ۱۸۱۰ء میں پیدا ہوئے اور ۱۸۷۸ء میں وفات پائی۔

برق: میرزا محمد رضا نام، برق تخلص، وطن لکھنؤ۔ ناسخ کے شاگرد تھے۔ ۲۰ اکتوبر ۱۸۵۷ء کو انتقال کیا۔ اس سے زیادہ ان کے حالات مہیا نہ ہو سکے۔

بقا: نام شیخ بقاء اللہ اور حافظ لطف اللہ خوشنویس۔ وطن آگرہ، پیدائش دہلی کی۔ عنفوان شباب میں دہلی کو چھوڑا اور لکھنؤ میں جا رہے۔ فارسی میں تمکین اور اردو میں بقا تخلص کرتے تھے۔ فارسی شاعری میں مرزا فاخر مکین کے اور اردو نظم میں شاہ حاتم کے شاگرد تھے۔ خواجہ میر درد سے بھی اصلاح لی ہے۔ زندگی بڑی بے لطف اور فقر و فاقہ میں گزری۔ طبیعت فن شعر کے لیے نہایت موزوں پائی تھی۔ کلام صاف اور سادہ ہے، مزاج شگفتہ اور طبع رنگین رکھتے تھے۔ یہ اور سودا جیسے دارالحق کو بھی خاطر میں نہ لاتے تھے۔ نواب شیفتہ نے [illegible] فرماتے ہیں: در مراتب نظم طبعے شگفتہ و رنگین و [illegible] ۱۸۰۱ء میں وفات پائی۔

بیان: نام خواجہ احسن اللہ صاحب تھا اور بیان تخلص کرتے تھے۔ مرزا مظہر جان جاناں کے شاگرد اور مولانا فخر الدین کے [illegible] تھے۔ قدرت اللہ قاسم مؤلف مجموعہ نغز سے بھی فیض حاصل کیا تھا۔ دہلی میں پیدا ہوئے۔ حیدرآباد میں ملازم تھے اور وہیں ۱۲۱۳ھ / ۱۷۹۸ء میں وفات پائی۔ مولوی عبدالحق اپنے تذکرہ میں [illegible] لکھتے ہیں: خواجہ صاحب اصول شاعری سے باخبر، خوش گو، [illegible] طبع اور مشاق سخن تھے، [illegible] اور رنگینی ایسے غضب کی ہے کہ شعر پڑھ کر دل تڑپ اٹھتا ہے۔ وہ [illegible] اور [illegible] سے کلام پاک [illegible] سادگی میں ان کا انداز [illegible] ہیں پر ہزاروں بندشیں قربان ہیں۔

بیان و یزدانی: نام سید محمد مرتضیٰ [illegible] صاحب مرقع الشعراء نے محمد تقی غلط لکھا ہے۔ والد کا نام [illegible] ۱۳۰۰ء [illegible] مرزا الشعراء ۱۲۹۴ھ اور بقول صاحب قاموس [illegible] ۱۳۰۱ء [illegible] ہوئے۔ [illegible] کے شاگرد تھے۔ اردو میں بیان اور فارسی میں یزدانی تخلص کرتے تھے۔ بہت اچھے شعر [illegible] ہے مگر کلام کا کوئی مجموعہ ان کی زندگی میں چھپا [illegible] مختلف اخبارات اور رسالوں میں ان [illegible] رہتے تھے۔ ایک اخبار [illegible] لسان الملک کے نام سے جاری کیا تھا۔ طوطی ہند کے بھی ایڈیٹر رہے۔ اردو کے علاوہ [illegible] پر بھی کامل دستگاہ رکھتے تھے۔ صاحب مرقع الشعراء ان کے حال [illegible]

لکھتے ہیں کہ ہمیشہ اندھیری کوٹھڑی میں پڑے رہتے تھے۔ صفائی کا مطلق خیال نہ تھا۔ ہر وقت ایک لحاف اوڑھے رہتے تھے خواہ موسم ہو گرمی پر کچھ پروا نہ رکھا رہتا تھا۔ باہر بھی آتے جاتے نہ تھے۔ پتنگ پر ہی کبھی کبھی نہا لیتے تھے محض شاعر تھے اور کسی کام کے نہ تھے۔

تصنیفات یہ ہیں (۱) مسدس حالی کا جواب (۲) پانچ ہندو جواب شکوۂ ہند و حالی (۳) سیل استاد اور مثنوی حقوق اولاد (۴) مجموعہ نعت ۳۰ مارچ ۱۹۱۰ء کو انتقال ہوا۔ کلام کا کچھ انتخاب صاحب مراۃ الشعراء نے شائع کیا ہے۔ کچھ کلام فروری ۱۹۰۵ء کے رسالہ الحمرا لاہور میں بھی چھپا تھا۔

بیخود بدایونی:۔ ان کا نام مولوی عبدالحی تھا اور مولوی غلام سرور صدیقی کے فرزند تھے۔ بیخود تخلص تھا اور بدایوں (یو۔پی) کے رہنے والے تھے۔ ۱۸۵۷ء میں پیدا ہوئے۔ خوش وضع، رنگین طبع اور نہایت ہنس مکھ انسان تھے۔ فن شعر میں مولانا حالی کی شاگردی کی مگر طبیعت کو چونکہ غزل سے بڑی مناسبت تھی لہٰذا بعد میں داغ کو استاد بنایا اور طبع کی خوب خوب جولانیاں دکھائیں۔ نومبر ۱۹۱۲ء میں وفات پائی۔ ایک دیوان مراۃ الخیال یادگار چھوڑا۔

بیخود دہلوی:۔ حاجی سید وحید الدین احمد بیخود دہلوی عہد حاضرہ کے نہایت نامور ادیب اور اعلیٰ پایہ کے شاعر تھے اور شریف اور نجیب خاندان سے تعلق رکھتے تھے جو سارے کا سارا علم و فضل اور شعر و ادب کی دولت سے مالا مال تھا۔ والد کا نام سید [illegible] سالک اور دادا کا سید بدرالدین سالک تھا جو غالب کے شاگرد تھے۔ پردادا بادشاہ عالمگیر ثانی کے وزیر تھے جن کا نام اعتبار الدولہ مختار الملک منصور جنگ نواب سید احمد امیر خاں تھا۔ منشی محمد کرم اللہ خاں شیدا ماموں اور مفتی صدر الدین خاں آزردہ ان کی والدہ کے پھوپھا تھے۔ ۳ رمضان ۱۲۸۰ھ (۲۲ فروری ۱۸۶۳ء) کو پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم کے بعد حضرت شمس العلماء مولانا حالی کی شاگردی اختیار کی۔ رنگ طبیعت دیکھ کر انھوں نے داغ سے مشورۂ سخن کی صلاح دی۔ چنانچہ حیدرآباد پہنچے اور چھ ماہ تک داغ سے اصلاح لیتے رہے۔ دہلی چلے آئے اور ساری عمر شعر و شاعری کے شغل میں اور انگریزوں کو اردو پڑھانے میں گزار دی۔ بیخود مرحوم اس صدی کے ان بزرگوں میں سے تھے جن کے ہوتے ہوئے شعر و ادب اور زبان و بیان کی وہ روایتیں زندہ تھیں جو خاص دہلی کی ادبی مجالس سے تعلق رکھتی تھیں۔ ان کے اشعار میں محاورہ کی بے ساختگی، الفاظ کی بندش، خیالات کی صفائی، بیان کی سادگی اور زبان کی شیرینی بدرجۂ اتم موجود ہے۔ ۲ [illegible] کو دہلی میں وفات پائی۔ اردو شاعری میں دہلوی رنگ کی یہ آخری شمع تھی جو بجھ گئی۔

ان کے کلام کا پہلا مجموعہ گفتار بے خود ۱۳۲۳ھ (۱۹۰۵ء) میں چھپا اور دوسرا مجموعہ شہسوار بے خود ۱۳۳۷ھ (۱۹۱۹ء) میں چھپا۔ گفتار بے خود ۶ ہزار ابیات پر مشتمل ہے۔

بیدار:۔ میر محمدی عرف سید محمد علی نام اور بیدار تخلص تھا۔ میر درد اور ظہور الدین حاتم کے شاگرد ہیں۔ نہایت دیندار اور باخدا بزرگ تھے۔ مجموعۂ نغز میں ان کے متعلق ہے "خوش فکر، شیریں گفتار، پاکیزہ خو، فرشتہ کردار، شعرش بسیار با کیفیت و در نہایت حلاوت و دل بستگی است"۔ دیوان بیدار ۱۹۳۵ء میں ہندوستانی اکیڈمی الہ آباد نے شائع کیا۔ ۱۱۴۵ھ (۱۷۳۲ء)

ہوئے۔ انتقال کی تاریخ معلوم نہیں ہو سکی۔

تاباں:۔ نام میر عبدالحی اور تخلص تاباں تھا۔ شاہ حاتم یا میر حشمت کے شاگرد اور حضرت مرزا مظہر جان جاناں کے مرید تھے۔ [غیر] معمولی طور پر حسین اور خوبصورت واقع ہوئے تھے۔ یہاں تک کہ دہلی کے لوگ ان کو یوسف ثانی کہتے تھے۔ چونکہ حبش خاں میں ان کا مکان تھا اس لیے ان کے حسن کی شہر میں اتنی شہرت ہوئی تھی کہ ایک مرتبہ بادشاہ ان کو دیکھنے ان کے مکان پر آئے تھے۔ عین جوانی میں انتقال ہوا تو ساری دلی نے سوگ منایا۔ ان کے انتقال کی صحیح تاریخ معلوم نہ ہو سکی۔ فیلن صاحب لکھتے ہیں کہ ۱۱۹۰ھ میں زندہ تھے۔ مولوی محمد یحییٰ تنہا اپنے [سیر المصنفین] مرآۃ الشعراء میں لکھتے ہیں کہ ۱۱۶۱ھ (۱۷۴۸ء) اور ۱۱۶۵ھ (۱۷۵۲ء) اور ۱۱۶۵ھ (۱۷۵۲ء) کے درمیان انتقال ہوا۔

ان کے کلام کی نسبت رام بابو سکسینہ کی رائے ہے کہ کلام عاشقانہ، شیریں و نمکین ہے۔ خیالات نہایت نازک اور زبان بہت سلیس ہے۔ ان کا دیوان انجمن ترقی اردو نے شائع کر دیا ہے۔

(مولانا) **تاجور نجیب آبادی**۔ احسان اللہ خاں نام، تاجور تخلص۔ وطن نجیب آباد، یو۔ پی۔ مقام پیدائش نینی تال۔ سال ولادت ۱۸۹۴ء۔ والد کا نام محبت اللہ خاں تھا۔

ابتدائی تعلیم کے بعد دیوبند میں پڑھا اور فارغ التحصیل ہونے کے بعد ۱۹۱۰ء میں لاہور آ کر اورینٹل کالج سے مولوی فاضل اور منشی فاضل کی ڈگریاں حاصل کر کے دیال سنگھ ہائی سکول میں اورینٹل ٹیچر لگ گئے۔ کچھ عرصہ بعد دیال سنگھ کالج میں پروفیسر ہو گئے اور تقریباً [...] میں رہنے کے بعد ۳۰ جنوری ۱۹۵۱ء کو انتقال کیا۔

تاجور بحیثیت شاعر یا ادیب کے صحافی زیادہ تھے۔ سب سے پہلے ۱۹۱۰ء میں لدھیانہ سے ماہنامہ آفتاب اردو نکالا اور ۱۹۱۲ء میں تاج الکلام۔

ناصحانہ کر ۱۹۱۶ء میں مخزن کے مدیر ہوئے اور پانچ سال ہمایوں کی ادارت کے فرائض انجام دیتے رہے۔ پھر میاں بشیر احمد نے ہمایوں کی جانشینی ایڈیٹر کے لیے بلا لیا اور اس مشہور و معروف ماہنامہ کا پہلا پرچہ جنوری ۱۹۲۲ء میں مولانا کی زیر ادارت شائع ہوا۔ کچھ عرصہ تک یہاں کام کرنے کے بعد مولانا نے اپنا پرچہ 'پریم' کے نام سے جاری کیا جو بچوں کے لیے وقف تھا اور بہت خوبی اور قابلیت سے ایڈٹ کیا جاتا تھا۔ یہ پرچہ طلب سے کچھ پہلے تک جاری رہا۔ ازاں بعد ۱۹۲۹ء میں رسالہ 'ادبی دنیا' جاری کیا۔ یہ آج کل مولانا صلاح الدین کی زیر ادارت شائع ہو رہا ہے۔ ۱۹۳۲ء میں مولانا تاجور نے لاہور سے 'شاہکار' نکالا اور اس شان سے کہ دوسرے رسالے اور ماہنامے اس کے آگے ماند پڑ گئے۔

مولانا کی ادبی اور علمی خدمات بھی کچھ کم اہمیت نہیں رکھتیں۔ انھوں نے لاہور میں مشہور بزم ادب قائم کی اور [...] کے نام سے ایک اشاعتی ادارہ قائم کرنے کا سہرا بھی انھی کے سر ہے۔ اس ادارہ سے اردو نظم و نثر کا بہترین انتخاب ۲۹ جلدوں میں شائع کیا۔ اس سے پہلے بھی وہ [...] جلدوں میں اردو نظم و نثر کا انتخاب ادبیات شائع کر چکے تھے۔ مست [...] تھے اور انھوں نے کافی [...] ان کے شاگرد بھی بہت سے تھے مگر انھوں نے اپنے کلام کا مجموعہ اب تک شائع

کہتے ہیں کہ ہمیشہ اندھیری کوٹھڑی میں پڑے رہتے تھے۔ صفائی کا مطلق خیال نہ تھا۔ ہر وقت ایک لحاف اوڑھے رہتے تھے بچھونا موسم ہو گٹھڑی پر کچھ بوجھ رکھا رہتا تھا۔ باہر کبھی آتے جاتے نہ تھے۔ پتنگ پر یکی کبھی بنا لیتے تھے محض شاعر تھے اور کسی کام کے نہ تھے۔

تصنیفات یہ ہیں (۱) مسدس حالی کا جواب (۲) پانچ چند در جواب شکوۂ ہند و حالی (۳) ہیلی اسلام اور مثنوی حقوق اولاد و حقوق (۴) مجموعہ نعت ۱۳ مارچ ۱۹۰۵ء کو انتقال ہوا۔ کلام کا کچھ انتخاب صاحب مراۃ الشعراء نے شائع کیا ہے۔ کچھ کلام فروری ۱۹۰۵ء کے رسالہ الحمرا لاہور میں بھی چھپا تھا۔

بیخود بدایونی: ان کا نام مولوی عبدالحی تھا اور مولوی غلام سرور صدیقی کے فرزند تھے۔ بیخود تخلص تھا اور بدایوں ہی کے رہنے والے تھے۔ ۱۸۶۸ء میں پیدا ہوئے۔ خوش وضع، رنگین طبع اور نہایت منکسر مزاج انسان تھے۔ فن شعر میں مولانا حالی کی شاگردی تھی مگر طبیعت کو چونکہ غزل سے بڑی مناسبت تھی لہٰذا بعد میں داغ کو استاد بنایا اور طبع کی خوب خوب جولانیاں دکھائیں۔ نومبر ۱۹۱۲ء میں وفات پائی۔ ایک دیوان مراۃ الخیال یادگار چھوڑا۔

بیخود دہلوی: سائل سید وحید الدین احمد بیخود دہلوی عہد حاضرہ کے نہایت نامور ادیب اور اعلیٰ پایہ کے شاعر تھے اور نہایت شریف اور نجیب خاندان سے تعلق رکھتے تھے جو سارے کا سارا علم و فضل اور شعر و ادب کی دولت سے مالا مال تھا۔ والد کا نام سید شمس الدین ساکن اور دادا کا سید بدرالدین سالک تھا جو غالب کے شاگرد تھے۔ پردادا بادشاہ عالم گیر ثانی کے وزیر تھے جن کا نام اعتماد الدولہ انتظام الملک منصور جنگ نواب سید احمد امیر خان تھا۔ منشی محمد کرم اللہ خاں شیدا ماموں اور مفتی صدر الدین خاں آزردہ ان کی والدہ کے پھوپھا تھے ۳ رمضان ۱۲۸۰ھ (۲۲ فروری ۱۸۶۳ء) کو پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم کے بعد حضرت شمس العلماء مولانا حالی کی شاگردی اختیار کی۔ لگن طبیعت دیکھ کر انہوں نے داغ سے مشورۂ سخن کی صلاح دی۔ چنانچہ حیدرآباد پہنچے اور تھوڑے دنوں تک داغ سے اصلاح لیتے رہے۔ دہلی چلے آئے اور ساری عمر شعر و شاعری کے شغل میں اور انگریزوں کو اردو پڑھانے میں گزار دی۔ بیخود مرحوم اس صدی کے ان بزرگوں سے تھے جن کے ہونے سے شعر و ادب اور زبان و بیان کی وہ روایتیں زندہ تھیں جو زمانہ دہلی کی ادبی مجالس سے تعلق رکھتی تھیں۔ ان کے اشعار میں محاورہ کی بے ساختگی، الفاظ کی بندش، خیالات کی صفائی، بیان کی سادگی اور زبان کی شیرینی بدرجہ اتم موجود ہے ۳ اکتوبر ۱۹۵۵ء کو دہلی میں وفات پائی۔ اردو شاعری میں دہلوی رنگ کی یہ آخری شمع بھی بجھ گئی۔

ان کے کلام کا پہلا مجموعہ گفتار بیخود ۱۳۲۳ھ (۱۹۰۵ء) میں چھپا اور دوسرا مجموعہ شہوار بیخود ۱۳۳۸ھ (۱۹۱۹ء) میں چھپا۔ گفتار بیخود ۲۰۰۰ ابیات پر مشتمل ہے۔

بیدار: یہ محمدی عرف سید محمد علی نام اور بیدار تخلص تھا۔ میر درد اور ظہور الدین حاتم کے شاگرد ہیں۔ نہایت دیندار اور باخدا بزرگ تھے۔ مجموعۂ نغز میں ان کے متعلق ہے: خوش فکر، شیریں گفتار، پاکیزہ خو، فرشتہ کردار، شعرش بسیار با کیفیت و در نہایت حلاوت و درد انگیز است۔ دیوان بیدار ۱۹۳۵ء میں ہندوستانی اکیڈیمی الہ آباد نے شائع کیا۔ ۱۱۴۵ھ (۱۷۳۲ء)

دم نہیں ہو سکی۔

عبدالحیٔ اور تخلص تاباں تھا۔ شاہ حاتم یا میر حشمت کے شاگرد اور حضرت مرزا مظہر جانِ جاناں کے مرید تھے
واقع ہوئے تھے یہاں تک کہ دہلی کے لوگ ان کو یوسفِ ثانی کہتے تھے۔ چنانچہ حبش خاں میں ان کا مکان
رت ہوئی تھی کہ ایک مرتبہ بادشاہ ان کو دیکھنے ان کے مکان پر آئے تھے۔ عین جوانی میں انتقال ہوا تو ساری
انتقال کی صحیح تاریخ معلوم نہ ہو سکی۔ فیلن صاحب لکھتے ہیں کہ ۱۷۹۷ء میں زندہ تھے۔ مولوی محمد یحییٰ تنہا اپنے
یا ۱۱۶۱ھ (۱۷۴۸ء) اور ۱۱۶۵ھ (۱۷۵۲ء) اور ۱۱۶۵ھ (۱۷۵۲ء) کے درمیان انتقال ہوا۔
بت رام بابو سکسینہ کی رائے ہے کہ کلام عاشقانہ شیریں و نمکین ہے خیالات نہایت نازک اور زبان
انجمن ترقی اردو نے شائع کر دیا ہے۔

نجیب آبادی ۔ احسان اللہ خاں نام۔ تاجور تخلص۔ وطن نجیب آباد (یو۔ پی) مقام پیدائش نینی تال۔
والد محبت اللہ خاں تھا

ے بعد دیوبند میں پڑھا اور فارغ التحصیل ہونے کے بعد ۱۹۱۰ء میں لاہور آ کر اورینٹل کالج سے مولوی فاضل
ں کے دیال سنگھ ہائی سکول میں اور اورینٹل کالج میں لگ گئے۔ کچھ عرصہ بعد دیال سنگھ کالج میں پروفیسر ہو گئے اور بقیہ عمر
جنوری ۱۹۵۱ء کو انتقال کیا۔
شاعر یا ادیب کے صحافی زیادہ تھے۔ سب سے پہلے ۱۹۱۰ء میں لدھیانہ سے ماہنامہ آفتاب اردو نکالا

۱۹۱۰ء میں مخزن کے مدیر بنے اور پانچ سال بلا مبالغہ اس کی ادارت کے فرائض انجام دیتے رہے۔ پھر میاں
ت ایڈیٹر لے لیے۔ ان کا اور اس مشہور و معروف ماہنامہ کا پہلا پرچہ جنوری ۱۹۲۲ء میں ہوا کی ادارت
ں کام کرنے کے بعد مولانا نے اپنا پرچہ ہمایوں کے نام سے جاری کیا جو بچوں کے لیے وقف تھا اور بہت کی
ث کیا جاتا تھا یہ پرچہ ملک سے کچھ پہلے تک جاری رہا۔ اس کے بعد ۱۹۲۹ء میں رسالہ ادبی دنیا جاری کیا۔ یہ
یعنی یہ ادارت شائع ہوتا۔ ۱۹۳۲ء میں مقتدرہ نے لاہور سے شائع کیا۔ لالا ... اس شان سے
اس کے نہ رہنے ...
بلی اور علمی خدمات بھی کچھ کم اہم نہیں۔ انہوں نے لاہور میں مشہور ہندو دھرم ... راجا چند گیہما بند ... اردو ...
ی ادارہ قائم کرنے کا ... دو یا ادارہ خاص اس ادارے کے نگران ہے۔ اس ادارہ نے اردو نظم و نثر کا بہترین
۔ اس سے پہلے بھی وہ دو جلدوں میں اردو نظم و نثر کا انتخاب ادبی ... شائع کر چکے تھے۔ اگرچہ وہ
اور انہوں نے لکھا بہت کچھ اور ان کے شاگرد بھی بہت سے تھے مگر ان کے اپنے کلام کا مجموعہ اب تک شائع

نہیں ہوا۔ مؤلف جدید شعرائے اردو ان کے متعلق لکھتے ہیں:

"وہ ایک عجیب و غریب شخصیت کے مالک تھے۔ بے بدل ادیب، جید عالم، ماہر معانی اور خوش فکر شاعر غرض سب کچھ تھے۔ یہ کہنا قطعی مبالغہ نہ ہوگا کہ انھیں شاعری پر بڑا عبور حاصل تھا اور وہ ایک فطری شاعر تھے ان کے کلام سے ان کی پختہ کاری، ذہانت اور طباعی کا پتہ چلتا ہے۔ وہ اپنے اشعار میں اپنے جذبات و احساسات کی ترجمانی کرنے پر پوری قدرت رکھتے تھے مگر اس میں وہ سوز و گداز پیدا نہ کر سکے جو شاعری کی جان ہے۔"

تپش:- شیخ عبداللطیف تخلص تپش، انگریزی میں ایم۔ اے اور فارسی میں منشی فاضل۔ پاکستان کے نہایت فاضل علمائے ادب اور صاحب اسلوب ادیبوں میں سے تھے۔ ۲۹ اکتوبر ۱۸۹۵ء کو پسرور میں پیدا ہوئے۔ تعلیم لاہور میں پائی۔ شعر گوئی کا مذاق نہایت سنجیدہ اور اعلیٰ پایہ کا تھا۔ ذاتی طور پر نہایت خوش اخلاق اور منکسر المزاج تھے۔ شعر و سخن سے بچپن سے لگاؤ تھا۔ ایم۔ اے فارسی کے امتحان میں آپ پنجاب بھر میں اول آئے تھے۔ گورنمنٹ کالج [illegible] اور [illegible] کالج ملتان میں السنۂ شرقیہ کے پروفیسر رہے۔ پاکستان بننے سے پہلے ہی ۱۹۴۲ء میں ریٹائر ہو گئے۔ ان کے کلام میں پختگی، شگفتگی، اثر و جذب پایا جاتا ہے۔ زبان و بیان پر ان کو پوری قدرت حاصل ہے۔ سادگی اور متانت ان کا خاص وصف ہے۔ مرحوم سر شیخ عبدالقادر کے داماد تھے۔ ان کے صاحبزادے ابوالطاہر حنیف تپش کالج لاہور میں پڑھا رہے ہیں۔

تسکین:- ان کا نام میر حسین تھا اور میر حسن عرف میرن صاحب کے لڑکے تھے۔ تخلص تسکین کرتے تھے۔ دہلی میں پیدا ہوئے۔ گلشن سال ولادت ہے۔ فارسی میں صہبائی کے اور اردو میں شاہ نصیر کے شاگرد تھے۔ دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ آخر میں مومن سے اصلاح لینے لگے تھے۔ شاہ نصیر کا کلام انھوں نے ہی مرتب کر کے شائع کیا تھا۔ تلاش معاش میں لکھنؤ اور میرٹھ وغیرہ پھرتے رہے۔ پھر رامپور میں نوکر ہو گئے۔ [illegible] میں انتقال کیا۔

تسلی:- لالہ ٹیکا رام ان کا نام تھا اور تسلی تخلص کرتے تھے۔ والد کا نام گوپال رائے تھا جو اودھ کی سرکار میں فوج کی بخشی گری پر متعین تھے۔ تسلی کے آباؤ اجداد کا وطن [illegible] تھا۔ تسلی لکھنؤ میں پیدا ہوئے [illegible] دونوں کے خوش فکر شاعر تھے۔ فارسی میں مرزا محمد فاخر مکین اور اردو میں غلام ہمدانی مصحفی کے شاگرد تھے۔ نہایت با اخلاق، با مروت اور سادہ مزاج شخص تھے۔ کتابوں کے شوقین تھے۔ ہزار ہا روپے صرف کر کے نادر کتابوں کا ایک قیمتی کتب خانہ مہیا کیا تھا [illegible] تھے۔ بقول لالہ [illegible] میں، بقول حسرت [illegible] تک زندہ تھے۔

تسلیم لکھنوی:- احمد حسین عرف امیر اللہ، تخلص تسلیم۔ بمقام منگلسی ضلع فیض آباد ۱۲۳۵ھ (۱۸۲۰ء) میں پیدا ہوئے۔ تعلیم و تربیت لکھنؤ میں پائی۔ عربی فارسی میں کمال حاصل کیا۔ [illegible] مرزا اصغر علی خاں نسیم دہلوی کے شاگرد رہے۔ بڑے ہوئے تو واجد علی شاہ کی سرکار میں ۲۲ روپیہ ماہوار پر ملازم ہو گئے۔ اس کے بعد زوال ہونے پر رامپور پہنچے جہاں نواب کلب علی خاں نے ۳۰ روپیہ

منسوب کر دی۔ ۹۴ برس کی عمر میں ۱۳۳۰ھ (۱۹۱۱ء) میں وفات پائی۔ غزلوں کے پانچ دیوان آپ کی یادگار ہیں جن میں سے تین نظم ارجمند، نظم دل افروز، دیوان زادِ خیال چھپ گئے تھے۔ آپ کی مصنفہ مثنویوں کے نام یہ ہیں۔
نالۂ تسلیم۔ شامِ غریباں۔ صبحِ خنداں۔ دل و جاں۔ نغمۂ بلبل۔ شوکتِ شاہجہانی اور گوہر انتخاب۔ رام پور کی تاریخ [illegible] کے نام سے لکھی۔ منظومہ نواب رام پور نظم میں لکھا جس کے تقریباً ۱۲ ہزار اشعار ہیں۔ اس کا قلمی نسخہ رام پور کی سرکاری لائبریری میں موجود ہے۔

تشنہ:۔ ان کا نام محمد علی اور تخلص تشنہ تھا۔ ذوق اور عیش کے شاگرد تھے۔ ان کے حالات بھی اس سے زیادہ نہیں مل سکے۔

تنہا:۔ ان کا نام شیخ محمد عیسیٰ اور تخلص تنہا تھا۔ ان کے آبا و اجداد دہلی کے رہنے والے تھے اور یہ خود بھی دہلی میں پیدا ہوئے تھے مگر بعد میں لکھنؤ کی مستقل سکونت اختیار کر کے ساری عمر وہیں گزار دی۔ نہایت خوش خلق، متواضع، سلیم الطبع، رنگین مزاج اور ملامت پسند انسان تھے۔ شیخ غلام ہمدانی مصحفی ان کے استاد اور شیخ امام بخش ناسخ ان کے شاگرد تھے۔ ۱۲۲۲ھ (۱۸۰۷ء) میں ڈاکوؤں نے اثنائے سفر میں قتل کر ڈالا۔ ناسخ نے تاریخ کہی ؎

آج تنہا گیا دنیائے عدم کو تنہا

دیوان اور کلیات چھپ گیا ہے۔

ثاقب:۔ نواب شہاب الدین احمد خاں نام، ثاقب تخلص۔ نواب ضیاء الدین خاں نیر درخشاں کے فرزند۔ داغ کے چچا زاد بھائی اور غالب کے شاگرد تھے۔ اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ ۱۸۶۹ء میں وفات پائی۔

ثاقب لکھنوی:۔ مرزا ذاکر حسین نام، ثاقب تخلص۔ ۲ جنوری ۱۸۶۹ء کو آگرہ میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد آغا محمد حسن کا قزلباش بعد میں آگرہ کی سکونت ترک کر کے لکھنؤ چلے آئے۔ ان کی تعلیم و تربیت لکھنؤ ہی میں ہوئی۔ بچپن ہی سے شعر و شاعری کا شوق پیدا ہو گیا جو عمر کے ساتھ بڑھتا رہا یہاں تک کہ ہر وقت شعر گوئی میں مشغول رہنے لگے جس کی وجہ سے زندگی کے راستے میں اکثر ٹھوکریں کھائیں اور تکلیف اٹھائی۔ حصولِ معاش کے لیے کچھ تجارت کا سلسلہ شروع کیا جس میں گھاٹا ہوا، ساری جمع پونجی گنوا دی۔ پھر ۱۹۰۶ء میں [illegible] میں ملازم ہو گئے۔ ۱۹۰۸ء میں مہاراجہ محمود آباد سے تعلق ہو گیا اور میر منشی کا عہدہ ملا۔ تقسیم ملک کے وقت یہ ملازمت بھی ختم ہو گئی اور گھر بیٹھ گئے۔ ۱۹۴۹ء میں وفات پائی۔ کلام میں زبان، جذبہ، روانی، سوز و گداز اور عاشقانہ رنگ ہے۔ ذاتی لحاظ سے بہت خوش مزاج، با اخلاق، صاحبِ مروت اور خاکسار طبیعت کے انسان تھے۔

جرأت:۔ ان کا اصل نام یحییٰ امان تھا مگر شیخ قلندر بخش کے نام سے مشہور ہیں۔ جرأت تخلص ہے۔ دہلی کے رہنے والے اور میاں جعفر علی حسرت کے شاگرد تھے۔ شاعری کے علاوہ نجوم اور موسیقی سے بھی ذوق رکھتے تھے۔ جوان ہوتے ہی نواب بریلی کے ہاں

جاکر ملازم ہو گئے، پھر لکھنؤ پہنچے اور مرزا سلیمان شکوہ کے پاس نوکر ہو گئے۔ انشا سے اکثر چشمکیں رہتی تھیں۔ جوانی ہی میں آنکھوں سے معذور ہو گئے تھے۔ غزل ان کا خاص مضمون ہے۔ قصیدہ وغیرہ کو ہاتھ نہیں لگایا۔ دیوان موجود ہے۔ آزاد ان کے متعلق کہتے ہیں "طبیعت غزل گوئی کے لیے عین مناسب واقع ہوئی تھی۔ غریب، ظریف، خوش طبع، عاشق مزاج تھے، طبیعت عشرت پسند تھی اور ساری عمر عیش میں گزری۔ کلام میں بلند پروازی، لفظوں میں شان و شکوہ اور معنوں میں دقت نہیں، مگر کہتے ایسا تھے کہ اب تک دل پھڑک اٹھتے ہیں۔ جب مشاعرے میں غزل پڑھتے تھے تو جلسے کے جلسے لوٹ پوٹ ہو جاتے تھے۔" ۱۲۲۵ھ (۱۸۱۰ء) میں لکھنؤ میں انتقال ہوا۔ ناسخ نے تاریخ لکھی ہے

ہائے ہندوستاں کا شاعر مرا

۲۵ ۲ ۱ھ

جلال لکھنوی ۔ حکیم سید ضامن علی جلال لکھنوی بہت مشہور غزل گو شاعر ہیں۔ ۱۲۵۰ھ (۱۸۳۴ء) میں پیدا ہوئے۔ شعر میں پہلے میر علی خاں ہلال اور ان کے استاد رشک اور نواب فتح الدولہ برق کے شاگرد ہیں۔ ابتداءً برسوں تک نواب یوسف علی خاں اور نواب کلب علی خاں والیان رام پور کے ہاں ملازم رہے۔ وہاں ان کے معاصر داغ، تسلیم اور امیر مینائی تھے۔

اس صحبت کے بکھرنے کے بعد آپ نواب حسین میاں والی منگرول کے ہاں چلے گئے اور آخر عمر میں وطن آ گئے جہاں ۷۶ برس کی عمر میں ۵ شوال ۱۳۲۷ھ (مطابق ۲۰ اکتوبر ۱۹۰۹ء) کو وفات پائی۔ تصانیف میں چار دیوانوں کے علاوہ سرمایۂ زبان اردو، منتخب القواعد، تنقیح اللغات، گلشن فیض، رسالہ دستور الفصحا، مفید الشعرا ان کی یادگار ہیں۔ شاگرد بہت ہیں۔ جن میں سے بعض کے نام یہ ہیں: میر ذاکر حسین یاس، آرزو لکھنوی، احسان شاہجہان پوری اور سردار دوم سنگھ۔

جلیل مانک پوری : نواب فصاحت جنگ حافظ جلیل حضرت امیر مینائی کے ممتاز شاگرد اور ان کے جانشین تھے۔ امیر اللغات کی تدوین میں ان کے شریک تھے۔ اس کے بعد حیدر آباد دکن چلے گئے۔ داغ کے انتقال کے بعد آپ ہی نظام دکن میر محبوب علی خاں کے استاد مقرر ہوئے اور نواب فصاحت جنگ خطاب پایا۔ حیدر آباد میں محبوب الکلام اور رسالہ صوفی کے ایڈیٹر رہے۔ تذکیر و تانیث پر ان کی ایک تصنیف لاجواب ہے۔ اپنے استاد کی سوانح حیات بھی قلمبند کی تھی اور دکن کی ایک تاریخ بھی مرتب کی تھی۔ ان کے علاوہ آپ کی تصنیفات حسب ذیل ہیں:

تاج سخن۔ جان سخن۔ معراج سخن۔ سرتاج سخن۔ معیار اردو۔ عطر سخن۔ اردو کا عروض۔ گل صد برگ۔ روح سخن، نجم سخن، نو بہار سخن
آخر الذکر تینوں غیر مطبوعہ ہیں۔

جنوری ۱۹۴۶ء (۱۳۶۵ھ) میں بمقام حیدر آباد انتقال کیا۔ ولادت ۱۲۸۲ھ (۱۸۶۵ء) میں مانک پور اودھ میں ہوئی۔
مؤلف تذکرہ جدید شعرائے اردو نے سال پیدائش ۱۸۶۹ء لکھا ہے۔

ان کی شاعری کی خصوصیات کے متعلق اس تذکرہ میں حسب ذیل رائے ظاہر کی گئی ہے:

(۱) سادگی بیان کے ساتھ ساتھ نازک خیالی۔

(۲) غزلوں میں الفاظ کی ابا زنشست سے ترنم کا لطف۔

(۳) بیانِ حسن و عشق میں روزمرہ و سلاست کی روانی۔

ان کے بہت سے اشعار رعایتِ لفظی اور محاورہ بندی کے طلسم سے باہر نہیں نکلے۔ تاہم بندش کی چستی اور بیان کی سلاست اس رنگ کو بھی دلپسند بنا دیتی ہے۔ ان کا اصل رنگ حسن و عشق کا اظہار اور جذبات نگاری ہے۔ ان کے دیوان سہلِ ممتنع کا بہت اچھا نمونہ ہیں۔ ہمارے دوست جناب کسریٰ منہاس نے ان کی ہجری و عیسوی دونوں تاریخیں لکھی ہیں جو قارئین کرام کی دلچسپی کے لیے یہاں لکھی جاتی ہیں۔

منہ سے کسریٰ نے یہ کہا سالِ وفات
ہے امام الفن جلیل اللہ کو رحلت ہوئی تھی (۱۳۶۵ھ)

اور عیسوی تاریخ سے
نکلا ہے فرد بگ میں اپنے یہ سالِ فوت
بگ بن سے اصل ہے رحلت جلیل کی (۱۹۴۶ء)

جوان: ان کا نام مرزا نسیم بیگ اور تخلص جوان تھا۔ فن شعر میں مصحفی کے شاگرد ہیں۔ مرزا سلیمان شکوہ سے ان کے بزرگ متوسل تھے۔

جوشش: شیخ محمد روشن، [illegible] جوشش تخلص اور وطن عظیم آباد (پٹنہ)۔ سید علی حسن صاحب [illegible] ان کی بلندیٔ فکر، قدرتِ تخیل اور مہارت [illegible] کی بہت تعریف کی ہے۔

دیوان کے علاوہ انھوں نے شعرا کا ایک تذکرہ بھی لکھا تھا جو اب نہیں ملتا۔ تیرھویں صدی ہجری میں وفات پائی۔ صحیح سنہ معلوم نہیں ہو سکا۔

جوہر: رئیس الاحرار مولانا محمد علی جوہر [illegible] سے کون واقف نہیں۔ ہندوستان کی جنگ آزادی کے بہت زبردست علم بردار اور مسلمانوں کے محبوب لیڈر تھے۔ [illegible] آزادی کی [illegible] سب [illegible] آزادی کی تڑپ ان کے دل میں تھی وہ ان کے اس شعر سے ظاہر ہے جو انھوں نے [illegible] میں کہا تھا [illegible] غلام ملک میں واپس جانا نہیں چاہتا۔ [illegible] مجھے دو گز زمین [illegible] انھوں نے اپنا [illegible] پورا بھی کر دکھایا [illegible] ۱۸۷۸ء [illegible] بیت المقدس [illegible] انگریزی، اردو [illegible] ادیب [illegible] خطیب [illegible] سیاست دان اور [illegible] انسان تھے۔ [illegible] رام پور میں پیدا ہوئے۔ دو برس کے تھے کہ والد کا انتقال ہو گیا۔ والدہ نے [illegible] کی تعلیم [illegible] انگلستان بھیجے گئے۔ واپس آ کر رام پور [illegible] ملازمت کی مگر جلد ہی [illegible] ۱۹۱۱ء کو [illegible]

زبردست معارضے لکھے۔ مولانا شاہ پرواز کی کے ایسے شاندار نمونے دکھائے کہ مشہور انگریز ادیب ایچ۔ جی۔ ویلز نے کہا محمد علی نے برک کی زبان، میکالے کا قلم اور نپولین کا دل پایا ہے:

مولانا کے اشعار جذب اثر اور جوش سے بھرے ہوتے تھے۔ "کلام جوہر" ان کی منظومات کا مجموعہ ہے مگر شاعری ان کا اصل میدان نہیں۔ ان کی عظمت کے جذبے سیاست کے میدان میں گزرے ہیں۔ کاش محمد علی جیسے با ہمت شخص ہمہ وقت مستقل مزاجی اور صداقت پیشہ لیڈر مسلمانوں کو جلد ہی میسر آجاتے۔

چکبست:۔ پنڈت برج نرائن نام، چکبست تخلص۔ وطن فیض آباد (یو۔ پی) ۱۸۸۱ء یا ۱۸۸۲ء میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۰۵ء میں بی۔ اے کرنے کے بعد ۱۹۰۸ء میں وکالت کا امتحان پاس کیا اور لکھنؤ میں وکیل ہو گئے۔ ۱۲ فروری ۱۹۲۶ء کو فالج کے حملے سے وفات پائی۔ شاعری کا شوق بچپن سے تھا۔ کسی کے شاگرد نہیں ہوئے۔ ان کی شاعری میں حب الوطنی اور قوم پرستی نہایت نمایاں ہے۔ ان کی منظومات کا مجموعہ صبح وطن کے نام سے چھپا۔ علاوہ ازیں مقالات و مضامین چکبست کے نام سے شائع ہوئے۔ مگر چکبست و شرر ان کے ان تنقیدی مضامین کا مجموعہ ہے جو مثنوی گلزار نسیم سے متعلق مولانا عبدالحلیم شرر کے جواب میں لکھے۔ علاوہ گلدستہ پنج کا دیباچہ اور مثنوی گلزار نسیم پر مقدمہ بھی خوب لکھا۔ داغ کے کلام پر تنقید ان کے وجدان صحیح اور خوش ذوقی کا بہترین نمونہ ہے۔

حاتم:۔ دلی کے قدیم شاعروں میں سے ہیں۔ شیخ ظہور الدین نام تھا اور حاتم تخلص کرتے تھے۔ دہلی میں شیخ فتح الدین کے ہاں ۱۶۹۹ء میں پیدا ہوئے۔ سپاہی پیشہ انسان تھے مگر نوجوانی سے شعر کا چسکا لگ گیا۔ نواب عمدۃ الملک امیر خان کے ندیم خاص اور داروغہ تھے۔ بعد ازاں بادشاہ محمد شاہ کے ہو گئے اور ملازمت ترک کر کے درویشی اختیار کر لی۔ تاریخ وفات میں اختلاف ہے۔ مصحفی ۱۷۸۱ء بتاتے ہیں۔ بعض تذکروں میں ۱۷۹۱ء درج ہے۔ صاحب مراۃ الشعراء نے ۱۷۸۳ء لکھا ہے۔

"دیوان زادہ" ان کا اردو دیوان ہے جو پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں محفوظ ہے۔ اس میں دو ہزار اشعار ہیں۔ فارسی دیوان بھی مرتب کیا تھا۔ ایک مثنوی قہوہ کی تعریف میں بھی لکھی ہے۔ ۔۔ سال کے طویل عرصے تک شعر کہتے رہے۔ مرزا رفیع سودا اور عبدالحی تاباں ان کے شاگردوں میں سے ہیں۔

حالی:۔ نام خواجہ الطاف حسین، تخلص حالی۔ خواجہ ایزد بخش کے بیٹے اور پانی پت کے رہنے والے تھے۔ باپ کی طرف سے انصاری اور والدہ کی طرف سے سید ہیں۔ ۱۸۳۷ء میں پیدا ہوئے۔ فن شعر میں غالب اور شیفتہ کے شاگرد ہیں۔ عربی فارسی، منطق، فلسفہ، حدیث، تفسیر، فقہ وغیرہ استادوں سے حاصل کی۔ ۱۸۶۳ء سے ۱۸۷۱ء تک نواب مصطفیٰ خان شیفتہ کے بچوں کے اتالیق رہے۔ شیفتہ کے انتقال کے بعد پنجاب گورنمنٹ بک ڈپو میں ملازم ہو گئے۔ پھر دہلی کے اینگلو عربک سکول میں مدرسی کی۔ دریں اثنا کچھ عرصہ علی گڑھ کالج کے طلباء کے اتالیق کے طور پر رہے مگر پھر دہلی چلے گئے۔ جب ریاست حیدرآباد سے ۷۵ روپے ماہوار وظیفہ مقرر ہو گیا تو مدرسی کی نوکری چھوڑ دی اور باقی وقت تصنیف و تالیف میں بسر کیا۔ یہاں تک کہ ۳۱ دسمبر ۱۹۱۴ء کو پانی پت میں طویل علالت کے بعد آپ کا انتقال ہو گیا۔

آپ نظمِ اردو کے مجدد اور بہت سی کتابوں کے مصنف اور مؤلف ہیں۔ مسدس مد و جزر اسلام کی تصنیف نے آپ کے نام کو ہمیشہ کے لیے زندہ کر دیا ہے۔ اس کے علاوہ بہت سی معرکۃ الآرا اخلاقی، اصلاحی اور معاشرتی نظمیں آپ نے لکھیں جن میں سے اکثر کو نہایت قبولیت حاصل ہوئی۔ مثلاً مناجاتِ بیوہ، مثنوی حقوقِ اولاد، حبِ وطن، تحفۃ الاخوان، شکوۂ ہند اور چپ کی داد وغیرہ۔ دیوان ۱۸۹۳ء میں شائع ہوا جو بجائے خود جدید شاعری کا بہترین نمونہ تھا۔ نثر میں حیاتِ سعدی، مقدمہ شعر و شاعری، یادگارِ غالب اور حیاتِ جاوید نہایت مشہور ہیں۔ سرسید احمد خاں کے تعلیمی مشن کو کامیاب کرنے میں حالی کا بہت بڑا حصہ ہے۔ ۱۹۰۴ء میں آپ کو شمس العلماء کا خطاب ملا۔ حالی اخلاق اور انسانیت کے لحاظ سے سرسید احمد خاں صاحب کے تمام گروہ میں خاص درجہ رکھتے ہیں۔ افسوس ہے کہ اس بے نظیر انسان کی مفصل سوانح عمری اب تک کوئی شائع نہیں ہوئی۔ چھوٹی چھوٹی سوانح عمریاں کئی ہیں جو اکثر تاریخی اور واقعاتی غلطیوں سے پُر ہیں۔

حزیں:- نام سر محمد باقر تھا اور مرزا مظہر جانِ جاناں کے شاگرد تھے اور انہی کے پاس رہتے تھے۔ پھر عظیم آباد چلے گئے جہاں نواب صولت جنگ نے ان کی خوب قدر دانی کی۔ صاحبِ دیوان تھے۔ چمنستانِ شعراء میں ان کے متعلق لکھا ہے: "شعرش رنگین و نمکش شیریں است ... اشعار سوز انگیز و مضامین عجیب بسیار می دارد۔"

حسامی:- حسام الدین حیدر ان کا نام تھا اور حسامی تخلص کرتے تھے۔ ۱۲۳۲ھ میں پیدا ہوئے۔ خدا بخش نویر کے شاگرد تھے۔

حسرت موہانی:- رئیس المتغزلین سید فضل الحسن حسرت موہانی دورِ جدید کے غزل گو شعراء میں نہایت بلند مقام رکھتے ہیں اور غزل کے امام سمجھے جاتے ہیں۔ ۱۸۷۵ء میں موہان ضلع اناؤ میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۰۳ء میں علی گڑھ سے بی۔ اے کیا اور علی گڑھ ہی سے اردوئے معلیٰ جاری کر کے چند سال تک نکالا۔ والد کا نام سید اظہر حسن تھا۔ ان کے بزرگ نیشاپور سے ہندوستان میں آئے اور قصبہ موہان ضلع اناؤ یو۔ پی میں سکونت اختیار کی۔ تسلیم لکھنوی اور نسیم دہلوی کے شاگرد ہیں۔ دوسرے اساتذہ سے بھی فیض حاصل کیا ہے۔ خود کہتے ہیں ~

غالب و مصحفی و میر و نسیم و مومن
طبعِ حسرت نے اٹھایا ہے ہر استاد سے فیض

اعلیٰ درجے کے شاعر ہونے کے علاوہ ممتاز سیاست داں بھی تھے۔ ساری عمر میں صدہا تکلیفیں برداشت کیں۔ انگریزوں کے سخت دشمن اور آزادی کے رکن تھے اور ساری عمر کانگریس کی حمایت میں بسر کر دی۔ ۱۳ مئی ۱۹۵۱ء کو لکھنؤ میں انتقال کیا۔ بہت سے شعراء کے انتخابِ دیوان نہایت کاوش کے ساتھ شائع کیے۔ دیوانِ غالب کی ایک بے نظیر شرح لکھی۔ نکاتِ سخن اصولِ فن پر ان کی لاجواب تصنیف ہے۔ نہایت بااخلاق، منکسر المزاج، سادہ طبع، پابندِ وضع اور صوم و صلوٰۃ کے پابند تھے۔ حج بیت اللہ کا شرف کئی بار حاصل کر چکے تھے۔

حسرت: چراغ حسن نام، حسرت تخلص۔ ۱۹۰۴ء میں ریاست پونچھ کے ایک گاؤں میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام شیخ نور الدین تھا۔ بی۔ اے پاس کرنے سے قبل ہی ... پھر کلکتہ چلے گئے وہاں عصر جدید، جمہور، نئی دنیا، استقلال کے ایڈیٹر رہے۔ کچھ دنوں مولانا ابوالکلام آزاد کے اخبار "پیغام" میں کام کیا۔ پھر ظفر علی خاں نے "زمیندار" میں بلا لیا۔ اس کے بعد شہباز، احسان، اور انصاف کی ادارت کی۔ اپنا اخبار "شیرازہ" بھی شملہ سے نکالا۔ دوسری جنگ میں ملایا چلے گئے۔ وہاں دو فوجی اخباروں کی ایڈیٹری کی۔ پھر لاہور آ گئے۔ ... مقرر ہوئے۔ چار برس یہاں گزرے، پھر ایک جھگڑا ہونے کے باعث ملازمت چھوڑ کر کراچی چلے گئے جہاں کچھ دنوں ماہ نو کی ایڈیٹری کی۔ ریڈیو میں ملازم ہو گئے پھر ... بورڈ کی ... کا اردو ترجمہ کیا۔ بعد لاہور چلے آئے اور "نوائے وقت" میں "افکار و حوادث" لکھنے شروع کیے یہاں تک کہ ۲۶ جون ۱۹۵۵ء کو انتقال ہو گیا۔ سندباد جہازی آپ کا قلمی نام تھا۔ اعلیٰ درجے کے ادیب، نہایت اعلیٰ پایہ کے شاعر، بہترین مصنف، زبان و بیان اور محاورے کے استاد، نکات اور مضحکات کے ... ہر محفل کی جان اور ہر مجلس کی روح رواں تھے۔ صاف، سلیس اور صحیح اردو لکھنے میں اپنی نظیر نہ رکھتے تھے۔ "پرچھائیاں" ان کی انشا پردازی کا شاہکار ہے۔ دیگر تصانیف یہ ہیں: مردم دیدہ، ... ڈاکٹر کیسے کا ... کے خطوط، سرگزشت، اسلام، مطائبات، پنجاب کا جغرافیہ، ... کشمیر۔

حسرت: جعفر علی نام، حسرت تخلص۔ دہلی کے باشندے تھے۔ سعادت گنج کی جو جہاں ... کی دکان کرتے تھے۔ ان شعر میں ... مرزا رفیع سودا کے شاگرد ہیں۔ ان کے کلام کا انتخاب حسرت موہانی نے شائع کیا تھا جو ساڑھے تین سو ... کے قریب ہے۔ ان کا کلام تصنع اور ... رعایت لفظی سے پاک، سادگی سے ... اور ... سے لبریز ہوتا ہے۔ ۱۲۰۲ھ (۱۷۹۲ء) میں بمقام لکھنؤ وفات پائی۔ "دہلی کا دبستان شاعری" میں ۱۱۶۵ھ (۱۷۵۱ء) لکھا ہوا ہے۔

میر حسن: میر غلام حسن ابن میر غلام حسین ضاحک نام، حسن تخلص۔ دہلی میں پیدا ہوئے۔ آباء و اجداد کا وطن ہرات تھا۔ خوش مزاج اور شیریں زبان تھے۔ شعر کا شوق بچپن ہی سے ہو گیا تھا۔ اس فن میں میر درد، میر ضیاء الدین ضیا اور مرزا سودا کے شاگرد ہیں۔ بلوغت سے قبل دہلی چھوڑ کر فیض آباد چلے گئے۔ وہاں سے لکھنؤ آ کر مقیم ہو گئے۔ ان کی شہرت ہندوستان میں لکھنؤ ہی سے پھیلی۔ کلام مسلسل ... لیکن ... ہوتا ہے۔ مثنوی لکھنے میں اپنا جواب نہیں رکھتے۔ ان کا دیوان قریباً آٹھ ہزار اشعار کا مجموعہ ہے۔ حسرت موہانی نے اس کا انتخاب گیارہ سو اشعار میں چھاپا ہے۔ کہتے ہیں کہ ۱۱ مثنویاں لکھیں مگر سحر البیان معروف ہے۔ مثنوی میر حسن سب سے زیادہ مشہور ہے۔ ۱۱۴۰ھ (۱۷۲۷ء) میں پرانی دہلی کے محلہ سید واڑہ میں پیدا ہوئے اور ۶۰ سال کی عمر پا کر ۱۲۰۱ھ (۱۷۸۶ء) میں بمقام لکھنؤ انتقال کیا۔ میر مستحسن خلیق، میر احسن خلق اور میر محسن محسن ان کے تین لڑکے تھے۔ مرثیہ گو شعرا کے امام میر انیس ان کے پوتے تھے۔

ان کی مثنوی سحر البیان کے متعلق آزاد لکھتے ہیں:

"زمانہ نے اس کی سحر البیانی پر تمام شعرا اور تذکرہ نویسوں سے محضر شہادت لکھوایا۔ اس کی صفائی بیان اور لطف محاورہ، شوخی مضمون، طرز ادا اور سوال و جواب کی نوک جھوک حد توصیف سے باہر ہے۔ آج تک کس کا منہ ہے جو اس تعریف کے ساتھ پاؤں شعر ...

موزوں کر سکے۔ قبولِ عام نے اسے ہاتھوں ہاتھ لے کر آنکھوں پر رکھا اور آنکھوں سے دل و زبان کے حوالے کیا۔ ان مثنویوں کا ایک مجموعہ مدت ہوئی نولکشور پریس سے شائع ہوا تھا جس میں سحرالبیان، گلزارِ ارم اور رموز العارفین وغیرہ شامل تھیں۔ اُردو شعراء کا ایک تذکرہ بھی ان کی یادگار ہے جسے انجمن ترقی اُردو نے چھاپ کر شائع کر دیا ہے۔ حسرت کے علاوہ نولکشور پریس سے بھی ان کی غزلوں کا انتخاب شائع ہو چکا ہے۔ علاوہ ازیں ایک صاحب علی حسن نے بھی لکھنؤ سے غزلیات میر حسن کے نام سے ایک کتاب شائع کی تھی۔ محترمی ڈاکٹر وحید قریشی ایم۔ اے پی ایچ۔ ڈی پروفیسر اسلامیہ کالج لاہور نے بڑا زبردست تحقیقی مقالہ میر حسن پر لکھا ہے۔

حسن: حسن رضا خاں ان کا نام تھا۔ بریلی (یو۔ پی) کے رہنے والے اور داغ کے شاگرد تھے۔ ۱۸۵۹ء سالِ پیدائش ہے اور ۱۹۰۸ء سنِ وفات۔

حسین:۔ ان کا نام سید صادق علی تھا اور حسین تخلص کرتے تھے۔ تقریباً ۱۸۶۵ء میں پیدا ہوئے۔ ان پڑھ ہونے کے باوجود اچھے شاعر تھے۔

(آغا) حشر:۔ مشہور ڈرامہ نگار آغا حشر کاشمیری کا نام آغا محمد شاہ تھا۔ وطن کشمیر اور پیدائش امرتسر کی ہے۔ ڈرامہ نویسی کی ابتدا بمبئی میں ہوئی۔ شروع میں بہت سے ڈرامے نیو الفریڈ کمپنی کے لیے تصنیف کیے۔ پھر کلکتے چلے گئے اور وہاں فلم ایکٹریس سے تعلق رہا۔ شکریۂ یورپ اور موجِ زمزم ان کی مشہور نظمیں ہیں۔ بہت سے ڈراموں کے مصنف ہیں۔ ۲۸ اپریل ۱۹۳۵ء کو لاہور میں انتقال کیا۔ یکم اپریل ۱۸۷۹ء کو پیدا ہوئے تھے۔ ڈرامہ نویسی کے علاوہ غزل گوئی میں بھی کمال رکھتے تھے۔

حفیظ جونپوری:۔ ان کا نام محمد علی تھا اور حفیظ تخلص کرتے تھے۔ جونپور کے رہنے والے تھے۔ شیخ عبدالقادر کے مشہور رسالہ "مخزن" کے نامہ نگاروں میں سے تھے اور اس میں ان کی نظمیں اور غزلیں اکثر چھپا کرتی تھیں۔

حیا:۔ شاہ رحیم الدین ان کا نام تھا اور حیا تخلص کرتے تھے۔ پہلے شاہ نصیر کے اور پھر ذوق کے شاگرد رہے۔ ۱۸۰۰ء میں پیدا ہوئے اور [illegible] میں انتقال کیا۔

حیران:۔ میر حیدر علی ان کا نام تھا اور حیران تخلص کرتے تھے۔ فورٹ ولیم کالج کے مشہور مصنف میر شیر علی افسوس ان کے شاگرد تھے اور یہ خود رائے سرب سکھ (یا سب سکھ) دیوانہ کے استاد تھے۔ ضلع بہرائچ کے ایک شخص نے ان پر حملہ کر کے قتل کر دیا۔ مگر مرنے سے پہلے انہوں نے بھی نہایت جواں مردی سے اپنے قاتل پر تلوار کا ایسا بھرپور وار کیا کہ وہ وہیں ٹھنڈا ہو گیا۔ [illegible] گزرے ہیں۔ شاہجہان آباد کے رہنے والے تھے اور [illegible] لکھنؤ کے ہاں سپاہیوں میں ملازم تھے۔ مجموعۂ نغز کا مصنف ان کا

[illegible] شاعری کے متعلق لکھتا ہے: "خوش فکر شاعر ہے، شاعری نے [illegible] جگہ دیدی۔"

خلیق: میر مستحسن نام، خلیق تخلص، میر حسن مصنف مثنوی بدر منیر کے فرزند، میر انیس کے والد اور مصحفی کے شاگرد تھے۔ ابتدا میں غزلیں کہتے تھے پھر صرف مرثیہ کہنے لگے اور اسی میں نام پیدا کیا۔ لکھنؤ اور فیض آباد میں تعلیم پائی۔ سو برس کی عمر سے مشق سخن کا شوق رہا [illegible] آخر میں نوبت تھی [illegible] کرتے تھے کلام نہایت فصیح و بلیغ اور صاف و شستہ ہوتا تھا۔ ۱۲۶۰ھ کے قریب انتقال کیا۔

داغ: مقرب السلطان، بلبل ہندوستان، جہان استاد، ناظر یار جنگ، دبیر الدولہ، فصیح الملک، نواب میرزا خاں [illegible] غزل گو شعرا کے امام ہیں۔ ۲۵ مئی ۱۸۳۱ء کو دہلی میں پیدا ہوئے۔ قلعۂ معلیٰ میں پرورش پائی۔ فارسی غیاث اللغات کے مصنف غیاث الدین سے اور فن خوش نویسی [illegible] سے حاصل کی۔ شعر میں استاد ذوق کے شاگرد اور [illegible] کے معتقد تھے۔ [illegible] اور نشانہ بازی و [illegible] میں بھی طاق تھے۔ ۱۸۵۷ء کے ہنگامے میں دہلی سے نکلے اور رامپور پہنچے اور نواب یوسف علی خاں و کلب علی خاں والیان رامپور کے [illegible] رہے۔ نواب کلب علی کے انتقال کے بعد حیدرآباد کا رخ کیا مگر وہاں کسی نے بات نہ پوچھی۔ پیچھے آئے [illegible] بعد نواب محبوب علی خاں والی حیدرآباد نے خود طلب کیا تو ساڑھے تین برس کے بعد باریابی نصیب ہوئی اور ساڑھے چار سو روپیہ ماہوار تنخواہ مقرر ہوئی جو بعد میں ایک ہزار ہو گئی اور انہیں نواب حیدرآباد کے استاد ہونے کا فخر حاصل ہوا۔ [illegible] ۱۸۹۱ء کا واقعہ ہے۔ زندگی کے باقی ایام نہایت عیش و آرام سے [illegible] کے بعد ذی الحجہ ۱۳۲۲ھ مطابق ۱۴ فروری ۱۹۰۵ء کو ۷۴ سال کی عمر میں انتقال کیا۔ [illegible] ایک صاحبزادی چھوڑی جو نواب سراج الدین خاں سائل کی اہلیہ تھیں۔ سلاست، روانی، [illegible] شاعری اور [illegible] کے کلام کا خاص زیور ہیں۔ [illegible] سا [illegible] مگر [illegible] اب [illegible] بلکہ اگر [illegible] کوئی [illegible] شریک ہوتا تو کہا نہ کہا سکتے۔

ان کی مشہور مثنوی "فریاد داغ" منی جان طوائف کی داستان عشق و محبت ہے۔ آخر عمر میں بھی اختر جہاں طوائف دو سو روپیہ ماہوار ان کے ہاں سے تنخواہ پاتی تھی۔ چار دیوان [illegible] یادگار چھوڑے "گلزار داغ" "آفتاب داغ" "مہتاب داغ" "یادگار داغ" مثنوی فریاد داغ۔ بے شمار شاگرد ہوئے ہیں۔ بعض [illegible] کے نام یہ ہیں۔ نظام دکن میر محبوب علی خاں، [illegible] [illegible] پرشاد، [illegible] احسن مارہروی، جگر مراد آبادی، سب سے بڑھ کر شاعر مشرق علامہ اقبال۔

---

(۲۰) **درد:** ایک نہایت ہی صوفی منش اور مقدس بزرگ تھے۔ [illegible] درد تخلص کرتے تھے۔ [illegible] کے نام سے مشہور ہیں۔ حضرت امام حسن عسکری کی اولاد سے ہیں اور خواجہ [illegible] کے بیٹے تھے۔ ۱۱۳۳ھ (۱۷۲۰ء) میں [illegible] پیدا ہوئے۔ اپنے وقت کے تمام مروجہ علوم سے استفادہ کیا اور اپنے زمانے کے برگزیدہ صوفیائے کرام سے فیض حاصل کیا چونکہ

حصولِ معاش سے بے فکری تھی لہٰذا تمام وقت ذکرِ الٰہی میں گزرتا تھا۔ وطن دہلی تھا اور سودا، میر تقی، مرزا مظہر جانِ جاناں جیسے قادر الکلام ہمعصر [illegible] ۶۶ سال کی عمر میں ۲۴ صفر ۱۱۹۹ھ مطابق ۶ جنوری ۱۷۸۵ء کو دہلی میں انتقال کیا۔ ایک مرید نے تاریخ کہی ؎

حیف دنیا سے سدھارا وہ خدا کا محبوب

میر درد طبقہ فقرا و شعرا دونوں میں یکساں عزت و احترام کے ساتھ یاد کیے جاتے ہیں۔ ان کا اردو دیوان نہایت منتخب اشعار کا ایک خوبصورت مجموعہ ہے۔ ساری عمر نہ کسی کی ہجو کہی نہ تعریف لکھی۔ تمام دیوان زندگی کے آلام، دنیا کی بے ثباتی، تعلق باللہ اور فقر و استغنا جیسے مضامین سے بھرا ہوا ہے۔ فارسی کا دیوان بھی موجود ہے۔ اس کے علاوہ بہت سی کتابیں فارسی میں لکھیں مثلاً رسالہ اسرار الصلوٰۃ، واردات درد، علم الکتاب۔ یہ چھوٹے بڑے ایک سو گیارہ رسالوں کا مجموعہ ہے اور تمام تصوف کے مضامین سے معمور ہیں۔ واقعات درد، رسالہ درد [illegible] تھا۔ ان کی بزرگی اور تقدس کا اتنا شہرہ تھا کہ شاہ عالم بادشاہ نے خود ان کی خدمت میں حاضر ہونا چاہا مگر انھوں نے منظور نہ کیا۔ اور جب ایک روز مجلس تصوف میں بادشاہ بے اطلاع چلے آئے تو کوئی توجہ نہ دی بلکہ خلافِ مجلس ایک حرکت پر سرِ مجلس ٹوک دیا۔ بادشاہ نے معذرت کی۔ ان کی شاعری کے متعلق آزاد کی رائے سننے کے قابل ہے۔ لکھتے ہیں:

"چھوٹی چھوٹی بحروں میں جو اکثر غزلیں کہتے تھے گویا تلواروں کی آبداری نشتر میں بھر دیتے تھے۔ خیالات ان کے سنجیدہ اور متین تھے۔ کسی کی ہجو سے زبان آلودہ نہیں ہوئی۔ تصوف جیسا انھوں نے کہا ہے اردو میں آج تک کسی سے نہیں ہوا۔"

ان کے شاگردوں میں قیام الدین قائم، ہدایت اللہ خاں ہدایت، ثناء اللہ خاں فراق، میر محمدی بیدار، مرزا اسمٰعیل طپش اور محمد پناہ ثنا مشہور ہوئے۔

والؔی: حضرت ملک الحکما [illegible] حکیم مولوی ضمیر حسن والی شاہجہانپوری دورِ موجودہ کے قابل تو شاعروں میں نہایت بلند درجہ رکھتے ہیں اور حضرت امیر مینائی کے جانشین ہیں۔ ۱۲۸۵ھ میں شاہجہانپور کے ایک معزز خاندان میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم گھر ہی پر دلائی گئی۔ چند برس کی عمر سے شعر گوئی کا چسکا پڑا۔ آپ امیر مینائی کے ممتاز شاگردوں میں سے ہیں۔ عربی معقول کی کچھ کتب مولوی محمد علی خیال سے پڑھیں۔ کتب فقہ اور درس [illegible] مشکوٰۃ اور جلالین کی تکمیل مولوی [illegible] مراد آبادی اور مولوی عبد الباسط شاہجہانپوری سے کی۔ طب خاندانی طور پر مولوی حکیم محمد [illegible] اور اس کے بعد حکیم محمود [illegible] خاں سے حاصل کی۔ حکیم صاحب بلحاظ اخلاق و عادات نہایت فرشتہ خصلت انسان ہیں۔ مروت و حیا ان کے اخلاق کا امتیازی وصف ہے۔ نہایت منکسر [illegible] راست باز شخص ہیں اور [illegible] انکساری کے ساتھ پیش آتے ہیں۔ آپ کا کلام اکثر رسائل میں شائع ہوتا رہتا ہے۔ نمونہ دل آپ کے کلام کا مجموعہ ہے۔ آپ کا ایک مجموعہ [illegible] کے نام سے حال ہی میں شائع ہوا ہے۔ اس میں نمونہ دل اور اس کے بعد کا کلام شامل ہے۔ دو دیوان اور [illegible] بھی آپ نے لکھے ہیں۔ آپ کے شاگرد بکثرت ہیں جن میں [illegible] کے نام یہ ہیں۔

ماخذ: شاہجہانپور اور شعرائے شاہجہانپور، مقدمہ شاہجہانپور، محبت [illegible] فضا جالندھری [illegible] تسلیم [illegible] کسری [illegible] پیام شاہجہانپوری، ایڈیٹر اخبار کامیت اسلام لاہور ــــ ۲۰ دسمبر ۱۹۵۹ء کو حضرت والی انتقال فرما گئے۔

دیوانہ: راجا سرب سکھ نام۔ بعض تذکروں میں سرب سنگھ لکھا ہے۔ تخلص بہ دیوانہ: اردو اور فارسی کے نہایت پُرگو شاعر تھے۔ دہلی کے باشندے اور قوم کے کھتری تھے مگر وضع قطع اور لباس بالکل ایرانیوں جیسی رکھتے تھے۔ راجہ ہمانامل دیوان نواب شجاع الدولہ صوبہ دار اودھ کے پیش کار تھے۔ جب دہلی تباہ ہوئی تو دہلی سے لکھنؤ چلے گئے تھے۔ وزیر اور قدرت ... ان کے تین فارسی دیوان ہیں۔ ایک صاحب نگارستان ... ایک دیوان ہے۔ جعفر علی حسرت اور سعید علی حیرت انہی کے شاگرد تھے۔ ۱۲۰۴ھ (۱۷۸۹ء) میں انتقال ہوا۔ کتاب "... خوش فکر ..." کو ... ۱۲۱۴ھ (۱۷۹۹ء) سال وفات لکھا ہے۔ خم خانۂ جاوید میں لکھا ہے کہ بڑے جامہ زیب، نظیر گاہ، خوش وضع، شکیل جوان تھے اور بڑی ایرانی شان سے رہتے تھے۔ مرزا فاخر مکیں سے بارہا اصلاح لی اور اپنے وقت کے مستند شاعر مانے جاتے تھے۔

ذوق: محمد ابراہیم نام۔ شیخ محمد رمضان کے بیٹے۔ ذوق تخلص۔ دہلی کے ایک بہت غریب گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔ ۱۲۰۴ھ (۱۷۸۹ء) میں پیدا ہوئے۔ فن شعر میں غلام رسول شوق اور شاہ نصیر کے شاگرد تھے۔ اکبر شاہ ثانی کے دربار سے خاقانی ہند کا خطاب پایا۔ بہادر شاہ ظفر کے استاد تھے اور قصیدہ گوئی کے فن میں اپنا جواب نہ رکھتے تھے۔ اپنے دور کے بزرگ ترین شعراء میں ... علاوہ شعر کے علم و فضل کے بھی مالک تھے۔ طب میں بھی دخل رکھتے تھے۔ خواب کی تعبیر بھی خوب بتاتے تھے۔ زبان و بیان اور محاورات کے بادشاہ ہیں۔ علم نجوم سے بھی واقف تھے۔ علاوہ بہادر شاہ ظفر کے شمس العلماء مولانا محمد حسین آزاد، نواب مرزا داغ، سید ظہیر الدین ظہیر، سید سجاد ... اور نواب الٰہی بخش خاں معروف اور حافظ غلام رسول ویران بھی ذوق کے تلامذہ میں سے تھے۔ ۱۱ نومبر ۱۸۵۴ء کو انتقال کیا۔ بعد میں آزاد نے دیوان مرتب کیا۔

راقم: "خلاق المعانی" مولوی محمد عبدالرحمن تخلص بہ راقم دہلی کے مشہور ... مصنف اور شاعر تھے۔ آپ فن شعر میں اپنے والد کے شاگرد رہے جن کا نام وہ خود اس طرح لکھتے ہیں: "حضرت رسول ... حاجی الحرمین الشریفین ... شیخ ... ملا ... حضرت مولانا مولوی محمد حسین صاحب ... قدس سرہ العالی ... نقشبندی چشتی شاذلی قادری مصنف ... و غیرہ۔ ریاست بھوپال:

... کا زمانہ تھا اور عربی فارسی کی تعلیم حاصل کر رہے تھے کہ بقول خود ... کے ... ہو گئے یعنی ... شاعری کا جنون پیدا ہوا۔ شعر گوئی کا شوق ... ہوا کہ شعر گوئی کا شوق ... نقل سے ... حسن و عشق میں ... گیا ... زلفوں کا سلسلہ ... عشق ابروئے تلوار کے گھاٹ اتارا اور ... کا فراوانی ... نے ایک ... سے سلمان ... کر دیا۔ مشہور شعر ان کا ہے کہ

جاوٗں قاف سے باہر نہ پرے راقم
جلے مہروں کے پر بیل کھپے تھے ہیں

... الہٰی اور آئینہ کمال ... دیوان یادگار چھوڑے۔ مثنوی مولانا روم کے پہلے دفتر کا منظوم ترجمہ ... شہرت کتاب مرقوم ...

...صفحات پر نہایت عمدگی اور لیاقت سے لکھا اور ۲۹ اپریل ۱۸۹۹ء کو رشید کے اہتمام سے مطبع احسن المطابع دہلی سے چھپ کر شائع ہوا۔ ...بالکل کمیاب اور نایاب ہے۔ حق یہ ہے کہ بے نظیر شرح اور ترجمہ ہے۔ دوسرے دفتر کی شرح مسک الختام کے نام سے اور تیسرے ...تر کی منثور معصوم کے نام سے بھی تیار کی تھی مگر خاندان کے چھپنے کی نوبت نہیں آئی۔ بعارضہ ... ۲۹ ستمبر ۱۹۰۷ء کو انتقال کیا ۷۴ برس کی عمر پائی۔

شوکت: نام محمد جاوید ان کے متعلق لکھتے ہیں کہ قصبہ بت (نواح پانی پت) کے رہنے والے تھے مگر تعلیم دہلی میں پائی اور یہیں ...ابتدائے شباب میں افضل الاخبار ... چھاپا، پرزہ اور خیر خواہ عالم کے برسوں ایڈیٹر رہے۔ دہلی سے باہر ان کی شاعری کی شہرت ...بلاغت زبان، جاری کرنے کے بعد ہوئی۔ طبیعت نہایت ظریف پائی تھی اور زبردست عالم تھے۔ وعظ بہت اچھا کہتے تھے۔ فقہ، معقول، منقول اور کتب حدیث پر کمال عبور تھا۔ داغ دہلی کے نوآموز شاعروں کو کہا کرتے تھے کہ داغ کی موجودگی میں اپنی غزل انہی کو دکھاؤ۔ مرنے سے چار سال پہلے شغل شاعری بالکل ترک کر دی تھی اور وعظ و نصیحت اور درس و تدریس کا اپنا شغل بنا لیا تھا۔

راقم: خواجہ قمر الدین نام، راقم تخلص، وطن دہلی، خواجہ بدر الدین مالک مترجم بوستان خیال کے فرزند اور غالب کے شاگرد تھے۔ ریاست جے پور سے وظیفہ مقرر تھا جس پر گزر اوقات تھی۔ آخر میں دہلی چھوڑ کر جے پور میں سکونت اختیار کر لی تھی جہاں ۱۹۰۹ء کے قریب ان کا انتقال ہوا۔ دیوان چھپ چکا ہے۔ اس کے علاوہ "عقد ثریا" تعلیم نسواں کے متعلق ان کی ایک بہت ہی دلچسپ کتاب ہے جو قصہ کے پیرایہ میں لکھی گئی ہے مگر اس میں کمال یہ دکھایا ہے کہ ہر فقرہ مسجع اور مقفیٰ ہے۔

رخشاں: نواب ضیاء الدین احمد خاں دہلی کے رئیس اور عربی، فارسی اور اردو کے بے مثل عالم تھے۔ فارسی اور اردو میں بہت اعلیٰ پایہ کے اشعار کہتے تھے۔ اردو میں رخشاں اور فارسی میں نیر تخلص کرتے تھے۔ تاریخ کے بہت بڑے فاضل تھے۔ ولیٹ صاحب نے اپنی تاریخ ہند انہی کی مدد سے لکھی تھی۔ سفر نامہ حکیم ناصر خسرو انہی کے کتب خانہ میں بھی موجود تھا جہاں سے ڈاکٹر شیفر نے گورنمنٹ ہند کی وساطت سے منگوایا اور اسے شائع کیا۔ بعد میں وہی اصل نسخہ مولانا حالی نے نواب صاحب سے لے کر دہلی سے ۱۸۸۲ء میں چھاپا۔ سرسید کی آثار الصنادید پر ایک بہت عمدہ تقریظ لکھی، غالب کے دیوان پر مفصل تنقید کی۔ مسدس حالی کے متعلق ایک لطیف رباعی کہی جو مسدس کے پہلے ایڈیشن میں شائع ہوئی۔ غالب کے نہایت عزیز شاگرد تھے۔ باوجود رئیس ابن رئیس ہونے کے نہایت منکسر المزاج اور با اخلاق انسان تھے۔ نایاب اور قلمی کتابوں کا بے نظیر کتب خانہ بڑے شوق سے جمع کیا تھا جس میں بیش قیمت قلمی کتابیں تھیں۔ ۱۰ رمضان ۱۳۰۲ھ مطابق ۲۳ جون ۱۸۸۵ء بروز شنبہ انتقال کیا۔ شمس العلماء مولانا شبلی نے فارسی میں پر درد مرثیہ لکھا۔ حضرت مولانا حالی ان کے متعلق فرماتے ہیں ؎

عمریست کہ ہمچو ... جہان است — وز قحط رجال سر بسر ویران است
اما ... شکوہ کوکب نخشش — روشن ز فروغ نیر رخشاں است

رسا: ان کا نام منشی حیات بخش تھا اور رسا تخلص کرتے تھے۔ رام پور کے رہنے والے تھے مگر دہلی میں شاعری پروان چڑھی۔ رسا مرزا داغ دہلوی کے ارشد تلامذہ میں سے تھے شمس العلماء مولانا آجور نجیب آبادی فن شعر میں آپ ہی کے شاگرد ہیں۔

رشک: میر علی اوسط نام رشک تخلص۔ بمقام فیض آباد ۱۲۱۴ھ (۱۷۹۹ء) میں پیدا ہوئے۔ بہت دنوں تک لکھنؤ میں رہے پھر کربلائے معلیٰ میں مستقل سکونت اختیار کرلی۔ فن شعر میں ناسخ کے شاگرد اور تنویر شکوہ آبادی کے استاد ہیں۔ اردو زبان کی ایک ضخیم لغت مدتوں کی محنت کے بعد مرتب کی مگر اسے چھپنا نصیب نہ ہوا۔ نظم مبارک اور نظم گرامی ان کے کلام کے مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ ۱۲۸۴ھ (۱۸۶۷ء) میں وفات پائی۔

رشکی: نواب محمد علی خاں نام رشکی تخلص۔ نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ رئیس جہانگیر آباد ضلع بلند شہر کے فرزند اکبر تھے۔ اپنے والد صاحب کی طرح شعر کا نہایت ستھرا مذاق رکھتے تھے اور دہلی کی ادبی مجالس کی رونق تھے۔ فن شعر میں غالب سے تلمذ تھا۔ حضرت مولانا حالی کو ان کا اتالیق مقرر کرکے شیفتہ اپنے ساتھ جہانگیر آباد لے گئے تھے جہاں آٹھ سال تک مولانا نے یہ خدمت بہت احسن طریقہ پر ادا کی۔ اپنے والد کی وفات کے بعد ہی جہانگیر آباد کے رئیس ہوئے۔ ۱۸۹۹ء میں وفات پائی۔ حضرت مولانا حالی نے بہت پُر درد مرثیہ ان کا فارسی میں کہا۔

سند لکھنوی: سید محمد خاں نام اور سند تخلص تھا۔ نواب غیاث الدین غیاث الدولہ کے بیٹے تھے۔ ۱۰ ربیع الاول ۱۲۱۲ھ مطابق ۳ ستمبر ۱۷۹۷ء کو فیض آباد میں پیدا ہوئے۔ بڑے ہوئے تو شعر و شاعری کا شوق پیدا ہوا۔ وفا تخلص اختیار کیا اور میر حسن خلیق کے شاگرد ہو گئے۔ ۱۲۳۸ھ (۱۸۲۲ء) میں لکھنؤ آگئے اور یہیں کی رہائش اختیار کرلی۔ یہاں آکر خواجہ حیدر علی آتش کی شاگردی اختیار کی اور وفا کی جگہ اپنا تخلص سند رکھ لیا اور خلیق کی شاگردی کے زمانہ کا سارا کلام دریا میں غرق کر دیا۔

گلدستۂ عشق ان کے کلام کا مجموعہ ہے۔ آخر عمر میں کربلا کی زیارت کو روانہ ہوئے تھے کہ بمبئی ہی پہنچے تھے کہ پیغام اجل آگیا۔ تاریخ انتقال معلوم نہ ہو سکی۔ ۱۲۸۲ھ کے قریب سمجھئے۔ دیوان میں غزلیات کے تقریباً سات ہزار اشعار ہیں۔

رنگین: نام سعادت یار خاں تخلص رنگین۔ سرہند میں پیدا ہوئے۔ دہلی میں تعلیم پائی۔ فن شعر میں شاہ حاتم کے شاگرد تھے ظرافت و بذلہ سنجی کے ساتھ طبیعت ایجاد پسند تھی۔ ہر صنف شعر میں انھوں نے اپنے فن کا مظاہرہ کیا ہے۔ حاضر جوابی میں طاق تھے۔ شہسواری، تیراندازی میں کمال حاصل تھا۔ گھوڑوں کے علاج میں ماہر تھے۔ دہلی سے نکل کر کچھ مدت مرزا سلیمان شکوہ کے دربار میں بھی بمقام لکھنؤ رہے پھر آخر میں گوشہ نشین ہو گئے تھے۔ ۱۱۷۰ھ (۱۷۵۷ء) میں پیدا ہوئے اور ۱۲۵۱ھ (۱۸۳۵ء) میں وفات پائی۔ چار دیوان ان کی یادگار ہیں جن کے نام یہ ہیں۔ ریختہ۔ بیختہ۔ آمیختہ اور انگیختہ۔ ان کے علاوہ ایجاد رنگین۔ فرس نامہ۔ رنگین نامہ۔ مجالس رنگین اور مثنوی دلپذیر بھی ان کی تصانیف ہیں۔ تذکرۂ شعرا ... نہایت مستند کتاب ہے جو انجمن ترقی اردو نے شائع کیا ہے۔

ریاض: سید ریاض احمد نام اور ریاض تخلص ہے۔ خیرآباد وطن ہے جہاں ۱۲۷۱ھ (۱۸۵۵ء) میں پیدا ہوئے۔ شعبہ ... (۲۴) والد کا نام سید طفیل احمد تھا۔ بچپن ہی سے شعر و شاعری کا شوق پیدا ہو گیا۔ پہلے لکھنؤ جا کر اسیر کے شاگرد ہوئے اور ان کے انتقال کے بعد امیر مینائی کے۔ معدودے چند نہایت بلند پایہ غزل گو شعراء میں سے ہیں۔ ان کے اشعار نہایت دلکش، دلفریب اور دلچسپ ہیں۔ ریاض الاخبار، پیام کل، فتنہ، عطر فتنہ، گلکدۂ ریاض اور گلچیں وغیرہ پرچے وقتاً فوقتاً نکالے۔ حرم سرا ——— اور نظارہ تین ناول بھی آپ کی ہیں۔ ریاض رضوان کے نام سے آپ کا دیوان چھپ گیا ہے۔ مختلف مضامین عقیل احمد جعفری نے مرتب کر کے نثر ریاض کے نام سے چھاپے۔ اشعار کا انتخاب ... کے نام سے شائع ہو۔ ۱۳ ربیع الثانی ۱۳۵۳ھ مطابق ۲۰ جولائی ۱۹۳۴ء کو انتقال ہوا۔

— —

زکی: جناب سید محمد زکریا نام، زکی تخلص۔ کشمیر کے سادات میں سے تھے۔ بمقام دہلی ۱۲۴۵ھ (۱۸۲۹ء) میں پیدا ہوئے۔ مختلف اوقات میں الٰہ آباد، بریلی، گورکھپور اور بدایوں میں ڈپٹی انسپکٹر آف اسکولز رہے۔ عربی اور فارسی بہت اچھی جانتے تھے۔ حدیث، تصوف اور نجوم میں پوری مہارت رکھتے تھے۔ موسیقی اور خوش نویسی سے بھی بہت زیادہ شوق تھا۔ فن شعر میں طرز قدیم کے استاد مانے جاتے ہیں۔ اوّل اوّل صہبائی، پنڈت رام کشور نسل سے اور بعد میں غالب سے اصلاح لیتے تھے۔ مولوی سید احمد دہلوی مؤلف فرہنگ آصفیہ ان کے شاگرد ہیں۔ بدایوں میں ۱۳۲۰ھ (۱۹۰۲ء) میں انتقال کیا۔ دیوان چھپ گیا ہے۔

———

ساحر دہلوی: پنڈت امرناتھ نام اور ساحر تخلص ہے۔ دلی کے رہنے والے اور نہایت باذوق صاحب علم اور پرانی وضع کے بزرگ تھے۔ ان کے والد ... سے بڑے پنڈت جانکی ناتھ مدن رئیس دہلی تھا۔ آپ رائے بریلی میں ۲۹ مارچ ۱۸۶۳ء کو پیدا ہوئے۔ بارہ برس کی عمر میں پنڈت ... سے شاگرد ہوئے۔ عربی و فارسی کی تعلیم نہایت لائق اور فاضل علماء سے پائی۔ شاعری میں مولوی عبدالحلیم حاتم کاشانی کے شاگرد رہے۔ نہایت وسیع الاخلاق، منکسر المزاج بزرگ تھے۔ وضع قطع میں پرانے بزرگوں کی نشانی تھے۔ مولانا حالی کے خاص دوستوں میں سے تھے۔ [illegible] میں انتقال کیا۔ کلام ساحر، ترجمہ ... ترجمہ ... فارسی ... آپ کی تصنیفات ہیں۔

———

سالک: مرزا قربان علی بیگ نام، مرزا ... بیگ کے فرزند۔ حیدرآباد میں پیدا ہوئے۔ دہلی میں پرورش پائی۔ پہلے ... کے، بعد ازاں غالب کے شاگرد ہوئے۔ ... تخلص کرتے تھے، پھر سالک کہلانے لگے۔ غالب کے بہت ہی شاگرد ... تھا۔ ۱۸۵۷ء کی قیامت میں ... ہو گئے۔ پھر حیدرآباد دکن جا کر محکمہ تعلیمات کے ... مقرر ہوئے۔ حیدرآباد کے زمانۂ قیام میں آپ کچھ مدت تک وہاں سے ایک ماہوار رسالہ مخزن الفوائد کے ایڈیٹر بھی رہے جو نواب مختار الملک بہادر کی زیر سرپرستی اس وقت نکلا کرتا تھا۔ ۱۲۹۷ھ (۱۸۸۰ء) میں آپ کا حیدرآباد ہی میں انتقال ہوا۔

———

سائل دہلوی: جناب نواب سراج الدین احمد خاں سائل دہلوی دور حاضر کے ... نامور غزل گو شاعر۔

۱۸۶۳ء میں دہلی میں پیدا ہوئے۔ نواب شہاب الدین مصنف ثاقب آپ کے والد اور نواب سعید الدین خاں طالب آپ کے چچا تھے۔ فاضل عربی اور فارسی کے عالم تھے۔ ہندی اور سنسکرت سے بھی واقف تھے۔ طب میں بھی خاصا دخل تھا جس میں آپ حاذق الملک حکیم اجمل خاں صاحب شیدا کے شاگرد تھے۔ نواب ضیاء الدین خاں آپ کے دادا تھے۔ دادا کی زیر نگرانی ان کی تعلیم کی تکمیل ہوئی۔ نواب مرزا داغ دہلوی کے نسبتی تھے اور فن شعر میں استاد بھی۔ نہایت نفاست پسند اور جامہ زیب بزرگ تھے۔ مشرقی تہذیب کا عمدہ نمونہ اور پرانے شریفوں کے اخلاق کا مجموعہ تھے۔ ۱۵ ستمبر ۱۹۴۵ء کو طویل علالت کے بعد انتقال کیا۔ غزلوں کے چھ دیوان یادگار چھوڑے مگر چھپا ایک بھی نہیں۔ ان کے مفصل حالات جو ... کے رسالہ البیان کے کئی نمبروں میں چھپے تھے۔ کلام کا انتخاب ... کیا گیا ہے۔

سجاد:۔ میر سجاد صاحب کا نام تھا۔ آگرہ کے رہنے والے تھے اور شاہ نجم الدین آبرو کے شاگرد تھے۔

سراج دکنی:۔ دکن کے مشہور شاعر تھے۔ سید سراج الدین نام، سراج تخلص تھا۔ اورنگ آباد وطن تھا۔ درویش منش اور فقیر دوست شخص تھے۔ کلام میں ... خیالات ہیں جن میں اور مضامین میں صفائی و سادگی پائی جاتی ہے۔ غزلوں میں حسن و عشق اور توحید و معرفت ہے۔ ریختہ گوئی میں ولی کے قائل/مقلد تھے۔ دیوان پانچ ہزار اشعار کا مجموعہ ہے۔ فارسی شعراء کے کلام کا انتخاب منتخب دیوانہا کے نام سے ۱۱۵۵ھ میں کیا جس میں ۸۰ شعراء کے اشعار ہیں۔ ایک مثنوی بوستان خیال کے نام سے ۱۱۴۰ھ میں مکمل کی جس میں ایک ہزار ساٹھ اشعار ہیں۔ ۱۷۱۵ء میں پیدا ہوئے تھے اور ۶ اپریل ۱۷۶۳ء کو انتقال کیا۔

سلیم پانی پتی:۔ ابوالحسن مولوی سید وحید الدین سلیم ۱۸۶۹ء میں پانی پت میں پیدا ہوئے۔ گھر میں نہایت غربت تھی۔ معمولی تعلیم مکتب میں ہوئی پھر ... کی تحصیل کی۔ مولانا حالی کی سفارش سے سر سید کے لٹریری اسسٹنٹ مقرر ہوئے۔ ۱۹۰۰ء میں ایک رسالہ معارف کے نام سے علی گڑھ سے نکالا جو نہایت ہی اعلیٰ پایہ کا ادبی اور تاریخی ماہنامہ تھا۔ پھر پانی پت سے شائع ہونے لگا۔ ۱۹۰۱ء میں بند ہو گیا۔ کچھ دنوں بعد مولانا علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ کے ایڈیٹر ہو گئے۔ مشہور ہفتہ وار مسلم گزٹ بھی لکھنؤ سے بہت عرصہ تک انہی کی ایڈیٹری میں نکلتا رہا۔ پھر ... عثمانیہ یونیورسٹی میں اردو ادب کے پروفیسر ہو کر چلے گئے جہاں آخر عمر تک رہے۔ ۲۹ جولائی ۱۹۲۸ء کو ... بمقام علی گڑھ (یو۔ پی) انتقال کیا۔ مرحوم زبان کے ... فاضل اور زبردست ادیب تھے۔ اعلیٰ درجہ کے شاعر، بے نظیر نقاد اور بہت بڑے ماہر لسانیات تھے۔ نئے الفاظ ایجاد کرنے کی خاص قابلیت تھی۔ نہایت زندہ دل، ہنس مکھ اور خوش مزاج شخص تھے۔ ان کے کلام کا مجموعہ افکار سلیم کے نام سے ... نے ۱۹۳۸ء میں شائع کیا تھا۔ ۲۱۸ صفحات کی مختصر کتاب ہے لیکن آج کل کہیں نہیں ملتی۔ ۱۹۴۷ء کے فسادات میں اس کی ساری کاپیاں تباہ ہو گئیں۔ ... نے ان کے مضامین کا مجموعہ بھی تین جلدوں میں تیار کیا تھا وہ بھی فسادات کی نذر ہوا۔ افادات سلیم کے نام سے مضامین کا ایک مجموعہ چھپ چکا ہے۔ وضع اصطلاحات ان کی نہایت بلند پایہ علمی کتاب ہے۔ حضرت ... کی جو سوانح عمری بھی انہوں نے شائع کی ... سے پہلے مولانا حالی کے مضامین جمع کر کے انہوں نے ہی شائع کیے تھے۔ مولانا حالی کے بہت گہرے دوستوں میں سے تھے۔

یہ مطبع بھی یہاں بہت جلد قائم کیا تھا جس پر بہت اچھی اچھی کتابیں انھوں نے شائع کیں۔

سلیمانؔ: - نواب مرزا سلیمان شکوہ شاہزادگانِ مغلیہ میں سے اُردو زبان کے بہت زبردست قدردان اور سرپرست گزرے ہیں۔ سلیمان تخلص کرتے تھے۔ شاہ عالم ثانی کے لڑکے تھے اور دہلی کی سکونت ترک کر کے لکھنؤ میں جا بسے تھے۔ نواب آصف الدولہ والی اودھ ان کو ہزار روپے ماہوار وظیفہ دیتے تھے۔ ۳۰ سال کامل لکھنؤ میں رہنے کے بعد آگرہ چلے گئے تھے۔ ۱۲۵۴ھ میں انتقال کیا۔ علی الترتیب [illegible] مصحفی اور انشا سے مشورۂ سخن کرتے رہے۔ ان کا دربار شعراء اور اہلِ علم کا ملجا و ماویٰ تھا اور مرزا ایسا مرکز تھے کہ ہر شاعر و ادیب ادھر ہی کی طرف چلا آتا تھا اور ان کی سرکار سے وظیفہ، انعام اور خلعت پاتا تھا۔ راقم الحروف کے جدِ امجد شیخ غلام غوث بھی مرزا کی سرکار میں بہت معزز عہدے پر تعینات تھے اور لکھنؤ سے مرزا کے ساتھ ہی آگرہ آ گئے تھے۔ اسی سرکار سے وابستگی کی حالت میں ان کی وفات ہوئی۔

ضرورت ہے کہ اُردو کے اس سچے قدردان اور سرپرست کی ادبی قدردانیوں اور اس کے ادبی و علمی کارناموں کے متعلق ایک مبسوط مضمون مرتب کیا جائے جو اب تک نہیں ہوا۔

سوداؔ: - مرزا کا نام محمد رفیع اور باپ کا نام مرزا محمد شفیع تھا جو بسلسلۂ تجارت کابل سے دہلی آئے اور یہیں رہ پڑے۔ سودا ۱۱۲۵ھ (۱۷۱۳ء) میں پیدا ہوا۔ کابلی دروازہ کے محلہ میں مکان تھا۔ جوان ہوا تو شاعری کی سوجھی۔ پہلے سلیمان قلی خان وداد کا شاگرد ہوا۔ پھر شاہ حاتم سے مشورہ کرنے لگا۔ فارسی چھوڑ کر اُردو شعر کہنے کی ترغیب خان آرزو نے دی۔ بہت جلد شاعری میں کمال حاصل کر لیا۔ یہاں تک کہ شاہ عالم [illegible] ہونے لگے۔ مگر اس وقت کی دلی بد امنی کا گہوارہ بنی ہوئی تھی۔ مجبوراً ۶۰ برس کی عمر میں دلی سے نکلا اور نواب بنگش کے پاس فرخ آباد میں پہنچا۔ وہاں سے ۱۱۸۵ھ (۱۷۷۱ء) میں لکھنؤ آیا۔ نواب شجاع الدولہ نے ہاتھوں ہاتھ لیا اور اس کے بعد آصف الدولہ نے بڑی خاطر مدارات سے چھ ہزار روپیہ سالانہ وظیفہ مقرر کر دیا۔ نہایت عیش و آرام سے زندگی گزار کر ۴ رجب ۱۱۹۵ھ (۲۶ جون ۱۷۸۱ء) کو ۷۰ برس کی عمر میں انتقال کیا۔ شاہ حاتم نے سنا تو کہا: "افسوس ہمارا پہلوانِ سخن مر گیا۔"

سودا کا کلیات بڑا ضخیم ہے جسے حکیم سید اسلم الدین خاں نے مرتب کیا۔ آزاد کی زبانی کلیاتِ سودا کی کیفیت سنیے:

"اوّل قصائد اُردو، بزرگانِ دین کی مدح میں اور اہلِ دول کی تعریف میں ہیں۔ اسی طرح چند قصائد فارسی، ۲ مثنویاں ہیں۔ بہت سی حکایتیں اور لطائف منظوم ہیں۔ ایک مختصر دیوان فارسی کا تمام و کمال۔ دیوانِ ریختہ جس میں بہت سی [illegible] غزلیں (قریباً ۵ ہزار اشعار)، اور مطلع، رباعیاں، مستزاد، قطعات، تاریخیں، پہیلیاں، واسوخت، ترجیع بند، مخمس اور ہجویں سب کچھ کہا ہے۔ ایک تذکرہ شعرائے اُردو کا ہے۔ ایک کتاب عبرۃ الغافلین مرزا فاخر مکین کے جواب میں لکھی ہے۔"

مرزا اُردو کا سب سے بڑا اور سب سے زیادہ بدنام ہجوگو شاعر ہے جس کی ہجو کا یہ عالم تھا بقول آزاد "شرم کی آنکھیں بند اور بے حیائی کا منہ کھول کر بے نقط سناتا تھا کہ شیطان بھی پناہ مانگے۔" سودا کی ہجوگوئی اس قدر بڑھی ہوئی تھی کہ جانور تک کو نہ بخشا۔ یہ ہجویں عفونت میں شدید ترین اور اُردو شاعری کی پیشانی پر سیاہ داغ۔

(میر) سوز: سید محمد میر نام اور سوز تخلص تھا۔ حضرت قطب عالم گجراتی کی اولاد سے ہیں۔ آباؤ اجداد بخارا سے آکر شاہجہان آباد میں آباد ہو گئے۔ میر سوز دہلی ہی میں پیدا ہوئے اور یہیں پرورش اور تعلیم پائی۔ جب شہر میں ... طوائف الملوکی کے باعث دہلی سے نکل کر فرخ آباد پہنچے اور وہاں سے مرشد آباد۔ کچھ دنوں وہاں رہ کر پھر لکھنؤ آئے۔ یہاں نواب آصف الدولہ نے ان کی شاگردی اختیار کی اور یہاں باقی ماندہ عمر یہیں گزاری۔ ۱۱۳۳ھ (۱۷۲۱ء) میں پیدا ہوئے اور ۱۲۱۳ھ (۱۷۹۸ء) میں وفات پائی۔ شاعری کے ساتھ ساتھ شہسواری، تیر اندازی میں بھی ماہر تھے۔ خط نہایت عمدہ اور پاکیزہ تھا۔ خوش گفتار، عالی طبیعت، درویش صفت اور ظریف الطبع بزرگ تھے۔ دیوان تقریباً سات ہزار اشعار کا مجموعہ ہے۔

سیماب: عاشق حسین نام، محمد حسین صدیقی کے فرزند۔ آگرہ کے رہنے والے۔ ۱۲۹۸ھ (۱۸۸۰ء) میں پیدا ہوئے۔ عربی ادب، اصول، منطق اور فارسی کی تحصیل کے بعد انگریزی کی تحصیل شروع کی۔ ایف۔ اے میں تھے کہ والد کے انتقال کے باعث تعلیم ترک کر دی اور ریلوے میں ملازم ہو گئے۔ شعر و شاعری کے شوق میں ملازمت کو خیرباد کہا اور آگرہ آکر زبان اور ادب کی خدمت میں مصروف ہو گئے۔ رسالہ ... جاری کیا۔ پھر آگرہ میں جا کر آگرہ اخبار کی ادارت کی۔ پیمانہ نکالا۔ شاعر اور تاج کے ایڈیٹر بھی رہے۔ قصر ادب قائم کیا اور داغ کے شاگرد ہیں۔ ان کی شاعری کا موضوع بقول خود "حسن و عشق اور عشق حقیقی" ہے۔ باقاعدہ شاعری کا کوئی ... بے شمار شاگرد بنائے۔ ... میں مبتلا رہنے کے بعد ... سال کی عمر میں ۳۱ جنوری ۱۹۵۱ء کو کراچی میں انتقال کیا۔ بقول خود ۲۸ کتابوں کے مصنف تھے۔ ان کی نظموں کے تین مجموعے ... اور ... کے نام سے چھپ چکے ہیں۔ ... ساز و آہنگ ... کار امروز اور دستور الاصلاح بھی ان کی کتابیں ہیں۔ خوش گو اور قادر الکلام شاعر تھے۔

شاد عظیم آبادی: سید علی محمد نام اور شاد تخلص تھا۔ والد سید عباس مرزا حضرت امام ... کی اولاد سے تھے۔ ۱۸۴۶ء کو عظیم آباد میں پیدا ہوئے۔ عربی فارسی اور اردو کی تحصیل قابل اساتذہ سے کی۔ بچپن ہی سے شاعری کا شوق پیدا ہوا۔ شاہ الفت حسین فریاد کی شاگردی کی۔ ... خاندانی ... بڑی حیثیت تھی۔ شاد نے اپنی ساری عمر ادب اور زبان کی خدمت میں گزار دی۔ ... ۲۲ سال تک آنریری مجسٹریٹ رہے۔ جنوری ۱۹۲۷ء میں انتقال ہوا۔ خان بہادر کا خطاب ملا۔ نیز ایک ہزار سالانہ وظیفہ بھی ملتا تھا۔ بہت سی کتابوں کے مصنف تھے جو بعض چھپ گئی ہیں، بعض نہیں چھپیں۔ نہایت خوش گو شاعر اور اعلیٰ درجہ کے ادیب تھے۔ ان کی تصانیف کے نام یہ ہیں: کلام شاد، ... فکر بلیغ، ... فصاحت و بلاغت ... کے نام سے شائع ہوا ہے۔

شاد: ہز ایکسیلنسی مہاراجہ سر کشن پرشاد کے۔ سی۔ آئی۔ ای۔ جی۔ سی۔ آئی۔ ای، وزیر اعظم ریاست ... بہت ممتاز اور مشہور شاعر اور ادیب۔ عربی، فارسی، انگریزی، سنسکرت اور ہندی کے فاضل تھے۔ نظم و نثر نہایت بے تکلف ... کرتے تھے۔ اہل علم کے قدردان اور خوش اخلاق صاحب فہم تھے۔ دبدبۂ آصفی اور محبوب الکلام ... کے ایڈیٹر بھی رہے ...

نی مشرب ۔ خوش اخلاق ۔ متواضع ۔ منکسر المزاج ۔ وسیع المشرب اور مشرقی تہذیب کا بہت اعلیٰ نمونہ تھے ۔ مزاج میں تکبر اور غرور بالکل نہ تھا ۔ جب راقم مضمون ۱۹۳۰ء میں حیدرآباد گیا اور مہاراجہ بہادر سے ملا تو مہاراجہ بہادر بہت ہی خوش اخلاقی اور تواضع کے ساتھ پیش آئے ۔ چائے منگوائی اور خود اپنے ہاتھ سے پان بنا کر مجھے مرحمت فرمایا ۔ پھر اپنے کتب خانہ سے ایک قلمی کتاب منگوا کر مجھے دکھائی جو انکی اپنی خود نوشت سوانح عمری تھی اور جس پر جا بجا مولانا حالی نے اپنے قلم سے اصلاح دے رکھی تھی ۔ مہاراجہ سادر نظم و نثر کی اکیاون باون کتابوں کے مصنف ہیں ۔ جن میں سے بعض کے نام یہ ہیں بزم خیال ۔ ہدیہ شاد ۔ فریاد شاد ۔ مطلع خورشید ۔ نغمۂ شاد ۔ ارمغان وزارت ۔ مخزن القوافی ۔ مثنوی آئینہ وجود ۔ سیر پنجاب ۔ روزنامچہ گلبرگہ ۔ فسانۂ رشید وغیرہ ۔ ادبی مذاق نہایت صاف ستھرا اور متین و سنجیدہ تھا ۔ آپ کا کلام حسن تخیل ، سلاست زبان اور بندش الفاظ کے لحاظ سے بہت اعلیٰ ہے ۔ تقریباً سارا کلام تصوف کے رنگ میں رنگین ہے ۔ ۱۸۶۴ء میں پیدا ہوئے اور ۱۹۴۰ء میں انتقال کیا ۔

آغا شاعر دہلوی : آغا شاعر کے مورث اعلیٰ نادر شاہ درانی کے ساتھ ہندوستان آئے ۔ اور دہلی میں رہائش اختیار کی ۔ والد کا نام آغا عبد علی تھا ۔ آغا شاعر دہلی میں ۵ مارچ ۱۸۷۱ء کو پیدا ہوئے ۔ عربی اور فارسی کی تعلیم گھر ہی پر پائی ۔ فن شعر میں نواب احمد سعید خاں طالب دہلوی کے شاگرد ہیں ۔ پچیس تیس برس کی عمر میں جب حیدرآباد گئے تو داغ کی شاگردی اختیار کی ۔ آپ کا کلام قدیم شاعری کا اچھا نمونہ ہے ۔ زبان میں شیرینی اور روانی ہے ۔ معاشرت قدیم بزرگوں جیسی تھی ۔ قرآن پاک کا منظوم ترجمہ آپ کا کارنامہ ہے ۔ غزلیات کا مجموعہ تیر و نشتر کے نام سے شائع ہو چکا ہے ۔ عمر خیام کی رباعیوں کا بھی منظوم ترجمہ کیا تھا ۔ آغا صاحب کے مضامین کا مجموعہ خمارستان کے نام سے شائع ہوا ۔ آویزۂ گوش ۔ پر پرواز اور دامن مریم بھی آپ کی کتابیں ہیں ۔ ۱۱ مارچ ۱۹۴۰ء کو وفات پائی ۔

شبلی نعمانی ۔ دور حاضرہ کے بہت بڑے ادیب ۔ زبردست مورخ ۔ اعلیٰ پایہ کے سوانح نگار اور نہایت فاضل و عالم بزرگ تھے ۔ نظم میں خاص درجہ حاصل نہیں ۔ مگر جتنا اور جو کچھ کہا نہایت مقبول ہوا ۔ قومی اور تاریخی نظمیں انہوں نے جتنی کہیں سب نہایت بے نظیر تھیں ۔ جتنی مبسوط کتابیں تحریر فرمائیں سب اپنے موضوع کے لحاظ سے بے حد قابل قدر تھیں ۔ الفاروق کا جواب تمام اردو لٹریچر میں نہیں ۔ شعر العجم پانچ جلدوں میں فارسی شاعروں کی مبسوط تاریخ ہے ۔ المامون ۔ سیرۃ النعمان ۔ سوانح مولانا روم ۔ الغزالی ان کی مشہور کتابیں ہیں ۔ اسلامی تمدن و تہذیب کے متعلق جس قدر بلند پایہ مضامین انہوں نے لکھے وہ رہتی دنیا تک مولانا کے نام کو زندہ رکھیں گے ۔ نظم شبلی ان کی نظموں کا مختصر سا مجموعہ ہے ۔ سیرت [illegible] نصف حصہ انہی کا ہے ۔ جو ان کا شاہکار کہی جاتی ہے ۔ محمد شبلی نام تھا ۔ شبلی تخلص کرتے تھے ۔ موضع بندول ضلع اعظم گڑھ میں ۱۸۵۷ء میں پیدا ہوئے ۔ بڑے بڑے فاضل استادوں سے تعلیم پائی ۔ کئی سال تک علی گڑھ کالج میں پروفیسر رہے ۔ ممالک اسلامیہ کی سیاحت کی اور ایک سفرنامہ قلمبند کیا ۔ انگریزی گورنمنٹ سے شمس العلماء کا خطاب پایا ۔ ندوۃ العلماء کو قائم کیا ۔ دارالمصنفین انہی کی یادگار میں قائم کیا گیا ہے جس سے اسلامی تاریخ اور ثقافت کے متعلق نہایت اہم اور بہت قابل قدر کتابیں شائع

کی تھی۔ ۱۸؍نومبر ۱۹۱۴ء کو انتقال ہوا۔

شرر۔ مولوی عبدالحلیم شرر۔ اُردو زبان کے نہایت فاضل انشاء پرداز تھے۔ اور ناول نویس تھے۔ اُردو میں اسلامی تاریخی ناول انھی کی ایجاد ہیں۔ اعلیٰ درجہ کے مصنف، مؤرخ اور انشا پرداز تھے۔ اُردو لٹریچر کو انھوں نے اپنی لاجواب تصنیفات سے مالا مال کر دیا۔ اگر ان کی تمام تصنیفات کی تعداد گنوائی جائے تو ایک لمبی فہرست بن جائے۔ ۴ر جنوری ۱۸۶۰ء کو لکھنؤ میں پیدا ہوئے اور ۱؍دسمبر ۱۹۲۶ء کو انتقال ہوا۔ ابتدا میں اودھ اخبار لکھنؤ میں کام کیا۔ پھر مختلف اخبارات و رسائل وقتاً فوقتاً خود نکالے۔ جن میں خاص طور پر دلگداز کو نہایت شہرت و قبولیت حاصل ہوئی۔ مصنف و مؤلف اور ناول نویس ہونے کے علاوہ شاعر بھی تھے۔ اور شرر تخلص کرتے تھے۔

شفیق۔ ان کا نام مولوی سید علی مرتضیٰ تھا اور یہ مولوی سید علی رضا صدر الصدور اضلاع مغربی و شمالی کے لڑکے تھے۔ بھادر پور (بہار) ان کا مولد و مسکن ہے۔ جہاں ۱۸۶۸ء میں پیدا ہوئے۔ چار برس کی عمر تھی کہ شفقت پدری سے محروم ہو گئے اور یتیم بچے کا کوئی والی وارث نہ رہا۔ مگر انھوں نے بڑے ہو کر اس قدر ترقی کی کہ سارا بہار ان کی ذات پر فخر کرنے لگا۔ تعلیم کی غرض سے عظیم آباد اور الٰہ آباد کے سفر اختیار کیے اور ہر جگہ قابل اساتذہ سے علم کی تحصیل کی۔ حکیم عابد علی کوثر غیاث آبادی سے طب اور مولانا ظہیر احسن شوق نیموی سے حدیث پڑھی۔ نو برس کی عمر میں شعر کہنے شروع کیے پہلے اپنا کلام کوثر کو دکھایا۔ بعد ازاں شوق نیموی کو۔ ۱۸۹۲ء میں امیر مینائی کے شاگرد ہوئے اور ہر صنف سخن میں کچھ نہ کچھ کہا۔ ان کا خاص رنگ نعتیہ ہے۔ ان کی نظموں، نعتیہ اشعار اور رباعیوں اور غزلوں کے مجموعے چھپ چکے ہیں۔ مثلاً خیابانِ رحمت، حدیقۂ آخرت، ثمرۂ عقیدت، صحیفۂ نو بہار، دل [illegible] اخلاق کی تعمیر پر ایک کتاب تہذیب الآفاق اور شاعری کے متعلق دو کتابیں منتخب العروض اور تحقیق سخن اور نگارستان [illegible] انشا پردازی کا نمونہ [illegible] وغیرہ۔ ۱۳۴۰ھ میں انتقال کیا۔

شوق قدوائی۔ منشی احمد علی شوق قدوائی لکھنؤ کے رہنے والے اور منشی امیر لکھنوی کے شاگرد تھے۔ ۱۸۵۲ء میں پیدا ہوئے عربی اور فارسی میں فاضل تھے۔ غزلیں اور مثنوی خوب کہتے تھے اور اودھ پنچ کے مشہور مضمون نگاروں میں سے تھے۔ آپ کی مثنویوں کی زبان نہایت پاکیزہ اور شیریں ہے۔ عرصہ تک اخبار آزاد لکھنؤ کے ایڈیٹر رہے۔ آپ کی نظمیں ملک کے مشہور جرائد میں شائع ہوتی رہی تھیں۔ حضرت جو یہاں آ گئے تھے۔ اور یہاں ۵۰ سال تک ملازمت کی۔ پھر رام پور چلے گئے۔ نواب حامد علی خاں کے پاس جا کر قیام کیا۔ اور وہیں ۲۹ اپریل ۱۹۲۵ء کو انتقال کیا۔ بعض تصانیف کے نام یہ ہیں۔ قاسم و زہرہ۔ [illegible]، عالم خیال۔ دیوان بھی چھپ گیا ہے۔

شہیدی۔ نام کرامت علی، تخلص شہیدی اور وطن بانس بریلی تھا۔ تعلیم و تربیت لکھنؤ میں ہوئی۔ شاعری کا شوق پیدا

مصحفی کے شاگرد ہو گئے اور ان کی وفات کے بعد اپنا کلام شاہ نصیر دہلوی کو دکھانے لگے۔ جب کبھی دہلی آتے تو شیفتہ سے بھی ملتے رہتے۔ بقول صاحب مراۃ الشعرا نہایت یار باش، زندہ دل، بذلہ سنج، مرنجاں مرنج اور وارستہ مزاج آدمی تھے۔

آخر عمر میں حج کو گئے۔ حج سے فراغت کے بعد جس وقت مدینہ منورہ کے لیے سوار ہوئے اور روضۂ اقدس کے سامنے آ پہنچے تو اس پر نظر پڑتے ہی حرکت قلب بند ہو گئی اور آپ کا انتقال ہو گیا۔ تاریخ وفات ۱۴ صفر ۱۲۵۵ھ (۱۰ اپریل ۱۸۳۹ء) ہے۔ یہ اردو شاعروں میں اپنی نعت کے لیے مشہور ہیں۔

شیدا۔ مسیح الملک حکیم اجمل خاں المتخلص بہ شیدا۔ دہلی کے نہایت نامور طبیب خاندان شریفی کے چشم و چراغ، حکیم محمود خاں کے فرزند اور ملک کے بڑے سیاسی لیڈر تھے۔ ۱۷ شوال ۱۲۸۴ھ مطابق ۱۱ فروری ۱۸۶۸ء کو دہلی میں پیدا ہوئے۔ کم عمری ہی میں اس وقت کے مروجہ متداول علوم یعنی منطق، فلسفہ، ادب، طبیعیات، حدیث اور تفسیر وغیرہ میں کامل مہارت پیدا کر لی۔ طب اپنے برادر بزرگ حاذق الملک حکیم عبدالمجید خاں سے حاصل کی۔ خاندان کے دوسرے بزرگوں سے بھی چند طبی کتابیں پڑھیں۔ ابتدائی زمانہ ریاست رام پور میں گزرا جہاں ان کا محبوب مشغلہ مطالعہ کتب تھا۔ ہزاروں کتابیں پڑھ ڈالیں۔ اپنے بھائی حکیم واصل خاں کے انتقال کے بعد دہلی آئے اور اپنی آبائی طب پر توجہ صرف کرنے لگے۔ طب یونانی کے فروغ کے علاوہ ڈاکٹری کی طرف بھی آپ نے توجہ کی۔ طبیہ کالج دہلی کا قیام آپ ہی کی کوششوں کا رہین منت ہے۔ جس کا سنگ بنیاد وائسرائے ہند لارڈ ہارڈنگ نے رکھا تھا۔ ملک کے جن بہادروں نے وطن کی آزادی میں حصہ لیا ان میں حکیم اجمل خان کا نام ہمیشہ نہایت بلند مقام پر پایا جائے گا۔ حکیم صاحب کی ہستی ملک کے نہایت ممتاز لیڈروں میں سے گنی جاتی ہے۔ اور درحقیقت وہ ملک کے حقیقی اور سچے خادم تھے۔ ان کی آخر عمر کا بیشتر حصہ ملک کے سیاسی مسائل کے حل میں گزرا۔ یہاں تک کہ ۲۹ دسمبر ۱۹۲۷ء کو رام پور میں بعارضۂ قلب انتقال ہو گیا۔ ۱۹۰۸ء میں گورنمنٹ نے ان کو حاذق الملک کا خطاب دیا۔ جب سیاسی کشمکش بہت زیادہ بڑھی تو انھوں نے اپنا خطاب واپس کر دیا۔ جس پر قوم نے ان کو مسیح الملک کا خطاب دیا۔ شاعری میں شیدا تخلص کرتے تھے۔ کلام کا مجموعہ چھپ گیا ہے۔

ان کی فیاضی طبیعت، بلند اخلاق اور اعلیٰ کیرکٹر کی یہ مثال نہایت مشہور ہے کہ ان کو علاج کے سلسلے میں نواب رام پور سے مستقل تنخواہ کا ہزار ملتی تھی۔ کسی بات پر نواب کی اور حکیم صاحب کی ان بن ہو گئی۔ اس نے بلانا چھوڑ دیا۔ انھوں نے جانا چھوڑ دیا۔ تنخواہ چھ مہینے تک بہت دنوں اسی طرح گزر گئے مگر آخر نواب کو معلوم ہوا کہ حکیم صاحب نے تنخواہ لینا چھوڑ دیا ہے۔ نواب نے حکیم صاحب کو بلا کر تنخواہ نہ لینے کی وجہ پوچھی تو فرمایا کہ اس عرصہ میں میں نے کام نہیں کیا تو تنخواہ کس بات کی لوں۔ نواب نے ہر چند اصرار سے رقم پیش کرنی چاہی مگر حکیم صاحب کسی طرح بھی راضی نہ ہوئے۔

شیفتہ۔ نواب محمد مصطفیٰ خان شیفتہ رئیس دہلی و جہانگیر آباد۔ یہ شعر کا نہایت اعلیٰ مذاق رکھتے تھے۔ ۱۲۲۱ھ (۱۸۰۶ء) میں بمقام دہلی پیدا ہوئے۔ تجوید، تفسیر، حدیث، فقہ، ادب، اور تاریخ کی تعلیم ہندوستان، مکہ اور مدینہ کے مستند علما و فضلا سے

بانی نہایت مہذب اور وضعدار باطن پابند شرع تھے۔ پہلے مومن سے اور پھر غالب سے اصلاح لیتے تھے۔ اُردو میں شیفتہ اور فارسی میں حسرتی تخلص کرتے تھے۔ سفر حج سے واپس آنے کے بعد شعر گوئی بہت ہی کم کر دی تھی۔ ۱۸۵۷ء میں ان پر بھی بڑی آفت پڑی۔ قید ہوئے جائداد ضبط ہوئی۔ بہ ہزار مشکل چھٹکارا ملا۔ شمس العلماء مولانا حالی ان کے مصاحب اور ان کے لڑکوں کے اتالیق تھے۔ حالی کو شعر کا صحیح مذاق انہی کی صحبت سے میسر آیا۔ خود فرماتے ہیں ؎

حالی سخن میں شیفتہ سے مستفید ہے
غالب کا معتقد ہے مقلد ہے میر کا

آپ کا اُردو دیوان حال میں مولوی صلاح الدین احمد صاحب نے ایک مبسوط مقدمے کے ساتھ لاہور سے شائع کیا ہے۔ گلشن بے خار۔ اُردو شعراء کا بہترین تذکرہ فارسی کا لکھا ہوا ہے۔ دیوان فارسی، رقعات فارسی، سفر نامہ حجاز موسوم بہ رہ آورد بھی اُن کی تصنیفات ہیں۔ ۲۲ جمادی الآخر [illegible] مطابق ۲۹ ستمبر ۱۸۶۹ء کو بعارضہ دق وفات پائی۔

صابر دہلوی۔ صاحبزادہ مرزا قادر بخش ان کا نام تھا اور صابر تخلص کرتے تھے۔ دہلی کے رہنے والے تھے۔ دیوان صابر ان کی یادگار ہے۔

صبا لکھنوی۔ مشہور غزل گو شاعر ہیں۔ نام میر وزیر علی ابن میر بندہ علی تھا۔ لکھنؤ میں پیدا ہوئے اور وہیں تعلیم و تربیت پائی۔ فن شعر میں خواجہ حیدر علی آتش کے شاگرد تھے۔ گھوڑے سے گر کر ۱۲۷۱ھ مطابق ۱۸۵۵ء کو انتقال ہوا۔ کلام بقول صاحب مرآۃ الشعر دلچسپ اور صاف ہے۔ زبان پاکیزہ اور عمدہ ہے۔ خیالات سیدھے سادے ہیں۔ ان کا دیوان ساڑھے تین ہزار اشعار کا مجموعہ ہے۔ اور اس میں ۷۲۰ غزلیں ہیں۔

صفی۔ سید علی نقی زیدی نام، صفی تخلص اور لسان القوم لقب ہے۔ ۳ جنوری ۱۸۶۲ء کو بمقام لکھنؤ پیدا ہوئے اور محکمہ دیوانی کے چالیس سال ملازمت کے بعد ۱۹۲۳ء میں پنشن پائی۔ ۱۹۵۰ء میں انتقال کیا۔ شاعری میں اگرچہ کسی کے شاگرد نہیں مگر ان کا شمار لکھنؤ کے مشہور شاعروں میں ہوتا ہے۔ تمام اصناف سخن پر عبور رکھتے تھے۔ ان کے اشعار میں بہت زیادہ دلچسپی اور ان کے کلام میں بڑی شگفتگی پائی جاتی ہے۔ صفی کی مشہور مثنوی "تنظیم الحیات" ہے۔ جس پر ہندوستانی اکیڈمی الٰہ آباد نے پانچ سو روپیہ انعام دیا۔ یہ اکانومی آف ہیومن لائف کا ترجمہ ہے۔ اُن کے کلام کا ایک مجموعہ "تحت جگر" [illegible]ء میں شائع ہوا تھا۔ بعد میں پھر ایک دوسرا مکمل مجموعہ ان کے نامور شاگردوں کی کوشش سے چھپا ہے۔

صنعت۔ ان کا نام شیخ زین العابدین تھا۔ مرادآباد (یو۔ پی) کے رہنے والے تھے۔ اور مولوی عصمت اللہ شوق کے شاگرد تھے۔ [illegible]ء میں انتقال ہوا۔

ضیاؔ۔ میر ضیاء الدین نام۔ ضیاؔ تخلص۔ دہلی کے باشندے اور سوداؔ کے ہم عصر تھے۔ دلی کی طوائف الملوکی سے گھبرا کر فیض آباد چلے گئے۔ وہاں سے کھسک جاتے ہیں۔ پھر عظیم آباد پٹنہ میں جا کر زندگی کے دن پورے کیے۔ جہاں راجہ شتاب رائے رئیس پٹنہ کا لڑکا ان کا مربی اور سرپرست تھا۔ میر صاحب نہایت تنہا پسند بزرگ تھے۔ اور اسی حالت میں عمر گزار دی۔ نہ کسی سے واسطہ رکھا نہ مطلب۔ ان کو سنگلاخ زمینوں میں شعر کہنے کا بڑا شوق تھا۔ اصناف سخن میں غزل ان کا خاص مضمون ہے۔ میر حسن انہی کے شاگرد تھے۔ مجموعہ نغز میں ان کے متعلق یہ رائے ظاہر کی گئی ہے: "شاعر خوش گو۔ شیریں گفتار۔ صاحب استغنا۔ آبدار۔ ستودہ اطوار۔ پسندیدہ کردار بود" ۱۱۹۴ھ
(سنہ [illegible]ھ میں پٹنہ میں وفات پائی۔

طاہرؔ۔ سید اطہر علی کے بیٹے۔ طاہر علی ان کا نام ہے اور فرخ آباد کے رہنے والے ہیں۔ امداد حسین صفیؔ کے شاگرد ہیں۔ ایک دیوان ان سے یادگار ہے۔ ۱۳۱۲ھ (۱۸۹۴ء) میں مرتب کیا تھا۔ ۱۹۰۸ء میں مطبع محمدی کانپور میں چھپا۔ (جواہر سخن جلد چہارم بحوالہ دیوان طاہر صفحہ ۲)۔

ظفرؔ۔ بہادر شاہ ظفر مغلیہ خاندان کے سب سے آخری بادشاہ تھے۔ طبیعت کو شعر و سخن سے لگاؤ تھا۔ ان کے اکثر اشعار درد اور اثر میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ بالترتیب شاہ نصیرؔ، کاظم حسین بیقرارؔ، محمد ابراہیم ذوقؔ اور مرزا اسد اللہ خاں غالبؔ کے شاگرد رہے۔ ۱۸۵۷ء میں بغاوت کے جرم میں گرفتار ہو کر رنگون بھیج دیئے گئے جہاں ۷ نومبر ۱۸۶۲ء کو انتقال کیا۔ شمس العلماء مولانا حالی کی رائے میں "زبان کی صفائی اور سلاست و محاورہ کی بولی ہے ظفر کا نام دیوان کی جان ہے۔" ان کے چار دیوان ۱۸۵۷ء سے پہلے ہی مطبع سلطانی قلعہ معلیٰ دہلی سے چھپ کر شائع ہو چکے تھے۔ جن میں ۲۰ ہزار کے قریب اشعار تھے۔

ظہیرؔ دہلوی۔ ظہیر الدین نام اور ظہیرؔ تخلص تھا۔ دہلی کے رہنے والے اور ذوقؔ کے شاگرد تھے۔ ان کے والد کا نام سید جلال الدین حیدر تھا جو بہت اعلیٰ درجے کے خطاط تھے اور فن خوشنویسی میں بہادر شاہ ظفر کے استاد تھے۔ بادشاہ کی درگاہ سے صلاح الدولہ راقم الدولہ رقم اور خان بہادر کا خطاب ملا تھا۔ تیرہ برس کے ہوئے تو یہ بھی قلعہ معلیٰ میں بعہدہ [illegible] ملازم ہو گئے۔ ۱۸۵۷ء کی قیامت خیز آندھی میں دہلی سے نکلے اور پھر سونی پت، نجیب آباد ہوتے ہوئے بریلی پہنچے۔ پھر رامپور میں چار برس رہنے کے بعد واپس دہلی چلے گئے۔ کچھ دنوں بعد مہاراجہ شیودان والی الور نے بلا لیا۔ پھر قصبہ پیر بلند شہر میں اخبار جلوۂ طور کی ایڈیٹری کرنے چلے گئے۔ پھر نواب احمد علی خاں رونق والی ٹونک کے دربار میں پندرہ سولہ برس یہاں رہے۔ پھر جے پور میں ملازم ہو گئے۔ ۱۰ برس یہاں ملازمت کی۔ آخر عمر میں حیدرآباد جانے کا شوق ہوا۔ وہاں گئے مگر کوئی قدردانی نہ ہوئی اور وہیں ۱۳۲۹ھ میں ان کا انتقال ہو گیا۔ غزلوں کے چار دیوان ان کی یادگار ہیں۔

عاجزؔ۔ ان کا نام عارف الدین خاں اور تخلص عاجزؔ ہے۔ ان کے حالات دستیاب نہیں ہو سکے۔

عزیز لکھنوی۔ نام مرزا محمد ہادی۔ مرزا علی کے بیٹے۔ وطن لکھنؤ اور تخلص عزیز ہے۔ ۵ ربیع الاول ۱۲۹۹ھ مطابق ۲۵ جنوری ۱۸۸۲ء کو پیدا ہوئے۔ معقول و منقول، فقہ و اصول، صرف و نحو، ادبیات اور ریاضیات کی تعلیم لکھنؤ کے مشہور علما و فضلا سے پائی۔ شاعری کا شوق بچپن سے تھا۔ غزل اور قصیدہ ان کے خاص میدان ہیں جن میں آپ نے خوب طبع کی جولانیاں دکھائی ہیں۔ ۱۳۵۴ھ مطابق ۱۹۳۵ء میں بمقام لکھنؤ انتقال کیا۔ صفی لکھنوی کے شاگرد تھے۔ گل کدہ، صحیفۂ ولا ان کے کلام کے مجموعے ہیں۔

عظیم۔ مرزا عظیم بیگ متخلص بہ عظیم۔ شیخ ظہور الدین حاتم المتوفی ۱۱۹۷ھ کے شاگردوں میں سے ایک نامور شاعر تھے۔ انشاء اللہ خاں انشا کے ہم عصر تھے۔ اُن کی ہجو میں ایک پُرزور مخمس بھی لکھی ہے۔ یہ اُس عہد کے مشہور غزل گو شاعر ہیں۔ مگر ہر صنف کلام میں کچھ نہ کچھ کہا ہے۔ اشعار میں فصاحت بیان اور لطف زبان دونوں موجود ہیں۔ انشا کی ہجو بڑی دلچسپ ہے۔ جس کا ایک مصرعہ تو ضرب المثل اب تک زبان زد خاص و عام ہے یعنی:۔

ط تیری زباں کے آگے نہ دہقاں کا ہل چلے

غالب۔ مرزا اسد اللہ خاں غالب کے نام سے کون واقف نہیں۔ اُردو اور فارسی کے مسلم الثبوت شاعر۔ اور دور موجودہ کی اُردو شاعری کے امام مانے جاتے ہیں۔ جتنی شاندار ان کی نظم ہوتی ہے اتنی ہی شاندار نثر لکھتے ہیں۔ اُردوئے معلیٰ کی زبان اس قدر سلیس و شیریں۔ اور دلچسپ ہے کہ اردو میں اس کا کوئی نمونہ اب موجود نہیں۔ ۲۷ دسمبر ۱۷۹۷ء کو آگرہ میں پیدا ہوئے۔ آباؤ اجداد کا پیشہ تیغ زنی اور سپہ گری تھا۔ انھوں نے اپنا پیشہ انشا پردازی اور شعروشاعری بنایا اور ساری عمر اسی شغل میں بسر کردی۔ کم ہی لوگوں کو ایسی بلند شہرت نصیب ہوئی ہوگی جیسی غالب کو۔ شادی دہلی میں ہوئی اس لیے ۱۳ برس کی عمر میں دہلی چلے آئے۔ اور ہمیشہ کے لیے یہیں کے ہو رہے۔ ان کی شاعری کے متعلق مولانا غلام رسول مہر کا صرف ایک فقرہ سن لیجئے۔ فرماتے ہیں "سپہ گری میں اگر غالب بڑی سے بڑی ترقی کرتے تو اپنے چچا کی طرح رسالدار یا اپنے نانا کی طرح کمیدان ہی جاتے۔ مگر ادب و شعر میں انھیں وہ پایہ حاصل ہوا جو سلطنت و تاجداری میں افراسیاب۔ طغرل۔ سنجر۔ الپ ارسلان اور ملک شاہ نے حاصل کیا" (غالب ص ۳۳)

۱۸۵۴ء میں ذوق کے انتقال کے بعد بہادر شاہ ظفر کے استاد مقرر ہوئے اور نجم الدولہ دبیر الملک۔ نظام جنگ خطاب ملا۔ جب ۱۸۵۷ء میں بہادر شاہ قید کر کے رنگون بھیج دیئے گئے تو نواب یوسف علی خاں والی رامپور نے سو روپے ماہوار تنخواہ مقرر کردی جو آخر تک ملتی رہی۔ مگر ہمیشہ تنگدستی اور عسرت میں مبتلا رہے۔ مولانا مہر غالب کے انتقال کی تاریخ ان الفاظ میں لکھتے ہیں۔ "۱۵ فروری ۱۸۶۹ء (مطابق ۲ ذی قعدہ ۱۲۸۵ھ) کو دوشنبہ کے دن ادب و شعر کا یہ درخشندہ آفتاب ہمیشہ کے لیے غروب ہوگیا جس کی عالمتابی دور ماضیہ کے لیے سرمایہ ناز اور قرون آیندہ کے لیے منارۂ ہدایت تھی۔" ان کے انتقال کے بعد ان کے دیوان کی جتنی قدر ہوئی اور جیسی صحت و حسن طباعت اور نفاست کے ساتھ وہ بار بار چھاپا گیا۔ اتنی مقبولیت غالباً اُردو کی کسی کتاب کو حاصل نہیں ہوئی۔ ممتاز شاگردوں میں سے بعض کے نام یہ ہیں۔ نواب ضیاء الدین نیر درخشاں۔ نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ۔ میر مہدی مجروح۔ شمس العلماء مولانا حالی۔ مرزا قربان علی بیگ سالک۔ منشی ہرگوپال تفتہ۔ اور نواب علاء الدین خاں علائی۔

فانی بدایونی۔ شوکت علی خاں نام تھا اور فانی تخلص کرتے تھے۔ ان کے باپ شجاعت علی خاں سب انسپکٹر پولیس پکے اہلحدیث تھے اور بیٹے کو مولوی بنانا چاہتے تھے۔ مگر اس کی قسمت میں محض شاعر ہونا لکھا تھا۔ فانی بدایوں کے قریب موضع اسلام نگر میں ۱۳ ستمبر ۱۸۷۹ء کو پیدا ہوئے۔ شاعری کا شوق بچپن ہی سے ہو گیا۔ ۱۱ سال کی عمر میں پہلا شعر کہا اور شوکت تخلص رکھا۔ جو آٹھ برس بعد فانی سے بدل لیا۔ گورنمنٹ ہائی سکول بدایوں سے انٹرنس پاس کرنے کے بعد بریلی کالج سے بی۔ اے ہو کر علیگڈھ گئے اور ۱۹۰۸ء میں ایل۔ ایل۔ بی کی ڈگری حاصل کی۔

کالج سے فارغ ہونے کے بعد بریلی میں وکالت شروع کی مگر وہ شاعری کے سر صدقے ہوئی۔ بریلی سے لکھنؤ۔ لکھنؤ سے اٹاوہ اور وہاں سے آگرہ گئے مگر کہیں بھی وکالت نہ چلی۔ مگر ہاں شاعری ہر جگہ خوب زوروں پر رہی۔ اور شعراء کا جمگھٹا ہر وقت ارد گرد رہا۔ مہاراجہ سرکشن پرشاد کے بلاوے پر ۱۹۳۲ء میں حیدر آباد گئے۔ مگر بدقسمتی بھی ساتھ ساتھ گئی۔ مہاراجہ نے اگرچہ بہت خاطر مدارات کی اور منصب کی کوشش کی مگر صرف ایک سکول کی ہیڈ ماسٹری۔ بہت افسردہ ہوئے مگر کرنی پڑی۔ تھوڑے دنوں بعد مہاراجہ کا انتقال ہو گیا۔ ملازمت بھی چھوٹ گئی۔ ادھر جوان بیٹی کا انتقال ہو گیا ادھر بیوی داغ مفارقت دے گئی۔ سخت بیمار اور مضمحل رہنے لگے۔ اور مرنے کے دن گننے لگے۔ آخر ۲۷ اگست ۱۹۴۱ء کو بلاوا آگیا اور ایک بہت ہی خوش گو شاعر و بنا کے مصائب اور آلام بڑی تکلیف کے ساتھ برداشت کرتا ہوا ہمیشہ کے لیے رخصت ہو گیا۔

حیدر آباد میں مرزا اورنگ کی قبر سے کوئی دو سو قدم کے فاصلے پر درگاہ یوسفین نامپلی کے مشرقی دروازے کے باہر والے چبوترے پر ان کا مزار ہے۔

مفصل حالات اور فوٹو ہم ۲۱ اکتوبر ۱۹۵۵ء کے اخبار آئینہ دہلی میں شائع ہوئے ہیں۔ دیوان فانی۔ باقیات فانی۔ عرفانیات فانی۔ وجدانیات فانی۔ کلیات فانی۔ ان کے کلام کے مجموعے ہیں جو مختلف اوقات میں شائع ہوئے۔

فدوی، لاہوری۔ فدوی لاہور کے رہنے والے تھے۔ اور ہندو سے برضا و رغبت مسلمان ہوئے تھے۔ صابر علی شاہ صابر ایک صاحب تھے۔ ان کے ہاتھ پر انھوں نے سلسلہ قبول کیا تھا۔ اور انھیں سے ان کو شاعری میں تلمذ تھا۔ مسلمان ہونے کے بعد ضابطہ خاں کے منیب ہو گئے تھے جو یوسف زلیخا فارسی کو انھوں نے ہی اردو نظم کا جامہ پہنایا تھا۔ پچاس سال سے زیادہ کی عمر پا کر ۱۷۸۰ء میں انتقال کیا۔

فراق، حکیم ثناء اللہ خاں نام اور فراق تخلص تھا۔ میر درد کے مرید اور شاگرد تھے۔ ہدایت اور سوز سے بھی اصلاح لی ہے۔ مجموعہ نظم ہے ان کے متعلق یہ الفاظ درست ہیں۔ محبت آگیں۔ سرا سر درد۔ سراپا وفا۔ شیریں زبان۔ طلاقت بیان۔ فصاحت قرین بلاغت آگیں۔ جادو طراز سحر پرداز۔ صاحب وفا۔ شریف۔ مالک عالی لطیف بقول صاحب مرآۃ الشعراء اندازاً ۱۱۶۸ھ (۱۷۶۰ء) میں پیدا ہوئے اور تقریباً ۱۲۴۳ھ (۱۸۳۰ء) میں انتقال کیا۔

فغاںؔ ۔ اشرف علی نام اور ظریف الملک خطاب تھا۔ فغاںؔ تخلص کرتے تھے۔ احمد شاہ بادشاہ کے کوکہ تھے۔ نہایت وجیہ بذلہ سنج اور لطیفہ گو واقع ہوئے تھے حاضر جوابی میں اپنا جواب نہ رکھتے تھے۔ فن شعر میں قزلباش خاں امیدؔ کے شاگرد تھے۔ صاحب گلزار ابراہیم اور مصحفی کو علی قلی ندیم کا شاگرد بتاتے ہیں۔ جب احمد شاہ ابدالی نے ہندوستان پر حملہ کیا تو یہ گھبرا کر دلی سے نکلے اور اپنے چچا ایرج خاں کے پاس مرشد آباد میں چلے گئے۔ کچھ دنوں وہاں رہنے کے بعد لکھنؤ آئے۔ نواب شجاع الدولہ والی اودھ بہت تعظیم و تکریم سے پیش آیا مگر نہایت ہی نازک مزاج تھے۔ ایک ذرا سی بات پر نواب سے ناراض ہو کر مرشد آباد چلے گئے اور وہاں راجہ شتاب رائے کی نوکری کر لی۔ چونکہ نہایت عالی نسب، باکمال، شیریں زبان اور فنِ مجلس کے پورے ماہر تھے۔ اس لیے راجہ صاحب ان کی بہت عزت کرتے تھے۔ یہ بھی قدردانی دیکھ کر یہیں رہ پڑے اور بڑی فراغت اور عیش کی زندگی گزار کر ۱۱۸۶ھ (۱۷۷۲ء) میں وفات پائی۔ گلشن بہار میں ۱۱۹۶ھ (۱۷۸۲ء) لکھا ہے۔ آزاد ان کی شاعری کے متعلق کہتے ہیں "فن شاعری کے اعتبار سے ان کی زبان نہایت با اصول اور برجستہ ہے۔ اور الفاظ کی بندش ان کی مشق سخن پر گواہی دیتی ہے۔" فن شعر میں ان کے کمال کا اس سے بڑھ کر کیا ثبوت ہو سکتا ہے۔ کہ بقول آزاد مرزا رفیع جیسے صاحبِ کمال اکثر ان کے اشعار مزے لے لے کر پڑھا کرتے تھے اور بہت تعریف کیا کرتے تھے۔

فقیرؔ ۔ میر شمس الدین نام تھا اور فقیرؔ تخلص کرتے تھے۔ اس کے علاوہ مفتونؔ بھی تخلص کرتے تھے۔ دلی کے رہنے والے تھے لیکن ۱۱۶۵ھ میں دلی چھوڑ کر لکھنؤ جا بسے۔ اور وہیں ۱۱۷۶ھ میں دریا میں غرق ہو گئے۔ ایک دیوان اور ایک مثنوی موسوم بہ "تصویر محبت" ان کی تصنیف ہے۔

قائمؔ چاندپوری ۔ ان کا نام کوئی تذکرہ نویس محمد قائم بتاتا ہے۔ کوئی قیام الدین علی اور کوئی قائم الدین۔ مگر صحیح نام محمد قیام الدین ہے۔ والد کا نام محمد ہاشم اور دادا کا محمد اکرم تھا۔ وطن چاندپور (ضلع بجنور۔ یو۔ پی) ہے۔ جوانی میں تلاش معاش چاندپور سے دلی آ کر شاہی توپخانے کے داروغہ ہو گئے۔ یہ شاہ عالم کا زمانہ تھا۔ اور یہیں اپنا تذکرہ شعراء "مخزن نکات" لکھنا شروع کیا۔ اس وقت دلی کی شاعری عروج پر تھی اور میر تقی میرؔ، خواجہ میر دردؔ اور سوداؔ جیسے باکمال شعراء یہاں موجود تھے۔ قائمؔ پہلے شاہ ہدایت اللہ ہدایتؔ کے شاگرد ہوئے۔ مگر معلوم ہوتا ہے کہ مزاج کے نہایت اکھڑ اور تندخو تھے۔ تھوڑے ہی دنوں میں استاد سے ایسی بگڑی کہ ان کی ہجو لکھی۔ پھر خواجہ میر دردؔ کے شاگرد ہوئے۔ ان سے بھی نہ بنی تو سوداؔ کو کلام دکھانے لگے۔ یہ سلطنت مغلیہ کا دور انحطاط تھا۔ جب یہ گروہ بڑھا، قحط پڑا تو قائمؔ دلی سے نکلے اور کچھ دنوں نواب محمد یار خاں عاجز والی ٹانڈہ کے ہاں ملازمت کر لی۔ جو بڑے علم دوست اور صاحب ذوق بزرگ تھے اور امیرؔ تخلص کرتے تھے۔ ان دنوں مصحفیؔ بھی یہاں ملازم تھے۔ تین ماہ کے بعد یہاں سے رامپور چلے گئے۔ اور فوج میں سپاہی بھرتی ہو گئے۔ یہیں ۱۲۰۸ھ (۱۷۹۳ء) میں وفات پائی۔

بعد نظر میں ہے کہ امروہہ کے قاضی مقرر ہو گئے تھے اور یہیں انتقال کیا۔ نام کی طرح سن وفات میں بھی اختلاف ہے۔

کسی تذکرہ میں ۱۲۰۷ھ (۱۷۹۲ء) لکھا ہے۔ کسی میں ۱۲۰۸ھ (۱۷۹۳ء) اور کسی میں ۱۲۱۰ھ (۱۷۹۵ء)۔ مولوی عبدالحق مقدمہ مخزن نکات میں ۱۲۰۸ھ (۱۷۹۳ء) کو صحیح بتاتے ہیں۔ قائمؔ کی شاعری کے متعلق آزاد آبِ حیات میں لکھتے ہیں "ان کا دیوان ہرگز

میر و مرزا کے چاند سے نیچا نہیں رکھ سکتے۔ مگر کیا کیجئے کہ قبول عام کچھ اور شے ہے شہرت نہ پائی۔" مولوی عبدالحق اس پر یہ تبصرہ فرماتے ہیں۔ "اس میں شک نہیں کہ قائم بہت بڑا شاعر ہے مگر اُسے میر و مرزا کا ہم رتبہ کہنا سراسر ناانصافی ہے۔ اُس کا کلام ہر صنف میں موجود ہے۔ غزل، رباعی، قطعہ، مثنوی، قصیدہ، ترکیب بند، تاریخ سب کچھ کہا ہے۔ ہجو کہنے اور فحش بکنے میں اپنے استاد سودا کا ہم پلہ ہے۔ متعدد مثنویاں بھی لکھی ہیں۔ قصیدوں میں بھی زور پایا جاتا ہے۔"

ان کا تذکرہ شعراء نایاب تھا۔ مولوی عبدالحق نے تلاش کر کے اس پر مقدمہ لکھا اور ۱۹۲۹ء میں انجمن ترقی اردو کی طرف سے چھاپ کر شائع کر دیا۔ اس میں قائم سمیت ۱۱۴ اردو شاعروں کا تذکرہ ہے۔ تذکرہ کی زبان فارسی ہے۔ ابتدائی ۷۵ صفحات میں مقدمہ اور قائم کے کلام کا انتخاب ہے۔ پھر ۹۰ صفحات پر اصل تذکرہ ہے۔ قائم کا مختصر مجموعہ کلام مولانا حسرت موہانی نے شائع کیا۔ کلام کا انتخاب صاحب مراۃ الشعراء نے بھی دیا ہے۔

قدر۔ مولوی سید غلام حسنین ان کا نام تھا۔ سید صفت علی کے بیٹے اور حضرت امام زین العابدین کی اولاد سے تھے۔ ۱۸۳۳ء میں بمقام بلگرام پیدا ہوئے۔ چھوٹی عمر میں بعہد واجد علی شاہ لکھنؤ آئے اور یہیں تعلیم پائی۔ شاعری کا شوق بچپن ہی سے تھا۔ اور اس وقت اس وبا میں قریباً ہر شخص بری طرح مبتلا تھا۔ انہوں نے پہلے سحر اور برق کی شاگردی اختیار کی۔ جب ان دونوں کا انتقال ہو گیا تو شیخ امداد علی بحر سے اصلاح لینی شروع کی۔ ۱۸۵۷ء کے بعد دہلی چلے آئے اور غالب کے آگے زانوئے تلمذ تہہ کیا۔ آخر عمر میں حیدرآباد دکن جا کر نواب کے ملازم ہو گئے تھے۔ کیونکہ ایسے لوگوں کی کھپت ایسی ہی جگہ ہو سکتی ہے۔ عروض و قوافی اور صنائع و بدائع کے اُستاد تھے۔ ہندی فن عروض کے واقف تھے۔ حاشیہ اعجاز خسروی آپ ہی کا لکھا ہوا ہے۔ عروض پر بھی ایک کتاب "قواعد العروض" کے نام سے لکھی ہے۔ کلیات بھی شائع ہو چکا ہے۔ ۱۵ ستمبر ۱۸۸۴ء کو انتقال ہوا۔

قدرت۔ ان کا نام شاہ قدرت اللہ تھا۔ اور اپنے نام کی مناسبت سے قدرت تخلص کرتے تھے۔ مرزا مظہر جان جاناں کے شاگرد تھے۔ ۱۷۹۱ء میں انتقال کیا۔

قلق۔ ان کا نام خواجہ ارشد علی اور خطاب آفتاب الدولہ تھا۔ خواجہ سید حسین فراق کے فرزند۔ خواجہ وزیر علی وزیر لکھنوی کے شاگرد اور واجد علی شاہ اختر شاہ اودھ کے دربار کے شاعر اور مصاحب تھے۔ ۱۸۷۹ء میں انتقال کیا۔ "دیوان قلق" اور "مثنوی طلسم الفت" ان کی تصنیفات ہیں۔

کمال۔ شاہ کمال الدین ان کا نام تھا اور کمال تخلص کرتے تھے۔ جرأت اور ناتواں کے شاگرد تھے۔

کیفی۔ پنڈت برج موہن دتاتریہ نام اور کیفی تخلص۔ ۱۳ دسمبر ۱۸۶۶ء کو دہلی میں پیدا ہوئے۔ والد پنڈت کنہیا لال بیکتجہ

میں افسر پولیس تھے جن کا انتقال کیفی کی صغر سنی میں ہو گیا۔ انھوں نے، بے حد شوق اور محنت سے علم حاصل کیا۔ دورِ حاضرہ کے نہایت اعلیٰ پایہ کے ادیبوں اور شاعروں میں آپ کا شمار ہے۔ نہایت صلح کل اور مرنجان و مرنج پالیسی کے مالک اور بے حد خوش اخلاق، منکسر المزاج اور بے تعصب بزرگ تھے۔ عربی و فارسی کے فاضل، انگریزی زبان کے ماہر اور اُردو کے اعلیٰ پایہ کے ادیب تھے۔ سنسکرت اور ہندی بھی بہت اچھی جانتے تھے۔ تصانیف یہ ہیں۔ بھارت درپن (جو مسدس حالی کی طرز پر ہندوؤں کے لیے لکھی) خمار کیفی۔ پریم ترنگنی۔ شوکت ہند۔ تزک قیصری۔ منشورات۔ کیفیہ۔ آئینہ ہند۔ جگ بیتی۔ خمسہ کیفی۔ مرأت خیال۔ ناگوار قیل و قال۔ وحدت اور اس کی تعلیم۔ چراغ ہدایت۔ پریم دیری۔ نستا ماجہ۔ سماج وفاداری۔ مراری دادا وغیرہ۔ آپ کا دیوان "واردات" کے نام سے چھپ چکا ہے۔ فنِ شعر میں مولانا حالی سے تلمذ تھا۔ یکم نومبر ۱۹۵۵ء کو دہلی کے قریب قصبہ غازی آباد میں وفات پائی۔

گستاخ۔ کرامت اللہ خاں نام، گستاخ تخلص اور رامپور وطن تھا۔ آپ امیر مینائی کے شاگرد تھے۔ ۱۸۶۲ء میں پیدا ہوئے اور ۱۹۱۲ء میں انتقال کیا۔

گویا۔ نواب حسام الدولہ تہور جنگ فقیر محمد خاں گویا مشہور شاعر۔ جوش ملیح آبادی کے جدِ امجد لکھنؤ کے رہنے والے۔ عربی و فارسی کے جید عالم اور مشہور شاعر تھے۔ نواب اودھ کی سرکار میں رسالداری اور نظامت کے اعلیٰ عہدوں پر فائز رہے دو ہزار روپیہ ماہوار تنخواہ پاتے تھے۔ فرائضِ ملازمت کے علاوہ نہایت علم دوست اور خوش طبع بزرگ تھے۔ اہلِ علم اور شعراء کا ہر وقت اُن کے ہاں مجمع لگا رہتا تھا۔ ان کا کلام دیوانِ گویا کے نام سے چھپ چکا ہے۔ مشہور عالم فارسی کتاب "انوار سہیلی" کا سب سے پہلے انھوں نے ہی ۱۲۵۰ھ (۱۸۳۴ء) میں اُردو میں ترجمہ کیا اور بستانِ حکمت نام رکھا۔ ۱۲۶۶ھ (۱۸۵۰ء) میں انتقال کیا۔

مجروح۔ میر مہدی حسین مجروح میر حسین نگار کے بیٹے اور دہلی کے نہایت خوش گو شاعروں میں سے تھے۔ غالب کے شاگرد اور مذاق۔ مومن۔ آزردہ۔ شیفتہ۔ صہبائی۔ نیر اور حالی کے دوست اور معاصر تھے۔ ۱۸۵۷ء کے بعد دہلی سے نکلے اور پانی پت چلے گئے۔ پھر مہاراجہ الور نے طلب کر کے ریاست میں تحصیلداری کا عہدہ دیا۔ مگر وطن کی کشش نے پھر دہلی میں کھینچ بلایا۔ زبان کے لحاظ سے ان کا دیوان اُردو لٹریچر کا بہترین نمونہ ہے۔ خیالات کی نزاکت اور تخیل کی بلند پروازی مجروح کی غزلیات کو بقائے دوام بخشتی ہے۔ حالی انھیں کے متعلق کہتے ہیں ؎

داغ و مجروح کو سن لو کہ پھر اس گلشن میں
نہ سنے گا کوئی بلبل کا ترانہ ہرگز.....!

۔ اکتوبر ۱۹۰۳ء کو دہلی میں انتقال کیا اور درگاہ قدم شریف کے زیرِ فصیل دفن ہوئے۔

محب۔ شیخ ولی اللہ نام اور تخلص محب ہے۔ آباء و اجداد سرہند کے رہنے والے تھے۔ دہلی آ کر شاہ عالم کے مصاحب

شاعر مقرر ہونے پر مرزا سلیمان شکوہ کی سرکار میں لکھنؤ چلے گئے۔ یہیں ۱۲۴۱ھ (۱۸۲۶ء) میں انتقال کیا۔ ایک دیوان اور دو ایک مثنوی فارسی ان کی یادگار ہے۔ ان کے ہم عصر شعراء قمر الدین منت، شکیبا، فراق اور قاسم وغیرہ تھے۔ ان کے متعلق مجموعہ نغز میں درج ہے کہ "بسیار پرمشق دیوانے مطولہ الوارع سخن ازوے یادگار زمانہ است"

محروم۔ لالہ تلوک چند نام۔ محروم تخلص۔ تحصیل عیسیٰ خیل کے ایک گاؤں میں ۱۸۸۷ء میں پیدا ہوئے۔ بی۔ اے پاس کرنے کے بعد مدت تک عیسیٰ خیل اور میانوالی کے سکولوں میں ماسٹر اور ہیڈ ماسٹر رہے۔ ۱۹۳۳ء میں گورڈن کالج راولپنڈی میں پروفیسر ہو گئے۔ قیام پاکستان کے بعد دہلی چلے گئے اور پنجاب یونیورسٹی کیمپ کالج دہلی میں لکچرار مقرر ہوئے۔ کچھ دنوں ہفتہ وار تیج کی بھی ادارت کی۔ مگر وطن کی یاد سے طبیعت ستاتی ہے۔ نہایت خوش فکر اور خوش گو شاعر ہیں۔ کلام صاف سلیس اور عام فہم ہوتا ہے۔ دیوان چھپ گیا ہے۔ جو الفاظ کی برجستگی، بندش کی چستی اور خیالات کی پاکیزگی کا آئینہ دار ہے۔ ان کے کلام کے متعلق اکبر الٰہ آبادی کی رائے سنئے۔ فرماتے ہیں۔

ہے داد کا مستحق کلامِ محروم   لفظوں کا جمال۔ معانی کا ہجوم
ہے ان کا سخن مفید و دانش آموز   ان کی نظموں کی ہے بجا ملک میں دھوم

جمیل احمد ایم۔ اے اپنی کتاب اردو شاعری کی مختصر تاریخ میں ان کے متعلق لکھتے ہیں "تلوک چند محروم اردو کے مایہ ناز شاعر ہیں۔ ان کے یہاں جذبات و حسیات کی فراوانی ہے۔ زبان نہایت درجہ شستہ و پاکیزہ ہے۔ حسنِ الفاظ، حسنِ ادا اور معنی آفرینی محروم کے خاص جوہر ہیں۔ نظم میں وہ اپنا حریف نہیں رکھتے۔ انھوں نے نظموں میں جذبات کی جیتی جاگتی تصویر کھینچی ہے"

ان کے اشعار کا پہلا مجموعہ "کلامِ محروم" کے نام سے ۱۹۱۶ء میں شائع ہوا۔ رباعیاتِ محروم، گنجِ معانی اور نیرنگِ معانی بھی ان کی تصنیفات میں سے ہیں۔ پاکستان کے ادبی پرچوں میں اکثر اپنا کلام بھیجتے رہتے ہیں۔ فارسی کلام بھی بہت اچھا ہوتا ہے۔

محنت۔ مرزا حسین علی بیگ نام۔ محنت تخلص تھا۔ جیسہ (دہلی) کے رہنے والے تھے۔ کم عمری میں ہی لکھنؤ چلے گئے تھے اور وہیں رہنے لگے تھے۔ فن شعر میں قلندر بخش جرأت کے شاگرد تھے۔

مصحفی۔ نام شیخ غلام ہمدانی تھا۔ اور مصحفی تخلص کرتے تھے۔ شیخ ولی محمد کے بیٹے اور امروہہ کے باشندے تھے۔ جوانی میں دہلی چلے آئے اور یہاں کے علماء سے علمی استفادہ کیا۔ اس وقت دہلی میں اہل کمال کا مجمع تھا۔ ان کو بھی شعر کہنے کا شوق ہوا اور بہت جلد اس میں کمال حاصل کیا۔ شیخ اماني کے شاگرد تھے۔ دہلی سے نکل کر مختلف مقامات پر گھومتے ہوئے لکھنؤ پہنچے۔ اور مرزا سلیمان شکوہ کے ہاں ملازم ہو گئے۔ ۱۱۶۴ھ (۱۷۵۱ء) میں پیدا ہوئے اور ۱۲۴۰ھ (۱۸۲۴ء) میں بمقام لکھنؤ انتقال کیا اور آٹھ دیوان یادگار چھوڑے۔ دو تذکرے اردو شعراء کے تذکرہ ہندی (۱۷۹۴ء) اور ریاض الفصحا (۱۸۲۰ء) اور ایک تذکرہ

ہندی شعراء کا تذکرہ (۱۲۰۰ھ) فارسی میں ترتیب دیا۔ بقول تمنا "گلشن" کی شاعری کے بابا آدم ہیں۔ بزرگوں میں آتش، ضمیر، خلیق اور اسیر وغیرہ شعراء ان کے شاگرد تھے۔ یہ ایسے اعلیٰ پایہ کے استاد تھے کہ اپنے شاگردوں کو بھی استاد بنا دیا۔ چنانچہ ضمیر کے شاگرد دبیر اور خلیق کے شاگرد انیس تھے۔ صاحب مراۃ الشعراء نے مصحفی کے کلام پر یہ دلچسپ تبصرہ کیا "مصحفی کا کلام ہر قسم کا ہے۔ پُرجوش بھی اور پُردرد بھی۔ شیریں بھی ہے اور پُرکیف بھی۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ پھیکا بھی ہے اور بے لطف بھی۔ پس پُھسا بھی ہے اور کمزور بھی۔ بندشیں چست بھی ہیں اور سست بھی۔ مضمون آفرینی کم ہے اور قافیہ پیمائی زیادہ۔ عشق و عاشقی معمولی ہے اور سادگی بہت ہے۔ تصوف بالکل نہیں۔"

مضطر۔ ان کا نام سید افتخار حسین تھا اور امیر مینائی کے شاگرد تھے۔ وطن خیر آباد تھا ۱۸۶۵ء میں پیدا ہوئے اور ۱۹۲۶ء میں انتقال کیا۔

مظہر جانِ جاناں۔ مرزا جان جان یا جانِ جاناں نام مظہر تخلص۔ نہایت صحیح النسب سید اور بڑے عالی مرتبت بزرگ تھے۔ والدہ بیجاپور کے ایک شریف گھرانے سے تعلق رکھتی تھیں۔ باپ مرزا جان، تخلص بہ جانی شہنشاہ اورنگ زیب کے دربار میں صاحب منصب تھے۔ دادا بھی دربار شاہی کے معزز عہدہ دار تھے۔ پردادا سے شہنشاہ جلال الدین اکبر کی دختر منسوب تھی۔ جب اورنگ زیب دکن میں تھا۔ اس وقت ان کے والد شہنشاہ سے رخصت ہو کر دہلی کو چلے تو راستہ میں بمقام کالا باغ (مالوہ)، ۱۱ فروری ۱۷۰۰ء کو یہ پیدا ہوئے۔ باپ نے شمس الدین نام رکھا۔ لیکن شہنشاہ نے سنا تو فرمایا بیٹا باپ کی جان ہوتا ہے تو بیٹے کا نام جانِ جاناں ہونا چاہیے۔ آج باپ کے رکھے ہوئے نام کو کوئی جانتا بھی نہیں۔ شہنشاہ کا رکھا ہوا نام زبان زد خاص و عام ہے۔ ان کے والد مرزا جان بھی شاعر تھے اور جانی تخلص کرتے تھے۔ مظہر ۱۶ برس کے تھے کہ باپ کا انتقال ہو گیا۔ یہ جوان ہوئے تو صوفیت اور فقیری کو شاہی مصاحبت پر ترجیح دی۔ اور صوفیائے کرام کی صحبت اختیار کی۔ شیخ محمد افضل سیالکوٹی سے حدیث پڑھی۔ غرض تھوڑے ہی دنوں میں صوفی باصفا اور درویش کامل بن گئے۔ یہاں تک کہ سینکڑوں ہندو مسلمان آپ کے مرید ہو گئے۔ شروع شاعری کا شروع سے ذوق تھا۔ مظہر تخلص اختیار کیا۔ رام بابو سکسینہ لکھتے ہیں کہ "آپ کا کلام زبان اردو کی تاریخ میں خاص اہمیت رکھتا ہے۔ آپ نے نہ صرف زبان کو ثقیل الفاظ سے پاک کیا بلکہ اس میں نئی نئی ترکیبیں بھی ایجاد کیں۔ آپ کا کلام نظم و نثر دونوں میں نہایت سادہ سلیس اور فصیح ہوتا ہے اور جذبات و تاثر کے ساتھ تصوف سے بھی مالا مال ہے۔"

میر تقی میر اپنے تذکرہ میں ان کا ذکر ان الفاظ سے کرتے ہیں "درویش، مقدس، مظہر، درویش، عالم، صاحب کمال شہرۂ عالم، بے نظیر، معزز کرم اکثر اوقات دریاو الہٰی صرف سے کرتے" ان کے پاک باطن بزرگ اور باکمال صوفی ہونے کے لیے یہی بات کافی ہے کہ قاضی ثناء اللہ محدث پانی پتی جیسا فاضل اجل انسان ان کا مرید تھا اور انہی کے نام پر انہوں نے اپنی مشہور عالم اور بے نظیر تفسیر لکھی ہے۔ جو تفسیر مظہری کے نام سے مشہور ہے۔ ان کی تاریخ وفات بہت سے مصنفین نے مختلف لکھی ہے۔ لیکن صحیح یہ ہے کہ ۱۰ محرم ۱۱۹۵ھ (مطابق ۶ جنوری ۱۷۸۱ء) کو ان کا انتقال ہوا۔ بعض شاگردوں کے نام یہ ہیں۔ انعام اللہ خاں یقین

...دولال بیدار۔ میر باقر حزیں۔ احسن اللہ خاں بیان۔ حیبت قلی خاں حسرت۔ شاہ قدرت اللہ قدرت۔ مصطفیٰ خاں یک رنگ۔ محمد فقیہ دردمند

معروف۔ نواب مرزا الٰہی بخش خاں نام، معروف تخلص۔ والی فیروز پور جھرکہ و رئیس لوہارو اور فخر الدولہ دلاور الملک نواب احمد بخش خاں رستم جنگ کے چھوٹے بھائی تھے۔ نہایت عابد، زاہد اور پرہیزگار شخص گزرے ہیں۔ فن شعر میں شاہ نصیر کے شاگرد تھے۔ بعد میں ذوق سے اصلاح لینے لگے تھے۔ ان کی بیٹی امراؤ بیگم کی شادی مرزا اسد اللہ خاں غالب سے ہوئی تھی۔ معروف نے ۱۲۴۲ھ (۱۸۲۶ء) میں وفات پائی۔ اور درگاہ نظام الدین دہلی میں دفن ہوئے۔ دیوان چھپ گیا ہے۔

مقتول۔ مرزا ابراہیم بیگ نام اور مقتول تخلص تھا۔ مصحفی کے شاگرد تھے۔

منت۔ میر قمر الدین نام، منت تخلص۔ سونی پت (نزد پانی پت) کے رہنے والے تھے۔ دلی میں تعلیم و تربیت پائی۔ تمام درسی کتابیں حضرت شاہ عبد العزیز سے پڑھیں۔ فارسی میں میر شمس الدین کے اور اردو میں شیخ قیام الدین کے شاگرد تھے۔ دونوں زبانوں میں بہت اچھے شعر کہتے تھے۔ آصف جاہ ثانی والی دکن کے زمانہ میں حیدر آباد گئے اور نواب کی مدح میں قصیدہ لکھ کر دس ہزار نقد ملا اور دو سو ماہوار وظیفہ مقرر ہوا۔ کلکتہ میں ۱۲۰۸ھ (۱۷۹۴ء) میں انتقال ہوا۔ ایک دیوان اور چند مثنویاں اور گلستان کے جواب میں ایک کتاب نگارستان ان کی یادگار ہیں۔ میر نظام الدین ممنون مشہور شاعر انہی کے فرزند ہیں۔

ممنون۔ میر نظام الدین ابن میر قمر الدین نام، ممنون تخلص۔ وطن سونی پت جو پانی پت اور دہلی کے درمیان ایک خرد قصبہ ہے۔ تعلیم و تربیت دہلی میں ہوئی۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے عہد میں صدر الصدور کے عہدہ پر فائز تھے۔ پنشن کے بعد دہلی میں سکونت اختیار کی۔ صاحب گل رعنا ان کے متعلق لکھتے ہیں "ان کی زبان صاف و شیریں ہے۔ جس میں جا بجا محاوروں کی چاشنی موجود ہے۔ جس کے باعث کلام اور بھی مزیدار ہو جاتا ہے۔ پامال اور فرسودہ مضامین کو بھی اس انداز سے بیان کرتے ہیں کہ ان میں ایک لطافت پیدا ہو جاتی ہے۔" بقول صاحب مراۃ الشعراء "۱۲۶۰ھ (۱۸۴۴ء) میں ایک ضخیم دیوان چھوڑ کر راہی ملک بقا ہوئے۔" شیفتہ جیسا نقاد سخن ان کے متعلق کہتا ہے۔ "طرز گفتارش خیلے دلچسپ و دل نشیں است و طلاقت کلامش نہایت عذب و شیریں۔"

منتظر۔ میاں نور الاسلام ان کا نام تھا اور منتظر تخلص کرتے تھے۔ مصحفی کے شاگرد تھے۔

منیر۔ ان کا نام سید محمد اسماعیل حسین تھا۔ شکوہ آباد (ضلع مین پوری) کے رہنے والے تھے۔ منیر تخلص کرتے تھے۔

۱۲۰۷ھ میں پیدا ہوئے۔ فن شعر میں پہلے ناسخ کے شاگرد ہوئے، پھر رشک سے اصلاح لی۔ غزل اور قصیدہ ان کے خاص موضوع ہیں جس میں انھوں نے طبیعت کی خوب خوب جولانیاں دکھائی ہیں۔ طول گوئی ان کی خصوصیت ہے اور کلام میں مبالغہ کی انتہا نہیں۔ مرثیہ بھی کہتے تھے جس میں وہ دبیر کے شاگرد تھے۔ اُن کی غزلوں میں لکھنویت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔ لکھنؤ سے اُن کو عشق سا تھا۔ کانپور میں نواب نظام الدولہ کے مصاحب رہے۔ اور لکھنؤ میں ظفر الدولہ کے۔ فرخ آباد میں نواب تجمل حسین خاں کے، باندہ میں والی ریاست نواب علی بہادر اور آخر میں نواب کلب علی خاں والی رامپور کے ہاں ملازم رہے جہاں [illegible] میں وفات پائی۔ ایک طوائف کے قتل کے سلسلے میں کالے پانی کی سزا بھی ہوئی تھی۔۔۔ مگر پھر رہائی مل گئی تھی۔ منتخبات عالم، تنویر الاشعار اور نظم بے نظیر ان کے مجموعہ کلام ہیں۔ معراج المضامین ایک مثنوی بھی لکھی تھی۔

مومن۔ دلی کے رہنے والے اور حکیم غلام نبی خاں کے بیٹے تھے۔ جب پیدا ہوئے تو حضرت شاہ عبدالعزیز نے آکر کان میں اذان دی اور مومن خاں نام رکھا۔ عربی ادب میں حضرت شاہ عبدالقادر کے اور طب میں اپنے والد اور چچا کے شاگرد ہیں۔ شاعری میں شاہ نصیر سے شرف تلمذ ہے۔ حافظہ غضب کا تھا۔ حضرت شاہ عبدالعزیز کا وعظ سنتے تو ویسا ہی دہرا دیتے۔ شاعری کے علاوہ نجوم سے بھی شوق تھا۔ مولانا حالی لکھتے ہیں کہ نجوم میں ایسا ملکہ رکھتے تھے کہ ان کا نام سن کر بڑے بڑے منجم حیران رہ جاتے تھے۔ شطرنج کا بھی نہایت شوق تھا۔ بقول مولانا حالی شعر و سخن سے ان کو طبعی مناسبت تھی اور عاشق مزاجی سے ان کو چسکا پڑا تھا۔ رنگین طبع، رنگین مزاج، خوش وضع اور خوش لباس تھے۔ ساری عمر کسی کی تعریف میں قصیدہ نہیں کہا۔ غیور اس قدر تھے کہ کسی عزیز یا دوست کا ادنیٰ احسان بھی کبھی گوارا نہیں کیا۔ ان کی تاریخیں جو وہ مختلف اوقات میں کہتے تھے نہایت دلچسپ اور پُر لطف ہوتی تھیں۔ ان میں سے چند آب حیات میں درج ہیں۔ ان کے کلام کے متعلق آزاد کی رائے ہے کہ غزلوں میں اُن کے خیالات نہایت نازک اور مضامین عالی ہیں۔ استعارہ اور تشبیہ کے زور نے انھیں اعلیٰ درجہ پر پہنچا دیا ہے۔ قصائد اچھے درجہ میں عالی رتبہ رکھتے ہیں۔ مثنویاں نہایت درد انگیز ہیں۔ نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ ان کے عزیز بھائی، نواب محمد اکبر خاں، میر حسین تسکین، سید غلام علی وحشت، غلام ضامن کرم، میر عبدالرحمٰن آسی، حکیم منور علی آشفتہ، نواب اصغر علی خاں نسیم اور شہزادہ خدا بخش قیصر ان کے شاگرد تھے۔ ۱۲۱۵ھ (۱۸۰۰ء) میں پیدا ہوئے اور ۱۲۶۸ھ/۱۸۵۲ء میں وفات پائی۔

آب حیات کی تدوین کے وقت مومن کے حالات آزاد کو کہیں نہیں ملتے تھے۔ مولانا الطاف حسین حالی نے ان کی درخواست پر مومن کے مفصل حالات لکھ کر بھیجے جو آزاد نے آب حیات کے دوسرے ایڈیشن میں شائع کیے مگر دستِ قلب کر دیکھئے، مولانا کا نام بالکل نہ لکھا۔ صرف یہ فقرہ تحریر کیا کہ "ایک صاحب کے الطاف و کرم کا شکر گزار ہوں جنھوں نے یہ حالات لکھ کر عنایت فرمائے۔" اگرچہ لفظ الطاف سے مولانا حالی کے نام الطاف حسین کی طرف اشارہ کر دیا۔ جس سے کچھ لوگ سمجھ گئے۔ مگر صاف نام نہ لیا۔

مہر: میرزا حاتم علی بیگ نام، مہر تخلص ہے۔ ۱۸۱۵ء میں پیدا ہوئے۔ ۱۸۵۷ء کی بغاوت کے وقت وفاداری سرکار کے صلہ میں خلعت اور دس گاؤں جاگیر میں ملے جن کی آمدنی سے بقیہ عمر عیش سے گزاری۔ اس سے پہلے ہائی کورٹ میں وکیل تھے۔ چودہ برس کی عمر سے شعر کہنے شروع کیے۔ نہایت پرگو شاعر تھے۔ تاریخ کہنے کا خاص ملکہ تھا۔ کلام میں سلاست اور روانی ہے۔ زبان پر پوری قدرت حاصل ہے۔ آگرہ میں آنریری مجسٹریٹ تھے۔ ۱۸۷۹ء میں انتقال ہوا۔

دیوان مہر، سراپا، عروض، تاریخ خوش گلستان، مثنوی داغ نگار، داغ دل مہر، مثنوی شعاع مہر تصانیف ہیں۔

میر: غزل گو شعراء کے سرتاج ہیں۔ نام محمد تقی، تخلص میر۔ آگرہ میں پیدا ہوئے۔ کلام سادہ، دلآویز اور درد و اثر سے لبریز ہوتا ہے۔ ہر صنف شعر میں طبع کی جولانی دکھائی ہے۔ تمام اساتذہ فن ان کی استادی کے قائل ہیں۔ غالب کہتا ہے ؎

غالب اپنا یہ عقیدہ ہے بقول ناسخ
آپ بے بہرہ ہے جو معتقد میر نہیں

ذوق بھی ان کو مانتے ہیں ؎

نہ ہوا پر نہ ہوا میر کا انداز نصیب ۔۔۔ ذوق یاروں نے بہت زور غزل میں مارا

حالی کی سنئے ؎

حالی سخن میں شیفتہ سے مستفید ہے ۔۔۔ غالب کا معتقد ہے مقلد ہے میر کا

حسرت موہانی فرماتے ہیں ؎

شعر میرے بھی ہیں پر درد ولیکن حسرت ۔۔۔ میر کا شیوۂ گفتار کہاں سے لاؤں

ان کو اپنی استادی پر خود بھی فخر تھا کہتے ہیں اور کس رو سے کہتے ہیں ؎

مستند ہے میرا فرمایا ہوا

نہایت نازک مزاج، خود دار، خود پسند اور بے حد قانع اور متوکل شخص تھے۔ اسلامیات میں زیادہ شغف [illegible] ان کی [illegible] تیس سپہ و قلم کی ہیں۔ بچپن میں یتیم ہو گئے اور اپنے خالو سراج الدین علی خان آرزو کے پاس دہلی بھیجے گئے۔ وہاں تعلیم و تربیت پائی۔ جوان ہوئے تو نواب آصف الدولہ کے بلانے پر لکھنؤ چلے گئے۔ اور وہیں نوے برس کی عمر پا کر ۱۸۱۰ء میں انتقال کیا۔ چھ دیوان غزلوں کے یادگار چھوڑے۔ دو واسوخت اور کئی قصیدے بھی کہے۔ مثنویاں کئی ہیں۔ شعلۂ عشق، دریائے عشق، اعجاز عشق، خواب و خیال، معاملات عشق، شکار نامہ، تذکرہ [illegible] اور شعراء کا ایک تذکرہ بعنوان نکات الشعراء کے مصنف بھی ہیں۔

مرزا رفیع سودا۔ خواجہ میر درد۔ مرزا مظہر جان جاناں، قائم، [illegible] مصحفی [illegible] ان کے ہم عصر تھے۔

ان کے فرزند میر عسکری عرف میر کلو بھی صاحب دیوان شاعر تھے عرش تخلص تھا۔ لکھنؤ میں رہتے تھے۔

ناسخ۔ شیخ امام بخش نام ناسخ تخلص۔ لاولد تھے۔ پیدائش فیض آباد اور شاعری کا میدان لکھنؤ ہے۔ مصحفی، قتیل، جرأت، انشا، مصحفی وغیرہ کے ہم عصر ہیں۔ فن شعر میں کسی کے شاگرد نہیں مگر شعر میں ہم پلہ بلکہ بعض مشہور شاعر ان کے شاگرد ہیں مثلاً خواجہ وزیر، [illegible]، میر علی اوسط رشک، شیخ امداد علی بحر، منیر شکوہ آبادی، آغا کلب حسین خاں نادر۔ ورزش اور ریاضت کا بے حد شوق تھا۔ انتہا یہ ہے کہ ۱۲۹۵ ڈنڑ روز پیلا کرتے تھے۔ جیسے تنومند اور طاقتور تھے ویسی ہی خوراک بھی تھی۔ کھانا اگرچہ ایک وقت کھاتے مگر وہ پانچ سیر سے کم نہ ہوتا۔ آم کھانے بیٹھتے تو تین چار ٹوکرے ہضم کر جاتے۔ جامنیں آتیں تو پانچ سیر سے کم نہ کھاتے۔ جامن نہایت پسند تھے۔ مگر کھاتے تھے تنہا ہی تھے۔ حقے کا عشق تھا۔ اور سیکڑوں طرح طرح کے حقے جمع کر رکھے تھے۔ یہی سبب ہے کہ شعر کی مجری ہوئی تھی۔ نہایت درجہ مستغنی المزاج بے پروا۔ اور عالی دماغ شخص تھے۔ امیر بیش بالکل نہ رکھتے اور جو بات ناگوار طبع ہوتی فوراً منہ پر کہہ دیتے تھے۔ خواہ مخاطب کو کتنی ہی ناگوار گزرے۔ سیاحی کا بھی شوق تھا اس سلسلہ میں الٰہ آباد، بنارس، عظیم آباد، پٹنہ کی سیر کی۔ دو دیوان نظم میں یادگار ہیں جو مشہور ہیں۔ ایک مثنوی بھی لکھی جو حدیث مفضل کا ترجمہ ہے۔ نظم سراج نام ہے۔ تاریخ گوئی میں کمال حاصل تھا۔ ان کی غزل کے متعلق آزاد کی رائے ہے کہ "اس میں شوکت الفاظ، بلند پروازی اور نازک خیالی تو بہت ہے مگر تاثیر کم ہے۔" مزاج کے متعلق آزاد کہتے ہیں کہ "بہت خوش اخلاق تھے۔ مگر اپنے خیالات میں ایسے محو رہتے تھے کہ ناواقف شخص خشک مزاج اور بد دماغ سمجھتا تھا۔" مگر اس میں شبہ نہیں کہ نہایت درجہ نازک مزاج واقع ہوئے تھے۔ ان کی نازک مزاجی کے بعض بہت دلچسپ لطیفے آبِ حیات میں مرقوم ہیں۔ قریباً سو سال کی عمر پائی اور [illegible] میں بمقام لکھنؤ انتقال کیا۔

ناطق لکھنوی۔ ان صاحب کا نام سعید احمد ہے۔ اور [illegible] میں لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ اس سے زیادہ ان کے حالات نہیں ملے۔

ناظم۔ نواب یوسف علی خاں والی رامپور اپنے باپ کے بعد ۱۸۵۵ء میں تخت پر بیٹھے۔ ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ میں انگریزوں کا ساتھ دیا جس کے صلہ میں ستارہ ہند کا خطاب اور ایک لاکھ روپیہ کی جاگیر ملی۔ فن شعر میں غالب کے شاگرد تھے۔ اور ناظم تخلص کرتے تھے۔ منطق اور فلسفے کے بھی خوب ماہر تھے۔ ۲۱ اپریل ۱۸۶۵ء کو انتقال ہو گیا۔

نثار۔ میاں محمد امان نام اور نثار تخلص تھا۔ شیخ ظہور الدین حاتم کے شاگرد تھے۔ وطن دہلی تھا مگر لکھنؤ چلے گئے تھے وہاں شاعروں سے خوب خوب چوٹیں ہوتی تھیں۔ سودا، درد اور قائم کے ہم عصر تھے۔

ندرت میرٹھی۔ شعیب احمد نام۔ ندرت تخلص۔ مولانا احمد حسین شوکت (مہتمم مدرسہ شرقیہ) کے لڑکے ہیں۔ [illegible] میں بمقام میرٹھ پیدا ہوئے۔ عربی اور فارسی کی تعلیم شروع میں تو اپنے والد سے پائی۔ پھر اس کی تکمیل مختلف اساتذہ سے کی۔

فراغت کے بعد اپنے والد کے اخبار شحنۂ ہند کے سب ایڈیٹر رہے۔ ۱۹۰۵ء میں خود ایک ادبی رسالہ عندلیب نکالا۔ پھر ناصر الاخبار کی ادارت کی اور مختلف اخبارات میں نظمیں اور مضامین لکھتے رہے۔ ۱۹۱۰ء میں میرٹھ سے نگارہ جاری کیا اور پھر ۱۹۲۳ء سے آئینہ نکالا۔ آخر عمر میں ۲ بیٹے اور ایک بیٹی کا اپنے سامنے انتقال ہو گیا جس کی وجہ سے نہایت دل شکستہ اور غمگین و مجبور رہنے لگے۔ کلام میں شستگی، صفائی اور سلاست ہے۔ خوننابۂ دل ان کے کلام کا مجموعہ ہے۔

نسیم بھرت پوری۔ نام سید نصیر حسین (ایک تذکرہ میں شبیر حسین لکھا ہے) اور تخلص نسیم ہے۔ ریاست بھرت پور کے رہنے والے اور داغ کے شاگرد تھے۔ استاد کو ان کی شاگردی پر فخر تھا۔ اور اکثر اپنے پاس حیدر آباد بلایا کرتے تھے۔ غزل گو شعراء میں بڑا نام پیدا کیا اور اکثر معرکۃ الآرا طرحوں پر بڑے زور کی غزلیں لکھیں۔ ریاست کے محکمہ پولیس میں ملازم تھے۔ ۱۸۶۱ء میں پیدا ہوئے، اور ۱۹۱۳ء میں انتقال کیا۔ ۵۲ برس کی عمر پائی۔

نسیم دہلوی۔ نواب مرزا اصغر علی خاں نام۔ نواب آقا علی خاں قاچار کے بیٹے۔ نسیم تخلص۔ وطن دہلی تھا۔ ۱۷۹۹ء میں پیدا ہوئے۔ فن شعر میں حکیم مومن خاں کے شاگرد ہیں۔ خانگی جھگڑوں کے باعث دلی چھوڑ لکھنؤ کی راہ لی۔ کچھ دنوں واجد علی شاہ کے دربار میں رہے۔ لیکن جب وہ معزول ہو کر کلکتہ گئے تو یہ لکھنؤ ہی رہے۔ بعد کے زمانہ میں منشی نولکشور نے ان کو اپنے مطبع میں نوکر رکھ لیا اور الف لیلہ کو منظوم کرنے کی خدمت ان کے سپرد کی۔ تھوڑا ہی کام ہوا تھا کہ پیغام اجل آ گیا۔ اور ۱۴ رمضان ۱۲۸۲ھ (۳۱ جنوری ۱۸۶۶ء) کو داعی اجل کو لبیک کہا۔

بے پروائی اور آزادروی کے باعث کبھی اپنا کلام جمع نہیں کیا۔ دیوان شاگردوں کا مرتب کیا ہوا ہے۔ حسرت موہانی نے انتخاب ۴۰۰ اشعار کا چھاپا تھا۔ آپ کے کلام میں تشبیہات و استعارات اور فارسی تراکیب بھی ہیں۔ کلام میں بالعموم شیرینی اور حلاوت ہے۔ غزل آپ کا خاص مضمون ہے۔ حسرت موہانی کی ان کے کلام کے متعلق یہ رائے ہے کہ لکھنؤ کی زبان اور دہلی کے بیان کی پسندیدہ اور معتدل ترکیب کا جلوہ جیسا مرزا نسیم کی شاعری میں نظر آتا ہے۔ اس کی مثال کسی دوسرے شاعر کے کلام میں نہیں مل سکتی۔

نسیم لکھنوی۔ پنڈت دیا شنکر نام۔ پنڈت گنگا پرشاد کول کے بیٹے۔ نسیم تخلص۔ وطن لکھنؤ۔ سال پیدائش ۱۸۱۱ء۔ ایک معزز کشمیری خاندان کے فرد اور شاہ اودھ کی فوج میں بخشی گری کے عہدہ پر تعینات تھے۔ بچپن ہی سے شاعری کا شوق ہوا۔ بیس سال کی عمر میں خواجہ حیدر علی آتش کے شاگرد ہوئے۔ نہایت طباع، ذہین اور حاضر جواب تھے۔ اور بڑی سرعت کے ساتھ اشعار ان کے دماغ سے نکلا کرتے تھے۔ لکھنؤ کے اکثر اساتذہ سے فیض حاصل کیا اور فن شعر میں جلد ہی نہایت مشہور ہو گئے۔ ۲۵ برس کی عمر میں قصہ گل بکاؤلی کو نظم کیا اور مثنوی گلزار نسیم نام رکھا۔ یہ میر حسن کی مثنوی سحر البیان کے مقابلہ میں لکھی گئی تھی۔ یہی لاجواب اور دلچسپ مثنوی نسیم کی لازوال شہرت کا باعث ہوئی۔ اس مثنوی پر پہلے اودھ پنچ میں موافق و مخالف بہت

سے مضامین شائع ہوئے اور نتائج بعد ۱۹۰۵ء میں پنڈت برج نرائن چکبست اور مولانا عبدالحلیم شرر میں بحث و نظر کی قلمی جنگ ہوئی جس کی تفصیل کتاب "معرکۂ چکبست و شرر" میں مفصل مذکور ہے۔ نسیم نے عین جوانی میں بعمر ۳۲ سال ۱۸۴۳ء میں انتقال کیا۔ بیٹے کا پہلا ابھی بھولا بھی نہ تھا کہ مرجھا گیا۔

ان کی تصنیف گلزار نسیم کے متعلق رام بابو سکسینا اپنی مشہور تالیف تاریخ ادب اردو میں لکھتے ہیں "اس کا ایجاز، معانی، مناسبت الفاظ، رنگینی عبارت، نادر تشبیہات و استعارات، یہ سب قابل تعریف ہیں البتہ تصنع ضرور ہے... یہ مثنوی اس قدر مقبول ہوئی کہ اس کے بہت سے اشعار بطور ضرب المثل زبان پر چڑھ گئے ہیں۔ اس سے پنڈت دیا شنکر نسیم کا نام ہمیشہ کے لئے روشن ہے اور وہ اردو کے ایک مایہ ناز شاعر کہلائے جانے کے قرار واقعی مستحق ہیں" (تاریخ ادب اردو ص ۱۸۸)

شاہ نصیر الدین نصیر۔ شاہ نصیر الدین نام، نصیر تخلص۔ دہلی کے رہنے والے۔ فن شعر میں شاہ محمدی مائل کے شاگرد تھے۔ دو مرتبہ لکھنؤ گئے۔ حیدرآباد بھی کئی مرتبہ گئے اور آخر ۱۲۵۳ھ (۱۸۳۸ء) میں وہیں وفات پائی۔ نہایت نیک نفس، نفیس طبع، لطیف مزاج، بامذاق اور خوش پوشاک تھے۔ یاروں کے یار تھے۔ ظرافت اور بذلہ سنجی کا گویا مجسمہ تھے۔ ان کا کلیات حیدرآباد میں چھپا تھا لیکن آج کل نہیں ملتا۔ ان کی شاعری کا درجہ اس بات سے ظاہر ہے کہ ذوق اور مومن ان کے شاگرد تھے۔

نظام۔ سید نظام علی شاہ ان کا نام تھا اور نظام تخلص۔ رامپور کے سیدوں میں سے تھے۔ فن شعر میں پہلے شیخ علی بخش بیمار سے اصلاح لی پھر نواب یوسف علی خاں ناظم والی رامپور کو اپنا کلام دکھانے لگے۔ ۲۰ اکتوبر ۱۸۷۲ء کو رامپور ہی میں انتقال ہوا۔ دیوان مرنے کے بعد رامپور ہی میں چھپا۔

نظم طباطبائی۔ سید علی حیدر نظم طباطبائی لکھنؤ میں ۲۹ نومبر ۱۸۵۲ء کو پیدا ہوئے۔ والد کا نام سید مصطفیٰ حسین طباطبائی تھا جو ایک سپاہی آدمی تھے۔ جب پڑھ لکھ کر قابل ہوئے تو معزول شاہ اودھ واجد علی شاہ کے پاس مٹیا برج کلکتہ میں شاہزادوں کو پڑھانے پر ملازم ہو گئے۔ جب وہ میدان چھوٹ گیا تو حیدرآباد دکن جا کر نظام کالج کے پروفیسر ہو گئے۔ پھر کتب خانہ آصفیہ کے مہتمم بنا دیے گئے۔ مگر پھر واپس کالج میں چلے گئے۔ جب ۳۰ سال کی ملازمت کے بعد ریٹائر ہوئے تو شاہزادوں کی تربیت کا کام ان کے سپرد ہوا۔ دارالترجمہ عثمانیہ میں ناظر ادب کی خدمات بھی انجام دیں۔ پھر نظام کالج میں عربی کے پروفیسر مقرر ہو گئے۔ ۲۲ مئی ۱۹۳۳ء کو وہیں انتقال ہوا۔ آپ اخلاق و آداب میں پرانے بزرگوں کی ایک مثال تھے۔ آپ کے شاگردوں کا حلقہ بہت وسیع تھا۔ مولوی عبدالحلیم شرر اور مہاراجہ کشن پرشاد مدار المہام حیدرآباد آپ ہی کے شاگرد تھے۔ شرح دیوان غالب، شرح دیوان امرؤ القیس، تشریح الافلاک اور تاریخ یورپ آپ کی تصنیفات ہیں۔ نظم طباطبائی اور دیوان طباطبائی ان کی نظموں کے مجموعے ہیں۔

نظر لکھنوی - نوبت رائے نام نظر تخلص۔ وطن لکھنؤ۔ کائستھ خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ پیدائش ۱۸۶۶ء کی ہے۔ فارسی اور انگریزی اچھی جانتے تھے۔ شاعری کا شوق شروع ہی سے تھا۔ آغا مظہر کے شاگرد تھے۔ ۱۸۹۴ء میں لکھنؤ سے رسالہ خدنگ نظر جاری کیا جو سات سال تک جاری رہا۔ ۱۹۰۳ء میں رسالہ زمانہ کے اسسٹنٹ ایڈیٹر مقرر ہوئے۔ لیکن ۱۹۱۱ء میں استعفیٰ دے دیا۔ وہاں سے آ کر اخبار آزاد کی ایڈیٹری سنبھال لی۔ اس کے بعد لکھنؤ جا کر "تفریح" کی ادارت کی۔ پھر اودھ اخبار کے ایڈیٹر ہو گئے۔ لیکن خرابی صحت کی بنا پر وہاں سے بھی قطع تعلق کر لیا۔ آخر میں اخبار خادم ہند کے بھی کچھ مدت ایڈیٹر رہے۔ نہایت سادہ مزاج۔ سادہ وضع اور خوش اخلاق شخص تھے۔ نمود و نمائش اور غرور و تکبر سے بالکل پاک تھے۔ اعلیٰ پایہ کے مضمون نگار ہونے کے علاوہ خوشنویس و مصور بھی تھے۔ آخری عمر بہت تفکرات اور مصائب میں گزری۔ یہاں تک کہ زندگی سے تنگ آ گئے۔ اسی حالت میں ۱۰ اپریل ۱۹۲۳ء کو انتقال کیا۔

ان کے متعلق منشی دیا نرائن نگم ایڈیٹر زمانہ کی رائے سنیے "فطرت سے انھوں نے علم و ادب کے لیے نہایت موزوں طبیعت پائی تھی۔ قدرت نے انھیں نہایت شستہ و سیر ذوق سخن عطا کیا تھا۔ بچپن میں ان کو صحبت بہت اچھی ملی جس سے طبیعت میں رفعت، مزاج میں متانت اور عادت میں سنجیدگی پیدا ہو گئی تھی۔ ذہن بلا کا تھا۔ معیار خیال بہت اونچا اور مطمح نظر نہایت بلند تھا۔"

نظیر اکبر آبادی - ولی محمد نام۔ محمد فاروق کے بیٹے اور دہلی کے رہنے والے تھے۔ نظیر تخلص تھا۔ ۱۱۴۸ھ (۱۷۳۵ء) میں پیدا ہوئے۔ ۲۶ برس کے تھے کہ احمد شاہ ابدالی نے دہلی پر حملہ کیا۔ اس موقع پر یہ دہلی سے نکلے اور اکبر آباد (آگرہ) چلے گئے۔ اور وہیں مستقل سکونت اختیار کر لی۔ اردو کے علاوہ فارسی میں بھی شعر کہتے تھے۔ اردو کلیات خاصا ضخیم ہے۔ فارسی میں ۹ کتابیں لکھیں۔ سید زوار حسینی صاحب نے ۱۹۵۲ء میں لاہور سے اردو شاعروں کا ایک البم نہایت ہی نفاست کے ساتھ آرٹ پیپر پر شائع کیا تھا۔ جس میں تصاویر کے ساتھ ہر شاعر کے مختصر حالات بھی ہیں۔ نظیر اکبر آبادی کے متعلق لکھتے ہیں۔

"نظیر ایک نغز گو اور بذلہ سنج شاعر تھے۔ فن شعر میں کسی کے مقلد نہ تھے۔ بلکہ خود ہی اپنے رنگ کے موجد تھے۔ ان کا موضوع انسان اور اس کی معاشرت ہے۔ انسانی ہمدردی۔ جزئیات کا مطالعہ اور ہمہ گیر تخیل ان کا طرۂ امتیاز ہے۔ زبان پر قدرت۔ معاشرتی حالات پر عبور۔ فطرت کی رمز شناسی۔ مناظر قدرت کی مصوری۔ مختلف فنون کا وقوف۔ سیاسی بصیرت۔ رفتار زمانہ سے دلچسپی۔ اختراع۔ الفاظ کا سلیقہ۔ ظرافت۔ سوز و گداز اور ترنم۔ غرض نظیر میں شاعری کے سارے لوازم اور محاسن موجود ہیں۔ نظیر نے اردو زبان میں نئی بندشوں اور جدید ترکیبوں کا اضافہ کیا۔ اردو شاعری میں نیچرل شاعری کا بیج سب سے پہلے انہی نے لگایا۔ نظیر نے ہر صنف سخن میں طبع آزمائی کی ہے۔ زندگی کا کوئی پہلو۔ اور حیثیت و معاشرت کا کوئی انداز۔ احساسات و تاثرات کا کوئی منظر ایسا نہیں جو کلیات نظیر میں نہ ملتا ہو۔" ۱۲۴۶ھ (۱۸۳۰ء) میں آگرہ میں انتقال کیا۔

نوا - ان کا نام شیخ محمد [illegible] تھا اور نوا تخلص کرتے تھے۔ بدایوں کے رہنے والے اور وہاں کے صدیقی خاندان

سے تعلق رکھتے تھے۔ جہاں سے لکھنؤ جا کر شاہ اودھ کے ہاں نوکر ہو گئے اور رضا خان کا خطاب پایا۔ کچھ دنوں بعد وہاں سے ایران گئے اور بہت دنوں تک وہاں رہ کر عوام و خواص کے دلوں پر اپنے علم و فضل کا سکہ جمایا۔ پھر واپس لکھنؤ چلے آئے اور یہیں [illegible] میں انتقال کیا۔

نوح ناروی۔ ہندوستان کے غزل گو شعراء میں نہایت مشہور شاعر ہیں۔ داغ کے ارشد تلامذہ میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ خود ۴۰۰ سے زیادہ شاعروں کے اُستاد ہیں۔ کلام میں سلاست اور روانی ہے۔ ساری عمر حسن و عشق اور ہجر و وصال کے جھگڑوں میں گزار دی۔ سوائے اس کے کچھ کام نہ کیا۔ سفینۂ نوح۔ طوفانِ نوح۔ اور اعجازِ نوح ان کے کلام کے ضخیم مجموعے ہیں۔ [illegible] سے ماہوار رسالہ رہنمائے تعلیم پہلے لاہور سے اور اب دہلی سے ان کی زیر سرپرستی نکل رہا ہے۔ نام محمد نوح ہے۔ ۱۸ ستمبر ۱۸۷۹ء کو بھانی پھر (ضلع رائے بریلی) میں پیدا ہوئے۔ وطن نارہ (ضلع الٰہ آباد) ہے۔

نیاز۔ شاہ نیاز احمد ان کا نام تھا۔ نیاز تخلص کرتے تھے۔ بریلی کے رہنے والے تھے۔ ۱۷۴۲ء میں پیدا ہوئے۔ ۱۸۳۴ء میں انتقال کیا۔

واقف۔ شاہ واقف کے نام سے مشہور تھے۔ اور سودا کے معاصرین میں سے تھے۔ لکھنؤ میں سکونت تھی۔ اٹھارویں صدی کے آخر میں وفات پائی۔

وحشت۔ رضا علی نام۔ مولوی شمشاد علی کے فرزند۔ وحشت تخلص۔ کلکتہ کے رہنے والے اور وہیں ۱۸ نومبر ۱۸۸۱ء کو پیدا ہوئے۔ فن شعر میں مولوی ابوالقاسم محمد شمس کے شاگرد ہیں۔ اعلیٰ تعلیم سے فراغت کے بعد امپیریل ریکارڈ ڈپارٹمنٹ کلکتہ میں ملازم ہو گئے۔ پھر اسلامیہ کالج کلکتہ کی پروفیسری پر چلے گئے۔ ۱۹۳۱ء میں خان بہادر کا خطاب ملا۔ اور ۱۹۳۶ء میں پنشن پر ریٹائر ہو گئے۔ پاکستان بننے کے بعد کلکتہ سے ڈھاکہ چلے گئے۔ ان کی شاعری کے متعلق مولانا شبلی فرماتے ہیں "وحشت کے کلام میں جدت۔ ندرت اور پختگی ہوتی ہے۔ غالب اور مومن کی طرز ادا ان سے خوب بن پڑتی ہے۔" ان کے آباؤ اجداد دہلی کے رہنے والے تھے۔ لیکن ۱۸۵۷ء کی قیامت میں جب دلی اجڑی تو ان کے دادا حکیم غالب علی دہلی چھوڑ کر بنگال چلے گئے تھے۔

کلام کا پہلا مجموعہ دیوانِ وحشت کے نام سے ۱۹۱۰ء میں کلکتہ سے شائع ہوا۔ جس کی مولانا حالی نے بڑی تعریف کی۔ ۱۹۵۰ء میں ترانۂ وحشت کے نام سے ان کے مکمل کلام کا مجموعہ لاہور سے شائع ہوا۔ جس میں قریباً ۴ ہزار اشعار ہیں۔ ۲۰ جولائی ۱۹۵۶ء کو آپ نے وفات پائی۔

وزیر لکھنوی۔ خواجہ محمد وزیر نام تھا اور وزیر تخلص کرتے تھے۔ حضرت خواجہ بہاء الدین نقشبند کی اولاد سے تھے۔

دہلی وطن تھا۔ فارسی اور عربی کی تعلیم مکتب میں پائی۔ فن شعر میں ناسخ کے شاگرد تھے اور نہایت قانع، متوکل اور گوشہ نشین بزرگ تھے۔ واجد علی شاہ اور ان کے بعد دوسرے دربار میں بلایا گیا مگر یہ نہ گئے۔ آخر عمر میں شعر کہنا چھوڑ دیا اور علم جفر سے شوق پیدا ہو گیا تھا۔ ۱۲۹۰ھ (۱۸۷۳ء) میں وفات پائی۔ دیوان چھپ گیا ہے۔ جس میں چار ہزار کے قریب اشعار ہیں۔

وفا رامپوری۔ حکیم عبدالہادی خاں ان کا نام تھا۔ رامپور کے رہنے والے تھے۔ داغ اور امیر کے شاگرد تھے۔ ۱۲۶۹ھ میں پیدا ہوئے اور ۱۳۱۹ھ میں انتقال کیا۔

ولا۔ اصلی نام مرزا لطف علی بیگ مگر مظہر علی خاں کے نام سے مشہور ہیں۔ ولا تخلص تھا۔ شیفتہ نے ولا لکھا ہے۔ منت، طپش اور مصحفی کے شاگرد ہیں۔ عربی، فارسی، ہندی اور سنسکرت بہت اچھی جانتے تھے۔ اردو تو مادری زبان تھی۔ دہلی وطن تھا۔ دیوان کا قلمی نسخہ شاہان اودھ کے کتب خانہ میں تھا۔ فورٹ ولیم کالج کلکتہ میں فارسی اور ہندی کتابوں کے ترجمہ پر مامور تھے۔ جہاں رہ کر انھوں نے ترجمہ مادھونل اور کام کندلا۔ کریما کا ترجمہ۔ ترجمہ ہفت گلشن۔ اتالیق ہندی۔ ترجمہ بیتال پچیسی۔ ترجمہ تاریخ شیر شاہی۔ تزک جہانگیری کے ایک حصہ کا ترجمہ۔ غرض کئی کتابیں لکھیں۔ انیسویں صدی کے شروع میں وفات پائی۔

ولی دکنی۔ ان کے نام میں سخت اختلاف ہے۔ کوئی شمس الدین بتاتا ہے۔ کوئی شمس الحق سرور۔ کسی کا خیال ہے کہ نام ولی الدین تھا۔ کوئی کہتا ہے کہ نہیں صاحب ولی تھا۔ کوئی ولی محمد کہتا ہے تو کوئی ولی اللہ۔ غرض مختلف تذکروں میں مختلف نام ان کے لکھے ہوئے ہیں۔ مولد بعض اورنگ آباد دکن بتلاتے ہیں بعض احمد آباد گجرات۔ لیکن اہل اس امر پر سب متفق ہیں کہ انتقال احمد آباد میں ہوا۔ سنہ ولادت میں بھی اختلاف ہے۔ صاحب قاموس المشاہیر ۱۰۶۸ھ بتاتے ہیں۔ مصنف مرآۃ الشعراء ۱۰۶۷ھ لکھتے ہیں۔ اسی طرح سنہ وفات کوئی ۱۱۴۱ھ بتاتا ہے کوئی ۱۱۵۵ھ۔ ڈاکٹر ظہیر الدین اپنی کتاب ولی گجراتی میں ۴ شعبان ۱۱۱۹ھ (مطابق ۱۰ اکتوبر ۱۷۰۷ء) لکھتے ہیں۔ ولی اب تک اردو شاعری کے باوا آدم سمجھے جاتے تھے۔ لیکن اب یہ بات تحقیق ہو گئی ہے کہ ان سے پہلے بھی کئی اردو شاعر گزرے ہیں۔ ان کا کلیات انجمن ترقی اردو کی طرف سے شائع ہو چکا ہے۔ ولی دہلی بھی آئے تھے اور حج کو بھی گئے تھے۔ ان کا کلام قدیم اور متروک الفاظ سے بھرا پڑا ہے۔ اور اردو میں ایسی کوئی لغت موجود نہیں جس سے ان فرسودہ الفاظ کے معنی معلوم ہو سکیں۔ آپ "نور المعرفت" کے بھی مصنف ہیں جو فن سلوک میں ہے۔ ولی شاہ شیخ سعد اللہ گلشن کے شاگرد ہیں۔

ہادی۔ ان کا نام میر محمد جواد تھا۔ اور ہادی تخلص کرتے تھے۔ ۱۲۸۰ھ میں وفات پائی۔ دیوان ہادی چھپ گیا ہے۔

ہاشمی۔ میر ہاشم ان کا نام تھا۔ اور نام ہی کی مناسبت سے ہاشمی تخلص کرتے تھے۔ سودا کے شاگرد تھے۔

تجر - نواب ناظم علی خاں نام تھا اور تجر تخلص۔ شاہجہان پور کے رہنے والے تھے اور آتش کے شاگرد تھے۔

ہدایت - شیخ ہدایت اللہ نام۔ ہدایت تخلص۔ اردو کے مشہور شعرا میں سے ہیں۔ خواجہ میر درد کے شاگرد تھے۔ مصحفی ان کے متعلق لکھتا ہے: "بزرگے بود درویش دل، مسکین نہاد، صاف باطن و مزاج، حلیم، بردبار، بیگناہ، بے ریا، یک قلم، وفادار، پاکیزہ سیر، محبت پرور، مروت گستر، صاف دل، یک رو، صاف طینت، فرخندہ خو، نہ پروا کس را نہ ورا، جفا، غبار در دل اور ساختہ سے۔"

ان کے اشعار کے متعلق صاحب مجموعہ نغز کے الفاظ یہ ہیں "فصاحت کلامش مستغنی البیان است و طرز سخنش بے پایان، از تبیان روز مرہ زبان اردو سے معلیٰ کہ بجستش افتادہ بجلے کم دست بہم دادہ۔ محاورہ گفتگو سے بدیں حد کہ بدستش رسیدہ در شعر اردو کسے ازیں فقیر ندیدہ۔" ان کا دیوان اور چند اشعار کا مجموعہ ہے "چراغ ہدایت" نامی ایک کتاب کے بھی مؤلف ہیں جو تصوف میں ہے۔ ان کے علاوہ چند مثنویاں بھی لکھی ہیں۔ قیام الدین قائم اور قدرت اللہ قائم ان کے شاگرد تھے۔ ~~۱۱۴۰ھ~~ (۱۷۲۷ء) میں پیدا ہوئے۔ اور ~~۱۲۱۵ھ~~ (۱۸۰۰ء) میں وفات پائی۔

ہوس - نواب مرزا محمد تقی خاں شوستری۔ مرتضیٰ الدولہ نواب محمد اسحٰق خاں صوبہ دار گجرات کے پوتے اور نواب مرزا علی خاں دلاور جنگ کے فرزند تھے۔ پہلے تیر تخلص کرتے تھے۔ پھر ہوس کرنے لگے۔ عہد آصف الدولہ میں فیض آباد سے لکھنؤ آئے اور یہیں مستقل سکونت اختیار کر لی۔ مگر جو کچھ کہا ہمیشہ دہلی کے رنگ میں کہا۔ مشاعروں میں کم شامل ہوتے تھے۔ طبیعت میں رنگینی اور کلام میں شوخی تھی۔ اپنے وقت میں لکھنؤ کے نامی شاعروں میں شمار ہوتے تھے۔ اردو میں لیلیٰ مجنوں کا قصہ انھوں نے ہی لکھا تھا۔ ایک دیوان بھی چھپ چکا ہے۔

یکی - یحییٰ خاں نام اور یکی تخلص تھا۔ دہلی کے نہایت معزز اور رئیس شخص تھے۔ آخر عمر میں سورج مل جاٹ کے پاس چلے گئے تھے اور وہیں ان کا انتقال ہوا۔

یقین - ان کا نام انعام اللہ اور ان کے والد کا نام شیخ اظہر الدین خاں ~~۱۱۴۰ھ~~ (۱۷۲۷ء) میں دہلی میں پیدا ہوئے۔ شاعری میں مرزا مظہر جان جاناں کے شاگرد ہیں۔ جوانی ہی میں اپنے باپ کے ہاتھ سے قتل ہوئے۔ سنہ انتقال ~~۱۱۶۹ھ~~ (۱۷۵۵ء) ہے۔ میر تقی میر ان کے متعلق لکھتے ہیں کہ "محتاج بہ تعریف و توصیف نیست۔" منشی لچھمی نرائن شفیق تذکرہ چمنستان شعرا میں لکھتے ہیں "یقین یکتائے عصر و یگانہ زمانہ است۔ چشم روزگار چنیں معنی آفرینے نکتہ رس ندیدہ۔" میر حسن فرماتے ہیں "اشعارش بسیار نمکین و پر شاندار" مولوی کریم الدین پانی پتی طبقات الشعرا میں لکھتے ہیں "تمام قسم کے اشعار میں ہوا کرتا تھا، گلشن بیخار میں ہے: "کلامش سر بسر نمک است حلاوت و مزہ دارد۔"

آثر لکھنوی۔ خان بہادر مرزا جعفر علی خان اثر لکھنوی ۱۲ جولائی ۱۸۸۵ء کو لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۰۶ء میں بی۔ اے پاس کیا۔ ۱۹۰۸ء میں ڈپٹی کلکٹر مقرر ہوئے اور ایڈیشنل کمشنر تک ترقی کی۔ ۱۹۴۰ء میں ریٹائر ہوئے۔ پھر کشمیر کے ہوم ممبر اور وزیر تعلیم ہو کر سری نگر آ گئے جہاں تقسیم تک رہے۔ بعد ازاں لکھنؤ واپس آ گئے جہاں اب تک مقیم ہیں اور زبان اور ادب کی خدمت کر رہے ہیں۔ فن شعر میں عزیز لکھنوی کے شاگرد ہیں۔ پاکستان و ہندوستان کے بلند پایہ رسائل میں ان کی شگفتہ [illegible] نظمیں بکثرت شائع ہوتی رہتی ہیں۔ انھوں نے بہت سی بلند پایہ انگریزی نظموں کو بڑی خوبی سے اردو میں منتقل کیا ہے۔ صرف انگریزی سے ہی نہیں بلکہ سنسکرت اور عربی سے بھی اکثر اعلیٰ پایہ کی نظموں کے اُردو میں ترجمے کیے ہیں۔ سنسکرت سے [illegible] کا منظوم ترجمہ [illegible] ہے جو [illegible] ہے۔ بہاراں [illegible] رنگ بست۔ مزامیر، جہان ہیں۔ انیس کی مرثیہ نگاری اور مطالعہ [illegible]

[illegible]

احسان دانش۔ [illegible] کاندھلہ (یو۔ پی) کے رہنے والے اور احسان دانش کے [illegible] سے مشہور ہیں۔ [illegible] ۱۹۱۴ء میں پیدا ہوئے۔ والد قاضی دانش علی غریب [illegible] تھے۔ [illegible] کے [illegible] شب سے دوچار ہونا پڑا۔ پھر دلی [illegible] کبھی [illegible] سے کبھی [illegible] کی۔ کبھی [illegible] کرکے پیٹ بھرا۔ کبھی معماری کا کام [illegible] کی [illegible] کی ملازمت کی [illegible] کے اس تمام طویل عرصہ میں اس باہمت اور اولوالعزم [illegible] نے [illegible] کتابوں کا مطالعہ [illegible] برابر جاری رکھا۔ اس طرح اپنی زندگی خود بنائی۔ کبھی [illegible] کا شوق [illegible] علمی عاصل کرنے کا ذوق شروع سے تھا۔ آخر اس جواں ہمت انسان نے [illegible] کر اپنی شہرت اور عزت کا سکہ [illegible] چنانچہ آج آپ [illegible] کے مالک۔ بہت سی کتابوں کے مصنف [illegible] خوش گو [illegible] کی ترجمانی جتنی [illegible] کی ہے۔ وہ کوئی اور شاعر نہ کر سکا۔ اپنی نظموں میں [illegible] حقیقت کا رنگ بھرنے اور اثر اور جذب پیدا کرنے میں آپ بلاشبہ دور موجود کے شعرا میں ایک نمایاں حیثیت رکھتے ہیں۔ اخلاق و عادات کے لحاظ سے نہایت خوش طبع، نرم دل، شگفتہ مزاج اور مخلص انسان ہیں۔ ان کی غزلوں اور نظموں کی زبان پاکیزہ [illegible] ہے۔ لغت اردو کے متعلق بہت دنوں سے نہایت تحقیقی کام کر رہے ہیں۔ نایاب کتب کا ایک [illegible] ذخیرہ [illegible] جمع کیا ہے۔ [illegible] علمی اور عملی دونوں لحاظ سے ملنے کے قابل آدمی ہیں۔

نظموں کے مجموعے: نوائے کارگر۔ نفیرِ فطرت۔ آتشِ خاموش۔ مقامات۔ زخم و مرہم۔ جادۂ نو۔ گورستان۔ چراغاں۔ شیرازہ۔

دوسری تصانیف: لغت الاصلاح۔ دستور اردو۔ [illegible]۔ عروض [illegible]۔ شام زندگی۔

اختر انصاری - یکم اکتوبر ۱۹۰۹ء ان کی تاریخ پیدائش اور وطن بدایوں - عمر کا بیشتر حصہ دہلی میں بسر ہوا۔ وہیں تعلیم و تربیت پائی۔ ۱۹۳۳ء میں بی۔ اے کا امتحان پاس کیا پھر علی گڑھ سے بی ٹی کر کے وہیں ملازم ہو گئے۔ اسی دوران میں آپ نے ایم اے کیا۔ اور مسلم یونیورسٹی کے ٹریننگ کالج میں لیکچرار ہو گئے۔ بہ نسبت غزل کے قطعات بہت اچھے کہتے ہیں۔ کلام کے یہ مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ نغمۂ روح۔ آبگینے۔ خندۂ سحر۔ طوفانِ ناب۔ ناظم ہونے کے علاوہ آپ افسانہ نگار بھی بہت اچھے ہیں۔

اختر حیدر آبادی - علی اختر تخلص بہ اختر حیدرآبادی دراصل علی گڑھ یو۔ پی کے رہنے والے ہیں۔ رامپور۔ [illegible] آباد میں پیدا ہوئے۔ سنہ ولادت ۱۹۰۳ء ہے۔ ۱۹۱۹ء سے حیدرآباد دکن میں ملازم رہے۔ اس لیے حیدرآبادی کہلاتے ہیں۔ شعر کا شوق بچپن سے تھا۔ اس فن میں اپنے والد حضرت تاج کے شاگرد ہیں۔ ان کی غزل اور نظم دونوں پختہ ہیں۔ ان کے کلام میں [illegible] شاعری کے بہت اچھے نمونے ملتے ہیں۔ مبالغہ اور غزل قدیم طرز سے پرہیز کرتے ہیں۔ آج کل کراچی میں مقیم ہیں۔ "[illegible]" ان کی غزلوں کا مجموعہ ہے۔

اختر شیرانی - نام داؤد خاں اور تخلص اختر تھا۔ مشہور فاضل اور محقق حافظ محمود خاں شیرانی پروفیسر پنجاب یونیورسٹی کے لڑکے تھے اور افغانوں کے قبیلہ شیرانی سے متعلق تھے۔ ۴ مئی ۱۹۰۵ء کو ریاست ٹونک میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۱۰ء میں ٹونک کی نظر عنایت کے باعث حافظ صاحب اور اختر لاہور آ گئے۔ ۱۹۲۰ء میں [illegible]۔ پہلے پڑھ کر منشی فاضل کا امتحان پاس کیا۔ اور ۱۹۲۲ء میں ادیب فاضل۔ شعر گوئی کا بچپن سے شوق تھا۔ پہلی نظم ۱۹۲۱ء میں شائع ہوئی۔ جو اتنی شاندار تھی کہ اس نے ان کے نام کو سارے ہندوستان میں مشہور کر دیا۔ مختلف اوقات میں ہمایوں، انتخاب، بہارستان، خیالستان، رومان اور مولانا تاجور کے رسالہ شاہکار کے ایڈیٹر رہے۔ مولانا محمد علی جوہر کے روزنامہ ہمدرد دہلی میں فکاہی کالم لکھتے رہے اور ادارہ اردو مرکز میں مولانا تاجور کے معین و مددگار رہے۔ انجمن ترقی اردو دہلی میں بھی کچھ عرصہ کام کیا۔ ۱۹۴۶ء میں وطن واپس چلے گئے مگر تقسیم ملک کے بعد پھر لاہور آ گئے۔ کثرت شراب نوشی نے ان کے دل، دماغ اور دوسرے اعضا پر بہت برا اثر کیا۔ جس کے باعث یہ نامور ادیب اور اعلیٰ پایہ کا شاعر بہت جلد دنیا سے رخصت ہو گیا۔ ۹ ستمبر ۱۹۴۸ء کو میو ہسپتال لاہور میں انتقال ہوا۔ اور میانی صاحب کے قبرستان میں دفن ہوئے۔ ان کی رومانی شاعری نہایت پُر اثر، نہایت شاندار اور پُر لطف ہے۔ ان کی نظموں کے مجموعے مندرجہ ذیل شائع ہو چکے ہیں۔

صبح بہار۔ اخترستان۔ لالہ طور۔ طیور آوارہ۔ شہناز۔ پھولوں کا گیت۔ نغمۂ حرم۔ شہرود

ان کے علاوہ ان کی تالیفات و تصنیفات کے نام حسب ذیل ہیں۔

آئینہ خانے میں (پانچ افسانوں کا مجموعہ)

جوامع الحکایات (ترجمہ از فارسی) برائے انجمن ترقی اردو۔ دو جلد۔

دھڑکتے دل (ادبی مضامین۔ تراجم اور افسانوں کا مجموعہ)

"ڈرامہ بھی دیکھا یہ بھی دیکھو" (مختلف ادیبوں اور فنکاروں کے ڈراموں کا مجموعہ)
ان کے متعلق ان کے دوست حکیم نیر واسطی نے جو کتاب "اختر و سلمیٰ" کے نام سے لکھی ہے پڑھنے کی چیز ہے۔

اختر۔ پنڈت ہری چند، متخلص بہ اختر ہندوستان و پاکستان کے شاعروں میں سے ہیں۔ وطن ہوشیار پور ہے مگر تقسیم ملک تک لاہور میں مقیم رہے۔ فارسی میں منشی فاضل اور انگریزی میں ایم۔ اے ہیں۔ شروع ہی سے مضمون نگاری اور شعر و شاعری سے نہایت درجہ لگاؤ رہا۔ فارسی میں بہت سے مضامین رسالہ رہنمائے تعلیم لاہور میں وقتاً فوقتاً لکھے۔ اپریل ۱۹۰۱ء میں پیدا ہوئے۔ سن شعور کے ابتدا میں چند سال تک اخبار نویسی کی۔ بعد ازاں دفتر پنجاب اسمبلی اور محکمہ اطلاعات میں کام کیا۔ دوسری جنگ عظیم میں سرکار انگریزی کے جنگی پراپیگنڈے کے محکمے سے متعلق رہے۔ اس کے بعد آل انڈیا ریڈیو میں ملازم ہو گئے۔ یکم جنوری ۱۹۵۸ء کو آپ کا انتقال ہو گیا۔

آزاد۔ جگن ناتھ آزاد اردو کے موجودہ شعراء میں خاص شہرت کے مالک ہیں۔ ان کی نظمیں نہایت درجہ درد، اثر اور جذب میں ڈوبی ہوئی ہوتی ہیں۔ منشی تلوک چند محروم کے فرزند اور عیسیٰ خیل (میانوالی) کے رہنے والے ہیں۔ سال پیدائش دسمبر ۱۹۱۸ء ہے۔
ان کی تمام تعلیم پنجاب میں ہوئی۔ بی۔ اے پاس کرنے کے بعد روزنامہ ملاپ کے سب ایڈیٹر ہو گئے۔ جو اس زمانہ میں لاہور سے نکلا کرتا تھا۔ کچھ دنوں روزنامہ احسان سے بھی متعلق رہے۔ پھر ایم۔ اے کا امتحان دیا۔ آپ پنجاب یونیورسٹی کے منشی فاضل بھی ہیں۔ تقسیم ملک کے بعد اپنے والد کے ہمراہ دہلی چلے گئے۔ وہاں اردو کے مشہور ہفت روزہ "آج کل" کے اسسٹنٹ ایڈیٹر ہو گئے۔ ان کے کلام کے تین مجموعے اس وقت تک چھپے ہیں۔ ایک "بیکراں" اور دوسرا "ستاروں سے ذروں تک" تیسرا "وطن میں اجنبی"۔ "اردو" پر بھی ان کی ایک بلیغ نظم چھپ چکی ہے۔ سنا ہے کہ اقبال پر ہندی میں ایک مبسوط کتاب آج کل لکھ رہے ہیں۔

اسد ملتانی۔ محمد اسد خاں متخلص بہ اسد ماہ دسمبر ۱۹۰۲ء میں پیدا ہوئے۔ وطن ملتان ہے۔ ۱۹۲۴ء میں بی۔ اے پاس کرنے کے بعد الشمس نامی ایک اخبار ملتان سے جاری کیا۔ ۱۹۲۶ء میں انگریزی گورنمنٹ کی ملازمت کی اور سیکرٹریٹ میں ملازم ہو گئے۔ تقسیم ملک کے وقت لاہور اپنی سابقہ ملازمت پر آ گئے۔
شعر و شاعری کا شوق آٹھ نو برس کی عمر سے تھا اور عمر کے ساتھ ساتھ ترقی کرتا رہا۔ وہ ایک مشہور اور کامیاب شاعر تھے۔ ۱۹۵۹ء میں انتقال ہوا۔

حبیب اشعر۔ حکیم حبیب احمد نام، اشعر تخلص۔ یکم جنوری ۱۹۱۹ء کو دہلی میں پیدا ہوئے۔ دہلی کے معزز ترین

خاندان شریفی سے تعلق رکھتے ہیں۔ ابتدا میں قرآن حکیم کی تعلیم حافظ بشیر حسین سے حاصل کی۔ فارسی کی تحصیل مولوی جلال الدین سے کی۔ عربی منطق و فلسفہ بزرگ مولوی عبدالسلام سے پڑھی۔ طب کی سند حکیم مولوی محمد حسین پروفیسر طبیہ کالج دہلی سے لی۔ اللہ تقسیم کے وقت دہلی سے لاہور چلے آئے۔ یہاں شاہی محلہ میں قیام پذیر ہیں۔ آپ کا مطب "دواخانہ حاذق الملک" رنگ محل میں ہے نہایت قابل اور لائق نوجوان ہیں۔ ملک کے مشہور ادیب اور عربی کے بہت اچھے مترجم ہیں۔ آپ کے ابتدائی کلام کا مجموعہ "راز و نیاز" کے نام سے شائع ہوا ہے۔ تراجم کی تفصیل جو آپ نے اب تک کئے ہیں اور شائع ہو چکے ہیں حسب ذیل ہے:۔
جبران خلیل جبران کے ترجمے۔ ٹوٹے ہوئے پر۔ شیطان۔ دلوں کی پکار۔ جلنشر کا پھول۔ ریت اور جھاگ۔ اشک و تبسم۔
پکار۔ مصطفیٰ لطفی المنفلوطی کے تراجم۔ رخسانہ۔ تاریخ اور شہزادی۔ نیز محمد حسین ہیکل کی کتاب عمر فاروق۔
ان کے علاوہ متعدد ادبی اور تاریخی عربی کتابوں کے بھی آپ نے نہایت سلاست اور روانی کے ساتھ ترجمے کیے ہیں۔

اکبر۔ چودھری جلال الدین اکبر تخلص ہے۔ اکبر ستمبر ۱۹۰۸ء میں موضع علی وال نہراں والا (ضلع گوجرانوالہ) میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام چودھری نتھو علی تھا۔ ابتدائی تعلیم اپنے گاؤں میں پائی سائنس کا امتحان ایم۔ بی ہائی سکول گوجرہ سے دیا۔ بی۔اے گورنمنٹ کالج لاہور سے کیا۔ بی۔ ٹی کی تعلیم سنٹرل ٹریننگ کالج لاہور میں پائی اور پھر معلمی کا پیشہ اختیار کیا۔ نقش و رنگ ان کے کلام کا مجموعہ ۱۹۳۶ء میں چھپا۔ ۱۹۳۵ء میں ایک مرد درویش حاجی وارث علی سے بیعت کی اور ۱۹۴۱ء میں ان کے انتقال کے بعد ان کے خلیفہ ہوئے۔ اکبر ایک قادر الکلام شاعر ہیں۔ بقول صاحب تذکرہ جدید شعرائے اردو "ان کے تغزل میں ایک سادگی ایک رعنائی اور ایک مخصوص رکھ رکھاؤ پایا جاتا ہے۔ جذبات عام طور پر بلند ہیں اور ان میں بڑی کشش ہے۔ ان کی اکثر غزلیات اپنے سادہ مگر حسین اسلوب اور زبان کی بے پناہ لطافت و روانی کے محاسن سے آراستہ ہیں۔"

مجید امجد۔ عبدالمجید نام امجد تخلص۔ عام طور پر مجید امجد کہلاتے ہیں۔ جھنگ کے رہنے والے ہیں۔ جہاں ۱۹۱۴ء میں پیدا ہوئے۔ راقم الحروف نے ۱۹۳۲ء میں تبلیغ تحریک کے نام سے جاکر وہاں سے ایک نیم سرکاری اخبار اصلاح و حیات کے سے جاری کیا۔ اور عروج اس کا نام رکھا۔ خرابی صحت کی بنا پر مجھے وہاں سے ۱۹۳۵ء میں استعفیٰ دینا پڑا۔ تو مجید امجد صاحب ہی میری بجائے عروج کے ایڈیٹر مقرر ہوئے تھے۔ اور وہ سے تک وہاں کام کرتے رہے۔ یہ اخبار آج کل بھی پرائیویٹ ملکیت میں نکلتا ہے۔ اور غلام محمد صاحب رنگین اس کے ایڈیٹر ہیں۔ مجید امجد صاحب آج کل منٹگمری میں راشننگ انسپکٹر ہیں۔

انجم رومانی۔ فضل الدین نام ہے اور انجم تخلص موضع سلطان پور ضلع [illegible] میں واقع۔ باست گیارہ ضلع میں پیدا ہوئے ہیں۔ ایم۔اے کرنے کے بعد دیال سنگھ کالج میں شعبہ ریاضیات کے صدر ہیں۔

باقی صدیقی۔ محمد افضل نام، باقی تخلص۔ موضع سہام ضلع راولپنڈی کے رہنے والے ہیں۔ ۲۰ دسمبر ۱۹۰۸ء کو پیدا ہوئے۔ بچپن ہی میں والد کا انتقال ہو گیا۔ اس لیے شروع ہی سے فکر معاش جان لیوا رہی۔ دیہاتی مدرسی کی۔ بمبئی جاکر فلم میں کام کیا۔ مگر پھر بیزار ہو کر چھوڑ دیا۔ دوسری جنگ عظیم اُس وقت ہو رہی تھی۔ یہ بھی فوج میں بھرتی ہو گئے۔ دو سال بعد وہاں سے علیحدہ ہوئے اور مختلف ملازمتیں کرتے رہے۔ ۱۹۵۰ء میں اخبار راہ دمنزل راولپنڈی میں ملازم ہو گئے۔ پھر ریڈیو میں نوکری مل گئی۔ مگر بعد میں یہ بھی چھوٹ گئی۔ آج کل اپنے موضع سہام ہی میں قیام پذیر ہیں اور فکر شعر میں مشغول۔

تابش صدیقی۔ آپ کا نام جماعت علی ہے۔ اور ۱۹۱۶ء میں بمقام بہرام سندھواں (ضلع سیالکوٹ) آپ کی ولادت ہوئی۔ ۱۹۳۴ء میں آپ نے اسلامیہ کالج لاہور سے بی۔ اے پاس کیا اور چند سال اردو اخبار نویسی کے میدان میں کام کرنے کے بعد حکومت ہند کے محکمہ مالیات میں ملازم ہو گئے۔ آج کل آپ وزارت مالیات میں سیکشن آفیسر ہیں۔

تاثیر۔ محمد دین نام، تاثیر تخلص۔ ۲۸ فروری ۱۹۰۲ء کو پیدا ہوئے۔ آباؤ اجداد کا قدیمی وطن کشمیر ہے۔ دو برس کے تھے کہ ماں باپ دونوں کا انتقال ہو گیا۔ یتیم بچے کو خالو نے پرورش کیا۔ ۱۹۲۶ء میں ایم اے پاس کرنے کے بعد سیکرٹریٹ میں ملازم ہو گئے۔ پھر انگریزی زبان و ادب کے پروفیسر کی حیثیت سے اسلامیہ کالج لاہور میں کچھ عرصہ کام کیا۔ کچھ دنوں لاہور کے رسالہ نیرنگ خیال کی ادارت کی۔ ۱۹۳۴ء میں انگلینڈ چلے گئے جہاں انھوں نے کیمبرج یونیورسٹی سے "انگریزی ادب میں ہندوستان اور مشرق بعید" پر مقالہ لکھ کر پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ انھوں نے شادی ایک یورپین لیڈی سے کی، جنھوں نے مسلمان ہو کر اپنا نام بلقیس تاثیر رکھا۔ نکاح ڈاکٹر اقبال نے پڑھا۔ اور نکاح نامے پر اپنے دستخط کیے۔

انگلینڈ سے واپسی پر ۱۹۳۶ء میں ایم اے او کالج امرتسر کے پرنسپل مقرر ہوئے پھر آزاد کشمیر چلے گئے۔ اور وہاں ملازمت کر لی۔ آخر میں اسلامیہ کالج لاہور کے پرنسپل ہو گئے تھے۔ ۳۰ نومبر ۱۹۵۰ء کو انتقال کیا۔ گورنمنٹ نے ان کے پسماندگان کا وظیفہ مقرر کر دیا ہے۔

تاثیر مرحوم نہایت باذوق اور نہایت زندہ دل شخص تھے۔ نظم و نثر کا نہایت اعلیٰ پایہ کا مذاق رکھتے تھے۔ اُن کے تمام مضامین اور نظموں کا مجموعہ اگر شائع ہو جائے تو ادب اردو میں یقیناً گرانقدر اضافہ ہوگا۔ آتش کدہ ان کے کلام کا ایک مختصر مجموعہ ان کی بیگم بلقیس تاثیر نے شوہر کے انتقال سے ڈھائی برس بعد شائع کیا ہے۔ ان کے خطوط کا ایک مجموعہ [illegible] کے نام بھی شائع ہو چکا ہے۔ کنول بھی ان کی ایک کتاب ہے۔ نہایت ہی با اخلاق، ملنسار، شریف الطبع اور سچے انسان تھے۔ دوستوں پر جان دیتے اور ان کے لیے ہر قربانی پر تیار رہتے تھے۔ ان کے ملنے والوں میں ہر مشرب اور ہر عقیدہ کے لوگ تھے۔ اور وہ سب سے انتہائی خندہ پیشانی کے ساتھ پیش آتے تھے۔ رحمدلی اور ہمدردی ان میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ غریبوں اور معمولی درجہ کے لوگوں سے بے حد جھک کر اور بڑی تواضع کے ساتھ ملتے تھے۔ اگر کبھی کوئی معمولی وضع قطع کا آدمی ملنے آتا۔ اور نوکر اس سے بے اعتنائی سے پیش آتے تو نہایت سخت ناراض ہوتے۔ دوسروں کے جذبات اور احساسات کا بے حد

خیال رکھتے تھے۔ کسی کو حق اور سچ اپنے سے علاحدہ ہونے کا موقع نہ دیتے۔ جو شخص ان سے ایک مرتبہ ملتا ہمیشہ کے لیے ان کا گرویدہ ہو جاتا۔ جس چیز میں خوبی اور نفاست نظر آتی اُسے بے حد پسند کرتے اور وہ ذرا فکر نہ کرتے خواہ معاملہ کتنا ہی دہ ہوتی۔ صفائی ستھرائی کا بے حد خیال رکھتے تھے اور گندگی اور ڈھنگ نہ ہونے کے سخت خلاف تھے۔ بچوں سے بھی نہایت الفت اور محبت سے باتیں کرتے تھے۔ غرض نہایت عیش و مسرت کی زندگی گزارتے ہوئے پاکستان کا یہ نامور ادیب، شاعر اور انشا پرداز ہم سے رخصت ہوا۔

تبسم۔ صوفی غلام مصطفیٰ تبسم پاکستان کے مشہور ادیب اور شاعر ہیں۔ جلی امرتسر ہے جہاں آپ ۴ اگست ۱۸۹۹ء کو پیدا ہوئے۔ ایم۔ اے پاس کرنے کے بعد سنٹرل ٹریننگ کالج لاہور میں علوم شرقیہ کے پروفیسر ہو گئے۔ وہاں سے گورنمنٹ کالج لاہور میں تبدیل ہو گئے۔ اور یہیں سے ریٹائر ہوئے۔ فارسی کے بہت اچھے فاضل ہیں۔ آپ کا فارسی کلام نہایت شستہ اور شائستہ ہوتا ہے۔ اردو کلام میں بھی نہایت سلاست اور روانی ہے۔

جذبی۔ معین احسن جذبی کا سال ولادت ۱۹۱۲ء۔ شروع کی تعلیم جھانسی میں پائی۔ بعد ازاں آگرہ، لکھنؤ اور دہلی میں پڑھتے رہے۔ ۱۹۴۲ء میں علی گڑھ سے ایم۔ اے کیا۔ کچھ دنوں رسالہ آج کل کے ایڈیٹر رہے۔ پھر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں اردو کے لیکچرار ہو گئے۔ اور ابھی تک وہیں کام کر رہے ہیں۔ نظم اور غزل دونوں خوب کہتے ہیں۔ اشعار بڑی خوش آوازی سے پڑھتے ہیں۔ اور موجودہ شعراء میں بہت مقبول ہیں۔ "فروزاں" ان کے کلام کے مجموعہ کا نام ہے۔

جگر۔ نام علی سکندر تخلص جگر اور وطن مراد آباد ہے۔ ۱۸۹۰ء میں پیدا ہوئے۔ دورِ حاضرہ کے نہایت نامور غزل گو شاعر ہیں۔ ان کے کلام کا مجموعہ "شعلۂ طور" ادارہ فروغ اردو نے نہایت نفاست اور کمال اہتمام کے ساتھ شائع کیا ہے۔ داغِ جگر اور آتشِ گل بھی ان کے کلام کے مجموعے ہیں۔ اُن کے والد مولوی علی نظر بھی شاعر اور صاحب دیوان تھے۔ نظر تخلص کرتے تھے۔ جگر شگفتہ مزاج اور رنگین طبع ہیں۔ مشاعرہ میں غزل پڑھنے کا انداز بہت دلفریب ہے۔ شراب کے بہت رسیا تھے۔ مگر اب چھوڑ دی ہے۔ ان کا کلام بے حد مقبول ہوا۔ غالب، حالی اور اقبال کو چھوڑ کر ان کا مجموعہ کلام سب سے زیادہ فروخت ہوا۔ فنِ شعر میں اپنے والد، تسلیم اور داغ کے شاگرد ہیں۔

جوش ملسیانی۔ پنڈت لبھو رام جوش ضلع جالندھر کے موضع ملسیان میں یکم فروری ۱۸۸۴ء کو پیدا ہوئے۔ والد کا بچپن ہی میں انتقال ہو گیا۔ مگر انہوں نے اپنی ذاتی کوشش اور سعی سے ایسی علمی لیاقت پیدا کی کہ آج ملک میں ان کا نام عزت سے لیا جاتا ہے۔ منشی فاضل اور ادیب فاضل کے امتحان میں بیٹھے اور ہر بار اول آئے۔ طالب علمی کے زمانہ سے شاعری کا شوق تھا۔ ۱۹۰۲ء میں داغ کے شاگرد ہوئے مگر ۱۹۰۵ء میں داغ کا انتقال ہو جانے کے بعد پھر کسی سے اصلاح نہیں لی۔

جاب کے مختلف سرکاری سکولوں میں عرصہ دراز تک فارسی کے اول مدرس رہے۔ ۱۹۳۳ء میں ریٹائر ہوئے۔ ۱۹۱۴ء سے ادر حفیظ جالندھری قیام ہے ... طالب علموں کے پاس ہی ہے ... رسالہ جامعہ تعلیم کے حصہ نظم کی امامت کے فرائض زیری طور پر بڑی قابلیت سے انجام دے رہے ہیں۔ رسالہ مذکور کا حصہ نثر راقم الحروف کے متعلق ہے۔ ہندوستان کے غزل گو شعراء میں آپ کا درجہ نہایت ممتاز ہے۔ غزلوں کی زبان نہایت شستہ و شائستہ، فصیح و بلیغ اور نہایت بامحاورہ ہوتی ہے۔ عادات و خصائل کے لحاظ سے پرانے بزرگوں کا نمونہ ہیں۔ بے حد سادہ مزاج۔ سادہ وضع اور نیک نفس انسان ہیں۔ کلام کا پہلا حصہ بادہ سرجوش کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ دوسرا مجموعہ جنون و ہوش ہے۔ غالب کی ایک اردو شرح بھی آپ نے لکھی ہے جو شائع ہو چکی ہے۔ غرض نہایت خاموشی کے ساتھ ایک گوشہ میں بیٹھے ہوئے ادب اور فن کی خدمت کر رہے ہیں۔ ان کا شمار ملک کے معتمد شعراء میں ہوتا ہے۔

جوش ملیح آبادی - شبیر حسن خاں نام۔ بشیر احمد خاں کے بیٹے۔ جوش تخلص۔ شاعر انقلاب خطاب اور ملیح آباد (یوپی) وطن ہے۔ ۱۳۱۲ھ (۱۸۹۴ء) میں پیدا ہوئے۔ مشہور شاعر فقیر محمد خاں گویا ان کے پردادا تھے۔ جنہوں نے سب سے پہلے انوار سہیلی کا اردو میں ترجمہ کیا۔ ۱۹۲۴ء سے ۱۹۳۴ء تک دس سال دارالترجمہ حیدرآباد دکن میں ناظر ادبی رہے۔ فن شعر میں عزیز لکھنوی سے اصلاح لی۔ موجودہ دور کے نہایت نامور شعراء میں سے ہیں۔ دہلی سے انہوں نے ماہنامہ کلیم جاری کیا تھا۔ تقسیم کے بعد دہلی کے ماہنامہ "آج کل" کے چیف ایڈیٹر تھے۔ مگر اپنے بیوی بچوں کا مستقبل بھارت میں تاریک دیکھ کر دسمبر ۱۹۵۵ء کے آخر میں کراچی چلے آئے اور پاکستان کے شہری ہو گئے۔

روح ادب۔ اوراق سحر۔ مقالات زریں۔ جذبات فطرت اور آواز حق۔ ان کی ابتدائی کتابیں ہیں۔ بعد کی تصنیفات یہ ہیں: جنون و حکمت۔ سنبل و سلاسل۔ عرش و فرش۔ فکر و نشاط۔ حسینؑ اور انقلاب۔ شاعر کی راتیں۔ آیات و نغمات۔ نقش و نگار۔ شعلہ و شبنم۔ حرف و حکایت۔ حرف آخر۔ سیف و سبو۔ پیغمبر اسلام اور اشارات۔ ان کی تصنیفات ہیں۔

حفیظ جالندھری - خان بہادر ابوالاثر حفیظ جالندھری ہندوستان و پاکستان کے ممتاز شاعر۔ شاہنامہ اسلام کے مؤلف۔ پاکستان کے قومی ترانہ کے مصنف۔ ۱۹۰۰ء میں جالندھر میں پیدا ہوئے۔ شروع ہی سے حصول معاش کی پریشانیوں میں مبتلا رہے اور حصول معاش کی کوششیں کرتے رہے۔ یہاں تک کہ سٹیشن پر قلیوں کے میٹ بھی رہے۔ جب اپنے وطن میں کوئی ترقی کی سبیل نظر نہ آئی تو لاہور آ گئے اور دارالاشاعت پنجاب میں "پھول" کے ایڈیٹر ہو گئے۔ مذاق سلیم فطری تھا جسے ملک الشعراء شیخ غلام قادر گرامی جالندھری کی صحبت نے جلا دی اور کندن بنا دیا۔ اور آہستہ آہستہ حفیظ کو اپنے زمانے کا سب سے زیادہ مشہور اور سب سے زیادہ مقبول شاعر بنا دیا۔ عزت۔ دولت۔ شہرت سب کچھ مل گئی۔ ان کا لازوال اور بے مثل کارنامہ شاہنامہ اسلام ہے جس کی اب تک چار جلدیں شائع ہو چکی ہیں۔ کاش حفیظ صاحب سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر اس کی تکمیل کی طرف متوجہ ہوں۔

ان کی دوسری مطبوعہ تصانیف نقد و نظر۔ سخنور ساز، تنکا تا جیری، تعمیر کشمیر۔ بعد کے اقبال سہیل [redacted] کے نام سے شائع ہو چکی ہیں۔

حفیظ ہوشیار پوری۔ شیخ عبدالحفیظ سلیم نام، حفیظ تخلص۔ والد کا نام شیخ فضل محمد۔ وطن ہوشیار پور مشرقی پنجاب، تاریخ پیدائش ۵ جنوری ۱۹۱۲ء۔ ۱۹۳۶ء میں گورنمنٹ کالج لاہور سے ایم۔ اے پاس کرنے کے بعد کچھ دن تک ادبی مشاغل میں مصروف رہے۔ اس کے بعد آل انڈیا ریڈیو لاہور میں ملازم ہو گئے۔ تقسیم ملک کے بعد ریڈیو پاکستان سے منسلک ہو گئے۔ کچھ دنوں لاہور رہی رہے۔ اور آج کل کراچی میں ہیں۔ اردو کے علاوہ آپ نے انگریزی میں بھی نظمیں کہی ہیں۔ فارسی بھی بہت اچھی جانتے ہیں۔ تاریخ گوئی میں آپ کو خاص ملکہ ہے۔ بقول صاحب تذکرہ جدید شعرائے اردو آپ پاکستان کے خوش فکر شعراء میں سے ہیں اور آپ کا کلام پختگی معانی۔ سلاست و شگفتگی اور درد و اثر کی خصوصیات کا حامل ہے۔ مذاق کے لحاظ سے بہت با اخلاق منکسرالمزاج اور خوش طبع انسان ہیں۔

خاطر غزنوی۔ محمد ابراہیم بیگ خاطر غزنوی۔ پشاور میں ۵ نومبر ۱۹۲۵ء کو پیدا ہوئے۔ آج کل ریڈیو پاکستان پشاور میں کام کرتے ہیں اور ساتھ ہی ساتھ شعر و شاعری کا مشغلہ بھی جاری ہے۔ انجمن ترقی اردو کے بہت سرگرم ممبر ہیں۔ کئی اخباروں اور رسالوں کے ایڈیٹر رہ چکے ہیں۔ دسمبر ۱۹۵۱ء میں ماہنامہ زندگی نکالا۔ مگر جلد ہی بند ہو گیا۔ خاطر صاحب آج کل کے شعراء میں خاصے مشہور ہیں۔ شاعری کی ابتدا غزل گوئی سے کی لیکن نظمیں اور گیت بھی خوب لکھتے ہیں۔ ان کی نظمیں رومانی اور انقلابی ہوتی ہیں۔ شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ خاطر صاحب افسانہ نگار بھی ہیں۔ "فسانہ" اور "پھول اور پتھر" ان کی کتابیں ہیں۔ مجموعہ کلام ابھی تک شائع نہیں ہوا۔ پشتو ادب کے متعلق انہوں نے بہت عمدہ مضامین لکھے ہیں۔

ذوالفقار۔ ان کا نام سید ذوالفقار علی بخاری ہے۔ اور ذوالفقار تخلص کرتے ہیں۔ ۱۹۰۴ء میں بمقام پشاور پیدا ہوئے۔ بڑے ہو کر اور انٹرنس پاس کرنے کے بعد پہلے گورنمنٹ پریس پشاور میں کلرک رہے۔ پھر اپنے بڑے بھائی پطرس بخاری کی امداد سے بی۔ بی۔ سی لندن میں اناؤنسر ہو گئے۔ ازاں بعد ریڈیو اسٹیشن بمبئی کے ڈائرکٹر۔ تقسیم ملک کے بعد ریڈیو پاکستان کے کنٹرولر ہوئے۔ طبیعت میں شوخی اور مزاح بہت ہے۔ نہایت زندہ دل اور با اخلاق ہیں۔ کلام میں جان اور اشعار میں دلکشی ہے۔ پُرگو اور بدیہہ گو شاعر ہیں۔ نظم میں بندش الفاظ اور اسلوب بیان خوب ہے۔ پڑھنے کا انداز دلکش ہے۔

رضا ہمدانی۔ مرزا رضا حسین ہمدانی نام، رضا تخلص اور وطن پشاور ہے۔ جہاں ۱۹۱۰ء میں پیدا ہوئے۔ والد خیاط تھے۔ یہ رفوگر ہوئے۔ کام کے ساتھ ساتھ شعر و شاعری کا بھی دور چلتا رہا۔ جب کام نہ چلا تو کسی چائے فروش کے ہاں

دس روپے ماہوار پر ملازم ہو گئے۔ پھر خود تباکو کی دکان کھولی۔ اس سے بھی پوری نہ پڑی تو پشاور سے راولپنڈی چلے آئے۔ اور پھر یہاں روزگار کا پیشہ اختیار کیا۔ کچھ دنوں بعد لاہور آ کر ایک ہفتہ وار اخبار "شباب" کے نام سے جاری کیا۔ مگر جب نہ چلا تو اُسے بند کر کے کراچی چلے گئے اور ایک پریس میں کمپوزیٹر ہو گئے۔ کچھ دنوں بعد وطن واپس چلے آئے اور طبابت کا پیشہ اختیار کیا۔ اور اب وہ پشاور میں ڈاکٹر رحیمؔ کے نام سے مشہور ہیں۔ مگر زندگی کے کسی مرحلے میں بھی شعر و سخن نے ان کا پیچھا نہ چھوڑا۔ وہ برابر کہتے اور لکھتے رہے۔ بہت سی کتابیں ان کی تصنیفات سے موجود ہیں۔ پشتو ادب کو اردو میں ڈھالنے کا سہرا انہی کے سر ہے۔ "ادبیات سرحد" میں ان کا تذکرہ ۲۰ صفحات میں دیا گیا ہے اور ان کی شاعری کے بہت سے نمونے پیش کیے گئے ہیں۔

روشؔ صدیقی۔ شاہد عزیز صدیقی المتخلص بہ روشؔ۔ ۱۹ جولائی ۱۹۱۱ء کو جوالاپور میں پیدا ہوئے جو سہارنپور کے ضلع میں مشہور مقام ہے۔ اردو، فارسی، سنسکرت، ہندی اور انگریزی سے بقدر ضرورت واقف ہیں۔ سات سال کی عمر سے شعر کہنا شروع کیا۔ موجودہ زمانہ کے رومانی شاعروں میں نہایت نمایاں حیثیت کے مالک ہیں۔ غزل بھی بہت اچھی کہتے ہیں۔

ساحرؔ لدھیانوی۔ عبدالحی نام۔ ساحرؔ تخلص۔ وطن لدھیانہ۔ سنہ پیدائش ۱۹۲۲ء۔ نوجوانی ہی میں سیاسیات میں حصہ لینا شروع کر دیا تھا۔ اس لیے تعلیم مکمل نہ کر سکے۔ لدھیانہ سے لاہور آ کر کالج میں داخل ہوئے مگر امتحان نہ دے سکے۔ بعد ازاں ادب لطیف، شاہکار اور سویرا میں کام کرتے رہے۔ پھر بمبئی چلے گئے اور وہیں آج کل فلمی گانے اور مکالمے لکھ کر اپنا پیٹ پالتے ہیں۔ شاعری کا شوق ۱۶ برس کی عمر سے ہوا۔ اس دوران میں انہوں نے ہر قسم کی نظمیں کہی ہیں۔ رومانی بھی، سیاسی بھی اور سماجی بھی۔ اسلوب بیان بالعموم دلچسپ ہوتا ہے۔ ان کے مجموعہ کلام کا نام "تلخیاں" ہے۔

ساغرؔ نظامی۔ محمد صدیار خاں ساغرؔ ۲۱ دسمبر ۱۹۰۵ء کو علیگڑھ میں پیدا ہوئے۔ بارہ تیرہ سال کی عمر سے شاعری کا شوق ہوا۔ سیمابؔ اکبر آبادی کے شاگرد ہیں۔ استاد شاگرد نے مل کر ۱۹۲۳ء میں آگرہ سے رسالہ پیمانہ نکالا۔ لیکن صرف تین ہی سال بعد لڑائی ہو گئی اور ایک دوسرے پر چوٹیں ہونے لگیں۔ ستمبر ۱۹۲۵ء میں علیگڑھ سے مستقبل نکالا۔ مگر جلد ہی بند کر کے اخبار علیگڑھ جاری کیا۔ ۱۹۲۶ء میں مستقبل کی اشاعت شروع کی۔ مگر وہ بھی بند ہوا۔ پھر پیمانہ جاری کیا۔ جو بڑی شان سے نکلا۔ ۱۹۳۲ء میں میرٹھ میں ادبی مرکز اور ساغر پریس جاری کیا۔ یہیں سے ماہنامہ "ایشیا" نکالا۔ ۱۹۳۸ء میں پرتاب گڑھ جا کر ایک شاہی دربار میں ملازم ہو گئے۔ آج کل بمبئی میں کسی فلم میں کام کر رہے ہیں۔ بقول مولوی عبدالحق "ان کے کلام کی بہت بڑی خصوصیت اس کا ترنم اور موسیقیت ہے"۔ بادۂ مشرق، صبوحی اور رنگ محل وغیرہ ان کے کلام کے مجموعے ہیں۔

سالکؔ۔ پاکستان و ہندوستان کے مشہور ادیب۔ مرحوم روزنامہ انقلاب کے مدیر۔ اور بہت سی کتابوں کے مؤلف اور مصنف ہیں۔ مولانا عبدالمجید سالکؔ ۱۳ دسمبر ۱۸۹۴ء کو بٹالہ ضلع گورداسپور میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد حضرت شاہ

غلام قادر صاحب مرحوم نہایت عابد، صالح اور واجب الاحترام بزرگ تھے۔ عقائد کے لحاظ سے آپ احمدی تھے اور قادیان کے احمدی قبرستان میں مدفون ہیں۔ پٹھان کوٹ میں میونسپل کمیٹی کے سیکرٹری تھے۔

مولانا عبدالمجید سالک کی ابتدائی تعلیم اپنے والد محترم کے زیر سایہ پٹھان کوٹ میں ہوئی۔ انٹرنس کا امتحان بٹالہ میں دیا اور پھر ایک مدت کے بعد لاہور میں آ گئے۔ ۱۹۱۴ء میں پٹھان کوٹ سے ایک ادبی ماہنامہ "فانوس خیال" جاری کیا مگر یہ جلد ہی بند ہو گیا اور ۱۹۱۵ء میں آپ لاہور آ کر "پھول" اور "تہذیب النسواں" کے ایڈیٹر مقرر ہوئے۔ سید امتیاز علی نے "کہکشاں" نکالا تو اس کے بہترین مضمون نگار سالک صاحب ہی تھے۔ بہت اعلیٰ اور بلند پایہ نظمیں، افسانے اور مضامین انھوں نے اس کے لیے لکھے۔ یکم مئی ۱۹۲۰ء کو مولانا ظفر علی خاں کے اصرار پر "زمیندار" میں چلے آئے اور اسے بڑی کامیابی کے ساتھ چلایا۔ ان کا "افکار و حوادث" کا کالم مزاح نویسی کا بہترین نمونہ ہوتا تھا اور بڑی دلچسپی سے پڑھا جاتا تھا۔ نومبر ۱۹۲۱ء کو تحریک عدم تعاون کے سلسلہ میں گرفتار ہوئے اور میانوالی جیل میں ایک سال تک قید رہے۔ رہا ہونے کے بعد پھر "زمیندار" کو سنبھالا۔ اپریل ۱۹۲۷ء کو زمیندار کی ایڈیٹری سے استعفیٰ دیا اور ۱۰ اپریل ۱۹۲۷ء کو مولانا غلام رسول مہر کے ساتھ مل کر "انقلاب" نکالا۔ جو تقسیم ملک کے بعد تک نہایت کامیابی اور نہایت شہرت کے ساتھ نکلتا رہا۔ پھر مولانا کراچی چلے گئے اور دو سال تک وہاں علمی مشاغل میں مصروف رہے۔ ۱۹۵۱ء میں لاہور واپس چلے آئے۔ تقسیم ملک کے وقت تک اپنی سوانح عمری "سرگزشت" کے نام سے آپ نے لکھی ہے جو نہایت دلچسپ ہونے کے علاوہ پوری نصف صدی کی سیاسی سرگرمیوں کی تاریخ ہے۔ اور پڑھنے کے قابل چیز ہے۔ ۱۹۵۳ء کے فسادات کے متعلق "تحقیقاتی رپورٹ" کا بھی ترجمہ آپ ہی نے کیا۔ لاہور کی ادبی مجالس کی رونق آپ ہی کے دم سے تھی۔ شاعری کا آغاز ۱۹۱۰ء سے ہوا۔ کلام بہت ہی پرمغز، بلند پایہ اور لطیف ہوتا ہے۔ آپ موجودہ دور کے مزاح نویسوں کے امام سمجھے جاتے تھے۔ "افکار و حوادث" کا تاریخی کالم آپ کی لازوال شہرت کا باعث ہے۔ چچا اور دیگر افسانے، چترا، نیا چاند، الف لیلہ جدید، خودکشی کی انجمن، ساحر کا ہیرا، قصر ساحل، انگلی حکومت ہند، امداد باہمی، کاریگری، ایجادات، مالیات فرنگ، سیاحوں کی کہانیاں، قدیم تہذیبیں وغیرہ آپ کی تصانیف ہیں۔ "راہ و رسم منزلہا" ان کی ابتدائی نظموں کا مجموعہ ہے۔ تازہ تصانیف "ذکر اقبال"، "یاران کہن" ہیں۔ ۲۷ ستمبر ۱۹۵۹ء کو انتقال کیا۔

سکندر علی وجد۔ آپ کا نام سکندر علی اور وجد تخلص ہے۔ ۱۹۱۴ء میں بمقام اورنگ آباد (دکن) پیدا ہوئے۔ تعلیم حیدرآباد دکن میں پائی اور عثمانیہ یونیورسٹی سے بی۔ اے کرنے کے بعد ریاست کے مختلف اضلاع میں ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کے عہدہ پر تعینات رہے۔

وجد صرف غزل گو شاعر ہی نہیں، بلکہ نظم کے میدان میں بھی انھوں نے طبع آزمائی کی ہے اور بہت کامیاب رہے ہیں۔ "لہو ترنگ" اور "آفتاب تازہ" ان کے کلام کے دو مجموعے اب تک شائع ہو چکے ہیں۔

سلام۔ سلام صاحب بنگال کے قصبہ کہلی شہر میں غالباً یکم جولائی ۱۹۱۱ء کو پیدا ہوئے۔ میرے سننے میں آیا ہے

ان کے کلام کے دو مجموعے شائع بھی ہو چکے ہیں۔ انھوں نے اپنے حالات اور کلام کا انتخاب خود رسالہ داستان لاہور کے "غزل نمبر" میں دیا تھا جو ۱۹۴۶ء میں شائع ہوا تھا۔ مگر افسوس ہے کہ سوانحی حالات میں سوائے الفاظ کے ایک فقرہ بھی ہمیں ایسا نہ ملا جو ہم اس تذکرہ میں شامل کر سکتے۔ صرف اتنی سی بات "سوانح" سے ہم اخذ کر سکے کہ یہ حالات لکھتے وقت سلام صاحب کی عمر اکیس بائیس سال کی تھی۔ اوپر کی تاریخ ہم نے عزیزی ڈاکٹر وحید قریشی صاحب کے مضمون سے نقل کی ہے۔

سیفؔ۔ سیف الدین نام، سیفؔ تخلص۔ امرتسر کے رہنے والے۔ مارچ ۱۹۲۲ء میں پیدا ہوئے۔ وہیں جماعت میں پڑھتے تھے کہ خاکسار تحریک میں شامل ہونے کی پاداش میں دو سال کی قید ہو گئی۔ چھوٹ کر آئے اور کالج میں داخل ہوئے تو وہاں سے بھی نکال کر خارج ہوئے۔ اس لیے تعلیم ہی کو خیرباد کہا۔ اور معاش کی تلاش میں وہاں سے کشمیر تک گئے۔ آخر میں فلمی گانے بھی لکھے۔ چنانچہ انھوں نے اس کام کو ہی اپنا ذریعہ معاش بنایا۔ غزل گو شعراء میں ممتاز حیثیت رکھتے ہیں۔ کلام کے مجموعہ کا نام "خم کاکل" ہے۔

شادؔ عارفی۔ خان احمد علی نام ہے اور شادؔ تخلص۔ ریاست لوہارو میں ۱۹۰۲ء میں پیدا ہوئے۔ لیکن تمام ریاست رامپور میں رہتا ہے۔ "سماع" ان کی تصنیف ہے۔

شاعرؔ لکھنوی۔ لکھنؤ کے نوجوان شعراء میں شاعرؔ لکھنوی امتیازی حیثیت کے مالک ہیں۔ عام طور پر غزل کہتے ہیں اور خوب کہتے ہیں۔ ان کی نظمیں بھی اکثر دیکھنے میں آتی ہیں۔ لیکن وہ بھی ایک طرح کی غزلیں ہی ہوتی ہیں۔ تقسیم ملک کے بعد ترک وطن کر کے پاکستان آ گئے۔ پہلے لاہور میں تھے، اب کراچی میں ہیں۔ عمر چالیس کے لگ بھگ ہو گی۔ نام حسن پاشا۔ [illegible]

شوکت تھانوی۔ "سودیشی ریل" کے موجد۔ کتابوں کے مصنف اور ریڈیو کے "قاضی جی" کو کون نہیں جانتا۔ جو اتنا تعارف کی ضرورت ہو۔ مزاح نگاری اور ظرافت کی شہرت کو اپنے ساتھ لکھنؤ سے پاکستان لائے۔ جہاں یہ نعمت اور بھی زیادہ پھلی پھولی۔ اور شہرت و قبولیت کے اس درخت میں بہت سے شیریں اور مزے دار پھل لگے۔ جو ان کے قدردان کھاتے اور لطف اٹھاتے ہیں۔ آپ مزاح نگار، افسانہ نویس، ناولسٹ اور صحافی ہونے کے علاوہ شاعر بھی واقع ہوئے ہیں اور [illegible] ان کے مزاحیہ مضامین کے ابتدائی مجموعے طوفان تبسم، دنیائے تبسم کے نام سے مدت ہوئی اپنا مجموعہ کلام بھی شائع کر چکے ہیں۔ موج تبسم، بحر تبسم اور سیلاب تبسم ہیں اور پنجاب میں ان کی سب سے پہلی کتاب ۱۹۳۲ء میں "شیش محل" شائع ہوئی۔ ان کا مشہور افسانہ "سودیشی ریل" کے نام سے ۱۹۳۰ء میں چھپا۔ جس نے ان کے نام کو ملک کے آخری کونے تک مشہور کر دیا۔ ہندوستان کے مزاحیہ نگاروں میں ان کا نام آج سب سے زیادہ مشہور ہے۔ اب تک ساٹھ ستر کتابیں لکھ چکے ہیں جو کتابیں لکھتے ہیں۔ فوراً قبولیت کے پر لگا کر اڑ جاتی ہے۔ محمد عمر نام ہے۔ مگر اس نام کو کوئی جانتا بھی نہیں اور شوکت تھانوی کو سب جانتے ہیں۔

ہیں۔ تھانہ بھون ضلع مظفر نگر (یو۔ پی) میں ۱۹۰۹ء میں پیدا ہوئے۔ شاعری کا شوق بچپن سے تھا۔ تعلیم [illegible]
[illegible] شروع کی اسامیوں کی حد تک پہنچا کر چھوڑا۔ کافی عرصہ فلم کمپنیوں میں بھی کام کیا۔ اخباروں کی ملازمت بھی کی [illegible]
[illegible] تقسیم ملک سے پہلے آل انڈیا ریڈیو لکھنؤ میں تھے۔ تقسیم کے بعد لاہور آ کر ریڈیو پاکستان میں ملازم ہو گئے [illegible]
کے روزنامہ جنگ میں کام کر رہے ہیں۔

شہرت بخاری۔ آپ کا نام سید محمد انور ہے اور تخلص شہرت۔ عام طور پر شہرت بخاری کے نام سے مشہور ہیں۔ ۱۰ دسمبر ۱۹۲۵ء کو لاہور میں پیدا ہوئے۔ انٹرنس کا امتحان لاہور ہی میں پاس کیا۔ جس کے بعد مالی پریشانیوں اور اقتصادی مشکلات کے باعث اپنی تعلیم آگے جاری نہ رکھ سکے۔ مگر پرائیویٹ طور پر ادبی لیاقت برابر بڑھاتے رہے۔ بغرضِ حصول معاش کی خاطر ایک روپے کے کارخانہ میں مزدوری بھی کی۔ مگر ہمت کو ہاتھ سے نہ چھوڑا اور ترقی کی امنگ مسلسل دل کو دو ساتھی رہی۔ بالآخر سخت نامساعد حالات کی موجودگی میں آپ نے ایم۔ اے پاس کر ہی لیا۔ آج کل مغربی پاکستان کی انگریزی کمپنی میں مترجم کے طور پر کام کر رہے ہیں۔ "غزلیں" ان کے مجموعہ کلام کا نام ہے۔

ضیا جالندھری۔ سید نثار احمد نام۔ ضیا تخلص۔ ۱۹۲۳ء میں بمقام جالندھر پیدا ہوئے۔ وطن میں ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد گورنمنٹ کالج لاہور سے ایم۔ اے پاس کیا۔ پہلے کچھ دنوں اسلامیہ کالج میں لیکچرار رہے۔ پھر آل انڈیا ریڈیو میں چلے گئے۔ آج کل مشرقی پاکستان کے اسسٹنٹ پوسٹ ماسٹر جنرل ہیں اور ڈھاکہ میں قیام پذیر ہیں۔ "سرشام" ان کی نظموں کا مجموعہ ہے۔

ظفر تاباں۔ ظفر تاباں دہلی میں پروفیسر تھے۔ تقسیم ملک سے پہلے اُن کا انتقال ہو گیا۔

سراج الدین ظفر۔ سراج الدین ظفر ایک قابل ادیب اور شاعر ہیں۔ ان کی والدہ مسز جہاں آرا شاہنواز مشہور افسانہ نگار خاتون ہیں۔ سراج الدین ظفر جہلم کے باشندے ہیں اور ۲۵ مارچ ۱۹۱۲ء کو پیدا ہوئے تھے۔ ایل۔ ایل۔ بی پاس کرنے کے بعد چند روز وکالت کی۔ پھر ہوائی فوج میں افسر ہو کر چلے گئے۔ جب طبیعت گھبرائی تو ملازمت چھوڑ کر تجارت شروع کی۔ آج کل کراچی میں مقیم اور فیروز سنز سے متعلق ہیں۔ شعر و شاعری کا شوق اور افسانہ نویسی کا ذوق بچپن سے ہے۔ شاگرد کسی کے نہیں۔ ہر صنفِ سخن میں انہوں نے طبع آزمائی کی ہے۔ ان کا کلام اکثر رسائل میں چھپتا رہتا ہے۔ "زمزمۂ حیات" ان کی نظموں کا مجموعہ اور "آئینے" ان کے افسانوں کا مجموعہ ہے۔

یوسف ظفر۔ نام شیخ محمد یوسف۔ تخلص ظفر۔ وطن گوجرانوالہ۔ یکم دسمبر ۱۹۱۴ء کو مری میں پیدا ہوئے۔ سلسلہ

یں ماہنامہ کے ایڈیٹر رہے۔ اس کے بعد ریڈیو پاکستان میں چلے گئے۔ کچھ دنوں اخبار آزاد کشمیر راولپنڈی کے ایڈیٹر رہے۔ ے ۱۹۳۶ء میں کیا تھا۔ زنداں اور زہر خند ان کی نظموں کے مجموعے اور "شہسوار" ریڈیائی ڈراموں کا مجموعہ ہے۔ پھول اور روح زندگی ان کی ابتدائی کتابیں ہیں۔

ظہیر کاشمیری۔ غلام دستگیر کشمیری ۱۹۲۰ء میں بمقام امرتسر پیدا ہوئے۔ ظہیر تخلص ہے۔ تعلیم بی۔ اے تک ہے۔ لاہور میں قیام ہے۔ "عظمت آدم" ان کے مجموعہ کلام کا نام ہے۔

عابد۔ سید عابد علی عابد لاہور کے ادیبوں اور شاعروں میں خاص درجہ رکھتے ہیں۔ وطن لاہور ہے ۱۷ ستمبر ۱۹۰۶ء کو پیدا ہوئے۔ والد فوج میں ملازم اور ڈیرہ اسمٰعیل خاں میں مقیم تھے۔ اس لیے ابتدائی تعلیم وہیں پائی۔ انٹرنس رنگ محل مشن ہائی سکول لاہور سے ۱۹۲۱ء میں کیا۔ ۱۹۲۳ء میں پنجاب یونیورسٹی سے بی۔ اے اور ۱۹۲۵ء میں ایل۔ ایل۔ بی کیا۔ اسی دوران میں آپ نے رسالہ "دلکش" اور "ہزار داستان" کی ادارت بھی کی۔ اپنے وقت میں دونوں رسالے اردو ادب کے نہایت شاندار نمونے تھے۔ "ہزار داستان" نہایت دلچسپ اور پُرلطف مسلسل اور مختصر افسانوں کے لیے مشہور تھا۔ نونہال اور دورِ جدید کے بھی ایڈیٹر رہے۔ بعد ازاں ندیم، دنیا اور صادق کی بھی کچھ دنوں ایڈیٹری کی۔ آج کل مجلس ترقی ادب کے سہ ماہی مجلہ صحیفہ کے اعزازی مدیر ہیں۔

ایل۔ ایل۔ بی ہونے کے بعد آپ نے گجرات میں وکالت شروع کی۔ مگر جس دل میں ادبی امنگ اور شعری ذوق ہو اُس کا دل قانون جیسے خشک مضمون میں کیا لگ سکتا ہے۔ تھوڑے ہی دنوں میں اُسے خیرباد کہہ کر لاہور چلے آئے اور ایم۔ اے کا امتحان پاس کیا۔ جس کے بعد ۱۹۳۴ء میں ایف۔ سی کالج میں پروفیسر ہو گئے۔ اس کے بعد فلم "پرترنگا" کا ڈائیلاگ لکھنے کے لیے بمبئی چلے گئے۔ وہاں سے واپس آ کر ۱۹۴۳ء میں دیال سنگھ کالج کی پروفیسری سنبھالی۔ ۱۹۴۷ء میں پاکستان بننے کے بعد اس کے پرنسپل مقرر ہو گئے۔ مگر کچھ دنوں بعد کالج کے ٹرسٹیوں سے اختلاف کے باعث علیحدہ ہو گئے۔ آپ پاکستان کے چوٹی کے شعراء میں سے ہیں۔ ادبی مذاق بھی بہت اعلیٰ پایہ کا ہے۔ فن موسیقی میں بھی بڑی مہارت رکھتے ہیں۔ گفتگو اور تحریر دونوں شگفتہ اور پُرلطف ہوتی ہیں۔ اعلیٰ درجہ کے نقاد اور ملک کے مشہور ادیب ہیں۔ عجائب زندگی۔ چاندنی قسمت۔ ذکر شہیداں۔ سہاگ۔ نیرنگ۔ طلسمات۔ روپ متی۔ دو دل۔ میر تقی خاں۔ ید بیضا۔ شہباز خاں۔ شمع۔ بشر ہے کیا کیجئے۔ انتقاد۔ اردو کا تنقیدی سرمایہ۔ گلہائے بہار۔ اصول انتقاد ادبیات وغیرہ آپ کی تصنیفات ہیں۔ کلام کا انتخاب شب نگار بنداں کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ آپ کی تازہ تالیفات تلمیحات اور شعر اقبال ہیں۔

عارف عبدالمتین۔ عبدالمتین نام ہے اور عارف تخلص۔ یکم مارچ ۱۹۲۳ء کو امرتسر میں پیدا ہوئے۔ ایم۔ اے۔ او کالج امرتسر سے ۱۹۴۵ء میں ایم۔ اے اور سنٹرل ٹریننگ کالج لاہور سے ۱۹۵۲ء میں بی۔ ٹی کا امتحان پاس کر کے

ملازمت کا آغاز ضلع گجرات میں اور تقسیم سے قبل اکاؤنٹنٹ جنرل کے دفتر میں کلرکی کی۔ مگر جلد ہی کلرکی سے طبیعت اکتا گئی اور تدریس کے پیشہ سے منسلک ہو گئے۔ آج کل اسلامیہ ہائی سکول شیرانوالہ گیٹ لاہور میں طلباء کو سائنس پڑھاتے ہیں۔ دیدہ و دل ان کے مجموعۂ کلام کا نام ہے۔

عارف صاحب ترقی پسند مصنفین میں سے ہیں۔ امرتسر میں انھوں نے ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری سے مل کر ترقی پسند مصنفین کے تن بے جان میں از سرِ نو جان ڈالی۔ اور لاہور آنے کے تو یہاں بھی اس انجمن سے ... تک وابستہ رہے۔
۱۹۴۷ء سے ۱۹۵۸ء تک انھوں نے بحیثیت ایڈیٹر میدانِ صحافت میں کام کیا اور اس دوران میں ... کی ادارت کے فرائض انجام دیتے رہے۔ آج کل بھی ماہنامہ جمہور راولپنڈی کے اعزازی مدیر ہیں۔

عدم۔ سید عبدالحمید عدم تخلص۔ ماہ جون ۱۹۱۰ء میں بمقام تلونڈی موسیٰ خاں (ضلع گوجرانوالہ) پیدا ہوئے۔ تربیت لاہور میں ہوئی۔ اور یہیں سے بی۔ اے پاس کیا۔ پھر فوجی ملازمت سے منسلک ہو گئے۔ آج کل ملٹری اکاؤنٹس کے محکمہ آڈیٹر ہیں۔ ابتدا ہی سے شعر و شاعری کا شوق ہوا۔ کسی کی شاگردی نہیں کی۔ مسلسل مشق و مزاولت کے باعث کلام میں بڑی پختگی پیدا ہو گئی ہے۔ اور ان کا شمار پاکستان کے مشہور شعراء میں ہوتا ہے۔ "نقش دوام" "خرابات" "زلف پریشاں" "سیہ و سفید" "گردش جام" "قول و قرار" "شہرِ خوباں" ان کی تصنیفات ہیں جو ابرد باغ ادب ... اور ... ان کی تصنیفات ہیں۔

عرش ملسیانی۔ بالمکند عرش ملسیانی پنڈت لبھو رام جوش جیسے فاضل استاد کے لائق فرزند ہیں۔ ... ۱۹۰۸ء ضلع جالندھر میں پیدا ہوئے۔ باپ کا ادبی ذوق پوری طرح بیٹے میں منتقل ہوا۔ اور آپ دورِ حاضر کے نہایت کامیاب اور معتبر ... ہیں۔ بی۔ اے پاس کرنے کے بعد مدرسی کی لائن اختیار کی۔ اور پندرہ برس تک یہ شغل جاری رکھا۔ آج کل دہلی کے ماہنامہ "آج کل" کے ایڈیٹر ہیں۔ کلام کے دو مجموعے "ہفت رنگ" اور "چنگ و آہنگ" چھپ چکے ہیں۔ جن کی زبان نہایت صاف شائستہ سلیس اور با محاورہ ہے۔

عشرت رحمانی۔ عشرت رحمانی ۱۹ اپریل ۱۹۱۰ء کو رامپور (یو۔ پی) میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی اردو تعلیم گھر پر ہوئی ..... انگریزی تعلیم رامپور، کلکتہ، دہلی اور لاہور میں حاصل کی۔ فارسی اور انگریزی میں کورس کرنے کے بعد اور بنگلہ بھی سیکھی۔ نیز ٹیچرز ڈپلومہ حاصل کیا۔ ۱۹۲۲ء سے شعر و شاعری اور مضمون نگاری کا شوق ہوا۔ ... فارسی اور معاشرتی علوم کے معلم بھی رہے۔ یکم مئی ۱۹۳۸ء سے آل انڈیا ریڈیو دہلی میں اسسٹنٹ پروگرام ... مقرر ۱۹۴۳ء میں پروگرام ڈائریکٹر ہو گئے۔ اگست ۱۹۴۷ء میں قیام پاکستان کے بعد ریڈیو پاکستان سے منسلک ہو گئے اور تک یہ سلسلہ قائم ہے۔ بہت سی کتابوں کے مصنف ہیں۔

عندلیب شادانی — اصل نام وجاہت حسین ہے۔ اور عندلیب تخلص کرتے ہیں۔ شاداںؔ ان کے استاد سید اولاد حسین کا تخلص ہے۔ انہی کی نسبت سے عندلیب شادانی کہلاتے ہیں۔ سنبھل ضلع مراد آباد (یو۔پی) میں یکم دسمبر ۱۹۰۴ء کو پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم اپنی ننھیال رامپور (ریاست) میں پائی۔ بڑے ہو کر منشی فاضل پاس کرنے کے بعد ۱۹۲۵ء میں اسلامیہ کالج لاہور سے ایم۔ اے کیا۔

تعلیم سے فراغت کے بعد پہلے ہندو کالج دہلی میں اور پھر ڈھاکہ یونیورسٹی میں لیکچرار مقرر ہوئے۔ ۱۹۳۱ء میں لندن سے پی ایچ۔ ڈی کا امتحان دیا اور ڈھاکہ واپس چلے آئے۔ جہاں آپ اردو اور فارسی کے شعبے کے صدر ہیں۔ شاعری کا شوق بچپن سے پیدا ہوا اور برابر بڑھتا رہا۔ اس فن میں کسی کے شاگرد نہیں۔ تصنیفات اب تک حسب ذیل ہیں۔

دور حاضر اور اردو غزل گوئی۔ تحقیقات۔ چھوٹا خدا۔ نوش و نیش۔ سچی کہانیاں۔ ترجمہ انشائے ابوالفضل۔ ترجمہ و شرح رباعیات بابا طاہر ہمدانی۔ ترجمہ چہار مقالہ۔ نقش بدیع۔ لغت فارسی جدید۔

آپ کے کلام کا مجموعہ نشاط رفتہ کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔

احمد فراز — احمد شاہ نام ہے اور فراز تخلص۔ احمد فراز کے نام سے پکارے جاتے ہیں۔ سرحد کے مشہور شاعر برق کوہاٹی کے فرزند ہیں اور ۱۲ جنوری ۱۹۳۱ء کو پشاور میں پیدا ہوئے۔ بچپن سے شعر و شاعری کا ذوق تھا۔ اسی لیے سکول چھوڑ کر ریڈیو پاکستان میں ملازم ہو گئے۔ پاکستان بننے کے بعد شعر کہنے شروع کیے۔ پہلے گوہر تخلص کیا پھر بدل لیا۔

فراق — رگھوپتی سہائے فراق منشی گورکھ پرشاد عبرت کے لڑکے اور گورکھپور کے باشندے ہیں۔ ۱۸۹۶ء میں پیدا ہوئے۔ تعلیمی لحاظ سے ایم۔ اے ہیں اور یو۔پی کے مختلف کالجوں میں پروفیسر رہے ہیں۔ آج کل الٰہ آباد میں ہیں۔ شعر و سخن کا شوق بچپن سے ہے۔ نو مشقی میں ناصری مرحوم اور وسیم خیرآبادی کے شاگرد رہے۔ غزلوں میں امیر مینائی کا رنگ نمایاں ہے۔ غزل گو شعراء میں ان کا درجہ بہت بلند ہے۔ بلکہ غزل میں نئی طرز کے موجد، جتنے بڑے شاعر ہیں، اتنے ہی بڑے نقاد ہیں۔ "اندازے" ان کے تنقیدی مضامین کا مجموعہ ہے۔ رمز و کنایات۔ شبستاں۔ روپ۔ روح کائنات۔ مشعل۔ شعلۂ ساز۔ ان کے کلام کے مجموعے ہیں۔

فیض — فیض احمد نام۔ فیض تخلص۔ سلطان محمد خاں بیرسٹر سیالکوٹ کے فرزند ہیں جو وکٹوریہ کے دربار میں افغانستان کے سفیر تھے۔

سال پیدائش میں اختلاف ہے۔ ایک تذکرہ میں ۱۹۱۰ء — ایک میں ۱۹۱۱ء اور ایک میں ۱۹۱۲ء لکھا ہے۔ آپ نے مرے کالج سیالکوٹ سے ایف اے، گورنمنٹ کالج لاہور سے بی اے پاس کیا۔ اورینٹل کالج لاہور سے عربی کا ایم اے پاس کیا۔ تعلیم سے فراغت کے بعد ۱۹۳۴ء سے ۱۹۳۵ء تک ایم۔ اے او کالج امرتسر اور ہیلی کالج لاہور میں لیکچرار رہے۔ ۱۹۴۲ء میں گورنمنٹ ہند کی فوجی ملازمت اختیار کی جو پانچ سال تک رہی۔ بعد میں لاہور آ کر ۱۹۴۷ء میں پاکستان ٹائمز اور ۱۹۴۸ء میں روزنامہ امروز کے چیف ایڈیٹر

مقرر ہوئے۔ ۱۹۶۹ء میں عالمی امن کونسل میں پاکستان کے نمائندے مقرر ہوئے۔ جنوری ۱۹۵۳ء میں انھیں ... میں ۵ سال کی سزا ہوئی۔ ۱۹۵۸ء کے مارشل لا میں بھی کچھ دن نظر بند رہے۔ پھر بیروت چلے گئے۔ فیض اس دور کے ... مشہور نقاد اور اچھے صحافی ہیں۔ ادب اور شعر کا صحیح مذاق رکھتے ہیں۔ ان کی نظموں کے مجموعے "نقش فریادی"، "دست صبا" ... ہو چھپ چکے ہیں۔ تنقیدی مضامین کا مجموعہ "میزان" زیر طبع ہے۔

قتیل شفائی ۔ نام اورنگ زیب۔ تخلص قتیل شفائی۔ وطن ہری پور (ہزارہ) تاریخ پیدائش ۲۴ دسمبر ۱۹۱۹ء۔ فن شعر میں عبدالحکیم حکیم شفا کے شاگرد ہیں۔ اس لیے قتیل شفائی کہلاتے ہیں۔ والد کا بچپن ہی میں انتقال ہو گیا۔ اس لیے اعلیٰ تعلیم حاصل نہ کر سکے۔ جوان ہوئے تو فکر معاش کے سلسلے میں کہیں چونگی کی محرری کی۔ کہیں اداروں کے ماہنامے پر ملازمت۔ شعر اور گیت کہنے کا شروع سے شوق تھا۔ متعدد فلموں کے گیت بھی لکھے ہیں۔ دو برس تک "ادب لطیف" کی ادارت بھی کی اور ہفتہ وار رسالہ "اداکار" میں بھی کام کیا۔ رفتہ رفتہ ان کی شعری صلاحیتیں پورے طور پر آئیں اور وہ دیکھتے ہی دیکھتے ادبی حلقوں میں مشہور ہو گئے۔ گیت بھی خوب لکھے اور غزلیں بھی خوب کہیں۔ منظوم ڈرامے۔ ریڈیو فیچر۔ سیکڑوں نظمیں۔ بیسیوں غزلیاں ان کی تصنیف ہیں۔

قتیل کی شاعری اور ان کے گیتوں پر مفصل تبصرہ مؤلف "ادبیات سرحد" نے ۱۲ صفحات پر کیا ہے۔

ہریالی۔ گجر۔ جلترنگ۔ بازار اور روزن ان کی نظموں کے مجموعے ہیں۔

کمپیو

ماہر القادری ۔ نام منظور حسین۔ تخلص ماہر۔ سلسلہ قادری اور وطن کیسر کلاں (ضلع بلند شہر) ہے۔ والد کا نام محمد مشتاق علی تھا۔ جو ظریف تخلص کرتے تھے۔ سال ولادت ۱۳۲۴ھ (۱۹۰۶ء) ہے۔ نام سے تاریخ نکلتی ہے۔ تحصیل علم کے بعد مختلف مقامات میں قیام رہا۔ کئی سال حیدرآباد میں ملازمت کی۔ پھر بمبئی چلے آئے۔ اس کے بعد دہلی کا رُخ کیا۔ کچھ دنوں بجنور میں رہ کر مدینہ اور نجم کی ادارت کی۔ ۱۹۴۶ء میں بلاد اسلامیہ کا سفر بھی کیا۔ ۱۹۴۹ء میں پاکستان آکر کراچی میں مقیم ہیں۔ کراچی آکر رسالہ "فاران" جاری کیا۔ اس وقت تک بیس پچیس کتابیں لکھ چکے ہیں۔ جن میں "دُرّ یتیم" خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سوانح عمری ہے۔ روزنامچے۔ آخری رسول۔ حسیم حیات بھی آپ کی تصنیفات ہیں۔ کلام کے مجموعے "محسوسات ماہر" جذبات ماہر۔ نغمات ماہر اور ذکر جمیل ہیں۔ غزل میں بے اعتدالی اور لااُبالی پن سے احتراز کرتے ہیں۔ مذہب اسلام۔ تاریخ اسلام اور اسلامی ادب سے بہت گہرا لگاؤ رکھتے ہیں۔

مجاز ۔ نام اسرار الحق۔ تخلص مجاز۔ والد شیخ سراج الحق تھے۔ ۱۹۱۱ء میں قصبہ ردولی۔ ضلع بارہ بنکی میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۳۵ء میں علی گڑھ سے بی۔ اے کیا۔ پھر آل انڈیا ریڈیو دہلی میں ملازم ہو گئے۔ محکمہ اطلاعات بمبئی اور ہارڈنگ لائبریری دہلی میں بھی کچھ دن نوکری کی۔ لیکن طبیعت لااُبالی پائی تھی۔ نوکری چھوڑ کر گھر بیٹھ گئے۔ اور شعر و شاعری کے شوق میں ساری عمر گزار دی۔

۱۰ دسمبر ۱۹۶۵ء کو ان کا انتقال ہو گیا۔

آہنگ، شب تاب اور ساز نو ان کی نظموں اور غزلوں کے مجموعے ہیں۔ جو شائع ہو چکے ہیں۔ کلام میں روانی اور شیرینی دونوں پائی جاتی ہیں۔

مختار صدیقی۔ نام مختار الحق، تخلص مختار۔ آبائی وطن سیالکوٹ تھا۔ لیکن والد نے گوجرانوالہ میں رہنا شروع کر دیا۔ لہٰذا اب وہی وطن ہو گیا۔ صدیقی صاحب یکم مارچ ۱۹۱۹ء کو پیدا ہوئے تھے۔ بی۔ اے پاس کرنے کے بعد کچھ عرصہ کلرک رہے۔ پھر ریڈیو پاکستان میں پروگرام اسسٹنٹ متعین ہو گئے۔ آج کل راولپنڈی میں تعینات ہیں۔ فن شعر میں سیماب اکبر آبادی کے شاگرد ہیں۔ ان کی شاعری کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ ہر بات کو ایک نئے ڈھنگ سے نظم کرتے ہیں۔ جس سے نظم کی دلکشی اور دلچسپی میں نمایاں اضافہ ہو جاتا ہے۔

آنند نرائن ملا۔ پنڈت آنند نرائن، تخلص ملا، پنڈت جگت نرائن ملا کے فرزند اور لکھنؤ کے رہنے والے ہیں۔ اکتوبر ۱۹۰۱ء میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۲۳ء میں ایم۔ اے اور ۱۹۲۵ء میں ایل۔ ایل۔ بی کا امتحان پاس کیا۔
اردو فارسی کی تعلیم مولانا برکت اللہ رضا فرنگی محلی سے پائی۔ پہلے انگریزی میں شعر کہنے شروع کیے پھر اردو میں۔ مگر کسی سے اصلاح نہیں لی۔ کلام کے مجموعے کا نام "جوئے شیر" ہے۔

میرا جی۔ نام ثناء اللہ ڈار تھا۔ ایک بنگالی طالبہ میرا سین کے عشق میں ایسے بیخود اور از خود رفتہ ہوئے کہ اس کے نام پر اپنا نام میرا جی رکھ لیا۔ اور باقی ساری عمر اس کی یاد اور محبت میں گزار دی۔ شروع شروع میں لاہور کے ادبی رسائل میں مضامین اور نظمیں لکھیں جو اپنی ندرت، سلاست، عمدگی اور خوبی کے باعث نہایت درجہ مقبول ہوئیں اور بہت جلد ایک نوجوان ادیب اور شاعر کی حیثیت سے لاہور کی ادبی مجالس کی رونق بن گئے۔ بعد میں انھوں نے دوسرے ادیبوں کے ساتھ مل کر حلقہ ارباب ذوق کی بنیاد ڈالی۔ ۱۹۳۶ء سے ۱۹۴۱ء تک "ادبی دنیا" کے نائب ایڈیٹر رہے۔ پھر ریڈیو میں ملازم ہو کر دہلی چلے گئے۔ وہاں سے بمبئی گئے اور اختر الایمان کی شراکت میں "خیال" جاری کیا۔ شراب کی کثرت نے صحت کو بالکل تباہ کر دیا۔ یہاں تک کہ نہایت بے بسی، بے کسی اور کس مپرسی کی حالت میں ایک ہسپتال کے اندر چند روز بیمار رہ کر ۳۔ نومبر ۱۹۴۹ء کو انتقال کیا۔ ۱۹۱۰ء میں پیدا ہوئے تھے۔ بقول بعض ۱۹۱۲ء میں۔ ان کی تصانیف میرا جی کی نظمیں، میرا جی کے گیت، اور نگار خانہ وغیرہ ہیں۔

ناصر کاظمی۔ ناصر رضا نام ہے اور ناصر تخلص۔ انبالہ میں ۸ دسمبر ۱۹۲۵ء کو پیدا ہوئے۔ والد کا نام محمد سلطان تھا۔ جو فوج میں صوبیدار میجر تھے۔ ناصر صاحب نے لاہور میں بی۔ اے تک پڑھا مگر امتحان نہ دے سکے۔ سر عبدالقادر مرحوم کی یادگار میں ان کے لڑکوں نے جو رسالہ "اوراق نو" کے نام سے نکالا تھا، اس کے مدیر رہے۔ پھر ہمایوں کے ایڈیٹر ہو گئے۔ آپ نہایت

بھی ہیں۔ غزل گو شاعر ہیں، کلام کا مجموعہ "..." کے نام سے شائع ہوا ہے۔ نوجوان شعرا میں خاصے مقبول ہیں۔

احمد ندیم قاسمی۔ احمد شاہ نام ہے اور ندیم تخلص کرتے ہیں۔ میر غلام نبی عرف چن پیر کے فرزند ہیں۔ ۲۰ نومبر ۱۹۱۶ء کو موضع انگہ (ضلع سرگودھا) میں پیدا ہوئے۔ پردادا کا نام محمد قاسم تھا۔ اسی نسبت سے قاسمی کہلاتے ہیں اور اسی ... کے نام سے مشہور ہیں۔ ۱۹۲۳ء میں جب والد کا سایہ سر سے اٹھ گیا تو چچا اپنے ساتھ کیمبل پور لے گئے جہاں وہ ملازم تھے۔ ان کے چچا خان بہادر پیر حیدر شاہ عربی کے عالم، فارسی کے فاضل اور شعر و سخن کا بہت اچھا ذوق رکھتے تھے۔ وہیں ان کو بھی شاعری کا شوق پیدا ہوا۔ اور تفسیر حقانی کا درس بھی چچا سے لیا۔ ۱۹۲۹ء میں انٹرنس پاس کیا۔ ایجرٹن کالج بہاولپور میں داخل ہوئے کیونکہ وہاں ان کے چچا ریاست کے تحصیلدار ہو کر چلے گئے تھے۔ مگر ۱۹۳۳ء میں ان کا انتقال ہو گیا۔ جس کے باعث ان پر مصائب و آلام کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ لیکن انھوں نے ہمت نہ ہاری اور جس طرح بھی بن پڑا ۱۹۳۵ء میں بی۔ اے کر لیا۔ اب حصول معاش کا سوال تھا۔ چار سال اسی تگ و دو میں گزرے۔ آخر ۱۹۳۹ء میں محکمہ آبکاری کے انسپکٹر مقرر ہوئے۔ مگر نوکری نہ طبیعت کے موافق تھی نہ ذوق کے مطابق۔ اس لیے ۱۰ ستمبر ۱۹۴۱ء کو مستعفی ہو کر لاہور چلے آئے۔ اور پھول و تہذیب النسواں میں ۱۹۴۲ء سے ۱۹۴۳ء تک کام کیا۔ اسی دوران میں کچھ مدت ماہنامہ ادب لطیف کو بھی ایڈٹ کیا۔ اسی اثنا میں ادب لطیف کے ایک مضمون کی بنا پر آپ پر ایک مقدمہ قائم ہوا۔ جو ایک سال تک چلتا رہا۔ اس سے آپ ۱۹۴۴ء میں بری ہوئے۔ ستمبر ۱۹۴۶ء سے مارچ ۱۹۴۸ء تک پشاور ریڈیو میں ملازمت کی۔ اس ملازمت کے دوران میں رسالہ سویرا کی ایڈیٹری بھی کرتے رہے۔ پھر لاہور آ گئے اور محمد طفیل صاحب مالک ادارہ فروغ اردو سے مل کر رسالہ نقوش نکالا۔ اس کے ابتدائی دس پرچے ان کے اور ہاجرہ مسرور کی ادارت میں شائع ہوئے۔ مارچ ۱۹۵۱ء سے نومبر ۱۹۵۱ء تک سیفٹی ایکٹ کے ماتحت نظر بند رہے۔ وہاں سے آئے تو مختلف ادبی اور علمی مشغولیتوں میں مصروف رہنے کے بعد مارچ ۱۹۵۳ء کو روزنامہ امروز لاہور کے ایڈیٹر ہوئے اور اب وہاں استعفیٰ دے دیا۔

شادی ۱۹۴۸ء میں ہوئی تھی۔ جس سے دو بچیاں نشاط اور ناہید ہیں۔

ملک کے نامور انشا پردازوں، معروف شاعروں اور مشہور افسانہ نگاروں میں آپ کا خاص مقام ہے۔ آپ کا منظوم کلام نہایت شستہ و شائستہ اور لطیف و دلکش ہوتا ہے۔ شعر و سخن کی ہر مجلس میں آپ کی غزلیں اور نظمیں گہری دلچسپی اور بڑے ذوق و شوق سے سنی جاتی ہیں۔

ذاتی لحاظ سے نہایت درجہ خلیق، بے حد ملنسار، بہت متواضع اور بڑے منکسر المزاج واقع ہوئے ہیں۔ دوستوں کے ہمدرد، عزیزوں کے بہی خواہ، رشتہ داروں کے ساتھ حسن سلوک کرنے والے، دشمن کے بھی وقت پڑنے پر مدد کرنے والے، تکلیف پر صبر کرنے والے، مصائب سے نہ گھبرانے والے، ہر وقت خوش رہنے والے، تکلف سے، ریا سے، دکھاوے سے علیحدہ۔ فیاض طبع، سیر چشم، خوش اطوار، نیک نیت، نیک سرشت ہیں احمد ندیم قاسمی۔

آپ کی منظوم تصانیف جلال و جمال، شعلۂ گل اور رم جھم ہیں۔

نثری تصنیفات اور افسانوں کے مجموعے اب تک حسب ذیل شائع ہو چکے ہیں۔

جہانِ دل، جگمگ ستے گہرےاب۔ طلوع و غروب۔ سیلاب سا کچھ۔ تنہائے۔ آس پاس۔ در و دیوار۔ سناٹا۔ انگرائیاں۔ بپتا جیل کے شب و روز۔ نقوشِ لطیف۔ کیسر کیاری اور بازارِ حیات۔

قیوم نظر۔ عبدالقیوم نام ہے اور نظر تخلص ہے۔ قیوم نظر کے نام سے مشہور ہیں۔ وطن لاہور ہے۔ تاریخ پیدائش ۷ مارچ ۱۹۱۴ء۔ ۱۹۴۱ء میں اورینٹل کالج لاہور سے اردو میں ایم۔اے کر کے اکاؤنٹنٹ جنرل کے دفتر میں کچھ عرصہ تک کام کیا۔ پھر گورنمنٹ کالج لائل پور میں لیکچرار ہو گئے۔ آج کل گورنمنٹ کالج لاہور میں ہیں۔ شعر و شاعری کا شوق زمانہ طالب علمی ہی میں ہوا۔ ان کے کلام کی خصوصیت انداز بیان کی دلکشی اور اسلوب کا بانکپن ہے۔

ان کی منظومات کے دو مجموعے "قندیل" اور "پون جھکولے" کے نام سے چھپ چکے ہیں۔ "سویدا" بھی آپ ہی کی کتاب ہے۔

نہال سیوہاروی۔ منشی عبدالخالق المتخلص بہ نہال سیوہارہ ضلع بجنور (یو۔ پی) میں پیدا ہوئے۔ تاریخ ولادت ۲۷ اگست ۱۹۰۵ء ہے۔ والد کا نام قاضی عبدالواسع تھا۔ تعلیم معمولی تھی۔ جوان ہوئے تو حصول معاش کے لیے اکاؤنٹس آفس نارتھ ویسٹرن ریلوے دہلی میں ملازم ہو گئے۔ قیام پاکستان کے بعد کراچی منتقل ہو گئے۔ جنوری ۱۹۶۲ء میں وفات پائی۔ شاعری کا شوق بچپن سے تھا۔ عمر کے ساتھ ساتھ کلام میں پختگی آتی گئی۔ کلام میں سادگی، سلاست، روانی اور جذب و اثر بدرجۂ غایت موجود ہے۔ "کلہائے آزادی" اور "شباب و انقلاب" اُن کی منظومات کے مجموعے ہیں۔

وحید قریشی۔ آپ کا نام عبدالوحید قریشی ہے اور وحید تخلص کرتے ہیں۔ اصلی گھر میانوالی ہے۔ مگر آپ میانوالی میں ۱۴ اکتوبر ۱۹۲۵ء کو پیدا ہوئے۔ ایم۔اے کے بعد پی۔ایچ۔ڈی حاصل کی۔ اور آج کل اسلامیہ کالج لاہور میں لیکچرار ہیں۔ "شبلی کی حیات معاشقہ" آپ کی نہایت مشہور اور دلچسپ کتاب ہے۔ مقدمہ دیوان حالی کو بھی آپ نے نہایت خوبی، عمدگی اور محنت کے ساتھ ایڈٹ کیا ہے۔ مثنوی سحر البیان، اردو تنقید، انتخاب سودا اور جدید اردو شاعری زیر ترتیب اور زیر طبع ہیں۔ نقوش کے غزل نمبر کے پہلے ایڈیشن میں شعرائے کرام کے حالات بھی آپ نے مرتب فرمائے تھے۔ نہایت قابل اور لائق شخص ہیں۔ ادب سے خاص ذوق رکھتے ہیں۔ حال ہی میں آپ نے "میر حسن" پر خاص ریسرچ کی ہے۔ کبھی کبھی شعر بھی کہتے ہیں۔

یاس یگانہ چنگیزی۔ مرزا واجد حسین نام۔ یاس و یگانہ تخلص اور وطن عظیم آباد ہے۔ ۱۸۸۴ء سال پیدائش ہے۔ پہلے بیتاب کے شاگرد ہوئے۔ بعد ازاں شاد عظیم آبادی کے۔ عظیم آباد سے لکھنؤ آ کر آباد ہو گئے۔ پھر اٹاوہ اسکول میں ملازم ہو کر حیدر آباد چلے گئے۔ لاہور میں کچھ دن اکر رہے ہیں۔ نشترِ یاس، چراغِ سخن، آیاتِ وجدانی، غالب شکن، ترانہ اور گنجینہ تصنیفات میں سے ہیں۔ طبیعت میں تعلّی، فخر اور خود ستائی و خود پسندی کا مادہ بے حد تھا۔ اسی کی وجہ سے اکثر جگہ نقصان اور تکلیف اٹھائی۔ اپنے دور تک کے شعرا کو تو کیا غالب کو بھی بے حقیقت سمجھتے تھے۔ ۴ فروری ۱۹۵۶ء کو انتقال ہوا۔

اختتامیہ

میں شعرائے کرام کے حالات لکھ چکا تھا کہ مدیر صاحب نقوش نے "غزل نمبر" کا دوسرا ایڈیشن شائع کیا اور اس میں کچھ مزید شعراء کی غزلیں بھی شامل کیں۔ ان بعد کے شعراء کے حالات (جہاں تک دستیاب ہو سکے) اس اختتامیہ میں ملاحظہ فرمائیں۔ ان میں سے چھ سات شعراء کے حالات میرے محترم دوست مکرمی پیتم صاحب شاہجہان پوری ایڈیٹر حمایت اسلام لاہور نے مجھے فراہم کئے۔ جو مجھے نہیں مل رہے تھے۔ اس عنایت کے لیے میں ان کا نہایت ممنون ہوں۔

خاکسار محمد اسماعیل پانی پتی

شمس العلماء مولانا محمد حسین آزاد ۔ نہایت فصیح و بلیغ۔ نہایت لطیف و شیریں اور نہایت سلیس و دلنشیں اردو لکھنی مولانا محمد حسین آزاد پر ختم ہے۔ ان سے پہلے اور ان کے بعد ایسی شاندار اردو لکھنے والا جس کا ہر فقرہ دل میں بیٹھتا چلا جائے کوئی دوسرا پیدا نہیں ہوا۔ آپ ۱۸۳۲ء میں بمقام دہلی پیدا ہوئے۔ والد کا نام مولوی محمد باقر تھا۔ جو ایک علم دوست اور ذی علم انسان تھے اور غدر ۱۸۵۷ء میں مارے گئے۔ آزاد بھی دہلی کی تباہی کے بعد گھر سے نکلے اور تلاش معاش میں جگہ جگہ کے دھکے کھاتے ہوئے لاہور پہنچے۔ یہاں کے ڈاکخانہ میں نوکری کی درخواست دی تو جواب ملا کہ ایک ماہ تک بلا تنخواہ کام کرو کام اچھا کیا تو رکھ لیے جاؤ گے۔ مصیبت کے مارے آزاد نے یہ بھی کیا اور نوکر ہو گئے۔ بعد میں لالہ پیارے لال آشوب کی سفارش سے محکمہ تعلیم میں جگہ مل گئی۔ جہاں رفتہ رفتہ ترقی کرتے کرتے آپ گورنمنٹ کالج میں عربی فارسی کے پروفیسر ہو گئے۔ دو مرتبہ تحقیقات کے لیے ایران گئے۔ اور وہاں سے بڑے نوادرات ساتھ لائے۔ ۱۸۸۷ء میں آپ کو گورنمنٹ کی طرف سے شمس العلماء کا خطاب ملا۔ محکمہ تعلیم کے سرکاری پرچے "اتالیق پنجاب" اور اس کے بعد "پنجاب میگزین" کے نائب مدیر رہے کرنل ہالرائڈ ڈائرکٹر تعلیمات پنجاب کے ایماء سے آپ نے "انجمن پنجاب" کے جلسوں میں ایک مشاعرے کی بنیاد ڈالی جس میں بجائے مصرعہ طرح کے کسی ایک موضوع پر نظمیں پڑھی جاتی تھیں۔ یہ مشاعرے جدید شاعری کی سب سے پہلی بنیاد تھے۔ اس قسم کا سب سے پہلا مشاعرہ ۹ مئی ۱۸۷۴ء کو انجمن پنجاب کے دفتر میں منعقد ہوا جس میں آزاد نے اپنی مثنوی "شب قدر" سنائی۔ شمس العلماء مولانا الطاف حسین حالی نے بھی ان مشاعروں میں نہایت دلچسپی سے حصہ لیا اور اپنی چار ابتدائی مثنویاں انہی مشاعروں میں پڑھ کر سنائیں آخر میں اپنی ایک ہونہار اور لاڈلی بیٹی کی وفات کے باعث مولانا آزاد کا دماغ مختل ہو گیا تھا اور یہ عارضہ جان کے ساتھ گیا ۲۲ جنوری

۱۹۱۱ء کو اردو فارسی اور عربی کے اس لاثانی ادیب کا انتقال ہو گیا۔ اور اُردو اپنے ایک ایسے انشا پرداز سے خالی ہو گئی جس کا مثیل و نظیر پیدا نہ ہو سکا۔ آزاد شیخ محمد ابراہیم ذوقؔ کے شاگرد تھے۔ استاد کا دیوان آپ ہی نے بڑی تلاش کے بعد فراہم کر کے شائع کیا تھا۔ آپ کا کلام مجموعہ نظم آزاد کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ اردو شاعری کی تاریخ آپ نے آب حیات کے نام سے لکھی۔ نیرنگ خیال۔ دربار اکبری۔ سخندان پارس۔ نگارستان فارس۔ سپاک و غاک وغیرہ آپ کی مشہور تصانیف ہیں۔ بچوں کی ابتدائی ریڈریں آپ نے کی لکھیں۔

جاں نثار اختر۔ جاں نثار اختر التخلص بہ اختر ۱۹۱۴ء میں بمقام گوالیار پیدا ہوئے۔ آبائی وطن خیر آباد ہے مشہور و معروف شاعر مضطر خیر آبادی آپ کے والد تھے۔ اختر خاندانی لحاظ سے ایک بہت بڑے ذی علم گھرانے سے تعلق رکھتے ہیں۔ جس کے ذمہ مولانا فضل امام۔ مولانا فضل حق اور مولانا عبد الحق جیسے فاضل یگانہ روزگار رہتے۔

اختر انٹرنس پاس کرنے کے بعد علیگڑھ میں تکمیل تعلیم کے لیے بھیج دیے گئے۔ جہاں سے آپ نے ۱۹۳۶ء میں ایم اے پاس کیا۔ اور وکٹوریہ کالج گوالیار میں پروفیسر مقرر ہو گئے۔

شاعری کا شوق علی گڑھ میں پیدا ہوا جو عمر کے ساتھ بڑھتا رہا۔ علیگڑھ کی زندگی میں آپ عرصہ تک کالج کی ادبی انجمن "حدیقۃ الشعراء" اور انجمن اردوئے معلیٰ کے معتمد رہے۔ علیگڑھ میگزین کی ادارت بھی آپ نے عرصہ تک کی۔ مجموعہ کلام "سلاسل" کے نام سے شائع ہو چکا ہے

علی اختر۔ آپ کا نام سید علی اختر ہے اور آپ نے اپنے نام کے آخری حصے کو بطور تخلص اختیار کیا۔ ان کے والد ماس گنج ضلع ایٹہ، یو۔ پی کے متوطن تھے مگر آپ کی پیدائش علی گڑھ میں ہوئی اور تعلیم بھی وہیں پائی تعلیم کے بعد حیدر آباد چلے گئے اور وہاں محکمۂ عدالت میں ملازم ہو گئے۔ مدت تک وہیں مقیم رہے۔ مگر سقوط حیدر آباد کے بعد کراچی چلے آئے۔ اور اب وہیں مستقل سکونت اختیار کر لی ہے۔ فارسی ادب میں بہت کافی دستگاہ رکھتے ہیں اور کہنہ مشق شاعر ہیں۔ اصناف سخن میں غزل سے بالخصوص طبیعت کو نہایت لگاؤ ہے۔ کلام کے کئی مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔

اختر تلہری۔ آپ کا نام سید اختر علی ہے اور نام ہی کے ایک حصہ کو بطور تخلص استعمال کرتے ہیں۔ مضافات شاہجہانپور میں ایک مشہور قصبہ ہے تلہر۔ آپ وہاں کے رہنے والے ہیں۔ اس لیے اختر تلہری کے نام سے مشہور ہیں۔ آپ نے بی اے تک تمام امتحانات نہایت اعزاز کے ساتھ پاس کرنے کے بعد اپنے لیے معلمی کے پیشہ کو پسند فرمایا اور گورنمنٹ ہائی سکول شاہجہانپور میں مدرس مقرر ہو گئے۔ شاعری کا شوق آپ کو شروع سے تھا۔ نثر میں مضامین بھی خوب لکھتے تھے کئی کتابوں کے مصنف بھی ہیں۔

امجد حیدر آبادی۔ آپ کا نام سید امجد حسین ہے نام کا پہلا جزو امجد آپ نے اپنا تخلص اختیار کیا۔ حیدر آباد کو

پ کا وطن ہے۔ جہاں آپ ۱۸۸۲ء میں پیدا ہوئے۔ والد صوفی سید رحیم علی کا انتقال بچپن ہی میں ہو گیا تھا۔ ابھی سے بڑے ہو کر
حیدرآباد کے مدرسہ نظامیہ میں تعلیم پائی۔ اس کے بعد مولانا نادر الدین اور نواب سندالملک آغا سید علی شوستری سے عربی فارسی کی
اعلیٰ تعلیم کے بعد مقامی مدرسہ دارالعلوم میں مدرس ہو گئے۔ مگر جلد ہی اُسے چھوڑ کر محکمہ محاسبی میں ملازم ہو گئے اور ۳۵ سال تک
نوکری کرنے کے بعد ریٹائر ہوئے۔

ان کی زندگی کا بڑا المناک واقعہ یہ ہے کہ حیدرآباد کی موسیٰ ندی میں ۱۹۰۸ء میں ایک بڑا قیامت خیز طوفان آیا۔ اور
ان کا مکان بھی اچانک اس طوفان کی لپیٹ میں آگیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ والدہ ساجدہ اور چھوٹی بچی ان کی آنکھوں کے سامنے پانی
میں غرق ہو گئیں۔ اس ہولناک اور جگر پاش واقعہ نے اُن کی زندگی کو سراسر بدل دیا۔ اور اُن کی شاعری درد اور تڑپ سے لبریز
ہو گئی۔ کچھ دنوں بعد ان کے استاد مولوی نادر الدین نے اپنی دختر کی شادی ان سے کر دی۔ یہ خاتون نہایت قابل اخلاق منتظم
گھر دار اور شوہر سے بیحد محبت کرنے والی تھیں۔ مگر سفرِ حج سے واپسی کے بعد ان کا بھی انتقال ہو گیا۔ جس کا صدمہ ایسا
ہوا کہ امجد بالکل تارک الدنیا بن گئے۔ اور ان کی زندگی ہر دلچسپی اور ہر خوشی سے خالی ہو گئی۔ فنِ شعر میں حبیب کنتوری کے شاگرد
ہیں۔ فارسی اشعار ترجمے کو دکھایا کرتے تھے۔ ان کی نظمیں نہایت زوردار، نہایت پُراثر اور نہایت بلیغ ہوتی ہیں۔ بالخصوص رباعی
میں اپنا جواب نہیں رکھتے۔ مولوی وحید الدین سلیم۔ ڈاکٹر اقبال۔ مولانا گرامی۔ عظمت اللہ خاں اور پروفیسر مناظر احسن گیلانی نے نہایت
عمدہ اور شاندار الفاظ میں ان کی شاعری کے متعلق اپنے تاثرات کا اظہار کیا ہے: ند امجد۔ جمال امجد۔ ریاض امجد۔ گلستان امجد سیاحتِ امجد
خرقہ امجد آپ کی نظم و نثر کے مجموعے ہیں۔ مولوی نصیر الدین ہاشمی نے آپ کے خطوط کا مجموعہ شائع کیا ہے۔ اور آپ کی شاعری پر
ایک مبسوط کتاب لکھی ہے۔

برقؔ دہلوی۔ منشی مہاراج بہادر نام تھا۔ اور برقؔ تخلص۔ منشی بہرناتھ داس حسرتؔ کے فرزند تھے۔ قدیمی وطن
سکیٹ ضلع ایٹہ (یو۔ پی) تھا۔ مگر بزرگوں نے دہلی میں مستقل سکونت اختیار کر لی تھی۔ اور وہیں برقؔ ۱۸۸۴ء میں پیدا ہوئے۔ انٹرنس
میں پڑھ رہے تھے کہ ۱۹۰۱ء میں والد کا انتقال ہو گیا جس سے ان پر آئندہ تعلیم کے دروازے بند ہو گئے اور روزی تلاش
کرنے پر مجبور ہوئے۔ جو بھی چھوٹی موٹی نوکری مل گئی کر لی۔ مگر معاشی مجبوریوں کے باوجود تعلیم جاری رکھی۔ ۱۹۱۵ء میں منشی فاضل کا امتحان
دیا اور ۱۹۲۰ء میں پرائیویٹ طور سے بی۔ اے کیا۔ ۱۹۲۲ء میں محکمانہ امتحان پاس کرنے کے بعد دہلی کے ڈاکخانہ میں سپرنٹنڈنٹ
مقرر ہوئے جب جا کر معاش کی طرف سے اطمینان نصیب ہوا۔

فنِ شعر میں آپ آغا شاعر قزلباش کے شاگرد تھے اور غزل گوئی اور نظم نگاری کا بہت اچھا سلیقہ رکھتے تھے۔ بیاضیت
میں اپنے ایک دوست لالہ شکر چند روشن کی لڑکی کی تقریب میں آئے ہوئے تھے کہ یکایک حرکت قلب بند ہونے سے ۹ فروری
۱۹۳۶ء کو انتقال کیا۔ مطلعِ انوار ان کے کلیات کا نام ہے جو بہت شگفتہ نظموں کا مجموعہ ہے۔

بیتابؔ عظیم آبادی۔ آپ کا نام سید کلب علی تھا۔ اور آپ سید فیاض علی کے فرزند تھے۔ مرزا عظیم آباد وطن تھا۔ یہ بزرگ

ساری عمر کیمیا کی تلاش اور جستجو میں اِدھر سے اُدھر اور اُدھر سے اِدھر سارے ہندوستان میں مارے مارے پھرتے رہے۔ مگر افسوس گوہرِ مقصود ہاتھ نہ آیا۔ اور ہمیشہ ایک آنچ کی کسر رہی۔

(تذکرہ ذکاء بحوالہ یادگارِ شعرا ص ۲۴۲)

بے نظیر شاہ۔ ان کا نام سید محمد بے نظیر شاہ ہے اور نام ہی کا پہلا حصہ بطور تخلص استعمال کرتے ہیں۔ یعنی بے نظیر ان کا تخلص ہے۔ شاہ صاحب ایک صوفی منش کہنہ مشق شاعر ہیں۔ ۱۸۶۳ء میں پیدا ہوئے۔ کڑا مانک پور ضلع الٰہ آباد ان کا وطن ہے۔ مگر وطن کی سکونت ترک کر کے حیدر آباد چلے گئے اور اسی کو اپنا وطن بنا لیا۔ مولانا شاہ احسان علی قادری ان کے والد اور بہت بڑے صاحبِ طینت بزرگ تھے۔ حضرت شاہ عبدالعزیز دہلوی کے خلیفہ ہونے کا ان کو شرف حاصل تھا۔

بے نظیر شاہ عربی و فارسی کے ماہر کامل اور بہت اعلیٰ پایہ کے غزل گو شاعر ہیں۔ مگر جتنے اچھے غزل گو ہیں مثنوی لکھنے میں بھی ان کا پایہ اتنا ہی بلند ہے۔ چنانچہ ان کی مشہور و معروف مثنوی "ام الکلام" جو ایک صوفیانہ رنگ کی نظم ہے۔ نہایت درجہ مقبول ہوئی اور بقول عبدالقادر سروری "اردو کی کوئی مثنوی اس کے رتبہ کو نہیں پہنچ سکتی۔ اس کے اکثر حصے اردو شاعری کے جدید انتخابات کے لیے سرمایۂ زینت بنے ہوئے ہیں۔ اکثر غزلیں طویل ہیں مگر تسلسل کے اعتبار سے تقریباً سب کے سب حسن و خوبی کے بلند ترین معیار پر واقع ہیں۔ (جدید اردو شاعری ص ۱۹۱)

ثاقب۔ آپ کا نام ابو محمد ہے۔ اور تخلص ثاقب۔ کان پور کے رہنے والے ہیں۔ جہاں آپ ۱۸۸۶ء میں پیدا ہوئے۔ ۱۲ سال کی عمر میں شاعری کا شوق پیدا ہوا۔ اور بہت جلد یو۔ پی اور پنجاب میں مشہور ہو گئے۔ "متاعِ درد" آپ کے کلام کا مجموعہ ہے جو ۱۹۲۶ء میں زیورِ طبع سے آراستہ ہوا۔

جگر بریلوی۔ کنور کنہیا لال کے فرزند منشی شام موہن لال المتخلص بہ جگر۔ ۱۸۹۰ء میں بمقام بریلی پیدا ہوئے۔ دس گیارہ سال تک گھر ہی پر اردو۔ فارسی اور انگریزی کی تعلیم حاصل کرتے رہے۔ پھر سکول میں داخل کر دیے گئے۔ تعلیم کے مختلف مراحل طے کرنے کے بعد ۱۹۱۶ء میں بریلی کالج سے بی اے پاس کیا۔ اور نائب تحصیلدار بن گئے۔ اور اسی عہدہ سے قبل از وقت ریٹائر ہو کر خانہ نشین ہو گئے۔ فنِ شعر میں آپ کے استاد مرزا محمد ہادی عزیز لکھنوی تھے۔ آپ کی نظمیں اور مضامین رسالہ زمانہ، کانپور۔ نگار لکھنؤ اور ہمایوں لاہور میں اکثر چھپتے رہتے تھے۔ "اردو ادب" "ہندو ادب" اور رسالہ صحت زبان آپ کی تالیفات ہیں۔ مضامین کے بھی کئی مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ غزلیات، رباعیات اور مثنویاں بھی انھوں نے بہت سی کہی ہیں۔ آپ کی تالیفات اور تصنیفات میں دو کتابوں کو بڑی شہرت حاصل ہوئی ایک "یادِ رفتگاں" جو ایسے ہندو مشاہیرِ ادب کا تذکرہ ہے جن کا انتقال ہو چکا ہے۔ دوسری "بہارِ جاوداں" جس میں موجودہ ہندو ادیبوں اور شاعروں کے حالات ہیں۔

آپ کا جنوری ۱۹۵۶ء کے آخری دنوں میں انتقال ہوا۔

جلیل قدوائی۔ جلیل قدوائی عصر حاضر میں قدیم غزل گو شعراء کے نمائندے ہیں حسرت موہانی کے دوست ہیں اور شاعری میں انہی کے قدم بقدم چل رہے ہیں۔ احسن مارہروی کے شاگرد ہیں۔

راسخ عظیم آبادی۔ شیخ غلام علی نام، راسخ تخلص۔ ۱۱۶۳ھ (۱۷۴۹ء) میں بمقام پٹنہ عظیم آباد پیدا ہوئے۔ ابتدا میں زیا فدوی اور مرزا اشرف سے اصلاح لیتے تھے۔ آخر میں میر تقی میر کی شاگردی کی۔ اپنی جوانی کے زمانہ میں وطن سے نکل کر کلکتہ، فتح گڑھ، دہلی اور لکھنؤ کی خوب سیریں کیں۔ اور ہر جگہ شعر و سخن کے خوب چرچے رہے۔ پھر پٹنہ واپس آ گئے۔ اور وہی مشغلہ یہاں بھی اور شعر کے ساتھ جاری رکھا۔ بہار کے نامور اور مشہور شاعر ہوئے ہیں۔ مؤلف تاریخ ادب اردو کی ان کے متعلق یہ رائے ہے کہ زبان پاکیزہ اور طرز بیان صاف و سادہ ہے۔ ان کے کلام میں سادہ اشعار کے ساتھ رنگین اشعار بھی ملتے ہیں۔ ۱۲۳۸ھ (۱۸۲۲ء) یا ۱۲۴۰ھ (۱۸۲۴ء) میں وفات پائی۔

رسوا۔ نام محمد ہادی، مرزا اور رسوا تخلص۔ آغا محمد تقی کے فرزند۔ ۱۸۵۸ء میں بمقام لکھنؤ پیدا ہوئے۔ پہلے فارسی درسیات کی تکمیل کی۔ پھر ریاضی، اقلیدس، حساب اور علم ہیئت کی تعلیم اپنے فاضل باپ سے پائی۔ لکھنؤ کے مختلف علماء سے عربی پڑھی۔ پنجاب یونیورسٹی سے بی۔ اے کیا۔ امریکہ کی اورینٹل یونیورسٹی سے پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ رڑکی سے اوورسیری کا امتحان پاس کیا اور بلوچستان میں ریلوے کے محکمہ میں ملازم ہو گئے۔ مگر اس نوکری سے علم دوست طبیعت کو کیا مناسبت۔ ایک دفعہ کیمسٹری کی ایک کتاب مل گئی جسے دیکھ کر کیمسٹری کا ایسا شوق دل پر غالب ہوا کہ نوکری سے استعفیٰ دے دیا۔ کوٹھی کا سامان نیلام کر کے گھر آ بیٹھے اور ولایت سے کیمسٹری کے آلات اور کتابیں منگوا کر تجربات شروع کر دیئے۔ علم کا شوق دیکھ کر ایک لوہار کے لڑکے کو اس بات پر پڑھانا منظور کیا کہ وہ اپنی بعض فارغ اوقات میں ان کو تجربات کے لیے دے دیا کرے۔ آخر عمر میں عثمانیہ یونیورسٹی کے دارالترجمہ میں ملازم ہو گئے تھے۔ ۲۱ اکتوبر ۱۹۳۱ء کو انتقال کیا۔ اور اپنے پیچھے اپنی بہت سی تصنیفات بطور یادگار چھوڑ گئے۔ جن میں سے امراؤ جان ادا سب سے زیادہ مشہور ہے۔ جس کا ایک ایڈیشن ادارہ فروغ اردو نے بھی گذشتہ دنوں شائع کیا تھا۔

رسوا کو فارسی، عربی، عبرانی، انگریزی، ہندی اور سنسکرت پر پورا عبور تھا۔ اور وہ اپنی علمی تصنیفات میں ان سب زبانوں سے فائدہ اٹھاتے تھے۔ وہ مغربی اور مشرقی علوم پر حاوی اور منطق، فلسفہ، ریاضی اور ہیئت کے اعلیٰ درجے کے ماہر تھے۔ اسلام اور دانش کے عقائد کا بھی انہوں نے گہرا مطالعہ کیا تھا۔ ۲۵ کے قریب اعلیٰ پایہ کی علمی اور ادبی کتب انہوں نے لکھی ہیں۔ جیسے اعلیٰ درجہ کے شاعر تھے ویسے ہی بلند پایہ ادیب اور انشا پرداز بھی تھے۔ لطف زبان اور شگفتگی بیان کوئی ان کی کتابوں سے سیکھے۔ طبیعت کے نہایت بھولے بھالے۔ سادہ مزاج، تکلف اور تصنع سے دور، صاف دل، مخلص، غیور اور بہت ہی زندہ دل انسان تھے۔ ان کی شہرت بہ نسبت ایک شاعر کے بطور نثر نویس زیادہ ہے۔ علاوہ امراؤ جان ادا کے اختری بیگم، ذات شریف، شریف زادہ، بہرام کی رہائی، خونی بھید، خونی جورو، مثنوی لذت فنا، مثنوی بہار ہند، مثنوی امید و بیم، مثنوی لیلیٰ مجنوں اور کلیات متعدد ہی کی تصانیف ہیں۔ خالص علمی اور سائنٹیفک کتابیں بھی انہوں نے متعدد لکھی ہیں۔

رواںؔ ۔ نام چودھری جگت موہن لال اور تخلص رواںؔ تھا۔ ۱۸۸۹ء میں موضع موہان ضلع اناؤ (یو۔ پی) میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام چودھری گنگا پرشاد تھا۔ ابھی رواںؔ کی عمر ۱۰ سال ہی کی تھی کہ شفیق باپ کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ بڑے بھائی چودھری کنہیا لال نے ان کی تعلیم کا انتظام کیا۔ رواںؔ نے ذہن عالی اور حافظہ بہت اچھا پایا تھا۔ ایم۔ اے اور ایل۔ ایل۔ بی کے امتحانات نہایت امتیاز سے پاس کئے اور وطن ہی میں وکالت کرنے لگے۔ جلد ہی سارے اناؤ میں ان کی لیاقت کا سکہ بیٹھ گیا۔ اور وہ شہر کے مشہور وکلاء میں شمار ہونے لگے۔ فن شعر میں آپ عزیزؔ لکھنوی کے شاگرد ہیں۔ کلام نہایت شگفتہ، مؤثر اور رواں ہوتا ہے۔ سید اعجاز حسین اعجاز ایم اے اپنی تاریخ ادب میں ان کے متعلق یہ رائے ظاہر کرتے ہیں۔

"اُن کی نظمیں کردار کی بلندی کا نہایت عمدہ نمونہ ہیں۔ صاف گوئی و بلند کردار نگاری اُن کی نظموں کی دو نمایاں خصوصیات ہیں۔ واردات حسن و عشق کو جہاں بیان کرتے ہیں معلوم ہوتا ہے کہ خود انہی کے دل پر کیفیت گزر رہی ہے۔ مناظر قدرت کے بیان میں خلوص اور کو نہایت پر اثر انداز میں نظم کرتے ہیں۔ غیر مادی چیزوں پر طبع آزمائی کرتے وقت نہایت بلند مضامین لانے کی کوشش کرتے ہیں۔ نظموں میں عام طور سے صفائی ہے۔ لیکن کہیں کہیں ناہمواری بھی پیدا ہو گئی ہے۔ اکتوبر ۱۹۳۴ء میں بعمر ۴۵ سال انتقال کیا۔ "روح رواں" ان کے کلام کا مجموعہ ہے۔ "رباعیات رواں" ابھی تک شائع نہیں ہوا۔ بڑا رسالہ مرتبہ ہوا چھپی تھیں۔

سراج دکنی ۔ آپ کا نام سید سراج الدین تھا اور سراج تخلص کرتے تھے۔ شاہ سراج دکنی یا سراج اورنگ آبادی کے نام سے مشہور ہیں۔ سادات حسینی سے تعلق رکھتے تھے اور ۱۱۲۷ھ (۱۷۱۵ء) میں مقام اورنگ آباد (دکن) پیدا ہوئے۔ تعلیم اورنگ آباد ہی میں پائی اور مقبول ہیر تقی میرؔ ترین شعر میں سید حمزہ کے شاگرد ہوئے۔ طبیعت پر تصوف کا رنگ بہت غالب تھا اور تمام عمر اسی رنگ میں رنگے رہے۔ شاعری کی ابتدا فارسی اشعار سے ہوئی مگر وہ لکھتے تھے بے پروائی کے باعث لکھتے نہیں تھے۔ اس لیے وہ سب کلام ناپید ہو گیا۔ سید عبدالرحمن چشتی کے ہاتھ پر بیعت کر کے طریقہ چشتیہ میں منسلک ہو گئے تھے۔ نہایت صاحب دل بزرگ اور خوش فکر شاعر تھے۔ اردو کلام قریباً پانچ ہزار اشعار پر مشتمل ہے۔ آخر عمر میں شعر گوئی ترک کر کے ترک باطن کی طرف متوجہ ہو گئے تھے۔ کلام سادہ مگر دل نشین اور پُر اثر ہوتا ہے۔ اور بالعموم تصوف کے رنگ میں ڈوبا ہوا۔ ایک دیوان فارسی اشعار کا اور ایک دیوان اردو کا یادگار چھوڑا۔ فارسی شعراء کے کلام کا ایک نہایت عمدہ انتخاب بھی "منتخب دیوانہا" کے نام سے لیا تھا۔ تصوف پر مشتمل ایک مثنوی "بوستان خیال" بھی لکھی تھی۔ ان کا کلیات انجمن ترقی اردو نے خاص اہتمام سے شائع کیا تھا۔ ۶ اپریل ۱۷۶۳ء مطابق ۴ شوال ۱۱۷۷ھ کو وفات پائی۔

سردار جعفری ۔ علی سردار آپ کا نام ہے اور نام ہی کی مناسبت سے سردار تخلص کرتے ہیں۔ ۱۹۱۳ء میں بمقام ریاست بلرام پور (یو۔ پی) پیدا ہوئے۔ شروع میں لکھنؤ کے مدرسۃ الواعظین میں داخل ہو کر دینی تعلیم حاصل کی۔ مگر طبیعت کو مولویت سے کوئی لگاؤ نہ تھا اس لیے اسے چھوڑ کر بلرام پور کے ہائی سکول میں انگریزی پڑھنے کے لیے داخل ہو گئے۔ ۱۹۳۶ء میں اینگلو عربک کالج دہلی سے بی۔ اے کا امتحان پاس کیا۔ ۱۹۳۸ء میں سبط حسن اور مجاز کے ساتھ لکھنؤ سے رسالہ "نیا ادب" جاری کیا۔ طبیعت میں آزادی کی بے پناہ تڑپ تھی اور سیاسی تحریکوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے تھے اس لیے ۱۹۴۰ء میں گرفتار کر لیے گئے جب

…سے تو بمبئی چلے گئے اور اب تک وہیں قیام ہے۔ علی سردار جعفری موجودہ زمانہ کے چوٹی کے اور کامیاب شاعروں میں سے ہیں۔ بعض نظمیں انہوں نے بڑی پُر زور لکھی ہیں۔ ان کی رومانی شاعری بھی اچھی خاصی بلند ہے۔ اپنی شاعری میں جوش ملیح آبادی اور ڈاکٹر اقبال سے بہت زیادہ متاثر ہیں۔ پرواز، خون کی لکیر اور کشمیر جاگ اٹھا۔ ان کی نظموں کے مجموعے ہیں۔

اصغر سلیم ۔ محمد اصغر آپ کا نام ہے اور سلیم تخلص کرتے ہیں۔ اصغر سلیم کے نام سے مشہور ہیں۔ آپ کی ولادت ۱۵ نومبر ۱۹۱۹ء کو گجرات میں ہوئی۔ گجرات اور لاہور میں تعلیم کی تکمیل کرنے کے بعد لاہور کے محکمہ تعلیم میں ملازم ہو گئے جہاں آپ اسسٹنٹ کی حیثیت سے کام کر رہے ہیں۔

جب آپ قریباً ۱۲ سال کی عمر میں پانچویں جماعت کے طالب علم تھے۔ اسی وقت سے آپ کو شاعری کا شوق پیدا ہوا۔ اس لحاظ سے آپ کی شاعری کی عمر قریباً ۲۵ سال ہے۔ اس تمام عرصہ میں ملک کے مشہور ادبی رسائل میں آپ کا کلام شائع ہو کر خراج تحسین وصول کرتا رہا ہے۔ لاہور کی متعدد علمی اور ادبی مجالس میں بھی آپ سرگرمی سے حصہ لیتے رہے ہیں۔ آپ کی غزلوں کا مجموعہ "متاعِ ہنر" زیر طبع ہے۔

شعلہ ۔ ان کا نام منشی بنواری لال تھا اور شعلہ تخلص کرتے تھے۔ منشی موتی لال ان کے والد کا نام تھا۔ شعلہ ۱۸۶۲ء میں بمقام سہارنپور پیدا ہوئے۔ مگر آبائی وطن حصار تھا۔ بچپنے ہی میں والد کا انتقال ہو جانے سے بڑے ہوتے ہی معاش کی فکر دامنگیر ہو گئی۔ کچھ دنوں علیگڑھ کے محکمہ بندوبست میں نوکری کی۔ پھر ملازمت کی پابندیوں سے اکتا کر وکالت کا امتحان دیا۔ اور علیگڑھ میں وکالت کرنے لگے۔

فن شعر میں منشی بال مکند بے صبر اور غالب کے مشہور شاگرد مرزا تفتہ کے شاگرد تھے۔ آپ کا کلام ۱۹۳۶ء میں آگرہ یونیورسٹی کے ایم اے کے امتحان میں شامل تھا۔ نظموں اور غزلوں کا بہت سا مجموعہ یادگار چھوڑا جو کچھ طبع ہو گیا۔ کچھ نہ ہوا۔ ۱۹۱۰ء میں انتقال ہوا۔

پروفیسر شور علیگ ۔ آپ کا نام منظور حسین ہے اور شور تخلص کرتے ہیں۔ جولائی ۱۹۱۱ء میں بمقام امراوتی (سی پی) پیدا ہوئے۔ وطن میں ابتدائی تعلیم کے بعد علیگڑھ چلے گئے۔ جہاں سے ۱۹۳۶ء میں ایم اے، ایل ایل بی ہو کر فارغ ہوئے۔ ۱۹۳۹ء میں ناگپور یونیورسٹی میں صدر شعبہ اردو و فارسی مقرر ہوئے اور تقسیم ملک تک اس عہدہ پر فائز رہے۔ ازاں بعد پاکستان آ کر مختلف کالجوں میں تعلیمی خدمات انجام دیتے رہے۔ آج کل گورنمنٹ کالج لائلپور میں ہیں۔ شاعری کا آغاز علیگڑھ کی علمی فضا سے ہوا۔ جو عمر اور وقت کے ساتھ بڑھتا گیا۔ آپ پاکستان کے خوش فکر شعراء میں ایک ہیں۔

عظیم قریشی ۔ محمد عظیم آپ کا نام ہے۔ عظیم تخلص کرتے ہیں اور عظیم قریشی کے نام سے پکارے جاتے ہیں۔ والد کا نام احسن قریشی ہے جو خود بھی شاعر تھے۔ یعنی عظیم صاحب کو شاعری ورثہ میں ملی ہے۔ آپ کا آبائی وطن قلعہ پھلور (مشرقی پنجاب) ہے مگر آپ

۲۴ مارچ ۱۹۱۸ء کو کشمیر کی حسین و جمیل وادی اننت ناگ میں پیدا ہوئے۔ ہوش انبالہ میں سنبھالا۔ تعلیم لاہور میں پائی اور یہیں جنرل پوسٹ آفس میں ملازمت کا آغاز ہوا۔ جو اس وقت تک جاری ہے۔ بچپن ہی سے شعر و شاعری کا شوق پیدا ہو گیا تھا۔ اور بارہ سال کی عمر میں پہلی غزل کہی تھی۔ اگرچہ آپ کی شاعری کی ابتدا غزل سے ہوئی مگر آپ نے نظم کے میدان میں شہرت حاصل کی۔ مختصر نظم لکھنے میں آپ کو خصوصیت حاصل ہے۔ یعنی ان کی اکثر نظمیں ایک ایک دو شعروں پر مشتمل ہیں۔ "رادھا کے گیت" اور "آج کے نغمے کل کے شعلے" اُن کی نظموں کے دو مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ غزلیات کا دیوان زیر طبع ہے۔

نظم کے علاوہ نثر کے میدان میں بھی آپ کا اشہبِ قلم تیز دوڑتا ہے۔ چنانچہ "راہب کے محبت نامے" ان کی دلچسپ کتاب شائع ہو چکی ہے۔ اور دوسری "جب جینیس مسکراتا ہے" عنقریب چھپنے والی ہے۔

کلیم۔ آپ کا نام مکین احسن اور تخلص کلیم ہے۔ ۱۰ نومبر ۱۹۲۲ء کو ریاست محمود آباد (یو۔پی) میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم محمود آباد سیتاپور اور لکھنؤ میں پائی۔ گورنمنٹ کالج الٰہ آباد سے بی۔اے کا امتحان دیا۔ اور ایم۔اے کی ڈگری بھی ۱۹۴۳ء میں الٰہ آباد یونیورسٹی سے حاصل کی۔ تعلیم سے فراغت کے بعد حکومت ہند کے محکمہ اطلاعات و نشریات میں ملازم ہو گئے۔ مگر ادبی ذوق اور علمی شوق کا پورا ہونا اس محکمہ میں ممکن نہ تھا اور طبیعت کو شاعری اور صحافت سے خاص لگاؤ تھا۔ اس لیے ایک ہی سال بعد اس ملازمت کو چھوڑ کر روزنامہ "قومی آواز" لکھنؤ میں چلے گئے اور تقسیم ملک تک اسی میں کام کرتے رہے۔ تقسیم کے بعد لاہور آ گئے۔ چونکہ طبیعت کو اسی پیشہ سے مناسبت اور دلچسپی تھی۔ لہٰذا یہاں آ کر بھی اسی کو اختیار کیا۔ کافی عرصہ تک روزنامہ "ملت" لاہور میں کام کرتے رہے۔ اور آج کل روزنامہ "نوائے وقت" کے شعبہ ادارت سے منسلک ہیں۔

آپ کی شاعری کا آغاز ۱۹۳۶ء سے ہوا۔ اس فن میں کسی کے باقاعدہ شاگرد نہیں مگر علامہ اقبال، مولانا سہیل، ڈاکٹر ممتاز اور فراق گورکھپوری کے کلام سے بہت زیادہ متاثر ہیں۔ احباب میں سے مجروح سلطانپوری کے اشعار آپ کو خاص طور پر پسند ہیں جہاں تک معلوم ہے آپ کا کوئی مجموعہ کلام اب تک شائع نہیں ہوا۔

مائل دہلوی۔ "مجموعہ نغز" میں ان کا نام مرزا محمد یار بیگ لکھا ہے اور تخلص مائل ہے۔ یہ نہایت صاحب حیا، بہت بااخلاق، متواضع، منکسر المزاج، اعلیٰ تعلیم یافتہ اور حلیم الطبع شخص تھے۔ فن شعر میں ان کو میاں شکیبا، گمش جرأت سے تلمذ تھا۔ اسی تخلص کے ایک شاعر دہلی ہی میں اور گزرے ہیں۔ جن کا نام میر محمدی شاہ تھا۔ یہ میاں قیام الدین علی قائم۔ استاد میر محمد علی آشفتہ اور محمد نصیر الدین نصیر کے شاگرد تھے۔ حکیم ابو القاسم میر قدرت اللہ قاسم اپنے تذکرہ مجموعہ نغز میں ان کے متعلق لکھتے ہیں۔ "بزیور علم و حیا آراستہ و بحلیہ ہنر و فن پیراستہ۔ بسیار مرد بیشانہ و آزادانہ ایام بسر می بُرد۔ در ۱۲۲۱ھ با شاہ عالم کے زمانہ میں دہلی سے مرشد آباد چلے گئے تھے۔

مجنوں گورکھپوری۔ احمد صدیق نام اور مجنوں تخلص ہے۔ ۱۹۰۴ء میں بمقام موضع پلدہ ضلع بستی (یو۔پی) میں

پیدا ہوئے۔ ایف۔ اے کا امتحان مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے بی۔ اے کا سینٹ اینڈریوز کالج گورکھپور سے پاس کیا۔ اسلامیہ ہائی سکول میں مدرس ہو گئے۔ ۱۹۲۳ء میں آگرہ یونیورسٹی سے ایم۔ اے کیا۔ پھر علی گڑھ اور گورکھپور کے کالجوں میں پروفیسر رہے۔ اول درجے کے مترجم، مشہور افسانہ نگار، اور مقبول شاعر ہیں۔ آپ کی تصنیفات میں سے بعض یہ ہیں۔ سالی۔ خواب و خیال۔ سمن پوش۔ افسانہ (فن افسانہ نگاری کی تاریخ) شوپنہار۔ ہندوستان کی بہادر عورتیں، مجنوں کے افسانے۔

مہر دہلوی۔ منشی سورج نرائن نام، مہر تخلص۔ اور وطن دہلی تھا۔ جہاں کے ایک معزز کائستھ خاندان میں آپ کی ولادت ہوئی۔ بی۔ اے کی ڈگری آپ نے گورنمنٹ کالج لاہور سے لی اور محکمہ تعلیم سے منسلک ہو گئے۔ جہاں آپ مدت دراز تک راولپنڈی اور دہلی میں انسپکٹر تعلیمات رہے۔ کرنل ہالرائڈ ڈائرکٹر سررشتہ تعلیمات پنجاب کے زمانہ میں ٹیکسٹ بک کمیٹی میں بھی رہے۔ بچوں کے لیے درسی کتب بھی آپ نے محکمہ کی طرف سے لکھیں۔

شاعری کا شوق بچپن سے تھا۔ سب سے پہلے ماہوار رسالہ "کائستھ متر" میں آپ کی نظمیں چھپیں۔ اس کے بعد رسالہ زمانہ کانپور میں بھی آپ اپنا کلام بھجواتے رہے۔ اپنے پیر و مرشد مہاتما شیو برت لال کے رسالہ "سادھو" کو آپ ہی ایڈٹ کرتے تھے اور اس میں اپنی نظمیں بھی شائع کرتے تھے۔ آپ کی نظموں میں تصوف کا رنگ بہت غالب ہے جسے سنسکرت میں ویدانت کہتے ہیں۔ آپ کی تمام نظمیں پاکیزہ خیالات اور اخلاق و موعظت سے بھری ہوئی ہیں۔ بچوں کے لیے بھی آپ نے بکثرت نظمیں لکھی ہیں۔ ۱۹۲۳ء میں آپ کا انتقال ہو گیا۔ آپ کی نظموں کا مجموعہ کلام مہر کے نام سے چھپ چکا ہے۔ بچوں کے لیے جو نظمیں تھیں وہ دو علیحدہ حصوں میں شائع ہوئی ہیں۔

نشتر جالندھری۔ آپ کا نام محمد عبدالحکیم خاں ہے اور نشتر تخلص کرتے ہیں۔ ۱۸۹۶ء آپ کا سال پیدائش ہے اور مقام ولادت میانوالی جو کہ ضلع جالندھر کے مضافات میں ایک مشہور موضع ہے۔ یہ گاؤں آپ ہی کے بزرگوں کا آباد کیا ہوا ہے جو حضرت اورنگ زیب عالمگیر رحمۃ اللہ علیہ کے عہد حکومت میں افغانستان سے یہاں آئے تھے۔

نشتر نے ابتدائی تعلیم شاہ کوٹ، نکودر اور جالندھر میں پائی۔ پھر اپنے بھائی مولوی عبدالحفیظ کے پاس کوئٹہ چلے گئے۔ جہاں انٹرنس پاس کرنے کے بعد وہیں ایک اسلامیہ سکول کے صدر مدرس مقرر ہو گئے۔ پھر اردو ٹیچر شپ کا امتحان پاس کر کے ایک فوجی کالج میں تعینات ہو گئے۔

آپ کی صحافتی زندگی کا آغاز روزنامہ وکیل امرتسر سے ہوا جس کے بعد لاہور آ کر تہذیب النسواں، پھول، زمیندار، انقلاب، ادیب، دلگداز، پیام ادب اور اخبار حمایت اسلام میں کام کرتے رہے۔ اور مختلف پبلشرز کے لیے درسی کتب لکھتے رہے۔ ۱۹۲۳ء میں منشی فاضل کا امتحان پاس کیا۔ دس سال کی عمر سے شاعری کا شوق پیدا ہوا۔ اس فن میں نظم طباطبائی کو اپنا استاد بنا دیا۔ پاکستان کے غزل گو شعرا میں خاصے مشہور ہیں۔ نہایت خلیق، متواضع اور سادہ مزاج رکھنے والے بزرگ ہیں۔ غزل کے علاوہ تمام اصناف سخن پر حاوی ہیں۔

ن۔م۔ راشد۔ جنجوعہ خاندان کے ایک معزز فرد ہیں۔ ان کے والد ڈسٹرکٹ انسپکٹر آف سکولز تھے۔ نام نذر محمد۔ تخلص راشد۔ عام طور پر ن۔م۔ راشد کے نام سے مشہور ہیں۔ یکم اگست ۱۹۱۰ء کو اکال گڑھ ضلع گوجرانوالہ میں پیدا ہوئے۔ تاریخی نام خضر محمد ہے۔ انٹرنس گورنمنٹ ہائی سکول اکال گڑھ سے پاس کیا۔ ایف۔ اے لائلپور کالج سے اور گورنمنٹ کالج لاہور سے ۱۹۳۲ء میں ایم۔ اے کیا۔ کچھ دنوں تک ماہنامہ نخلستان ملتان کو اور ایک سال رسالہ شاہکار لاہور کو ایڈٹ کیا۔ ملتان کمشنری میں کلرک رہے۔
۱۹۳۹ء میں آل انڈیا ریڈیو میں ملازم ہوئے۔ تقسیم ملک کے بعد ریڈیو پاکستان سے منسلک ہو گئے۔ اس سلسلہ میں ۱۹۵۲ء میں امریکہ بھی گئے تھے۔ ان کی نظموں کے دو مجموعے ایک "ماورا" اور دوسرا "ایران میں اجنبی" شائع ہو چکے ہیں۔ پاکستان کے بلند پایہ شعراء میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ جیسے کہ جدید نظم آزاد کے تو راشد گویا موجد ہیں۔ جس کی تقلید اردو کے دوسرے شعراء نے بھی کی۔

---

(۲)

محمد عبداللہ قریشی

آباد۔ مرزا مہدی حسن خاں نام۔ لکھنؤ کے رہنے والے۔ جعفر خاں کے بیٹے اور ناسخ کے ممتاز شاگردوں میں تھے۔ ۱۲۲۳ھ میں پیدا ہوئے۔ نواب فرخ آباد سے قرابت تھی۔ زندگی فراغت سے بسر کی۔ بہت پرگو اور مشاعروں کے شائق تھے۔ عبدالغفور نساخ تذکرہ سخن شعراء میں لکھتے ہیں کہ ان کے تین واسوخت اور سراپا میں غزل کا ایک ایک دیوان ہے۔ ایک مثنوی ان کے دو جزکی لائی بھی جاتی ہے۔ نگارستان عشق ان کا دیوان مشہور ہے لیکن نایاب ہے۔ بہارستان ایک مجموعہ شائع ہوا ہے جس میں ناسخ و آتش و آباد کی ہم طرح غزلیں ردیف وار درج ہیں۔ ان کا کلام ناسخ کے کلام سے ملتا جلتا ہے مگر مضمون آفرینی میں بہت پیچھے ہیں۔

احسن لکھنوی۔ مہدی حسن نام۔ احسن تخلص۔ شوق لکھنوی کے نواسے اور مرزا داغ دہلوی کے شاگرد تھے۔ عمر کا بیشتر حصہ بمبئی میں تمام رہا۔ ناول اور ڈرامے لکھنے میں شہرت حاصل کی۔ آپ کے کلام میں جوش اور درد اور سوز پایا جاتا ہے۔

احمد۔ خان احمد حسین خان نام۔ خان بہادر ڈاکٹر محمد حسین خان آنریری مجسٹریٹ و بانی میڈیکل کالج لاہور کے صاحبزادے تھے۔ ۱۸۶۶ء میں پیدا ہوئے۔ تعلیم ختم کرنے کے بعد سول میں ملازم ہو گئے۔ ایک عرصے تک سب رجسٹرار رہنے کے بعد ریٹائر ہوئے۔ پنشن پانے کے بعد آپ نے رسالہ شباب اردو لاہور سے جاری کیا۔ اور ایک دو سال تک جاری رہا۔ گورنمنٹ کی طرف سے انعام بھی ملا۔ بہت سے افسانے اور ناول لکھے اور شیکسپیئر کے ڈراموں کا اردو ترجمہ کیا۔ شعر گوئی کا ذوق نہایت شائستہ تھا۔ آپ کے کلام کا مجموعہ چھپ چکا ہے۔ یکم جنوری ۱۹۴۵ء کو لاہور میں انتقال ہوا۔

اختر۔ محمد صادق خاں نام۔ بنگال کے رہنے والے تھے۔ گھر سے ترک وطن کر کے لکھنؤ آ گئے تھے۔ مرزا تقی کے شاگرد تھے۔ اردو

اور فارسی دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ اور شعبدہ بازی میں بھی کمال رکھتے تھے۔ ان کی شاعری کا اس قدر شہرہ ہوا کہ [illegible] اور صفدر [illegible] کو ملک الشعرا کا خطاب دیا۔ انہوں نے سخن اور انشا سے لے کر وزیر اور حیا تک کا زمانہ دیکھا اور بہت سی کتابیں [illegible] مضامین کا تنوع، بندش کی چستی، فارسی ترکیبوں کی دل آویزی اور بیان کی شائستگی ان کی شاعری کی چند خصوصیات ہیں۔ انہوں نے [illegible] میں انتقال کیا۔

اختر اورینوی ۔ اختر احمد نام، اختر تخلص ہے۔ بی۔ اے۔ کالج کے فارغ التحصیل اور پٹنہ کالج میں پروفیسر ہیں۔ صوبہ بہار کے نوجوان ادیبوں اور شاعروں میں آپ کا ممتاز درجہ ہے۔ کلام میں صفائی پائی جاتی ہے۔

ازل ۔ ابو الاعجاز منشی عبد المجید ازل لاہور کے ایک شریف راعی خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ بچپن ہی سے شعر کہتے تھے۔ [illegible] سے [illegible] تک مرزا داغ دہلوی سے اصلاح لی جس سے سلاست زبان اور صفائی بیان کی خوبی آپ کے کلام میں پیدا ہو گئی۔ آپ کی غزلیں عام طور پر استادانہ رنگ میں ہوتی تھیں۔ [illegible] میں انتقال ہوا۔

اسد ۔ سلیمان خاں نام، نواب خطاب، نواب محبت خاں مغفور کے نواسے، اسیر کے شاگرد اور لکھنؤ کے رہنے والے تھے۔ خواجہ آتش کا زمانہ دیکھا تھا، رند اور صبا کے ہمعصر تھے۔ کچھ دنوں کے لیے ٹونک چلے گئے تھے۔ نواب صاحب ٹونک اور ان کے صاحبزادے ان کے تلامذہ میں داخل ہوئے۔ پھر وہیں قیام کر لیا۔ اسیر کے شاگردوں میں ان کا رنگ خاص ہے۔ زبان بہت صاف، ترکیب ہلکی پھلکی، بندش میں مضامین پیدا کرتے ہیں۔

اشک رامپوری ۔ سید احمد علی خاں نام، اچھے صاحب عرف تھا۔ نواب یوسف علی خاں ناظم والئ رامپور کی اولاد سے تھے۔ جوانی میں بنے ٹھنے رہتے تھے۔ بڑی آن بان، بڑے ٹھاٹ باٹ اور کر و فر سے رہتے تھے۔ چودہ برس انگلستان اور جرمنی میں گزارے۔ انقلاب زمانہ سے طبیعت [illegible] فقیر گوشہ نشین ہو گئے۔ تقسیم پاک و ہند کے بعد گولڑہ (راولپنڈی) کی خانقاہ میں رہتے تھے۔ پھیپھڑوں میں کینسر ہو گیا تھا [illegible] حرکت قلب بند ہو گئی۔ اس طرح ۱۹۵۵ء کے آخر میں یہ بڑا شاعر دنیا سے اٹھ گیا۔

اظہر امرتسری ۔ خدا بخش نام، اظہر تخلص، امرتسر وطن تھا۔ [illegible] میں پیدا ہوئے۔ تعلیم باقاعدہ حاصل نہ کر سکے لیکن کثرت مطالعہ سے عربی، فارسی اور اردو میں اتنی استعداد پیدا کر لی کہ شعر کہنے لگے۔ تحریک خلافت کے بعد سیاست میں دخل دینے لگے۔ کئی بار قید ہوئے۔ راولپنڈی سے ہفت روزہ ترجمان سرحد جاری کیا۔ ان کی نثر میں مولوی محمد حسین آزاد کے استعارات و تشبیہات اور مولانا ظفر علی خاں کا سا طنز پایا جاتا تھا۔ عرصہ دراز تک زمینداری اور [illegible] کے فرائض انجام دیئے اور افسانے لکھے۔ نظمیں بھی لکھتے تھے اور غزلیں بھی۔ کلام بلند، زبان فصیح اور اسلوب نیا اچھوتا تھا۔ دسمبر [illegible] میں ۶۰ سال کی عمر پا کر وفات پائی۔

اعظم ۔ مرزا اعظم علی نام ، الٰہ آباد کے رہنے والے ، منشی محمد رضا کے فرزند اور آتش کے شاگرد تھے ۔ آگرہ میں عرصہ تک سرکاری ملازم رہے ۔ پنشن لے کر الٰہ آباد گئے تو خانہ نشین ہو گئے ۔ ۱۸۶۹ء میں ان کا دیوان چھپا ۔ اب نایاب ہے ۔ اعظم نے آتش کے رنگ کو خوب نبھایا ہے ۔ بے ساختگی اور لطف زبان ایک ایک شعر میں نمایاں ہے ۔

بیتاب ۔ سنتوکھ رائے نام ، قائم چاند پوری کے معاصر تھے ۔ ان کے کلام میں تخیل ، سوز و گداز اور بے ساختگی پائی جاتی ہے ۔ (جواہر سخن) ۔

بیدل ۔ (پروفیسر) عبدالمنان نام ، بیدل تخلص ہے ۔ صوبہ بہار کے نغز گو شاعر ہیں ۔ کلام میں رنگینی پائی جاتی ہے ۔ زبان صاف اور سلیس ہے ۔ فارسی ادب پر بھی آپ کو قدرت حاصل ہے ۔ نظم کے علاوہ اردو ادب کے ایک بلند پایہ نثر نویس بھی ہیں ۔

پیام شاہجہانپوری ۔ نام محمد یمین خاں ۔ تخلص پیام ہے ۔ پیدائش ۹ اگست ۱۹۲۳ء کو شاہجہانپور کے ایک پٹھان رئیس خاندان میں ہوئی ۔ چھ سال کی عمر میں قرآن مجید ختم کیا ۔ اس کے بعد اسکول میں داخل ہوئے اور [illegible] انگریزی اور فارسی کی تحصیل کی ۔ کتب بینی کا شوق ابتدا سے رہا ہے ۔ قیام پاکستان سے پہلے آرڈیننس کلوتھنگ فیکٹری میں کلرک تھے ۔ تقسیم کے بعد لاہور آ گئے ۔ پھر عرصہ آزاد کشمیر فورسز میں ملازم رہ کر فوجی خدمات انجام دیں ۔ کشمیر سے واپس آ کر ادبی زندگی شروع کی ۔ شعر و شاعری کا شوق تو شاہجہانپور ہی سے تھا ۔ ابتداءً ملک حضرت دل شاہجہانپوری کی شاگردی اختیار کر کے شاہجہانپور کے علاوہ بریلی ۔ بدایوں ۔ بہار پور [illegible] ۔ مرادآباد اور دہلی وغیرہ کے مشاعروں میں شریک ہو کر داد سخن دے چکے تھے ۔ پاکستان آ کر ان کی نثر نگاری کی ابتدا ہوئی ۔ مختلف اوقات میں ہفت روزہ [illegible] اور [illegible] لاہور میں ادارت کے فرائض انجام دیئے ۔ آج کل ہفت روزہ حمایت اسلام کے ایڈیٹر اور ماہنامہ معاشرتی بہبود کے مدیر اعزازی ہیں ۔ تصنیف و تالیف کا بھی شوق ہے ۔ تاریخ اسلام [illegible] صدی کی اردو نثر ۔ جنوبی ہند میں اردو ۔ میخانہ عجم ۔ روح [illegible] عائلی اور تعمیری معاملات کا مجموعہ ، قلم حسین ۔ [illegible] خلافت وغیرہ کتابیں شائع ہو چکی ہیں ۔ شاعری میں غزل ان کی محبوب صنف ہے ۔ کلام میں سوز و گداز اور تیکھا پن ہے ۔ [illegible] پامال اور فرسودہ خیالات سے اکثر دامن بچاتے ہیں ۔

عبدالرشید تبسم ایم اے ۔ آپ کا تعلق ضلع گورداسپور کے ایک علمی خاندان سے ہے ۔ ۲۹ جون ۱۹۱۳ء کو پیدا ہوئے ۔ [illegible] ہائی سکول گورداسپور سے میٹرک اور گورنمنٹ کالج لاہور سے بی اے پاس کیا اور انعامات حاصل کئے ۔ پنجاب یونیورسٹی سے ایم اے کی ڈگری لی ۔ کالج سے فارغ ہو کر اخبار نویسی کا پیشہ اختیار کیا ۔ بعض روزانہ اخبارات اور ماہوار رسالوں کی ادارت کی ۔ ۲۵ اپریل ۱۹۴۱ء کو [illegible] حکومت ہند کے محکمہ دفاع میں ملازم ہو کر گیارہ سال دہلی ۔ سیالکوٹ ۔ احمد آباد ۔ بمبئی ۔ شاہجہانپور اور لاہور میں متعین رہے ۔ ۱۹۵۲ء میں استعفیٰ دے کر دو سال ادارہ ثقافت اسلامیہ کے ریسرچ افسر کی حیثیت سے ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم کی صحبت سے فائدہ اٹھایا ۔ یہاں مولانا روم کی فارسی تصنیف [illegible] کا اردو میں ترجمہ بھی کیا جو ملفوظات رومی کے نام سے چھپ چکا ہے ۔ گذشتہ [illegible] سال سے ہفت روزہ [illegible] کے ایڈیٹر ہیں ۔ ایک ناول [illegible]

اور مضامین کی تین کتابیں بھی شائع ہو چکی ہیں۔ افسانوں کا ایک مجموعہ زیر طبع ہے۔ غزلیں اور نظمیں بھی کہتے ہیں۔ زبان کے [illegible] عبدالمجید سالک سے مشورہ کرتے ہیں۔

تشنہ بلند شہری۔ حافظ محمد سعادت علی تشنہ بلند شہر کے رہنے والے اور نواب مرزا داغ دہلوی کے شاگرد تھے۔ آپ بلند شہر کے مقام پر ایک پٹھان سپاہی پیشہ خاندان میں پیدا ہوئے۔ کچھ عرصہ سوداگری کرتے رہے پھر ایک برس کے قریب دکن میں رہے۔ آخر کلکتہ میں مقیم رہے۔ خوش الحانی اور عشق کی وجہ سے شہرت بھی رکھتے تھے۔ آخری عمر میں بینائی جاتی رہی تھی۔ ان کا دیوان طبع ہو گیا تھا مگر اب نایاب ہے۔ تشنہ نے ۱۹۱۰ء میں انتقال کیا۔ آپ کے بیٹے ضمیر الدین ضمیر استاد ظہیر دہلوی کے شاگرد تھے۔ تشنہ بالکل اپنے استاد کے رنگ میں شعر کہتے تھے۔ سادگی، بندش کی چستی اور زبان کی شیرینی ان کی غزلوں کی خصوصیات ہیں۔

تعشق۔ سید مرزا نام، لکھنؤ کے رہنے والے، ناسخ کے شاگرد تھے۔ مگر غزلوں میں ان کا رنگ سب سے نرالا تھا۔ زبان کے ساتھ طرز ادا، بے ساختگی کی خوبی اور سوز و گداز کے مضامین اس طرح ادا کرتے ہیں کہ دل کھنچ جاتا ہے۔

تمنا عمادی مجیبی (پھلواری) محی الدین نام، تمنا تخلص ہے آپ عظیم آباد کے بڑے پختہ گو شاعر ہیں۔ کلام میں پختگی اور متانت پائی جاتی ہے۔ بہار کے لئے آپ کا دم غنیمت ہے۔

ثاقب زیروی۔ محمد صدیق نام ہے اپریل ۱۹۱۹ء میں وادی ستلج کے ایک گاؤں ماہی والا تحصیل قصور میں پیدا ہوئے لیکن دو سال بعد اراضی کے تنازعات کے نتیجے میں سارا خاندان زیرہ ضلع فیروزپور میں منتقل ہو گیا جس سے نسبت خصوصی کے باعث ۱۹۴۷ء میں باہر نکال دئے جانے کے باوجود اب تک زیروی کہلاتے ہیں۔ وہیں ۱۹۳۶ء میں انٹرنس پاس کیا۔ پھر کلرکی، نظامت، سب انسپکٹری اور نہ جانے کیا کیا کچھ حصول معاش کی خاطر کیا۔ لیکن شعر گوئی فطری رجحان سے لے کر ہمیشہ ہم رکاب رہی۔ ثاقب تخلص آپ کی والدہ کا عطا کیا ہوا ہے ۱۹۴۳ء کے اوائل میں لاہور آ کر روزنامہ انقلاب کے عملہ میں شامل ہوئے۔ ۱۹۴۷ء کے وسط میں زیرہ لوٹے تو تعصبات تقسیم کے جنگل میں جا پہنچے تمام انسان ہندو، مسلم اور سکھ بن چکے تھے۔ کوئی جائے پناہ نہ تھی۔ اس ہر کے سمندر میں ڈوب کر ساڑھے چودہ میں سے صرف ۶ افراد کے ساتھ لاہور پہنچے۔ کچھ عرصہ روزنامہ احسان میں رہ کر جہاں گشت کے نام سے "مطالبات زیبی" کہتے رہے۔ ساتھ ہی ساتھ پرائیویٹ طور پر بی اے تک تعلیم مکمل کی۔ اس کے بعد ڈیڑھ دو سال مختلف جرائد و رسائل میں کام نویسی کرنے کے بعد ہفت روزہ "لاہور" جاری کیا جو اب تک کامیابی سے چل رہا ہے۔

۱۹۵۱ء سے قبل قومی منظومات کے تین مجموعے "ہاے نغمہ" "ماہ کامل" "اشعار خسروی" شائع ہوئے۔ ۱۹۵۵ء میں ادارہ پنجابی ثقافت نے ثاقب کی مثنوی کا ایک ایڈیشن اس بار اس شائع کیا۔ اور سب پیار حاصل کر گئے۔ شعبہ ثاقب ——— زیبائیات ہے۔ غزل میں ان کا اپنا رنگ ہے۔ اور بہت خوب ہے۔

جالب - سید بشارت علی نام اور جالب تخلص تھا۔ دہلی کے رہنے والے اور داغ کے شاگرد تھے۔ نہایت پختہ مغز اخبار نویس تھے بہت عرصہ ہمدرد، پیسہ اخبار کے ایڈیٹر رہے۔ معلومات کے لحاظ سے چلتی پھرتی انسائیکلوپیڈیا سمجھے جاتے تھے۔ آخری عمر میں لکھنؤ جا کر ہفتہ وار ہمدم اور روزانہ اخبار ہمدم کے ایڈیٹر ہو گئے تھے۔ بعد میں اپنا اخبار ہمت جاری کر لیا تھا۔ قریب ساٹھ ستر برس کی عمر پا کر جولائی ۱۹۳۰ء میں فوت ہوئے

جگر بسوانی - نام حکیم محمد امتیاز علی تخلص جگر تھا۔ آپ کے والد شیخ امیر علی خاں جدا حضرت آتش لکھنوی کے شاگرد تھے۔
محرم ۱۲۹۲ھ بمطابق ۱۸۷۵ء بسواں ضلع سیتاپور (اودھ) میں پیدا ہوئے فارسی کی تکمیل کے بعد اسکول میں انگریزی کی تعلیم حاصل کرنے کے لئے بھیجے گئے۔ لکھنؤ میں انٹرنس کا امتحان پاس کیا۔ ۱۸۹۶ء میں رامپور جا کر حضرت امیر مینائی سے شرف تلمذ حاصل کیا۔ جہانگیر آباد کے راجہ شاد علی خاں آپ کے خاص قدردان تھے۔
۱۸۹۷ء میں تجارت شروع کی لکھنؤ میں ان کا کاروبار خوب چلا۔ لیکن ۱۹۰۸ء میں مستقل طور پر بمبئی کاروبار کرنے کی نیت سے چلے گئے مگر طرز معاشرت پسند نہ تھی۔ اس لئے ترقی کی بیل فسردہ ہو کر رہ گئی۔ ۱۹۱۲ء میں وطن واپس آ گئے۔ کلکتہ بھی تشریف لے گئے۔ لیکن وہاں بھی کام نہ چلا۔

آپ کی شاعری میں قدیم رنگ نمایاں ہے۔ دیوان ۱۹۲۳ء میں طبع ہو چکا ہے۔
۱۹۵۸ء میں وفات پائی۔ اور اپنے وطن بسواں ہی میں سپرد خاک ہوئے۔

جگر بہاری - سید شاہ نصیر الدین نام، جگر تخلص ہے۔ شاعری میں شاہ شمیم سے تلمذ حاصل ہے۔ یہ صوبہ بہار کے دردمند شاعر ہیں۔ ان کی زندگی سرتاپا حسرت اور درد و الم کی تصویر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے ہر شعر میں درد اور تڑپ ہے۔

جمیل مظہری - آپ صوبہ بہار کے مقبول شاعر اور ادبی دنیا میں ممتاز حیثیت رکھتے ہیں۔ قیام زیادہ تر کلکتہ میں رہتا ہے۔ حضرت لکھنوی مرحوم سے شرف تلمذ حاصل ہے۔ (بہار اور اردو شاعری ص ۱۳۲)

جوش - احمد حسن خاں نام، نواب خطاب، اچھے عرف عام، کلکتہ کے رہنے والے تھے۔ ابتدا سے طبیعت شاعری کی طرف راغب تھی۔ پہلے نواب عاشق علی خاں عاشق اور راسخ مرحوم سے مشورۂ سخن کیا۔ آخر میں امیر کے شاگردوں میں داخل ہوئے۔ مگر راسخ اور امیر دونوں سے مختلف رنگ ہے۔ غزل میں سلاست اور روانی کے ساتھ درد بھی ہے۔ انداز بیان میں تاثیر اور دلکشی ہے۔
۱۲۴۲ھ میں پیدا ہوئے اور ۱۳۰۳ھ میں وفات پائی۔

جوشش - شیخ محمد روشن نام، جسونت سنگھ ناگر کے داروغہ تھے عظیم آباد میں کوئی وطن تھا۔ خواجہ میر درد کے ہم عصر ہیں لیکن ان کا کلام درد کی خصوصیات سے خالی ہے۔ بہرحال اچھے رنگ میں الجھتے ہیں۔ ان کے کلام میں خاص طرح کی چاشنی موجود ہے۔

جوہر۔ ادھو رام نام، جوہر تخلص، لالہ جواہر لال صاحب کے بیٹے، فرخ آباد کے رہنے والے، منیر شکوہ آبادی کے شاگرد، مستند اور قادر الکلام شاعر تھے۔ ایک دیوان یادگار ہے۔ چودھویں صدی ہجری کے شروع میں وفات پائی۔ کلام دلچسپ، صاف اور شستہ بے تکلف لکھتے ہیں۔ معاملہ بندی ان کا خاص رنگ ہے جو جدت سے خالی نہیں (خمخانۂ جاوید ج ۲ ص ۲۹۰، جواہر سخن جلد ۴ ص ۱۳۹)

جوہر۔ جوہر سنگھ نام، جوہر تخلص، منشی جگادر سنگھ واقف کے بیٹے، لکھنؤ کے رہنے والے، قوم کے کائستھ اور راجا لال جی کے حقیقی بھتیجے تھے جو امجد علی اور واجد علی شاہ کے زمانے میں فوج کے بخشی تھے۔ فدا علی خاں ناطق اور خواجہ وزیر سے اصلاح لیتے تھے۔ (سخن شعرا ص ۱۱۸ خمخانۂ جاوید ج ۲ ص ۲۱۲) اور مرزا غالب کے شاگرد رشید تھے۔ اردو کے پانچ دیوان سے یادگار ہیں۔ غالباً ۱۳۳۲ھ میں وفات پائی۔ زبان کی خوبی اور سلاست کے علاوہ کلام میں تصوف غالب ہے۔ اکثر جگہ مسئلہ وحدت الوجود کو تغزل کے مقبول رنگ میں بیان کیا ہے۔ (جواہر سخن جلد ۴ صفحہ ۱۸۲)۔

جنوں۔ علی محمد خاں نام، نواب سراج الدولہ سردار جنگ خطاب، فیض آباد کے رئیس تھے۔ ان کے والد نواب حشم الدولہ عمدۃ الملک مرزا باقر علی خاں بہادر فتح جنگ مشہور تھے، دادا روہیلکھنڈ کے صوبیدار تھے۔ جنوں نے ابتدا میں آتش سے مشورۂ سخن کیا۔ آتش کی وفات کے بعد اسیر کو اپنا کلام دکھایا۔ ان کے دو دیوان سراج النظم اور مصباح النظم کے نام سے چھپے۔ دونوں دیوان غزلوں کے مجموعے ہیں۔ کلام میں شان و شوکت زیادہ ہے۔

حامی۔ پیر وزیر علی شاہ حامی ہمارے عہد کے مشہور علم دوست بزرگ پیر غلام دستگیر نامی کے بڑے بھائی اور اصلاح کے شاگرد تھے، آپ غزلیں، نظمیں، قصیدے، مرثیے، قطعے اور رباعیاں سب ہی کچھ کہتے تھے مگر آخری عمر میں نعتوں کے سوا سب کچھ چھوڑ دیا تھا۔ آپ نے دو دیوان، ایک غزلوں کا اور دوسرا نعتیہ اپنی یادگار چھوڑے ہیں، نعتیہ دیوان چھپ چکا ہے مگر غزلوں کا غیر مطبوعہ ہے۔ دسمبر ۱۹۳۰ء میں بعمر ساڑھے ترپن سال فوت ہوئے۔

حرماں خیر آبادی۔ سعید احمد نام، حرماں تخلص ہے۔ ولادت ۱۹۱۰ء میں خیر آباد میں ہوئی۔ آپ کے والد کا نام وحید احمد اور پیشہ زمینداری ہے۔ حرماں چھ سات سال کی عمر میں اپنی ننھیال سندیلہ چلے آئے اور پندرہ سولہ برس تک وہیں پرورش پائی مگر تعلیم حالات سے بے علمی نے آوارگی پر مجبور کیا۔ سندیلے کانپور، آگرہ ہوتے ہوئے حیدر آباد دکن پہنچے اور مہاراجہ سرکشن پرشاد بہادر شاد کے حضور باریاب ہوئے۔ قیام حیدر آباد کے زمانے میں مولانا حمید الدین قمر فریدی کی کوشش سے آپ نے پنجاب یونیورسٹی سے منشی فاضل کا امتحان پاس کیا۔ ۱۹۴۷ء میں لاہور چلے آئے اور میٹرک تک انگریزی پڑھی اس وقت سے پاکستان ہی میں قیام ہے۔ آپ کے کلام کا مجموعہ کمال کے نام سے لاہور میں شائع ہو چکا ہے۔

حسن — خواجہ حسن نام، خواجہ ابراہیم کے بیٹے اور بخاری مودودی کے نواسے تھے۔ دہلی ان کا وطن تھا۔ وجیہ اور خوبصورت تھے۔ بذلہ گوئی اور موسیقی میں کمال حاصل تھا۔ لکھنؤ کی کسی ناز طوائف کو دل دے بیٹھے تھے۔ اشعار میں جا بجا اپنے خیال میں اس کے نام کا نگینہ جڑا ہے۔ علم نجوم سے بھی واقف تھے۔ اکثر اشعار دل کی زبان سے کہتے ہیں۔ جذبات عشق کے اظہار میں محاورات اور زبان کی چنداں پروا نہیں کرتے۔ شاعری میں جعفر علی خاں حسرت کے شاگرد تھے۔ (جواہر سخن، سخن شعرا، خمخانہ جاوید)

خاموش — شاہ معین الدین نام، حیدرآباد دکن کے رہنے والے تھے۔ صابریہ طریقے کے فقیر تھے۔ کلام میں تصوف کا رنگ ہے۔ اس کی خاص خاص اصطلاحیں موزوں طریقے سے لاتے ہیں۔ زبان عام فہم ہے۔ سنہ ۱۲۸۹ھ میں انتقال ہوا۔ (دکن میں اردو، جواہر سخن جلد اول ص ۲۹۲)

خلیل — دوست علی نام، سید جمال علی کے بیٹے، بڈولی (اودھ) کے رہنے والے آتش کے شاگرد تھے۔ قیام زیادہ تر لکھنؤ میں رہا۔ واجد علی شاہ کے زمانہ میں چکلہ دار تھے۔ اس لیے زندگی عیش و راحت سے بسر کی۔ سنہ ۱۲۸۱ھ میں کلکتہ گئے [illegible]۔ کلام میں تصوف کا رنگ جا بجا نظر آتا ہے۔ کہیں کہیں ابتذال بھی ہے۔ دل نشینی کم ہے البتہ الفاظ کا اہتمام زیادہ ہے۔

راقم — بندرابن نام، قوم کائستھ، دہلی کے رہنے والے تھے۔ بعض انہیں مظہر کا شاگرد بتاتے ہیں، بعض سودا کا اور بعض میر کا۔ مگر صحیح یہ ہے کہ میر ہی کے شاگرد تھے کیونکہ خود میر نے ان کو اپنے تذکرہ میں اپنا شاگرد بتایا ہے۔ آخر میں سودا کو بھی کلام دکھاتے تھے۔ فن شعر کے ماہر تھے اور خوب کہتے تھے۔ ان کے اشعار میں روانی ہے، غزل میں رنگ کسی قدر پھیکا ہے تاہم لطف سے خالی نہیں۔ جواہر سخن جلد اول ص ۲۸۷، مخزن نکات، چمنستان شعرا، نکات الشعرا۔

رسا جالندھری — کبیر خاں نام، رسا تخلص، جالندھر وطن ہے۔ تقسیم کے بعد جالندھر سے پاکستان آگئے ہیں اور لاہور میں رہتے ہیں۔ غزل خوب کہتے ہیں۔ زبان نہایت شیریں اور شگفتہ۔ بندش چست اور استادانہ اور تخیل بلند اور ارفع ہے۔

ریحاں — دیا کشن نام، گنگا بشن عزیز کے بیٹے اور قوم کے کائستھ سریواستو تھے۔ مولد شاہ آباد تھا مگر لکھنؤ میں آ بسے تھے۔ عام طور پر مصحفی کے شاگرد مشہور ہیں مگر صاحب خمخانہ جاوید نے موتی تمیز مصحفی کا شاگرد لکھا ہے۔ واجد علی شاہ کے زمانے میں [illegible] کے بخشی تھے۔ نازک مزاج، وضعدار اور خوش تقریر تھے۔ علمی استعداد معقول تھی۔ دیوان میں اخلاقی مضامین کا عنصر غالب ہے۔ سوز و گداز بھی اور صفائی بھی ہے۔ لفظی پابندیوں سے دامن بچاتے ہیں۔ انداز بیان دلنشین ہے۔ سنہ [illegible] میں وفات پائی۔ (جواہر سخن) دوسری جلد ص [illegible]

فاکر — ذاکر علی نام، فاکر تخلص، شاہ پور ضلع فتحپور ہسوہ کے رہنے والے۔ آپ [illegible] کمشنری میں سر رشتہ دار [illegible]

کے شاگرد تھے۔ [illegible] ھ کے بعد وفات پائی۔ ان کا دیوان جس کا تاریخی نام "خزینۂ بہار" (۱۳۰۳ھ) ہے، طبع ہو چکا ہے۔ [illegible] چھپا۔ شاعری کا بھی ایک [illegible] بار [illegible] ہے۔ ذکر پہلے شاعر تھے۔ کلام میں سادگی، روانی اور [illegible] [illegible] مستقل [illegible] کا رنگ معلوم نہیں ہوتا بلکہ آتش کا رنگ [illegible] ہے۔ (جواہر سخن جلد چہارم ص ۹۰، [illegible] ص ۲۳۰)

فکی۔ مہدی علی خاں نام، کرامت علی خاں کے بیٹے، آبائی وطن لکھنؤ کے رہنے والے تھے گر ان کا مولد و مسکن مراد آباد تھا۔ [illegible] ریاست رامپور سے وظیفہ ملتا تھا۔ غازی الدین حیدر بادشاہ کے زمانے میں لکھنؤ آئے اور ناسخ کے شاگرد ہوئے۔ کچھ دنوں دہلی، بہار، حیدرآباد اور مصطفیٰ آباد کی سیر کی، مگر کہیں قدردانی نہ ہوئی۔ واجد علی شاہ کے عہد میں پھر لکھنؤ آئے اور [illegible] حاصل کیا۔ غدر کے بعد خانہ نشین ہو گئے تھے۔ لیکن نواب یوسف علی خاں ناظم [illegible] کا شہرہ سن کر رامپور آئے۔ وہیں [illegible] ھ میں وفات پائی۔ ان کے کلام میں درد و گداز بھی ہے اور زبان و بیان کی خوبیاں بھی۔ اکثر اشعار دلنشیں ہیں۔

مجاد علی انصاری۔ سجاد علی انصاری بی اے، ایل ایل بی (علیگ) اگرہ ضلع بارہ بنکی کے رہنے والے تھے۔ [illegible] خوش شمائل، خوش فکر اور خوش باش تھے۔ جوانی میں انتقال ہو گیا۔ وہ ادب برائے ادب کے نظریے کی پیداوار تھے [illegible] صاحب [illegible] زادے [illegible] تھے۔ ان کا مشغلہ تھا، بعض اوقات تو ایسی ادبی [illegible] کیا کرتا تھا کہ ہم اور عوام اس کے پابند کر رہ جاتے تھے۔ ان کی نثر کا مجموعہ "محشر خیال" کے نام سے ان کے دوست خواجہ منظور حسین صاحب ایم اے (علیگ) نے ان کی وفات کے بعد ۱۹۳۲ء میں مرتب کیا تھا۔ اب لاہور میں دوبارہ طبع ہوا ہے۔

محسر۔ راجہ نواب علی خاں نام، بہادر جنگ خطاب، ریاست محمود آباد کے والی، واجد علی شاہ کے خاص مصاحب تھے۔ ابتدا میں ناسخ کے شاگرد ہوئے، پھر مرزا قربان کے۔ لیکن رنگ دونوں سے جدا ہے۔ [illegible] ھ میں وفات پائی۔ کلام سے [illegible] آفرینی اور طباعی کا پتہ چلتا ہے۔ محاورہ بندی بھی ہے اور سلاست بھی۔ لفظی رعایات، تشبیہ اور استعاروں کے استعمال سے [illegible] پیدا کرتے ہیں۔

محسر۔ شیخ امداد علی نام، لکھنؤ کے رہنے والے، شیخ امین علی کے بیٹے اور ناسخ کے شاگرد تھے۔ [illegible] ناسخ کے شاگرد تھے [illegible] کیا تھا۔ شہرت نے واجد علی کے دربار تک رسائی کر دی۔ بڑے [illegible] اور جامہ زیب تھے۔ غدر کی [illegible] میں کچھ دنوں فرخ آباد، بلرام، کاکوری وغیرہ بھٹکتے رہے۔ آخر لکھنؤ آ گئے اور یہیں پیوند خاک ہوئے۔ انہوں نے اکثر اصناف [illegible] کی ہے مگر مرثیہ میں زیادہ شہرت پائی ہے۔ زبان صاف اور با محاورہ ہے۔ لفظی صنائع بدائع کی پابندی [illegible]

محسر۔ اقبال بہادر نام، محسر تخلص، وطن بلگرام ضلع فتح پور ہے۔ ان کے والد منشی [illegible] اپنے قصبہ کے [illegible]

اور مجموعہ مرقع رنگین [illegible] اور شاعر تھے۔ بحر نے پہلے مکتب میں اردو فارسی پڑھی، پھر انگریزی۔ ۱۹۰۲ء میں انگریزی مڈل کا امتحان پاس کیا اور [illegible] میں الٰہ آباد یونیورسٹی سے میٹرک کا، آگے تعلیم جاری نہ رہ سکی۔ اسی دوران میں صحت خراب ہو گئی۔ قدرے آرام ہوا تو [illegible] میں کالی داس کے شہرۂ آفاق شکنتلا کا ترجمہ (مثنوی بحر) ختم کیا جو زمانہ پریس کانپور سے شائع ہوا، پھر عمر خیام کی تقریباً پانچسو رباعیوں کا ہندی نظم میں ترجمہ کیا جسے انڈین پریس الٰہ آباد نے [illegible] میں ج دج سے مصور شائع کیا۔ بحر کے اردو کلام میں نفاست، نازک خیالی اور سوز کے اثرات موجود ہیں۔

سرور جہان آبادی۔ منشی درگا سہائے نام، سرور تخلص، جہان آباد (ضلع پیلی بھیت) وطن تھا۔ [illegible] میں پیدا ہوئے۔ فارسی مولوی کرامت اللہ سے پڑھی اور شاعری میں بیان یزدانی میرٹھی سے اصلاح لی۔ کثرت بادہ نوشی کی وجہ سے ۳۷ سال کی عمر پا کر [illegible] کو انتقال کیا۔ بہت زود گو تھے۔ بے تکلف شعر کہتے تھے۔ ہر صنف میں طبع آزمائی کی ہے۔ ان کے مزاج میں حزن و یاس اور رنج و الم غالب تھے۔ اسی لئے کلام میں جذبات نگاری اور درد و سوز زیادہ ہے۔ ان کا مجموعہ کلام خمخانۂ سرور کے نام سے چھپ چکا ہے۔

شاعر۔ میر کلو نام، میر درد کے عزیز اور مرزا مظہر کے شاگرد تھے۔ تفصیلی حالات معلوم نہ ہو سکے۔ مرزا مظہر کے شاگردوں کا جو رنگ ہے۔ ان کے کلام میں بھی پایا جاتا ہے۔ جواہر سخن، گلشن ہند، خمخانۂ جاوید، تذکرۂ میر حسن، تذکرۂ مصحفی میں ان کا ذکر کیا جاتا ہے۔

شرف۔ نام سید سادات حسین، عرف آغا جو۔ سید محمد میر عرف میرن صاحب کے بیٹے، لکھنؤ کے رہنے والے تھے۔ غزلوں میں جا بجا آتش کا رنگ جھلکتا ہے۔ لفظی رعایات کے پیچھے نہیں پڑتے۔ معنوی خوبی پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

شمس مینائی۔ شیخ عبد الرحمن نام، ابو المعانی کنیت، تخلص اردو میں شمس، فارسی میں مینائی تھا۔ [illegible] میں بمقام [illegible] پیدا ہوئے۔ مڈل تک تعلیم حاصل کرنے کے بعد [illegible] میں بمبئی چلے گئے اور چاندی کے برتن بنانے والے ایک کارخانہ میں ملازم ہو گئے۔ وہاں حاجی تجمل حسین، مرزا مفتون لکھنوی، عاشق بجنوری اور حفیظ جونپوری کی صحبت میسر آ جانے سے شعر کہنے لگے اور مطالعہ و مزاولت کی بدولت فارسی میں اچھی خاصی استعداد بہم پہنچا لی۔ آپ نے قدیم و جدید طرز دونوں میں ہر صنف سخن میں طبع آزمائی کی اور دونوں زبانوں میں قادر الکلامی کے جوہر دکھائے۔ آخری زمانے میں ضعف پیری کے سبب بینائی کی دولت سے محروم ہو گئے تھے۔ [illegible] میں اپنے اردو فارسی کلام کا مجموعہ جام مینائی کے نام سے مرتب کر کے امرتسر میں چھپایا مگر وہ تقسیم ملک کے ہنگاموں میں ضائع ہو گیا۔ [illegible] کو لاہور میں انتقال کیا۔

شمس ضمیری۔ (حافظ) شمس الدین نام، شمس تخلص۔ خانوادۂ ضمیری سے تعلق رکھنے کی وجہ سے ضمیری کہلاتے ہیں۔

صوبہ بہار کی چند اہم شخصیتوں میں ہیں۔ شعر و ادب کا پاکیزہ ذوق رکھتے ہیں۔ پٹنہ کالج کے عربی و فارسی کے پروفیسر ہیں۔ ... بھی آپ کا اختصاص درجہ ہے۔

شوق ۔ پنڈت بھگوان ناتھ رینہ نام، شوق تخلص، پنڈت دھنیشور ناتھ رینہ کے بیٹے تھے۔ ان کا آبائی وطن کشمیر تھا۔ شوق کے جد امجد کو نواب غفور خاں نے ریاست جاورہ کا دیوان مقرر کیا تھا۔ شوق ۱۸۷۵ء میں بمقام ... پیدا ہوئے۔ ... معاش میں شمالی ہندوستان گئے اور ۱۹۰۵ء میں ڈپٹی کلکٹر ہو گئے۔ آپ نے صوبجات متحدہ آگرہ و اودھ کے تیرہ ضلعوں میں خدمات انجام دیں اور ۱۹۳۲ء میں پنشن لی۔ شعر و شاعری کی دنیا میں آپ کو پہلے امیر مینائی، پھر سید محمد ضامن صاحب شہید لکھنوی شہری ... استاد رہے۔ آپ کے کلام کا مجموعہ "پیام شوق" کے نام سے چھپ چکا ہے۔ جس کے مطالعہ سے تدریجی ترقی کا پتہ چلتا ہے۔

شوق نیموی ۔ مولانا ظہیر احسن شوق نیموی عظیم آبادی ضلع پٹنہ کے قریہ نیمی میں پیدا ہوئے۔ سنہ ولادت ۱۲۷۸ ہجری ہے۔ شوق صوبہ بہار کی بزرگ ترین ہستیوں میں شمار ہوتے ہیں۔ آپ کی اردو دانی کا لوہا لکھنؤ اور دہلی والے بھی مانتے ہیں۔ آپ کی تالیف آثار السنن علم حدیث کی بڑی معتبر کتابوں میں شمار کی جاتی ہے۔ دیوان ۱۳۲۲ھ میں شائع ہوا تھا۔ اصلاح، ازاحۃ الاغلاط اور تذکرہ یادگار وطن بھی آپ کی چند تصانیف ہیں۔

صاحب و شفیق ۔ لچھمی نراین نام، اورنگ آباد دکن کے رہنے والے تھے۔ ان کے والد منسا رام ... سلطنت دکن میں صدالصدور کے پیشکار رہے۔ ۱۷۴۵ء میں پیدا ہوئے۔ مولوی شیخ عبدالقادر سے کتب درسی پڑھیں۔ فن شعر میں علامہ میر غلام علی آزاد بلگرامی کے شاگرد ہوئے۔ پہلے صاحب تخلص کیا۔ جب میر مسیح "صاحب" کا شہرہ ہوا تو آزاد کے مشورے سے شفیق تخلص اختیار کیا۔ چنانچہ پہلے دیوان میں صاحب اور دوسرے میں شفیق ملتا ہے۔ ان کی زبان دکن کے ہمعصروں کے مقابلے میں صاف ہے لیکن شاعری میں کوئی خاص ... لفظی رعایتیں زیادہ ہیں۔ (جواہر سخن دوسری جلد ص ۷۷)

ضیا جعفری ۔ سید عنایت علی شاہ نام، ضیا تخلص ہے۔ آپ کے والد سید ... شاہ کیمبل پور میں انسپکٹر تھے۔ وہیں بمقام ... ۱۹۰۸ء میں ضیا پیدا ہوئے۔ ابتدائی زمانہ کیمبل پور میں گزرا۔ والد کی پنشن کے بعد پشاور چلے گئے۔ دسویں جماعت میں تعلیم پا رہے تھے کہ پولیس میں سب انسپکٹر ہو گئے۔ ... طبع کے باعث زیادہ دن ملازمت نہ کر سکے۔ مستعفی ہو کر شعر و ادب کو اپنا شعار بنا لیا۔ اس کے بعد روزنامہ "سرحد" اور ... روزنامہ "شہباز"، ماہنامہ سرحد اور تعمیر کے اداروں میں مدیر کی حیثیت سے کام کیا۔ بزم سخن پشاور آپ کی ادبی زندگی کا پہلا گہوارہ ہے جہاں آپ کی شاعری پھلی پھولی اور پروان چڑھی۔ آپ نے علاوہ ادب کی ... جس نے ترقی یافتہ ادب کی طرف قدم اٹھایا۔ پشاور میں انجمن ترقی اردو کا قیام بھی آپ ہی کی مساعی جمیلہ کا نتیجہ ہے۔ شعر و سخن کی طرف آپ کا فطری رجحان ہے۔ اگرچہ نظم، قصیدہ، قطعہ غرض ہر صنف میں طبع آزمائی کرتے ہیں مگر غزل سے خاص لگاؤ ہے۔ تنقید نگاری میں خاص ملکہ حاصل ہے۔ فارسی کے بھی بے بدل شاعر ہیں۔ آپ کی رباعیات کا ایک مجموعہ ...

سے چھپ چکا ہے۔ منثورات "مضامین ابر رواں" اور مجموعہ کلام "ریحانے" زیر طبع ہیں۔

طالب باغپتی - محمود طالب علی خاں طالب باغپتی بقول جگر مرادآبادی "سلیم الفطرت، وسیع المشرب، لطیف الخیال انسان واقع ہوئے ہیں۔ ستارہ چمکنے والا دل و دماغ رکھتے ہیں، رنگینی و رعنائی کے ساتھ ساتھ بہت سادہ مزاج، تکلفات، تصنعات سے بڑی حد تک کنارہ کش۔ ان کی شاعری کی راز دار حسن و عشق بھی ہے۔ ان کے کلام میں یہ تمام صفاتی خصوصیات زندگی بدرجۂ اتم پائی جاتی ہیں۔ انہوں نے شعر کو حسن و عشق کی نازک نازک واردات، لطیف لطیف جذبات و معاملات، نفسیات و خیالات تک محدود رکھا ہے۔ ان کے کلام میں حکیمانہ حقائق و معارف بھی ہیں۔ کلام کا مجموعہ شاخ نبات کے تاریخی نام (۱۳۵۶ھ) سے چھپ چکا ہے۔

طالب انصاری - طالب انصاری محمود بدایوں کے رہنے والے ہیں۔ آپ کے والد شیخ برکت اللہ وہاں کے قدیم شرفا تھے۔ تھوڑی بہت زمینداری بھی تھی۔ طالب ۱۹۰۸ء میں پیدا ہوئے۔ عربی تعلیم مولوی محمد یوسف ہزاروی سے حاصل کر کے باقی تعلیمی حسب اللہ تشکیل خود ہی پوری کی۔ ۱۹۲۸ء میں تلاش معاش میں لاہور پہنچے۔ یہیں منشی فاضل اور میٹرک کیا اور درس و تدریس میں مشغول ہو گئے۔ کئی سال سے گورنمنٹ ہائی سکول باغبانپورہ (لاہور) میں مدرس ہیں۔ شاعری کا شوق بچپن سے ہے۔ فن عروض اور شاعری کی درس و تدریس کی بابت کئی کتابوں کے علاوہ آپ کی غزلوں کا ایک مجموعہ سرود حیات کے نام سے چھپ چکا ہے۔ زبان پاکیزہ، انداز بیان نکھرا ہوا اور جذبات کم سے کم مصنوعی جوش و خروش کا نام نہیں۔ ایک پرسکون ندی ہے کہ خاموشی سے بہتی چلی جاتی ہے۔

عابد شاہجہانپوری - عابد حسین نام، عابد تخلص۔ وطن شاہجہانپور، عمر ۵۷ سال کے قریب ہے۔ ۱۹۱۰ء میں اعتبار الملک حضرت دل شاہجہانپوری کے حلقۂ تلامذہ میں شامل ہوئے اور ۱۹۲۲ء میں فارغ الاصلاح ہو گئے۔ اب کئی خوش فکر شعرا آپ کے حلقۂ شاگردی میں داخل ہیں۔ آپ کو تمام اصناف سخن پر قدرت ہے لیکن خصوصیت کے ساتھ آپ کا میدان غزل، نظم اور رباعی ہے۔ عروض میں بہت اچھا دخل ہے۔ زبان محاورہ اور طلاقت اور انداز بیان میں ندرت اور شگفتگی ہے۔

عاصی کرنالی - جناب عاصی کرنالی بقول ملک الشعراء "ان معتدل شعرا میں بلند مقام رکھتے ہیں جنہوں نے معاشرے کو پاکیزہ فکر، شعر و ادب کو حسین اسلوب اور زبان کو ندرت و رعنائی دی ہے۔ عاصی کے کلام میں متانت فکر، مقصدیت اور عمل و حرکت کی قوت پائی جاتی ہے۔ عاصی نے زبان کو محض نہیں سنوارا ہے اور گیسوئے اردو کی مشاطگی کی ہے۔" رگ جاں ان کے کلام کا مجموعہ ہے۔

عبرت صدیقی - محمد تبارک علی نام، عبرت تخلص ہے۔ اردو ہندی کی تعلیم سرکاری مدارس سے حاصل کی۔ عربی فارسی مکاتب کے علاوہ اپنے والد منشی مبارک علی صدیقی سے پڑھی، جو فارسی عربی کے ماہر تھے۔ ۱۹۲۲ء سے سررشتۂ تعلیم میں ملازم ہوئے اور کئی سال سے شاہ آباد میں ہیڈ ماسٹر ہیں۔ شاعری سے فطری لگاؤ ہے۔ بارہ سال کی عمر میں شعر کہنا شروع کئے۔ اعتبار الملک

مجموعہ اشعار حضرت تل شاہجہانپوری کی زوجہ نے کہیں سے کہیں پہنچا دیا۔ قدرت نے ان کو جو دل دیا ہے [illegible] ہیں۔ غزل ان کا دامن کسی عالم میں بھی ان کے ہاتھ سے نہیں چھوٹتا۔ ترقی پسندی [illegible] حضرت شعر سے متعلق خود نہ ہونے کے سبب شعر کہتے ہیں۔ ان کی شاعری انہیں پاکیزہ جذبات اور تجربہ حیات کی آئینہ ہے۔

عبدالعلیم آسی، سکندر پور ضلع بلیا کے رہنے والے، ۱۸۳۴ء میں پیدا ہوئے۔ صاحب [illegible] شعر و شاعری کی طرف مائل تھی جلال الدین اعظم سے تلمذ تھا پچاسی برس کی عمر پاکر ۱۳۳۵ھ میں وفات پائی۔ یہ اپنے وقت کے [illegible] جی تھے۔ ایک مختصر سا دیوان عین المعارف ان کی وفات کے بعد اسی سال مطبع سلیمانی بنارس سے شائع ہوا۔ کلام ناسخ کے رنگ میں ہے جس میں شوخی بلند پروازی، بے ساختگی، مناسب و موزوں الفاظ کا اہتمام پایا جاتا ہے۔ تغزل میں جا بجا تصوف کا [illegible] ہے۔ دیباچہ عین المعارف (دیوان آسی) مطبوعہ شاد بیج ۱ ص ۶۴ - ۶۵، جواہر سخن چوتھی جلد ص ۲۱۲)

عزیز صفی پوری۔ منشی ولایت علی خاں عزیز کے والد محمد یکی علی خان، دادا ثابت علی خاں اور پردادا رونق علی شاہان اودھ نواب سعادت علی خاں، نواب غازی الدین حیدر، نواب نصیر الدین حیدر محمد علی شاہ امجد علی شاہ اور واجد علی شاہ کے عہد میں میر منشی تھے منشی ولایت علی خاں ۱۸۴۲ء یا ۱۸۴۳ء میں پیدا ہوئے۔ نو برس کی عمر تک مکتب میں پڑھتے رہے۔ بعد ازاں مولوی محمد حسن بنگالی اور مولوی محمد رضا باگر مئی سے عربی فارسی پڑھی۔ ۱۴ یا ۱۵ برس کے ہوئے تھے کہ حکومت کا تختہ الٹ گیا۔ واجد علی شاہ مٹیا برج چلے گئے۔ ہنگامہ بعد غدر ہو گیا اور عزیز کے مکانات جو شاہی محل کے قریب تھے لوٹ کر کھود ڈالے گئے۔ عزیز جان بچا کر صفی پور ضلع اناؤ (اودھ) میں پہنچ گئے جہاں ان کا ننہال تھا اور باقی عمر وہیں گزار دی۔

اسی زمانے میں عزیز نے پنج رقعہ فارسی میں لکھا، شعر کہنے شروع کئے اور غالب کو اصلاح کے لئے لکھا۔ غالب نے منظور کیا اور اصلاح کلام منظور کی۔ اس کے بعد عزیز نے سرور کے فسانۂ عجائب کو فارسی میں نظم کیا اور غالب کے پاس بغرض اصلاح بھیجا۔ غالب نے لکھا کہ فسانۂ عجائب کو اگر میں خود بھی فارسی میں لکھوں تو سرور سے زیادہ دلچسپ نہ ہو گا پھر میری ۶۶ برس کی عمر ہے اتنا کثیر کلام (بارہ ہزار اشعار) دیکھنے سے معذور ہوں عزیز نے دوبارہ لکھا کہ اگر آپ نہ دیکھیں گے تو میں کتاب چاک کر ڈالوں گا۔ چنانچہ عزیز نے اپنے ہاں کا نسخہ چاک کر ڈالا۔

عزیز فارسی کے شاعر ہیں اور ان کی کل تصانیف نثر و نظم فارسی زبان میں ہیں جن میں سے ارمغان و نور ربا اور رسالہ اشعار وارشد شبلی اور حالی پسند فرما چکے ہیں۔ اردو کلام کا مجموعہ حاجی محمود علی انصاری نائب ناظم و مجسٹریٹ درجہ اول ریاست بھوپال کے اہتمام سے گلزار عزیز کے نام سے چھپ چکا ہے۔ (شباب اردو مارچ ۱۹۳۸ء)

عشق۔ رکن الدین نام، محمد شاہ عرف تھا۔ دہلی کے مشہور درویش شاہ فرہاد کے نواسے تھے۔ شروع جوانی میں دہلی سے عظیم آباد گئے۔ جب تک وہاں رہے ویسی ہی عزت حاصل رہا۔ وہاں سے عظیم آباد گئے تو فرقہ صوفیہ سلسلۂ [illegible] سرکار کی سرپرستی میں [illegible]

تھا۔ غزلوں میں تصوف کی چاشنی بھری ہوتی ہے۔ انداز بیان دل نشین، زبان سلیس اور اثر انداز ہے۔ (جواہر سخن جلد اول ص ۳۱۱)

جوش فیروزپوری ـ جان محمد خاں نام، جوش تخلص ہے۔ آپ کے بزرگ شہاب الدین غوری کے ساتھ ہندوستان آئے۔ جوش ۱۸۹۱ء میں فیروزپور پنجاب میں پیدا ہوئے۔ جوش ورام کے ساتھ ہوا تھے۔ تعلیم و تربیت گھر ہی میں ہوئی۔ بچپن ہی سے شعر کہنے کا شوق پیدا ہوگیا۔ تقسیم ہند (اگست ۱۹۴۷ء) تک فکر معاش سے بے نیاز رہے صرف شعر و شاعری اور شکار کا شغل تھا۔ ابتدا میں حکیم کوثر خیرآبادی سے بعد میں مولانا صفدر علی مرزاپوری سے پھر علامہ نظم طباطبائی سے مشورۂ سخن کیا اور غزل گوئی میں ایک خاص مقام حاصل کیا۔ آپ کی زبان شیریں اور پرکیف، انداز بیان پُر زور اور تخیل بلند ہوتا ہے۔ تقسیم کے بعد وہ امیر زمّلث تو یرو زپور ہی میں رہ گیا اب خاندان کے دیگر افراد کے علاوہ کراچی آ گئے تھا

عیشی ـ طالب علی خاں نام، لکھنؤ کے رہنے والے، مصحفی کے شاگرد تھے، فارسی میں قتیل سے اصلاح لیتے تھے، فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں صاحب دیوان تھے مگر دونوں دیوان نایاب ہیں۔ بعض اور کتابیں بھی ان کی تصنیف سے تھیں مگر اب نہیں ملتیں۔ بیان میں زور، بندش میں چستی اور خیالات میں رفعت کے باوجود کلام پُر تکلف ہے۔ کہیں کہیں مصحفی کا رنگ جھلک جاتا ہے۔ (جواہر سخن)

فاخر ـ منور خاں نام، فقیر محمد خاں گویا کے دوست، لکھنؤ کے رہنے والے، مصحفی کے شاگرد تھے۔ فاخر ایک خوش گو شاعر تھے ان کا کلام حشو و زوائد سے پاک ہے ان کی زبان میں شیرینی اور طرز بیان میں دل نشینی ہے۔ ان کی شاعری درد سے خالی نہیں مگر اضمحلالی کیفیت نہیں ہے۔ ان کی بعض غزلیں عوام میں مشہور ہیں (جواہر سخن)

غضنفر ـ غضنفر علی خاں نام، لکھنؤ کے رہنے والے، جرأت کے شاگرد تھے۔ کلام میں صفائی اور روانی ہے۔ محاورہ بندی کا خیال رکھا ہے۔ واردات عشق کے علاوہ دوسرے مضامین بہت کم نظر آتے ہیں۔ (جواہر سخن دوسری جلد ص ۹۳)

فیض ـ میر شمس الدین نام، دکن کے رہنے والے، دبیر اور فارغ البال فاضل اور صوفی تھے۔ اشعار میں ہندی الفاظ اور محاورات کثرت سے لائے ہیں، تاہم دہلی کے رنگ میں صاف اور سلیس کہتے ہیں۔ متعدد کتابوں کے مصنف ہیں کئی دیوان چھپ چکے ہیں۔ ۱۸۰۱ء میں پیدا ہوئے اور ۱۸۶۶ء میں وفات پائی۔ (دکن میں اردو۔ جواہر سخن)

منشی محمد الدین فوق ـ محمد الدین نام، فوق تخلص تھا۔ فروری ۱۸۷۷ء میں موضع کوٹلی ہرنارائن میں پیدا ہوئے۔ سیالکوٹ سے جنوب کی جانب دو تین میل کے فاصلہ پر واقع ہے۔ آبائی وطن کشمیر تھا مگر کسی وجہ سے عرصہ سے یہیں رہتے تھے۔ آپ ایک کامیاب اخبار نویس، نامور مورخ اور قادر الکلام شاعر تھے۔ شاعری میں پہلے حضرت تاباں سے رجوع کئے بعد میں داغ کے شاگرد ہوئے۔ اخبار کشمیری کی ادارت کے علاوہ بیشمار کتابیں تصنیف کیں۔ کلام فوق اور نغمہ و گلزار نظموں اور غزلوں کے دو مجموعے یادگار ہیں۔ ۱۴ ستمبر ۱۹۴۵ء

[illegible] انتقال ہوا۔

کامل — [illegible] پیدا ہوئے۔ [illegible] لیا۔ [illegible] کے لئے مشہور ہے۔ [illegible] کا اعتراف کرتے تھے۔ [illegible] مضمون کو بندش کی خوبی اور ترکیب کی چستی سے بہت اچھا کرتے ہیں۔ [illegible] جلد ۳ ص ۱۲۳)

کسری منہاس — نام غلام حسن، تخلص کسری ہے۔ ۱۰ رجنوری ۱۹۱۳ء کو راولپنڈی کی ایک قدیم مردم خیز بستی میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم ڈسٹرکٹ بورڈ سکول میں ہوئی۔ ۱۹۲۹ء میں خالصہ مڈل ہائی سکول سے (جو اب کالجیٹ ہائی سکول کے نام سے مشہور ہے) میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ عربی فارسی کی تعلیم اپنے عم بزرگوار میاں فضل الدین منہاس سے حاصل کی۔ ۱۹۳۳ء میں [illegible] جلیل [illegible] سے شرف تلمذ حاصل کیا۔ ان کی عدیم الفرصتی کے باعث اپنا کلام استاذ الملک حضرت [illegible] کی ذات گرامی سے بھی بہت سا فیض حاصل کیا۔ فن تاریخ گوئی کے متعلق بہت سے شکوک ان ہی کی توجہ سے حل ہوئے۔ مطالعہ زندگی کا خاص شغل ہے۔ تاریخ گوئی، لسانی مباحث اور تنقید کا خاص شوق ہے۔ ہزاروں کتابیں خود خریدیں، قدیم [illegible] اپنے سینکڑوں روپیہ صرف کرکے مختلف مقامات سے حاصل کئے۔ ان کا ذاتی کتب خانہ بہت بڑا ادبی سرمایہ ہے۔

کلیم — محمد حسین نام، دہلی کے رہنے والے تھے۔ میر تقی سے قرابت تھی، نظم و نثر دونوں پر قدرت رکھتے تھے۔ شاعری کے علاوہ فضل و کمال کی وجہ سے بھی شہرت تھی۔ [illegible] کے طرز کی پیروی کرنے کی وجہ سے کلام صاف اور سلیس نہیں البتہ مضمون کے اعتبار سے اچھا ہے۔ فصوص الحکم کا ترجمہ اردو میں کیا۔ عروض و قافیہ پر ایک رسالہ اردو میں لکھا، نثر رنگین لکھتے تھے۔ ایک کتاب یادگار چھوڑی۔ (جواہر سخن، نکات الشعراء، مخزن نکات، تذکرہ میر حسن، [illegible])

کوثر نیازی — محمد حیات خاں نام، کوثر تخلص، نیازی قبیلے سے تعلق رکھنے کی وجہ سے نیازی کہلاتے ہیں۔ ۲۱ اپریل ۱۹۳۴ء کو ضلع میانوالی میں پیدا ہوئے۔ میٹرک تک تعلیم حاصل کرنے کے بعد پنجاب یونیورسٹی سے ادیب فاضل اور منشی فاضل کے امتحانات پاس کئے۔ ابھی عربی اور انگریزی کی تحصیل جاری ہے۔ دو سال تک سہ روزہ کوثر لاہور کی ادارت کرتے رہے ہیں۔ گذشتہ پانچ سال سے ماہنامہ [illegible] اور دو سال سے روزنامہ تسنیم لاہور کے مجلس ادارت سے وابستہ ہیں۔ نظم و نثر پر یکساں قدرت ہے۔ کلام کا ایک مجموعہ [illegible] کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ دوسرا مجموعہ [illegible] کے نام سے زیر ترتیب ہے۔ آپ کی غزلوں میں بلا کی سرمستی [illegible] ہیں۔

کیفی حیدرآبادی — سید [illegible] الدین حسن نام، کیفی تخلص، حیدرآباد دکن کے رہنے والے [illegible] داغ کے شاگرد تھے۔ [illegible]

بیت ایک شاہد بھی جو ایک دو شعر نے اور سو شعر نے کہہ ڈالتے تھے۔ اشعار کو رنگ کی نظام پن کرتا ہاتھ باندھے چلے آتے تھے۔ گو غزل میں عنادل کا شیفتہ دارہ بھی تھی گویا مصحفی و آتش کے طرز تحریر کا تتبع ہوتا تھا۔ ان کی وفات کے بعد ان کے کلام کا مجموعہ کلام گلزار کے نام سے ۱۲۸۰ھ میں مطبع سے شائع ہوا تھا۔

قبول ۔ مرزا مہدی علی خاں نام، مقبول الدولہ خطاب، محمد مرزا کے بیٹے، وطن لکھنؤ تھا۔ واجد علی شاہ کے مصاحب اور مختار کے عہدہ پر تھے۔ شاہ اودھ کے ساتھ کلکتہ کا سفر بھی کیا۔ ناسخ کے شاگردوں میں صاحب دیوان تھے۔ کتاب "شمشیر خانی" کا ترجمہ بھی اردو نظم میں کیا ہے۔ ۱۲۹۵ھ میں وفات پائی۔ کلکتہ میں دفن ہوئے۔ اشعار میں صفائی اور گداز ہے۔

گرفتار ۔ علی بیگ نام، قوم کے مغل، فوج میں ملازم، حاتم کے شاگرد تھے۔ کلام میں تغزل کی شان ہے۔ زبان بھی صاف اور سلیس ہوتی ہے۔ (جواہر سخن جلد اول ص ۲۰۵، مجموعہ نغز قدرت اللہ قاسم مرتبہ محمود شیرانی)

لطف ۔ مرزا علی نام اور لطف تخلص تھا کاظم بیگ کے فرزند اور استرآباد (ایران) کے رہنے والے تھے مرزا کاظم نادر شاہ کے ساتھ ہندوستان آئے اور دربار میں داخل ہو گئے، فارسی کے اچھے شاعر تھے۔

لطف نے شروع سے ہی اردو میں ان دیکھے استادوں میں قدم رکھا اور غزلیں کہیں۔ انہوں نے اکثر تراکیب اور مضمون فارسی سے کر اردو کلام مزین کیا دیوان لطف میں سلاست کے ساتھ ساتھ جذبات تغزل کا اظہار بھی ہے اور زبان و محاورہ کا لطف بھی تذکرہ گلشن ہند نہایت تحقیق سے لکھا ہے (جواہر سخن جلد اول ص ۳۲۲، گل رعنا، دیوان لطف)

لطیف انور گورداسپوری لطیف انور نام، انور تخلص، وطن گورداسپور ہے۔ تعلیم و تربیت سرحد میں ہوئی جہاں ان کے والد ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ پولیس تھے۔ اسلامیہ کالج میں کچھ عرصہ تعلیم حاصل کرنے کے بعد گورداسپور میں مقیم ہو گئے جہاں سے انگست ۱۹۴۲ء میں آپ نے ماہنامہ سپاہان جاری کیا جو سرمایہ کی کمی کے باعث بند ہو گیا۔ تقسیم کے بعد سرگودھا ہو کر چلے آئے۔ پہلے لاہور ریڈیو اسٹیشن پر پچھلے کئی برس کلام مرتب کرنے پر ملازم رہے۔ اب اخبار نویسی کرتے ہیں۔ نظم کم اور غزلیں زیادہ کہتے ہیں۔ آپ کے رنگ تغزل میں میر اور فانی بدایونی کی سی جھلک پائی جاتی ہے زبان با محاورہ گو بہت سادہ اور سلیس استعمال کرتے ہیں۔ شعر یوں کہتے ہیں جیسے باتیں کرتے ہیں باتیں بھی ایسی جنہیں ہم گویا بھول گئے تھے اور اب وہ ہمیں یاد کرا رہے ہیں۔

مائل ۔ میر محمدی نام، دہلی کے رہنے والے تھے۔ طرز گوئی میں ایک خاص انداز کے مالک تھے۔ قدرت اللہ قدرت سے شرف تلمذ حاصل تھا۔ (جواہر سخن جلد اول ص ۳۲۴)

[illegible] شش ست [illegible] [illegible] [illegible]
[illegible] [illegible] اس کا مختلف [illegible] تصانیف کے [illegible] [illegible] [illegible]
[illegible] [illegible] [illegible] اقتضایات کے [illegible] [illegible] گا۔ [illegible]
[illegible] استعداد حاصل کی کہ قرآن شریف جیسی [illegible] سنسکرت [illegible] [illegible] [illegible]
[illegible] [illegible] تصوف سے [illegible] [illegible] [illegible] حافظ [illegible]
[illegible] اسی تحقیق اور مطالعہ کی برکت ہے کہ آپ کے کلام میں انسانیت اور [illegible] ہوتی ہے۔ [illegible]
[illegible] ہوتا ہے۔ ان کے کلام میں [illegible] [illegible] [illegible] فراق [illegible] [illegible]
منتخب ہندو شعراء ص ۱۵۲ - ۱۵۱)

پیر مراد شاہ - پیر مراد شاہ سادات قریش کے ایک صاحب استطاعت بزرگ تھے۔ آپ کے مشہور اسلاف میں سے ایک حضرت شیخ ابوالحسن [illegible] (متوفی یکم محرم [illegible]) تھے جو حضرت سید عبدالقادر جیلانی کے [illegible] تھے۔ دوسرے سلطان المشائخ شیخ حمید الدین حاکم تھے جنہوں نے سلطنت چھوڑ کر [illegible] میں فقر اختیار کیا اور ۱۹۷ برس کی عمر میں [illegible] میں واصل بحق ہوئے۔ مزار پاک [illegible] مبارک ریاست بہاولپور میں ہے۔ تیسرے بزرگ قطب العالم حضرت عبدالجلیل چوہڑ شاہ بندگی داماد سلطان بہلول لودھی تھے جو [illegible] سے [illegible] لاہور آئے اور [illegible] میں فوت ہوئے۔ ان کی خانقاہ [illegible] پر واقع ہے۔ ان کے پوتے عبدالجلیل ثانی بن ابوالفتح ثانی کی پشت میں مراد شاہ [illegible] میں [illegible] پیدا ہوئے۔ جب آپ کی عمر ۱۳ برس کی ہوئی تو آپ کے والد پیر کرم شاہ عرف میاں شاہ [illegible] کی بدنظمی سے تنگ آ کر اپنے خسر [illegible] نور الحسن عقیل الہاشمی سے ملنے لکھنؤ گئے۔ مراد شاہ نے نامۂ مراد (۱۲۰۳ھ) میں اور ان کے چھوٹے بھائی پیر فرخ بخش (متوفی [illegible]) نے ازاد قلندری میں اس سفر کی تفصیل بیان کی ہے۔ [illegible] اقامت کے بعد [illegible] میں یہ قافلہ [illegible] اور [illegible] شاہجہان پور کے قریب قزاقوں نے پیر کرم شاہ کو شہید کر دیا۔ وہاں سے مراد شاہ واپس دہلی پہنچے اور [illegible] صورت علی دیوان مرزا [illegible] کے پاس [illegible] سال مقیم رہے۔ یہیں آپ نے مولوی [illegible] کے ہاتھ پر بیعت کی اور شاعری میں شاہ [illegible] کے سامنے زانوئے ادب تہ کیا۔ [illegible] کے بعد آپ لاہور چلے آئے۔ یہیں آپ نے [illegible] برس کی عمر میں [illegible] لکھی اور یہیں رمضان [illegible] میں [illegible] پانچ سال [illegible] اردو نظم میں لکھنا شروع کیا مگر مکمل نہ ہوا تھا کہ [illegible] جمادی [illegible] کو بعمر [illegible] سال [illegible] شاہدرہ [illegible] میں انتقال کیا۔

مراد شاہ پہلے آدمی ہیں جنہوں نے لفظ اردو کو زبان کے معنوں میں استعمال کیا ہے اور یہ بات کہ اہل پنجاب کے لیے باعث فخر ہے کہ اس کے ایک بزرگ نے اردو زبان کی خدمت کی اور ہندوستان میں [illegible] کو صاف کیا۔ پیر غلام دستگیر نامی نے [illegible] مراد [illegible] اردو کے سہ ماہی رسالہ اردو بابت جولائی ۱۹۲۶ء میں شائع کرا دیا ہے۔

محسن - محمد محسن نام، خان آرزو کے بھانجے اور میر تقی میر کے شاگرد تھے۔ [illegible] سے شعر و شاعری کی طرف مائل تھے۔

محروم علی رضا ۔ ضلع پٹنہ میں بہار، ایک بستی ہے، وہیں کے رہنے والے ہیں۔ حضرت نوح ناروی کے شاگردوں میں ہیں۔ طبیعت ... شاعرانہ انداز پایا ہے۔ لکھتے بھی خوب ہیں اور پڑھتے بھی خوب ہیں۔ ترقی پسند شعراء میں بہت مقبول ہیں۔ شاعری کی ہر صنف پر قادر ہیں۔ لیکن غزل میں آپ کا ممتاز رنگ ہے۔ نکہت گل، اور کم نظر دو مجموعے آپ کے شائع ہو چکے ہیں۔

محمود ۔ محمد جعفر نام، لکھنؤ کے رہنے والے، مصحفی کے شاگرد تھے۔ ان کے کلام کی سب سے نمایاں خوبی ان کی زبان کی صفائی اور روانی ہے۔ ان کے یہاں ایسے الفاظ بہت کم ملتے ہیں جو بعد میں متروک ہو گئے (جواہر سخن)

مسرور ۔ شیخ میر بخش نام، کاکوری ضلع لکھنؤ کے رہنے والے، شیخ مصحفی کے شاگرد تھے۔ دہلی کی سیاحت بھی کی تھی۔ تغزل کا رنگ اچھا ہے۔ جدت مضامین پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ مضمون آفرینی میں مصحفی کا انداز اختیار کیا ہے۔ حتی الوسع کوئی لفظ بیکار نہیں رکھتے۔ زبان شستہ، ترکیب صاف اور بندش چست ہوتی ہے۔ بے ساختگی سے معلوم ہوتا ہے کہ دل چوٹ کھایا ہوا ہے۔

ممتاز ۔ حافظ فضو نام، سودا کے شاگرد تھے۔ وطن دہلی تھا مگر دکن میں قیام کر لیا تھا۔
ممتاز کی زبان میں صفائی اور روانی، بیان میں درد و اثر اور تشبیہات و تمثیلات میں جدت و ندرت ہے (جواہر سخن)

مجذوب ۔ مرزا غلام حیدر نام، دہلی کے رہنے والے، مرزا رفیع سودا کے متبنی اور شاگرد ہیں۔ خود کہتے ہیں ؎

بیٹھے کو کسی کے محبوب جانتے ہیں ۔ اپنے تئیں کو یارو ہم خوب جانتے ہیں
ظاہر میں کون واقف میرا کسو کو مجھ کو ۔ سودا کا پر جو کر مجذوب جانتے ہیں

"مجذوب کی غزل میں بھی سودا کا رنگ نمایاں ہے۔ معانی میں سودا سے زیادہ ... اور انداز میں کم ہیں" (جواہر سخن)

ماہر ۔ فخر الدین خان نام، آبا و اجداد دہلی کے رہنے والے تھے مگر ماہر نے لکھنؤ میں قیام کر لیا تھا۔ شرف علی فغاں کے بیٹے اور سودا کے شاگرد تھے۔ (جواہر سخن)

ماہ ۔ مرزا عنایت علی بیگ نام، حاتم علی مہر کے چھوٹے بھائی اور خواجہ حیدر علی آتش کے شاگرد تھے۔ لکھنؤ کی حکومت زائل ہونے کے بعد الہ آباد میں قیام کر لیا تھا۔ کلام میں معنوی خوبی پیدا کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ مضامین بلند اور پاکیزہ ہوتے ہیں۔ اکثر اشعار کی گرمی میں تغزل کا شعلہ موجود ہے۔

مہتی ۔ مرزا مہتاب بیگ نام، لکھنؤ کے رہنے والے، آتش کے شاگرد تھے۔ غدر کے بعد باندہ چلے گئے۔ نواب باندہ

[illegible]

[illegible] ۔

منظور ۔ چودھری منظور احمد [illegible] ہیں ۔ وہ وسطی پنجاب کے ایک [illegible]
[illegible] چودھری [illegible] [illegible] چودھری [illegible] بچپن [illegible]
[illegible] پنجاب کے زمیندار طبقہ میں بہت عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں ۔ منظور صاحب بی ۔ اے ایل ایل بی کی [illegible]
[illegible] کے [illegible] ہیں ۔ ان کے دماغ میں شعریت بدرجہ اتم موجود ہے ۔ تخیل بلند اور ہمہ گیر ہے ۔ جن کے جذبات [illegible]
[illegible] احساسات شاعریت کی جان ہیں ۔ ان کے کلام کا مجموعہ [illegible] کے نام سے شائع ہو چکا ہے ۔

منیر نیازی ۔ محمد منیر خان نام ہے ۔ نیازی قبیلے سے تعلق رکھتے ہیں ۔ ۹ اپریل ۱۹۲۸ء کو ہوشیارپور کے نواح میں [illegible] ایک
پٹھان بستی میں پیدا ہوئے ۔ تعلیم پہلے بی اے [illegible] سری نگر (کشمیر) میں حاصل کی ۔ نظموں اور غزلوں کا ایک مجموعہ "تیز ہوا اور تنہا پھول" چھپ چکا
ہے ۔ دو مزید مجموعے زیر طبع ہیں ۔ آج کل لاہور میں فلمیں لکھ رہے ہیں ۔

بشیر منذر ۔ یکم جنوری ۱۹۲۶ء کو ضلع گجرات کے ایک چھوٹے سے گاؤں میں پیدا ہوئے ۔ چوتھی جماعت ہی میں شعر کہنا شروع کر دیا
تھا ۔ آٹھویں جماعت میں وظیفہ حاصل کیا اور پہلی مکمل نظم بھی کہی ۔ نویں جماعت میں ادیب فاضل کا امتحان پاس کیا ۔ میٹرک کے امتحان میں بھی [illegible]
حاصل کی ۔ ابتدائی زندگی معاشی مشکلات کا مقابلہ کرتے گزری ۔ حالات کی نامساعدت کی وجہ سے بی اے کو ادھورا چھوڑنا پڑا ۔ تعلیم کا سلسلہ منقطع ہو جانے کے
بعد [illegible] گجرات میں [illegible] ہو گئے ۔ بعد میں کچھ عرصہ گجرات کے ہفت روزہ "صحب کسان" کی ادارت کی ۔ [illegible]
[illegible] ۔ شاعری میں نظمیں ، غزلیں اور گیت بھی کہتے ہیں ۔ نثر میں ایک ناول "ماریہ" لکھا ہے ۔

نصرت ۔ نصرت تخلص تھا ۔ [illegible] کے شاگرد تھے ۔ [illegible] سے پرہیز کرتے تھے ۔ ان کا بیت [illegible]
[illegible] معلوم ہو سکا ہے ۔ (جواہر سخن)

ناظم لکھنوی ۔ میرزا [illegible] حسین ناظم لکھنوی سادات بارہ کے مشہور [illegible] شاگرد [illegible] تھے ۔ [illegible]
[illegible] شاعر تھے ۔ وہ مرثیہ میں [illegible] مہارت رکھتے تھے ۔ اور اس فن میں انیس میر انیس کے [illegible] بیرون [illegible] شاگرد تھے ۔ شعر [illegible]
[illegible] کلکتہ میں صحافت کا پیشہ اختیار کیا ۔ پہلے کچھ روز [illegible] کی مدیرانہ ہفتہ وار [illegible]
[illegible]

[illegible] ـ [illegible] حسین خان نام، نیر تخلص، وطن [illegible]، منشی محمد [illegible] خاں [illegible] کے عزیز [illegible] جو اردو فارسی کے [illegible] [illegible] میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۲۱ء میں میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ طالب علمی کے زمانے ہی سے شعر و شاعری کا شوق [illegible] ہوگیا۔ [illegible] [illegible] اور دو مرکز سے منسلک ہوگئے۔ پھر [illegible] سرکاری ملازمت اختیار کر کے [illegible] [illegible] میں ملازمت چھوڑ کر پھر لاہور آگئے۔ اس دوران میں ماہنامہ [illegible]، ماہنامہ [illegible] کی [illegible] [illegible] کے نام سے بھی شائع کیا [illegible] منسلک ہوئے۔ [illegible] [illegible] پاکستان کے قیام کے بعد روزنامہ [illegible] سے منسلک ہو کر پشاور چلے گئے۔ وہاں سے [illegible] [illegible] میں پھر لاہور چلے گئے [illegible] روزنامہ [illegible] کی ادارت میں رہے۔ آپ کے کلام پر علامہ اقبال، مولانا [illegible] اور [illegible] کا رنگ غالب ہے۔

نور ـ میر [illegible] نام، نور تخلص، میر بادشاہ لکھنوی [illegible] پور کے بیٹے، فتح پور میں دیوانی کے سررشتہ دار تھے۔ واجد علی شاہ کے زمانے میں امین ہوگئے۔ ان کے علاوہ اپنے زمانے کے مشہور شعر گو تھے۔ نور کو ابتدا ہی سے شعر و سخن کا ذوق تھا۔ [illegible] امام بخش ناسخ نے نور تخلص تجویز کر کے اپنے شاگرد مرزا محمد رضا برق کے سپرد کیا۔ ان کا دیوان "[illegible] نور" کے نام سے ۱۲۹۶ھ ، ۱۸۷۹ء میں چھپ چکا ہے۔ غزل میں ناسخ کا رنگ ہے۔ رعایت لفظی کا بہت خیال رکھتے ہیں۔ (جواہر سخن جلد ۴ ص ۸۹ سخن شعرا)

حکیم نیر واسطی ـ سید علی احمد نام، نیر تخلص ہے۔ ۱۸۹۰ء میں ضلع بجنور کے قصبہ نہٹور کے واسطی خاندان میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد سید مظفر حسین [illegible] ضلع بجنور کے ممتاز طبیب تھے۔ ابتدا میں فارسی اور عربی کی تعلیم مولوی امتیاز حسین اور مولانا حامد حسن [illegible] سے حاصل کی اور طب کی چند کتابیں حکیم کفایت اللہ سے پڑھیں۔ پھر تکمیل علوم کے لئے دہلی اور لکھنؤ کا سفر اختیار کیا۔ دہلی میں مسیح الملک حکیم اجمل خاں سے [illegible] سے فارغ ہونے کے بعد لکھنؤ کے تکمیل الطب کالج سے سند فراغت حاصل کی۔ نیز حکیم مظفر حسین، حکیم [illegible] صاحب، حکیم محمد تقی [illegible] حکیم [illegible] کی شاگردی اختیار کر کے عملی تجارب حاصل کئے۔ ۱۹۲۳ء کے اواخر میں لاہور آکر اپنے مطب کا آغاز کیا [illegible] [illegible] [illegible] ہوگیا۔ اور اس وقت سے اب تک آپ کو طبی اداروں اور طبی سیاسیات میں ممتاز مقام حاصل ہے۔ طبی تحقیقات کے سلسلے میں [illegible] ترکی، افغانستان وغیرہ کی سیاحت بھی کرچکے ہیں اور طب عرب اور ترکی نظام طب کی تاریخ پر دو کتابیں بھی شائع کرچکے ہیں۔

شعر و سخن کا شوق آپ کو بچپن ہی سے ہے۔ شاعری کی ابتدا میں سبقی [illegible] سے استفادہ کیا۔ اس کے بعد دہلی پہنچ کر نواب [illegible] سائل، مولانا [illegible] بیخود دہلوی اور میر ناصر نذیر فراق کی صحبتوں سے اکتساب فیض کیا۔ جب لکھنؤ پہنچے تو حضرت عزیز لکھنوی اور [illegible] مرزا [illegible] کی صحبتوں سے فائدہ اٹھایا۔

تیس سال گزرے آپ کی ایک کتاب [illegible] کے نام سے شائع ہوئی تھی جو آپ کی نظموں کا ابتدائی مجموعہ تھی۔ چند سال ہوئے آپ نے ایک کتاب [illegible] لکھی تھی جو [illegible] شیرازی کی [illegible] سے متعلق تھی۔ اب آپ کا مجموعہ کلام "[illegible]" کے نام سے [illegible] ہے۔ [illegible] فارسی، عربی تینوں زبانوں میں شعر کہتے ہیں۔

نیرنگ — میر غلام بھیک نیرنگ [illegible] کے رہنے والے [illegible] شاعر [illegible]
سے [illegible] کی [illegible] ادب [illegible] شاعر [illegible] [illegible]
سے [illegible] کے [illegible] زندگی [illegible]
[illegible] شروع کر دیا۔ پاکستان [illegible]
[illegible] رکن تھے۔ ۱۶ اکتوبر [illegible] کو لاہور میں وفات پائی [illegible] ہوئے۔

واصلی — میر فضل رسول خان نام، سندھ کے رئیس تھے اور حضرت امام [illegible] کی اولاد سے تھے۔ [illegible]
میر [illegible] واصلی نے [illegible] کے عہد میں سندھ فتح کر کے وہاں حکومت اختیار کی تھی۔ فضل رسول ۱۹ جمادی الاول [illegible] میں

پیدا ہوئے۔ فارسی کی ابتدائی تعلیم [illegible] میں ہوئی۔ عربی [illegible] مشہد [illegible] پڑھی۔ [illegible] سے [illegible] شاعری میں امیر کے شاگرد تھے
ان کے کلام کا مجموعہ [illegible] کی صورت میں طبع ہوا۔ کتاب [illegible] کے [illegible] میں [illegible] ہو گئی۔ [illegible] اشعار [illegible] سے بہتر ہیں۔ [illegible]
زیادہ [illegible] کا [illegible] ہے۔

وسیم خیرآبادی — سید [illegible] نام، وسیم تخلص خیرآباد کے رہنے والے امیر مینائی کے ارشد تلامذہ میں تھے۔ [illegible]
کی ایک جلد کی ترتیب انہی نے کی ہے۔ مدت تک مہاراجہ [illegible] کے دربار کی شعرا میں شامل رہے۔ تحقیق و صحت [illegible] کا ان کو بہت شوق
ہے۔ رسالہ [illegible] بھی آپ کی ادارت میں عرصہ دراز تک شائع ہوتا رہا۔ تغزل کا رنگ [illegible] خیرآبادی سے ملتا ہے تاریخ گوئی میں بھی کمال
حاصل ہے۔ (آبِ بقا)

وفا — [illegible] نام تھا، خوش گزران اور خوش اوقات تھے۔ بعضوں کے قول کے مطابق خواجہ حسن کے معاصر تھے کلام
میں قدرت اور جدت کا رنگ ہے اس کے ساتھ مزہ [illegible] تغزل بھی ہیں۔ سلاست اور روانی بھی ہے طرز بیان میں خوبی بھی ہے لیکن
اشعار کم ہیں۔ (جواہر سخن جلد اول ص ۲۸۳، مخزن نکات)

وفا — [illegible] سیالکوٹ کے موضع [illegible] میں پیدا ہوئے تھے۔ ان کا بچپن [illegible]
دیہات کے سکول [illegible] جماعت میں پڑھتے تھے کہ شعر موزوں کرنے لگے۔ سکول کی تعلیم ختم کر کے لاہور آ گئے یہاں آپ کی شاعری [illegible]
[illegible] کرنے کے [illegible] شروع کی۔ لاہور کے کئی اخبارات کے ایڈیٹر رہے [illegible] اپنا اخبار بھی نکالا [illegible]
پاکستان کے قیام کے بعد [illegible] چلے گئے۔

آپ نظم بھی کہتے ہیں اور غزل بھی۔ زبان نہایت شستہ، پاکیزہ اور سلیس استعمال کرتے ہیں۔

وفا — سید شاہ [illegible] نام، وفا تخلص ہے۔ ڈپٹی مجسٹریٹ ہونے کے ساتھ ساتھ بہاری شعراء میں ممتاز درجہ رکھتے ہیں۔ [illegible] بعد کے بہترین ادیب اور شاعر ہیں۔ آپ ضلع گیا کی ایک بستی [illegible] کے رہنے والے ہیں۔ نظم اور غزل [illegible] شاعر ہیں۔

ہادی مچھلی شہری — ہادی علی شہری علی گڑھ کے فارغ التحصیل اور اردو فارسی نظم و نثر کے ایک ممتاز اور نہایت ہی پرگو ادیب ہیں۔ بحیثیت جج کے [illegible] رہے۔ وکالت کرتے ہیں۔

ہوش — نیاز احمد خاں نام، نواب خطاب تھا، بریلی کے رہنے والے تھے۔ بہت دنوں تک لکھنؤ میں رہے، وہاں طب اور شاعری دونوں کی مشق ساتھ ساتھ جاری رکھی۔ معقولات اور منقولات کی تعلیم مشہور اساتذہ سے حاصل کی۔ فن شاعری میں حکیم [illegible] خاں [illegible] سے استفادہ کیا۔ آخر میں امیر کے شاگرد ہوئے۔ ۵۵ سال کی عمر میں ۱۳۱۵ھ میں وفات پائی۔ تمام اصناف سخن میں طبع آزمائی کی۔ کلام صاف اور سلیس ہے۔ لیکن قصیدوں کے مقابلے میں غزلیں زیادہ کامیاب نہیں۔

یکرنگ — مصطفیٰ قلی خاں نام تھا، خان جہاں لودھی کے نواسے اور سلسلہ ملازمت شاہی میں وابستہ تھے۔ اشعار میں آمد کا رنگ غالب ہے، تغزل میں سوز و گداز موجود ہے۔ اکثر اشعار سلیس اور صاف ہیں۔ بعض تذکرہ نگاروں نے شاہ آبرو کا اور بعض نے آرزو کا شاگرد لکھا ہے۔ بعض مظہر کا شاگرد بتلاتے ہیں۔ (جواہر سخن، مخزن نکات، نکات الشعراء، چمنستان شعراء، گلشن ہند)

[illegible]

ورق ناخن تدبیر

[illegible]

قیمت ۔/۴/۲

بھابی

[illegible]

قیمت ۔/۴/۱

نمک مرچ

[illegible]

قیمت ۔/۴/۲

باغ و بہار

[illegible]

قیمت ۔/۴/۲

ادارہ

فروغ اردو، لاہور

ہماری کتابیں

۵/-	عمر ابوالنصر	نبی امی	۶/-	شوکت تھانوی	[illegible]
۱۰/-	″	خلفائے مصر	۳/۸	″	[illegible]
۴/۸	جگر مرادآبادی	شعلۂ طور	۶/-	″	[illegible]
۲/-	رسوا	امراؤ جان ادا	۳/-	″	[illegible]
۲/۴	ابو سعید قریشی	خشو	۲/-	″	سودیشی ریل
۲/۸	ندیم	قول و قرار	۳/۸	″	کچا [illegible]
۲/-	″	ریگ و نم	۲/۸	″	[illegible]
۲/-	مصنفہ	سرگزشتوں کے ہجوم	۲/۴	″	سسرال
۳/-	احمد ندیم قاسمی	آنچل	۲/۸	″	[illegible]
۳/-	″	بازار حیات	۳/۸	″	[illegible]
۴/-	″	نقوش لطیف	۲/۸	″	[illegible]
۲/۸	ڈاکٹر تاثیر	عزیزہ کے نام	۴/-	″	[illegible]
۵/-	عابد علی عابد	ید بیضا	۲/۸	″	[illegible]
۲/۸	امام ابن تیمیہ	سیاست الہیہ	۱/۸	″	[illegible]
۴/-		مضامین جمال الدین افغانی	۲/۸	″	غالب کے خطوط
۲/۴	رشید اختر ندوی	پندرہ جگسٹ	۲/-	″	دھیرو وغیرہ
۲/-	محمد خلیل	صاحب	۴/۸	″	بجلی
۳/-	عابد علی عابد	انتقاد	۳/-	قتیل شفائی	[illegible]

ادارہ فروغ اردو، لاہور

غزل نمبر

[illegible] اپنی [illegible] شعرائے اردو کی غزلوں [illegible]
[illegible] شائع کر [illegible] اہمیت، افادیت اور قدر و قیمت [illegible]
دینا تا یا ممکن ہے کہ ادارۂ فروغ اردو۔ لاہور کے زیر اہتمام شائع ہو [illegible]
آپ پر شعرائے سلف کے متغزلانہ کمالات ہی واضح نہیں کریں گے بلکہ [illegible]
پہلے تک کی غزل کے تمام ارتقائی مدارج اور مراحل بھی آپ کے سامنے آئینہ کر [illegible]

شائع ہونے والے انتخابات یہ ہیں

(۱) انتخاب میر (۲) انتخاب سودا (۳) انتخاب درد (۴) انتخاب میر حسن
(۵) انتخاب جرأت (۶) انتخاب مصحفی (۷) انتخاب غالب (۸) انتخاب مومن
(۹) انتخاب ذوق (۱۰) انتخاب آتش (۱۱) انتخاب امیر (۱۲) انتخاب داغ
(۱۳) انتخاب نظیر (۱۴) انتخاب حالی (۱۵) انتخاب شیفتہ (۱۶) دہلی اسکول
(۱۷) لکھنؤ اسکول

[illegible]

[illegible] کے علاوہ ان مطبوعات کی بھی [illegible]

اگر آپ

اپنا نام ہمارے ہاں درج کرا دیں [illegible]

ادارۂ فروغ اردو۔ لاہور